امیرِ شریعت نمبر

ماہنامہ

نقیبِ ختمِ نبوت ملتان

بہ موقع صد سالہ سالِ ولادت

۱۹۹۲ــــ ۱۸۹۲ء

مُدیر

سید محمد کفیل بخاری

جمادی الاخریٰ ۱۴۱۳ھ دسمبر ۱۹۹۲ء جلد ۳ شمارہ ۱۲ قیمت فی پرچہ =/۸ روپے

زرِ تعاون سالانہ

◎ اندرونِ ملک =/۱۰۰ روپے ◎ بیرونِ ملک =/۱۰۰۰ روپے پاکستانی

موجودہ شمارہ کی قیمت

عام ایڈیشن / روپے ● اعلیٰ ایڈیشن / روپے

رابطہ دار بنی ہاشم — مہربان کالونی — ملتان — فون ۲۸۱۳۷

تحریکِ تحفظِ ختمِ نبوۃ شعبہ تبلیغ مجلسِ احرارِ اسلام پاکستان

ناشر: سید محمد کفیل بخاری طابع: تشکیل احمد اختر مطبع: تشکیل نور پرنٹرز مقام اشاعت: دار بنی ہاشم ملتان

اشاعتِ خاص

بہ موقع صد سالہ سالِ ولادت

حضرت امیرِ شریعت

مرتبین:

سید محمد کفیل بخاری

سید محمد ذوالکفل بخاری

بخاری

ولادت:

یکم ربیع الاوّل ۱۳۱۰ ھ
۲۳ر ستمبر ۱۸۹۲ ش
جمعۃ المبارک ۔ بوقتِ سحر

اِنتقال:

۹ر ربیع الاوّل ۱۳۸۱ھ
۲۱ر اگست ۱۹۶۱ش
بعد العصر بروز پیر

حرمِ امیرِ شریعت

سیّدہ اُمُّ الاحرار کے نام

جنہیں حلقۂ احرار میں

سب "امّاں جی" کے مقدس نام سے پکارتے

اِنتقال :-

۶ جون ۱۹۹۱ء

"مخلوق میں جب تک خالق کا نظام نہیں چلایا جائے گا

دنیا میں امن نہ ہوگا" (۱)

سید عطاء اللہ شاہ

۲۸ ستمبر ۴۶

بمبئی دفتر ہلالِ نو

(۱) یہ آٹو گراف خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری، پٹنہ، (انڈیا) کی شائع کردہ "جنید احمد کی آٹو گراف بک" کے صفحہ ۲۳ سے لیا گیا ہے۔

(۲) شاہ جی ان دنوں ۱۹۴۶ء کی انتخابی مہم کے سلسلہ میں بمبئی کے دورے پر تشریف لے گئے تھے۔ حافظ علی بہادر مرحوم، مجلس احرارِ اسلام کے سرکردہ رہنما تھے اور بمبئی سے احرار کے ٹکٹ پر انتخاب میں امیدوار تھے۔

(۳) ہفت روزہ "ہلالِ نو" حافظ صاحب کی ادارت میں بمبئی سے شائع ہوتا تھا۔ جبکہ وہ بمبئی سے ہی ہفت روزہ "دورِ جدید" بھی نکالتے رہے جو قیامِ پاکستان کے بعد تک شائع ہوتا رہا۔ (کفیل)

سید محمد کفیل بخاری

دل کی بات

۲۱ اگست ۱۹۶۱ء کی ڈھلتی شام کا وہ کربناک منظر آج بھی مجھے یاد ہے۔ ایک طرف آفتاب جہاں تاب ڈوب رہا تھا اور دوسری طرف آفتابِ خطابت غروب ہو رہا تھا۔ میری عمر اس وقت پونے چار برس تھی۔ میرے سب سے بڑے ماموں حضرت سید ابومعاویہ ابو ذر بخاری مدظلہ میری انگلی پکڑ کر دوڑتے ہوئے مجھے میرے نانا ابا جی کی چارپائی کے قریب لے آئے۔ اور فرمایا بیٹا اپنے نانا ابا جی کو آبِ زمزم پلاؤ۔ میں نے چمچ ان کے ہونٹوں کے قریب کیا تو انہوں نے منہ کھول دیا اور آخری مرتبہ میرے ہاتھ سے زمزم پیا۔ اس وقت ان کی آنکھیں بند تھیں اور زبان پر کلمۂ توحید کا ورد جاری تھا۔ وہ اپنے مستقر کی جانب رختِ سفر باندھ کر ہمیشہ کے لئے روانہ ہو رہے تھے۔ سب لوگ اشکبار تھے۔ میں نے سنا، وہ کہہ رہے تھے، اب یہ آنکھیں ہمیشہ کے لئے بند ہو چکی ہیں۔ اب ان کے دیکھنے کو ہماری آنکھیں ہمیشہ ترستی رہیں گی۔ حکیم عطاء اللہ خان مرحوم، جو نہ صرف ان کے معالجِ خاص تھے بلکہ مخلص ترین دوست بھی تھے ان کی ہچکی بندھ گئی۔ ابھی کچھ ہی دیر پہلے شاہ جی کا بخار مقیاس حرارت کے تمام درجوں کو عبور کر چکا تھا۔ حکیم صاحب نے گلوگیر آواز میں کہا "شاہ جی! بخار اتر گیا؟ شاہ جی! آرام آ گیا؟۔ شاہ جی! "صحت ہو گئی؟" اس سے آگے وہ کچھ نہ کہہ سکے اور دھاڑیں مار کر رونے لگے۔ سارا ماحول حزن و یاس کی کیفیتوں میں ڈوب گیا۔ تب مجھے احساس ہوا کہ میرے نانا ابا جی، جنہیں ان کے لاکھوں چاہنے والے محبت سے "شاہ جی" کہتے ہیں کہیں دور بہت دور جا چکے ہیں۔ جہاں سے لوٹ کر کبھی کوئی نہیں آیا۔

میں نے انہیں شعور کے ساتھ نہیں دیکھا۔ مگر ان کی سیرت کے دل افروز نقوش کا سب سے پہلے اپنے ہی گھر میں شعور کے ساتھ مشاہدہ کیا۔ نانی اماں۔۔۔ (جنہیں حلقۂ احرار کے سبھی بزرگ اور خورد "اماں جی" کے مقدس نام سے پکارتے) کا وجودِ مسعود پورے خاندان کے لئے ابرِ رحمت اور دعاؤں کا حصار تھا۔ میں نے ان کی عصمت مآب زندگی میں شاہ جی کی پاکیزہ اور اولوالعزم زندگی کا عکسِ جمیل دیکھا۔ انہوں نے بیوگی کی تیس منزلیں جس ہمت اور عزم کے ساتھ عبور کیں اس سے یہ بات آسانی کے ساتھ سمجھ میں آ گئی کہ اس عفت مآب ماں نے شاہ جی کی قید و بند اور مصائب بھری زندگی سے کس ہمت کے ساتھ نباہ کیا۔ میری والدہ ماجدہ اور پھر چاروں ماموں۔ جن کی تربیت میں اماں جی رحمۃ اللہ علیہا نے ہی اہم کردار اداء کیا تھا آج اپنے عظیم باپ کے اخلاق و کردار کا حسین پرتو ہیں۔ یہی بات کیا کم ہے کہ انہوں نے اپنے باپ کا کفن نہیں بیچا۔ شاہ جی کے بعض نام نہاد محبین کے پیہم ظلم و ستم، بے وفائی اور چیرہ دستیوں کے باوصف احرار کا چراغِ مصطفوی جلائے رکھا۔ جس کی حقیقت افروز روشنی کے سامنے شرارِ بولہبی نے دم توڑ دیا۔ میں نے بچپن سے جوانی تک کے لیل و نہار اسی گھر میں گزارے۔ اور انہی روشن صورتوں میں شاہ جی کو چلتے پھرتے دیکھا۔۔۔۔ زندۂ جاوید شاہ جی۔

میں نہیں جانتا کہ شاہ جی کیا تھے اور انہوں نے کیا کام کیا؟ میں نے شاہ جی کو انہی مستند حوالوں سے جانا اور پہچانا ہے۔ میں ان بستیوں میں گھوما پھرا جنہیں شاہ جی نے "بنجر زمینیں" قرار دیکر ان میں ہل جوتے اور وفا کی فصل کاشت کی تھی۔ تب شاہ جی کا کام سمجھ میں آ گیا۔۔۔ انہوں نے اپنے علم و عمل اور نظریئے کو جن دماغوں میں منتقل کیا وہ گویا نقش فی الحجر ہیں۔ انہوں نے سرد فضاؤں کو اپنی شعلہ بیانیوں سے ایسا گرم کیا کہ صدیوں تک اس کی شدت و حرارت محسوس کی جاتی رہے گی۔ انہی گرم فضاؤں میں پہنچ کر مجھے ان کے مقام و مرتبے کا ادراک اور عرفان نصیب ہوا۔ انہوں نے برف سے زیادہ

ٹھنڈے انسانوں کو متحرک کیا، ان کے کانوں میں غیرت و حمیت کا صور پھونکا، انہیں دین کا سچا سپاہی بنایا اور ان کے دل و دماغ پر اپنے نقوشِ عمل یوں جما دیئے کہ پھر وہ امتدادِ وقت کے باوجود نہ مٹ سکے اور نہ مٹائے جاسکے۔ وہ ہمہ صفت موصوف تھے۔ خطیب، مدبر، مصلح، سیاست دان، عالمِ دین، شاعر، غرض اس پیکر صدق و صفا میں خوبیوں کا اک جہان آباد تھا۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ وہ ایک سچے اور عظیم مسلمان تھے۔ انہوں نے اپنے عہد میں زندگی کے ہر شعبے کے افراد کو متاثر کیا۔ مختلف الخیال اور متضاد طبیعتوں کے حامل افراد کو مجتمع کر کے نہ صرف انہیں ہم خیال بنایا بلکہ ان کے قدم ملا کر سرفروشوں اور بہادروں کا قافلۂ احرار تشکیل دے دیا۔

ہوئی تیغ حق بے نیام اللہ اللہ

پھر یہی قافلۂ احرار پوری آب و تاب کے ساتھ شپرہ چشموں کی عیب چینی سے یکسر بے نیاز ہو کر وقت کی سب سے بڑی جابر نصرانی حکومت سے ٹکرا گیا۔ ایک مقصد عالی کی خاطر اپنی کڑکتی جوانیوں کے بیس بیس برس پسِ دیوار زنداں بسر کر ڈالے۔ ظلم کا ہر ڈھنگ ان مردانِ احرار پر آزمایا گیا مگر انہیں جھکایا نہ جاسکا۔ بالآخر برصغیر سے انگریزی اقتدار کی بساط لپیٹ دی گئی لیکن افسوس کہ اپنے خون سے حریت کی داستانیں رقم کرنے والوں اور متاعِ دین و دانش کی حفاظت کے لئے مر مٹنے والوں کے سب خواب لوگ، دل و جاں کے سارے خروش کو مفادات کی بھینٹ چڑھا دیا گیا۔ وہ حادثات کی پیداوار سیاسی مخلوق کے شب خون کا شکار ہوگئے۔ جس دھرتی کی آزادی کے لئے انہوں نے اپنا سب کچھ نثار کیا اس کے ضمیر فروش اور چھچھورے حکمرانوں، تیرہ باطن تاریخ نویسوں، قلم فروش صحافیوں اور کرائے کے دانشوروں نے انہیں "غدار" سمجھا۔ لیکن تابکے؟

سچائی، حقیقت اور واقعہ یہی ہے کہ اب جھوٹ کی نیا ڈوب چکی ہے۔ ڈوب رہی ہے۔ پوری قوم جان چکی ہے کہ

بد تر ہے جانور سے بھی دانشوروں کا حال
جو سوچتا نہیں ہے وہ انساں ہے ان دنوں

حقیقت خود کو منوا رہی ہے۔ لوگ زبانِ حال سے پکار رہے ہیں کہ خدا تم ہی سچے تھے۔ لیکن آہ۔۔۔

دل زدگاں کے قافلے دور نکل چکے تمام
ان کی تلاش میں نگاہ اب جو گئی تو کیا گئی

اگست ۱۹۹۲ء کی ایک شام۔۔۔ میں لاہور میں اپنے رفقاء فکر، عبداللطیف خالد چیمہ، پروفیسر محمد عباس نجمی، پروفیسر شاہد محمود کاشمیری، محمد رفیق اختر، محمد عمر فاروق، میاں محمد اویس اور رانا محمد فاروق کے ساتھ خوش گپیوں میں مصروف تھا۔ اچانک گفتگو کا رُخ اور طرف مُڑ گیا۔ محترم محمد عباس نجمی نے کہا ۱۹۹۲ء میں حضرت امیر شریعت کا صد سالہ یوم ولادت ہے۔ اس موقع پر نقیبِ ختم نبوت کا ایک یادگار نمبر شائع ہونا چاہیئے۔ اس سمے، میں نے سوچا کہ اس بار سے کیوں کر سبک دوش ہوں؟ مگر دوسرے لمحے میں نے فیصلہ کرلیا کہ ان شاء اللہ یہ کام میں ہی سرانجام دوں گا۔ رفقاء نے بھرپور تعاون کا یقین دلایا۔ تفصیل میں نہیں جاتا کہ کس نے کتنا تعاون کیا۔ بس اتنا کہہ دینا کافی سمجھتا ہوں کہ سب نے ایک دوسرے پر سبقت لینے کی کوشش کی۔

اعلان کے مطابق یہ نمبر اکتوبر ۱۹۹۲ء میں چھپ جانا چاہیئے تھا مگر مجھے اس بھاری کام کا اندازہ نہ تھا۔ پھر یہ میرا پہلا تجربہ تھا۔ ادھر قارئین کی طلب و اصرار شدت اختیار کر گئے۔ دسمبر ۱۹۹۲ء میں کتابت مکمل ہوئی اور جنوری ۱۹۹۳ء میں یہ تاریخی نمبر منصۂ شہود پر آرہا ہے۔ اگر کتابت شدہ تمام مواد شاملِ اشاعت کیا جاتا تو ایک ہزار سے زائد صفحات پر پھیل

جاتا۔ ظاہر ہے کہ اتنی ضخامت کے ساتھ موجودہ قیمت پر قارئین کو مہیا نہیں کیا جاسکتا تھا۔ چنانچہ اسے دو حصوں میں تقسیم کردیا گیا ہے۔ ۶۴۰ صفحات پر مشتمل حصہ اوّل آپ کے ہاتھوں میں ہے جبکہ حصہ دوم ان شاءاللہ ۱۹۹۳ء میں ہی ہدیہ قارئین کیا جائے گا۔ اس مجموعہ میں مطبوعہ اور غیر مطبوعہ دونوں طرح کے مضامین شامل ہیں۔ شاہ جی پر اتنا کچھ لکھا گیا ہے کہ تمام مواد ہزاروں صفحات پر پھیل جائے۔ ہماری کوشش ہے کہ بکھرے ہوئے تمام مقالات و مضامین تسلسل کے ساتھ شائع کئے جائیں۔

زیر نظر مجموعہ میں جو خامیاں رہ گئی ہیں وہ میری کوتاہیاں ہیں۔ قارئین تصحیح فرمائیں تو اس کا خیر مقدم کیا جائے گا۔

اس کارِ خیر کی تکمیل میں والدہ ماجدہ اور اپنے محسن ماموں سید عطاء المحسن بخاری مدظلہ کی بھرپور سرپرستی نے میرا حوصلہ بڑھایا۔ ان کی یادداشتوں سے میں نے بھرپور استفادہ کیا۔

برادر محترم شیخ حبیب الرحمن بٹالوی اور برادر عزیز سید محمد ذوالکفل بخاری نے حروف خوانی سے لیکر ترتیب و تزئین تک میری مکمل دستگیری فرمائی۔ برادرم ابو میسون اللہ بخش احرار نے دن رات ایک کر کے اپنی نگرانی میں طباعت کے تمام مراحل طے کرائے۔ محترم شبیر احمد میواتی نے شاہ جی کا آٹو گراف فراہم کیا جو خدا بخش لائبریری پٹنہ (انڈیا) سے شائع ہوا۔ اور اس مجموعہ کی زینت بنا۔ محترم جاوید اختر بھٹی صاحب کے مفید مشوروں سے بھی بھرپور فائدہ اٹھایا۔

میں شکریہ کے روایتی اظہار سے گریز کر رہا ہوں کہ وہ محض الفاظ کی شہہ خرچی ہے۔ جتنے دوستوں، بزرگوں کا اوپر ذکر کر آیا ہوں ان سب کے لئے دعا گو ہوں اللہ تعالیٰ انہیں اس تعاون پر جزاء خیر عطاء فرمائے (آمین) شکر۔۔۔ اللہ کا اداء کرتا ہوں جس نے مجھے اس بار سے سبک دوش ہونے کی توفیق بخشی اور دوستوں کو میرا معاون بنایا۔

میں نے جس گھر میں ہوش کی آنکھ کھولی اور شعور کی دولت پائی اب اس میں شاہ جی ہیں نہ اماں جی۔ مگر

اسی گھر میں جلایا ہے چراغِ آرزو برسوں

شاہ جی کے حضور نذرانہ عقیدت کے طور پر یہ چند آنسو حاضر ہیں۔

ہر چند بگولہ مضطر ہے، اِک جوش تو اُس کے اندر ہے
اِک وجد تو ہے، اِک رقص تو ہے، بے چین سہی، برباد سہی

والسلام

سراپا احرار

۲۰ جنوری ۱۹۹۳ء

مختصر سوانحی خطوط

اسم گرامی

ننھیالی نام: سید شرف الدین احمد

ددھیالی نام: سید عطاء اللہ بخاری

کنیت: ابو العطایا

لقب: امیر شریعت

تخلص: ندیم

ولادت:

بروز جمعہ: بوقتِ سحر

یکم ربیع الاول ۱۳۱۰ھ ۲۳ ستمبر ۱۸۹۲ء (اپنے نانا) حافظ حکیم سید احمدِ اندرانی کے مکان واقع کوچہ لنگر، محلہ خانہ باغ

پٹنہ عظیم آباد--- صوبہ بہار، انڈیا- میں ولادت ہوئی

اساتذہ:

مولانا سید الفت حسین بہاری، مولانا عبدالرحیم بہاری، امام القراء سید عمر عاصم (ترکی) حضرت مولانا قاضی عطاء محمد (ساکن موضع راجُو وال ضلع گجرات)، حضرت مولانا عبدالصمد کاشمیری امرتسری، حضرت مفتی غلام مصطفیٰ قاسمی کاشمیری امرتسری، حضرت مفتی محمد حسن تھانوی امرتسری، حضرت مولانا نور احمد صاحب، محمد دین غریب امرتسری رحمۃ اللہ علیہم اجمعین۔

بیعت و استرشاد

بیعتِ اُولیٰ: بدستِ مُرشد گرامی حضرت

پیر سید مہر علی شاہ حَسنی، گیلانی، قادری، چشتی، نظامی، گولڑوی رحمۃ اللہ علیہ۔

بیعت امیر شریعت:

اِسترشاد و حصُولِ سعادت بیعتِ امیر شریعت از حجۃ الاسلام علامہ محمد انور شاہ کاشمیری، رحمۃ اللہ علیہ۔

بیعت ثانیہ:

بدستِ مرشدِ عظیم حضرت مولانا شاہ عبدالقادر نقشبندی، چشتی، سہروردی، قادری، رائپوری، رحمۃ اللہ علیہ (حضرت نے چاروں سلسلوں میں آپ کو اجازتِ بیعت بھی عطاء فرمائی)

آباؤ اجداد:

کل آباؤ اجداد تا سیدنا علی رضی اللہ عنہ: بتیس
کل نکاح: ایک۔
کل اولاد: آٹھ (چار لڑکے۔ چار لڑکیاں)
کل زندہ اولاد: پانچ (چار لڑکے۔ ایک لڑکی) بہ ترتیب ذیل:

۱۔ حافظ سید ابو معاویہ ابو ذر بخاری۔ ۲۔ سیدہ ام کفیل بخاری۔ ۳۔ حافظ سید عطاء المحسن بخاری۔ ۴۔ حافظ سید عطاء المومن بخاری۔ ۵۔ حافظ سید عطاء المہیمن بخاری۔

کل احفاد:

(پوتے، نواسے، نواسیاں) تیرہ۔
چار پوتے: حافظ سید محمد معاویہ بخاری، حافظ سید محمد مغیرہ بخاری، سید عطاء اللہ بخاری، سید عطاء المنان بخاری۔
دو نواسے: حافظ سید محمد کفیل بخاری، سید محمد ذوالکفل بخاری
تین نواسیاں، چار پوتیاں۔

قید و بند:

کل گرفتاریاں: گیارہ
کل قید: نو سال چار مہینے انیس دن پونے سولہ گھنٹے

وفات

بروز پیر، بعد العصر، چھ بجکر ترپن منٹ
۹ ربیع الاول ۱۳۸۱ھ۔ ۲۱ اگست ۱۹۶۱ء ملتان شہر

کل عمر:

اکہتر سال سات دن۔

نمازِ جنازہ:

بروز منگل ۱۰ ربیع الاول ۱۳۸۱ھ۔ ۲۲ اگست ۱۹۶۱ء بعد عصر، ایمرسن کالج گراؤنڈ۔
زیر امامت: فرزند اکبر سید ابو معاویہ ابو ذر بخاری

تدفین:

چھ بجے شام، جلال باقری قبرستان ملتان۔

شجرۂ نسب

اِس صدی کے مشہور کشمیری مؤرخ منشی محمد الدین فوق نے اپنی تصنیف "تاریخ اقوامِ کشمیر" میں آپ کا شجرۂ نسب یوں رقم کیا ہے۔

امیرِ شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاری نور اللہ مرقدہٗ کا نسب نامۂ حریت

میں ان سؤروں کا ریوڑ بھی چَرانے کو تیار ہوں، جو برٹش امپیریلزم کی کھیتی کو ویران کرنا چاہیں، میں کچھ نہیں چاہتا، ایک فقیر ہوں، اپنے نانا صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت پر مرمٹنا چاہتا ہوں۔ اور کچھ چاہتا ہوں، تو صرف اس ملک سے انگریز کا انخلا۔ وہی خواہشیں ہیں میری زندگی میں یہ ملک آزاد ہو جائے، یا پھر میں تختۂ دار پر لٹکا دیا جاؤں

میں ان علمائے حق کا پرچم لئے پھرتا ہوں، جو ۱۸۵۷ء میں فرنگیوں کی تیغِ بے نیام کا شکار ہوئے تھے۔ ربِ ذوالجلال کی قسم مجھے اس کی کچھ پروا نہیں، کہ لوگ میرے بارے میں کیا سوچتے ہیں ——— لوگوں نے پہلے ہی کب کسی سرفروش کے بارے میں راست بازی سے سوچا ہے۔ وہ شروع سے تماشائی ہیں، اور تماشا دیکھنے کے عادی۔ میں اس سرزمین میں مجدد الف ثانیؒ کا سپاہی ہوں۔ شاہ ولی اللہؒ اور ان کے خاندان کا متبع ہوں سید احمد شہیدؒ کی غیرت کا نام لیوا، اور شاہ اسمٰعیل شہیدؒ کی جرأت کا پانی دیوانہ ہوں، میں اُن پانچ مقدمہ ہائے سازش کے پابہ زنجیر علمائے امت کے لشکر کا ایک ضمت گذار ہوں جنہیں حق کی پاداش میں عمر قید اور موت کی سزائیں دی گئیں۔ ہاں! ہاں!! میں انہی کی نشانی ہوں ——— انہی کی صدائے بازگشت ہوں میری رگوں میں خون نہیں آگ دوڑتی ہے۔ میں علی الاعلان کہتا ہوں، کہ میں قاسم نانوتویؒ کا علم لے کر نکلا ہوں۔ میں نے شیخ الہند کے نقشِ قدم پر چلنے کی قسم کھا رکھی ہے، میں زندگی بھر اسی راہ پر چلتا رہا ہوں، اور چلتا رہوں گا ——— میرا اس کے سوا کوئی موقف نہیں میرا ایک ہی نصب العین ہے اور وہ برطانوی سامراج کی لاش کو کفنانا یا دفنانا ———

——— ہر شخص اپنا شجرہ نسب ساتھ رکھتا ہے میرا یہی شجرہ نسب ہے۔ میں سر اُونچا کر کے فخر کے ساتھ کہہ سکتا ہوں، کہ میں اس خاندان کا ایک فرد ہوں۔

۲۲ مارچ ۱۹۳۹ء

حضرت مجدد الف ثانیؒ

قلعہ گوالیار میں دو سال

شاہ ولی اللہؒ

قرآن پاک کے ترجمہ فارسی پر دسترخوان شاہی کے ریزہ چینوں نے آپ پر قاتلانہ حملہ کیا، اور پانہچے توڑ ڈالے۔

شاہ عبدالعزیزؒ | شاہ رفیع الدینؒ | شاہ عبدالقادرؒ | شاہ عبدالغنیؒ

چاروں بھائی تھے۔ آخری تین چھوٹے بھائی شاہ عبدالعزیزؒ کی زندگی ہی میں وفات پاگئے۔ شاہ عبدالقادرؒ نے سب سے پہلے قرآن پاک کا اُردو ترجمہ کیا، جو آج تک سبھی اُردو تراجم کی بنیاد ہے۔ سلطنت کے آخری فرزندوں نے شاہ عبدالعزیزؒ کو دو مرتبہ زہر دیا، جو ناکام رہا۔ بدن پر چھپکلی کا ابٹن مل دیا گیا جس سے (۱) برص ہو گیا۔ (۲) بینائی جاتی رہی (۳) خون میں حدت پیدا ہو گئی (۴) مختلف امراض نے گھیر لیا۔ ایک دفعہ فتح پوریگی کی جامع مسجد میں تراویح پڑھا رہے تھے کہ غنڈوں کا ایک ٹولا شراب میں دُھت طوائف کو رہنما بنا کر آوازے کستا رہا، اس طائفہ نے تماشے پیش کر دہ اودھم مچایا، کہ پناہ بخدا

سید احمد بریلویؒ — شہادت

اسمٰعیل شہیدؒ (فرزند عبدالغنی) — شہادت

ان نفوس قدسیہ کی معیت میں علمائے حق اور مجاہدین اسلام کا ایک قافلہ جامِ شہادت نوش کر کے سرخرو ہو گیا۔

۱۸۵۷ء

(جنگ آزادی)

سزا یافتگان موت — پھانسی دیئے گئے یا گولی سے اُڑا دیئے گئے

نواب عبدالرحمٰن خاں والیٔ جھجھر | نواب مظفر الدولہ | نواب میر خاں | نواب اکبر خاں بنگش | احمد مرزا | میر محمد حسین

حکیم عبدالحق | قاضی فیض اللہ کشمیری | میر پنجہ کش خوشنویس | امام بخش صہبائی | نواب احمد علی خاں (جیل میں موت واقع ہوئی) | نواب محمد حسین خاں

نظام الدین خاں | نواب محمد علی خاں | عبداللہ خاں | دلدار علی خاں | صوفی حسن عسکری | غلام محمد خاں (رئیس فرخ نگر)

قیدی ۱۸۵۷ء

سید اسمٰعیل حسین منیر شکوہ آبادی — بعبور دریائے شور | مفتی عنایت احمد کاکوروی — بعبور دریائے شور | مفتی مظہر کریم — بعبور دریائے شور | مولانا فضل حق خیر آبادی — بعبور دریائے شور | مولانا ولایت علی — بعبور دریائے شور

پانچ مقدمہ ہائے سازش

انبالہ ۱۸۶۴ء
- مولانا یحییٰ علی صادق پوری
- مولانا عبد الرحیم صادق پوری
- قاضی میاں جان
- میاں عبد الغفار
- مولانا محمد جعفر تھانیسری

سزائے موت سنا کر صرف اس لئے عمر قید میں تبدیل کر دی گئی، کہ پھانسی کو دوست رکھتے تھے۔ کل گیارہ ملزم تھے۔ صرف ایک وعدہ معاف گواہ بنا۔

پٹنہ ۱۸۶۵ء — مولانا احمد اللہ صادق پوری کو موت کی سزا دی گئی، جو عمر قید میں تبدیل ہوگئی کالے پانی میں داعیٔ اجل کو لبیک کہا۔ ان کی تمام جائیداد ضبط کر لی گئی۔ حتیٰ کہ قبریں بھی اکھاڑ دی گئیں۔

راج محل ۱۸۷۰ء — جناب ابراہیم منڈل کو عمر قید اور ضبطی جائیداد کی سزائیں دی گئیں۔

مالدہ ۱۸۷۰ء — مولوی امیر الدین کو عمر قید کی سزا دی گئی، گیارہ سال قید کٹوا کر رہا کئے گئے۔

پٹنہ ۱۸۷۱ء — کل سات ملزم تھے۔ مولانا مبارک علی نے جیل میں انتقال کیا۔ مولانا تبارک علی عمر قید کئے گئے۔ دو چھوٹ گئے۔ باقی کو ضبطی جائیداد کے علاوہ مختلف المیعاد سزا دی گئی۔

دیوبند

- **حاجی امداد اللہ تھانوی (مہاجر مکی)** — ۱۸۵۷ء کے معرکہ میں مطلوب تھے۔ حجاز چلے گئے، وہیں واصل بحق ہوئے۔ مکہ معظمہ میں دفن ہیں۔!
- **رشید احمد گنگوہی** — چھ ماہ قید رہے، والد شہید کر دیئے گئے۔
- **محمد قاسم نانوتوی** — بانی دار العلوم ۱۸۵۷ء کے جہادِ حریت میں مطلوب تھے۔ انگریزوں نے عمر بھر تعاقب کیا۔

شیخ الہند مولانا محمود حسن اسیرِ مالٹا

دار العلوم دیوبند کے سب سے پہلے شاگرد، حضرت نانوتویؒ کے فخرِ روزگار تلمیذ ۱۸۹۱ء میں اپنی ہی درسگاہ کے صدر مدرس ہوگئے۔ انگریزوں کے حکم اور شریف حسین کی غداری سے مالٹا میں چار سال تک قید رکھے گئے۔ ۱۹۲۰ء میں وصال ہوگیا۔ —— اپنی نظر، اپنے علم اور اپنے ایمان سے، اپنے شاگردوں میں انگریز دشمنی کا ایسا بیج بو گئے، کہ علمائے حق کا نوشتہ تقدیر ہوگیا۔

تلامذہ حضرت شیخ الہند

- مولانا انور شاہ — علامہ اقبال کے دینی مشورہ میں استاذ العلماء
- مولانا حسین احمد مدنی — (چودہ سال قید)
- مولانا عبید اللہ سندھی — (۲۲ سالہ جلاوطنی)
- مولانا منصور انصاری — (۲۲ سالہ جلاوطنی)
- مفتی کفایت اللہ — (دس سال قید)
- مولانا شبیر احمد عثمانی — (مفسرِ قرآن، پاکستان کے شیخ الاسلام)
- مولانا احمد علی لاہوری — (متعدد مرتبہ قید ہوئے)

مجاہدہ حریت کی شاخیں

1. مولانا محمد علی جوہر (۸ سال قید)
2. مولانا شوکت علی (۸ سال قید)
3. مولانا حسرت موہانی (۱۲ سال قید)
4. مولانا ابو الکلام آزاد (۱۰ سال قید)
5. مولانا ظفر علی خاں (۱۰ سال قید)

مجلس احرار اسلام

- مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی — ۱۲ سال قید
- چودھری افضل حق — ۸ سال قید
- مولانا مظہر علی اظہر — ۸ سال قید
- تاج الدین انصاری — ۶ سال قید
- مولانا محمد گل شیر شہید — ۲ سال قید، شہادت
- مولانا غلام غوث ہزاروی — ۶ سال قید

- مولانا داؤد غزنوی — ۶ سال قید
- شیخ حسام الدین — ۸ سال قید
- قاضی احسان احمد — ۶ سال قید
- محمد علی جالندھری — ۴ سال
- امیرِ شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ — ۱۰ سال ۲ ماہ

شورش کاشمیری: دس سال چار ماہ

- جانشینِ امیرِ شریعت سید ابو معاویہ ابو ذر بخاری — ۲ سال قید
- سید عطاء المحسن بخاری — ۲ سال قید
- سید عطاء المؤمن بخاری — ۱½ سال قید
- سید عطاء المہیمن بخاری — ۱ سال قید

شورش کاشمیریؒ

شاہ جی کا چہرہ

شاہ جی ان لوگوں میں سے ہیں، جن کی زندگی ماضی میں بسر ہوتی ہے اور جو اپنی متنوع زندگی کے باعث مجموعۂ اضداد ہوتے ہیں۔ ان شخصیتوں کا صحیح تاثر ان کے قرب ہی سے مرتب ہوتا ہے۔

شاہ جی کے چہرے مہرے سے عنان خیال معاً ان یونانی فلسفیوں کی طرف مُڑ جاتی ہے جن کے فکر و نظر کی بہت سی راہیں صدیوں کی شب کاری کے باوجود روشن چلی آتی ہیں اور جن کے تصویری پیراہن، ان شہ دماغوں کی یاد دلاتے ہیں جن کی صورتوں سے ایک ساحرانہ شکوہ کا اظہار ہوتا ہے۔ شاہ جی کا نک سک قرون وسطیٰ کے ان حکماء و فقہا اور علماء و خطبا سے مشابہ تھا جو طلوع تاریخ سے پہلے یونان و روما میں اور طلوع تاریخ کے بعد بغداد و دہلی میں پائے جاتے تھے۔

اتفاق کہئے کہ بعض داعی شخصیتیں آپس میں ایک گونہ مماثلت ضرور رکھتی ہیں، مثلاً فیثا غورث، کارل مارکس، رابندر ناتھ ٹیگور اور شاہ جی میں فکر و نظر، عقیدہ و ایمان اور علم و عمل کی کوئی راہ بھی مشترک نہ تھی لیکن کچھ ایسا بانکپن ضرور تھا کہ ان کا چہرہ مہرہ ہر صفاتی بُعد کے باوجود ایک سا تھا۔ بہرحال یہ ایک شاعرانہ چیز ہے ان بڑوں کی زندگی ایک خاص طرز رکھتی ہے۔ جس سانچے میں بھی ڈھلیں ہمیشہ اُبھرے ہوئے ملیں گے۔ یہ کسی کے نقشِ پا نہیں ڈھونڈھتے بلکہ لوگ ان کے نقشِ پا کی تلاش میں رہتے ہیں۔

شاہ جی کی زندگی جس نہج پر استوار ہوئی اس میں ادب و سیاست کا ایک رومانی امتزاج تھا، ظاہر ہے کہ ایک رومانی زندگی کھُلی کتاب ہوتی ہے۔ اس میں سرے سے ادق عبارتیں ہوتی ہی نہیں، ایسا شخص جذبات پر جیتا اور جذبات پر مرتا ہے۔ اس میں احساس کی شدّت اور استغنا کی شرافت تاحد کمال ہوتی ہے۔ اس کو اس سے غرض نہیں ہوتی کہ اس کے بارے میں کون کیا سوچتا ہے اس کی ذات ہی اس کا پیمانہ ہے۔ وہ گرد و پیش سے متاثر ہوتا اور چاہتا ہے کہ گرد و پیش اس سے متاثر ہوں۔ اس کی روح اس وقت معراج پر ہوتی ہے جب وہ عام چہروں میں اپنا ہی عکس دیکھتا ہے۔

یک چراغ است دریں خانہ کہ از پرتوِ آں
ہر کجا می نگری انجمنے ساختہ اند

مجھے خوشی ہے کہ میں نے شاہ جی کے ساتھ اپنی زندگی کا ایک حصہ بسر کیا ہے ان کی شخصیت ان یونانی فلسفیوں سے ملتی جلتی ہے جن کی تصویریں عجائب خانوں میں عہد عتیق کے انسانی خدوخال پر روشنی ڈالتی ہیں۔

ایک امریکی فلم پروڈیوسر نے ان کی تصویر دیکھ کر کہا تھا۔ ہالی وڈ کے فلم سازوں کو مسیح مقدس کی تصویر کے لئے اس سے بہتر چہرہ نہیں مل سکتا۔

ان کی شخصیت کا سراپا ہندوستانی مسلمانوں کا شاندار ماضی ہے وہ کچھ بھی ہیں ماضی ہی کی گونج ہیں

ہندوستان میں عوامی خطابت کے اعتبار سے اردو زبان نے آج تک اتنا بڑا خطیب پیدا نہیں کیا۔ وہ کہا کرتے ہیں میں لوگوں کی نگاہ سے مضامین چنتا ہوں۔ انہیں دیس دیس کی بولی آتی ہے وہ مقامی بولیوں میں بھی اسی ٹھاٹھ سے تقریر کر سکتے ہیں جو ان کی مابہ الامتیاز خصوصیت ہے انہیں کمال ہے کہ وہ مجمع کی رنگا رنگی کو اکائی میں تبدیل کر لیتے ہیں انہیں ہزاروں شعر ان گنت ضرب الامثال بے شمار محاورے اور سینکڑوں تمثیلات زبانی یاد ہیں وہ ایک عظیم خطیب ایک عظیم انسان اور ایک عظیم بذلہ سنج ہیں ان تینوں کو یکجا کریں تو سید عطاء اللہ شاہ بخاری کا ہیولیٰ تیار ہوتا ہے۔

وہ راس کماری سے لے کر سری نگر تک اور خیبر سے لے کر کلکتہ تک شعلے بکھیرتے پھرے ہیں انہوں نے ایک وقت میں دس دس گھنٹہ تک لوگوں کو اپنی طاقت لسانی سے مسحور کیئے رکھا اور کئی بار چارپائی پر لیٹ کر تقریر کی ہے (علالت کے باعث) وہ کسی نامور مدرسہ کے فارغ التحصیل نہیں لیکن ان کے ہاتھ پر علامہ انور شاہ نور اللہ مرقدہ بیعت ہو چکے ہیں اور بڑی بڑی فضیلتوں نے انہیں خراج ادا کیا ہے

ان کی دل پسند چیزیں دو ہیں آواز خوش اور چہرہ خوش ان کی چال حدی خوانوں کی سی ہے اور ان کا چلن ہر عیب سے خالی وہ سونا نہیں کندن ہیں۔

دراز قامت 'دوہرا بدن' گول چہرہ 'سفید داڑھی' ظالم آنکھیں 'طوفانی لہجہ' کوندے تو بجلی 'کڑکے تو بادل' اٹھے تو آندھی۔

دوستوں کے دوست بلکہ جگری دوست ' دشمنوں کے شریف دشمن ' لیکن مدت کے بچھڑے ہوئے بغلگیر ہوں تو۔ شہید گنج کا ملبہ بھی بھول جاتے ہیں۔ الغرض وہ سمجھنے کی نہیں ' پیار کرنے کی چیز ہیں۔

حیاتِ امیرِ شریعت

تجزیہ و تعارف

جانشین امیر شریعت سید ابو معاویہ ابوذر بخاری

مناقب و سوانح اور تاریخ و سیرت کی اکثر کتب میں متعدد بزرگوں کے متعلق مختلف زاویہ ہائے نگاہ سے لکھنے والوں نے کچھ اس قسم کے فقرات و کلمات لکھے ہیں کہ

فلان نشأ فی بیت علم وّ شعر وّ ادب وّ حکمتہ کان فصیحاً بلیغاً خطیباً مصقعاً، سخیاً جوّاداً، شھیماً شجاعاً، عابداً زاہداً فقیہاً عارفاً، وما سوی ذالک!

اپنا خیال یہ ہے کہ اس عبارت میں اگر کچھ پیوند اور لگا دیئے جائیں اور بایں صورت کہ:

نشأ فی بیت مجدد وّ شرف و کرم نجابتہ و غدی بلبان علم وادب و شعر و حکمۃ وفقاہۃ و معرفتہ۔ کان لبیباً فطیناً، شھماً ذکیا،فصیحاً بلیغاً حافظاً قارئاً، خطیباً مصقعاً، سخیاً جواداً، عابداً زاہداً امیناً عفیفاً، بطلاً شجاعاً، عمیداً زعیماً، فارساً مغواراً فاتحاً منظماً وّسیداً وّمسوداً۔

(فلاں ممدوح نے شرافت اور بزرگی اور خالص حسب و نسب والے گھرانے میں ہوش کی آنکھ کھولی، علم و ادب، شعر و حکمت اور فہم و معرفت کی غذاء سے اس کی پرورش ہوئی۔ وہ عقل و ہوشمند، بلند فطرت اور ذکی الحس، فصیح و بلیغ، حافظ و قاری، خطیب و زباں آور، سخی و صاحب جود و عطاء، عابد و زاہد، امانت دار و پاک دامن، بیباک و بہادر، معتمد و رہنما، شہسوار و یلغار افگن، فاتح و مدبر اور سید و سردار تھا)۔

اس مسلسل مگر مختصر وصف آرائی سے آئندہ سطور میں مذکور ہونے والی ہستی کے لوازم و خصائص کا ایک ہیولیٰ اور خاکہ طیار ہو جائے گا۔ پھر بات بھی سمجھنے اور ماننے کی ہے کہ:

ا۔ جس ذات کو پونے چودہ سو سال کے دہر مدید اور طویل عرصہ میں صرف چھتیس پشتوں کی وساطت سے سید ولد آدم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ نسبتی قرابت اور حسبی وراثت کا تعلق میسر ہو! کہ جن کا نام نامی خود نجابت و کرم اور مجد و شرافت کے لئے سند ہے تو اس کی شرافت و نجابت میں کوئی کلام ہو سکتا ہے؟

جس ذات کو آب و دام کی طرف سے سیدنا علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کی سخن فہمی و نکتہ سنجی فطرۃً ودیعت کی گئی ہو، تعلیم دین اور تہذیب و اخلاق جس کی گھٹی میں پڑے ہوں۔ اور جس کی طبعی نفاست اور ذوق انتخاب کو اہل نظر دنیا میں صرف کبوتر کا حسن و معصومیت، باز کی جرأت و قناعت، گھوڑے کی وفاء و شرافت اور شیر کی حمیت و شجاعت راس آئی ہو اس کی بلند دماغی، علم پروری اور ادب نوازی میں کسی کو شک ہو سکتا ہے؟۔

جس ذات کے فکر عالی اور نگاہ بصیرت کا سکون اور جس کے دل و جان کی راحت انسانی اخلاق کے حسب ذیل عناصر اربعہ میں منحصر ہو جائے۔ یعنی:

بفحوئ قول حسن مجسم صلی اللہ علیہ وسلم

التمسوا الخیر فی حسان الوجوہ۔ (الحدیث)

اچھے چہروں میں بھلائی کی جستجو کرو۔

اولاً اسے حسن صورت مرغوب ہو۔ اور

بمقتضیٰ کلامِ خلقِ مجسم صلی اللہ علیہ وسلم۔

انما بعثت لا تمم مکارم الاخلاق

میں اس لئے بھیجا گیا ہوں کہ باعزت عادات وخصائل کی تکمیل کر دوں۔ (ترمذی)

ثانیاً اسے جمالِ خلق محبوب ہو۔

اور بمفہوم ارشادِ انفس الکائنات ریحانۃ الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم۔

حبب الی الثلث (ومنھا) الطیب (بخاری)

میرے دل میں تین چیزوں کی محبت ڈال دی گئی ہے اور انہیں میں سے ایک خوشبو ہے۔

ثالثاً۔۔۔ اسے شمیم جانفزا مطلوب ہو۔

اور بمطابقت فرمانِ اعدلُ الناس صلی اللہ علیہ وسلم:

من لم یتغن بالقرآن فلیس منا۔ (ابوداؤد)

جو شخص تلاوت قرآن میں حسن صوت وخوش الحانی ملحوظ نہ رکھے۔ وہ ہم سے بے تعلق ہے۔

رابعاً۔۔۔ وہ مزامیر آل داؤد (علیہ السلام) کے نغمۂ موزوں کا مجذوب ہو جیسا کہ اس نے خود زبان نبوت کی ترجمانی کرتے ہوئے ان اوصاف چہار گانہ کو اپنے مندرجۂ ذیل شعری مقولہ میں قلمبند بھی کیا ہے۔

باغ و بہار ماندیم یعنی کہ جنۃ النعیم

تو کیا اس ذات کی موزونیٔ طبع پاکیزگیٔ فطرت اور ذوق شعر وحکمت پروری میں کوئی تردّد و تذبذب ہو سکتا ہے؟۔

جس ذات کو باب الولایت اسد اللہ الغالب سیدنا علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ جو کہ، درج خلافت راشدہ کے چوتھے لولوئے تابدار ہیں، ریحانۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم، سید الامت سیدنا حسن بن علی رضی اللہ عنہ کو جن کے صدقہ میں امت مرحومہ قتل و غارت سے مامون ہوئی۔ نیز صلح و عافیت اور امن و راحت سے فیضیاب ہوئی۔ سید الاولیاء سید عبدالقادر جیلانی قدس اللہ سرہ، کہ جن کے دم سے دنیائے ولایت و قطبیت میں بہار تازہ آئی اور عالم کشف و کرامت و مجاہدہ کی رونق دوبالا ہوئی۔ مقبول بارگاہ ایزدی، مستجاب الدعوات، قطب کامل و ولی عصر سید محمد بخاری رحمۃ اللہ کہ جن کی دعاء مقبول اور توجہ باطنی کے طفیل سلطان مراد خان ثانی مرحوم کے ہاتھوں خدام الحرمین ترکان احرار کی ڈوبتی ہوئی کشتی ساحل مراد تک پہنچی۔ شیخ الاسلام قاضی القضاۃ سید عبدالغفار بخاری رحمہ اللہ کہ جن کے وجود کی برکت اور تاثیر علم و عمل سے سلطان زین العابدین مرحوم والیٔ کشمیر کے عہد میں ریاست اور اس کے نواح و مضافات تک قانون الٰہیٰ کا سکہ جما اور اسلامی حکومت کا پرچم لہرایا۔ مومن

کامل، مرد مجاہد، مہاجر الی اللہ والرسول سید اکمل الدین محمد بخاری رحمہ اللہ کہ جنہیں خاندان نقشبندیہ کے نامور بزرگ حضرت شاہ غلام علی دہلوی قدس سرہ کے آستانہ سے صرف چند دنوں کی مصاحبت پر خرقۂ خلافت و پروانۂ بیعت وارشاد عطاء ہوا۔ اور وہ رنجیت سنگھ کے عہد میں اپنے مجاہدانہ عزم و سیرت اور مومنانہ فراست و تدبر کے باعث شہرہ آفاق رہے۔ ولی کامل صاحب الجلالت سید نور الدین بخاری رحمہ اللہ جو تلاش مرشد میں حضرت خواجہ شمس الدین سیالوی قدس سرہ کی خدمت میں چلے تو شیخ کامل پر بذریعہ کشف اس مرید باصفاء اور طالبِ صادق کی جلالت قدر و عظمت شان منکشف ہوئی اور خانقاہ میں داخل ہونے سے پہلے ہی حضرت خواجہ تعظیماً و استقبالاً سروقد ہو گئے۔ اور خادم خاص بھیج کر سید مرحوم کو خانقاہ میں بصد احترام بلوایا۔ اور بیعت کے چند روز بعد پروانۂ خلافت اور سند بیعت و ارشاد عطاء کر کے رخصت کیا۔ زہد مجسم واصل باللہ ولی وقت حضرت حافظ سید ضیاء الدین بخاری رحمہ اللہ کہ جن کی ساری زندگی زہد و ورع، عبادت و تقویٰ، صبر و عزیمت، ضبط و مجاہدہ، اور کفایت و قناعت کی فقیرانہ شان میں بسر ہو گئی۔ ان اکابر رجال سے نسباً و مشرباً ابنیّت و ولدیت حقیقیہ کی نسبت حاصل ہو۔ مزید برآں عالم باعمل جامع شریعت و طریقت حضرت پیر سید مہر علی شاہ گولڑوی رحمتہ اللہ علیہ سے نسبت بیعت و سلوک حاصل ہو۔ اور امام العارفین، مرجع العلماء والصلحاء الشیخ عبد القادر رائے پوری رحمتہ اللہ علیہ کے ساتھ نسبت بیعت و سلوک اور رابطۂ خلافت و مجازیت نصیب ہو۔ یعنی جو سب بزرگوں کی مختلف نسبتوں کے طفیل حسنیہ، قادریہ، سہروردیہ اور نقشبندیہ کے تمام خانوادوں کے فیوض و برکات کا مجمع و مظہر ہو۔ کیا دریائے علم و معرفت میں اس کی پیراکی و شناوری اور مدارج ولایت و سلوک سے اس کی آگاہی و آشنائی میں کوئی قدح کی جا سکتی ہے؟

جس ذات کی والد ماجد مرحوم جیسے مربی کامل کی زیر نگرانی، عالم طفولیت میں مرحلہ تکلم تک پہنچنے پر قل ھواللہ احد کی صدا سے شہادت توحید اور اعلانِ حقیقت کبریٰ کے ساتھ زبان کھلوائی گئی ہو۔ اور عدم بلوغ کی حالت میں ہی جس کا سینہ حفظ کلام اللہ کا امانت دار ہو گیا۔ اور جس کے کام و دہن، حسن تلاوت و قرأت داؤدی کے مناد بن گئے ہوں۔ پھر جس نے طلب علم الٰہیٰ کی راہ میں مبادی و مقدمات کے طور پر اردو اور فارسی نظم و نثر اور انشاء و ادب کی چوٹی کی کتب شرح صدر کے ساتھ از خود حل کر لی ہوں اور اساتذہ کرام کی ذات جس کے لئے محض وسیلہ کا درجہ رکھتی ہو۔ اور علوم خادمہ، یعنی منطق و فلسفہ، صرف و نحو، فقہ و اصول، اور حدیث و تفسیر میں جس نے محنت اور جدوجہد کے بغیر عبارت و معنی کا حقیقی ربط، چند دنوں کے اندر اندر معلوم کر کے اساتذہ و اکابر کی مخلصانہ و والہانہ دعاؤں کا قابلِ قدر انعام پایا ہو۔ پھر بفحوائے قول معلم انسانیت وآقائے کائنات صلی اللہ علیہ وسلم

من یرد اللہ بہ خیراً یفقھہ فی الدین (مشکوٰۃ)

خدا جس کے ساتھ بھلائی کا ارادہ کر لے اسے دین میں سمجھ عطاء کر دیتا ہے۔

نیز

خیر کم من تعلم القرآن وعلمہ۔ (الحدیث)

تم میں بہتر انسان وہ ہے جو علمِ قرآن حاصل کرے اور پھر اس کا علم عام کرے۔

جس نے اولاً اپنی زندگی کتاب اللہ کی صوری و معنوی اقتداء و اطاعت میں ڈھالی اور پھر مدراس سے لے کر ہنگو، اور شملہ کی چوٹیوں سے لے کر بمبئی کے حال تک لاکھ نہیں کروڑوں انسانوں کو قرآن خوانی، قرآن فہمی، قرآن دانی اور مطالبات قرآنی پر ایثار و قربانی کا سبق دیتے ہوئے مؤمنانہ فراست و جرأت اور مجاہدانہ عزم و تدبر کے ساتھ بسر کر ڈالی ہو۔ اور جسے وقت کے علماء ظاہر و باطن نے ماہر اسرار کلام اللہ کا لقب دے کر اس کے علم و عمل بالقرآن کی صحیح داد دی ہو۔ کیا اس کی فقاہت فی الدین اور اس کے سر پر آسمانی خیر و برکت کے سایہ فگن ہونے میں کوئی تاویل کی جاسکتی ہے؟۔

جس ذات کو عقلِ سلیم و دینی بصیرت نے اثناء تعلیم و تعلم میں ہی ذاتی ماحول سے لے کر شہری و قومی زندگی تک ہر گوشہ کی اصلاح کے لئے آمادہ و مستعد کر دیا ہو اور اس نے موت و حیات، شادی و غمی، تعلیم و تربیت، تہذیب و تمدن، معاشرت و اخلاق، تجارت و اقتصاد، اور سیاست و حکومت جیسے اہم ترین موضوعات پر چند سال میں سینکڑوں مواعظ و خطبات و تقاریر کے ذریعہ تبلیغ عقائد حقہ، تنقید رسوم قبیحہ، احقاق حق اور ابطال باطل کا فریضہ باحسن وجوہ اداء کیا۔ اور ہر کہ ومہ اور عامیٔ و عالم کو اعتراف حقیقت پر مجبور کر دیا ہو۔ جس کی مصلحانہ روش اور تجدیدی کارروائی نے لاکھوں انسانوں کی زندگی کا رخ اوہام و رسوم، جاہلیت، فرنگیت، بداخلاقی و بد تہذیبی، اقتصادی بدحالی و سیاسی یتیمی پر قناعت کئے رہنے کے بجائے حکومت و آزادی طلبی، وطن و ملت کی خود مختاری، فرنگ دشمنی و تردید جاہلیت، حسن معاشرت و تہذیب اخلاق، اعلانِ توحید و ختم نبوت اور فی الجملہ شریعت اسلامیہ کے غلبہ و اقتدار کی جدوجہد کی طرف موڑ دیا ہو۔ اور جس کی تاثیر قول و عمل سے ملک میں ایک مستقل جماعت و تحریک "حُریتِ اسلامیہ" کی داغ بیل پڑ کر ملک و ملت کی اہم ترین خدمات بجا لانے کا ناقابل فراموش تاریخی و انقلابی کارنامہ سرانجام پا چکا ہو کیا اس ذات کی ذہانت و طباعی، عقل و فراست اور ملک و ملت کی صحیح نباضی کا اعتراف و اقرار کئے بغیر کوئی چارہ کار ہو سکتا ہے؟

جس ذات کو قدرت علی الکلام، طلاقت لسانی، زبان آوری و ہفت زبانی کا جوہر فطرت میں ودیعت کیا گیا ہو۔ انتخاب موضوعات و مضامین اور تبدیلیٔ اسلوب و طریقِ بیان میں وہ فرد ہو۔ ساحرانہ تاثیر و نفوذ، جذبات آفرینی اور انقلاب انگیزی جس کی خطابت کا زیور ہو۔ تنقیدِ اعتراضات و تردید خرافات، اثبات معتقدات و تطبیق واقعات، نیز آیات و احادیث سے استدلال اور اشعار و محاورات سے استشہاد میں جس کو مہارت تامہ حاصل ہو۔ مزاح و تفنن اور طنز و ہجو ملیح سے تزئین کلام میں جس کو درجہ کمال حاصل ہو۔ زیر بحث موضوع سے فنکارانہ گریز اور مقصود خطاب کی طرف ماہرانہ رجوع میں جسے ید طولیٰ حاصل ہو۔ عوام و خواص کے دل و دماغ کو آنسوؤں کی روانی اور قہقہوں کی پرواز کے درمیان اعترافِ حق وانکار باطل کی وادی میں لاکھڑا کرنا اور اصحاب و احباب اور اکابر کی دعاؤں کے جھرمٹ میں اغیار و اعداء پر صرف تیغ زباں کے سہارے چھا جانا اس کے مقدر میں لکھا گیا ہو۔ جس کی مبلغانہ و متکلمانہ اوصاف گرامی سے مزین و مجلّی شخصیت کا اس نصف صدی میں ابھرنے

والے ہر ذی استعداد مقرر اور فنکار خطیب نے بارہا اعتراف کیا ہو۔ چنانچہ:

مولانا محمد علی جوہر مرحوم نے ایک دفعہ بے قابو ہو کر دفتر زمیندار لاہور میں خود ممدوح موصوف کے روبرو یہ کہا: "بخاری! تو نے لوگوں کو اپنی تقریروں کا جو پلاؤ قورمہ کھلا کھلا کر ان کا دماغ خراب کر دیا ہے۔ ارے ظالم! اس کے بعد ہمارے ساگ ستو کو کون پوچھے گا؟" اور اس کے بعد فرط جذبات میں اٹھ کر پیشانی چوم لی۔ پھر جب سیاسی اختلاف بڑھ گئے تو غالباً "ہمدرد" میں یہ انتباہ کر کے "ایک مشورہ" بھی قوم کو دیا کہ:

"یہ شخص جادو گر ہے۔ اسے تقریر کی اجازت نہیں دینی چاہیے۔ اس کا وجود بڑا خطرناک ہے۔ کیونکہ لوگ اس کی تقریر سے مسحور و مبہوت ہو جاتے ہیں۔ اگر یہ چاہے تو انہیں اچھائی کے بجائے کسی غلط کام پر بھی آسانی سے آمادہ کر سکتا ہے۔ میرا بس چلے تو میں اسے کبھی تقریر نہ کرنے دوں"۔ اور یہ جذبات ہی گواہ ہیں کہ جوہر کا یہ رشک آمیز قول حریفانہ معاصریت اور رقیبانہ چشمک کا کس قدر صحیح آئینہ دار ہے؟۔

مولانا ابوالکلام آزاد نے تحریک خلافت میں بھی ممدوح شخصیت کی نمایاں خدمات کا اعتراف کیا پھر اپنی بیعت امامت جہاد کے وقت جامع عالمگیری (بادشاہی مسجد) لاہور میں اس مبلغ اعظم اور خطیب امت کی قادر الکلامی و جادو بیانی اور عوامی جذبات و میلانات پر ضبط و توازن کا پہرہ بٹھا دینے کا نظارہ دیکھا۔ اور ایک مدت بعد ۱۳۶۵ھ، ۱۹۴۶ء میں وزارتی مشن کی آمد پر رجعت پسند افراد و ادارات کے خلاف اور قوم پرور و آزادی خواہ عناصر کی ترجمانی کرتے ہوئے دہلی کے ایک بے مثال کے آخری اجتماع میں اس کے حسنِ اداء کی تعریف کی۔ نیز اس کے دینی و قومی شعور اور سیاسی تجزیہ پر تحسین و تصویب کرتے ہوئے یہ الفاظ کہے کہ:

"میرے بھائی آپ کے اس بیان اور اس خدمت پر ملک و ملت کا ہر گوشہ خوش اور شکر گزار ہے"۔

اور یہ کلمات ابوالکلام جیسی شخصیت کی طرف سے کسی انسان کے لئے اس کی کسی خوبی کا بہت بڑا اعتراف اور گراں قدر ہدیۂ تشکر و تحسین ہے۔

مولانا اشرف علی تھانوی مرحوم نے ان کے سریع النفوذ مواعظ، مؤثر و جذبات آفریں تقاریر، اور شعلہ بار خطبات کا غلغلہ سنا تو احباب و متوسلین کے روبرو خانقاہ کی ایک مجلس علم و عرفان میں حضرت الاستاد مولانا خیر محمد جالندھری رحمہ اللہ کی شہادت کے مطابق اپنے خاص انداز میں فرمایا کہ: "بھائی عطاء اللہ شاہ صاحب کی کیا بات کرتے ہو۔ ان کی باتیں تو عطاء اللّٰہی ہوتی ہیں"۔

نواب بہادر یار جنگ مرحوم نے ان کا شہرۂ خطابت سنا اور اس کے اثرات محسوس کئے تو یارانِ محفل اور رازدارانِ حقیقت کے سامنے متعدد بار تحسین و آفرین کے پھول نچھاور کئے اور ایک دفعہ بے اختیار ہو کر ایک خاص دوست سے یہ کہہ ڈالا کہ:

"اے کاش! میں اس شخص کو مسلم لیگ میں لا سکتا؟ اگر یہ میرے ساتھ ہو تو چھ ماہ کے اندر اندر ملک میں انقلاب برپا کر دوں"!

مولانا شبیر احمد عثمانی مرحوم ایک دفعہ حضرت ممدوح کی سخت علالت پر دہلی میں بغرض عیادت و مزاج پرسی ان کی قیام گاہ پر پہنچے اور حالت غیر دیکھی تو اظہار و افسوس کرتے ہوئے فرش پر بیٹھ کر ان کی تقریر

وخطابت کے ذریعہ انجام دی ہوئی خدمات کی اہمیت بیان کی اور آئندہ کے لئے ان کی ضرورت پر حسب ذیل تبصرہ کیا کہ:

"شاہ جی! آپ تو بہت کمزور ہو گئے! میں تو سمجھا تھا کہ معمولی تکلیف ہے۔ مجھے کیا خبر تھی کہ تم اس حالت کو پہنچ گئے ہو۔ شاہ جی! تم کسی ایک کے نہیں۔ تم تو سب کے ہو۔ تمہیں اس حال میں دیکھ کر مجھے بڑا دکھ ہوا ہے۔ تم نے پہلے بھی بڑا کام کیا۔ اور ابھی تمہیں بہت کچھ کرنا ہے۔ شاہ جی۔ اپنی صحت کا بہت خیال کرو۔ تم اپنے اس وجود کو اپنا نہ سمجھو۔ یہ تمہارا نہیں کسی کی امانت ہے۔ شاہ جی! تم تو اسلام کی مشین ہو۔ تمہاری ابھی بہت ضرورت ہے۔ قاری محمد طیب قاسمی رحمہ اللہ نے راقم السطور کے نام ایک ذاتی مکتوب تحریر فرمایا تو ضمناً میری ادبی تحریک کو سراہتے ہوئے شہادت واقعہ کے طور پر یہ کلمات بھی سپرد قلم کئے کہ:

"حق تعالیٰ کا شکر ہے کہ جس افادیت کو ہمارے محترم بزرگ حضرت شاہ صاحب نے تبلیغی رنگ میں قائم کیا اور ایک "بے مثال خطابت" کے ذریعہ دنیا کو فائدہ پہنچایا۔ آپ نے بھی الولد سرہ لابیہ (بیٹا اپنے باپ کی رمز اور بھید ہوتا ہے) کے مطابق اسے قائم ہی نہیں رکھا بلکہ پائیدار بنانے کی جدوجہد کی:

فکلم اتی مائنی ابیہ-------- فکل فعال کلکم عجاب!

(تم سب اپنے باپ دادا کی جگہ پر ہی آئے ہو اور تم سب کے سبھی کام خوش کن اور حیرت انگیز ہیں!)
الغرض یہ تمام اقوال اس صدی کے سر بر آوردہ مقررین اور اس برعظیم کے آئمہ خطابت کی پراثر نفسیاتی واردات و کیفیات کا خاکہ اور ان کے جذبات و احساسات کی غیر اختیاری تعبیرات کا آئینہ ہیں۔ نیز مذکورہ ہستی کے حق میں تحسین آشنا اور کلام سخن شناس کا مصداق ہیں اور بتقاضئے قول شاعر:

ومليحہ شهدت بهاضراتها

والفضل ماشهدت بہ الاعداء

(وہ حسنِ ملیح کا مرقع محبوب کہ جس کے کمال خوبی پر اس کے رقیب بھی گواہی دیں۔ ممتاز جہاں وہی ہے اور فضیلت اسی کو حاصل ہے) کیونکہ:

وبضدهاتتبين الاشياءُ

اشیاء کا حسن و قبح اپنی ضد اور مد مقابل سے ہی خوب روشن ہوتا ہے۔

جس کے متعلق بلامبالغہ کہا گیا، کہا جاتا ہے اور کہا جائے گا کہ جس طرح امام الہند مولانا ابوالکلام آزاد علمی تحریر و تقریر کے بادشاہ ہیں؟ ویسے ہی حضرت امیر شریعت رحمتہ اللہ علیہ بھی عوامی خطابت و تحریر کے امام و امیر ہیں۔ نیز لسانی و قومی خصوصیات کے اعتبار سے ایشیاء اور اپنی نوعیت و حیثیت کے لحاظ سے دنیا کے بے مثال مقرر و خطیب ہیں۔ جن کی زباں آوری، فی الواقعہ بھی اس دور میں "سحبانِ وائل" کی بلاتکرار و مسلسل تقاریر اور علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کے جلال آمیز و پرشکوہ خطبات کی صدائے بازگشت ہے۔ اور جن کی خطابت طربیہ و حزنیہ، موعظہ و عبرت تبلیغ و اصلاح، اور تجدید و انقلاب غرضیکہ کلام کے ہر پہلو کا سلیس و رواں، حسین و شگفتہ اور موقر و نتیجہ خیز نمونہ کہی جا سکتی ہے۔ حتیٰ کہ اسے مذکورہ آثار و شواہد کی روشنی میں اگر میدان وغاء میں

عرب شہسواروں کی ٹکراتی ہوئی تلواروں کی جھنکار، لپکتے ہوئے نیزوں اور لپکتے ہوئے تیروں کی سنسناہٹ سے تشبیہ دی جائے، یا صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے عسکری قافلوں کے حدی گو اور رجز خوانوں کے نغمہ موزوں سے استعارہ کیا جائے تو خلاف حقیقت نہ ہوگا۔ کیا پھر ایسی شخصیت کے جوہر فصاحت و بلاغت اور قوتِ کلام و خطابت کے متعلق مذکورہ تشبیہ و استعارہ میں کوئی لفظی یا معنوی قدغن لگایا جاسکتا ہے؟

جس ذات کے حسنِ قرأت کی جاذبیت اور موزونی تلاوت کی دلبستگی کا یہ عالم ہو کہ اہلِ اسلام اسے نزولِ وحی کی کیفیت سے مشابہ کہیں۔ غیر مسلم اس کو محض اس لئے سنیں کہ وہ دماغی سکون کا باعث اور قلبی وجد و سرور کی ضامن ہے۔ اور مسلم و غیر مسلم بلاتفریق دین و ملت ہزاروں لاکھوں کی تعداد میں جس شخص سے لحن داؤدی اور حسین قرأت کے جلو میں صرف اس مقصد کے لئے کلام الہیٰ سننے کو بے تاب رہتے ہوں۔ کہ اس کی تشریح و بیان میں فکر و عقل کے لئے ایک قابل غور و تدبر دعوت پوشیدہ ہے۔ اور ایک قابل عمل و باعث نجات و مغفرت پیغام مضمر ہے۔ جس کی تلاوت قرآن و بیانِ تفسیر کے طفیل لاکھوں مسلمانوں کے عقائد و اخلاق اور اعمال میں ایک خوشگوار تغیر پیدا ہوا۔ سینکڑوں ہندوؤں، سکھوں اور مسلمانوں کی زندگی میں ایک باطنی انقلاب برپا ہوا اور انہیں کلمہ ہدایت و دعوت اسلام قبول کرنے کی سعادت نصیب ہوئی۔ تو کیا ایسے حاملِ کتاب الہیٰ کی سکوں پرور تلاوت اور مؤثر بیان و تفسیر کی نفع بخشیوں اور خیر آفرینیوں میں کسی احتمال کی گنجائش ہو سکتی ہے؟

جس ذات کو جذبہ ایثار و سخاء وراثت میں ملے اور اس کا اپنا عمل انفرادی طور پر انفاق فی سبیل اللہ کی مختلف صورتوں میں یہاں تک پہنچ چکا ہو کہ وقت آنے پر وہ تن کے کپڑے بھی اتار کر صحیح ضرورت مند کی ستر پوشی کر ڈالے اور اجتماعی نقطۂ نظر سے دنیا میں سب سے زیادہ عزیز شئے "جان" کو دینی و ملی جہاد میں قید و بند اور دار و رسن کی سختیاں جھیلنے کے لئے خدا کے سپرد کر دے۔ اور عمر کا ایک گراں قدر حصہ سنت یوسفیہ علی نبینا و علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والتحیہ کی پیروی کے لئے وقف کر ڈالے۔ غرض جس نے نہ افراد کے سوال و طلب پر انہیں کبھی خالی ہاتھ لوٹایا اور نہ دین و ملت کی اجتماعی پکار پر ہی کبھی اپنے جان و مال اور وقت کی قربانی سے دریغ و انحراف کیا ہو! بلکہ ہمیشہ السابقون الاولون کی صف میں کھڑے ہو کر احباب و اغیار کے لئے ایک اسوہ اور مثال قائم کی۔ اور زمانہ تاریخ جس کے وصف و کردار کے لئے اٹل گواہ ہوں۔ تو کیا اس شخصیت کے انفرادی جذبہ جود و سخا اور اجتماعی ولولہ ایثار و قربانی پر کوئی انگشت نمائی کی جاسکتی ہے؟

جس ذات نے بچپن کی معصوم ساعتوں سے لے کر جوانی کی پرخطر راہوں تک سفر رشد و صلاحیت اور سعادت و فیروزمندی کے ساتھ طے کیا۔ اور آباؤ اجداد کی سنت قدیمہ اور اکابر و مشائخ کے وطیرہ دائمی کے مطابق توجہ الی اللہ، ذکر و مراقبہ، اداء فرائض و نوافل، قرآن خوانی، تہجد گزاری و شب زندہ داری کے لئے پابند دستور ہو کر چلہ کشی کی۔ حتیٰ کہ صوم وصال رکھ کر متواتر دو سال تک روزانہ چھ گھنٹے میں قرآن کریم ختم کیا ہو اور جس کے اپنے قول کے مطابق کہ:

"ستاروں سے میں نے بازی لگا رکھی تھی۔ پھر یہ کبھی نہیں ہوا کہ ستارہ پہلے طلوع ہو اور میں پیچھے

جاگوں۔ میں نے ہمیشہ اس کو شکست دی، ہمیشہ پہلے اٹھا اور معمولات پورے کئے۔ پھر خدا کی جو جو رحمتیں نازل ہوئیں ان کا کیا ٹھکانا ہے۔ لطائف کھل گئے۔ میں فضاؤں میں پرواز کرتا۔ اور ارواح قدسیہ سے ہمکلامی کی کیفیت محسوس کرتا تھا۔ روح کا تو یہ حال تھا، لیکن جسم کی یہ کیفیت تھی کہ شب و روز جو کے ستو میں طرف نمک اور پانی ملا کر یا تنور کی پکی ہوئی خشک روٹی کے خستہ ٹکڑے کھاتے رہنے سے میں سوکھ کر کانٹا ہو گیا تھا"۔

اپنے خالق و معبود کے ساتھ عبدیت و مخلوقیت کا جس شخص نے ایسا رشتہ قائم کرلیا ہو، اس کی زہد پروری اور عبادت گزاری میں کوئی شبہ کیا جاسکتا ہے؟

جس کی ذات کا عہد طفولیت قانون فطرت کی ودیعت کردہ معصومیت کے باوجود بشری اقتضاء سے پیدا ہونے والی شوخیوں اور تندیوں سے بھی خالی گزرے، بلوغت کا دور طلب علم و فضل کسب معیشت کے لئے سفر و محنت اور تکمیل سیرت کے لئے مجاہدہ و مراقبہ کی وادیاں عبور کرتے ہوئے بسر ہو، پھر صحت و توانائی کا مرقع شباب تازہ، اور غضب کی محبوب و دلفریب اور قابلِ رشک جوانی کا آزمائشی زمانہ، درون خانہ اور بیرون در، احباب و اغیار اور معاصرین و اکابر کی شہادت کے ساتھ ساتھ اس کے اپنے قول کے مطابق یوں بیت جائے کہ:

"دنیا میں تین چیزیں حقوق العباد کی بنیاد ہیں۔ جان، مال، آبرو۔ اور ان تینوں کے متعلق (علی الترتیب) دنیا میں کوئی شخص اس بات کا دعویٰ نہیں کر سکتا کہ میرے ہاتھ سے اس کو کوئی آزار پہنچا ہو۔ ہتھیار تو خیر بڑی چیز ہے۔ میں نے آج تک کسی شخص کو ایک تھپڑ بھی نہیں مارا۔ رہا مال، سو اس کے متعلق بھی کوئی شخص یہ دعویٰ نہیں کر سکتا کہ میں نے اس کا روپیہ پیسہ غصب کیا ہو یا امانت میں خیانت کی ہو۔ یا لے کر واپس نہ کیا ہو اگرچہ یہ تو ہوا ہے کہ میں نے کچھ دے کر واپس نہیں لیا۔ اور اب بھی اگر دنیا داروں کی طرح سوچوں تو ہزاروں نہ سہی دو چار سو کی معمولی رقم کسی نہ کسی کے ذمہ نکل ہی آئے گی۔ خود میں فقیر ہوں۔ میرے پاس تو کیا ہو گا۔ البتہ آج سے نہیں ہمیشہ سے ہی لوگوں کے روپے پیسے اور جماعتی امانتوں کا بحمد اللہ کفیل اور محافظ رہا ہوں۔ اور کہہ سکتا ہوں کہ "انی لقوی" امین! سب سے آخری اور سب سے زیادہ نازک چیز انسان کی عزت و آبرو ہوتی ہے۔ الحمدللہ! کہ آج تک میری آنکھ میلی نہیں ہوئی۔ اور دنیا میں کسی کی ماں بہن یا بہو بیٹی کی عزت آبرو کو میری ذات سے گزند نہیں پہنچا۔ حالانکہ جہاں میں جوان ہوا وہاں شب و روز لوگوں کے ننگ و ناموس سے میرا واسطہ تھا۔ لیکن ان کو ہمیشہ ماں، بہن اور بیٹی ہی سمجھا۔ کہا اور بنا کے رکھا۔ الحمدللہ کہ اس وقت ملک بھر میں میری ہزاروں مائیں بہنیں اور لاکھوں بہو بیٹیاں ہیں اور میں اپنی اولاد کے علاوہ ہزاروں بھانجوں بھتیجوں، نواسوں اور پوتوں والا ہوں۔ اور اس میں میری کوئی خوبی نہیں۔ میں یہ نہیں کہتا کہ میں متقی اور پارسا تھا، یا ہوں بلکہ سیدھی سادی بات یہ ہے کہ مجھے اپنے باپ دادا کی عزت کا پاس تھا۔ اور ہے۔ مجھے تو ان کی پگڑی کی لاج رکھنی تھی۔ تاکہ یہ نہ کہا جائے کہ خاندان سادات بخارا کا لڑکا سید نورالدین کا پوتا، اور حافظ سید ضیاء الدین کا بیٹا ایسا ویسا نکلا۔ اور اس کے بدلہ میں نیکوں کا یہ گھرانا بدنام ہوا۔ باقی اللہ کا خوف تو بڑی بات ہے اور خوش قسمت ہے وہ جسے یہ چیز حاصل ہو۔ سو الحمدللہ کہ اس بارہ میں انگلی سے غیر

محرم کو چھونے، اور نگاہ تک غلط نہ ہونے کی بھی قسم کھا سکتا ہوں۔

وذالک فضل اللہ یوتیہ من یشاء واللہ ذوالفضل العظیم"۔

جس شخص کے حق میں یہ عظیم الشان، نادرالوجود، اور مثالی کریکٹر، زبان حال سے گواہی دے اور فضل خداوندی اس انداز میں اس کا شامل حال رہے، کیا اس ذات کی امانت و دیانت اور عفت و اخلاقی پاکیزگی پر کوئی حرف آسکتا ہے؟

جس ذات نے ذاتی آزمائشوں اور قومی و دینی ابتلاء آت میں کبھی جی نہ ہارا حتیٰ کہ گھر بار، اہل و عیال، آرام و راحت اور جان تک کو مقصد پر ترجیح دی، خدا کی راہ میں تمام رکاوٹوں کو خواہ وہ ابناء وقت، غداران ملک وملت، اجیران فرنگ، اور دشمنان خدا و رسول ﷺ اشخاص کی صورت میں پیش آئیں یا شیطان کے پھیلائے ہوئے دام تزویر و تلبیس یعنی سیاست فرنگ کی قلابازیوں اور دسیسہ کاریوں کی شکل میں جس ذات نے کبھی پرکاہ کے برابر وقعت نہ دی۔ بلکہ ہمیشہ نام و شہرت جاہ و مرتبہ اور مال و زر کے پجاریوں اور اخوان الشیاطین، کی حیلہ بازیوں کے علی الرّغم، مؤمنانہ خلوص و فراست، مجاہدانہ سادگی اور صبر و حوصلہ کے باطنی اسلحہ اور وسائل استعمال کئے اور محض فضل خداوندی اور ارواح انبیاء و صلحاء رضوان اللہ علیہم اجمعین، کی تائید اور مشائخ و اولیاء رحمھم اللہ کی دعاؤں کے روحانی سہارے پر ہر دینی تحریک اور قومی مہم میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ ہر ملکی مصیبت میں انفرادی اور جماعتی مخالفتوں کے طوفان بد تمیزی کی سینے پر ٹکر لی۔ اپنوں اور بیگانوں کی جہالتوں اور حماقتوں کا تذلیل و انتقام کے بجائے تبلیغ و اصلاح اور عفوو درگزر سے جواب دیا۔ اور اپنی اس روش میں ہمیشہ مصلحانہ اخلاق اور پیغمبرانہ اسوہ کو مشعلِ راہ بنایا ہو۔ تو کیا اس ذات کی ظاہری و بطولت و جوانمردی اور روحانی بسالت و شجاعت پر کوئی طعن کیا جاسکتا ہے؟

جس ذات کو ہر مجلس اور اجتماع میں ذاتی صلاحیت اور قومی عزم و استعداد کی بناء پر ہمیشہ قدر و منزلت، اور عقیدت وارادت کی نگاہ سے دیکھا اور سر آنکھ پر بٹھایا گیا ہو۔ جسے ہر ادارہ اور جماعت نے جس میں اسے کسی بھی حیثیت سے شریک و دخیل ہونے کا موقع ملا ہو۔ توقع اور آرزو کو التجاء کے رنگ میں لاکر اعزاز عہدہ کی پیشکش کی ہو۔ لیکن اس فقر و استغناء کے دھنی اور دنیاوی شہرت و منزلت سے ہمیشہ نفور و کنارہ کش رہنے والے شخص نے جسے ہمیشہ ٹھکرایا اور اپنے سے بدرجہا کمتر لوگوں کو محض اخلاص و ایثار اطاعت کیشی، مقام و فرض شناسی اور ہمت افزائی کے نقطۂ نظر سے آگے بڑھایا، بلکہ اپنی زبان اور توجہ سے اسے پروان چڑھایا اور اس عمل کو بھی اپنی تحسین و تعریف کا سامان اور حیلہ نہ بنایا۔ پھر ان سب باتوں کے باوجود جس کا وجود گرامی ہر میں حل طلب دماغوں اور متجسس استفسار آمیز نگاہوں کا مرکز بنا رہتا ہو، جس کے اقوال و ارشادات ابتداءً صدائے درویش یا نداء مجذوب سمجھے گئے اور انجام کار کا واقعات و حقائق کی صورت میں الہامی جواب قرار دیئے گئے اور اب بھی ان کے متعلق یہی عقیدہ ہزاروں نہیں لاکھوں نیاز مندوں کے دل و دماغ پر حاوی اور محیط ہو کر اس کی باتیں جذبات و تصورات کے بجائے وجدان و بصیرت کی عکاس ہوتی ہیں اور اس کے اپنے قول کے مطابق کہ:

"بھائی! ہم لوگ آندھی بن کر اٹھے اور بادل بن کر برس گئے۔ ہمتیں اور کام کی دھن لے کر چلے لیکن اخلاص کے ساتھ اور اس خیال سے کہ ہمیں کام کرنا ہے نام نہیں چاہیئے۔ ہمیں معلوم ہے کہ ملک کی تمام جماعتوں اور انکے لیڈروں اور کارکنوں کا آپس میں کیا تعلق ہے؟ اور پھر ان کے آغاز و انجام کا حال بھی معلوم ہے۔ اور ہم فقیروں کی ٹولی کا حال ساری دنیا جانتی ہے۔ لوگ تعجب اور حیرت سے پوچھا کرتے ہیں کہ یہ آپس میں کبھی بھی نہیں لڑتے۔ آخر اس کی کیا وجہ ہے؟ اگر موقع ہو تو بتاؤں کہ یہی ایک بات راز کی ہے، ورنہ ہمارا تمام زندگی میں کوئی راز تھا۔ نہ ہے نہ ہو گا۔ کہ ہم جمع ہوئے تو قوم و ملک اور دین کے لئے نہ محض عہدوں اور وزارتوں کے لئے نہ مال و دولت اور شہرت و ناموری کے لئے، ورنہ اس حساب سے ہم میں بہت سے ساتھی کھاتے پیتے گھرانوں سے تعلق رکھتے تھے۔ کئی زمیندار اور رئیسانہ شان کے آدمی تھے۔ اور مختلف قسم کی دنیاوی قابلیتوں کے مالک تھے۔ اور کئی دینی علم اور نیکی میں ایک دوسرے سے بڑھ کر تھے۔ لہٰذا اس میں کسی سے بڑھ جانے یا کسی پر حسد و رقابت کی نوبت ہی نہیں آسکتی تھی۔ بس بات ایک ہی تھی اور وہ یہ کہ کام کیا جائے جس سے جماعت کا بھلا ہو۔ قوم اور ملک کا بھلا ہو۔ چھوٹے آگے آئیں اور بڑے تدریجاً پیچھے ہٹیں اور صرف رہنمائی کریں۔ کوئی مسئلہ درپیش ہو تو مشورہ دیں اور عملی طور پر ہاتھ بٹائیں۔ اور مرنے کا وقت آئے تو سب کارکنوں اور رضاکاروں سے آگے ہوں تاکہ محض لیڈری نہ رہے۔ آخر جنہیں لوگوں کی اولاد کا خیال نہ رہے وہ اپنی اولاد کے لئے کب مخلص ہوسکتے ہیں۔ ہمیں آج کل کے خود غرض سیاسی لیڈروں کی طرح منہ پر تعریف اور درپردہ سازشیں کرنے کا ڈھنگ ہی نہیں آیا (اور خدا کی لعنت ہو ایسی منافقانہ رفاقت پر) ہم نے کبھی ایک دوسرے کو کہنی مار کر پیچھے نہیں ہٹایا تاکہ اپنا مقام بنا سکیں۔ بلکہ جس کو قابل دیکھا اس کو آگے کیا۔ اور اس کا یہ حال دیکھا کہ وہ دوسرے ساتھیوں کی منت کر رہا ہے کہ خدا کے لئے مجھے عہدہ مت دو۔ مجھ سے کام نہیں ہو گا۔ بس اصل بات یہی تھی کہ ہم عہدوں کے لئے کام نہیں کرتے تھے۔ بلکہ کام کے لئے عہدے مجبوراً قبول کرتے تھے۔ اور میں تو ساری زندگی اس پر بھی راضی نہیں ہوا کہ عہدہ قبول کروں اور اگر مجبوراً دوستوں نے کبھی کھینچ گھسیٹ کے کچھ بنا بھی دیا تو بھی اپنی رائے اور ذاتی خیال کو کوئی درجہ نہیں دیا۔ بلکہ جو کیا مشورہ سے کیا۔ ہمیشہ اطاعت کی اور اکثر تکلیف اٹھائی لیکن ڈسپلن اور فیصلہ کے خلاف کوئی قدم نہیں اٹھایا۔ اختلاف رائے اور لڑائی جھگڑا ہم اندر بیٹھ کے کر لیتے تھے اور باہر نکل کر جو ایک کہتا وہی سب کی آواز ہوتی اور جو ایک کرتا سب اس کی عملاً تائید کرتے۔ اور حقیقت بھی یہی ہے کہ ہر آدمی اگر بڑا بننے کی فکر میں رہے، کام رک جائے گا۔ کچھ لوگ قوموں اور جماعتوں میں ایسے بھی ہونے چاہیئیں جو بنیاد کا پتھر بن کر عمارت کے نیچے دب جائیں۔ جن پر کسی کی نگاہ بھی نہ پہنچے۔ تعریف کرنے والے عمارت کی بلندی اور اس کے طرز تعمیر کی تعریف کریں۔ لیکن حقیقت پر نظر رکھنے والے ان پتھروں کو دعائیں دیں جن پر ایسی مضبوط و بلند اور خوبصورت عمارت قائم ہو۔ بات کہنے کی

نہیں لیکن جب میں آج کل کے واعظوں، مبلغوں اور مقرروں کو شہرت کے لئے در بدر ہوتے دیکھتا ہوں تو پھر خدا کے اس فضل و کرم پر جو ہمیشہ سے میرے شامل حال رہا اور ہے اور جو کچھ بولنے کی نعمت اور عزت خدا نے مجھے نصیب کی اس پر غور کرتا ہوں اور حیران ہوتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ نے مجھ جیسے بے ہنر انسان سے کتنا اور کیا کام لیا۔ ایک وقت تھا جبکہ آج کے بولنے والے پیدا بھی نہیں ہوئے تھے تو مجھے ملک کے بعض حصوں اور خاص علاقوں میں لاکھوں انسانوں کو صرف لفظ "السلام علیکم" سکھانے میں ہی کئی برس لگ گئے۔ مسائل تو رہے ایک طرف اٹھنے، بیٹھنے بول چال، ملنے جلنے، حتیٰ کہ بعض علاقوں میں مدت تک پیشاب، پاخانے کے سلیقہ پر بھی تقریریں کرنی پڑیں۔ کیونکہ جب مردوں اور عورتوں کو بد تہذیبی عریانی اور بے حیائی میں مبتلیٰ دیکھا تو اسی پر مہینوں بولنا پڑا اور بتایا کہ دیہاتی اور شہری دونوں کو کس طریقہ سے بیت الخلاء کی سہولت مہیا کرنی چاہیئے۔ خصوصاً عورتوں کی بے حرمتی سے مجھے سخت تکلیف ہوتی تھی۔ میں نے دیکھا کہ باپ، بھائی اور شوہر گھر میں بیٹھے ہیں اور مائیں بہنیں اور بہو بیٹیاں ضروریات سے فارغ ہونے غیر مردوں کے سامنے باہر جنگل کو جارہی ہیں۔ چنانچہ میں نے اس بد رسم کا سدباب کرنے کے لئے بارہا تقریریں کیں اور کئی جگہ پر تو میں نے خاص خاص لوگوں سے کہہ کے ان کے گھروں میں سنڈاس تک بنوائے اور تو اور سرحد میں یہ چیز میرے لئے سخت حیرت اور پریشانی کا باعث بنی۔ لیکن وہاں یہ فرق تھا کہ جب ان لوگوں کو اس بارہ میں شرم دلائی تو اس کا بہت جلد اثر ہوا۔ کیونکہ وہ لوگ ابھی بھی غیور ہیں۔ الغرض تبلیغ کے راستے میں عقائد باطلہ کے ٹیلوں اور تودوں کو ہموار کیا، جاہلانہ رسم و رواج کے جھاڑ جھنکار صاف کئے مخالفت و عداوت کے گڑھوں کو پر کیا مزدوروں کی طرح پتھر ڈھوئے اور کوٹے مٹی اور بجری کی ٹوکریاں کندھوں پر اٹھائیں اور اسے بچھا کر اس پر تارکول ڈالا، پھر خود ہی انجن کی طرح راستہ برابر کر دیا۔ اور مدتوں کی جانکاہی کے بعد جہاں چلنا مشکل اور ایک قدم اٹھانا بھی دشوار تھا وہاں پیدل تو کجا، پھر گدھا گاڑی سے لے کر موٹر تک سب کچھ چلا۔ اور اب تو ہماری ان خود ساختہ اور پامال کردہ راہوں پر کتنے ہلے بھی دوڑتے پھرتے ہیں۔ لیکن دیکھنے والا صرف سڑک کی کشادگی اور ہمواری کی تعریف کرتا ہے۔ وہ تو شاید لاکھوں میں کوئی ایک ہوگا جس کی نگاہ سڑک بنانے والے اور اس کے لئے جان کھپانے والے کو تلاش کرتی ہو؟"

جس عظیم شخص نے بایں طور زندگی کے فرائض میں ٹھوس اور بنیادی جدوجہد کا امتیاز حاصل کیا۔ حتیٰ کہ اپنے وقت کی اہم ترین علمی و دینی شخصیت محدث العصر علامہ محمد انور شاہ کشمیری قدس اللہ سرہ نے مئی ۱۹۳۰ء میں برصغیر کے تقریباً پانچ سو نمائندہ قوم اور جید علماء و صلحاء کی معیت میں جس شخص کے ہاتھ پر سیاسی قیادت اور دینی امارت کے لئے خود بیعت جہاد و امارت کی (اگرچہ وہ اس بیعت کے وقت بھی خود ہی حقیقی مقتدیٰ اور رہنما تھے) اور اسے "امیر شریعت" منتخب کیا۔ تو کیا ان تمام احوال و کوائف کے باوجود مذکورہ ہستی کی امیرانہ صلاحیت کی اصابت و خوبی، زعیمانہ استعداد کی پختگی اور اس کے قائدانہ اوصاف و شمائل میں کوئی مین میخ نکالی جا سکتی ہے؟

جس ذات نے دور غلامی کی جکڑ بندیوں اور دشمن خدا و رسول، فرنگی (لعنہ اللہ و خذلہ) کی قہرمانی قوت و سلطنت کی ظالمانہ کارروائیوں کے علی الرغم عقائد حقہ کی تبلیغ، فرق باطلہ کی تردید، غلامی اور نوکر شاہی کی مخالفت اور تحریک آزادی کی تائید وحمایت کی۔ خصوصاً غلبۂ اسلام، توحید اور ختم نبوت و استیصال مرزائیت جیسے اہم ترین مسئلہ میں قوم کی قیادت کی۔ تن تنہا تمام افراد اور جماعتوں کے کارناموں سے زیادہ مؤثر اور نتیجہ خیز مہم سر کر ڈالی! نیز عزم و ہمت اور توکل کے گھوڑے پر سوار ہو کر کتاب اللہ کے آسمانی اسلحہ سے لیس ہو کر مسیلمہ کذاب، اسود عنسی، طلیحہ اور حسن بن صباح کے جانشین دجال اعظم مرزائے کادیانی

(قبح الله وجهه و اخزاه و كل من تبعه فى الدينا والاخرة۔ آمین!!!)

کی نبوۃ کاذبہ و باطلہ کے ہیبت ناک قلعہ پر تابڑ توڑ حملے کر کے اس کی اینٹ سے اینٹ بجا دی۔ اس کے دجل و تلبیس اور اغواء و فریب کی دھجیاں بکھیر دیں۔ ازلی غلامان کفر و ارتداد جاسوسان فرنگ و دم بریدہ سگان برطانیہ، اُمت مرزائیہ کے مذہبی و سیاسی فراڈ کے ہولناک بت کو میدان رزم و مقابلہ میں جرح و استدلال کی بمباری سے اس طرح چکنا چور کیا کہ آج اس کا یہ عظیم کارنامہ دینی و قومی تاریخ اور بین الاقوامی اہمیت کے نقطہ نظر سے شہرت لازوال حاصل کر کے ایک مستقل تحریک کی شکل اختیار کر چکا ہے۔ جس کی گونج گرج سے ایوان فرنگ کے در و دیوار لرز رہے ہیں۔ جس کی کفر سوز سرگرمی اور ارتداد کش تاثیر کی بدولت کادیان و ربوہ کے جعلی بہشتی مقبرہ کی غلیظ و بوسیدہ ہڈیاں چٹخ رہی ہیں۔ تبلیغ و اعلان حق کے لئے جس کی شہسوارانہ یلغار اور استیصال کفر و خاتمۂ ارتداد کے لئے جس کی مجاہدانہ غارت گری آج عقیدہ توحید و ختم نبوت کی فتح مُبین اور فوز و کامرانی کے نتائج و آثار پیدا کرنے کا موجب بن رہی ہے۔ تو کیا اس ذات کی یہ غیر فانی مجاہدانہ جدوجہد اور مدار نجات و مغفرت اسلامی تحریک کسی اعتراض و اختلاف کا ہدف بنانے کے قابل قرار دی جا سکتی ہے؟

جس ذات کے حسب و نسب کی صحت اور خاندانی شہرت نیز ہر دور میں خواص و عام کی طرف سے اس کے خانوادہ کو اعتماد و مقبولیت کی سند ملے اور اس خاندان کے بیشتر افراد اپنے فضل و شرف کی بناء پر اپنے اپنے زمانہ میں تحقیق نسب اور سیادت و نجابت کا معیار بنتے رہے ہوں۔ یعنی جسے طبعی اور خلقی طور پر بھی شرافت و بزرگی کا امتیاز حاصل ہو اور باطنی لحاظ سے بھی تقدس و طہارت نسلاً بعد نسل جس کی فطرت کا خمیر ہو۔ اس کے حسیب و نسیب ہونے اور اس کی سیادت و سروری میں کوئی کلام ہو سکتا ہے؟۔

نہیں اور ہرگز نہیں

مندرجہ بالا فقرہ جواب ہے گزشتہ تمام سوالات کا بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ اگر محض ان سوالات کی ایک تصویر بنا کر صرف مسئول عنہ کی ذات کو اس کے تمام اوصاف و اعمال کی روشنی میں ایک نظر دیکھ لیا جائے تو بقول کسے:

اے لقاء تو جواب ہر سوال!

یہ سوال نامہ یا استفساری دستاویز آپ کو مبنی بر حقیقت اور مطابق واقعہ جوابات کے ایک دفتر میں تبدیل شدہ نظر آئے گی۔

وکفیٰ بہٖ شہیداً!

تو آخر پھر گزشتہ تمام سوالات کا مکمل جواب اور جملہ مذکورہ صفات کا حقیقی مرکز کون ہے؟ وہ ایسا گرامی قدر وجود ہے جو زمانہ کی رسم کے مطابق صرف اتنا ہی نہیں کہ خود کسی مشہور خاندان کا ایک فرد ہے اور بس۔ بلکہ جس خانوادۂ مجد و نجابت کے طفیل دنیا کو شہرت و ناموری اور صیت و غلغلہ کا حقیقی مفہوم سمجھ میں آیا لیکن گردش زمانہ نے صدیوں سے اس کے اکابر رجال کے کارناموں کو مدہم اور مضمحل کر دیا تھا۔ وہ شخص مذکورہ خاندان کی طرف سے ازسر نو سفیر علم و فضل، نمائندہ مجد و نجابت، قاصد رشد و ہدایت، داعیٔ اصلاح و تجدید، اور قائد تحریک و انقلاب اور صرف مشہور و معروف ہونے کے بجائے خود معرف الاباء والاجداد کی صورت میں نمودار ہوا۔ اور اصل کمال بھی یہی ہے کہ انسان کسی کی شہرت و فضیلت کے سہارے نامور ہونے کے بجائے خود اپنے اخلاق و اعمال کے ذریعہ اپنے حسب و نسب، آباء و اجداد، اعزہ و احباب، نیز اپنی ذات اور جماعت کو بھی لازوال، شہرت و معروفیت کا درجہ عطاء کر دے اور "لاریب"! کہ ہمارے ممدوح کو بھی مبداء فیاض نے انہی اوصاف و خصائص کا مرقع بنا کر بھیجا تھا۔ جسے اپنے تو جانتے ہی ہیں۔ مگر بیگانے اپنوں سے کہیں زیادہ اور بہت اچھی طرح جانتے ہیں۔ اور جس کی روحِ علم و عمل، اس کے پیکر جسم و مادہ کے متعلق ایک عرب شاعر کی زبان سے مدعیان علم و فضیلت کو خاموش دعوت مبارزت دے رہی ہے کہ:

فالخیل واللیل والبیداء تعرفنی!
والسیف والرمح والقرطاس والقلم،

(سواری کے گھوڑے، رات کی ساعتیں اور میدانِ سفر میرے حال سے باخبر ہیں۔ تیر و تلوار مجھے پہچانتے ہیں اور کاغذ و قلم بھی میرے آشنا ہیں؟) اور اگر معمولی تصرف کے ساتھ اسے یوں پڑھ لیا جائے کہ۔

ہذا الذی تعرف البیدآء وطاتہ،
والعلم یعرفہ، والقول والقلم!

(یہ وہ ذات ہے کہ رزم گاہِ عمل اس کی یلغار سے باخبر ہے۔ علم اسے پہچانتا ہے۔ اور خطاب و تحریر اس سے آشنا ہیں!)

تو اور بھی موزوں اور مطابق احوال ہو جائے گا۔ جس سے بیان و قلم اور علم و عمل کے دونوں قابل فخر جوہر نمایاں تر ہو جائیں گے۔

زباں پہ بارِ خدایا یہ کس کا نام آیا؟
کہ میرے نطق نے بوسے میری زبان کے لئے!

جن کا نام نامی اور اسم گرامی ہے سید شرف الدین احمد عطاء اللہ شاہ بخاری

ولادت۔ یوم جمعہ، بوقت سحر، ربیع الاول ۱۳۱۰ھ کی چاند رات مطابق ۲۳ ستمبر ۱۸۹۲ء۔

نام۔ ددھیال کی طرف سے عطاء اللہ اور ننھیال کی جانب سے شرف الدین احمد رکھا گیا۔

کنیت۔ ابو العطا یا

خطاب- امیر شریعت

تخلص- ندیم

والد ماجد حضرت حافظ سید ضیاء الدین بخاری ابن حضرت سید نور الدین بخاری قدس اللہ سرہ-

والدہ محترمہ سیدہ فاطمہ اندرابی بنتِ مولانا حکیم حافظ سید احمد اندرابی نور اللہ مرقد ہما-

نانی صاحبہ قطب العالم امام الواصلین و العارفین حضرۃ خواجہ باقی باللہ دہلوی قدس سرہ کی نواسی تھیں- جو ہنگامہ ۱۸۵۷ء کے اثرات و نتائج میں دہلی سے بہار میں پناہ گزینی پر مجبور ہوئیں- اور وہاں سادات اندراب کے ایک نامور فرد سے ان کا عقد نکاح ہوا-

پرنانا- حضرت میر سید عبد السبحان اندرابی رحمۃ اللہ علیہ، ننہال کے مورث اعلیٰ تھے- جو کشمیر سے ہندوستان وارد ہوئے اور بہار کے شہر پٹنہ عظیم آباد میں سکونت اختیار کی- جہاں باطنی شرف و مجد کے علاوہ ظاہری دولت و امارت میں بھی انہیں ممتاز مقام حاصل ہوا- چنانچہ حوادث زمانہ کی دست برد سے بچی ہوئی ان کی جائیداد کا ایک حقیر سا حصہ محلہ خانہ باغ پٹنہ میں ایک عظیم الشان حویلی کی صورت میں اب بھی موجود ہے-

اس نجیب الطرفین ذات گرامی نے بچپن ہی سے علم و فضیلت، تہذیب و اخلاق، حسن معاشرہ اور آداب زندگی کے معلم ماحول میں پرورش پائی- پیش نظر تحریر کے مقصد کے طور پر یہ جاننا مناسب ہوگا کہ حضرت ممدوح کی نانی صاحبہ روحانیت و اخلاق کا منبع ہونے کے ساتھ ساتھ ظاہری اوصاف حسنہ کا مرقع بھی تھیں- خصوصاً سخن فہمی، زبان دانی میں انہیں ید طولیٰ حاصل تھا- محاورہ کے مطابق دلی کی کوثر میں دھلی ہوئی زبان ان کے نطق و تکلم کا زیور تھی- چنانچہ ہندوستان کے مشہور شاعر اور اپنے وقت کے استاذ تغزل میر سید علی محمد شاد عظیم آبادی مرحوم اپنے کلام کو سطحی زبان سے مبریٰ رکھنے اور مستند بنانے کے لئے مفردات الفاظ، محاورات اور ضرب الامثال پوچھنے، ان کی تحقیق کرنے اور اُن کی سند لینے کی غرض سے حضرت ممدوح کے ننہال سے گہرے تعلقات اور بے تکلفی کی بناء پر، محترمہ موصوفہ رحمہا اللہ کی خدمت میں حاضر ہوا کرتے اور ان کی تحسین و تصویب سے مستفید ہوتے تھے- خود شاہ جی کے نانا سید احمد مرحوم خوش الحان حافظ، عالم دین، طبیہ کالج لکھنؤ کے مستند حکیم حاذق اور زبان و بیان پر قدرت رکھنے والے ایک خوش گلو نغمہ طراز بھی تھے- شاہ جی کو شاد مرحوم کی علمی و ادبی محفلوں میں بکثرت بیٹھنے کا موقع ملا- ان کا کلام اور وقت کے متعدد اہل فن کے چیدہ چیدہ اشعار انہیں از بر تھے- مزید برآں گھر میں ماموں، جو کئی بھائی تھے- بعض ان کے ہم عمر اور بعض کبیر السن تھے- نیز بچپن کے بعض خاص رفیق، ان سب کی آپس میں محفل مشاعرہ جمتی اور پرانے علمی گھرانوں کے رواج اور مذاق کے مطابق بیت بازی کا معرکہ برپا ہوتا- چنانچہ اسی بہانہ سے اردو اور فارسی کے مختلف مشہور و معروف اساتذۂ فن کا ذخیرۂ اشعار ان اہل مجلس کے نہاں خانۂ قلب و دماغ میں محفوظ ہوگیا- جس پر ضبط و حفظ، ذہانت و ذکاوت، تعلیم و تعلم، بحث و تکرار اور مشق و تمرین نے سونے پر سہاگے کا کام دیا- اور ابتداء سے ہی زبان دانی، سخن طرازی، سخن فہمی، بدیہہ گوئی، طلاقت لسانی، موزونیٔ طبع اور شعر گوئی کے ذوق و استعداد نے ان کے دل و دماغ کو اپنا گھر بنا لیا- اسی ملکۂ تکلم، قدرت علی البیان اور استعداد و ذوق سخن نے آگے چل کر ان کی

خطابت و تقریر کو ایسے چار چاند لگائے کہ بڑے بڑے زبان دان اور اہل فہم ان کے حسنِ انتخاب، بدیہہ گوئی اور سخن طرازی پر داد دیئے بغیر نہ رہ سکے۔ حتیٰ کہ وہی استعداد و ذوق جب اپنی اصلی شکل اور مطلوبہ راستے میں نمودار ہوا تو اس نے دبی دبی چنگاریوں کے خول سے نکل کر کبھی کبھی ابھرتے ہوئے شعلوں کا قالب بھی اپنا لیا۔ اور شعر خوانی کے جذبہ نے داعیۂ شعر گوئی کی صورت اختیار کر لی۔

عنفوان شباب میں جب کہ تحصیل علم جاری تھا اور تقریر و خطابت کا وعظ کی صورت میں آغاز ہو چکا تھا۔ مشقِ سخن کے لئے پہلے بھی طبعیت کچھ آمادہ ہو چکی تھی۔ لیکن یہ چیز تبعاً تھی۔ اصل مشغلہ اور مصروفیت تبلیغ و تقریر کا کام تھا۔ بہر کیف اس وادی میں قدم رکھا تو پھر ضابطہ کے مطابق رہبر سفر سے آشنائی اور ربط کی قدیم رسم بھی پوری کی گئی۔ اور سب سے پہلے امرتسر کے ایک ذی علم و ادب بزرگ جو معلم و ادیب اور شاعر نیز ایک باعزت و متدین تاجر بھی تھے یعنی مولانا محمد دین غریب مرحوم ان سے سلسلۂ تلمذ قائم کیا گیا۔ مگر اس سارے عرصۂ تعلیم و تلمذ میں ایک مصرع طرح پر گرہ لگانے کے سوئی اور کوئی شعری یادگار قائم نہ ہوئی۔ بعد ازاں تحریک خلافت میں سرگرم حصہ لینے کی بناء پر جب میانوالی جیل میں دو سال تک محبوس رہنا پڑا تو وہاں حضرت مولانا احمد سعید دہلوی، مولانا داؤد غزنوی، مولانا لقاء اللہ عثمانی پانی پتی، صوفی محمد اقبال مرحوم پانی پتی، جناب آصف علی مرحوم دہلوی، عبداللہ جیوڑی والے دہلوی، سالک بٹالوی اور بابا گوردت سنگھ کومی جیسے اہل علم و فضل اور اصحاب ذوق کی شبانہ روز ہمہ نشینی و بزم آرائی نے پرانے جذبات اور ولولے پھر بیدار کر دیئے۔ وہاں بھی محفل مشاعرہ منعقد ہوتی۔ نظم و غزل کی صورت میں کلام پڑھا جاتا اور گرہیں لگائی جاتیں۔ چنانچہ اس زمانہ کی ادبی یادگار کے طور پر بھی تین چار شعر ہی میسر آئے اور اس کے بعد تو پھر تیس برس کی ہنگامہ خیز اور طوفان آفریں قومی و سیاسی زندگی میں فرصت و عافیت کے اس نرم و نازک شغل کے لئے نہ کوئی گنجائش پیدا ہو سکی اور نہ بہ تکلف پیدا کی جا سکی۔ تا آنکہ ۱۳۶۲ھ، ۱۹۴۳ء میں مشہور کمیونسٹ شاعر ساحر لدھیانوی کی مشہور نظم قحط بنگال کے مضمون سے متاثر ہو کر پھر ایک عمدہ شعر موزوں ہوا۔ اور دو سال تک التواء و تعطل کی کیفیت طاری رہی۔ البتہ جب مدت مدیدہ کی کشمکش کے بعد دو قومی نظریہ اور ملکی وحدت کے فکر کی سیاسی ٹکر ناگزیر ہو گئی اور برطانوی حکومت نے ۱۳۶۴ء، ۱۹۴۵ء کے وسط میں ملک گیر عام انتخابات منعقد کرانے کا اعلان کر دیا تو اس زمانہ میں بعض خاص محرکات و عوامل کے زیر اثر احساس انفعال نے تقریر و خطابت کی تندیوں اور جولانیوں کے ساتھ ساتھ ادبیت و شعریت کی لطافتوں اور روانیوں میں بھی اپنے بعض حسین و دلفریب اور نادر الوجود نمونے بہم پہنچا دیئے۔ چنانچہ اکثر مدائح، منظومات اور قطعات و اشعار اسی انقلابی دور کی یادگار ہیں۔ جن کی محدود تر اشاعت پر بھی اس وقت کی متعدد مسلمہ ادبی شخصیات اور مقتدر علمی جرائد نے نہایت موزوں الفاظ اور فرخدلانہ انداز میں داد و تحسین کے پھول نچھاور کئے تھے۔ اور صاحب کلام کی علمی فوقیت، وسعت مطالعہ، قوت استعداد، بلندیٔ سخن، حسنِ ذوق اور کمال فن کا بصدق و خلوص اعتراف کیا گیا تھا۔ اس مختصر ذخیرہ میں پھر تقسیم ہند کے بعد بھی کچھ اضافہ ہوا ہے۔ لیکن یہاں کے حالات و حوادث نے حضرت ممدوح کے جذبۂ ادب نوازی و سخن طرازی کو اس طرح مضمحل اور افسردہ کر رکھا ہے کہ باوجود قدرے فراغت و فرصت کے بھی ان کی طبع

حساس اس طرف مائل نہیں ہوتی۔ اور ظاہر ہے کہ یہ چیز محض فرصت ہی نہیں بلکہ اس کے ساتھ امن و سکون اور راحت کی بھی طلب گار ہے۔ اور امن و راحت تو اپنے حقیقی مفہوم کے اعتبار سے مدت سے عنقا ہو چکا ہے!

الغرض یہ جو کچھ بھی تھا طبیعت کا جوہر اور فطرت کا عکس تھا۔ تکلف و تصنع کا نمونہ یا کسب اور پیشہ وری کا آئینہ نہیں۔ بلکہ وہ جذبات جو دینی عقائد، سیاسی افکار اور حوادث و واقعات کے زیر اثر کہیں تقریر و خطبہ میں ظاہر نہیں ہوئے تو انہوں نے اپنے ظہور و نمود کے لئے نثر کے بجائے نظم کا روپ دھار لیا اور بس۔ اس کے ثبوت کے لئے یہی جاننا کافی ہو گا کہ اس کلام کا بیشتر حصہ سیاسی ہنگامہ آرائی اور مضطربانہ زندگی کے باوجود لاریوں اور گاڑیوں میں سفر کرتے ہوئے موزوں ہوا ہے۔ اور یہ حالت شعر گوئی و سخن سازی کے لئے جس قدر مناسب اور جتنی "ممد و معاون" ہو سکتی ہے اہل عقل و ہوش پر مخفی نہیں؟ ورنہ اگر کہیں حضرت ممدوح تقریر و خطابت کے ساتھ ساتھ شعر و سخن کو بھی اپنا ایک مستقل مشغلہ بنا لیتے تو حقیقت یہ ہے کہ اس فن میں بھی وقت کے امام سخن اور اشعر الشعراء شمار ہوتے۔ کیونکہ ان کی طبیعت میں شاعرانہ ذوق اور حسن اداء کے تمام اوصاف بدرجہ اتم موجود تھے لیکن بقول امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ

ولولا الشعر بالعلماء یزری
لکنت الیوم اشعر من لبیدا

(اگر شعر گوئی کا پیشہ علماء دین کے لئے باعث تحقیر نہ ٹھہرے تو میں آج لبید بن ربیعہ عامری (رضی اللہ عنہ) سے بڑا شاعر و سخن ور ہوتا)

ایک تو وہ اس فن کو ابناء وقت اور زمانہ سازوں کی طرح اپنی شہرت و ناموری اور جلب زر کا ذریعہ نہیں بنا سکتے تھے۔ دوسرے یہ کہ ان کی فطرت و صلاحیت کے مطابق قدرت کاملہ نے چونکہ ان کا انتخاب وعظ و تبلیغ اور تقریر و خطابت کے لئے ہی کر رکھا تھا۔ اسلئے بھی وہ شعر گوئی اور سخن طرازی کے لئے مستقل وقت اور فرصت نکال کر اس میں مصروف و مشغول نہیں ہو سکتے تھے۔ مگر اس سب کچھ کے باوجود بھی اس مختصر سے مجموعہ میں جو اپنی لفظی مقدار اور کتابی ضخامت کے پیش نظر ایک تبرک سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتا۔ وہ سب کچھ موجود ہے جو ایک فنکار شاعر کے ضخیم دیوان میں ہونا چاہیئے یا ہو سکتا ہے۔ چنانچہ یہ کتابچہ اس وقت مدح و نعت، منقبت، نظم، غزل، مثنوی، رباعی، قطعہ، طنز و تفنن، اور مزاح و ظرافت کے مختلف شاہکاروں پر مشتمل ہے جو اپنے شایان شان اور مناسب حال طریق سے سلیقہ مندی کا مظاہرہ کر رہے ہیں اور صاحب کلام کی عوامی خطابت کی طرح ان میں بھی الفاظ کی چستی بندش کی قوت تخیل کی رفعت، بیان کی لطافت، زبان کی پختگی، بداہت کا شکوہ، تراکیب کا حسن، تشبیہات کی ندرت، اور فی الجملہ کلام کی جامعیت اور فن کی مہارت کے جلوہ ہائے گونا گوں متحرک و رقصاں ہیں! پھر انتہائی اجمال و اختصار کے باوصف توحید ذات و صفات. وحدت الشہود یا وحدت الوجود، وحی و رسالت، عصمت و ختم نبوت، سیاست دینیہ، حکومت الہیہ، غیرت قومی، حمیت ملی، شجاعت ظاہری، جرأت دینی، حق گوئی و بیباکی، فقر و استغناء، درویشی و قلندری، معرفت نفس اور اظہار حقیقت جیسے جامع

عنوانات اور متنوع مضامین بھی اس کلام بلاغت، نظام کا طرۂ امتیاز اور زیب و زیور ہیں؟ علاوہ ازیں حضرت ممدوح جیسے سراپا مقصد اور ہمہ تن اصول خطیب و سخنور کے اپنے الفاظ ہیں کہ:

"اگر انسان اپنے "مافی الضمیر" کو بہتر سے بہتر حسین سے حسین اور مختصر الفاظ میں اس ترتیب کے ساتھ بیان کرے کہ اس میں ترنم پیدا ہو جائے تو یہ "شعر" ہے"

اس میزانِ قول و کلام اور معیار شعر و سخن پر اگر خود ان کے اپنے فرمودات ہی کو تولا اور جانچا جائے تو وہ کلمات شعر و نغمہ کا صحیح مصداق ثابت ہوتے ہیں۔ اور ان اشعار و نغمات کو موجودہ دور کی اس بحث و تنقید کے لحاظ سے بھی کہ کلام کو ادب برائے ادب کے بجائے ادب برائے زندگی کا علمبردار ہونا چاہیئے۔ یہ شرف بدرجۂ کمال حاصل ہے کہ وہ محض صوت و ترنم کے بجائے اصول و مقصد کے پیمانوں اور سانچوں میں ڈھلے ہوئے ہیں! اب ظاہر ہے کہ جیسی زندگی اور اس کے اصول و مقاصد ہوں گے۔ اور جیسا کسی کا ضمیر و باطن اور فکر و عقیدہ ہوگا اسی قسم کا ادب و شعر بھی اس سے ظہور میں آئے گا۔ تو پھر جس شخص کی بول چال، وصل و انقطاع، خلق و معاشرہ، فکر و نظر، عقیدہ و مسلک، قول و عمل غرض اسلام کی دعوت و تبلیغ غلبۂ دین حق کی تجویز و تحریک اور حریت و انقلاب کے لئے جدوجہد اور سعی و کوشش جس کا اوڑھنا بچھونا بن جائے کیا اس کا مافی الضمیر کسی اصل و مقصد کا حامل اور اس کی زبان شعر و خطابت زندگی کے صحیح اور اٹل مقتضیات کی ترجمان اور پیغامبر ہوگی یا نہیں؟ ظاہر ہے اثبات و تائید میں جواب دیئے بغیر چارہ کار نہیں؟ تو ثابت ہو گیا کہ حضرت ممدوح کی تمام تر خطابت اور شاعری بھی بااصول و بامقصد اور ایک مکمل انسان یعنی ایک سچے مسلمان کی زندگی کی حرکت و حرارت کی آئینہ دار ہے۔ کیونکہ دعوت و تبلیغ اسلام سے بڑھ کر صحیح اور زندگی آمیز کوئی نظریہ نہیں۔ اور غلبہ دین حق کے لئے حریت طلبی و انقلاب آفرینی کو اپنا وطیرہ بنا لینے سے زیادہ واقعی اور زندگی آموز دنیا میں کوئی مقصد نہیں لہٰذا بلاشک و بلاریب اور بلاخوف لومتہ لائم کہا جائے گا کہ یہ مجموعہ کلام اگر ایک طرف فن شعر و حکمت پروری کے خوشرنگ اور سدا بہار پھولوں کا یہ گلدستہ ہے تو دوسری جانب بااصول و بامقصد زندگی کے گہرے احساسات کی جیتی جاگتی تصویر اور اٹل مقتضیات کا واقعی ترجمان بھی ہے۔ غرض شعر و نغمہ کے پھولوں کا گلدستہ اور حکمت و دعوت کے موتیوں کا یہ ہار اہل علم و عمل دونوں کے لئے باعث توجہ اور جاذب قلب و نظر ہے اور کہا جاسکتا ہے کہ:

بہارِ عالم حُسنش دل و جاں تازہ می دارد!
برنگ ارباب صورت را، ببُو اصحاب معنٰی را

ہر چند کہ یہ تحریر اپنے ابتدائی عنوان کے مطابق حضرت ممدوح کا واقعی تعارف نہیں ہے کیونکہ ان کی ذات کسی تبصرہ و تعارف کی محتاج نہیں بلکہ ان کے دم سے ہزاروں نے شہرت و معروفیت حاصل کی اور کسی کے حق میں ان کی، کی ہوئی تعریف خود مقبولیت کی ایک سند سمجھی جاتی ہے۔ لیکن بات صرف اتنی ہی نہیں کہ مجھے ایک عظیم المرتبت خطیب اور قادر الکلام شاعر و سخنور کے فرمودات پر ایک تعارف نویس اور تبصرہ نگار کی طرح رسمی طور پر کچھ کہہ دینا ہے اور بس! بلکہ معاملہ یہ ہے کہ شخص ممدوح خطیب و شاعر کے علاوہ مجھ جیسے

بے بضاعت و کم سواد کے ہمہ صفت موصوف اور گرامی قدر باپ بھی ہیں۔ اور ایسے باپ جو دنیا میں لوگوں کو کم نصیب ہوئے ہیں! اس لئے میں تو ایک ایسی الجھن میں پھنس گیا جس سے خلاصی مشکل تھی کہ اگر ان کے بارہ میں جبکہ انہیں کا ایک تحریری کارنامہ بغرض افادہ نشر کیا جا رہا ہے۔ میں ہی خاموش رہتا ہوں تو یہ چیز اظہار حقیقت اور شہادت واقعہ کے سلسلہ میں مضر نظر آتی اور اگر میں خود ہی کچھ کہتا ہوں تو رسم زمانہ کے مطابق اسے درمدح خود می گوید یا پدرم سلطان بود کے معترضانہ تیر و نشتر سے زخمی کر دیئے جانے کا خدشہ محسوس ہوتا۔ لیکن میں نے مستعد ہو کر آخری اور بڑی آزمائشی صورت کو عمداً اختیار کر لیا۔

اولاً اس لئے کہ جو کچھ مجھے کہنا اور لکھنا ہے یہ سب اس حیثیت سے نہیں کہ میں ایک غیر معروف شخص کو منظر عام پر لانے کے لئے زور قلم صرف کر رہا ہوں کیونکہ یہ صورت اکثر وہیں پیش بھی آتی ہے جہاں ممدوح قصیدہ گو سے بہرحال کم شہرت اور زیادہ اجنبی ہوتا ہے۔ تو مدح کرنے والا اپنی علمی برتری اور ناموری کے ذریعہ گمنام کو مشہور کر دیتا ہے۔ بلکہ میرا حال یہ ہے کہ ایک ایسا شخص میرے سامنے اپنے تمام اوصاف وخصائص سمیت موجود ہے جس کی متنوع، ہمہ گیر طوفانی اور انقلابی زندگی کا ناقدانہ تجزیہ کرنا میرے کیا سب جاننے اور لکھنے پڑھنے والوں کے لئے حتیٰ کہ خود اس شخص کے لئے باوجود قدرت بیان کے ایک مہم سر کرنے سے کم نہیں۔ جس کی شخصیت سے متعلق خیالات و تصورات کے ہجوم نے فکر و بصیرت کو حیران اور دم بخود کر کے رکھ دیا ہے۔ لہٰذا اس اضطراب اور ہچکچاہٹ کی حالت میں بجز اس کے کہ میں صرف اپنے مشاہدات، احساسات اور تصورات کو ایک واقعہ کی طرح صفحۂ قرطاس پر منتقل کر دوں اور کوئی تعبیر نہیں جو اس مفہوم کو ادا کر دے۔ کیونکہ حقیقی تعارف و مدح سے میں عاجز ہوں اس لئے ممکن صورت صرف ایک ہے کہ میں حضرت ممدوح کو ایک گرامی قدر باپ، عظیم خطیب اور بلند شاعر کی حیثیت سے جو کچھ دیکھا، پایا اور سمجھا ہے اسے حتی المقدور بیان کر دوں نہ یہ کہ جیسی شخصیت ہے اس کے شایان شان اور مناسب حال کوئی تعارف اور تبصرہ سپرد قلم کروں۔

ثانیاً اس لئے کہ میں نے سوچا جہاں یہ بات ایک لحاظ سے قابل غور معلوم ہوتی ہے کہ ایک نامور باپ کی تعریف اولاد خود نہ کرے بلکہ اہل اور تنقید و تبصرہ کے حقدار لوگ خود ایسے شخص کو اس کے حالات کے مطابق تعریف و مدح کے پیمانوں سے ناپیں یا پھر اس کے مخالفین اور مدمقابل اس کے اوصاف و محاسن کا اعتراف کریں۔ وہیں یہ بات میری عقل و وجدان کے لئے ایک مہمیز بن گئی کہ اگر ایک مستحق تعریف و منقبت باپ کو اس کی اپنی اولاد شہادت واقعہ، اظہار حقیت اور تحدیث نعمت کے طور پر خود ہی یاد نہ کرے تو آخر اور کون ہے جو ایسے شخص کو اس کے مناقب و اوصاف کے آئینہ میں صحیح رنگ میں دیکھنے کا خواہشمند ہو گا۔ اور بات اصل میں یہ ہے کہ دنیا میں یا تو بے نیاز تعریف باپ کی اولاد اسے یاد نہیں کرتی، یا پھر ناخلف اور دیمک خوردہ شجرہ کی نامزد ذریت اپنے اصل کو فراموش کرتی ہے۔ کسی حلال خون اور خلف صحیح کے لئے یہ تو ممکن ہی نہیں ہے کہ وہ اپنے ہی باپ یا عام الفاظ میں آباؤ اجداد کے حق میں ان کے شایان شان تذکرہ یا کم از کم ضرورت کے مطابق تعریف و تبصرہ سے دستبردار ہو جائے۔ تو ظاہر ہے کہ استدلال کا یہ آخری پہلو محض

جذباتی ہونے کے بجائے عقل و ہوش اور وجدان و بصیرت کے لئے ایک قابل غور و تدبر مرحلہ ہے۔ اور ہر اولاد کے لئے اس کے آباء و اجداد کے حق میں ایک لائق اتباع و تقلید اسوہ!

ولکل قوم سنة واما مُها
(اور ہر ایک گروہ کا ایک عملِ اور ایک قائد ہوتا ہے)

وہ صرف ایک کامیاب واعظ، شعلہ بار مقرر اور جادو بیان خطیب ہی نہیں بلکہ ایک نغز گو شاعر، جذبات آفریں رجز خوان اور قادر الکلام سخنور بھی ہیں۔ جس کے جسم و پیکر میں ایک عالم کی روح، ایک فلسفی کا دماغ، ایک حکیم کی فراست، ایک عارف کی بصیرت، ایک شاعر کا دل، ایک غازی کا حوصلہ، ایک مجاہد کا عزم اور ایک مکمل انسان یعنی ایک مومن صادق کا ضمیر دھڑک رہا ہے۔ دعاء ہے کہ رب قدیر اس شاعر ملت، خطیب امت عظیم انسان اور صاحب ایمان کو نواہائے سحر گاہی اور نغزہ ہائے فطرت کے زیر و بم سے ہمارے افکار واخلاق کی اصلاح و تربیت کو وابستہ فرمادے۔ اور اس کی مثالی زندگی کے نشیب و فراز میں ہمارے عقائد و اعمال کی استقامت و صلاحیت کو مقدر کر دے۔ اور ہم میں سے فرداً و جماعتہً ہر متنفس کو یہ توفیق بخشے کہ وہ حضرت ممدوح کی قیادت و رہنمائی میں صراط مستقیم پر گامزن ہو کر خدمت دین حق کا دنیوی اعزاز اور نجات و مغفرت کی اخروی سعادت حاصل کر سکے۔

فتلک منی قلبی ولی بغیتی التی؟
اذانلتها حازت لی الفوز اجمعا!

اللهم وفقنا لماتحب وترضیٰ فانانسئلک موجبات رحمتک وعزائم مغفرتک والسلامه من کل اثم والغنیمته من کل بر والفوز بالجنته والنجاة من النار۔ فیارب صلی وسلم و بارک علی عبدک ورسولک افصح العرب والعجم سید الاولین و خاتم النبیین ؤ خاتمته المرسلین محمد الامی و اله واصحابه وازواجه و اتباعه اجمعین برحمتک یاارحم الراحمین! آمین

(منقول از "سواطع الالہام")
جنوری ۱۹۵۵ء نادیتہ الادب الاسلامی
ملتان

سید عطاءاللہ شاہ بخاری کی شخصیت کا تاریخی تجزیہ

شورش کاشمیریؒ

سوال تقابل کا نہیں اور نہ مماثلت زیر بحث ہے۔ مقام اپنا اپنا، کمال اپنا اپنا، لیکن واقعہ یہی ہے کہ پنجاب نے تین شخصیتیں ایسی پیدا کی ہیں جنہوں نے مسلمانوں کی حیات اجتماعی پر نہ صرف دردِ دل کے ساتھ غور کیا بلکہ اس کے لئے حرکت و عمل کے خطوط پیدا کئے۔

۱۔ علامہ اقبال

۲۔ ظفر علی خاں

۳۔ سید عطاءاللہ شاہ بخاری

علامہ اقبال کا فکر ہی ان کا عمل تھا۔ وہ اس انداز کے دینی یا سیاسی رہنما نہ تھے جو عملی جدوجہد میں حصہ لیتے اور اپنے نقش پا چھوڑ جاتے جیسا کہ مولانا ظفر علی خاں یا سید عطاءاللہ شاہ بخاری تھے۔ یہ دونوں غیر ملکی غلامی کے خلاف لڑتے رہے۔ قید و بند کی صعوبتیں برداشت کیں۔ اور ان عناصر کی سرکوبی کا خمیازہ بھگتا جو برطانوی حکومت کے لئے ملکی دوائر میں ریڑھ کی ہڈی کا کام دے رہے تھے، حقیقت یہ ہے کہ مسلمانوں میں برطانوی استعمار کا خوف توڑنے اور پنجاب کے علاقوں میں پشتینی وفاداروں کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرنے میں جو کام ظفر علی خاں اور عطاءاللہ شاہ نے کیا۔ وہ بہمہ وجوہ ابھی سامنے نہیں آسکا۔ لیکن جب کبھی اس علاقے کے جمود و انحطاط کی ابتدائی مشکلیں سامنے آئیں گی ایک سچا مؤرخ ان دونوں شخصیتوں کے ممتاز کارناموں کا ذکر جلی حروف میں کئے بغیر نہیں رہے گا۔ ان دونوں رہنماؤں نے ایک خاص عہد استبداد سے لے کر اس جان بلب عہد استعمار تک مغربی پاکستان کے علاقے میں جس حرکت اور بیداری کا جوش و جذبہ پیدا کیا وہ بجائے خود جماعت یا تحریک سے کم نہیں۔ علامہ اقبال نے یہ کیا کہ مسلمانوں کو ایک فکری مزاج دیا۔ ان کے افکار و نظریات کا چرچا تمام ملک میں پھیلا، نتیجتہً مسلمانوں میں اپنی روایات سے انہماک کا شوق پیدا ہوا۔ یہی شوق بعد میں تحریک پاکستان کا محرک ہو گیا، باالفاظ دیگر علامہ اقبال ایک مفکر تھے جنہوں نے مسلمانوں کے ماضی کو سہارا دیا اور موثر بہ ماضی مستقبل کا ایک راستہ دکھایا، ظفر علی خاں اور عطاءاللہ شاہ بخاری نے عوام کو عملاً جھنجھوڑا۔ اس ذہن کی آبیاری کی جو غیر ملکی غلامی کے بندھن توڑ سکے اور اس کے لئے قربانی کر سکتا ہو، یہ صحیح ہے کہ قومی تحریکیں یا سیاسی انقلاب محض فردِ واحد سے پیدا نہیں ہوتے اور یہ عوامل، عناصر متحد ہو کر کسی فرد کی شخصیت کو اپنے خصائص کا مظہر بنا دیتے ہیں، نتیجتہً ایک شخصیت پوری تحریک یا پورے انقلاب کی مظہر بن جاتی ہے۔

افراد نہیں ادارے

جن دنوں ظفر علی خاں اور سید عطاءاللہ شاہ نے نعرۂ رستاخیز بلند کیا ان دنوں کے احوال و کوائف پر نظر

ہو تو یہ معلوم ہوسکتا ہے کہ ان لوگوں نے کس سنگین دور میں انقلاب و احتجاج کی بنیاد رکھی۔ پنجاب استعماری مقاصد کی شہ رگ تھا۔ اس قسم کے عوامی ذہن کا مغربی پاکستان میں پیدا ہونا یا پیدا کرنا جوئے شیر لانے سے کم نہ تھا۔ ان دونوں رہنماؤں نے جس بے جگری سے یہ فرائض سرانجام دیئے وہ تمام تر ان کی جرأت رندانہ کا معجزہ تھا، ہم انہیں تاریخ یا تاریخ کے محرکات سے الگ کر کے نہیں دیکھ سکتے۔ یہ کہنا مشکل ہوگا کہ جو کچھ انقلاب اور بیداری کی شکل میں سامنے آیا تمام تر انہیں کے عمل و ایثار یا قیادت و سیادت کا نتیجہ ہے۔ جیسا کہ عرض کیا ہے یہ ایک تاریخی عمل ہے اس عمل کو جب ہم ان شخصیتوں کے قالب میں دیکھتے ہیں تو کہہ سکتے ہیں کہ:

اقبال---- کی فکر، ظفر علیخاں--- کی صحافت اور سید عطاءاللہ شاہ بخاری--- کی خطابت نے مسلمانوں میں ایک تحریک یا تنظیم سے زیادہ کام کیا اور ان کے نتائج بھی ایک تحریک یا تنظیم کے نتائج سے زیادہ اُبھرے ہوئے، بکھرے ہوئے اور نکھرے ہوئے نظر آرہے تھے۔

کمالات کا مجسمہ

شاہ جی کے کمالات کا احاطہ کرنا مشکل ہے وہ ایک چمنستان کی طرح تھے۔ ان میں ایک باغ کی تمام دولتیں موجود تھیں۔ رنگا رنگ پھول تھے، سبزہ تھا، شاخیں تھیں، روشیں، درخت، پھل، پانی، ہریالی، چھاؤں، صبا، نسیم بہار، پھر اس کے ساتھ ساتھ کبھی کبھار پت جھڑ اور اس کی اداسیاں بھی پائی جاتی تھیں، سیاسی تعصبات کی بات دوسری ہے۔ یہ زمانہ ہی ایسا ہے کہ انسان حزبی افکار سے باہر قدم رکھتے ہوئے ہچکچاتا ہے، ممکن ہے کہ بعض غیر تاریخی طبقوں کو شاہ جی کے کمالات فائقہ سے انکار ہو یا وہ حزبی افکار کے تحت جز بز ہوں، لیکن کوئی واقعہ محض اس لئے نہیں جھٹلایا جاسکتا کہ اس کی تائید و حمایت کا پہلو کمزور ہے یا اختلاف کی ایک ایسی فضا موجود ہے جو نہیں چاہتی کہ فلاں واقعہ وجود رکھتا ہو۔ اب چونکہ واقعہ موجود ہے لہذا انکار سے دل مطمئن کرلیا جائے کہ نفی ہو گئی ہے۔

مثلاً یہ واقعہ کہ شاہ جی سے بڑا خطیب اردو زبان نے پیدا نہیں کیا، ہوسکتا ہے کہ بعض خطباً کو بعض اعتبارات سے فوقیت حاصل ہو۔ اس کی نظیریں موجود ہیں لیکن خطابت میں جو کمال شاہ جی کو حاصل رہا وہ نصف صدی میں اردو زبان کے کسی خطیب کو حاصل نہیں ہوا۔ شاہ جی کی عمر کا آخری حصہ دینی خطابت میں بسر ہوا بلکہ ان کی زندگی کا تقریباً دو تہائی حصہ توحید و رسالت کی خدمت گزاری میں کٹا۔ ان کے انداز تبلیغ اور عام خطباً کے انداز تبلیغ میں عظیم فرق تھا۔ انہوں نے مذہب کو کبھی مسلمانوں میں تفریق تو کیا؟ انسانوں میں تفریق کے لئے استعمال نہیں کیا۔ انہوں نے مذہب کے روائتی جھگڑوں اور خطابتی آویزشوں کو چھیڑا تک نہیں۔ ہمیشہ مسلمانوں کے احوال کی اصلاح اور عقائد کی درستی کو ملحوظ رکھا۔

عظیم خدمت

یہ صحیح ہے کہ انہوں نے قادیانی جماعت کا تعاقب کیا لیکن اس کے وجوہ فروعی نہ تھے وہ سمجھتے تھے کہ

ختم نبوت کے عقیدے سے مسلمانوں کی وحدت برقرار رہتی ہے اور جب کوئی رسول ﷺ کے بعد نبی ہونے کا دعویٰ کرتا ہے خواہ وہ ظلی ہو یا بروزی کیوں نہ ہو۔ وہ ایک نئی شریعت، فکر یا تنظیم پیدا کرکے مسلمانوں کی عالمی وحدت کو نقصان پہنچاتا ہے، دوسری چیز ان کے سامنے یہ تھی کہ وہ قادیانی جماعت کو برطانوی امپریلزم کا دست و بازو سمجھتے تھے، چنانچہ انہوں نے اپنی بے مثال خطابت سے قادیانی جماعت کو متروکات کی صف میں لاکھڑا کیا۔

علامہ اقبال نے اس مسئلہ پر جو کچھ لکھا تھا اس میں اس اجمال کی تفصیل موجود ہے، صورتحال ایسی ہے کہ ہم نے ابھی تک برطانوی غلامی کے اسباب، وعلل اور آثار و نتائج کا جائزہ نہیں لیا۔ ہمارے ہاں ابھی اسلامی بنیادوں پر فکری دماغوں کا قحط ہے، جب کبھی یہ جائزہ مرتب ہوا۔ اور ہم نے ان کرداروں کے بارے میں معلومات حاصل کیں جو مسلمانوں کی سیاسی غلامی میں شریک رہے ہیں، یقین سے کہا جاسکتا ہے کہ قادیانی جماعت برطانوی مستعمرین کی ایک دلچسپ کھیپ ثابت ہوگی۔ تب یہ امر خود بخود ابھر کر سامنے آجائے گا۔ کہ قادیانی جماعت کے خدوخال کیا تھے اور شاہ جی کی خدمات اس بارے میں کتنی عظیم تھیں۔

سیاسی پس ماندگی

سرحد مدت العمر سرزمین بے آئین رہا۔ بڑی جدوجہد کے بعد اسے دوسرے صوبوں کے برابر درجہ دیا گیا، سندھ کے حالات سیاسی اعتبار سے کبھی خوش آئند نہیں رہے، کسی سیاسی تحریک یا سیاسی شعور کا سندھ کے عوام میں پیدا ہونا خواب و خیال رہا، اس اعتبار سے بلوچستان بھی سناٹوں کی سرزمین ہے۔ پنجاب کے مشرقی اضلاع میں ضرور سیاسی شعور اور سیاسی تحریک پیدا ہوئی، مغربی اضلاع میں شہری زندگی نے سیاسی تحریکوں کو محسوس کیا اور بعض اضلاع کے عوام نے کسی قدر حصہ بھی لیا لیکن ایک صحیح سیاسی تربیت سے یہ اضلاع اکثر محروم ہی رہے، تحریک پاکستان کا معاملہ بالکل دوسرا ہے۔ وہ مسلمان قوم کا ہندوئیت اور استعماریت کے خلاف ایک ردعمل تھا جو استعمار و استبداد کے رخصتی عہد میں پیدا ہوا لیکن بانئ پاکستان محمد علی جناح کی رحلت کے بعد جن لوگوں نے قومی آزادی پر قبضہ کرلیا وہ زیادہ تر اس جماعت کے افراد تھے جو ان علاقوں میں سیاسی شعور کی گم شدگی کے ذمہ دار تھے اور ہیں؟ ممکن ہے کہ یہ بات بعض طبقوں کے لئے بارخاطر ہو تاہم واقعہ یہی ہے کہ پاکستان کے عوام قومی آزادی سے پورے طور پر متمتع نہیں ہوسکے۔ سیاسی مزاج آج بھی وہی ہے جو برطانوی عہد میں تھا۔ یعنی عوام الناس قومی مسائل میں دلچسپی لینے کی بہ نسبت حکمران جماعت کی خوشنودی کے حصول میں سرگرداں رہتے ہیں۔

یہ عہد جس میں سے ہم گزر رہے ہیں معمولی عہد نہیں۔ ایک عظیم عہد ہے۔ یہ دنیا ہماری آنکھوں کے سامنے بدلی ہے، اس عہد میں کوئی شخص یہ چاہے کہ وہ انسان کو غلام رکھے یا اس کے ابتدائی حقوق غصب کرلے یا لوگوں کو یہ حق حاصل نہ ہو کہ وہ اپنے حکمران خود منتخب کریں۔ قریب قریب ناممکن ہے۔ جن

قوموں کو بالادستی حاصل ہے ان کی آزادی تقلید و احترام کے قابل ہے جو قومیں سیاسی طور پر آزاد ہیں۔ ترقی کی طرف قدم بڑھا رہی ہیں، وہاں کوئی شخص بآسانی عوام کی فکری آزادی پر قبضہ نہیں کرسکتا۔ جو ممالک ابھی شخصی حکمران کے قبضے میں ہیں یا جہاں غیر ملکی انتداب باقی ہے وہ بدیر یا سویر آزاد ہونے والے ہیں۔ ان ممالک کے عوام کروٹ لے چکے ہیں اور شرف و امتیاز کے نشانات بھی بدل چکے ہیں۔

ظاہر ہے کہ یہ انقلابِ حال محض اتفاقی یا حادثاتی نہیں بلکہ یہ فکری انقلاب سے پیدا ہوا ہے۔ اُن عوامل و عناصر کی بدولت جو قوموں اور ملکوں میں پیدا ہوتے رہتے ہیں اور جن کی راہنمائی کا شرف دل و دماغ کے انسانوں کو قدرت کاملہ نے تفویض کیا ہے۔

حاصلِ کلام

پنجاب مزاجاً عسکریوں کی گزر گاہ رہا۔ ۱۸۵۷ء کے بعد برطانوی استعمار نے اپنے اغراض و مقاصد کے لئے پنجاب کو نامزد کیا۔ اب جو تالیفات مختلف انگریز مصنفوں کے قلم سے نکلی ہیں اور جس میں زیادہ تعداد ان لوگوں کی ہے جو یہاں سول سروس میں رہے۔ ان کی تحریروں سے مترشح ہوتا ہے کہ پنجاب برصغیر میں برطانوی سلطنت کا ایک ایسا ستون تھا جس نے نہ صرف انگریزی استعمار کو قائم رکھا بلکہ اپنے تئیں بازوئے شمشیر زن ثابت کیا۔ ایک ایسے علاقے میں ظاہر ہے قومی تحریکوں کا اٹھنا یا سیاسی طوفانوں کا اٹھنا سہل ہے، انگریز نے یہاں مختلف مفاد پیدا کئے۔ ایسے لوگوں کو مختلف داؤ پر پروان چڑھایا جن کا فہم و ادراک ان کے لئے ممد ہوسکتا تھا، یہ ایک بڑی دردناک تاریخ ہے کہ پنجاب کو برطانوی استعمار نے سب سے زیادہ اپنے حق میں استعمال کیا، یہ صوبہ سیاستاً اس کی سرحد رہا۔ یہاں انگریزوں نے ایسے خاندان پیدا کئے یا ان خاندانوں کو پالا گیا جن کی معرفت یہ کوششیں بار آور ہوتی رہیں کہ اس صوبے میں نہ کبھی منظم سیاسی تحریک پیدا ہوئی، نہ کوئی ایسا لیڈر اٹھا جو تمام ملک کے لئے قابلِ قبول ہوتا اور اگر مسلمانوں میں اس دل و دماغ کے ساتھ کوئی اٹھا تو وہ شکار ہو گیا یا زچ ہو کر رہ گیا، یہ بھی ایک المیہ ہے اور اس کہانی کے اجزا بھی بڑے دردناک ہیں۔ مگر ان کی تفصیل کا یہ محل نہیں، اب آپ ہی کچھ کہہ لیجئے حقائق یہ ہیں۔

۱۔ پنجاب نے انفرادی طور پر بڑے بڑے دل و دماغ کے سیاسی عبقری اور پرزور انقلابی پیدا کئے مگر ان کی اجتماعی شخصیت کو نشوونما پانے سے روک دیا گیا بلکہ رسوائی کے خنجر سے ذبح کیا۔

۲۔ تمام صوبے میں استبدادی زمینداروں کا جال بچھا دیا گیا، جنہوں نے برطانوی استعمار کی بہ صمیم قلب حفاظت کی۔ عام مسلمانوں میں روحانی افلاس کو مستحکم رکھنے کے لئے تن آسان سجادے پیدا کئے۔

۳۔ عامۃ الناس کو بہ لطائف الحیل تعلیم سے محروم رکھا۔

۴۔ معیشی زندگی کو فرقہ وارانہ عصبیتوں کے تابع کردیا۔

۵۔ مسلمانوں میں عقائد کی اساس پر تفرقے پیدا کئے گئے اور ان مذاہب کی حوصلہ افزائی کی گئی جو جہاد کی بجائے

مسلمانوں میں مسکینی اور گوشہ نشینی پیدا کرتے تھے۔ بظاہر حقائق کی یہ ایک مختصر سی داستان ہے لیکن اس کے جو نتائج پیدا ہوئے وہ اتنے قبیح تھے کہ ان پر قابو پانا مشکل تھا۔ ظفر علی خاں کی صحافت نے درمیانے درجے کی شہری جماعت کو جگا دیا اور وہ پلکوں سے نیندوں کا بوجھ اتارے ہوئے اٹھ بیٹھے۔ مگر شاہ جی نے واقعتاً ایک صور پھونکا۔ ان کی عدیم المثال خطابت نے ان تمام ستونوں کو ہلا دیا۔ جن پر پنجاب میں برطانوی حکومت کا قصرِ رفیع استوار تھا۔ شاہ جی نے پنجاب کو دو طرح سر کیا۔

۱۔ شہروں اور قصبوں پر سیاسی یلغار کی، جتنے دماغوں میں بھی سیاسی سوجھ بوجھ پیدا کر سکتے تھے کر گئے۔

۲۔ دیہات میں انہوں نے دعوت و ارشاد کے ہتھیاروں سے حملہ کیا اور اس کمین گاہ سے انگریزی دبدبہ کو بے توقیر کیا۔

الف: نتیجہ اس کا یہ نکلا کہ شاہ جی نے پنجاب جیسے عسکری صوبہ میں نہ صرف خلاف سامراج ذہن کو پرورش کیا بلکہ نوجوانوں کی ایک ایسی جماعت فراہم کر دی جس نے برطانوی حکومت کو آخری دن تک پریشان رکھا۔

ب۔ غریبوں میں زرداروں کے استحصال کا ردِ عمل قوی کیا۔

ج۔ ایک ایسی سرفروش جماعت (مجلس احرارِ اسلام) پیدا کی جس نے صوبے کے ذہنی انقلاب کو ابھارنے میں کماحقہ حصہ لیا۔

د۔ عام لوگوں کے دلوں سے مختلف الاصل مفادات کا خوف خارج کیا۔

ر۔ رسوم و عقائد کی خرابیوں کے بعض ایسے قلعے مسمار کئے جو اسلام کی حقیقی روح کو گھن کی طرح کھا رہے تھے اور یہ وہ کارنامے ہیں کہ پاکستان کی سرزمین حالات کی آئندہ تبدیلیوں کے ساتھ نہ صرف ان کی اہمیت کو محسوس کرے گی بلکہ تاریخ شکر گزار ہو گی کہ عطاء اللہ شاہ بخاری جیسے خطیب نے اس کے ایک خاص عہد کی پرورش کی ہے۔

شاہ جی اسلام کی چلتی پھرتی تلوار ہیں

علامہ اقبالؒ

ان کا اردو خطابت میں وہی مقام ہے جو اردو شاعری میں میر انیس کا درجہ ہے۔ ملک و ملت کا ہر گوشہ ان کا شکر گزار ہے۔ اللہ کے ہاں ان کا بڑا اجر ہے۔

مولانا ابوالکلام آزادؒ

آپ مقرر نہیں ساحر ہیں۔ تقریر نہیں جادو کرتے ہیں۔ آپ لوگوں کو مرغ و بریانی کھلائیں گے تو ہمارا ساگ ستو کون پوچھے گا؟

مولانا محمد علی جوہرؒ

میں جب تک زندہ ہوں
تمہاری جڑوں میں پانی پھیرتا رہوں گا

۱۹۲۱ء میں تحریک خلافت کے سلسلہ میں حضرت امیر شریعت گرفتار ہوئے تو انہیں لاہور سنٹرل جیل کے "گورا وارڈ" میں قید کر دیا گیا۔ ابھی دو ہفتے ہی گزرے تھے کہ اچانک ایک روز سپرنٹنڈنٹ جیل نے شاہ جی کو اپنے دفتر میں طلب کیا اور انگریزی میں لکھی ہوئی ایک درخواست انہیں پیش کی کہ وہ اس پر دستخط کر دیں جس پر درج تھا۔

"اگر اس دفعہ حکومت مجھے معاف کر دے تو میں یقین دلاتا ہوں کہ آئندہ میری کوئی حرکت ایسی نہیں ہوگی جس سے حکومت کو کسی قسم کی شکایت پیدا ہو"

شاہ جی نے اس معافی نامہ کے ہزار ٹکڑے کر کے اسے پاؤں تلے روندا اور تین دفعہ اس پر تھوکا۔ پھر غضبناک ہو کر واپس لوٹ گئے۔

اس واقعہ کے چند ہی دنوں بعد شاہ جی کو پنجاب کی سخت ترین جیل ڈسٹرکٹ، جیل میانوالی منتقل کر دیا گیا۔

مدت قید ختم ہونے میں ابھی چھ ماہ باقی تھے کہ ایک بار پھر یہی عمل دہرایا گیا۔ سپرنٹنڈنٹ جیل نے معافی نامہ دستخط کے لئے پیش کیا۔ تو شاہ جی نے فرمایا۔

"میں جو کچھ کہتا ہوں وہ اس پر لکھو گے"

سپرنٹنڈنٹ:۔ جی ہاں۔

شاہ جی:۔ تو پھر لکھو "میں جب تک زندہ ہوں تمہاری جڑوں میں پانی پھیرتا رہوں گا"

حضرت امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاری

شورش کاشمیریؒ

شاہ جی کی عادتیں

شاہ جی خوبصورت عادتوں کے ایک دلفریب انسان تھے۔ قرونِ اولیٰ میں ہوتے تو صحابہ کی صفِ اوّل میں ہوتے۔ اور کربلا میں سیدنا حسینؓ کے ساتھ شہید ہوتے۔ انکی درویشی اور فقیری میں بوئے اسد للّٰہی بھی تھی اور غیرت شبیری بھی۔ وہ ابو ذر غفاریؓ کی طرح املاک پیدا کرنے کے ہر طریق کو ناجائز سمجھتے۔ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رحمتوں سے بے پناہ ارادت رکھتے تھے۔ عہد عتیق کے روم و یونان میں ہوتے تو ڈیماسیتھنیز یا سسرو ہوتے۔ جنہوں نے خطابت کے اصول مدون کئے۔ ان لوگوں کی عصری کا شکار کرتے رہے گمشدہ یونان میں ہوتے تو عجب نہ تھا کہ سقراط کی طرح انہیں بھی زہر کا پیالہ پینا پڑتا۔ ویدوں کے ہندوستان میں ہوتے تو ہمالیہ کے غاروں میں رشیوں کے ساتھ قدم ملا کر چلتے اور گیتا کے ورق اجالتے پھرتے یا پھر گوتم بدھ کے ساتھ ہوتے جن کی یادیں ایلوار اور اجنتا کے محیر العقول غاروں میں نہ مٹنے والی خطابت کا شاہکار محسوس ہوتی ہیں۔

شاہ جی ایک عجیب و غریب تصویری مرقع تھے۔ ان کے چہرے مہرے پر فقرائے اسلام کا طنطنہ اور دانشورانِ یونان کا ہمہ ہالہ کئے ہوئے تھا۔ آدمی ان کے نزدیک آکر اور نزدیک ہو جاتا تھا۔ ان کے مخالف وہی لوگ تھے جو ان سے دور رہے تھے۔ یا پھر انگریزوں کے پٹھو، مسلمانوں کے دشمن اور قادیانیت کے متبع وہ نور کا تڑکا تھے کہ اندھیری رات اس کی گرفت میں آکر فقرو ہو جاتی ہے یا پھر اوس کا قطرہ تھے کہ غنچوں کا منہ دھلاتے اور پھول کھلاتے تھے۔ ان کی عادتیں جو ان کے انفاس کے ساتھ ساتھ چلتی تھیں۔ اتنی سادہ اور عجیب تھیں کہ عظیم کتابی انسانوں کے سوا ان کا وجود فی زمانہ شاذ ہی ملتا ہے۔ مثلاً

ا۔ وہ مستقبل کے بارے میں کچھ نہیں سوچتے تھے۔ ہر چیز کو اللہ کی رضا کے تابع سمجھتے حال سے انہیں بس اتنا ہی تعلق تھا کہ اس کو جھنجھوڑتے اس پر کڑھتے یا کبھی کبھار اس پر قہقہے لگاتے تھے۔ البتہ وہ ماضی کے انسان تھے۔ امور ماضی ہی سے محبت کرتے تھے۔ ان کا اوڑھنا بچھونا، چلنا پھرنا، کھانا پینا، سونا جاگنا، سوچنا سمجھنا، بولنا ہنسنا، سب ماضی کا مرہون اثر تھا۔ اور اسلام کے ماضی کے سوا کسی بھی ماضی کے قائل نہ تھے۔ وہ تہبند اس لئے باندھتے تھے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تہبند باندھا کرتے تھے۔ وہ کسی بھی غذا کے عادی نہ تھے۔ ساگ ستو جو ملا خدا کا شکر کیا اور کھالیا۔ میں نے ہری مرچوں کی رغبت کے سوا ان میں کسی شے کے لئے رغبت نہیں پائی انہیں بغیر پکائے بھی کھا جاتے اور قیمے میں بھون کر بھی۔

ٹھنڈا پانی کثرت سے پیتے۔ بلکہ تقریر کرتے وقت تھرماس ساتھ رکھتے تھے اور برف ہی چباتے چلے جاتے۔ انکا گلا برفاب سے اور کھلتا بلکہ کرارا ہوتا تھا۔

اکثر فرش پر ہی بستر کھول کر سو جاتے یا پھر بان کی کھردری چارپائی پر۔ وضو کے لئے لوٹا ہمیشہ ساتھ

رکھتے۔ جب پان کھانے کی عادت پختہ ہو گئی تو تیلیوں کی ایک غریب الحال ٹوکری میں پانوں کی ڈھولی، چونا، کتھا اور سپاری کی گولیاں کھدر کے ٹکڑوں میں لپیٹ لپاٹ کے رکھتے تھے۔

۲۔ سحر خیز تو تھے ہی۔ یعنی صبح کی نماز قضاء نہ ہونے دیتے۔ نماز انکی فطرت ثانیہ تھی۔ مگر رات گئے دیر سے سونے اور یہ ان کی فطرت ثانیہ ہو چکی تھی۔ جلسوں میں آخری مقرر وہی ہوتے۔ اور ان کا کوئی جلسہ بارہ ایک بجے رات سے پہلے ختم نہ ہوتا تھا۔ اور صبح ہو جانا تو عام معمول تھا۔ جلسہ ختم ہو جانے کے بعد عقیدتمندوں کا ہجوم گھنٹہ دو گھنٹہ گھیرے رکھتا جس روز جلسہ نہ ہوتا یا گھر پہ ہوتے تو محفل آرائیاں فرصت نہ دیتیں۔ وہی دو بجے شب کا سونا مقدر ہوتا۔ البتہ رمضان شریف کے مہینے میں یہ معول نہ رہتا۔ تراویح پڑھ چکنے کے بعد محفل جماتے اور سحری سے کچھ ہی عرصہ پہلے ذکر الہیٰ میں مشغول ہو جاتے آخری برسوں میں حال یہ تھا کہ صحبت آرائیاں بالکل مختصر کر دی تھیں۔ وقت کا بڑا حصہ یاد الہیٰ میں بسر کرتے۔ بلکہ صورت حال یہ تھی کہ عبادت کے لمحے قریب ہوتے تو دوستوں سے کہتے کہ بھائی میری گدائی کا یعنی اللہ سے مانگنے کا وقت ہے۔ محفل برخاست ہونی چاہیئے۔ پھر خود ہی اٹھ کھڑے ہوتے۔

۳۔ ہمیشہ ہی موٹا جھوٹا پہنتے، گھر میں بھی یہی حال تھا فقر و استغنا کی سچی تصویر تھے۔ مغربی تہذیب کے خفی و جلی اثرات کا سایہ بھی ان سے میلوں دور رہتا۔ میں نے ان کے گھر میں مغربی مصنوعات مغربی تصورات اور مغربی نظریات کا گزر تک نہیں پایا۔ ان کی فرنگ دشمنی اور یورپ بیزاری کا یہ عالم تھا کہ بس میں ہوتا تو اپنے گھر میں بجلی اور پنکھا بھی نہ لگواتے۔ ان دو چیزوں کے سوا میں نے ان کے ہاں کبھی کوئی یورپی چیز نہ دیکھی۔ ریڈیو کے وہ اتنے مخالف تھے کے سینکڑوں مرید تھے جنھوں نے ریڈیو سیٹ پیش کرنا چاہا۔ مگر جھنجھلا کر انکار فرما دیا۔ گھر میں استاد جی لانا چاہتے ہو؟

۴۔ راقم الحروف نے عرض کیا شاہ جی زمانہ بہت بڑھ چکا ہے۔ اپنے بچوں کو انگریزی مدرسوں میں داخلہ لے دیں۔ زمانہ کا تقاضا ہے فرمایا بابا مجھے معاف رکھو میں اس زمانہ کا آدمی نہیں۔ تم مجھے محمد قاسم نانوتوی اور محمود حسن کی روحوں سے بغاوت کرنے کی ترغیب دیتے ہو؟ یہ کیوں نہیں کہتے کہ تمہارے بچے مر جائیں۔ یا اپنے ہاتھوں بچوں کو قتل کر دوں۔

۵۔ انگریزوں سے نفرت کا یہ عالم تھا کہ "لعنت بر پدر فرنگ" ان کا نعرہ قلندری تھا اور موڈ میں آ کر اس زور سے بلند کرتے تھے کہ در و دیوار گونج اٹھتے تھے۔

۶۔ کبھی کسی شخص کی غیبت نہیں کی۔ نہ دشمن کی نہ دوست کی صرف خیالات سے اختلاف کرتے یا ان پر سخت قسم کی جرح و قدح۔ ان کے نزدیک عیب بینی سب سے بڑا عیب تھا۔ جس شخص کی قومی غداری پر طبعیت منغض ہوتی فرماتے جو فصل بوئی ہے دعا کرتا ہوں کہ خود کاٹ کے مرے۔ میں نے ان کی زبان سے کبھی کوئی گالی نہیں سنی۔ البتہ فرنگیوں اور ان کے خانہ زادوں کے بارے میں درشت سے درشت الفاظ بھی کہہ جاتے تھے۔

۷۔ بظاہر ان کا کوئی کاروبار نہ تھا۔ ان کے خاص معتقدین مدد فرماتے تھے۔ مگر نہ تو کبھی چھپ کر ہدیہ

قبول فرماتے اور نہ اس پر پردہ پوشی ہی کے قائل تھے۔ جب کوئی مٹھی بند کر کے کچھ دینا چاہتا تو مٹھی کھول دیتے کہ چھپاتے کیوں ہو کیا چوری کا مال ہے؟ جماعت سے ایک دمڑی نہ لیتے یہ واقعہ ہے کہ انہوں نے کسی جماعت سے کبھی نہ کرایہ وصول کیا نہ وظیفہ لیا نہ قرض حسنہ اور نہ اعانت قبول کی۔ ان کے مداح انہیں خود ہی بے نیاز رکھتے اور وہ ہر لحاظ سے بے نیاز تھے۔

جو بے نیاز کا بندہ ہے بے نیاز رہے۔

۸۔ ان کے پاس ایک بہت پرانا بٹوہ تھا مگر اس میں کچھ دھیلے اور پائیاں پڑی تھیں۔ جو ملتان کے ایک مجذوب نے دی ہوئی تھیں۔ انہیں بٹوہ میں تبرکاً رکھ چھوڑا تھا۔ فرماتے ان کی برکت سے بٹوہ کبھی خالی نہیں رہا۔

۹۔ فرماتے جو لوگ روٹی کے لئے جدوجہد کرتے اور اسی کے لئے جیتے ہیں ان میں اور ایک کتے میں کوئی فرق نہیں وہ بھی روٹی کے لئے بھونکتا اور دم ہلا کر مالک کے پیچھے پیچھے چلتا ہے۔ روٹی کوئی چیز نہیں اصلی چیز عقیدہ اور اس کے مطابق زندگی بسر کرنے کی دھن ہے۔

۱۰۔ مذہباً پکے مسلمان اور بہ لحاظ مسلک حنفی العقیدہ تھے۔ دیو بند کے مدرسۂ فکر کے پیرو۔ لیکن طبعیت میں کسی کے لئے تنفر نہ تھا۔ ہر فرقے کی اچھائیوں سے محبت کرتے۔ مرزائیوں کو تو مسلمان ہی نہ سمجھتے تھے۔ صوفیاء اور اولیاء کا بے حد احترام کرتے اور مزے میں آکر فرماتے بھئی میں تو چشتی بھی ہوں نقشبندی بھی، قادری بھی، صابری اور سہروردی بھی۔ مولانا داؤد غزنوی نے شکایت کی کہ مظہر علی اظہر اپنے بیٹے قیصر مصطفیٰ کی شادی پر باجا بجوا رہا ہے۔ فرمایا بھئی ان سے گلہ نہ کرو وہ تو محرم کے دنوں میں باجے بجوا کر تعزیہ نکالتے ہیں۔

۱۱۔ اپنے دوائر سے باہر عام مجلسی دعوتوں میں شاذ ہی شریک ہوتے تھے۔ میں نے انہیں اپنے بھائی یورش کاشمیری کے لئے دعائے مغفرت مانگنے کو کہا۔ تو فرمایا! اجی چھوڑو! اس ننھی کلی سے کون حساب لے گا۔ خدا ہماری اور تمہاری طرح تھوڑی ہے۔ قیامت کے روز چنگیز، ہلاکو، ہٹلر، مسولینی وغیرہ کا حساب ہی لمبا ہو گا ہماں شماں سے کون پوچھتا ہے۔

۱۲۔ وعدہ بہر حال پورا کرتے سال کے تین سو پینسٹھ دنوں میں تین سو تیس دن تقریریں فرماتے لیکن وقت کی پابندی ان کے بس کا روگ نہ تھا۔ جلسہ میں دیر سے پہنچتے اور جس کے ہاں جا کر ملنا ہو وہاں وقت مقررہ کا دو چار گھنٹے اوپر ہو جانا تو معمولی بات تھی۔ مولانا آزاد سے ملنے کا وقت طے کیا۔ وہ سیکنڈوں پر نگاہ رکھنے والے انگریز دو گھنٹے لیٹ پہنچے۔ وقت ہو رہا تھا۔ دوستوں نے متوجہ کیا مگر قیلولہ کرنے لگے گاندھی جی سے بھی یہی کیا۔ مولانا حبیب الرحمان کہا کرتے تھے کہ شاہ جی نے انگریز کے خلاف اتنا جہاد کیا ہے کہ کئی انسانوں کا مجموعہ بھی یہ نہیں کر سکا۔ مگر وقت کے اسراف کا یہ حال ہے کہ آج اگر یہ کہیں کہ فلاں روز ٹھیک اتنے بج کر اتنے منٹ پر شاہ جی کو وائسرائے لیگل لاج بھجوا دو ہم آزادی کا پروانہ دے دیں گے تو آزادی کبھی نہیں ملے گی کیونکہ شاہ جی اور وقت کی پابندی دو متضاد چیزیں ہیں۔

۱۳- اپنی تعریف سے کبھی خوش نہ ہوتے۔ نہ پسند کرتے نہ اجازت دیتے۔ اخباروں میں چھپنے چھپانے کے سخت خلاف تھے۔ انہوں نے پریس کانفرنس کا وجود ہی نہ دیکھا تھا۔ اخبارات کو عمر بھر کبھی کوئی بیان نہیں دیا۔ نہ مضمون لکھا۔ آزاد میں ان کے نام سے دو چار مضمون چھپے، وہ راقم الحروف کے لکھے ہوئے لیکن ان کی گفتگوؤں کا عکس تھے۔ اس معاملہ میں وہ عام لیڈروں کی کمزوریوں سے اتنے بالا تھے کہ ان کی ملکوتی صفات پر حیرت ہوتی تھی۔

۱۴- پان خود بناتے، چائے بھی خود ہی تیار کرتے، خود پیتے اور دوسروں کو پلواتے تھے۔ اللہ سے حد درجہ ڈرتے اور حضور ﷺ سے والہانہ ارادت رکھتے تھے۔

۱۵- ان کے پاس کوئی وسیع لائبریری نہ تھی۔ فرماتے قرآن کے سوا کسی اور کتاب کے مطالعہ کی ضرورت نہیں رہی نہیں پڑھی۔ ابتداءً خوب کتابیں پڑھی تھیں پھر مطالعہ کا یہ ذوق کچھ دنوں ساتھ رہا۔ آخر قرآن پاک ہی کو رفیق بنا لیا۔ مولانا طفیل منگلوری کی کتاب "مسلمانوں کا روشن مستقبل" ایک زمانہ میں ساتھ رکھتے اور ساتھیوں کو اس کے پڑھنے کا مشورہ دیتے تھے۔ مولانا ابوالکلام آزاد کا "الہلال" ظفر علی خان کا "ستارہ صبح" انہوں نے ڈوب کر پڑھے تھے۔ علامہ اقبال کے کلام کا بڑے انہماک سے مطالعہ کیا تھا۔

۱۶- اپنی ذات کی ہر حال میں نفی کرتے اور جماعت کے دوستوں یا جماعت سے باہر کے انگریز دشمنوں کے قصیدے پڑھاتے اور دعائیں دیتے تھے۔

انگریز کا دوست میرا دوست نہیں ہو سکتا

جس طرح مولانا ظفر علی خاں کی صحافت کو یہ شرف خاص حاصل رہا کہ وہ جب تک جوان رہے پنجاب کے کاسہ لیس خاندانوں اور ان کے ناقوس ہائے خصوصی کے لئے دلچسپ الفاظ اور ترکیبیں وضع کرتے رہے اسی طرح سید عطاء اللہ شاہ بخاری اس معاملہ میں ممتاز و منفرد تھے کہ وہ "وفاداری بشرط استواری" کے خمیر میں گندھے ہوئے ان خاندانوں کو نہ تو خاطر ہی میں لاتے تھے اور نہ ان کے دل و دماغ پر ان کی طرف سے حرف اعتبار نقش ہوتا تھا۔

شہروں اور لوگوں کے بارے میں ان کی رائے بڑی نپی تلی ہوتی جس شخص کے بارے میں کوئی بھرپور رائے قائم کر لیتے پھر اس میں ترمیم نہ کرتے۔ اس سختی سے اس پر جمے رہتے کہ ردو بدل کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا۔

ان کا عقیدہ تھا کہ قدرت کبھی معاف نہیں کرتی۔ اللہ کے ہاں دیر ہے اندھیر نہیں۔ ان کی آنکھیں بہت کچھ دیکھ چکی تھیں۔ اور بہت کچھ دیکھ رہی تھیں۔ فرماتے برہنہ گفتن کا موقع نہیں ورنہ جو کچھ جہد آزادی کے دور میں ہوتا رہا اور برطانوی سرکار نے خود کاشتہ خاندانوں کے لئے جو کچھ کیا یا ان خاندانوں نے برطانوی سرکار کے لئے جو کیا وہ روداد اتنی تلخ ہے کہ عرش و فرش کانپ اٹھتے ہیں۔ اس معاملے میں وہ کئی واقعات

بیان کیا کرتے تھے۔ مرحوم امرتسر میں ایک بزرگ کرسی نشین، درباری، آنریری مجسٹریٹ، خان بہادر اور کیا کچھ نہیں تھے۔ امرتسر کے مارشل لاء نے سرکار میں انکا ستارہ چمکادیا۔ قصہ مختصر کہ تحریک خلافت ختم ہو گئی۔ جلیانوالہ باغ کاحادثہ بھی ابھر کر ٹھنڈا پڑ گیا۔ قید و بند کے ابتدائی دن بھی لد چکے تھے۔ شاہ جی خیر الدین کی مسجد میں جمعہ پڑھنے یا پڑھانے جاتے۔ جب وہ دروازے پر پہنچتے تو خان بہادر دروازے پر کھڑے ہوتے اور جھک جھک کر سلام کرتے۔ شاہ جی نے سلام کا جواب کبھی نہ دیا۔ چپ چاپ اندر چلے جاتے۔ شاہ جی کا انداز تھا کہ وہ اپنے قاتلوں کو بھی بخش دیتے تھے۔ ان جیسے عفوو در گزر کے عادی اور ہنستے بولتے شخص کا یہ رویہ دوستوں کے لئے معمہ تھا۔ خان بہادر نے اس روش کے باوجود سلام کرنا ترک نہ کیا۔ شاہ جی نے بھی قبول کے لئے نہ کبھی ہاتھ ہلائے نہ زبان اور نہ اس کی طرف آنکھیں ہی اٹھا کر دیکھا۔

ایک دن نیازمندوں میں سے ایک نے سوال کیا "شاہ جی، خان بہادر صاحب آپ کو سلام کرتے ہیں۔ آپ جواب نہیں دیتے۔ وجہ کیا ہے" فرمایا، کوئی بات نہیں کبھی گھر میں ہوں تو پوچھ لینا۔ بات آئی گئی ہو گئی۔ کچھ دنوں بعد گھر میں تنہا تشریف فرما تھے کسی طرح خان بہادر کا ذکر چھڑ گیا۔ تو واقعہ بھی یاد آگیا۔ فرمایا "بات کوئی نہیں میں اس شخص کا دوست ہی نہیں ہو سکتا جسے انگریز دوست رکھتا ہو۔ یا جو انگریز کو دوست سمجھتا ہے۔ اصرار پر واقعہ بیان کیا کہ امرتسر کے مارشل لاء میں نیشنل بنک کے فرنگی مینجر کو مشتعل ہجوم میں سے کسی شخص نے چھت سے گرا کر ہلاک کر دیا۔ پولیس نے بہتیرا تلاش کیا لیکن مجرم کا سراغ نہ ملا۔ مقتول کی بیوی نے ملزموں کو پکڑ کر کیفر کردار تک پہنچانے کا مطالبہ کیا حکومت نے انعامی اشتہار نکالا کہ جو شخص ملزم کا پتہ دے گا اس کو اتنے ہزار روپے نقد انعام دیا جائے گا۔ ڈپٹی کمشنر نے نجی طور پر بعض "معززین" سے یہ بھی کہا کہ ان کی وفاداری کا امتحان ہے اگر انہوں نے مجرم کے پکڑوانے میں مدد کی تو موعودہ انعام کے علاوہ خطاب بھی دیا جائے گا۔ اور آنریری مجسٹریٹی بھی۔

مجرم نہ ملا۔ ان خان بہادر صاحب نے جو اس وقت تک خان بہادر نہ تھے اور محض علاقائی تھانیدار کے معاون ہی تھے اپنے محلے کی ایک غریب الحال بیوہ کے پاس گئے جس کا ایک ہی نوجوان بچہ تھا۔ اس سے کہا کہ تم اپنے بچہ سے کہو کہ وہ پولیس میں یہ بیان دے دے کہ میں نے بنک مینجر کو کوٹھے سے گرایا ہے میں تم سے حلفاً وعدہ کرتا ہوں کہ تمہارے بچہ کو دو ماہ کے اندر اندر رہا کرا لوں گا ورنہ حکومت سختی پر تلی ہوئی ہے۔ تمہارے بچہ کا نام لیا جارہا ہے۔ پولیس نے پکڑلیا تو رہائی ناممکن ہے۔ وہ جھوٹے گواہ ڈال کر بھی پھانسی پر لٹکوا دے گی۔ بڑھیا جھانسے میں آگئی۔ نوجوان بھی بے پڑھا لکھا اور بیمار و لاغر تھا فریب میں پھنس گیا۔ "خان بہادر" نے قرآن مجید پر حلف اٹھایا کہ دو ماہ تک ضرور ہی رہا کرادوں گا۔ غرض نوجوان مذکور نے خان بہادر کی مخبری پر اپنے آپ کو پولیس کے حوالہ کر دیا۔ پھر جیسا کہ اسے کہا گیا اس نے اعتراف بھی کر لیا۔ مقدمہ چلا چٹ منگنی پٹ بیاہ موت کی سزا ہو گئی جو اسے آخر کار دار کے تختہ پر لے گئی۔ بڑھیا نے خان بہادر کا دامن پکڑا۔ خان بہادر اثنائے مقدمہ سے لے کر سزائے موت تک یہی اعلان کرتا رہا کہ فکر نہ کرو تمہارا بیٹا رہا ہو جائے گا۔ یہ صرف قانون کی کارروائی ہے۔ گورنر صاحب نے مجھ سے وعدہ کر رکھا ہے۔ شور نہ کرو۔ وہ رہا ہو

جائے گا۔ ضرور گھر آئے گا میں لے کر آؤں گا۔ بڑھیا ان طفل تسلیوں پر جیتی رہی۔ آخر ایک دن بیٹا پھانسی پا کر گھر آ گیا۔ خان بہادر صاحب پھانسی کے دن تک یہی تسلیاں دیتے رہے کہ فکر نہ کرو تمہارا بیٹا ضرور گھر آئے گا۔ اور بیٹا آ گیا۔ بڑھیا نے بیٹے کی لاش دیکھی تو سر پیٹ لیا۔ چلا اٹھی۔ ہاہا کار مچ گئی تب افشائے راز سے بھی کچھ نہ بنتا تھا۔

خان بہادر صاحب انعام و خطاب پا گئے آنریری مجسٹریٹی مل گئی۔ جائیداد بھی ہاتھ آ گئی۔ غرض سرکاری دوائر میں ان کا طوطی بولنے لگا۔ لیکن اس بڑھیا کا بیٹا واپس نہ آیا البتہ ایک دن ماں خود ہی اس کے پاس پہنچ گئی۔

قدرت کا غائبانہ ہاتھ مسکراتا رہا مکافات نے بہت دنوں کا چکر کاٹا۔ ایک نوجوان بیٹا اوباشوں کے ہاتھوں قتل ہو گیا۔ آنریری مجسٹریٹی کو ایک ڈپٹی کمشنر کی ناراضی نے ہضم کر لیا کارخانہ کو آگ لگ گئی خود ٹانگ ٹوٹی اور تصویر عبرت ہو کر موت کی گود میں چلا گیا۔

شاہ جی نے کہا جب یہ شخص میرے سامنے آتا ہے تو اس کے ضمیر میں اسی کانٹے کی چبھن ہوتی ہے۔ خدا کا خوف نہیں۔ میرے سامنے اس بچے کی تصویر آ جاتی ہے جیسے وہ اس کی گردن مارنے کے لئے اپنا ہاتھ بڑھا رہا ہو۔ اور میں منہ پھیر لیتا ہوں کیونکہ مجھے اس کی جھریوں میں اس کی ماں کے آنسوؤں کی تہیں جمی ہوئی نظر آتی ہیں۔ اور وہ بال کھولے چلا رہی ہے۔

ڈر اس کی دیر گیری سے کہ سخت ہے انقلاب اس کا

یہ واقعہ سنا کر شاہ جی کانپنے لگے کہ اس دنیا میں یہ بھی ہوتا ہے۔ اور جب انگریزوں کے لئے غریبوں کے بچے کٹوانے والے ہمیں غدار کہتے ہیں تو فطرت بھی سرکوبی کے لئے ہاتھ اٹھا لیتی ہے۔

❖

وہ بولتے نہیں موتی رولتے ہیں ان کا وجود چشمۂ صافی ہے

مولانا شوکت علیؒ

بخاری مرحوم جیسا اسلام کا شیدائی دنیا میں پیدا ہونا مشکل ہے

مولانا داؤد غزنویؒ

اے کاش! میں اس شخص کو مسلم لیگ میں لا سکتا؟ اگر یہ میرے ساتھ ہو تو چھ ماہ کے اندر اندر ملک میں انقلاب برپا کر دوں

نواب بہادر یار جنگؒ

انہوں نے خطابت میں انا الحق کی بنیاد رکھی ہے وہ بیک وقت سرو دسمن اور دارورسن کے خطیب ہیں

سردار عبدالرب نشترؒ

شورش کاشمیری مرحوم

اس کی باتوں میں گلوں کی خوشبو

شاہ جی خود ایک بڑے آدمی تھے۔ لیکن اپنے عہد کے بڑے آدمیوں سے انکی مطلق خط و کتابت نہ تھی۔ فرماتے انسانی سوسائٹی میں سب فتنے تحریر سے پیدا ہوتے ہیں۔ تلواروں نے انسانوں کے جسموں کو قتل کیا۔ لیکن قلموں نے انسانوں کی روحیں فنا کر ڈالی ہیں۔ اس معاملہ میں ان سے زیادہ بے نیاز آدمی میں نے نہیں دیکھا۔ جن دنوں میں ان کی سوانح عمری لکھ رہا تھا۔ انہوں نے مجھ سے ذرہ برابر تعاون نہیں کیا۔ بلکہ جب میں سوانح عمری مکمل کر کے ان کے خاندانی حالات کا باب سنانے کے لئے حاضر ہوا تو فرمایا، چھوڑو اس کو، کس راہ پر پڑ گئے ہو؟ صاف انکار کر دیا۔ ان کی بے نیازی معراج کمال پر تھی وہ کسی کو اپنی فوٹو کھینچنے نہیں دیتے تھے اور کھنچوانے کا تو سوال ہی خارج از بحث تھا انکا ایک فوٹو شاید کسی طرح کی اجازت سے کھینچ گیا ہے تاہم باقی تمام تصویریں ان کی منشاء مرضی اور ارادے کے خلاف ہیں اور فوٹو گرافروں کی اپنی ہوشیاری کا نتیجہ، ان کی بعض تصویریں "چٹان" کے فوٹو گرافروں کی حاصل کردہ ہیں۔ جو انہیں گفتگو میں مصروف رکھ کر بنائی گئی ہیں۔ راقم الحروف کی تحریر کردہ سوانح عمری میں انکی جو تصویر ہے، کتاب کا پہلا نسخہ ان کے ہاں پہنچا تو کسی معتقد یا بزرگ نے اعتراض نما سوال کیا۔ تصویر پھاڑ کر اس کے حوالے کر دی۔ اور کہا اس کو جوتے مارو ضرور مارو۔ سوچتے کیا ہو؟ یہ بے نفسی اب کہاں؟ اور اس استغنا کے نمونے کوئی کہاں سے لاسکتا ہے؟

فی الحقیقت وہ ایک عہد، ایک ادارہ، ایک انجمن، اور ایک تاریخ تھے۔ گفتگو طرازی میں ان کا مثیل ملنا مشکل ہے وہ خاص صحبتوں میں بالکل ایک ادیب، ایک فقیر، ایک شاعر، ایک درویش، ایک متکلم، ایک صوفی، ایک نقاد، ایک عالم اور ایک دوست ہوتے تھے۔ ان میں سے جس تار کو بھی چھیڑ لو وہی نغمے پھوٹنے لگتے۔ پھر گلفشانیٔ گفتار بہار کی طرح پھیلتی چلی جاتی تھی۔ ایک نقص یہ ضرور تھا کہ اپنی گفتگو لکھنے نہیں دیتے تھے۔ ورنہ انہوں نے تمام زندگی الفاظ و تراکیب کے اتنے انبار لگائے اور لطائف و ظرائف کے اتنے موتی بکھیرے ہیں کہ ایک شاہکار دماغ ہی سے اس کی توقع کی جاسکتی ہے۔ پھر حکمتوں اور بذلہ سنجیوں میں تو وہ اپنا ثانی نہیں رکھتے تھے۔ حضرت مولانا اشرف علی تھانوی کا ارشاد تھا کہ "شاہ جی کی باتیں عطاء اللّٰہی ہوتی ہیں"۔

O۔ شاہ جی کی ساری زندگی سیاسیات کے چکر میں بسر ہوئی۔ گو عمر کا غالب حصہ دین ہی کی خدمت میں گزار اگر کہنے کا مطلب یہ ہے کہ وہ سیاسیات سے دستبردار ہونے کی خواہش کے باوجود ۱۴ اگست ۱۹۴۷ء تک اپنے آپ کو سیاسیات سے الگ نہ کر سکے۔ لیکن مسجد شہید گنج کے انہدام کے بعد ان کا یہ عقیدہ پختہ ہوچکا تھا کہ سیاست کا مطلب فتنہ پروری اور فتنہ انگیزی ہے۔ فرماتے سارے قرآن میں پالیٹکس کے مفہوم میں سیاست کا لفظ نہیں؟۔ اس کے معنی ہی مکر کے ہیں۔ اور فرنگی مقامروں کی ایجاد ہے۔ جس کا مطلب ہی فریب دہی ہے۔ سیاسیئن کے وعدے پورا ہونے کے لئے نہیں کئے جاتے بلکہ ٹالنے کے لئے کئے جاتے ہیں۔

O۔ حضرت حسینؓ کی شہادت پر کبھی تقریر نہیں فرمائی۔ ان جیسا لسان جو خطابت کے سحر سے وقت کو گوش بر آواز کر لیتا تھا سانحہ کربلا پر بولنے سے طرح دیتا رہا۔ کئی دفعہ دوستوں نے اصرار کیا کہ عاشورہ کے دنوں میں سانحہ کربلا پر تقریر فرمائیے۔ انکار ہی کرتے رہے۔ ایک دن میں نے سبب پوچھا تو کہا کس طرح بیان کروں؟ کہ نانا کا کلمہ پڑھنے والوں کے ہاتھوں نواسوں پر کیا بیتی؟ مجھ میں حوصلہ نہیں کہ اس سانحہ کو بیان کر سکوں۔ اپنے اندر طاقت نہیں پاتا البتہ اپنے حال پر غور کر کے دل کو تسلی دے لیتا ہوں کہ مسلمانوں کی "پرانی ریت" ہے۔

O۔ جن دنوں بعض سیاسیئن کی بدولت مدح صحابہ اور تبرا ایجی ٹیشن کا زور بندھا ہوا تھا شاہ جی نے دہلی دروازہ کے باہر ایک عظیم الشان جلسہ کو خطاب کیا اور فرمایا قدح صحابہ کرنے والو! خدا کے خوف سے ڈرو" اتنے میں کسی نے دور کونے سے آواز دی۔

"شاہ جی! خدا کا خوف کریں۔ سید ہو کر خلافت کے غاصبوں (معاذ اللہ) کی مدح کرتے ہو"۔

بس یہ ایک جملہ بخاری کو جلال پر لے گیا۔ فرمایا کیا کہتے ہو؟ میں علی کا بیٹا ہوں اور صدیق، عمر، عثمان رضی اللہ عنہم کی مدح کرتا ہوں پہلے بھی کرتا رہا ہوں اور آئندہ بھی کرتا رہوں گا تم کون ہو؟

ہائے وہ لوگ جنہیں رسول اللہ ﷺ کے پہلو میں جگہ ملی ہو تم انہیں گالی دیتے ہو۔ ظالمو! حشر کے دن آقا کو کیا جواب دو گے؟ پھر اس کے بعد خلفائے راشدین کے فضائل و مناقب پر وہ تقریر کی کہ جیسے شہپر جبریل ان کی خطابت کا ہالہ کئے ہوئے تھے۔

O۔ کسی شیعہ نے سوال کیا "علیؓ اور عمرؓ میں کیا فرق ہے۔ فرمایا۔ بڑا فرق ہے علیؓ مرید تھے عمرؓ مراد۔ حضور ﷺ نے خود ان کی آرزو کی۔ اور اللہ سے دعا مانگی تھی۔ فرمایا میں علیؓ کا بیٹا ہوں نفس میرا بھی چاہتا ہے کہ سب کچھ انہیں کی جھولی میں ڈال دوں مگر عمرؓ چھوڑتے نہیں وہ خود منواتے ہیں عمرؓ کو نکال دو اور سوچو کہ تاریخ اسلام میں رہ کیا جاتا ہے؟

O۔ اسی شخص نے پوچھا حضرت خدیجہؓ اور حضرت عائشہؓ میں کیا فرق ہے۔ فرمایا خدیجہؓ کا نکاح محمد بن عبداللہ سے ہوا تھا عائشہ کا عقد محمد رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) سے۔ وہ محمد ﷺ کی زوجہ بنیں یہ نبوت کی۔ یہ گویا ایک ناقص سوال کا شگفتہ جواب۔ لیکن ان لوگوں کے لئے مسکت جواب تھا جو ازواج مطہرات میں بھی تفاوت کے حاشیئے باندھتے ہیں۔

O۔ انہیں صاحب نے لگے ہاتھوں یہ سوال بھی کیا کہ حضرت فاطمۃ الزاہراؓ اور ان کی دوسری صاحبزادیوں، رقیہ، ام کلثوم اور زینب (رضی اللہ عنہم) میں کیا فرق ہے؟ فرمایا فاطمہؓ نبوت سے بعد کی بیٹی ہیں اور باقی نبوت سے پہلے کی بیٹیاں تھیں۔ (مطلب یہ ہے کہ جو چیزیں سرے سے مسئلہ ہی نہیں ہیں انہیں سوال کی صورت دینا بے سود تھا۔ تاہم "غنچہ طرازوں" کو کس بانکپن سے جواب دیتے تھے)

O۔ صاحبزادہ فیض الحسن شاہ ایک زمانے میں جماعت احرار کے اکابرین میں سے تھے۔ آجکل بریلوی

عقائد کے مبلغ ہیں۔ اور نوری و خاکی کے چکر میں محصور۔ کسی نے سوال کیا شاہ جی صاحبزادہ صاحب آپ کو کیوں چھوڑ گئے۔ فرمایا:

"بھائی وہ نوری ہیں ہم خاکی۔ ان نوریوں سے وفا کی امید ہی کیا۔ سب سے بڑے نوری (جبرئیل علیہ السلام) میرے نانا کو راستہ میں (شب معراج) چھوڑ گئے تھے۔ حضور نے کہا آگے چلو، کہا اس سے آگے پر جل جائیں گے نتیجتہً نوری رہ گیا خاکی آگے نکل گیا"

ہائے نہ ہوا بخاری، میاں ﷺ کا حکم مان لیتا خواہ پر ہی جل جاتے میاں کی اطاعت اور آقا کی دہلیز پر تو چلتے۔ اس سے بہتر کون سا موقع تھا۔

چوں رسی بکوئے دلبر بسپار جان مضطر
کہ مبادا یار دیگر برسد بدیں تمنا

O۔ درگاہ امام ناصر جالندھر کے جلسے میں کسی نے اس وقت کا اخلاقی مسئلہ "زیارت قبور" چھیڑ دیا۔ مخالفوں نے شاہ جی کے بارے میں مشہور کر رکھا تھا کہ وہابی ہیں۔ سوال کیا گیا کہ آپ کا زیارت قبور کے بارے میں کیا سوال ہے۔ فرمایا

"اپنے اپنے ظرف اور ذہن کی بات ہے۔ کچھ لوگ انگور نعمت خداوندی سمجھ کر کھاتے ہیں کچھ اس میں سے شراب نکالتے اور عقل کی بازی بدتے ہیں۔ میں بھی اس مزار کی زیارت کر کے آیا ہوں اور تم بھی زیارت کرتے ہو۔ میں خدا کے فضل و کرم سے کچھ لے کر آیا ہوں اور تم ایمان میں سے کچھ دے کر آتے ہو"

سبو اپنا اپنا ہے جام اپنا اپنا

O۔ سیرت کے ایک جلسہ میں فرمایا یہ بڑا نازک مضمون ہے۔ سیاسی تقریر ہو ایک آدھ جملہ نیچے اوپر یا ادھر ادھر ہو جائے تو ڈر نہیں لگتا۔ زیادہ سے زیادہ قید ہو جاتی ہے۔ سال دو سال پانچ سال لیکن سیرت یا حدیث کے مضمون پر بولتے ہوئے ایک آدھ جملہ بھی کم و بیش ہو جائے تو ایمان کا ضیاع ہے اور دوزخ کی آگ۔ اس میدان میں بخاری بزدل ہے جہنم کے قید خانے کی تاب اس میں نہیں ہے۔

O۔ حضور ﷺ کی بشریت کے منکرین کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا۔

"بھائی لوگو! آپ کے کبوتروں کی بھی نسل ہو، اور بٹیروں کی بھی۔ لیکن ایک ہم سید ہی ایسے ہیں کہ جن کی نسل نہیں، حضور ﷺ کو تم بشر نہیں مانتے ہو۔ تو پھر ہم کس کی اولاد ہوئے؟ وہ بشر ہیں مگر ہماری طرح نہیں بلکہ افضل البشر ہیں۔ وہ اپنے قول و عمل اور سیرت و کردار کے حوالے سے سراپا نور ہیں"۔

O۔ فرمایا۔ "علماء اسلام کی پولیس ہیں۔ ان کا فرض ہے کہ قانون کا احترام کرائیں۔ اہل حال بزرگوں کو جو کچھ کہنا ہے اپنے تک محدود رکھیں۔ اگر وہ کھلم کھلا قانون اسلام کی خلاف ورزی کر کے مرتکب ہوں گے تو ہم انہیں پکڑ لیں گے۔ خواہ عدالت میں چھوٹ ہی جائیں"۔ (بحوالہ مولانا قاری محمد طیب رحمہا اللہ)

O۔ کسی نے سوال کیا۔ شاہ جی یہ مردے سنتے ہیں کہ نہیں؟ فرمایا

"سنتے ہوں گے جن کی سنتے ہوں گے ہماری تو زندہ بھی نہیں سنتے ہیں"۔

حاضرین ہنس پڑے مسئلہ ختم ہو گیا۔

O۔ موری دروازے کے باہر کندن شاہ کا تکیہ ہے جسے عام لوگ گھدو شاہ کہتے ہیں اس سے پیوست کبھی ایک باغ تھا۔ جہاں کانگرس کے جلسے ہوتے تھے۔ سائمن کمیشن کے زمانے میں شاہ جی نے یہاں ایک تقریر کی۔ سرکاری لوگوں نے اس تکیئے کے چرسیوں، بھنگیوں اور سلفہ بازوں کو رنگ میں بھنگ ڈالنے کے لئے اکسایا۔ وہ سلفہ کا کش کھینچ کر یا علی مدد کے نعرے لگانے لگے۔ شاہ جی نے کروٹ بدلتے ہوئے کہا۔

"او چرسیو! یہ غلاظت پی کر میرے باپ علیؓ کا نعرہ کیوں لگاتے ہو؟ کیا تمہارے باپ دادا نہیں ہیں؟"۔

(کیا بات کس شگفتگی سے کہی ہے)

O۔ ایک وکیل نے رمضان کے دنوں میں شاہ جی سے بزعم خویش مذاق کرتے ہوئے کہا حضرت! علماء تعبیر و تاویل میں ید طولیٰ رکھتے ہیں کوئی ایسا نسخہ تجویز فرمائیے کہ آدمی کھاتا پیتا رہے اور روزہ بھی نہ ٹوٹے۔ فرمایا سہل ہے قلم و کاغذ لے کر لکھو!

"ایسا مرد چاہیئے جو اس وکیل صاحب کو صبح صادق سے مغرب تک جوتے مارتا جائے یہ جوتے کھاتے جائیں اور غصے کو پیتے جائیں اسی طرح کھاتے جائیں اور پیتے جائیں"۔

فرمایا۔ جاؤ اس طرح کھاتے پیتے رہو روزہ کبھی نہ ٹوٹے گا۔

O۔ اسلامیہ کالج کے طلبہ نے کہا شاہ جی کالج میں ڈاڑھی رکھ کر جانا مشکل ہے۔

فرمایا۔ "ہاں بھائی اسلامیہ کالج میں مشکل ہے خالصہ کالج میں آسان ہے"۔

O۔ مسلم کانفرنس کے ٹوڈیوں کا زمانہ تھا کسی تحریک میں لوگ جیل جا رہے تھے شاہ جی مولانا ظفر علی خاں کی صدارت میں تقریر کر رہے تھے۔ "زمیندار" کی ضبطی پر چندہ کی فراہمی کا ذکر آ گیا۔ ایک شخص نے دور سے کہا "یہ چندہ کھا جا۔ تے ہیں"۔

فرمایا بھائی چندہ ہی کھاتے ہیں سور تو نہیں کھاتے اور مجمع زعفران زار ہو گیا۔ پھر فرمایا:

"ان تنظیموں کو چندہ دو یہ لوگ قربانی کے بکرے ہیں۔ کھائیں گے تو جیل جائیں گے، پھانسی پر چڑھیں گے۔ قربانی کے بکروں کو بھوکا مارنا چاہتے ہو"۔

O۔ کسی نے کہا شاہ جی مجلس کے بعض لوگ اب لیگ میں چلے گئے ہیں یعنی اس سے تعاون فرما رہے ہیں۔ فرمایا ہاں بھائی کچھ حسینؓ کے پیروکار تھے کربلا میں ذبح ہو گئے کچھ حسنؓ کے پیرو ہیں انہوں نے صلح و آشتی کی راہ اختیار کی دونوں کے اسوۂ حسنہ کی پیروی ہو گئی۔

O۔ پاکستان بن جانے کے فوراً بعد راولپنڈی میں کسی دینی جماعت کا ایک جلسہ تھا۔ شاہ جی بھی مدعو تھے۔ راجہ غضنفر علی خاں تب وزیر تھے۔ اور جلسہ کے صدر۔ انہوں نے شاہ جی کو دعوت تقریر دیتے ہوئے کہا کہ شاہ جی جس لیگ کے مخالف تھے۔ اسی لیگ نے انہیں پناہ دی۔

ظاہر ہے یہ طنزیہ جملہ تھا۔ شاہ جی نے اٹھتے ہی جواب دیا۔ ہاں بھائی یہ پناہ آج سے نہیں مل رہی۔ اس کی بڑی

لمبی تاریخ ہے۔ میرے ابا کو بھی پٹنے کے بعد تمہارے ابا کے گھر میں پناہ ملی تھی۔ اور مجمع پر یکایک سناٹا چھا گیا۔

O۔ فرمایا۔ ہمارے ہاں نوجوانوں کا عجیب مزاج ہو گیا ہے بلکہ فطرت۔ جو لڑکا میٹرک میں فیل ہوتا ہے۔ باٹا شو کمپنی میں سیلزمین ہو جاتا ہے یا سی آئی ڈی کے ملائکہ مقدسین کا انفارمر بن کر ٹاپتا پھرتا ہے۔

O۔ تحفظ ختم نبوت کی تحریک کے دنوں میں سندھ کی کسی جیل میں محبوس تھے۔ ایک بہت بڑا سرکاری افسر ملنے کے لئے گیا۔ باتوں باتوں میں کہنے لگا شاہ جی اب اسلامی حکومت ہے پہلے جیل جاتے تھے تو لوگ قدر کرتے تھے اب تو وہ دن نہیں رہے۔ لوگ بھول جائیں گے۔ چھوڑیئے اس قضیہ کو باہر آکر کوئی اور کام کیجئے۔

فرمایا۔ "ٹھیک ہے بھائی لیکن میں کبھی لوگوں کے لئے جیل نہیں گیا۔ میں تو اسلام اور آزادی کے لئے جیل جاتا رہا ہوں۔ رہا اسلامی حکومت کا سوال تو مجھے تم سے اتفاق ہے۔ مگر یہ نہ بھولو کہ اسلامی حکومتوں میں کچھ لوگ جیل میں رہا کرتے ہیں اور کچھ لوگ تخت پر۔ کچھ گوالیار کے قلعہ میں کچھ دہلی کے قلعہ میں۔

O۔ کسی نے ایک بڑی گدی کے سالانہ عرس میں سوال کیا۔ مزاروں کے بارے میں کیا رائے ہے۔ فرمایا۔ میں اس سوال کی بنیاد کو سمجھتا ہوں بہرحال ایک مزار اقدس میرے آقا میرے ہادی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا مدینہ طیبہ میں بن چکا ہے اب دوسرا مزار میرے نزدیک شرک فی النبوۃ ہے۔

شاہ جی کے دوست۔ الآ

فرماتے ہیں ہر شخص کو اپنا دوست سمجھتا ہوں الا فرزندان سلطنت برطانیہ اور سارقان ختم نبوت، جو ان کا ساتھی ہے وہ میرا ساتھی نہیں اور جو میرا ساتھی ہے وہ ان کا ساتھی نہیں؟ یہ ممکن نہیں۔ عیب بینی میری فطرت کے خلاف ہے جو لوگ دوسروں کے عیب تلاش کرتے وہ اپنے ایمان کو ضائع کرتے ہیں۔ میں اپنے بدترین دشمن کے بارے میں بھی یہ سوچنا گناہ سمجھتا ہوں کہ اس کے ننگ و ناموس پر حملہ کیا جائے یا اس کے عیبوں کی رسوائی ہو۔ میں دعا دے سکتا ہوں اور دعا دیتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ گمراہوں کو راہ راست پر لائیں اور جو معصیت کی آلودگیوں سے دوچار ہیں ان کا خاتمہ ایمان پر ہو۔ رب کعبہ کی قسم میرے دل میں کسی شخص کے لئے ذاتی انتقام کا شائبہ بھی نہیں ہے۔

اُن کے دوستوں کی فہرست تیار ہو تو صرف ناموں کا دفتر ہی طلسم ہوشربا کی ضخامت سے بڑھ جاتا ہے۔ ان کی جماعت میں رہا، ان کے ساتھ دستر خوان پر بیٹھا، ان کے ساتھ کا قیدی تھا یا انکی تحریک و تنظیم کا جزو رہا۔ برصغیر کا وہ کون سا شہر قریہ یا تحصیل ہو گی جہاں وہ پہنچے نہیں یا جہاں ان کے دوستوں کا حلقہ نہ تھا۔ راقم الحروف جب ان سے ملا پھر جب تک ساتھ رہا اس اثناء میں ان کے جو جو دوست سامنے آتے رہے ان میں جماعت کے رفقاء تو تھے ہی اور وہ ان پر جان چھڑکتے تھے مگر جماعت سے باہر وہ جن کا ذکر فرماتے یا اُن

کے ذکر میں ڈوب ڈوب جاتے ان کے کئی حلقے تھے۔ مثلاً ان کے ادبی دوستوں کا ایک حلقہ تھا۔ اپنے بچپنے یا چھٹپنے کا ذکر کرتے وقت شاد عظیم آبادی کا نام بڑے احترام سے لیتے اور ان کے سینکڑوں شعر انہیں ازبر تھے۔ مولانا ظفر علی خاں سے جب سیاسی اختلافات کا نقطہ عروج پر تھا تو ان کی ادبی عظمتوں کو جاندار الفاظ میں سراہتے اور فرماتے میں نے آج تک اتنا بڑا بدیہہ گو نہیں دیکھا۔ تحریک تحفظ ختم نبوت کے آخری جلسہ عام میں مولانا اختر علی خاں مرحوم، مولانا ظفر علی خاں کو ساتھ لے کر آئے تھے تو اس وقت ان کے (مولانا ظفر علی خاں) ہاتھوں میں رعشہ کا زور تھا اور وہ اچھی طرح بول بھی نہیں سکتے تھے۔ بلکہ ان کی آواز کے الفاظ بھی کبھی کے ٹوٹ چکے تھے۔ شاہ جی نے دونوں ہاتھوں سے مولانا ظفر علی خاں کے گالوں کو بھینچا اور یہ کہہ کر خیر مقدم کیا۔ ظفر علی خاں تیرے ستارہ صبح نے میرے جگر میں آگ لگا دی تھی۔ شاہ جی کو مولانا کے بے شمار اشعار یاد

تھے۔ ان میں اکثر غیر مطبوعہ تھے اور وہ بڑے مزے سے لہک لہک کر پڑھا کرتے تھے۔ علامہ اقبال نور اللہ مرقدہ سے شاہ جی کا فکری و ادبی رشتہ تھا۔ شاہ جی انہیں یا مرشد کہہ کر مخاطب کرتے اور حضرت علامہ ٹھیٹھ پنجابی میں او پیرا کہہ کر اظہار محبت فرماتے تھے۔ حضرت علامہ ان سے اپنا تازہ کلام پڑھواتے اور ان کی آواز خوش سے دل خوش ہوتے تھے۔ حفیظ جالندھری بھی ان کے شیدائی تھے اور وہ بھی حفیظ کو بڑے خلوص سے یاد کرتے ان کی غزلوں کے منتخب اشعار بھی نوک زبان تھے۔ صوفی غلام مصطفیٰ تبسم، احمد شاہ بخاری (پطرس مرحوم) عبدالمجید سالک (بٹالوی)، محمد دین تاثیر ان کے جگری دوستوں میں سے تھے۔ چراغ حسن حسرت سیاسی طور پر ان کے ہم خیال تھے۔ ان کے مذاق شعر کے انتہائی قدرداں۔ ان کا خیال تھا کہ حسرت بامحاورہ اردو لکھنے میں بعض اہل زبان کو بھی پیچھے چھوڑ جاتے ہیں۔ ملحدوں کا ادب وہ بالکل نہیں پڑھتے تھے۔ انہیں نئی پود کی معرّیٰ شاعری اور آزاد نظم میں گمراہیوں کا ایک انبار نظر آتا ہے۔ فرماتے ہیں اس دفتر بے برگ و گیاہ میں شاعری نہیں۔ باقی سب کچھ ہے۔ وہ اسے ابہام سے بھی زیادہ اہمال کی پیداوار قرار دیتے تھے۔ اس سے متعلق ان کے برجستہ فقرے بجائے خود ایک نظم ہوتے تھے۔ مجید لاہوری ان فقروں کو بسا اوقات نظم کر دیتے۔ مرحوم سے انہیں بے حد پیار تھا۔ جب ان کے انتقال کی خبر پہنچی تو بڑی دیر تک گم سم رہے۔ ان کا یہ شعار تھا کہ ساتھیوں اور دوستوں کی موت پر ایک لمبی چپ سادھ لیتے تھے۔ دل شکنی کو مذہباً حرام سمجھتے تھے۔ ان کے ہاں مبتدی شعراء بھی حاضر ہو کر اپنا کلام سناتے اور داد پاتے تھے۔ نوجوان شعراء میں وہ فیض کے قائل، ساحر لدھیانوی کے مداح اور سیف الدین سیف کے دعا گو تھے۔ علامہ انور صابری کی بدیہہ گوئی کو بے حد سراہتے اور اس کی آواز کی دلکشی کے معترف تھے۔ غرض ان کی صحبتوں میں رہ کر کوئی سا شاعر یا ادیب مایوس نہ ہوتا تھا۔ وہ ہر شخص میں صرف خوبی ہی دیکھتے اور اس کا دل بڑھاتے تھے۔ خود ان کے ذوق شعری کا یہ عالم تھا کہ ہر بڑے شاعر کے تیر و نشتر حافظے میں تھے۔ پڑھنے پر آتے تو راتیں بسر ہو جاتیں۔ پھر اس لحن کے ساتھ پڑھتے کہ جادو کرتے چلے جاتے تھے۔ بڑے بڑوں کو ان کے سامنے ٹونی لگ جاتی اور چوکڑی بھول جاتے تھے۔

ایک دفعہ راقم الحروف کی تاثیر مرحوم سے چھڑ گئی راقم روزنامہ "آزاد" کا ایڈیٹر تھا اور "آزاد" جماعت احرار کا آرگن۔ تاثیر مرحوم دوستوں سے "دغا" کرتے وقت نہیں چوکتے تھے۔ انہوں نے "سول اینڈ ملٹری گزٹ" میں "پاکستان مبارک" کے زیر عنوان ڈاکٹر حجازی کے قلمی نام سے ایک سلسلہ مضمون لکھا جس میں احرار کو بھی مطعون کیا۔ راقم کو یہ دوغلہ پن ناگوار گزرا بلکہ حیرت ہوئی کہ ایک ہی روز پہلے جو شخص ساتھ بیٹھ کر کھانا کھا گیا ہے اب کس داؤ پر ہے۔ راقم نے آڑے ہاتھوں لیا۔ ایک سخت قسم کی ظالمانہ نظم لکھی۔ تاثیر توچاروں شانے چت ہو گئے۔ مگر شاہ جی بگڑ گئے۔ "تم نے یہ نظم کیوں لکھی؟" تاثیر میرا دوست ہے" صورت حال بیان کی تو فرمایا کوئی بات نہیں اس سے پہلے ہمارا گوشت کون کون نہیں کھاتا رہا۔ دشمنوں نے بھی کھایا ہے تو دوست بھی کھالیں۔ تاثیر آخر دوست ہے تم کس کس کا دامن پھاڑو گے؟

دوسرا گروہ ان کے سیاسی دوستوں یا جماعتی احباب کا تھا جماعت میں تو وہ مرکزی وجود تھے۔ جماعت سے باہر ان کے تعلقات کا دائرہ ایک لحاظ سے وسیع تھا اور ایک لحاظ سے مختصر۔ وسیع اس طرح کہ ملک کا ایک ایک لیڈر، کارکن، رضا کار، ہمدرد، سامع انہیں جانتا اور آسانی سے ان کے قریب آجاتا تھا۔ لیکن مختصراً اس لئے کہ وہ "یارانہ" گھانٹھنے کے عادی نہ تھے۔ گاندھی جی کو میں نے اپنی آنکھوں سے ان کا احترام کرتے دیکھا ہے۔ جواہر لال نے (آزادی سے پہلے) کئی دفعہ کہلا بھیجا کہ وہ ملنا چاہتے ہیں مگر گئے نہیں آخر وہی انہیں ملنے کے لئے کناٹ پیلس کی ایک دکان میں جہاں وہ ٹھہرے ہوئے تھے آئے اور گھنٹہ بھر باتیں کرتے رہے۔ مولانا حسین احمد مدنی، مولانا ابوالکلام آزاد، اور مولانا شبیر احمد عثمانی، مولانا اشرف علی تھانوی، مفتی کفایت اللہ، حضرت علامہ انور شاہ کو اپنا بزرگ دوست سمجھتے تھے۔ سردار عبدالرب نشتر سے ان کا آخری وقت تک دوستانہ رہا۔ فرماتے شرافت ان کے خون میں رچی ہوئی ہے۔ بعض لوگوں سے کھچے بھی رہتے تھے۔ مثلاً

میاں افتخار الدین لیکن خلاف ایک کلمہ بھی نہ کہتے تھے۔ (میاں افتخار الدین بھی ان سے ملنے کبھی کبھار آجاتے) مولانا احمد علی کا انتہائی احترام کرتے تھے مگر ایک "صاحب قلم" رہنما کے بارے میں ان کا خیال تھا کہ ان میں علم سے زیادہ رعونت ہے۔ ان کے ذاتی دوستوں میں کئی لوگ تھے مگر راقم الحروف نے جنہیں دیکھا ان میں میاں قمر الدین رئیس اچھرہ سے بڑی محبت رکھتے سلطان فونڈری کے مالکوں کو اپنا جگر سمجھتے۔ حاجی دین محمد اور ان کے بھائی حاجی حبیب اللہ کو اپنی عمر بھر کی کمائی خیال کرتے تھے۔ لاہور میں انہی دو چار گھروں میں ٹھہرتے تھے۔ خان مظہر نواز خاں سدوزئی (ملتان) اور نواب زادہ نصر اللہ خاں خان گھرطی ان کے جماعتی رفیق بھی تھے۔ مگر ان کے ساتھ ان کی دوستی کا علاقہ انتہائی مستحکم تھا۔ فرماتے ان دونوں کی رگوں میں شریف خون دوڑ رہا ہے۔ میں ان کی محبت سے لدا ہوا ہوں۔ ڈیرہ غازی خان کے حکیم غوث محمد جامپوری خاص خادموں میں سے تھے۔ محمد شریف (درزی) امر تسر سے ان کا خیاط تھا آج کل گوالمنڈی لاہور میں دکان کرتا ہے۔ (شاہ جی کے فرزند سید ابو ذر بخاری کے بچپن کے دوست) مگر اس سے یہاں تک دلی لگاؤ تھا کہ ملتان میں اسے کپڑے سلوانے کے لئے بلا بھیجتے تھے۔

مجلس احرار اوڑھنا بچھونا تھی۔ چودھری افضل حق مرحوم کو مہاتما جی مظہر علی بھائی، حسام الدین کو عزیز بھائی، قاضی احسان احمد کو بیٹا، مولانا غلام غوث کو محترم بھائی اور مولانا حبیب الرحمٰن کو شاہ عنایت کہہ کر مخاطب ہوتے تھے اور خود بلھے شاہ کہلاتے۔ پاس اتنا تھا کہ ایک دفعہ کا استوار کیا ہوا رشتہ سنگین سے سنگین مرحلے میں بھی نبھاتے چلے جاتے اور دل پر کبھی کوئی میل نہ لاتے۔ دوستوں کے لئے صلیب پر بھی چلے جاتے مگر خود کسی دوست کو صلیب پر چڑھتے ہوئے نہ دیکھ سکتے تھے۔ ان کے دل و دماغ کی سطحیں اتنی بلند تھیں کہ متکبروں میں سے سب سے بڑے متکبر تھے۔ اور عاجزوں میں سے سب سے بڑے عاجز۔ ان کے عظیم اوصاف میں سے ایک وصف یہ تھا کہ دوستوں کے سامنے جھک جاتے اور دشمنوں کے سامنے تن جاتے تھے اور پھر کوئی سا بوجھ بھی ان کی سیسہ پلائی ہوئی گردن کو دبا نہیں سکتا تھا۔

شکوہِ ترکمانی، ذہنِ ہندی، نطقِ اعرابی

شاہ جی نے شاعری میں اتنا شستہ و رفتہ مذاق پایا تھا کہ شاذ ہی کوئی خطیب کسی زمانہ میں ان کا ہم پایہ ہو۔ ان کی خطیبانہ دلکشی کا ایک سبب یہ تھا کہ وہ عربی فارسی، اردو، اور پنجابی بلکہ علاقائی شاعری کے باکمال اساتذہ کے دواوین سے آشنا تھے۔ عرب شعراء کے ایک تہائی دیوان انہیں نوکِ زبان تھے فارسی کا کوئی شاعر ایسا نہ ہوگا۔ کہ شاعر ہو اور ان کے حافظہ میں نہ ہو۔ اردو میں ولی دکنی سے لے کر اس دور میں قیوم نظر تک کے تیر و نشتر ان کے حجلۂ گفتار میں رہتے تھے۔ پنجابی شاعروں میں انہیں وارث شاہ، فضل شاہ، علی حیدر، سلطان باہو، پیر مہر علی شاہ، بلھے شاہ، خواجہ غلام فرید حتیٰ کہ اس زمانے کے استاد عشق لہر اور استاد شرم تک کے کلام کا وافر حصہ یاد تھا اور تو اور وہ دو سخنے اور ماہیئے، ثقہ سے ثقہ موضوع اور نازک سے نازک مضمون میں اس طرح کھپا جاتے تھے کہ انسان نہ صرف ورطۂ حیرت میں ڈوب جاتا بلکہ دماغ کی ایک پھریری کے ساتھ عش عش کر اٹھتا تھا۔ بسا اوقات ایک متبدل سا مصرعہ، آوارہ سا دو سخنہ اور پست سا ماہیا دینی مسائل کی قبا میں اس کمال سے ٹانکتے کہ تاج کا ہیرا معلوم ہوتا۔

پنجاب کے ایک دور افتادہ گاؤں میں تقریر کر رہے تھے۔ موضوع تھا معراج النبی، ٹھیٹھ پنجابی میں بیان کرتے چلے گئے۔ فرمایا حضور عرش کو چلے تو کائنات تھم گئی، اب تھم گئی کو پنجاب میں سمجھانا شروع کیا کہ رک گئی، پھر فرمایا ٹھہر گئی۔ لوگوں سے پوچھا کہ سمجھے؟ زیادہ تر سر نفی میں ہلے۔ کروٹ لیتے ہوئے فرمایا۔

میرے ہالیو (ہل جوتنے والو) اللہ کا محبوب عاشق کے گھر کو چلا تو حسن و جمال کے اس پیکر متحرک کو دیکھ کر کائنات تھم گئی ٹھہر گئی رک گئی۔ (تسی حالی وی نئیں سمجھے تو تہانوں سمجھاناں)

تیرے لونگ دا پیا لشکارا
تے ہالیاں نے ہل ڈک لئے

اس خوش آواز سے پڑھا کہ مجمع لوٹ پوٹ ہو گیا۔ "رب نے کہیا کہ میرا سوہناں آریا اے تے زمین و آسمان دی ایس گردش نوں ڈک لوؤ۔ جیہڑے جتھے سن اوتھے دے اوتھے ای ڈک لیتے" جہاں زمین و آسمان تھے وہاں رک گئے فرش سے عرش تک کا سفر طے ہو گیا۔

فرمایا جو کچھ چاہتے ہو مجھے سمجھا دو گالی سے انسان قائل نہیں ہوتا نہ الزام سے فنا ہے اور نہ جھوٹ ہی کو دلیل کیا جاتا ہے۔ مجھے قائل کر لو۔ میں کسی کا لیڈر نہیں میں امیر نہیں مبلغ ہوں۔ یار لوگوں نے شریعت کو نہ ماننے کے لئے مجھے امیر شریعت بنا رکھا ہے لیکن میں امیر نہیں فقیر ہوں۔ میں صرف سپاہی ہوں۔ اللہ کا سپاہی، رسول کا سپاہی، اسلام کا سپاہی، آزادی کا سپاہی، تمہارا سپاہی اور جب تم مجھے سمجھا دو گے پھر مجھے تنہا چھوڑ دو۔ تب میں جانوں اور میدان جنگ جانے، سپاہی میرے، خون میرا، رضاکار میرے، قید ہونا پڑے یا تختہ دار پر لٹکنا ہو تم مجھے ہر اول دستہ میں پاؤ گے گالی نہ دو سمجھا دو۔ (خوش آوازی کے ساتھ)

میری گھگری نوں گھنگھرو لوا دے
جے توں میری ٹور ویکھنی

بس لوگوں کا یہ حال تھا جیسے کسی نے لوٹ لیا ہو۔

فرماتے۔ غالب ہر کوئی پڑھتا ہے میں بھی پڑھتا ہوں لیکن میں ذرا عام روش سے ہٹ کر پڑھتا ہوں۔ یار لوگوں نے اس کی بہت سی شرحیں لکھی ہیں۔ ہر کسے را رنگ و بوئے دیگر است، سوچتا ہوں تو میرے سامنے ان کے مطالب کا رخ ہی دوسرا ہوتا ہے۔ میرا ذہن خود بخود اس کے اشعار کی گتھیاں کھولتا چلا جاتا ہے۔ اور میں دعویٰ سے کہہ سکتا ہوں کہ غالب کا نصف دیوان سیاسی ہے۔ اس نے الفاظ کی ریشمی نقابوں میں نہ صرف اپنے عہد دار و رسن اور اپنے زمانہ ادبار و انحطاط کی تصویریں بنائی ہیں بلکہ اشارات کو کنایات میں حالات و واقعات کے دفاتر سمو گیا ہے۔

ایک دفعہ جانے کیا موضوع تھا کہنے لگے۔ بحمد اللہ نفس نے کبھی کوئی جنسی خیانت نہیں کی۔ کسی کی عزت پر ہاتھ نہیں ڈالا۔ کسی کی عصمت کو تاکا نہیں۔ کسی کی عصمت کو گھورا نہیں۔ دوسروں کی طرف نگاہ غیر شعوری طور پر اٹھی بھی تو اپنی عزت یاد آ گئی۔

ہم نے مجنوں پہ لڑکپن میں اسد
سنگ اٹھایا تھا کہ سر یاد آیا

عمر کے آخری برسوں میں عموماً غالب ہی کے اشعار پڑھتے اور سر دھنتے تھے۔ گو ان کے حافظہ پر بیسیوں اساتذہ سخن کے کلام کی راہیں کشادہ تھیں لیکن غالب کے ذکر پر فرماتے ظالم نے دل چیر دیا ہے۔ شیخ حسام الدین ملتان گئے تو بان کی چٹائی پر بیٹھے پان بنا رہے تھے۔ کہنے لگے رات غالب نے کئی گھنٹے بیچین رکھا ہائے

کس دن کے لیے کہہ گیا تھا:

بیکسی ہائے تمنا کہ نہ عبرت ہے نہ ذوق
بیدلی ہائے تماشا کہ نہ دنیا ہے نہ دیں

سبحان اللہ! (آبدیدہ ہوگئے۔)

کتھے مہر علی کتھے تیری ثنا گستاخ اکھیں کتھے جا اڑیاں

فرمایا۔ حضرت کا یہ شعر پڑھا تو دنوں تک تڑپتا پھڑکتا رہا۔ پھر عمر بھر لوگوں کو اس سے تڑپایا اور پھڑکایا۔ کئی نعتیہ دیوانوں پر تنہا یہ شعر بھاری ہے۔ گستاخ اکھیں۔ یہاں اس طرح لگی ہیں کہ کائنات کی حیاء کا بوجھ ان پر پڑا ہوا ہے۔ اس شعر پر سوچتے جایئے اور پڑھتے رہیئے۔ معانی کا ایک بازار آراستہ ہوتا چلا جائے گا پھر یہ رونق کبھی اور کسی وقت بھی کم نہ ہوگی۔ میں نے لوگوں کو اس پر ماہیٔ بے آب کی طرح لوٹتے دیکھا ہے۔ بلکہ سیرت کے جلسوں میں لوگوں کی ہیئت کذائی ہی بدل ڈالی ہے۔

غبار خاطر چھپ کر سامنے آئی تو شاہ جی کے حافظے کی بیشمار گرہیں کھل گئیں۔ مولانا آزاد نے کسی خط میں لکھا ہے کہ عمر کے ابتدائی دنوں میں جو کتابیں پڑھی تھیں ان کے ضروری مقامات بقید صفحہ و سطر حافظے میں محفوظ ہیں۔ شاہ جی بھی حافظے کے اسی مقام سے گزرنے لگے۔ ان دنوں برصغیر کے فسادات کا زمانہ تھا۔ گھر یا دفتر میں مجلسیں لگاتے اور اپنے بچپن، لڑکپن اور ابتدائی ایام جوانی کے حافظہ پر نقش اشعار سناتے۔ سعدی، حافظ، نظیری، غالب، غنیمت کنجاہی، غنی کاشمیری، عنصری، شہیدی، ابو طالب حکیم آملی، رومی، گرامی غرض ایک خزینۂ گرانمایہ تھا کہ اس کا ڈھکنا اٹھا دیا ہو۔ اور اشرفیوں کا ڈھیر لگ رہا ہو۔ غالب کی فارسی شاعری کے ایسے ایسے نوادرات کھٹ سے چلے آتے تھے کہ جی جھوم جھوم جاتا تھا۔

اپنی جدوجہد کا ذکر کرتے ہوئے ایک دفعہ پڑھا

اے ہم نفساں، آتشم از من بگریزید
ہر کس کہ شود ہمرہ ما دشمن خویش است

پھر اس کو پلٹایا

گریزد از صف ما آنکہ مرد غوغا نیست
کسے کہ کشتہ نہ شد از قبیلۂ ما نیست

اور تب مسلمانوں کے اجتماعی مزاج کا ذکر کرتے ہوئے گونج اور گرج کے ساتھ پڑھا۔

ناوک نے تیرے صید نہ چھوڑا زمانے میں

یعنی

بوئے گل، نالۂ دل، دود چراغ محفل
جو تری بزم سے نکلا سو پریشاں نکلا

لیکن اب شاہ جی کہاں:

مژدہ باد اہل ریارا کہ زمیداں رفتم

سید عطاء اللہ شاہ بخاری

ایک قلمی مکالمہ

زیر نظر مضمون ۱۹۵۴ء میں ہندوستان کے ایک جریدے "پارس" اور پھر "پیام مشرق" میں غالباً یکے بعد دیگرے شائع ہوا مذکورہ رسائل بوجوہ ہمارے ریکارڈ میں محفوظ نہ رہ سکے۔

حسن اتفاق سے مرحوم آغا شورش کاشمیری نے ہفت روزہ "چٹان" کے ۲۲ نومبر ۱۹۵۴ء کے شمارے میں اسے "پیام مشرق" سے نقل کیا۔ مگر مضمون نگار کا نام درج نہیں کیا۔ چٹان کے شکریہ کے ساتھ یہ اہم مضمون ہدیہ قارئین کیا جا رہا ہے۔ (مدیر)

مولانا سید عطاء اللہ شاہ بخاری خود ایک "قلمی چہرہ" ہیں اور ذہن کی شوخیوں نے کبھی کبھی ان کے متعلق یہ بھی سوچا ہے کہ وہ "بخاری" کے بجائے "اپ ٹوڈیٹ" لاہوری ہوتے، تو کیا ہوتے، یعنی ایک منٹ کے لئے فرض کرلیجئے کہ ان کے داڑھی نہ ہو اور تہبند کے بجائے انہیں کسی زمانہ میں انگریزی لباس کی کوئی چیز پسند آجاتی جو ایک عجیب تصویر بنتی جو یو۔ این۔ او کے بخاری کی تصویر سے زیادہ دلکش ہوتی، بڑی بڑی آنکھیں جو شمشیر بھی دیکھتی ہیں اور تنکے بھی، محرابی پیشانی لمبی لمبی زلفیں بخاری داڑھی، جو منت پذیر شانہ نہ ہو، تو بگاڑ میں بھی بناؤ کا ایک انداز پیدا کرتی ہے۔ کمان سے ابرو، ہونٹ ذرا دبیز جو سو فیصدی مرد ہیں، زبان چھوٹی سی، مگر بیان میں تلوار ہی نہیں بلکہ ایٹم بم، گلا سیسہ میں ڈھلا ہوا جو آواز کا آل انڈیا ریڈیو اور ریڈیو پاکستان ہے، شاہ صاحب کی جوانی واقعی بخارا کے ایک حسین شہزادے کی جوانی ہوگی۔ جو شرع اور شرافت دونوں کا پابند ہو۔ شاہ صاحب یوں تو پنجاب کے رہنے والے ہیں۔ مگر شاید ان کا نسبی تعلق پٹنہ یعنی بہار سے ہے۔ وہ ایک ایسی شخصیت ہیں، جن کا وجود تنگنائے وطنیت سے بالا ہے، ان کے لئے ہر ملک ملک ماست کہ ملک خدائے ماست کا نصب العین ہی اصل حیات ہے، وہ پاکستان میں دینی خطابت کی ایک متحرک تصویر ہیں، لیکن وقت اور زمانے نے انہیں چپ کرا دیا ہے ان کے بہت سے خطوط مدھم پڑ گئے اور بہت سے رنگ پھیکے ہو گئے ہیں۔ اصلیت خواہ کچھ ہی ہو لیکن بنیادی وجہ یہ ہے کہ بعض لوگ زمانے کے موافق ہوتے ہیں، اور بعض کے موافق زمانہ نہیں ہوتا، شاہ جی اسی آخری گروہ میں سے ہیں۔

احرار وطن کی سیاست میں مولانا عطاء اللہ شاہ بخاری کا ایک کردار ایک ایسے شخص کا کردار رہا، جو اپنے لئے کچھ نہ چاہتا ہو اور دوسروں کے لئے سب کچھ چاہتا ہو، وہ سکندر اعظم کی تلوار ہیں جو شاید ہمیشہ بے نیام رہی، وہ حضرت خالد بن ولید کا دماغ ہیں، جو شاید کبھی نہیں سویا، وہ نپولین کا سرخ گھوڑا ہیں جس کی پیٹھ پر بیس سال تک زین کسی رہی۔ سول نافرمانی ہے تو ہوا کے پروں پر سوار ہیں ابھی امرت سر میں ہیں تو ابھی انبالہ میں، انبالہ میں شام ہوئی تو رات دہلی میں بسر ہوئی، پولیس تعاقب کر رہی ہے۔ تار آ رہے ہیں اور جا رہے ہیں۔ ٹیلیفون کھڑک رہے ہیں۔ لیکن بخاری ہیں کہ عناصر اربعہ کے بجائے ایک نیا عنصر خمسہ بنے ہوئے ہیں۔ وارنٹوں، گرفتاریوں، سنگینوں کا مقابلہ کر رہے ہیں۔

اک مشت خاک ہیں مگر آندھی کے ساتھ ہیں

کبھی ایک رواں رواں کارواں تھے، اب ایک مہر بلب دستاویز ہیں، اور مستقبل کا مورخ ان کی راہ تک رہا ہے۔ زمانہ تھا کہ مجلس احرار میں سب ہی تھے اور ایک سے ایک آفت کے پرکالے جیالے اور متوالے تھے، ان میں چودھری افضل حق بھی تھے، مولانا حبیب الرحمن بھی مولانا مظہر علی اظہر بھی تھے۔ شیخ حسام الدین بھی تھے اور ماسٹر تاج الدین بھی تھے اور اس زمانہ میں آغا شورش کا شمیری کے توسج دھج ہی نرالے تھے لیکن ان میں عطاء اللہ شاہ بخاری کوئی نہ تھا۔ چودھری افضل حق کی جگہ مظہر علی اظہر لے سکتے تھے، مولانا حبیب الرحمن کی جگہ مولانا داؤد غزنوی لے سکتے تھے لیکن بخاری کی جگہ صرف بخاری لے سکتا تھا۔ اور اس کا نعم البدل ملنا تو دور رہا بدل ملنا بھی محالات سے تھا۔ قرآن حکیم کے بارے میں کبھی کفار نے کہا تھا کہ یہ کسی "جادوگر کی جادوگری ہے" (نعوذ باللہ) اور بیسویں صدی میں

شاید بخاری کو دیکھ کر کہا جاسکتا ہے کہ "مسلمان، مسلمان نہیں جادوگر ہے" مثنوی مولانا روم پڑھنے پر آئے تو ایک سماں باندھ دیا۔ اور آسمان و زمین کی کائنات گوش بر آواز بخاری ہوگئی۔ قرآن حکیم کی تلاوت شروع کی۔ تو آسمان سے حور و ملک رحمتوں کے پھول برسانے لگے۔ وہ کئی اعتبار سے مولانا محمد علی مرحوم ہیں جوش و خروش اور اخلاص کی جرأت مولانا محمد علی سے ملتی جلتی ہے۔ فرق اتنا ضرور ہے کہ انہوں نے آکسفورڈ کی تعلیم حاصل نہیں کی۔ وہ "علیگ" نہیں ہیں اور اول درجہ کے سیاست دانوں کے مقابلہ پر "رائے کی ٹکر" نہیں لیتے۔ پچھلے تیس پینتیس سال میں ہم نے تین خطیب دیکھے ایک مولانا ابوالکلام آزاد، دوسرے نواب بہادر یار جنگ، تیسرے مولانا عطاء اللہ شاہ بخاری۔ مولانا آزاد اپنے فن خطابت کے امام ہیں۔ خود ہی اس فن کے استاد ہیں اور خود ہی مقلد بھی، ان کی خطابت میں امامت اور اجتہاد کی آواز بولتی ہے۔ بغاوت اور انقلاب کی فکر بولتی ہے نواب بہادر یار جنگ بہت بڑے خطیب تھے مگر آزاد کی بڑی حد تک عکس صدا تھے۔ ان کا اپنا رنگ بھی تھا۔ لیکن یہ رنگ دوسروں سے ملتا جلتا تھا۔ جس میں نواب صاحب کی شخصیت نے ایک فرق پیدا کردیا تھا لیکن مولانا عطاء اللہ شاہ بخاری کا انداز خطابت بالکل مختلف، بالکل انوکھا، بالکل نیا ہے۔ وہ ایک نئے فن خطابت کے موجد ہیں۔ اور مولانا آزاد کی خطابت کا انہوں نے بہت کم اثر قبول کیا ہے۔ جس خطیب کو ہیر رانجھا اور سوہنی مہینوال کا ماحول ملا ہو۔ اس کے طربیہ و حزنیہ انداز کا کیا کہنا۔ اس کے "کردار" اور "شنر نگار رس" (یہ ہندی ادب کی دو اصطلاحیں ہیں اور ان کا ترجمہ کرنا غیر ضروری ہے) کا کیا کہنا۔ شاید یہ کہنا بھی غلط نہ ہو کہ میر اور غالب کی شاعری میں جو فرق ہے وہ بخاری اور آزاد کی خطابت میں بھی ہے۔ بخاری میر ہیں اور آزاد غالب۔

سرہانے میر کے آہستہ بولو ابھی ٹک روتے روتے سو گیا ہے

شاید کچھ اسی قسم کی بات بخاری کی خطابت میں بھی ملتی ہے۔ آزاد جس مفہوم کو تین منٹ میں ادا کریں گے بخاری اسے تین گھنٹے میں ادا کریں گے۔ اور اس انداز سے ادا کریں گے کہ آپ پوری رات ایک عنوان کی تقریر سننے میں ختم کردینا چاہیں گے۔ آزاد کی تقریر فکر و نظر کو جذب کا شاہانہ لباس پہناتی ہے اور بخاری کی خطابت جذبات کو فکر و نظر کا شوخ دوپٹہ اڑھاتی ہے۔ آزاد کتابوں کی گفتگو کرتے ہیں، بخاری گھروں کی بات سناتے ہیں۔ بخاری کی

تقریر میں وہ مزا ملتا ہے جو تلسی داس کی رامائن میں ملتا ہے۔ بخاری دریا کی روانی ہیں۔ جس میں سیلاب بھی آتا ہے اور آزاد سمندر کا بے پناہ سیلاب ہیں جو سطح آب کے سکون سے کم ہی آشنا ہے۔

مولانا عطاء اللہ شاہ بخاری کی سیاست سے اختلاف ہوسکتا ہے لیکن ان کی خطابت سے نہیں اس لئے کہ جہاں تک تقریریں سننے کا تعلق ہے ہم نے بخاری صاحب کے بد ترین مخالفوں کو ان کی تقریر پر سر دھنتے دیکھا ہے اور یہ بخاری صاحب ہی کا ارشاد ہے کہ "تقریریں میری سنتے ہو اور ووٹ میرے خلاف دیتے ہو"

احرار وطن کی یہ تاریخ بھی کیسی ہے کہ ۱۹۴۷ء سے پہلے بھی لڑتے رہے اور ۱۹۴۷ء کے بعد بھی۔ آسمان بھی تھک جاتا ہے۔

حیف اس چار گرہ کپڑے کی قسمت غالب
جس کی قسمت میں ہو عاشق کا گریباں ہونا

شاہ جی خطابت کے شہسوار ہیں

مولانا حسرت موہانی

مجلس احرار اسلام کا وہ قیمتی ہیرا جو خطابت میں اپنا ثانی نہیں رکھتا۔ ان کی دو تقریروں نے میرا کام تمام کردیا۔

مفکر احرار چودھری افضل حق

شاہ جی! ہمارے ملک کی آزادی کے لئے جنگ کے بہادر رہنما تھے۔ وہ میرے ساتھی تھے اور میرے مہربان تھے۔

خان عبد الغفار خان:

وہ مجھے خادمان ملی کی صف میں سب سے پیارا اور باوصف دکھائی دیتا ہے

جناب عزیز ہندی (قائد تحریکِ ہجرت ۱۹۲۰)

آپ لوگوں پر جادو کرتے ہیں اور ان کے سوچنے کی قوت ماؤف ہو جاتی ہے' آپ کی تقریروں سے انقلاب کا خطرہ ہوتا ہے اگر ہم لوگ برسر اقتدار آئے تو سب سے پہلے بخاری صاحب کو گولی ماردینگے۔

ڈاکٹر کے ایم اشرف (سیکرٹری انڈین کمیونسٹ پارٹی)

شاہ جی جنگ آزادی کے بہادر جرنیل تھے' سیاسی اختلاف کے باوجود میں نے ہمیشہ ان کی خدمات کا اعتراف کیا اور اس کی قدر کی!

ممتاز دولتانہ

شاہ صاحب نہایت بزرگ تھے' انہوں نے نیک نیتی سے ملک و قوم کی خدمت کی آپ بلند پایہ لیڈر تھے' ان سا لیڈر صدیوں میں ہی مل سکتا ہے۔

نواب افتخار ممدوٹ مرحوم

اسلام اور پاکستان

پاکستان کے پڑوسی شیعہ ملک ایران میں پہلوی اقتدار کے خاتمہ اور شیعہ انقلاب کے بعد ایرانی پاسداران انقلاب اور پاکستانی آسن داران انقلاب نے جس جارحانہ انداز سے دین اور اسلاف دینی پر کیچڑ اچھالا، رسول، ازواج رسول اور اصحاب رسول علیہم السلام پر جس بری طرح سے تہمت و دشنام و الزام کا بازار گرم کیا اس سے اہل اسلام کا مضطرب ہونا فطری امر ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ سازشوں، رغبتوں اور شیعہ انقلابی قوتوں کے بل بوتے پر پاکستانی اقتدار پر شیعوں کے قبضہ و تسلط کے تناظر میں اہل اسلام کی بے بسی و بزدلی جتنی اذیت ناک ہے اس پر حضرت امیر شریعت رحمہ اللہ کی ۱۹۴۹ء کی مجلسی گفتگو کا ایک اقتباس ہدیۂ قارئین ہے۔

"یہ بات اب سوچ رہے ہو؟ جب پاکستان بنا تھا یہ تو ہم اسی وقت بھانپ گئے تھے کہ اب حکومت دو گروہوں کے قبضہ و تسلط میں ہو گی۔ "شیعہ اور مرزائی" شیعہ زیادہ ہیں اور مرزائی کم۔ مگر خطرہ انہیں سے زیادہ ہے۔ باقی یہ خیال دل سے نکال دو کہ شیعہ کسی بھی گوشہ میں تم سے رعایت برتیں گے یا تمہاری مدد کریں گے وہ صرف اپنے ہیں اور کسی کے نہیں ہیں صوبوں سے لے کر مرکز تک وہی قابض ہیں۔

کرامت علی، غضنفر علی، محمد علی یہ لوگ اگرچہ سیاسی لیڈر ہیں اور بظاہر وسیع المشرب مگر شیعہ ازم میں وہ بہت متشدد و مضبوط ہیں جہاں تک ان کا بس چلے گا ہمارے اسلام اور قرآن کو ناقابل عمل بنا کر دم لیں گے۔ غضنفر علی نے گزشتہ برس راول پنڈی میں کہا "وہ زمانہ لد گیا جب بخاری قرآن سنا سنا کر لوگوں کو الو بنایا کرتا تھا۔ اب پاکستان بن گیا یہاں ان باتوں کی گنجائش نہیں" پاکستان میں حکمرانوں کے ہاتھوں دین کا جو انجام ہو گا وہ تمہارے سامنے ہے۔ میں نے تو کہا تھا ہندوستان میں مسلمان نہیں رہنے دیا جائے گا اور پاکستان میں اسلام نہیں رہنے دیا جائے گا۔ پاکستان میں دین کا بس اللہ ہی حافظ ہے۔ یہاں فرنگی کے جانشین فرنگی سے زیادہ دین دشمن ہیں۔ شاید کچھ مدت بعد اس ملک میں دین اسلام کا لفظ بھی لوگوں کی سمجھ میں نہ آسکے۔ آثار اچھے نہیں ہیں"۔

امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاری رحمہ اللہ

(ملتان۔ مارچ ۱۹۴۹ء)

شاہ جی کے دو اہم خطوط

ماسٹر تاج الدین انصاری کے نام

پس منظر

اگست ۱۹۴۷ء کے آخری ہفتے حضرت امیر شریعت دفتر احرار لاہور سے بچوں سمیت خان گڑھ (ضلع مظفر گڑھ) میں نوابزادہ نصر اللہ خان کے ہاں منتقل ہوگئے۔ اُن دِنوں ماسٹر تاج الدین انصاری آل انڈیا مجلس احرار اسلام کے صدر اور نوابزادہ نصر اللہ خان ناظم اعلیٰ تھے۔

برصغیر تقسیم ہوچکا تھا اور پاکستان وجود میں آچکا تھا۔ اکابر احرار اور کارکن مجلس کی آئندہ پالیسی کے بارے میں خاصے متفکر تھے۔ اور اِسی نکتہ پر سوچ وبچار میں مصروف تھے۔

یہ تاریخی خط حضرت امیر شریعت نے ۲۴ دسمبر ۱۹۴۷ء کو صدر مجلس احرارِ اسلام کے نام خان گڑھ سے تحریر کیا۔ جس کی بنیاد پر مجلس احرارِ اسلام کی آئندہ پالیسی وضع کی گئی۔

اس خط میں یہ جملہ تاریخی اہمیت کا حامل ہے کہ

"مجلس کا قیام و بقاء بہرحال ایک شرعی امر ہے"

یہ خط بعض لوگوں کے اِس سراپا کذب پروپیگنڈے کی یکسر **تغلیط** کرتا ہے کہ "شاہ جی، مجلس احرار کو ختم کر گئے تھے"۔

آج بھی مجلس احرار حضرت شاہ جی کی اسی پالیسی کی روشنی میں اپنی جدوجہد جاری رکھے ہوئے ہے۔ (کفیل)

خان گڑھ ۲۴ دسمبر ۱۹۴۷ء:

برادرِ محترم ماسٹر جی! السلام علیکم

ملتان کی میٹنگ میں حالات کی وجہ سے شریک نہ ہوسکا۔ اسکے بعد بیماری آہستہ آہستہ بڑھتی گئی اور آخر غالب آگئی، نتیجہ یہ ہے کہ اس وقت نشست و برخاست بھی آسانی سے نہیں کرسکتا۔ تفصیل کیا لکھوں کیا گزری؟ پھر(۲) محسن اور(۳) مہیمن بیمار ہوگئے اور ایک وقت ایسا بھی آگیا کہ ہم محسن سے تھوڑی دیر کے لیے ہاتھ دھو بیٹھے، خیر! اللہ تعالیٰ نے کرم کیا، اب اس کی حالت اچھی ہے لیکن مہیمن بہت کمزور ہے اور بخار میں مبتلا ہے۔ رات ننھی ۴۔ سالمہ سخت بخار میں تھی۔

یہ ہے میرا مختصر سا حال اس وقت میں اپنے بچوں کی خدمت کے قابل بھی نہیں اور گھر میں کوئی دوسرا شخص بھی نہیں، جو پرسشِ احوال کرسکے۔ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی سہارا نہیں۔

حسبنا اللہ و نعم الوکیل

ملتان میں آپ کے اجلاس کو کامیاب دیکھنا چاہتا ہوں۔ چند باتیں لکھ دیتا ہوں۔ اگر احباب کو پسند ہوں تو بہتر ہے۔

۱۔ لیگ سے ہماری سیاسی کشمکش ختم ہوچکی ہے اور الیکشن کے ساتھ ہی ختم ہوچکی تھی۔ اس وقت لیگ قوت حاکمہ ہے۔ مسلمانوں نے اسے بنایا اور قبول کرلیا ہے۔ پاکستان نہ صرف مسلم لیگ کا بلکہ کانگرس کا تقسیم پنجاب کے اضافے کے ساتھ تسلیم کردہ معاملہ ہے، جس پر ''حضور'' برطانیہ کی مہر ثبت ہے۔ اس میں صرف مسلم لیگ کو ہدفِ ملامت بنانا آئینِ شرافت سے بعید ہے۔ اگر اچھا کیا تو کانگرس اور لیگ دونوں نے، اگر بُرا کیا تو دونوں نے۔ اب پاکستان بن چکا اور تقسیم پنجاب کو کانگرس نے پیش کر کے مسلمانوں سے پاکستان کی بہت بڑی قیمت اداء کرائی اور کرا رہی ہے۔ ابھی نہ جانے کب تک مسلمانوں کو سود در سود ادا کرنا پڑیگا۔

میری آخری رائے اب یہی ہے کہ ہر مسلمان کو پاکستان کی فلاح و بہبود کی راہیں سوچنی چاہئیں، اور اس کے لئے عملی اقدام اٹھانا چاہیئے۔ مجلس احرار کو ہر نیک کام میں حکومت پاکستان کے ساتھ تعاون کرنا چاہیے، اور خلافِ شرع کام سے اجتناب، اصلاحِ احوال کے لئے ایک دوسرے سے مل کر ''الدین نصیحۃ'' پر عمل ہونا چاہیے۔ یہ ارشاد ہے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا۔

۲۔ مجلس(۵) کا قیام و بقاء بہر حال ایک شرعی امر ہے، تبلیغ اعتقادِ صحیحہ اور تنقید رسومات قبیحہ، اعلائے کلمۃ الحق، اعلان و بیان ختم نبوت و اظہار فضائل صحابہ و اہلِ بیت رضوان اللہ علیہم اجمعین مجلس کے فرائض میں سے ہیں۔ خصوصاً اس دور لادینی میں جنسِ انسانی کی تمام مشکلات کے لئے شریعت محمدیہ علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کو ہی بطور حل پیش کرنا ہمارا وہ فریضہ ہے کہ اگر ہمیں دار و درسن تک بھی رسائی ہوجائے تو الحمدللہ۔ اس لیے مجلس کے قیام، بقاء کی بہر حال کوشش رہنی چاہیے۔

اگر دوستوں کو یہ باتیں معقول و مدلل نظر آئیں، تو ان بُنیادوں پر آئندہ زندگی کی عمارت استوار کریں،

ورنہ جیسے انکی مرضی، میں کسی کی راہ میں حائل نہیں، اب میں تھک گیا ہوں۔ ورنہ مفصل بھی لکھ سکتا تھا۔

غریب الدیار۔

سید عطاء اللہ شاہ بخاری

۱۔ بڑے سے چھوٹے فرزند

۲۔ سب سے چھوٹے فرزند

۳۔ سب سے چھوٹی بیٹی، جو اس خط کے کوئی ڈیڑھ ماہ بعد ۷۔ فروری ۱۹۴۸ء کو انتقال کر گئی۔

۴۔ مجلس احرارِ اسلام

پاکستان کے رہنماؤ...؟

اگر پاکستان کو صحیح معنوں میں اسلامی سلطنت بنادیا گیا تو یاد رکھو اسلامی سلطنت میں کوئی انسان دکھی نہ ہوگا یہ سلطنت غیور اور بہادر مجاہدوں اور درویشوں کی بستی ہوگی، کوئی دشمن اسلام، پاکستان کی طرف آنکھ اٹھانے کی جرات نہ کر سکے گا۔ اسلامی پاکستان کے اندر مسائل اگر ہوں گے تو خود بخود ختم ہو جائیں گے اور مستقبل بھی پریشان کن نہ ہوگا۔

خدا یقیناً نیک نیتوں کی مدد کرتا ہے۔ بہتان طرازی سے پرہیز کرنا ورنہ خدا کے آگے جواب دہ ہو گے۔ عزت، ذلت، موت، حیات سب اللہ کے پاس ہیں۔ شیطان کو شکست دو اور اللہ کے فوجی بن جاؤ۔ پھر دیکھو کیا ہوتا ہے جھوٹے منہ سے یا جھوٹے وعدے کر کے اقتدار کیلئے مت کرنا۔ کرسی اقتدار ایک بہت ہی بے وفا محبوبہ ہے۔ مسکرا مسکرا کر اپنے انداز میں جھوٹ بولنے والے خوشامدی جو پیچھے دکھائی دیں، ہمیشہ جھوٹے اور خود غرض ہوتے ہیں۔ خدا ان سے پاکستان کو محفوظ رکھے

امیرِ شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاری رحمۃ اللہ علیہ

نواب افتخار حسین خان ممدوٹ سے گفتگو

۱۹۵۰ء ملتان

بنام مولوی نذیر حسین صاحب مرحوم!

پس منظر

مولوی نذیر حسین صاحب مرحوم (ساکن پنوں عاقل۔ سندھ) حضرت امیر شریعت رحمہ اللہ کے انتہائی عقیدت مند اور مجلس احرارِ اسلام کے پرجوش مبلغ تھے۔ تقسیم ھند کے بعد پاکستان میں صرف مجلس احرار اسلام ہی واحد جماعت تھی جو سیاسی و دینی لحاظ سے حق پرست علماء و کارکنوں کی آرزوں کا مرکز و محور اور نمائندہ تھی۔
اس لئے قدرتی طور پر ہر دینی سیاسی کارکن مجلس کی آئندہ سیاسی پالیسی اور حکمت عملی کے بارے میں متفکر تھا۔
چنانچہ یہ اہم خط بھی اسی سوچ اور اضطراب کا عکاس ہے۔
پاکستان میں مجلس احرار اسلام کی دینی و سیاسی پالیسی سے متعلق حضرت شاہ جی کا یہ دوسرا اہم خط ہے جو انہوں نے مولوی نذیر حسین صاحب مرحوم کے خط کے جواب میں لکھا تھا۔ یہ خط، بعض شرعی شہدوں اور مذہبی اجارہ داروں کے اس سراپا کذب و افتراء الزام و دشنام کی مکمل نفی کرتا ہے جس کا سلسلہ تاحال جاری ہے کہ "شاہ جی ۱۹۴۸ء میں مجلس احرار ختم کر گئے تھے" جبکہ یہ خط ۱۹۵۱ء کا ہے۔ اس سے قبل ۱۹۴۸ء کا خط آپ ملاحظہ فرما چکے ہیں جس میں احرار کے قیام و بقا کو شاہ جی نے شرعی امر قرار دیا ہے۔ پھر ۱۹۵۳ء کی تحریک تحفظ ختم نبوت مجلس احرار نے ہی چلائی اور مجلس کو حکومت نے خلاف قانون قرار دیا۔ جبکہ ۱۹۵۸ء میں مجلس پر سے پابندی ختم ہونے پر ملتان میں شاہ جی نے نہ صرف خوشی کا اظہار کیا بلکہ جماعت کے نام پیغام دیا جو روزنامہ آزاد لاہور میں شائع ہوا۔ شدید ضعف و بیماری کے باوجود احرار کے جلوس سے خطاب فرمایا اور پرچم کشائی کی۔
مولوی نذیر حسین صاحب نے اپنے خط میں مجلس کی آئندہ پالیسی سے متعلق شاہ جی سے استفسار کیا تھا اور اسی خط کی پشت پر شاہ جی نے مختصر جواب تحریر کردیا۔
مولوی صاحب نے لکھا تھا کہ
"جمعیت علماء اپنے خدوخال سے پاکستان میں گویا کالعدم ہو گئی ہے جبکہ احرار ہر جگہ ماشاء اللہ مشغول کار ہے۔ ایک سوال جو ہر وقت دل میں چبھتا ہے وہ یہ ہے کہ ایک سے زیادہ احرار کی نظر میں کوئی بری جماعت نہ تھی۔ اور اب اس جماعت سے متعلق باوجود اس کے کہ ان کے خیالات میں ذرہ بھر بھی تبدیلی نہیں ہوئی، احرار نے اپنی پالیسی اتنی نرم کردی ہے کہ جس کی کوئی حد نہیں۔ افہام و تفہیم اور تشفی مقصود ہے نہ کہ اعتراض۔
اب جو کچھ احرار کی پالیسی ہے اس سے تفصیلاً متنبہ فرمائیں"
یہ خط اس سوال کا مختصر مگر جامع جواب ہے۔
حضرت شاہ جی رحمہ اللہ کے ایک عقیدت مند مولانا محمد یٰسین مدظلہ کے بقول "مولوی نذیر حسین صاحب ایک مرتبہ ملتان تشریف لائے تو یہ خط انہوں نے مجھے دکھایا۔ میں نے ازراہ محبت ان سے مانگ لیا اور انہوں نے کمال مہربانی سے عطاء فرمادیا"
یہ خط مولانا کے پاس نہایت خستہ حالت میں موجود تھا، انہوں نے انتہائی شفقت فرماتے ہوئے راقم کو عطاء فرمادیا۔
اس طرح یہ خط اکتالیس سال بعد حضرت مولانا محمد یٰسین صاحب کے شکریہ کے ساتھ پہلی مرتبہ شائع ہورہا ہے۔
(کفیل)

۲۰ رمضان المبارک
شہر ملتان
سید عطاء اللہ بخاری

مکرمی! السلام علیکم و رحمۃ اللہ و برکاتہ

یاد فرمائی کا شکریہ الحمدللہ ۔ رسالہ تو انشاء اللہ تعالیٰ میرے خط سے پہلے
دیکھ چکا ہوگا ۔ باقی آپکی کشمکش تو مجھ سے مخفی نہیں
تقسیم سے پہلے لیگ کے ساتھ ہمارے بہت سے اختلافات تھے ہم نے قوم کے
سامنے اپنا نظریہ پیش کیا لیگ نے اپنا۔ قوم نے لیگ سے اتفاق کیا اور
لیگ حکمران ہو گئی ہم ان کے مقابل پارٹی نہ تھے ہم بہرحال رعایا بن گئے
ہم لوگ شروع سے ملکی معاملات کے ساتھ ساتھ کچھ دینی مقاصد بھی
رکھتے تھے اور اب تک بفضلہ تعالیٰ رکھتے ہیں۔ موجودہ صورت میں ان دینی
مقاصد کو حاصل کرنیکی کوشش اور صورت اگر ہو سکتی ہے تو درس و تدریس
جو کچھ ہونا تھا وہ تو ہو چکا اور اب کسی صورت میں اسکو بدلنا بلا تحریک
اور تبلیغ ہے ۔ اصلاح احوال کے لئے اسی دائرہ میں عمل ہم کر رہے ہیں
مگر مخالف تحریک نہیں ۔ موجودہ وقت میں کسی فتنہ مرزائیت کے مقابلہ
میں جو کچھ ہمیں حاصل ہو سکتا ہے وہ باہمی تعاون کا ہی نتیجہ ہے
بصورت دیگر منکرین ختم نبوت کو ہر رنگ میں مسلمان کہیں ۔ مشکل ہے ۔

روزہ میں یہ مختصر سا جواب عرض خدمت ہے اگر آپ خود ذرا پھیلا کر دیکھیں اور ہماری
مشکلات کا اندازہ لگائیں - لیگ کی مخالفت نہ کرنی کا چیز نہ تھی نہ ہے کسی مقصد
عالی کیلئے مخالفت و موافقت معنی رکھتی ہے - عہد غلامی میں اختلاف باہمی تھا
اب اتفاق ہی کی اصلاح احوال کا ذریعہ ہو سکتی ہے - ورنہ سرخ پوش - انجمن وطن -
اور دوسری جماعتیں کہاں تک اپنے مقاصد میں کامیاب ہو رہی ہیں خاتمہ و شد بر

۱۱ اپریل ۱۹۴۱ء
دعا گو عبداللہ
سید عطاء اللہ

۲۰ [1] رمضان المبارک، شہر ملتان
مکرمی و علیکم السلام ورحمۃ اللہ وبرکاتہ
یاد فرمائی کا شکر گزار ہوں۔ رسالہ [2] توان شاءاللہ تعالیٰ میرے خط سے پہلے پہنچ چکا ہوگا۔ باقی آپ کی کھٹک تو صحیح ہے، فکر صحیح نہیں۔ تقسیم سے پہلے لیگ کے ساتھ ہمارے بہت سے اختلافات تھے۔ ہم نے قوم کے سامنے اپنا نظریہ پیش کیا، لیگ نے اپنا، قوم نے لیگ سے اتفاق کیا اور لیگ قوت حاکمہ بن گئی۔ مد مقابل پارٹی نہ رہی۔ ہم بہر حال رعایا بن گئے۔ ہم لوگ شروع سے ملکی معاملات کے ساتھ ساتھ کچھ دینی مقاصد بھی رکھتے تھے اور اب تک بفضلہ تعالیٰ رکھتے ہیں۔ موجودہ صورت میں ان دینی مقاصد کو حاصل کرنے کی کوئی اور صورت اگر ہوسکتی ہے تو ارشاد فرمائیں؟ جو کچھ ہونا تھا وہ تو ہوچکا، اور اب کسی صورت میں اس کو بدلنا قومی ہلاکت و تباہی۔ اصلاح احوال سے انکار نہیں وہ بھی ہم کر رہے ہیں مگر مخالف بن کر نہیں۔ موجودہ وقت میں اس فتنۂ مرزائیت کے مقابل میں جو کامیابی ہم کو حاصل ہورہی ہے وہ باہمی تعاون کا ہی نتیجہ ہے۔ بصورتِ دیگر
منکر مے بودن و ہمرنگ مستان زیستن
مشکل ہے۔ روزہ میں یہ مختصر سا جواب عرض خدمت ہے اسے آپ خود ذرا پھیلا کر دیکھیں اور ہماری مشکلات کا اندازہ لگائیں۔ لیگ کی مخالفت فی نفسہ کوئی کار خیر نہ تھا نہ ہے۔ کسی مقصدِ عالی کے لئے مخالفت و موافقت معنیٰ رکھتی ہے۔ عہد فرنگی میں اختلاف بامعنیٰ تھا۔ اب اتفاق سے ہی اصلاحِ احوال کی توقع ہوسکتی ہے۔ ورنہ سُرخ پوش، انجمنِ وطن اور دوسری جماعتیں کہاں تک اپنے مقاصد میں کامیاب ہورہی ہیں۔ فافہم و تدبر۔
والسلام مع الاکرام
دعا گو غریب الدیار
سید عطاء اللہ بخاری

---

(۱) شاہ جی رحمہ اللہ کے اس خط پر صرف ۲۰ رمضان المبارک کی تاریخ درج ہے سن ہجری درج نہیں۔ مکتوب الیہ مولوی نذیر حسین صاحب مرحوم نے اپنے خط پر ۱۶ رمضان المبارک اور ۲۲ جون کی تاریخیں تحریر کی ہیں مگر دونوں تاریخوں کے سِنین درج نہیں کئے۔ مولوی نذیر حسین صاحب مرحوم نے ۲۲ جون کی تاریخ درج کی ہے جبکہ تقویم کے مطابق ۱۶ رمضان المبارک کو ۲۱ جون بنتی ہے۔ تقویم کے لحاظ سے دونوں خطوط کے جو سنین نکلتے ہیں وہ درج ذیل ہیں۔
مولوی نذیر حسین صاحب ------ ۱۶ رمضان المبارک ۱۳۷۰ھ مطابق ۲۱ جون ۱۹۵۱ء بروز جمعرات
حضرت شاہ جی ------ ۲۰ رمضان المبارک ۱۳۷۰ھ مطابق ۲۵ جون ۱۹۵۱ء بروز پیر
ملاحظہ ہو تقویم تاریخی (قاموس تاریخی) صفحہ ۳۴۳ مرتبہ عبد القدوس ہاشمی، ادارہ تحقیقات اسلامی۔ اسلام آباد (طبع دوم ۱۹۸۷ء)

(۲) سہ ماہی "مستقبل" ملتان۔ (۱۹۵۱ء) مدیر: جانشینِ امیر شریعت سید ابومعاویہ ابوذر بخاری زیر اہتمام: نادی الادب الاسلامی ملتان۔

نوادراتِ امیرِ شریعت

رحمۃ اللہ علیہ

(اخباری بیانات و پیغامات)

قضیہ شہید گنج سے متعلق
مولانا سید امیر شریعت بخاری کا بیان

"ہماری جماعت کی پوزیشن کے متعلق چہ مہ گوئیاں ہو رہی ہیں۔ اس لئے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ایک محتاط بیان پبلک کے سامنے پیش کر دیا جائے۔ رانا فیروز الدین صاحب ایڈووکیٹ (لائل پور) نے جو مولانا ظفر علی خاں کے قریبی رشتہ دار ہیں اور ہماری جماعت کے معزز رکن ہیں مسجد شہید گنج کے حالات پر روشنی ڈال کر حزم و احتیاط کا مشورہ دیا اور ایک پالیسی تجویز کرلی گئی جب ہمارے کارکن لاہور پہنچے تو انہیں معلوم ہوا کہ مسجد شہید گنج کے تحفظ کے لئے ایک مقتدر جماعت بنالی گئی ہے اور مولانا ظفر علی خاں صاحب مولانا اختر علی خاں صاحب، مولانا سیّد حبیب صاحب، ڈاکٹر محمد عالم صاحب اور ملک لال خاں صاحب کی رہنمائی میں ایجی ٹیشن جاری کرنے کا فیصلہ ہو چکا ہے۔ جب ایک مقتدر جماعت نے ہماری لائل پور واپسی سے پہلے کام کو سنبھالنے کا فیصلہ کر لیا تو مجلس احرار کا من حیثیت الجماعت دخل دینا مسلمانوں میں کشمکش کا باعث ہو جانا اور جائز طور پر اس اعتراض کا موقع پیدا ہو جانا کہ احرار ایجی ٹیشن میں ٹانگ اڑا دیتے ہیں، اور کسی جماعت کو خواہ وہ کتنی ہی باوقار کیوں نہ ہو کام کرنے کا موقع دینے بنا بریں خاموشی کو بہترین مصلحت سمجھا گیا لیکن ہم اس امر کا ساتھ ہی اعلان کرتے ہیں کہ خاموشی کے معنی مخالفت کے نہ تھے بلکہ مولانا سید محمد داؤد صاحب غزنوی جنرل سیکرٹری مجلس احرار اسلام ہند کے تمام مشوروں میں شامل رکھنے کا فیصلہ کیا گیا۔ اور انہوں نے دیانت داری سے "انجمن تحفظ مسجد شہید گنج" میں نہایت محنت سے خدمات سرانجام دیں۔ جس دن سے مسجد شہید گنج شہید ہوئی ہم باخبر آدمیوں سے برابر مشورہ کرتے رہے۔ ہم اس بھرے جلسے میں اعلان کرتے ہیں کہ ہم ایسے نازک موقع پر اتحاد بین المسلمین کو ہاتھ سے نہ جانے دیں گے۔"

مجلس احرار نے اپنے کسی قول یا فعل سے مسلمانوں کو نہ پہلے کبھی نقصان پہنچایا ہے نہ کبھی آئندہ پہنچانے کے لئے تیار ہو سکتی ہے

روزنامہ "سیاست" لاہور
۲۶ جولائی ۱۹۳۵ء

مارچ ۱۹۲۱ء میں جیل سے حضرت امیر شریعت کا مسلمانوں کے نام پیغام

"میں مسلمانانِ پنجاب تک یہ پیغام پہنچانا چاہتا ہوں کہ ابھی پنجاب کے مسلمانوں میں نماز، روزہ کی پابندی اور شریعت حقہ پر چلنے کی ترویج نہیں ہوئی۔ مسلمانانِ پنجاب محض نام کے مسلمان ہیں۔ ہمارے صوبہ میں علمائے دین کی کمی نہیں مبلغ بھی مل جائیں گے لیکن ایک بات ہے وہ یہ کہ میدانِ عمل میں اترنے سے کتراتے ہیں۔ اور یہی مسلمان کے امتحان کا موقع ہے۔ مسلمان کو چاہیئے کہ مذہب کی پابندی کریں اور خدا اور اس کے رسول پاک ﷺ کے احکام کی تعمیل کریں۔ اس معبود حقیقی کے سوائے کسی سے نہ ڈریں آپس میں محبت و پیار بڑھائیں اور پرامن ترک موالات پر عامل ہوں۔ دوسرے ملکوں کے لباس پہننے سے کیا فائدہ؟ غیر ممالک کی اشیاء خریدنے سے کیا حاصل؟ ہندو اور سکھ بھائیوں کا ساتھ دو اور نہایت خاموشی سے نہایت امن سے مذہب اور ملک کی بہبودی کے لئے کوشاں رہو"

(بذریعہ خان شفاعت اللہ خاں رکن پنجاب خلافت کمیٹی)

روزنامہ "زمیندار" یکم اپریل ۱۹۲۱ء

مارچ ۱۹۲۱ء میں پہلی مرتبہ گرفتار ہونے پر جیل سے امیر شریعت کا مشائخ عظام و علمائے کرام کی خدمت میں پیغام

" یہ ایک پیغام ہے جو آپ کے سپرد کرتا ہوں کہ آپ مشائخ عظام اور علمائے کرام تک پہنچادیں۔ میری طرف سے عرض کردیں کہ حضرات میں ناچیز مبلغ خاکپائے علمائے کرام اپنا فرض ادا کرچکا اور شکر ہے کہ ایسے موقع پر جیل جانے لگا ہوں جب بھائی مولانا فاخر (مولانا سید فاخرالہ آبادی) جیل خانہ سے باہر آکر اشاعت و تبلیغ کے اہم فرائض انجام دیں گے۔ لیکن حضرات علمائے کرام کا فرض ہے کہ وہ مسلمانوں کو قرآن پاک کے مطالب و معانی سمجھائیں۔ طوطے کی طرح نہ پڑھائیں بلکہ اس طرح ذہن نشین کرادیں کہ اس شیریں زبان عربی کا مکمل مفہوم اپنی زبان میں سمجھ سکیں اور احکام الہیٰ پر کاربند ہوسکیں۔ مشائخ عظام کی خدمت میں عرض ہے کہ وہ اب وقت کی اہمیت دیکھیں۔ ہمسایہ اقوام اپنے اپنے مذاہب کے لئے کیا کچھ کررہی ہیں۔ ہمارے بھائی اپنے مذاہب پر عمل پیرا ہوکر روحانیت میں گوئے سبقت لے جارہے ہیں۔ ان کے ہاتھ بندھ گئے۔ انہوں نے جبر و تشدد، تکبر و نخوت کو دل سے نکال دیا ہے اور کامیاب ہونے والے ہیں۔ لیکن مسلمان نام کے مسلمان ہیں۔ انہیں قرآن شریف اور مذہبی احکام سے واقف و آگاہ کرنا مشائخ عظام اور علمائے کرام کا فرض ہے۔ آپ حضرات خدارا اپنا فریضہ پہچانیں اور میدان عمل میں اتریں۔ اگر قرآن شریف کی تلاوت اور اعلائے کلمۃ الحق کے لئے جیل خانہ بھیج دیئے جائیں گے تو سنت سجاد کی ادائیگی کر سکیں گے "

بذریعہ شفاعت اللہ خاں رکن خلافت کمیٹی (پنجاب)
روزنامہ "زمیندار" یکم اپریل ۱۹۲۱ء

عرب اسرائیل جنگ

قرآن مجید ہمیں نجات کا راستہ بتاتا ہے۔ ہم یہودیوں اور نصرانیوں کو کبھی دوست تصور نہیں کر سکتے۔ جو کہ فلسطین میں مل کر ہمارے غریب بھائیوں پر عرصہ حیات تنگ کر رہے ہیں۔ میں اپنے دوستوں کو مشورہ دوں گا کہ جو فوج میں بھرتی ہو کر جانا چاہیں ان کی ہر گز مخالفت نہ کریں۔ لیکن خدا سے دعا کریں کہ یہ لوگ جا کر واپس نہ آئیں۔

جہلم ۲۴ جنوری ۱۹۵۳ء

اپنے رفیق مولانا حبیب الرحمن لدھیانوی کی وفات پر تعزیتی پیغام

"ایک اچھے رفیق، مونس، غم خوار اور سراپا ایثار ساتھی کی جدائی نے میرے سینے میں ایک اور زخم کا اضافہ کر دیا ہے۔ مولانا کی وفات ملت کے لئے سانحہ عظیم ہے"۔

"نوائے پاکستان"

۶ ستمبر ۱۹۵۶ء

مجلس احرار اسلام سے پابندی ختم ہونے پر بیان

قدرت نے میرے مرنے سے پہلے میری سب سے بڑی آرزو پوری کر دی ہے۔ اب میرے مرنے کے بعد میری روح کو اطمینان رہے گا کہ احرار اکٹھے ہو گئے ہیں اور ملک و قوم کی خدمت کے لئے متحد ہیں۔

سید عطاء اللہ بخاری

(روزنامہ "آزاد" لاہور، یکم ستمبر ۱۹۵۸ء)

روزنامہ "نوائے پاکستان" کے اجراء پر
پیغام

"نوائے پاکستان" جن عزائم اور مقاصد کو لیکر اپنا دور جدید شروع کر رہا ہے۔ میں ان عزائم و مقاصد کی کامیابی کے لئے بارگاہ رب العزت میں دعا کرتا ہوں۔ ہمیں سیاسی بکھیڑوں میں الجھنے اور پھنسنے کی ضرورت نہیں۔ ہمارے پیش نظر صرف ایک ہی موقف ہونا چاہیئے۔ اور وہ حضور ختم المرسلین ﷺ کی ختم نبوت کا تحفظ ہے۔ اس کے علاوہ جو باتیں ملحوظ رکھنی ضروری ہیں وہ پاکستان کی عمومی خدمت اور جمہور المسلمین کو ان گمراہیوں سے نکالنا ہے جو ان کے عقائد و اعمال میں جڑ پکڑ چکی ہیں۔ ان الفاظ کے ساتھ میں "نوائے پاکستان" کی کامیابی کے لئے دعا کرتا ہوں۔

دستخط

سید عطاء اللہ بخاری

۲۴ جون ۱۹۵۶ء

مسئلہ ختم نبوت سے متعلق شاہ صاحب کا
حقیقت افروز بیان

مسئلہ ختم نبوت جان ایمان اور روح قرآن ہے۔ اگر مسلمان عقیدۂ ختم نبوت سے بال برابر بھی ادھر ادھر ہو جائیں تو پھر نہ محمد عربی ﷺ کا فرمان باقی رہتا ہے۔ اور نہ خدا تعالیٰ کی وہ تنزیہہ و تقدیس باقی رہتی ہے جس پر حضرت آدم سے لے کر حضور ختمی مرتبت تک تمام انبیاء ﷺ متفق ہیں۔ مرزائیت کی روح پر اور اسی جانِ قرآن اور جانِ اسلام پر مرتدانہ ضرب ہے۔ میں اس کے استحصال کو ہر مسلمان کے لئے فرض بلکہ افرض جانتا ہوں اور اپنی زندگی کی آخری بازی بھی اس پر لگا دوں گا۔ یہ پاکستان کے جسم کا سیاسی ناسور ہے اگر حکومت نے اس کا آپریشن نہ کیا تو یہ ناسور سارے جسم کو تباہ کر کے رہے گا۔ والسلام!

سید عطاء اللہ بخاری

(روزنامہ "آزاد" احرار نمبر ۲۷ ستمبر ۱۹۵۶ء)

تاریخ کی سچائی

مجھے پاکستان بن جانے کا اتنا ہی یقین ہے جتنا کہ اس بات پر کہ صبح کو سورج مشرق سے طلوع ہوگا۔ لیکن یہ پاکستان وہ پاکستان نہیں ہوگا جو دس کروڑ مسلمانانِ ہند کے ذہنوں میں اس وقت موجود ہے۔ اور جس کے لئے آپ بڑے خلوص سے کوشاں ہیں ان مخلص نوجوانوں کو کیا معلوم کہ کل ان کے ساتھ کیا ہونے والا ہے؟
بات جھگڑے کی نہیں سمجھنے اور سمجھانے کی ہے سمجھادو، مان لوں گا۔ لیکن تحریک پاکستان کی قیادت کرنے والوں کے قول و فعل میں بلا کا تضاد اور بنیادی فرق ہے اگر آج مجھے کوئی اس بات کا یقین دلادے کہ کل ہندوستان کے کسی قصبہ کی گلی میں یا کسی شہر کے کسی کوچہ میں حکومت الٰہیہ کا قیام اور شریعت اسلامیہ کا نفاذ ہونے والا ہے۔ تو رب کعبہ کی قسم! میں آج ہی اپنا سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر آپ کا ساتھ دینے کو تیار ہوں۔۔۔۔۔۔ لیکن یہ بات میری سمجھ سے بالاتر ہے کہ جو لوگ اپنی اڑھائی من کی لاش اور چھ فٹ کے قد پر اسلامی قوانین نافذ نہیں کرسکتے وہ دس کروڑ کی انسانی آبادی کے ایک قطعۂ زمین پر کس طرح نافذ کرسکتے ہیں؟
ادھر مشرقی پاکستان ہوگا ادھر مغربی پاکستان، درمیان میں چالیس کروڑ متعصب ہندو آبادی جس پر اس کی اپنی حکومت ہوگی، ہندو اپنی مکاری اور عیاری سے پاکستان کو ہمیشہ تنگ کرتا رہے گا اسے کمزور بنانے کی ہر کوشش کریگا اس تقسیم کی بدولت آپ کے دریاؤں کا پانی روک دیا جائے گا۔ آپ کی معیشت تباہ کرنے کی کوشش کی جائے گی اور آپ کی حالت یہ ہوگی کہ بوقت ضرورت مشرقی اور مغربی پاکستان دونوں ایک دوسرے کی کوئی سی مدد کرنے سے قاصر ہوں گے۔ پاکستان میں چند خاندانوں کی حکومت ہوگی اور یہ انگریز کے پروردہ، فرنگی سامراج کے "خود کاشتہ پودے" زمینداروں جاگیرداروں، سرمایہ داروں، صنعت کاروں، سروں اور نوابوں کے خاندان ہوں گے جو اپنی من مانی کارروائیوں سے محب وطن اور غریب عوام کو پریشان کرکے رکھ دیں گے۔ غریب کی زندگی اجیرن ہوجائے گی۔ ان کی لوٹ کھسوٹ سے پاکستان کے کسان اور مزدور نان شبینہ کو ترس جائیں گے۔ امیر دن بدن امیر تر ہوتا چلا جائے گا اور غریب غریب تر۔

مانو نہ مانو جان جہاں اختیار ہے
ہم نیک و بد حضور کو سمجھائے جاتے ہیں

(اقتباس خطاب)
امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاری رحمہ اللہ
۲۶ اپریل ۱۹۴۷ء اردو پارک دہلی

*

ہرچہ می گوید قلندر دیدہ گوید

در شہادت گاہ تکمیل رموز امر و نہی!
آرزو مند شہادت جز عطاء اللہ نیست
حرف حرفش معنیٔ تفسیر قرآں است و بس
حرف باحرفش بگیرد آنکہ رمز آگاہ نیست
ہر چہ می گوید قلندر دیدہ گوید اے پسر
در نگاہِ اہل معنی غیر وجہ اللہ نیست
نفی واثبات شہید دوست در معنی یکیست
ہم عطاء اللہ ہست وہم عطاء اللہ نیست

مولانا غلام قادر گرامیؒ

مفکر احرار چودھری افضل حق رحمۃ اللہ علیہ

پیکر علم و عمل

چودھری صاحب مرحوم کے یہ تأثرات ضیغم احرار شیخ حسام الدین مرحوم کی روایت سے ابو یوسف قاسمی کی تصنیف "مفکر احرار چودھری افضل حق" سے نقل کئے جا رہے ہیں جو ۱۹۹۱ء میں بساط ادب لاہور سے پہلی بار شائع ہوئی۔ (کفیل)

شاہ جی کی مسلسل دو تقریروں نے میرا کام تمام کر دیا[۱]۔ انگریز نے عالم اسلام پر جو ظلم و ستم روا رکھا تھا۔ اسے دیکھ دیکھ کر میں ملازمت کے دوران دل ہی دل میں کڑھتا رہتا۔ اب شاہ جی کی تقریروں نے جلتی پر تیل کا کام کیا۔ شاہ جی نے اہل فرنگ کی اسلام دشمنی کا اپنی جادو بیانی سے کچھ ایسا نقشہ کھینچا کہ میرے قلب و جگر میں بچپن سے لیکر عالم شباب تک انگریزوں کے خلاف حقارت و نفرت کا جو جذبہ پرورش پا رہا تھا۔ آناً فاناً ایسا اجاگر ہوا کہ مجھے دنیا و مافیہا کی کوئی خبر نہ تھی۔ میں اپنے ماحول سے کچھ ایسا بیگانہ ہوا کہ مجھے یہ بھی یاد نہ رہا کہ میں پولیس کا ایک سب انسپکٹر ہوں اور اپنی ڈیوٹی سرانجام دے رہا ہوں۔ عین ممکن ہے کہ مجھے ان کے خلاف مقدمہ چلانے کا فریضہ سرانجام دینا پڑے۔ میری رپورٹ کے باعث ان کی تقریر قانونی شکنجے میں آ جائے۔ پھر مجھے انگریز کے قانون کی حمایت میں شاہ جی کے خلاف لب کشائی کی بھی ضرورت لاحق ہو گی۔ یہ سب خیالات جو ایسی صورت حال کا ایک لازمی تقاضا ہو کرتے ہیں میرے ذہن سے یک قلم ماؤف ہو گئے تھے۔ میں یوں محسوس کر رہا تھا کہ شاہ جی کی لاثانی خطابت کے سمندر میں ایک بے سہارا تنکے کی طرح بہتا ہوا جا رہا ہوں۔ در اصل ان کی تقریر میں بلاد اسلامیہ کے درد و کرب، رنج و ملال اور حزن و غم کی ایک ایسی تصویر رقصاں تھی جو ایک مدت سے میرے اپنے ذہن پر نقش ہو کر رہ گئی تھی۔ وہ تقریر کر رہے تھے اور میرے دل کی ایک ایک دھڑکن ان کے خیالات سے ہم آہنگ تھی۔ وہ جب فرنگی بابا کی استعمار پسندی، چیرہ دستی اور عیاری کے واقعات اپنی معجز نما زبان سے بیان کر رہے تھے تو میں یوں محسوس کر رہا تھا جیسے میں کسی مجاہد کی طرح تمام ہتھیاروں سے لیس میدان جنگ میں کھڑا ہوں اور جونہی حملے کا بگل بجے گا میں انگریز کے سارے کس بل نکال دوں گا۔ اور جب مجاہدین اسلام کے زریں کارنامے اپنی حجازی لے میں سنا رہے تھے تو میں اپنے وجود تک سے بے خبر اور غافل ہو کر رہ گیا تھا۔

تین چار گھنٹے کی یہ ساحرانہ خطابت جب اختتام پذیر ہوئی تو مجھے یوں لگا میں کسی خواب سے بیدار ہوں۔ میں اپنے عملے کی معیت میں کوتوالی پہنچا وہاں کے ضابطوں کی تکمیل کے بعد گھر لوٹا مگر اب طبیعت کا سکون ہل گیا تھا۔ اضمحلال و کرب کی اس کیفیت میں بغیر کچھ کھائے پیئے چارپائی پر دراز ہو گیا۔ مگر نیند سے آنکھیں اشنا ہونے کا نام نہ لیتی تھیں۔ نگاہوں کے سامنے وہی منظر رقص کر رہا تھا۔ میں تخیل کی ایک خوشنما وادی میں پہنچ گیا۔ میں سوچ رہا تھا۔ خوشحالی میں ساتھ دینا بھی کوئی نیکی اور بہادری ہے؟ شرافت اور خلوص کے تقاضا کے تحت اسلام کے اس

---

[۱] شاہ جی مولانا حبیب الرحمن لدھیانوی کی دعوت پر تحریک ترک موالات ۱۹۲۱ کے سلسلہ میں تقریر کے لئے لدھیانہ تشریف لے گئے تھے۔

بد ترین دور میں تھوڑی سی قربانی بہت سے اجر کا باعث ہو سکتی ہے۔ اس جذبے کے ساتھ یہ خیال بھی ابھرا کہ اگر ایسا ہوا تو پھر کیا ہو گا؟ میرے عزیز و اقرباء کیا کہیں گے؟ میری اولاد کا کیا مستقبل ہو گا؟ امید و بیم کی اس کیفیت میں رات سوتے جاگتے کٹ گئی۔ دوسری رات شاہ جی پروگرام کے مطابق پھر تقریر کر رہے تھے۔ اب ڈیوٹی کے احساس کی نسبت ذوق و شوق کا جذبہ انتہائی شدت کے باعث مجھے کشاں کشاں جلسہ گاہ کی طرف لے گیا۔ شاہ جی کی تقریر میں واقعات وہی تھے مگر انداز نیا تھا۔ ان کی زبان کی لطافت، الفاظ کی شوکت اور اندازِ بیان کی پاکیزگی کا وہی عالم تھا۔ وہ محمود غزنوی اور کسی فقیر بے نوا کا واقعہ اپنے دل کش ترنم میں سنا رہے تھے

شنیدہ تو کہ محمود غزنوی شب دے
نشاط کرد شب اش برسر سمور گزشت
یکے فقیر ہمہ شب سر تنور گزشت
شب تنور بر آں مستمند عور گزشت
صباح نعمہ بر آورد و گفت اے محمود
شب تنور گزشت و شب سمور گزشت

ان اشعار کے معانی نے مجھے سوچنے پر مجبور کر دیا کہ زندگی محمود غزنوی اور فقیر دونوں کی بسر ہو گئی۔ محمود غزنوی نے دبیز قالینوں پر گزار دی تو کیا؟ اور فقیر نے پتھریلی زمین پر سسکیاں لیتے بسر کر دی تو کیا؟ زندگی کو کسی بلند نصب العین، کسی خوشنما مقصد اور خود داری کے جذبے کے تحت بسر کرنا اصلی منشائے حیات ہے۔ انہی جذبات سے مغلوب ہو کر میں نے استعفیٰ داغ دیا۔ اور گھر آ بیٹھا۔ (۲) **(چودھری افضل حق) ابو یوسف قاسمی ص۳۴)**

---

(۲) شیخ حسام الدین مرحوم ہی کی روایت ہے کہ چودھری صاحب کبھی موڈ میں آتے تو شاہ جی سے مخاطب ہو کر فرماتے "ارے شاہ جی! تمہیں تو معلوم ہی نہیں کہ، اللہ تعالیٰ نے کون کون سی صفات تمہیں بخش دی ہیں کہ دنیا تمہارے پیچھے پیچھے بھاگتی پھرتی ہے۔" (چودھری افضل حق، ابو یوسف قاسمی صفحہ ۳۸)

ڈاکٹر سید عبد اللہ مرحوم راوی ہیں کہ مرحوم چودھری افضل حق کی یہ حالت تھی کہ شاہ جی جب طویل تبلیغی سفر پر چلے جاتے تو وہ یہ فرمایا کرتے "شاہ جی دے بغیر ماڑیاں کھولے (کھنڈر) معلوم ہوندے نیں" اور کبھی کبھی کوئی صورت پیدا کر کے ان کا دورہ کٹوا بھی دیتے اور پھر اپنی محبت آمیز شرارت پر بہت خوش ہوتے۔ (چٹان لاہور سالنامہ ۱۹۶۲ء صفحہ ۸۰)

جذبہ احرار

مسلمانو! پرچم ختم نبوت گرنے نہ پائے اور عقیدۂ ختم نبوت پر آنچ نہ آئے۔ اس کی حفاظت ہم سب مسلمانوں کے ایمان کی اساس ہے۔

احرار رضا کارو!

اس تحریک کی روح کو زندہ رکھنا، میری دعائیں مجلس احرار اسلام کے ساتھ ہیں۔ میں مطمئن ہوں کہ جب تک احرار باقی ہیں نئی نبوت نہیں چلنے دیں گے۔ جب بھی کوئی نبی سر اٹھائے گا ہم صدیق اکبر کی سنت جاری کریں گے۔

مسلمانو!

متحد ہو کر احرار کی اس دینی جنگ میں شریک ہوجاؤ اور اپنی اجتماعی قوت سے انگریزی نبوت کا ٹاٹ لپیٹ دو۔

مقصود کی منزل نہ ملی ہے نہ ملے گی
سینوں میں اگر جذبۂ احرار نہیں ہے

امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاری رحمہ اللہ
ملتان ستمبر ۱۹۵۸ء

ہدیہ خلوص

بخدمت امیر شریعت سیّد عطاء اللہ شاہ بخاری! ۱۴ جنوری ۱۹۳۳ء کو صبح کو معلوم ہوا کہ شاہ جی کی آج رہائی ہے اور ابھی جا رہے ہیں۔ فوراً قلم برداشتہ یہ چند شعر لکھے۔ (کفایت اللہ)

چل دیئے ہو کس کو کس پر تم قفس میں چھوڑ کر
رشتۂ اخلاص کو کس بے رخی سے توڑ کر!
بیڈ منٹن ساتھ کس کے کھیلیں پنّا اور پریم
گوری شنکر کس کو اب کھینچیں گے بانہیں موڑ کر
کس سے دل بہلائیں گے ہنس کھیل کر احمد سعید[1]
مظہر[2] و لدھیانوی[3] بیٹھیں کہاں سر جوڑ کر!
بادہ نوشو، لو لپیٹو عیش و عشرت کی بساط
کیونکہ ساقی چل دیا جام و صراحی پھوڑ کر
خیر کچھ پروا نہیں جاؤ خدا حافظ مگر
بھول مت جانا ہمیں غیروں سے رشتہ جوڑ کر
ہوں مبارک تم کو آزادی کے اب لیل و نہار
فتح و نصرت پاؤ تم دشمن کی گردن موڑ کر!
شیرِ حریت کی آزادی سے میں تو خوش ہوا
بزدلانِ قوم اب بھاگیں گے میداں چھوڑ کر!

حضرت مفتی کفایت اللہ رحمہ اللہ

۱۔ مولانا احمد سعید دہلوی ۲۔ مولانا مظہر علی اظہر ۳۔ مولانا حبیب الرحمن لدھیانوی

تحریر: ضیغمِ احرار شیخ حسام الدین رحمۃ اللہ علیہ
نظرثانی واضافہ: سید عطاء المحسن بخاری

میرے شاہ جی

یہ کیا دست اجل کو کام سونپا ہے مشیت نے
چمن سے توڑ کر پھولوں کو ویرانے میں رکھ دینا

سید عطاء اللہ شاہ بخاری ایسے مقدس دور کی صدائے بازگشت تھے جس کا آغاز ۱۷۵۷ء کی جنگ پلاسی (بنگال) سے ہوا۔ فرنگی مقامروں نے لالچ، سازش، مکر و فریب اور ظلم و استبداد کے ابلیسی ہتھکنڈوں سے سراج الدولہ کو شکست دی۔ اس شکست کا انتقام لینے کے لئے امیر حیدر علی اور سلطان ٹیپو میسور میں منظم ہوئے اور فرنگی کے دانت کھٹے کئے مگر وہی ابلیسی و پرویزی حیلے یہاں بھی فرنگی کی کامیابی کا ذریعہ بنے۔ ان حادثوں میں ملی زوال کے اسباب کبھی رونما نہ ہوتے اور فرنگی کبھی مسلمانوں کے اقتدار کا خاتمہ نہ کر سکتا۔ اگر بنگال و دکن کا رافضی عنصر دولت و اقتدار کی دہلیز کو نہ چاٹتا اور غداری و سازش کی لعنت کا طوق اپنے گلے میں نہ ڈالتا۔ ان علقمی زادوں نے ذاتی مفادات کو قومی مفادات پر ترجیح دے کر ہندوستان کی تاریخ کا رخ موڑ دیا۔ انگریز ہندوستان پر تقریباً قابض ہو گیا۔ ان کی اس رسوائے زمانہ شیعی پالیسی پر ترجمان اسلام علامہ اقبال مرحوم نے ذیل کا یہ شعر کہہ کر انہی غداران ملت اسلامیہ کو ابدی لعنت کا سزاوار ٹھہرایا۔

جعفر از بنگال و صادق از دکن
ننگ ملت، ننگ دیں، ننگ وطن

ان رافضیوں، تبرّائیوں اور علقمی زادوں کی سلگائی ہوئی منافقت و ملت فروشی کی آگ مغل خانوادے کے آخری تاجدار سراج الدین ظفر کے نابالغ شہزادوں کے سر ناشتہ خوان پر سجا کے جلائی گئی۔ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کو جہاد کے فتویٰ سے تیز تر کرنے والے علماء، مصلح، عوام، مسلمان اور ہندو بھی مولانا احمد شاہ، جنرل بخت خان، تیتو میر رحمھم اللہ اور تانتے شاہ کی کمان میں اس کو بجھاتے بجھاتے شمع کی مانند خود بھی جل بجھے۔

فرنگی استبداد کا دیو خبیث جب رافضیوں کی ملی بھگت سے مسلمان مجاہدوں کے سروں کی فصل کاٹتے کاٹتے اکتا گیا تو فرنگی استعمار نے سزاؤں کا رخ بدل کر جائیداد کی ضبطیوں، کالے پانیوں میں عمر قید کی ذلیل پالیسی سے انسانیت کی تذلیل اور مسلم دشمنی پر مہر ثبت کر دی۔ رافضی نوابوں اور جاگیرداروں نے فرنگی اقتدار کے ماء حمیم کو اوک سے پیا اور سرکاری سرپرستی میں عوامی زندگی میں زہر گھولنا شروع کر دیا تو حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی امام الہند بن کر ابھرے اور فرنگی اور اس کے گماشتوں کا قلع قمع کرنے کی ٹھانی۔ احمد شاہ ابدالی، شاہ ولی اللہ کے خوابوں کی تعبیر بن کر ہندوستان میں وارد ہوا اور مسلمانوں کی ڈوبتی ہوئی کشتی کو کنارے لگا گیا۔ حالت نے پھر منفی رخ اختیار کیا اور شاہ ولی اللہ ان فرنگی گماشتے رافضیوں کے ہاتھوں شہید ہو گئے تو شاہ عبدالعزیز، سید احمد شہید نے ان کی خالی جگہ پُر کی اور اس تحریک کو جہاد و ہجرت کا نیا رخ دیا۔ اور

عملی جدوجہد اپنے دوسرے عوامی ارتقائی دور میں داخل ہو گئی۔ پھر کچھ عرصہ بعد مولانا محمد قاسم نانوتوی، مولانا رشید احمد گنگوہی نے اپنے مقدس اسلاف کی جہاد اسلامی کی عملی ریت کو تازہ کیا۔ حاجی امداد اللہ مہاجر مکی اوران کے عظیم رفقاء نے انگریزوں اوران کے رافضی گماشتوں کے دانت کھٹے کئے۔ اور فتح وشکست کے بین بین جہاد جاری وساری رکھا۔ عملی زندگی میں وطنی غلام پسند ٹولہ کی بدنہادی سے تنگ آکر تحریکی ذہن تیار کرنے کی نئی راہ کھولی اور دیوبند کے مدرسہ کی نیو اٹھائی۔ پھر اس مدرسہ فکر نے احیاء دین کی تحریک کے مجاہد شیخ الہند مولانا محمود حسن اموی قریشی کی امامت میں اس جہاد کا آغاز کیا تو فرنگی اور فرنگی زادوں سے عوامی انتقام کی آگ نے پورے ہندوستان کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ مولانا اپنے جیالے رفقاء کی سرپرستی کرتے ہوئے مالٹا میں اسیر ہو گئے۔ پھر جب مولانا رہا ہوئے تو زمانہ کروٹ بدل چکا تھا۔

چھٹے اسیر تو بدلا ہوا زمانہ تھا
وہ شاخ ہی نہ رہی جس پر آشیانہ تھا

جہاد حریت نے لوگوں کو تھکا دیا تھا۔ مسلمانوں میں سیاسی انتشار عروج پر تھا۔ اور انگریز کی وفادار جماعت کانگریس اور مسلم لیگ نے عوام میں فرنگی سرکار کی مفاہمت کے جذبہ کو عملی زندگی میں قومی وملی

زندگی کا بنیادی پتھر بنا دیا تو یہ ایک حلقۂ یاراں مختلف ٹولیوں میں بٹنے لگا۔ وڈیروں، جاگیرداروں کا ٹوڈی طبقہ سر آغا خان، نواب وقار الملک، سر سلیم اللہ وغیرہ کی پالتو جماعت مسلم لیگ اور یونینسٹ پارٹی بنا کر قومی مجاہدوں کی مخبری کے فرائض منصبی ادا کرنے پر قانع ہو گیا۔ علماء بھی دو حصوں میں بٹ گئے۔ کچھ کانگریس میں دیوی درشن پر راضی ہو گئے اور گاندھی کی جھوٹی اہنسا کی بھینٹ چڑھ گئے۔ اور کچھ فرنگی گماشتوں کی پیش کردہ آسائش وزیبائش کی نذر ہو گئے۔

۱۹۲۱ء میں مولانا محمود حسن اموی قریشی اللہ کو پیارے ہو گئے تو ہندوستان کی بساط جہاد بساط سیاست بن کر رہ گئی۔ اس پورے ہندوستان میں اگر کچھ لوگ باقی رہ گئے تھے تو وہ تھے

مسیح الملک حکیم محمد اجمل خان

علی برادران (محمد علی، شوکت علی)

مولانا حسین احمد مدنی، مولانا احمد سعید دہلوی، مولانا عبد الحامد بدایونی، مولانا عبد القادر قصوری، مولانا سید سلیمان ندوی، رفیق احمد قدوائی، مولانا محمد داؤد غزنوی، ظفر علی خان، ڈاکٹر مختار احمد انصاری، مفتی کفایت اللہ، مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا عبد الباری فرنگی محلی، مولانا فاخر الٰہ آبادی، مولانا حبیب الرحمن لدھیانوی، تصدق حسین شیروانی، حفظ الرحمن سیوہاروی، مولانا محی الدین اجمیری، ڈاکٹر سیف الدین کچلو اور امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاری رحمہم اللہ رحمۃً واسعۃً

ہمارے شاہ جی ان تمام باوقار و بلند مرتبہ متقدمین سے متاثر ہونے کے باوجود جہاد آزادی کی بساط پر اس شان و تمکنت سے جلوہ گر ہوئے جیسے ظلمتوں اور گھٹا ٹوپ اندھیروں میں ماہتاب۔ دیکھتے ہی دیکھتے امرتسر

کے کوچہ جیل خانہ کی مسجد کا امام ۱۸۵۷ء کے مجاہدین سے لے کر مولانا محمود حسن تک کے قافلہ حریت کا آخری سپہ سالار بن گیا اور وادیٔ عرب کے ریگ زاروں میں گھن گرج کی جو آوازیں کبھی گونجا کرتی تھیں وہ ہندوستان میں ہمالہ سے سلہٹ اور کراچی سے جلال آباد تک گونجنے لگیں۔ وہی مبارزت، وہی رجز خوانی، وہی لحن داؤدی میں تلاوت قرآن اور وہی معرکہ آرائی

ہو حلقۂ یاراں تو بریشم کی طرح نرم
رزمِ حق و باطل ہو تو فولاد ہے مومن

خلوص وللہیت، وفا و ثابت قدمی، قربانی و ایثار، جفاکشی و جواں ہمتی جیسی صفات عالیہ میں شاہ جی اپنے اسلاف کی مکمل تصویر تھے۔

شاہ جی مدرسہ نصرۃ الحق میں حضرت مفتی غلام مصطفیٰ قاسمی اور مدرسہ نعمانیہ مسجد خیر الدین ہال بازار میں موقوف علیہ تک پڑھ چکے تھے۔ جب ۱۹۱۹ء کے سیاہ اپریل میں جلیانوالہ باغ میں کرنل اوڈوائر نے خونی ڈرامہ کھیلا۔ امت مسلمہ میں اس وحشت و بربریت اور سفاکی کے خلاف اجتماعی رد عمل نے ملک بھر کے مجاہدوں اور سیاست دانوں کو حصہ لینے پر مجبور کر دیا تو شاہ جی کو میں نے پہلے پہل بندے ماترم ہال کے ایک قومی اجتماع میں دیکھا۔

اپریل ۱۹۱۹ء کے مارشل لاء میں مظالم جلیانوالہ باغ کی تحقیقات کے لئے سرکاری و غیر سرکاری کمیشن بیٹھے اور اسی سال دسمبر کے آخری ہفتہ میں خلافت، مسلم لیگ اور کانگریس کے مشترکہ اجلاس منعقد ہوئے۔ اور مارشل لاء کے تمام قیدیوں کو رہائی ملی اور حکومت ہند کی مرضی کے علی الرغم علی برادران، مولانا حسرت موہانی، مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا ظفر علی خاں کو بھی اجتماع میں شمولیت کے لئے بروقت آزاد کر دیا گیا۔ جن کو خوش آمدید کہنے اور جن کے استقبال کے لئے گویا پورا ہندوستان امڈ آیا تھا۔ اجلاس بندے ماترم ہال میں تھا اور قائدین کی آمد سے پہلے ہال میں تل دھرنے کو جگہ نہ تھی۔ شاہ جی بھی ان قومی قائدین کی زیارت کرنے اور ان کی باتیں سننے کے لئے محویت کی تصویر بنے بیٹھے تھے۔ ان دنوں شاہ جی اصلاح الرسوم اور اصلاح عقائد پر ہی وعظ کہتے تھے بعد میں شاہ جی سے سنا کہ "جو کچھ میں مولانا نور احمد سے تفسیر جلالین میں پڑھتا وہی جمعہ اور مواعظ میں سنا دیتا تھا"۔

شاہ جی دوستوں کی محفلوں میں بذلہ سنجی، لطیفہ گوئی، شعر و ادب کی مجالس میں دیکھے جاتے تھے۔ حکیم طغرائی کی بیٹھک پر روزانہ مجمع احباب ہوتا تھا۔ جن میں سید محمد مقیم بخاری جو آپ کے ددھیالی و ننھیالی عزیزوں میں سے تھے۔ حکیم ظہیر الدین صہبائی، حفیظ جالندھری اور بہت سے لوگ جو امرتسر کی ادبی زندگی کی روح و جاں تھے۔ شاہ جی ان میں بیٹھتے اٹھتے۔ شعری و ادبی ذوق ان کا منجھا ہوا زبان محاورہ ان کی ننھیالی وراثت تھی۔ کہ شاد عظیم آبادی جیسا بلند آدمی بھی محاوراتی زبان کی اصلاح کے لئے ان کی نانی اماں کے حضور حاضری دیتا تھا۔ انہیں دنوں چونکہ وعظ و تقریر سے آپ کو قبولیت عام کا درجہ حاصل ہو رہا تھا۔ تو مولانا داؤد غزنوی نے شاہ جی میں وہ جوہر پایا جو اس وقت کے دینی تقاضوں کے لئے بہت اہم تھا۔ انہوں نے شاہ جی کو قومی

معاملات و مسائل کے اجلاس اور جلسوں میں دعوت دینا شروع کی تو شاہ جی خلافت کمیٹی کے سٹیج پر مسلمانوں کی آواز بن کر چمک اٹھے۔ پھر خلافت کمیٹی کے بزرگ مولانا عبد القادر قصوری سے مشورہ اور حکم سے شاہ جی کو ضلع گجرات میں خلافت کمیٹیوں کی تشکیل کی ذمہ داری سونپی گئی۔ شاہ جی نے بے پناہ جدوجہد سے ضلع گجرات میں دو سال کی جانکاہ محنت سے ساڑھے تین ہزار خلافت کمیٹیاں قائم کیں۔ مسلمانوں کے دو اسکول بنائے۔ وکلاء کو کچہری سے وکالت چھڑوائی، برطانوی ہند کے نظام تعلیم میں جکڑے ہوئے اسکولوں سے کئی اساتذہ نے شاہ جی کی تقریر سن کر ریزائن کر دیا۔ مارچ ۱۹۲۱ء میں مسجد خیر الدین کے ایک جلسہ عام میں حضرت شاہ جی نے تقریر کی اور برطانوی سامراج کی دھجیاں اڑا دیں۔

شاہ جی پر مظلوم ترکوں کی بربادی، خلافت عثمانیہ کا عبرت ناک زوال، ٹوڈی مسلمانوں کی بے حمیتی، علماء سو کی مداہنت کا بہت بُرا اثر تھا۔ اس پر جلیانوالہ باغ میں فرنگی کے وحشیانہ مظالم نے جلتی پر تیل کا کام کیا۔ مولانا آزاد کے الہلال، مولانا ظفر علی خاں کے ستارۂ صبح نے ان کی سمت متعین کر دی۔ ان سارے جذبات کا اخراج اس تقریر میں ہوا۔ تقریر ایسی تھی کہ امرتسر ہل گیا۔ لوگ آمادہ جہاد نظر آرہے تھے۔ اس تقریر کی پاداش میں آپ گرفتار ہوئے۔ مقدمہ چلا اور آپ کو تین سال قید بامشقت سزا ہوئی اور آپ میانوالی جیل بھیج دیئے گئے۔ پھر ریل اور جیل کا یہ لامتناہی سلسلہ چل نکلا جو تیس برس پر محیط ہے۔ قومی و دینی معاملات کا وہ کون سا مسئلہ ہے جس میں شاہ جی نہیں کودے جہاں بھی نار نمرود کا الاؤ جلا یہ ابراہیم صفت سید عطاء اللہ شاہ بخاری اس کے غرور کو خاک میں ملانے جھپٹ پڑا ایسا کبھی نہیں ہوا کہ امت پر مشکل پڑی ہو اور شاہ جی عام علماء کی طرح تماشا دیکھتے رہے ہوں۔ وہ ابو عبیدہ بن الجراحؓ اور خالد بن ولیدؓ کی طرح لشکر غنیم پر جھپٹتے اور پینترا بدل بدل کر حملہ کرتے اور کبھی نہ تھکتے جس طرح صحابہ فرمایا کرتے تھے۔

باللّیل رہباناً و بالنہار فرساناً

ہم راتوں کو راہب ہوتے ہیں اور دن کو گھوڑوں کی پشت پر

شاہ جی رات بھر تقریر کرتے۔ قرآن بیان کرتے۔ عشاء کی نماز پڑھ کر تقریر شروع کی اور صبح کی نماز پڑھ کر ستائے پھر اگلے پڑاؤ کے لئے روانہ ہو گئے۔

صبح تو اندر قرن شام تو اندر یمن

مرے نزدیک شاہ جی وہ منفرد زعیم تھے جو اس عرصہ جہاد میں امراء کی کوٹھیوں میں کبھی کبھار اور غرباء کی جھونپڑیوں میں اکثر قیام کرتے اور جو راحت و آرام وہ جھونپڑیوں میں محسوس کرتے وہ کہیں نہ پاتے۔

اور شاید اس خصوصیت میں اپنا ثانی نہیں رکھتے۔ ان سے زیادہ کسی قومی کارکن نے سفر نہیں کیا۔ ریل، بس، گھوڑا، اونٹ، خچر، گدھا، بیل، پیدل، تیر کر کوئی سا ذریعہ سفر ایسا نہیں جو آزادی، حریت، عدل، مساوات، اخوت، اور ختم نبوت کے مشن کی تکمیل کے لئے شاہ جی نے اختیار نہ کیا ہو۔ ان مذہبی اجارہ داروں کی طرح نہیں جو زاد سفر اور وسیلہ سفر نہ ملنے پر تبلیغ و وعظ کی مجالس اور قومی ملکی مسائل کے اجلاس برباد کر دیتے ہیں۔ اور پھر مکروہ تاویلات سے جماعتوں اور دینی کارکنوں کا منہ بند کر دینے کے فن خبیث میں مہارت تامہ

رکھتے ہوں۔ شاہ جی فرمایا کرتے تھے وعدہ کر لیا ہے تو نبھاؤ ورنہ اللہ کو کیا منہ دکھلاؤ گے۔ ان کا عقیدہ تھا کہ دینی و قومی کاموں میں غفلت اللہ کے ہاں مسؤلیت کا سبب ہے۔

داماں نگہ تنگ و گل حسن تو بسیار
گل حسنِ تو از تنگیٔ داماں گلہ دارد

حضرت شاہ جی کی حیات طیبہ کے کن کن محاسن کو قارئین کے سامنے پیش کیا جائے۔ مغربی سیاست کے مدو جزر میں وہ کون سا مقام آیا جہاں قلب صادق کے لئے کلمۂ حق کو اونچی سے اونچی آواز میں بلند کرنے کی ضرورت ہوتی اور ہمارا شیر نتائج سے یکسر بے نیاز ہو کر وقت کے فرعونوں اور نمرودوں سے نبرد آزما ہونے کے لئے سب سے بلند مقام پر نہ دیکھا گیا ہو۔ جنگ آزادی ہو یا فرنگی کی اسلام دشمن حکمت عملی کے خلاف جہاد سید کونین صلی اللہ علیہ وسلم کے ناموس پر حملوں کے خلاف سینہ سپر ہونا یا بانیان مذاہب حق کی عزت کا قانونی تحفظ۔ شاہ جی کا عمل سرخروئی کے لباس میں سب سے زیادہ افضل، اعلیٰ اور روشن نظر آتا ہے۔ راج گوپال والی تحریک ہو یا مغلپورہ ریلوے اسٹیشن، کوئٹہ کے مفلوک الحال زخمی انسانوں کی خدمت اور امداد ہو یا کشمیر کے بے کس و مظلوم مسلمانوں پر ڈوگرہ شاہی کے مظالم رد مرزائیت ہو یا تحفظ ختم نبوت کے لئے جان کی بازی غرض کہ ہر مقام و ہر منزل پر حضرت شاہ جی قافلہ سالار کی حیثیت میں رجز خوانی و ھل من مبارز کے نعرے لگاتے ہوئے ملے اور ساتھیوں اور جاں بازوں کے مقابلہ میں زیادہ سے زیادہ سزا کو ہنستے ہوئے قبول کرتے نظر آئے۔ چنانچہ جاں بازی و سرفروشی کے اس پیکر پر ایک شاعر کا یہ شعر کس قدر موزوں و برجستہ نظر آتا ہے۔

ایں است کہ خوں خوردہ دل بردہ بسے را　بسم اللہ اگر تاب سخن ہست کسے را

شاہ جی کی وفات

شاہ جی کی موت ایک شخص کی موت نہیں بلکہ ایک عہد کی موت ہے۔ صرف ایک عہد نہیں ایک مقدس عہد کی موت ہے۔ جس عہد کے آتش بجاں حق پرستوں نے حق کا آفتاب طلوع کرنے کے لئے اپنی حیات مستعار کی تمام توانائیاں اور رعنائیاں راہ حق کو نکھارنے کے لئے نثار کر دیں۔ یہی وہ لوگ تھے کہ جن کی قربانی و جاں فشانی سے برطانوی سامراج اپنے تمام تر جبر و استبداد کی فراوانی کے باوجود اپنی جگہ چھوڑنے پر مجبور ہو گیا اور ہٹتے ہٹتے ملک چھوڑ کر چلا گیا۔

انگریز کو ملک سے نکال باہر کرنے میں شاہ جی کا حصہ احمد اللہ شاہ، جنرل بخت خان، سید شہید اور شاہ احمد اسمٰعیل شہید کے مساوی نہیں تو کم بھی نہیں۔ حق مغفرت کرے شاہ جی کو جنھوں نے احرار ساتھیوں میں زندہ رہنے کا شعور پیدا کیا۔ اور دشمن سے پنجہ آزمائی کا حوصلہ بخشا اور دین کے لئے تن من دھن قربان کرنے اور مرمٹنے کا سچا جذبہ پیدا کیا۔

احرار آج بھی قومی، ملکی اور دینی مشکلات سے نبرد آزما ہونے کے لئے شاہ جی کی زندگی کو منزل کا سنگ میل سمجھیں اور اس وادی میں اتر پڑیں۔

ویراں ہے میکدہ خم و ساغر اداس ہیں　تم کیا گئے کہ روٹھ گئے دن بہار کے

*

بلبل چہک رہا ہے ریاضِ رسول میں

اک چست فقرہ کس کے بخاری نے کس دیا
ڈھیلا پن آگیا جو مسلماں کی چول میں
حریت ضمیر کا ڈنکا بجا دیا
ہندوستاں کے عرض میں اور اس کے طول میں
ارکان دیں ہیں بستۂ آزادیٔ وطن
یہ سب فروع آگئے ایک اس اصول میں
کہدو یہ اس سے تم کو "خودی" کا جو درس دے
رکھا ہی کیا ہے تیری فعولن فعول میں،
کانوں میں گونجتے ہیں بخاری کے زمزمے
"بلبل چہک رہا ہے ریاضِ رسول میں"

مولانا ظفر علی خانؒ

ماسٹر تاج الدین انصاری مرحوم

چند یادیں

امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاری

دنیا ایک ایسی سرائے ہے جہاں لوگ آتے ہیں چلے جاتے ہیں۔ یہ لامتناہی سلسلہ مدت مدید سے جاری ہے۔ اور تا قیام قیامت جاری رہے گا۔ جب کوئی عظیم شخصیت اپنی عظمت کا سکہ بٹھا کر آنکھوں سے اوجھل ہو جاتی ہے تو ایک ایسا خلاء پیدا ہو جاتا ہے جو کسی صورت پُر نہیں ہوتا۔ تب ہم یادوں کے سہارے محبوب ہستیوں کو تصورات کی دنیا میں واپس لانے کی ادھوری سی کوشش کرتے ہیں۔ مگر جو ایک بار چلا جاتا ہے وہ کبھی واپس نہیں آتا۔ سید عطاء اللہ شاہ بخاری عظیم شخصیت کے مالک، تاریخی انسان اور مجموعہ کمالات تھے۔ جن خوش نصیبوں کو حضرت شاہ جی کی رفاقت کا شرف حاصل ہوا انہیں معلوم ہے کہ رحمت پروردگار کس طرح موصوف کی دستگیری فرماتی تھی۔ مجھے آج حضرت شاہ جی کی زندگی کا ایک حیرت انگیز واقعہ پیش کرنے کی سعادت نصیب ہو رہی ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ قادیان کانفرنس کے انعقاد نے جب قصر مرزائیت کی دیواروں کو ہلا دیا تو خلیفہ قادیان مرزا محمود (آنجہانی) نے حکومت پنجاب کی بے توجہی اور غیر جانبداری کا شکوہ کیا۔ تاریں ہلیں اور حکومت کے کل پرزے حرکت میں آگئے۔ سوال یہ اٹھایا گیا کہ قادیان مرزائیوں کا مقدس مقام ہے۔ مرزائی حضرات اسے اپنا کعبہ سمجھتے ہیں۔ یہاں ان کے پیغمبر کا مزار ہے۔ اس لئے قادیان میں کسی غیر مرزائی گروہ کو جلسہ یا کسی قسم کا مذہبی اجتماع کرنے کی اجازت نہ ہونی چاہیئے۔ اگر اب ایسا ہوا تو فساد ہو گا جس کی ذمہ داری احرار یا گورنمنٹ پر ہو گی۔ مرزا محمود سے اس قسم کا احتجاج کرا کے حکومت نے نظر بظاہر اپنے ہاتھ مضبوط کر لئے چنانچہ حکومت پنجاب نے اعلان کر دیا کہ قادیان اور اس سے ملحقہ آٹھ میل کے رقبہ میں کسی غیر مرزائی خصوصاً احرار کو جلسہ کرنے اور اس نیت سے قادیان میں داخل ہونے کی اجازت نہیں ہے۔ یعنی حکومت نے قادیان کے گرد قانونی پابندی کی خاردار تاریں لگا دی تا کہ خلیفہ قادیان کی راجدھانی محفوظ ہو جائے۔ اس احتیاطی تدبیر کے بعد یہ سمجھا گیا کہ اب بخاری کی تبلیغی یلغار کا خطرہ ٹل گیا ہے۔ مگر یہ خوش فہمی تھوڑے ہی عرصہ بعد دور ہو گئی احرار نے قادیان سے آٹھ میل اور کچھ فرلانگ دور یعنی قانونی حدود سے ذرا ہٹ کر یک روزہ کانفرنس کا اعلان کر دیا۔ ارد گرد کے ہزارہا مسلمانوں کے اجتماع میں بخاری نے ختم نبوت کے موضوع پر عام فہم اور دلنشیں انداز میں بڑی پیاری تقریر کی اس حادثے پر حکومت کھسیانی ہو کر رہ گئی۔ پنجاب کی حکومت زیادہ بدنام نہ ہونا چاہتی تھی۔ اس لئے خاموش ہو گئی۔ مجلس احرار کے رہنماؤں نے ایچ پیچ کی بات کبھی پسند نہیں کی وہ اپنا تبلیغی حق کسی صورت چھوڑنے پر آمادہ نہ تھے وہ اس صورت حال پر مطمئن نہ تھے انہیں یہ گوارا نہ تھا کہ آٹھ میل کی پابندی قبول کریں۔ چنانچہ قانون شکنی کا فیصلہ کر کے احرار رہنماؤں نے یکے بعد دیگرے خود کو گرفتاری کے لئے پیش کر دیا۔ پکڑ دھکڑ شروع ہو گئی ایک ہنگامہ بپا ہو گیا۔ حکومت نے خلیفہ قادیان کے اطمینان قلب کے

لئے جو پاپڑ بیلے تھے بیکار ثابت ہوئے۔ تاہم آٹھ میل سے باہر جلسہ کرنے کی پابندی قائم رہی۔ پابندی کی مدت ختم ہوتی تو تازہ پابندی لگا دی جاتی۔ یہ سلسلہ کچھ عرصہ جاری رہا۔ میں ان دنوں احرار کے سیاسی مشیر یا نمائندے کی حیثیت سے قادیان میں مقیم تھا۔ مجھے یہ خطرہ لاحق ہوا کہ خلیفہ محمود کے کارندوں اور مشیروں نے اگر میرے خلاف ریشہ دوانی کر کے مجھے قادیان سے نکلوا دیا تو احرار کا پروگرام پایۂ تکمیل تک پہنچنے میں مشکلات کا سامنا ہو گا۔ میں اس خدشے کو محسوس کر ہی رہا تھا کہ مجھے حکومت کی جانب سے چوبیس گھنٹے کے اندر قادیان چھوڑ دینے کا نوٹس موصول ہو گیا۔ میں اس نوٹس کے لئے تیار تھا چنانچہ میں نے اپنی مسجد میں قادیان کے مسلمانوں کو جمع کیا۔ ان کے سامنے ایک تقریر کی۔ میں نے کہا کہ یہ نوٹس جس کے ذریعہ مجھے قادیان سے نکالا جا رہا ہے۔ میری منشاء کے مطابق ہے میں نے سیاسی کارکن کی حیثیت سے ہندوستان کے کونے کونے میں کام کیا ہے۔ اب مبلغ احرار کی حیثیت سے ہندوستان بھر کا دورہ کروں گا۔ یہ نوٹس میری تقریر کا عنوان ہو گا۔ میں مسلمانوں سے اپیل کروں گا کہ کسی مرزائی مبلغ کو کسی شہر میں کسی قسم کی تبلیغ کی اجازت نہ دیں۔ اگر حکومت کسی مسلمان کو قادیان میں آنے اور اسلام کی تبلیغ کرنے کی اجازت نہیں دیتی تو ان مرزائیوں کو ہندوستان میں تبلیغ کا کیا حق ہے۔ اس طرح کی باتیں کر کے میں مسجد سے چلا آیا۔ دوسرے دن شام کی گاڑی سے مجھے قادیان کو خیر باد کہنا تھا۔ میری روانگی سے قبل مجھے ایک اور نوٹس ملا۔ کہ میں قادیان سے باہر نہیں جا سکتا دیکھا حکومت کس مستعدی سے قادیان کے بارے میں قلم برداشتہ احکامات جاری کرتی تھی۔ مجھے دو سال قادیان میں رہ کر اہل قادیان اور "خداوند قادیان" کے مطالعے کا موقع ملا۔ کافی تجربہ کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا کہ امت مرزائیہ مسلمانوں سے براہ راست ٹکر لینے کے لئے کبھی آمادہ نہیں ہوتی۔ وہ اپنے مذہبی پیشوا خلیفہ قادیان کی سربراہی میں کسی قسم کا اقدام کرنے سے قبل ایسی صورت حال پیدا کر دیتی ہے کہ جوابی کارروائی کے لئے جب بھی مسلمانوں کا کوئی سا طبقہ میدان میں قدم رکھے تو ان کا مقابلہ مرزائیوں کی بجائے حکومت سے ہو۔ مرزائی بیچ میں سے صاف نکل جائیں۔ آٹھ میل کی پابندی کے نوٹس نے یہی صورت پیدا کر دی تھی۔ مرزائی بڑی خوبصورتی سے اپنا دامن صاف بچا کر نکل گئے تھے۔ احرار رہنماؤں نے اس صورت حال کا بغور مطالعہ کیا۔ خود میں نے بھی جب مجھ سے رہنماؤں نے پوچھا اسی رائے کا اظہار کیا کہ ہمیں بحالات موجودہ حکومت سے الجھنا نہیں چاہیئے۔ اس الجھاؤ میں مرزائیوں کو فائدہ پہنچ رہا ہے۔ حکومت ان کے زیادہ قریب ہوتی جا رہی ہے۔ قانون ان کی زیادہ دستگیری کر رہا ہے۔ بہر حال کچھ عرصے کے لئے خاموشی طاری ہو گئی۔ امت مرزائیہ بھی مست ہو کر بیٹھ گئی۔ حکومت نے بھی چین کا سانس لیا۔ میری طبیعت جب قادیان کے مختصر مگر روحانی کوفت کے میدان میں بور ہو جاتی تھی تو میں دو ایک روز کے لئے چودھری افضل حق سے ملنے لاہور چلا آتا یا حضرت شاہ جی کی زیارت کے لئے امرتسر ان کے دولت کدہ پر حاضر ہو جاتا تھا۔ اس طرح تسکین قلب حاصل کر کے تازہ دم ہو کر پھر قادیان پہنچ جاتا تھا۔ میری پابندی ختم ہو چکی تھی۔ آٹھ میل والی پابندی کے ختم ہونے میں ابھی دو چار دن باقی تھے۔ حکومت بار بار تازہ پابندی لگانے سے بدنام ہو چکی تھی۔ اب اسے پابندی لگانے میں تذبذب تھا۔ احرار نے بظاہر پابندی قبول کر لی تھی۔

حضرت امیر شریعت کا جذبہ اخلاص

میں ایک روز حضرت شاہ جی سے ملنے کے لئے قادیان سے امرتسر ان کے مکان پر پہنچا تو وہ بے تابانہ مجھ سے بغلگیر ہوئے۔ فرمانے لگے ہم نے تمہیں خطرناک محاذ پر بھیج رکھا ہے۔ ہم وہاں پہنچ بھی نہیں سکتے کیا کیا جائے۔ پھر فرمانے لگے یار کوئی تکڑم لڑاؤ مجھے کسی طرح قادیان لے چلو۔ میں نے ادب سے عرض کیا شاہ جی اپنے بس کی بات نہیں ہے۔ کچھ دن خاموش رہنا مناسب ہے۔ اللہ بہتر کرے گا۔ آپ کی دعائیں شامل حال ہیں۔ میں اپنے کو کبھی تنہا محسوس نہیں کرتا۔ اس طرح کافی دیر قادیان کے بارے میں گفتگو ہوتی رہی۔ قادیان سے جانب مشرق تقریباً دس میل کے فاصلے پر ایک ہفتہ بعد احرار کی یک روزہ کانفرنس میں حضرت شاہ جی کی تقریر ہونے والی تھی۔ مجھے شاہ جی نے فرمایا اس اجتماع کے موقع پر تم آؤ گے؟ میں نے حاضری کا وعدہ کیا اور واپس قادیان چلا آیا۔ آٹھ میل والی پابندی ختم ہوئی تو مرزائیوں نے پھر واویلا شروع کیا۔ ان کا پراپیگنڈہ یہ تھا کہ جس روز عطاء اللہ شاہ بخاری قادیان میں قدم رکھیں گے یہاں خوفناک فساد ہو گا۔ مگر حکومت نے اس پراپیگنڈے کا کوئی اثر نہ لیا۔ اب وہ نئی پابندی لگانے میں پس و پیش کر رہی تھی۔ یعنی پابندی کا معاملہ معلق تھا۔

یک روزہ احرار کانفرنس

اعلان کے مطابق قادیان کے نو دس میل جانب مشرق کسی بڑے گاؤں میں مسلمانان علاقہ کا بہت بڑا اجتماع ہوا۔ نماز عشاء کے بعد حضرت امیر شریعت نے ایمان افروز تقریر کی مجمع خاموشی سے دم سادھے ہمہ تن آغوش تھا۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے نور کی بارش ہو رہی ہو۔ حضرت شاہ جی جب لحن داؤدی میں آیات ربانی تلاوت کرتے تو سامعین پر وجد طاری ہو جاتا۔ تہجد کے وقت تک رشد و ہدایت کے دریا بہتے رہے۔ دعاء کے بعد اجلاس بخیر و خوبی برخاست ہوا۔ مجھے اسی کمرے میں سونے کے لئے جگہ مل گئی جہاں حضرت شاہ جی کو ٹھہرایا گیا تھا۔ فجر کی اذان سے تھوڑی دیر قبل میری آنکھ کھلی میں نے حضرت شاہ جی کو جگایا اور ان سے عرض کیا کہ ہمیں سورج طلوع ہونے سے قبل بٹالے پہنچ جانا چاہیئے۔ آپ ضروریات سے فارغ ہو کر وضو بنالیں۔ میں ڈرائیور کو جگاتا ہوں۔ اور اسے کہتا ہوں کہ بس کو سٹارٹ کرے۔ ہم نے صبح کی نماز پڑھی میں نے ڈرائیور سے سرگوشیوں میں پروگرام طے کر لیا۔ اگلی سیٹ پر میں اور حضرت شاہ جی بیٹھ گئے۔ پیچھے باقی کارکن بیٹھ گئے۔ بس چلی تو سبھی اونگھنے لگے۔ حضرت شاہ جی مجھ سے باتوں میں مشغول ہو گئے۔ پانچ چھے میل کے فاصلے پر موڑ آ گیا۔ ایک راستہ بٹالے کو اور دوسرا قادیان کو جاتا تھا۔ بس قادیان کی سڑک پر ڈال دی گئی۔ میرے اور ڈرائیور کے سوا کسی کو معلوم نہ تھا کہ بس کدھر جا رہی ہے۔ سورج کی شعائیں پھوٹیں تو ہر شے نظر آنے لگی۔ ریلوے لائن کو جب بس نے کراس کیا تو جھٹکا سا محسوس ہوا۔ اور اونگھنے والے بیدار ہوئے۔ چھڑی گھماتے ایک صاحب خراماں خراماں چلے جا رہے تھے۔ حضرت شاہ جی نے مجھ سے دریافت کیا کہ ہم کدھر جا رہے ہیں یہ کیسی آبادی ہے۔۔۔۔؟ میں نے عرض کیا یہ صاحب جو چہل قدمی فرما رہے ہیں ڈاکٹر محمد

اسماعیل ہیں۔ مرزا محمود کے ماموں جان۔ اور یہ سامنے دیکھئے منارۃ المسیح اور یہ ہے قادیان اتنے میں ہماری بس قادیان کی بستی میں داخل ہو چکی تھی۔ حضرت شاہ جی کی قادیان میں آمد کی خبر جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئی۔ مسلمان ہندو اور سکھ گھروں سے نکل آئے دوسری طرف مرزائیوں کے ہاں بھی کھلبلی مچ گئی۔ مسلمانوں کو یوں محسوس ہوا کہ جیسے انتیس کو عید کا چاند نمودار ہو گیا ہو۔ چہل پہل شروع ہو گئی۔ تھانیدار دوڑا دوڑا ہانپتا کانپتا میرے پاس آیا کہنے لگا کیا غضب کیا ہے۔ کسی کو کانوں کان خبر نہیں اور شاہ جی بلا اطلاع قادیان پہنچ گئے ہیں۔ ارے بھئی افسران بالا کو ہم کیا جواب دیں گے۔ بیچارہ بوکھلا گیا تھا۔ میں نے اسے تسلی دیتے ہوئے کہا۔ کوئی غضب نہیں ہوا بس اک ذرہ سا پروگرام ہے۔ منہ ہاتھ دھو کر حضرت شاہ جی چائے کی ایک پیالی پی لیں ابھی ایک آدھ گھنٹے میں تشریف لے جائیں گے۔ گھبراؤ نہیں تھانے میں جا کر آرام سے بیٹھو بے چارہ بے وقوف بن کر چلا گیا۔ ایک گھنٹہ بعد پھر آ گیا پوچھنے لگا شاہ جی جانے کے لئے تیار ہو گئے؟ میں نے کہا رات بھر کے جاگے ہوئے تھے۔ سو گئے ہیں۔ ایک گھنٹہ آرام کر لیں گھبرانے کی بات نہیں وہ زیادہ دیر ٹھہریں گے نہیں۔ چلے جائیں گے۔ تھانیدار غچہ کھا کر پھر واپس چلا گیا۔ مسلمانوں نے واقعی عید کی سی خوشی منائی۔ ایک بکرا ذبح ہوا۔ تنور گرم ہو گئے روٹیاں پکنے لگیں، عورتیں، بچے، بوڑھے اور جوان خوشی سے پھولے نہیں سماتے تھے۔ شاہ جی جب دس بجے کے قریب سو کر اٹھے تو تھانیدار صاحب پھر وارد ہوئے مجھ سے دریافت کیا تو میں نے تھانیدار کو بتا دیا کہ اب شاہ جی واپس تشریف لے جانے سے قبل غسل فرمائیں گے۔ تب جائیں گے۔ تھانیدار پھر واپس ہو گیا۔ ایک گھنٹے بعد کھانا تیار ہو گیا۔ تھانیدار آیا اور دیکھ کر چلا گیا اسے اطمینان ہو گیا کہ ایسے معزز مہمان کو کھانا کھلائے بغیر کون جانے دیتا ہے۔ کھانے سے فارغ ہوئے تو میں نے اپنے ایک رضا کار کو بلایا اسے کہا کہ ٹین کا کنستر بجا کر قادیان کے گلی کوچوں میں اعلان کر دو کہ ظہر کی نماز کے بعد حضرت امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاری مسجد شیخاں میں ختم نبوت کے موضوع پر تقریر کریں گے۔ اس اعلان سے قادیان میں ہڑبونگ مچ گئی۔ بھاگیو، دوڑیو، لیجیو، پکڑیو، پولیس الگ بھاگی پھرتی تھی۔ مرزائیوں کی سی آئی ڈی الگ پریشان ہو رہی تھی۔

قصرِ خلافت میں اہم میٹنگ

مجھے نہیں معلوم کہ مرزا محمود کے قصر خلافت میں کیا مشورہ ہوا۔ مگر جو کچھ میرے سامنے آیا میری آنکھوں نے جو نظارہ دیکھا اس سے جو نتیجہ اخذ ہو سکتا تھا وہ یہی تھا کہ حضرت شاہ جی کو تقریر کا موقعہ نہ دیا جائے۔

حضرت شاہ جی کی تاریخی تقریر

اعلان کے فوراً بعد پولیس گارد مسجد شیخاں کے موڑ پر پہرا جما کر کھڑی ہو گئی اسے خیال یہ تھا کہ حضرت شاہ جی بازار کے سیدھے راستے مسجد میں تشریف لائیں گے مگر میں کسی اور فکر میں تھا۔ چنانچہ میں نے حضرت شاہ جی سے عرض کیا کہ آپ میرے ساتھ آئیں میں آپ کو ایسے راستے سے لے چلوں گا کہ آپ کا جی خوش

ہو جائے گا۔ میں انہیں مرزائیوں کے خاص محلے میں سے گزار کر سیدھا قصر خلافت کی جانب لے گیا۔ مرزا محمود کے محل کے پاس سے ایک چھوٹی سی گلی سے نکل کر ہم مسجد شیخاں میں بخیریت پہنچ گئے۔ کس قدر خطرناک راستہ تھا مگر اللہ کا فضل شامل حال تھا۔ کسی شخص کو کوئی شرارت نہ سوجھی اور نہ کسی نے ہم سے تعرض کیا۔

حضرت شاہ جی منبر پر کھڑے ہوئے تقریر سے پہلے قرآن پاک کی تلاوت شروع کی۔ اتنے میں مرزائی رضا کار جن کے ہاتھوں میں لاٹھیاں تھیں مسجد میں داخل ہوئے قادیان کے ایک جیالے مسلمان نے مرزائیوں کے داخلے پر احتجاج کرنا چاہا مگر حضرت شاہ جی نے اسے ڈانٹ کر خاموش کر دیا اور فرمایا یہ نوجوان ہمارے مہمان ہیں اور یہ خانہ خدا ہے اس میں داخل ہونے پر کوئی پابندی نہیں ہے اس کے بعد مرزائی نوجوانوں کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا۔ آؤ میرے عزیزو آگے آ کر بیٹھو ہٹو بھئی ان کو جگہ دو وہ لوگ آگے آ کر بیٹھ گئے۔ حضرت شاہ جی نے

الیوم اکملت لکم دینکم واتممت علیکم نعمتی

کی آیت درد میں ڈوبی ہوئی آواز سے تلاوت کی اور اس کے بعد مسئلہ ختم نبوت پر مثبت انداز میں تقریر فرمائی۔ تقریر کیا تھی جادو تھا، سحر تھا، پھولوں کی بارش ہو رہی تھی۔ تقریر کا ہر لفظ دل کی گہرائیوں میں اتر رہا تھا۔ خدا جانے کیا ہوا حاضرین سانس بھی آہستہ لیتے تھے۔ شاہ جی نے اس مسئلے پر سیر حاصل تبصرہ فرمایا۔ دوران تقریر وہ دریافت بھی کرتے گئے کہ مسئلہ ٹھیک طرح سے سمجھ میں آگیا ہے۔ سب لوگ مع مرزائیوں کے اقرار کر رہے تھے۔ جھوم رہے تھے۔ فرط عقیدت سے بعض کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ تقریر کے بعد جب شاہ جی نے دعاء کے لئے ہاتھ اٹھائے تو مرزائی نوجوانوں نے ایک دوسرے کی جانب سوالیہ نگاہوں سے دیکھا مگر انہیں بھی ہاتھ اٹھا کر آمین کہنا پڑی۔ اپنے عقیدت مندوں کے مجمع میں تقریر کر کے واہ واہ کرا لینا کچھ مشکل کام نہیں مگر جو لوگ بدترین مخالف ہوں جو مخالفت کے ارادے سے آئے ہوں انہیں وجد میں لے آنا یہ وصف یہ ہمت اور حوصلہ خدا نے بخاری کو دے رکھا تھا۔ آہ وہ شیدائے رسول ﷺ وہ پیکر ایثار و محبت اب اس دنیا میں نہیں رہے۔

وہ کیا گئے کہ روٹھ گئے دن بہار کے

اس ایک واقعہ سے مرزائیوں کا یہ پراپگنڈہ کہ حضرت شاہ جی قادیان میں داخل ہوئے تو خون خرابہ ہو گا۔ ختم ہو گیا۔ حکومت کے پاس اس واقعہ کے بعد پابندی لگانے کا کوئی جواز نہ تھا کیونکہ حضرت شاہ جی نہ صرف یہ کہ قادیان میں داخل ہوئے بلکہ وہ مرزائیوں کے اپنے محلے میں گھوم پھر آئے۔ اور مجمع عام میں مسئلہ ختم نبوت پر دل کھول کر تقریر بھی کر ڈالی۔

این سعادت بزور بازو نیست
تا نہ بخشد، خدائے بخشندہ

جس زمیں پر ہو عطاء اللہ کا نقشِ قدم
ذرہ ذرہ اس زمیں کا آسماں پیدا کرے
کارفرما اس کی ہمت ہو تو قلبِ سوختہ
اپنی مشتِ خاک سے اپنا جہاں پیدا کرے
ابرِ رحمت بن کے برسے آرزو کی کشت پر
حسرتوں کی آگ دل میں وہ دھواں پیدا کرے

مولانا انعام اللہ خاں ناصر حسن پوری رحمہ اللہ

چرخِ احرار پر ہے تو درخشاں آفتاب
تیری تقریروں نے پیدا کر دیا ہے انقلاب
قوم کی خاطر تجھے منظور ہے تختۂ دار
ہند میں پیدا نہ ہو گا حشر تک تیرا جواب

راحت شریفی امرتسری رحمہ اللہ

شاہ جیؒ کی سیاسی زندگی کا آغاز
(اسباب و عوامل)

قائد احرار مولانا مظہر علی اظہر

جنگ عظیم کے دوران سیاسی جلسوں اور سرگرمیوں کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ لالہ لاجپت رائے کے مانڈلے میں نظر بند کئے جانے کے بعد ۱۹۰۷ء کے زمانے میں ہی سیاسی سرگرمیاں ختم ہو چکی تھیں۔ سردار اجیت سنگھ جیسے لوگ ملک سے باہر پناہ لے چکے تھے۔ حیدر رضا جیسوی جیسے معززین کی آواز کبھی سنائی نہ دیتی تھی۔

یکایک ۱۹۱۸ء میں ترکوں نے برطانوی اتحادیوں کے سامنے ہتھیار ڈال دیئے۔ جس سے اسلامیان ہند کے دلوں پر ایک ہیجان پیدا ہو گیا۔ اور یہ ہیجان اور زور پکڑ گیا جب برطانیہ نے لڑائی میں امداد لینے کے لئے مسلمانوں سے جو وعدے کئے تھے۔ ان کی خلاف ورزی علی الاعلان ہونے لگی۔ مسلمانوں سے برطانیہ کا صاف اور صریح وعدہ تھا کہ ترکی سے کوئی مذہبی لڑائی نہیں ہے۔ جنگ میں فتح پانے کے بعد برطانیہ اور اس کے اتحادی ترکی سے کوئی زیادتی نہیں کریں گے۔ اس کے ملک کا کوئی حصہ اس سے علیحدہ نہیں کریں گے بلکہ اس کے علاقوں کو جوں کا توں رہنے دیں گے۔ ادھر عربوں سے اندرونی وعدہ یہ تھا کہ لڑائی میں ترکی کے خلاف مدد کریں گے تو ترکوں کی شکست کے بعد عرب کی ایک علیحدہ ریاست بنا کر شریف مکہ کو اس کا بادشاہ بنائیں گے۔ اسی بناء پر شریف مکہ اور اس کے بیٹوں نے عربوں کے لشکروں سے برطانیہ کی امداد کی تھی۔ لیکن جب ترکوں نے ہتھیار ڈال دیئے تو برطانیہ نے عام مسلمانوں سے کئے گئے وعدہ کا کچھ خیال کیا اور نہ عربوں سے کئے گئے وعدوں کو اس بات کے قابل سمجھا۔ عرب کے مختلف ٹکڑے کر دیئے گئے (عراق، شام، فلسطین، اردن، حجاز)

عراق اور اردن میں شریف مکہ کے بیٹوں فیصل اور عبداللہ کو علی الترتیب بادشاہ بنا دیا گیا اور ان پر برطانیہ کا انتداب قائم ہوا۔ شام پر فرانس کا انتداب قائم ہوا۔ فلسطینی علاقوں میں بعد میں آکر آہستہ آہستہ وطن یہود بنانے کے لئے زمین خرید خرید کر یہودیوں کو آباد کیا جانے لگا۔ کیونکہ یہودیوں سے بھی وعدہ کیا جا چکا تھا کہ جنگ جیتنے کے بعد ان کے صلے میں یہودیوں کی علیحدہ ریاست بنائی جائے گی۔ یہ سلطنت ۱۹۴۸ء میں آخر کار بین الاقوامی سیاست کی جولاگاہ بن کر قائم ہوئی۔

لیکن مجھے ۱۹۱۸ء اور ۱۹۱۹ء کے زمانے کے حالات عرض کر کے ۱۹۲۰ء اور ۱۹۲۱ء تک پہنچنا ہے تاکہ میرے محترم رفیق سید عطاء اللہ شاہ بخاری کی سیاسی زندگی کا تذکرہ شروع کیا جاسکے۔

جشن فتح

۱۹۱۸ء میں ترکی کی شکست کے بعد کرسمس کے دنوں میں جشن فتح منانے کے لئے انگریزی حکومت کی

طرف سے اعلان ہوا۔ حکومت ہند نے جشن منانے کا فیصلہ کیا اور ہر شہر میں جشن منانے کا فیصلہ کیا گیا۔ مقصد یہ تھا کہ برطانیہ کی فتح سے جو دبدبہ قائم ہو چکا ہے۔ اس کو اور زیادہ لوگوں کے دلوں میں بٹھایا جائے۔ اور ان پر فاتحانہ ہیبت طاری کی جائے۔ چونکہ سرکار پرست طبقہ مسلمانوں اور ہندوؤں میں کافی صاحب اثر تھا اس لئے ان کے شمول سے عوام بھی جشن فتح میں شامل ہوں گے۔ اس طرح عوام اور خواص متاثر ہوں گے اور برطانیہ کی وعدہ خلافیوں کے باوجود اس کے خلاف کوئی آواز بلند نہ ہو سکے گی۔

مولانا محمد علی جوہر کی گرفتاری

ہندوستان میں مقتدر آوازیں ایسی تھیں جو ابتدائے جنگ میں ہی ترکوں کے حق میں اٹھ چکی تھیں۔ سب میں مقتدر آواز مولانا محمد علی جوہر کی تھی جنھوں نے اپنے انگریزی اخبار کامریڈ میں OF TURKY VOICE کے عنوان سے ایک مضمون لکھ کر ۱۹۱۴ء میں ہی کہا تھا کہ ترکوں کے لئے برطانیہ کا سابق رویہ جو ۱۳-۱۹۱۲ء کی جنگ بلقان اور ۱۴-۱۹۱۳ء کی جنگ طرابلس میں اختیار کیا گیا تھا۔ اس کے سوا اور کوئی راہ ہی نہیں چھوڑتا تھا کہ وہ جرمنی کے ساتھ مل کر قسمت آزمائی کرتے۔ مولانا محمد علی جوہر اور ان کے بڑے بھائی مولانا شوکت علی کو اس مضمون کی بناء پر نظر بند کر دیا گیا تھا۔ ۱۹۱۸ء میں اور ۱۹۱۹ء میں بھی نظر بند رہے۔

جشن فتح کا بائیکاٹ، علمائے دہلی کی اپیل

دسمبر ۱۹۱۸ء میں حکومت ہند کی منشاء کے خلاف آواز اٹھانا ایک کٹھن کام تھا۔ لیکن دہلی میں علماء نے آواز اٹھائی اور گو اس وقت تک کوئی جمعیت قائم نہ ہوئی تھی تاہم مختلف علماء کے نام سے اس اپیل کا شائع ہونا ہی ایک ہی دلبرانہ قدم تھا کہ مسلمانان ہند جشن میں شامل نہ ہوں کیونکہ ترکی فتح پر جشن منانا مسلمانوں کو زیبا نہیں ہے اس اپیل کا غیر متوقع اثر ہوا۔ اور جگہ جگہ مسلمانوں نے جلسے کر کے لوگوں کو علماء کے اعلان سے روشناس کرایا اور ان کو تاکید کرائی کہ وہ جشن فتح میں شریک نہ ہوں۔ یہ برطانیہ اور ان کے ساتھیوں کے لئے جشن کا دن ہے لیکن ترکوں کی شکست کے باعث مسلمانوں کے لئے رنج و غم کا دن ہے۔

مجھے تو دسمبر ۱۹۱۸ء میں ہی بٹالہ کی جامع مسجد کے جلسہ میں لوگوں کے سامنے ایک مقالہ پڑھ کر علماء کی تائید کا موقع ملا اور میری سیاسی زندگی کا آغاز ہوا۔ لیکن حضرت شاہ جی ان دنوں ابھی تعلیم دینیات میں مصروف تھے اور مذہبی اور اصلاحی تقاریر کی ابتداء کر چکے تھے۔ لیکن سیاست کی طرف متوجہ نہ تھے۔

رولٹ بل پر کانگریس کا احتجاج

ہندوؤں نے ۱۹۱۸ء میں کوئی خاص توجہ نہ دی۔ سوائے اس کے کہ جب مرکزی اسمبلی میں رولٹ بل پیش ہوا تو انہوں نے مخالفانہ تقریریں کیں۔ اس قانون کے تحت نظر بندی کے اختیارات بھی حاصل کئے جا رہے تھے۔ اور مقدمات چلاتے وقت ملزموں کو وکیل کرنے یا اپیل کرنے کی اجازت نہ تھی۔ اس لئے اس قانون کے خلاف نہ صرف منتخب نمائندوں نے ہی اعتراض کیا بلکہ نامزد ہندو نمائندوں نے بلکہ سر سنکری تاشیر جو گورنمنٹ آف انڈیا میں وائسرائے کی مجلس انتظامیہ کے ایک رکن تھے اپنے عہدے سے استعفیٰ

دے دیا۔ ان تقریروں کے اخبارات میں چھپنے سے ملک کے کونے کونے میں پراپیگنڈہ ہوا اور لوگوں میں حکومت کے خلاف جذبہ ابھرا۔

گاندھی جی افریقہ میں وہاں کی حکومت سے ٹکر لے کر ہندوستان واپس آگئے۔ وہاں امتیازی قوانین کے خلاف احتجاج کرتے ہوئے وہ خود جیل میں گئے اور وں کو بھی قانون کی پرامن مخالفت پر آمادہ کیا وہ جنوبی افریقہ کی کارکردگیوں کے باعث ہندوستان میں کافی شہرت حاصل کر چکے تھے۔ یہاں آکر انہوں نے رولٹ بل کے خلاف احتجاج کے طور پر ۶ اپریل ۱۹۱۹ء کو ہڑتال منانے کا اعلان کیا۔ آل کانگریس نے ان کی تائید کی جگہ جگہ کانگریس کمیٹیاں بنا کر ۶ اپریل ۱۹۱۹ء کو ہڑتال کر کے جلسے کرنے اور ان میں رولٹ بل کے خلاف احتجاج کرنے کا فیصلہ کیا گیا۔ قصہ مختصر ڈاکٹر سیف الدین کچلو اور ڈاکٹر ستیہ پال امرتسر میں سرگرم کارکن پیدا ہوئے۔ حکومت نے ان دونوں کو ۶ اپریل سے پہلے ہی گرفتار کرلیا۔ لوگوں میں ہیجان برپا ہوا۔ ہندو مسلمان اکٹھے ہو کر ڈپٹی کمشنر کی کوٹھی کی طرف چل کھڑے ہوئے۔ راستے میں پل تھا جس سے گزر کر کوٹھی کی طرف جانا تھا۔ یہاں پولیس نے راستہ روکا اور حسب ہدایت ان کو سول لائنز کی طرف جانے نہ دیا۔ لوگ اپنے ہر دلعزیز لیڈروں کی رہائی کا مطالبہ کرنے جا رہے تھے۔ مگر پل پر ہی گولی چل گئی۔ کئی لوگ مارے گئے۔ اور کئی زخمی ہوئے۔ لوگ لاشوں اور زخمیوں کو لے کر ہال بازار میں داخل ہوئے۔ جوش و خروش بڑھ چکا تھا۔ گرم جوش لوگ تشدد پر اتر آئے۔ سرکاری عمارتوں اور بنکوں وغیرہ کو جلانا شروع کر دیا۔ کوئی انگریز مل گیا تو اس پر بھی حملہ کیا۔ بعض قتل بھی ہوئے۔

امرتسر کی خبروں نے دوسری جگہوں پر بھی اثر کیا۔ قصور، لاہور، گوجرانوالہ اور لائلپور وغیرہ میں بھی تشدد ہوا۔ ان سب جگہوں پر مارشل لاء نافذ کر دیا گیا جس کے تحت بعد میں کئی جگہوں پر معزز کارکنوں پر مارشل لاء کی عدالتوں میں مقدمات چلائے گئے۔

واقعہ جلیانوالہ باغ

لیکن سب سے زیادہ اشتعال انگیز حادثہ جلیانوالہ باغ امرتسر میں ہوا۔ یہ باغ شہر کے درمیان میں واقع تھا۔ کوتوالی سے جنوب کی طرف کچھ فاصلہ پر اس کا آمد و رفت کا علاقہ نہیں تھا۔ اس باغ میں جلسے ہوا کرتے تھے۔ مارشل لاء ہو جانے کے باوجود ایک ہفتہ تک شہر میں حکومت اپنا نظام قائم نہ کر سکی۔ باغ میں ہر روز جلسے ہوتے تھے اور لوگوں کو صورت حال سے آگاہ کیا جاتا تھا۔ اور پرامن رہنے کو بھی کہا جاتا۔ کیونکہ کارکن حضرات تشدد کو درست نہیں سمجھتے تھے اور گاندھی جی نے پرامن رہنے کی ہدایت کی تھی۔ ۱۳ اپریل اتوار کے روز بیساکھی کے دن امرتسر میں خاص ہجوم تھا لوگ دیہات سے بھی بڑی تعداد میں آئے تھے۔ جلیانوالہ باغ میں جلسہ ہو رہا تھا۔ حاضری معمولاً بھی غیر معمولی ہوتی تھی۔ لیکن بیساکھی کے دن غیر معمولی ریکارڈ بھی مات ہو گیا۔ لیفٹیننٹ گورنر لارڈ اڈوائر کی ہدایت کے مطابق جنرل ڈائر فوج کا ایک دستہ لے کر شہر میں آیا۔ اس نے کوتوالی کی طرف بڑھ کر عام آمد و رفت کا راستہ روکا اور آگے بڑھ کر کوئی تنبیہہ کئے بغیر فوج کو گولی چلانے کا حکم دے دیا۔ جب تک گولیاں ختم نہ ہو گئیں فائر ہوتے رہے۔ ہزاروں زخمی اور سینکڑوں قتل ہوئے۔ بھاگ

دوڑ میں نکلنے کا کوئی راستہ نہ تھا۔ لوگ مکانوں اور دیواروں کو پھاند کر بھاگنے لگے۔ لیکن وہ سب سے زیادہ تختہ مشق ستم ہوئے ڈائر اور اس کے فوجی واپس چلے گئے اور لوگ بھی ہراساں ہو کر جدھر رخ ہوا بھاگ گئے۔

سید عطاء اللہ شاہ بخاری پر حادثہ کا ردّ عمل

اس قتل عام نے نہ صرف امرتسر کے شہر اور ضلع میں آگ لگا دی بلکہ قرب و جوار کے لوگوں میں بھی اپنے مرنے والوں اور زخمی ہونے والوں کی خبر سن کر غم و غصہ کی لہر دوڑ گئی۔ اخبارات میں جب اس قتل عام کی خبر پھیلی تو سارے ملک بلکہ ساری دنیا میں انگریزی تشدد کے خلاف گہرا جذبہ پیدا ہوا۔ نوجوان سید عطاء اللہ شاہ بخاری کی رہائش گاہ بھی کوتوالی اور جلیانوالہ باغ کے قریب ہی تھی۔ اس سانحہ جانکاہ سے طبعیت متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکتی تھی۔ ترکوں کی شکست کے بعد خود اپنے گھر میں انگریزی مظالم کی داستان ایک چشم دید واقعہ بن کر سامنے تھی۔ جوشیلی طبعیت، تڑپنے والا دل، تڑپانے والی زبان کب تک خاموشی اختیار کرتی۔ قسمت نے پہلے ہی کرسمس کے دنوں میں کانگریس کا سالانہ اجلاس امرتسر میں کرانے کا فیصلہ کر چھوڑا تھا۔ اب انگریزی حکومت کے سامنے یہ سوال تھا کہ آیا کانگریس کا اجلاس امرتسر میں ہونے دیا جائے یا نہ؟ اجلاس کا فیصلہ دسمبر ۱۹۱۸ء میں ہو چکا تھا۔ اس لئے اسے خود ساختہ فتنہ سے تعبیر نہ کیا جا سکتا تھا۔ ہندوستان کے چپہ چپہ میں جلیانوالہ باغ کے مظالم کی داستان پہنچ چکی تھی۔ دنیا کی رائے عامہ بھی برطانیہ کے خلاف تھی۔ اس لئے اس اجلاس کو روکا نہ جا سکا۔ اور وزیر ہند نے اعلان کر ہی دیا کہ کانگریس کا سالانہ اجلاس امرتسر میں ہونے دیا جائے گا۔ اور اسے روکا نہیں جائے گا۔

کانگریس، مسلم لیگ اور خلافت کمیٹی کا مشترکہ اجلاس

آخر دسمبر ۱۹۱۹ء میں کانگریس کے اجلاس میں شامل ہونے کے لئے لوگ راس کماری اور سالایہ تک کے علاقوں سے آئے مرد، عورتیں اور بچے خون کے نشانات دیکھتے پھرتے تھے۔ جو آٹھ ماہ گزرنے کے باوجود دیواروں پر مل جاتے تھے۔ اور انہیں جو سرخی مائل مٹی نظر آتی اسے اٹھا کر ساتھ لے جاتے تاکہ ظلم و ستم کی داستان کا یہ نشان ان کی اپنی یاترا کی یاد دلاتا رہے اور آنے والی نسلوں کو بھی گرماتا رہے۔

کانگریس کے ساتھ مسلم لیگ کا اجلاس بھی امرتسر میں ہوا۔ حکیم اجمل خان صدارت فرما رہے تھے۔ لیکن اس اجلاس کی رونق میں اس وقت گراں قدر اضافہ ہوا۔ جب یہ خبر آئی کہ چھندواڑہ جیل سے رہا ہو کر علی برادران امرتسر میں آ گئے ہیں اور وہ اجلاس میں شامل ہوں گے۔ دو گرانڈیل ہستیاں آئیں جن کے قد بلند و بالا سے مقابلہ کرنے والا کوئی سرو بھی نظر نہ آیا۔ غلغلہ ہائے تکبیر سے ایوان گونج اٹھا۔ تحفظ خلافت کی آوازیں بلند ہونے لگیں لیکن ابھی تک خلافت کمیٹی کی باقاعدہ تشکیل نہ ہوئی تھی۔ انہیں دنوں ہمارے شاہ جی بھی ان بڑے بڑے اجتماعات میں شامل ہو کر درس سیاست اور اپنے مستقبل کی بنیاد استوار کرنے لگے۔

ابھی کچھ زیادہ دن نہیں گزرے تھے کہ جمعیت العلمائے ہند اور کانگریس نے بھی اعلان کیا کہ قومی کام کی ترقی کے لئے سرکاری ملازموں کو اپنی ملازمتیں، وکیلوں کو وکالتیں طالب علموں کو مدرسے اور دیگر کاروبار

والوں کو اپنے کاروبار چھوڑ کر قومی تحریک کا کام کرنا چاہیئے۔

ہندوؤں نے آزادیٔ ہند کا نام اس لئے لیا کہ ہندوستان آزاد ہو۔ انگریزوں نے ان کو مسلمانوں کے خلاف اٹھا کر اپنے بعد دوسرے نمبر پر سیاسی اقتدار دے دیا تھا۔ اور ان کو ۱۸۵۷ء کی سیاسی رہنمائی اور جنگ آزادی کی سرکردگی کی سزا میں سب سے پیچھے دھکیل دیا تھا مگر یہ قدرت کا انتظام تھا کہ وہی ہندو اب سیاسی طور پر بالغ ہو کر انگریز سے آزادی کا خواہاں اور اس سے جنگ لڑنے پر آمادہ ہوا۔ مسلمانوں کے دل کی بات اپنائی۔ اس نے بھی تحفظ خلافت اور حکومت ترکی کی تائید و حمایت کو اپنا ورد زبان بنایا۔ دوسری طرف مسلمان تحفظ خلافت ترکیہ اور العرب کی آزادی کے لئے بے قرار تھا۔ لیکن اس کے لئے براہ راست کوئی راستہ نہ تھا کہ وہ یہ کام کر سکتا۔ داناؤں نے یہی راہ سوچی کہ جب تک ہندوستان آزاد نہ ہو جہاں سے انگریز کو سب سے زیادہ سامان جنگ اور فوج و رسد ملتا ہے تب تک ترک سلامت نہیں رہ سکتے ہیں اور نہ عرب اور نہ دیگر ممالک اسلامی اس لئے انہیں بھی خلافت اور حفاظت ممالک اسلامی کے ساتھ آزادیٔ ہند کو اپنا قریبی مسلک بنانا پڑا۔

تحریک ہجرت

لیکن ان دنوں ایک اور تحریک شمالی ہند میں نمایاں ہوئی۔ وہ تحریک ہجرت تھی۔ امیر امان اللہ خان والیٔ افغانستان نے مئی ۱۹۱۹ء میں مارشل لاء کے دنوں میں ہی سرحد ہندوستان پر حملہ کر دیا اور انگریزی حکومت نے زیادہ لڑنا مناسب نہ سمجھا تھا۔ بلکہ افغانستان کے ساتھ نرم شرائط پر صلح کر لی تاکہ ہندوستان کا اندرونی انتشار اور افغانستان کی بیرونی یلغار مل کر زیادہ مشکلات نہ پیدا کریں۔

عطاء اللہ شاہ بخاری اور تحریک ہجرت

کچھ علماء اور کارکنوں نے جن میں سید عطاء اللہ شاہ بخاری بھی شامل تھے تحریک ہجرت کی تائید کی۔ سرحد اور پنجاب میں اس تحریک کو بہت رسوخ حاصل ہوا۔ اس تحریک کے سلسلہ میں شاہ جی کی تقریر دلی دروازہ کے باغ لاہور میں ہوئی جس میں انہوں نے ہجرت پر تقریر کی۔ جوانی کا عالم تھا۔ زبان ہر حرف کو اس کے مخزن سے نکالتی تھی قرأت پر قاری وجد کرتے تھے ترجمہ کرتے تو عالم سر دھنتے تھے۔ اور تفسیر فرماتے تو عالم بھی جھوم اٹھتے تھے۔ ترکوں پر انگریزوں کے مظالم کا ذکر کیا۔ عرب کے حصے بخرے جلیانوالہ باغ قید و بند کی صعوبتیں پھر ہجرت کے متعلق آیات کی تلاوت

"بے شک وہ لوگ جن کا خاتمہ فرشتے اس حالت میں کرتے ہیں کہ وہ اپنی جانوں پر ستم توڑنے والے ہوں۔ تو ان سے کہیئے کہ تم کس حال میں تھے؟ تو وہ جواب دیتے ہیں کہ ہم اس زمین میں کمزور کر دیئے گئے تھے تو فرشتے دریافت کرتے ہیں کہ کیا اللہ کی زمین لمبی چوڑی نہ تھی کہ تم ہجرت کر جاتے۔ پس ان کا ٹھکانا جہنم ہے اور وہ بری بازگشت ہے۔ سوائے ان کے جو مردوں، عورتوں اور بچوں میں سے بے بس ہوں کہ وہ کوئی حیلہ نہ کر سکیں اور نہ کوئی راستہ پائیں۔ پس قریب ہے کہ خدا ایسے لوگوں سے درگزر کرے اور خدا بڑا

در گزر کرنے والا بخشنے والا ہے"

اور جب شاہ نے جی ایک طرف ہندوستان میں انگریزی حکومت کے ظلم و تشدد اور دوسری طرف ترکوں اور عربوں سے اس کی بے انصافیاں، وعدہ خلافیاں اور ستم آرائیاں اور تیسری طرف امان اللہ خاں کی اسلام دوستی اور مہاجرین کے لئے خوش آمدید اور ان کی آباد کاری کے لئے اراضی اور کاروبار مہیا کرنے کے اعلانوں کا ذکر اپنے مخصوص انداز میں کرتے ہوئے کہا۔

"اور جو شخص راہ خدا میں ہجرت کرے گا تو وہ زمین پر بڑی آسائش اور کشائش پائے گا۔ اور جو شخص خدا اور رسول کے لئے اپنے گھر سے ہجرت کر کے نکلے گا پھر اسے موت آئے گی تو یقیناً اس کا اجر خدا کے ذمے ہے اور اللہ بڑا بخشنے والا رحم کرنے والا ہے"

دنیا کے ان حالات اور اللہ کے ارشادات کو سن کر کتنوں کے دل نہ چاہیں گے کہ وہ ہندوستان کو چھوڑ کر امان اللہ کے دارالسلطنت کابل کی طرف ہجرت کریں۔ اور ایمان والوں نے ہجرت کی۔ لیکن ان کے ہمراہ سرکاری کارندے بھی کثیر تعداد میں تھے۔ انہوں نے کابل پہنچ کر مہاجرین کو امان اللہ خاں کے پروگرام پر نہ چلنے دیا بلکہ فوری جہاد کا پروگرام پیش کر کے حکومت انگریزی کی خدمت کی اور امان اللہ خاں اور مہاجرین کی حقیقی آرزوؤں کو پورا نہ ہونے دیا۔

انہی دنوں جب سرکاری ملازم ملازمتوں کو چھوڑ کر نکلے۔ وکیلوں نے وکالت چھوڑ دی۔ سرکاری مدرسوں میں پڑھنے والوں نے مدرسے چھوڑے اور اپنے مستقبل کو جواب دے کر تحریک آزادی میں شامل ہو کر مصائب جھیلنے پر آمادہ ہوئے تو دینیات کے مدرسوں میں پڑھنے والے جاری وساری تحریک سے کس طرح بے پرواہ ہو سکتے تھے۔ اور جب لوگ ہر طرح کا کام چھوڑ کر ہجرت کر رہے ہوں حتیٰ کہ بیویوں کو طلاقیں دے کر آزاد کر رہے ہوں تاکہ خود آزادی کی جنگ بالکل آزاد ہو کر لڑ سکیں۔ تو شاہ جی اپنی طالب علمی کے دور کو کس طرح جاری رکھ سکتے ہیں۔ یہی سبب تھا کہ مشکوٰۃ شریف کا سبق پڑھتے پڑھتے طالب علمی کو طلاق دینے کی نوبت آئی۔ ان کے نقص مرتب کرنے والوں نے بعض اوقات ان کے غیر مستند عالم ہونے پر نکتہ چینی کی ہے۔ لیکن جس نے مشکوٰۃ شریف کا سبق باقاعدہ بھی لے لیا ہو وہ ایسا کوئی ان پڑھ تو نہیں رہ سکتا کہ اس پر انگشت نمائی کی جاسکے۔ (۱) جنگ آزادی کے دور میں فرصت کا وقت جیل میں ہی ملتا تھا۔ یا ریل گاڑی میں۔ شاہ جی کے لئے جیل میں ہی وقت ہو سکتا تھا جہاں ان کے حجۃ اللہ البالغہ کا قصہ بیان کیا جاتا ہے۔ لیکن شاہ جی حدیث و تفسیر کا مطالعہ کرتے رہے اور ان کی بے قاعدہ تعلیم اور بزرگوں سے خلوت اور جلوت میں اور برسر اجلاس وعظ وارشاد سن کر جو کچھ حاصل کیا اس کا خلاصہ قاری محمد طیب صاحب نے ان الفاظ میں فرمایا ہے۔

"جہاں تک ان کے بیانات سے مجھے استفادہ کا موقع ملا ہے محسوس ہوتا ہے کہ قرآن ان کے سامنے کھلا

(۱) انہوں نے کسی مدرسہ سے سند حاصل نہیں کی مگر حضرت مفتی محمد حسن صاحب رحمہ اللہ سے بخاری شریف تک دینی تعلیم مکمل کی۔ ہندوستان میں ایسی کئی مثالیں اور بھی موجود ہیں۔ جبکہ ایسی مثالیں بھی ملتی ہیں کہ بڑے بڑے مدرسوں سے سندِ فراغت حاصل کرنے والے جہادِ آزادی میں حصہ لینا تو درکنار مسلمانوں کے خلاف انگریز کے آزیری مخبر بنے رہے۔ (کفیل)

ہے اور وہ اس کے بلیغ اور موجز جملوں کی مجسم شرح و تفسیر بنے ہوئے ہیں۔ نیز انکے الفاظ ہیں۔
"ان کی خطابت محض واعظانہ رنگ کی خطابت نہیں بلکہ ان میں عالمانہ انداز بھی شامل ہوتا ہے"

دعوتِ فکر

مرزائیوں کو میں دعوت فکر دیتاہوں وہ غور کریں اور اپنے مدعی نبوت اور اسکے خاندان کی فرنگی نوازی دیکھیں کہ یہ انگریز کا درباری نبی کس طرح ہندوستان میں انگریز افسروں کے دربار میں اپنی اور اپنے باپ دادا کی خدمات کے حوالے سے اس کا قرب حاصل کرنے کے لئے لجاجت منت و سماجت اور سراپا حاجت بن کر یقین دہانیاں کراتا ہے۔ ظالم تم نے اگر نبوت کا دعویٰ کر ہی لیا تھا اور تم اپنے تئیں نبی بن ہی بیٹھے تھے تو کم از کم اس نام و منصب کا وقار ہی قائم رکھا ہوتا اور فرنگی کی چوکھٹ پر جبہہ سائی نہ کرتے۔ اپنی جبین نیاز کو عدو اللہ فرنگی کی خاک نجس سے آلودہ نہ کرتے:

"اے روسیاہ تجھ سے تو یہ بھی نہ ہوسکا"

تجھ سے تو سابق کذاب و دجال مدعیان نبوت بہتر تھے جنہوں نے دعوائے نبوت کے بعد مسلمان بادشاہوں کے درباروں کی راہ تک نہ دیکھی۔ ان کا بھی ایک وقار تھا مگر تجھ سا بے حمیت تو خطۂ ارضی پر کوئی دوسرا نہیں

------ خطاب ------
بانی احرار! مؤسس تحریک تحفظ ختم نبوت
حضرت امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاری
احرار تبلیغ کانفرنس قادیان ۲، اکتوبر ۱۹۳۴ء

وہ اپنے وقت کا خود نوحہ خواں ہے

بخاری ہے زمین مولتاں ہے — الٰہی کیسا انساں اور کہاں ہے
یہ خستہ گھر، یہ گرمی اور یہ خلوت — گلے پر سانس کا آرا رواں ہے
کہے اب وقت کیا اس کا فسانہ — وہ اپنے وقت کا خود نوحہ خواں ہے
گزرتی جا رہی ہے مشکل زیست — یہ شائد آخری اک امتحاں ہے
کبھی تھا کارواں اس کا فدائی — اور اب تنہا یہ میر کارواں ہے
گلا بیٹھا ہوا آواز کیا دے — نہ جانے مرقد ماضی کہاں ہے
کہاں اب آگیا یارب زمانہ — کہ عنقا اعتمادِ دوستاں ہے
یہ عالم پیشوائے علم و دیں کا — لب اہل نظر پر الاماں ہے
کریں دنیا کو مجبور وفا کیا — کہ یہ دولت نصیب دشمناں ہے
مآلِ رہنمائی اللہ اللہ — نہ منزل ہے نہ گرد کارواں ہے
یہ دنیا اب ہے ظلمت کی پرستار — کسی کو کیا خبر سورج کہاں ہے
نہ الفت ہے نہ غیرت ہے نہ ایماں — مسلماں کب یہاں تھا اب جہاں ہے
خیال و خواب ہے حفظ روایات — نظر سے تا افق دل کا دھواں ہے

خداوندا عطا عزمِ ہمم کر!
گنہ گاروں پہ اتمامِ کرم کر!

احسان دانش مرحوم

مولانا محمد داؤد غزنویؒ

شاہ جی میدان سیاست میں

واعظ سے سیاسی لیڈر تک

۱۹۱۹ء کے مارشل لاء کے بعد میں نے امرتسر میں پبلک جلسوں کا انتظام کیا۔ جلیانوالہ باغ میں انگریز کے ظلم و تشدد کی وجہ سے تمام پنجاب اور امرتسر میں خوف و ہراس تھا۔ میں نے اس خوف و ہراس کو ختم کرنے اور اس کی جگہ عوام میں آزادی کی تحریک کو پھر سے زندہ کرنے اور برطانیہ کی اسلام دشمنی کو بے نقاب کرنے کے لئے مسئلہ خلافت کو سامنے رکھ کر شہر کے مختلف مقامات پر جلسوں کا انتظام کیا۔

اس وقت میری عمر قریباً ۲۵ سال تھی۔ حکومت کے تشدد سے بے نیاز ہو کر جب میں نے تقریریں شروع کیں تو عوام میں ہر وقت میری گرفتاری کا چرچا تھا۔ میں نے اللہ کے نام پر اپنے مشن کو جاری رکھا۔ جو قلبی سکون مجھے اس وقت حاصل تھا میں اسے بیان نہیں کر سکتا۔

سید عطاء اللہ شاہ بخاری اس وقت مدرسہ نعمانیہ مسجد خیرالدین (امرتسر) میں مشکوٰۃ شریف پڑھ رہے تھے۔ لیکن وہ اپنے خوش بیان ہونے کی وجہ سے بطور ایک واعظ امرتسر میں مشہور تھے۔

میری ایک تقریر چوک کٹڑہ سعید میں ہو رہی تھی۔ اس کے بعد ہر دوست کا خیال تھا کہ میں گرفتار کر لیا جاؤں گا۔ اور ساتھ ہی مجھے دوستوں نے نصیحت کرنی شروع کی کہ زمانہ بڑا نازک ہے۔ آپ اس قسم کی تقریریں نہ کریں۔ دوسرے دن اسی جگہ سید عطاء اللہ شاہ بخاری نے تقریر کی اور کہا

"کل اسی جگہ مولوی داؤد غزنوی جو آگ لگا گیا ہے۔ میں اس پر پانی ڈالنے آیا ہوں"

شاہ جی کی اس تقریر سے عوام میں غلط فہمی پیدا ہوئی۔ مجھے جب اس تقریر کا علم ہوا تو میں نے سمجھا کہ شاہ جی کو واقعات کا علم نہیں اور ان سے یہ تقریر کرائی گئی ہے۔ لٰہذا میں نے دوسرے دن شاہ جی کو اپنے مکان پر بلوایا۔ اور اخبارات کے تمام گزشتہ فائل ان کے سامنے رکھے اور ان سے عرض کیا کہ اس وقت عالم اسلام کے خلاف برطانیہ کیا سلوک کر رہا ہے۔ اور خاص کر ترکی میں جو کچھ ہو رہا ہے وہ عالم اسلام کے لئے تباہی کا باعث ہے۔

یہ حالات سن کر شاہ جی نے فرمایا کہ میں نہ تو اخبارات پڑھتا ہوں اور نہ میں نے سیاست میں کبھی حصہ لیا ہے۔ اس لئے مجھے حالات کا کوئی علم نہیں۔

میں نے عرض کیا اگر آپ تمام حالات معلوم کرنے کے بعد میرے ساتھ مل کر کام کریں تو اس وقت مسلمانوں اور عالم اسلام کی بہتر خدمت ہو سکتی ہے۔ شاہ جی نے فرمایا کہ "میں تو ایک طالب علم ہوں ان حالات میں کیسے تقریر کر سکتا ہوں"

میں نے کہا آپ دو تین مہینے میرے ساتھ جلسوں میں شرکت کریں۔

شاہ جی میں جذبات کی کمی نہ تھی۔ تقریر کی قابلیت ان میں قدرت نے ودیعت کر رکھی تھی۔ چنانچہ تھوڑے ہی عرصے میں شاہ جی خلافت کے موضوع اور حالات حاضرہ کے بہترین مقرر بن گئے۔ پھر تو ان کی تقریر کا یہ عالم ہو گیا کہ نہ صرف امرتسر بلکہ پنجاب سے باہر سارے ہندوستان میں وہ اپنی ایمان پرور تقریروں سے لوگوں کے جذبہ حریت اور ایمان کو گرماتے رہے۔

یہ ان کی خاندانی شرافت یا عالی نسبی سمجھیئے کہ اس مقام پر پہنچ کر بھی وہ مجھے اپنا بڑا بھائی اور استاد تسلیم کرتے رہے۔

تحریک خلافت ۱۹۲۱ء میں جب عوام کی گرفتاریاں شروع ہوئیں اور شاہ جی بھی اپنی ایک تقریر کی بناء پر جو انہوں نے مسجد خیر الدین امرتسر میں کی تھی گرفتار کر لئے گئے۔ اس مرتبہ انہیں تین برس تک کی سزا ہوئی۔ یہ شاہ جی کی پہلی گرفتاری اور سزایابی تھی۔

اس کے تھوڑے عرصے بعد سول نافرمانی کی عام تحریک شروع ہو گئی اور ہم سب گرفتار ہو کر جیلوں میں چلے گئے۔

میانوالی جیل میں

پنجاب کے تمام کارکن میانوالی جیل میں تھے۔ وہاں شروع میں تو سخت پابندی تھی۔ ہم ایک دوسرے سے مل بھی نہ سکتے تھے۔ امرتسر کے کچھ کارکن وہاں پہنچے تو ہماری ایک طاقت بن گئی۔ شروع میں ہم گیہوں کی روٹی کھاتے تھے لیکن ہم نے یہ روٹی ترک کر دی اور مطالبہ کیا کہ ہم سب کو ایک ساتھ رکھا جائے۔ چھ دن بعد ہماری بات مان لی گئی اور ہم نے بھوک ہڑتال ترک کر دی۔ اس کے بعد ہمارا دوسرا مطالبہ یہ تھا کہ سیاسی اور اخلاقی قیدیوں کے لنگر الگ الگ ہوں اور اس کا تمام نظام ہمارے ہاتھ ہو۔ ہمارا یہ مطالبہ بغیر بھوک ہڑتال کے مان لیا گیا اور سیاسی قیدیوں کے لنگر کا انتظام ہمارے سپرد کر دیا گیا۔ مجھے لنگر کا مینجر مقرر کیا گیا۔ اس بناء پر مجھے تمام جیل میں آنے جانے کی آزادی مل گئی۔ اس کے بعد آہستہ آہستہ پابندیاں کم ہوتی چلی گئیں اور ہم سب ایک دوسرے سے ملنے جلنے لگے۔

ہنگاموں کے ختم ہونے کے بعد شاہ جی نے یہ خواہش ظاہر کی کہ مجھے شاہ ولی اللہ صاحب کی حجتہ اللہ البالغہ پڑھائیے۔ میں نے شاہ جی سے عرض کی کہ جیل کی ہنگامہ خیز زندگی کی بناء پر سال بھر سے میرا ذہن بالکل تھکا ہوا ہے۔ پھر جانے یہ موقعہ کب میسر آئے۔ بہتر ہے کہ ہم آرام کریں۔ مگر ان کا اصرار شدت اختیار کرتا چلا گیا۔ آخر وہ میرے انکار پر غالب آئے۔ اور میں نے کتاب کا سبق شروع کرایا۔ مگر دو ماہ نہ گزرنے پائے تھے کہ ہماری جمعیت کو منتشر کرنے کے لئے ہمیں مختلف جیلوں میں تبدیل کر دیا گیا۔ چنانچہ مجھے روہتک جیل بھیجا گیا۔

اس کے بعد میں نے شاہ جی سے کہا کہ مولانا احمد سعید مرحوم سے اپنا سبق جاری رکھیں۔ لیکن میانوالی جیل میں جہاں مولانا احمد سعید، مولانا عبدالمجید سالک، صوفی ذکاء اللہ ایسے بامذاق لوگوں کا اجتماع ہو وہاں درس

وتدریس کا سلسلہ کیسے قائم رہ سکتا ہے۔

حجاز میں انقلاب

تحریکِ خلافت کے قیدیوں کے رہا ہونے کے بعد حجاز میں ایک انقلاب آیا، "شریف حسین" وہاں سے بھاگ گئے اور سرزمین حجاز ابن سعود کے قبضہ میں آگئی۔

غط غط قبیلے کے معززین جن کا حجاز میں بہت بڑا دخل تھا انقلاب کا باعث ہوئے تھے۔ قبے گرانے کا یہ الزام غط غط کے سرداروں نے انگریز کے اکسانے پر شاہ سعود کے فوجیوں پر عائد کیا۔ حالانکہ یہ حقیقت نہیں تھی۔ چنانچہ جیسے ہی قبے گرنے اور قبریں مسمار کرنے کی اطلاع پاک و ہند میں پہنچی لوگ بیقرار ہو گئے اور انہوں نے ابن سعود کے خلاف الزام لگایا کہ قبے ابن سعود کی حکومت نے گرائے تھے۔ (۱)

خلافت کمیٹی جس میں سنی اور اہل حدیث شامل تھے۔ مل کر ان حالات کا مقابلہ کیا۔ بالخصوص شاہ جی نے ان دنوں میں جس جوانمردی کے ساتھ مخالفین اور حکومت کا مقابلہ کیا۔ یہ ان کی خداداد ہمت کا ایک نمایاں کارنامہ ہے۔ اس کے علاوہ وہ آج تک بڑی ہمت سے اور ایمانی قوت سے ملک کے اندرونی اور بیرونی دشمنوں کا مقابلہ کرتے چلے آئے تھے۔

شاہ جی کی شخصیت نہایت جاذب اور ان کا مبلغ علم' ان کی سحربیانیاں' ان کا اخلاق واقعی قابل ستائش تھے۔

اُن کے مکتب فکر کا نعم البدل اب خارج از بحث ہے ان کی تمام زندگی مسلسل قربانیوں اور قومی جدوجہد کا پیکر تھی۔ کشمیر کے لئے بالخصوص انہوں نے جو کچھ کیا، کوئی کشمیری اُسے فراموش نہیں کر سکتا۔

قائد کشمیر **چودھری غلام عباس**

امیر شریعت نے برطانوی سامراج کے خلاف جہاد کیا اور ملک کو آزاد کرالیا۔

خان عبدالولی خان

ان کی سیاسی بصیرت کے علاوہ ان کی دینی' ادبی اور علمی بصیرت کی مثال دنیا کے کسی انسان میں نہیں ملتی۔

مظہر علی اظہر

وہ فن خطابت کے امام تھے۔ ان کی وفات سے گل ہونے والے اس محفل کے چراغ ہمیشہ روشنی کو ترسیں گے۔

شیخ حسام الدین

۱۔ مولانا کی ذاتی رائے ہے۔ ورنہ قبے گرانے کی تحریک کو حکومت کی مکمل حمایت حاصل تھی۔

امیر شریعت ۔۔۔۔۔ ایک ہمہ گیر شخصیت

نوابزادہ نصر اللہ خان

امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاری ہمہ گیر اور پہلو دار شخصیت کے مالک تھے۔ وہ بیک وقت عالم دین، شعلہ بیان خطیب اور برعظیم میں جدوجہد آزادی کے صف اول کے رہنما تھے۔ انہوں نے تحریک آزادی کے ساتھ ساتھ بالعموم پورے ہندوستان بالخصوص پنجاب، سندھ اور سابق ریاست بہاولپور کے علاقوں میں مسلمانوں میں فرسودہ رسوم و رواج اور توہم پرستی کے خلاف مسلسل جدوجہد کی۔ ان علاقوں میں اس جاگیردار طبقہ کی بڑی شدت سے مخالفت کی جس نے برطانوی سامراج کے پاؤں مضبوط کئے۔ اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ پنجاب، سندھ، صوبہ سرحد میں برطانوی حکمرانوں کے خلاف رائے عامہ کو بیدار کرنے اور اس سے ٹکرانے کا جذبہ پیدا کرنے میں امیر شریعت کا بہت بڑا حصہ ہے۔ اسی طرح شاہ جی نے مسئلہ ختم نبوت کی اہمیت اور نزاکت سے ملت اسلامیہ اور خاص طور پر جدید تعلیم یافتہ طبقہ کو روشناس کرایا۔ اس خاص فرقہ کے ان مذموم مقاصد کو بے نقاب کیا جن کے حصول کے لئے اس فرقہ کو وجود میں لایا گیا تھا۔ شاہ جی نے مسئلہ ختم نبوت کے لئے جو کام کیا یہ اسی کا نتیجہ ہے کہ اب ہر مسلمان اس مسئلہ کی اہمیت سے پوری طرح آگاہ ہو چکا ہے۔ یہ بڑے افسوس کی بات ہے کہ ہندوستان کی آزادی کے لئے مسلمانوں نے جو جدوجہد کی اور جو عظیم قربانیاں دیں ان کو بوجوہ فراموش کیا گیا۔ یا ایک طبقہ نے ان کی اہمیت کو نظر انداز کرنے کی کوشش کی لیکن مستقبل کا مؤرخ جب بھی تحریک آزادی پر قلم اٹھائے گا تو ان مسلم زعماء اور مسلمان قوم کی قربانیوں کو یقیناً اجاگر کرے گا۔ اور ان کی بے لوث خدمات کو خراج تحسین ادا کئے بغیر نہیں رہ سکے گا۔ کیونکہ اس کے بغیر برعظیم کی تحریکات آزادی کا تذکرہ ادھورا اور نامکمل رہے گا۔ شاہ جی اور ان کے رفقاء نے برطانوی سامراج کو ملک سے باہر نکالنے میں جو کردار ادا کیا وہ تاریخی حیثیت کا حامل ہے۔ مولانا ابوالکلام آزاد، مفتی کفایت اللہ، مولانا احمد سعید دہلوی، مولانا محمد علی جوہر، سید عطاء اللہ شاہ بخاری اور دوسرے اکابر برق بن کر برطانوی حکمرانوں کے نشیمنوں پر گرے انہوں نے سامراج اور ان کے کاسہ لیس مسلمان جاگیرداروں اور سرمایہ پرستی کے خلاف رائے عامہ کو بیدار اور منظم کیا۔ یہ اسی تحریک کا نتیجہ تھا کہ جلیانوالہ باغ اور قصہ خوانی بازار میں مسلمانوں نے ہندوؤں اور سکھوں سے کہیں زیادہ قربانیاں دیں۔ جام شہادت نوش کیا اور تحریک آزادی کو بال و پر فراہم کئے۔ اسے آگے بڑھایا اس بارے میں دو رائے نہیں ہو سکتی ہیں کہ اسلامیان پاک وہند میں جذبہ حریت پیدا کرنے میں سب سے نمایاں کردار علماء نے انجام دیا۔ بیسویں صدی کے شروع میں آزادی کی تحریکات میں مولانا محمود حسن، مولانا ابوالکلام آزاد اور ان کے رفقاء اور ان کے بعد حکیم اجمل خان، ڈاکٹر انصاری، مولانا ظفر علی خان اور دوسرے زعماء نے ملت اسلامیہ کی نشاۃ ثانیہ اور ان کے کردار کی تعمیر و تشکیل میں بیش از بیش حصہ لیا۔

امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاری سب سے بڑے خطیب اور مسلمانوں کے ایک بڑے طبقہ میں بے حد مقبول اور ہر دلعزیز مسلمان رہنما تھے۔ لیکن ان میں غرور اور تفاخر کا کوئی جذبہ نہیں تھا۔ ان کی زندگی انتہائی سادہ اور درویشانہ تھی وہ اپنے کارکنوں سے بے حد محبت و شفقت کرتے تھے۔ انہوں نے اپنے رفقاء کو بلا تمیز امیر و غریب قومی زندگی میں نمایاں کرنے اور آگے لانے کی ہمیشہ سعی کی۔ اور ان کی ہر ممکن حوصلہ افزائی کی۔ یہی وجہ تھی کہ مجلس احرار اسلام نے سینکڑوں مقرر اور ہزاروں بے لوث، بے غرض اور جری کارکن پیدا کئے جس کا منطقی نتیجہ یہ نکلا کہ تقسیم ملک سے قبل نئی قیادت کا اتنا فقدان محسوس نہیں کیا گیا جتنا کہ اب محسوس ہوتا ہے۔ اگر قیام پاکستان کے بعد برسر اقتدار جماعتیں اپنے مخالفین کو سب و شتم کا نشانہ نہ بناتیں اور سیاست کے میدان میں قدم رکھنے والوں سے بد تر سلوک نہ کرتیں تو آج صورت حال بہت مختلف ہوتی۔ اور نئی قیادت کے ابھرنے کے دروازے یوں بند نہ ہوتے۔

سید عطاء اللہ شاہ بخاری برسر اقتدار طبقہ کے رعب و دبدبہ اور سرمایہ دارانہ اثر سے ہمیشہ بے نیاز رہے انہوں نے مدت العمر کسی انگریز حکمران سے ملنے یا اس کا قرب حاصل کرنے کی ذرہ بھر کوشش نہ کی۔ ان سے ملنے والے ان کے ایثار، استغنا اور بے لوثی کی شہادت دے سکتے ہیں۔

خلافت عثمانیہ جو اس وقت ایک حد تک اسلامیان عالم کا مرکز عقیدت تھی کے خلاف انگریز نے سازشیں شروع کیں۔ اس کے نتیجہ میں جنگ بلقان، جنگ طرابلس اور پہلی جنگ عظیم میں کرنل لارنس نے عرب شیوخ کو ترکوں کے خلاف اپنے استعماری مفاد کے لئے استعمال کیا۔ اور ہندوستان میں بھی اس نے ساڑھے نو سو سالہ مسلمان سلطنت کے باقی ماندہ آثار کو جس طرح ختم کیا شاہ جی اس سے بے حد دل آزردہ تھے۔ انگریز کے ان اسلام دشمن اقدامات نے شاہ جی کے دل میں زبردست آگ لگا دی تھی۔ ان کی انگریز سے نفرت کا یہ عالم تھا کہ وہ ان کا وجود تو ایک طرف رہا نام تک برداشت نہیں کر سکتے تھے۔ یہ وہ دور تھا جب ریاستوں کے مسلمان حکمران اور بالخصوص پنجاب میں مسلمان وزراء اور رؤساء انگریزوں کا فرزند دل بند کہلوانا اپنے لئے فخر و سعادت کا باعث سمجھتے تھے۔ ایسے ماحول میں مسلم عوام کو انگریزوں اور کاسہ لیس رؤساء کے اثرات سے آزاد کر کے انہیں حریت کے راستے پر گامزن کرنے میں شاہ جی کا بہت بڑا حصہ ہے۔

شاہ جی نے انگریز کے خلاف اسوقت علم بغاوت بلند کیا جب پنجاب میں جاگیر دار اور انگریز کے ٹوڈی حاکم تھے، سر سکندر حیات پنجاب کا وزیر اعظم تھا پنجاب میں اس کی مرضی کے بغیر کتا بھی حرکت نہیں کر سکتا تھا مگر شاہ جی کی مؤمنانہ للکار نے سکندر حیات کے اقتدار کو ہلا کر رکھ دیا۔

انہوں نے پنجاب کے غریب عوام کے ذہنوں میں انگریز سامراج کے خلاف بغاوت کوٹ کوٹ کر بھر دی۔

مجھے اپنے ماضی پر فخر ہے، میں سر بلند کر کے کہہ سکتا ہوں کہ مجھے ان باکردار، جرأت مند اور مخلص اکابر کی معیت میں جہادِ آزادی میں حصہ لینے کی سعادت نصیب ہوئی ہے۔

شاہ جی کی جماعت مجلس احرار اسلام ہندوستان کے غریب اور متوسط طبقہ کے کارکنوں پر مشتمل تھی۔

اس کی روز افزوں ترقی سے انگریز اور اُس کے ٹوڈی خائف تھے عوام میں احرار کی جڑیں بہت مضبوط ہو گئیں تھی چنانچہ ایک سازش کے تحت ۱۹۳۵ء میں مسجد شہید گنج کا مسئلہ کھڑا کیا گیا اور اس تحریک کا تمام ملبہ مجلس احرار پر گرادیا گیا۔ یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ اگر احرار پر شہید گھنج کا ملبہ نہ گرایا جاتا تو پنجاب کی سب سے زیادہ مقبول ترین عوامی سیاسی جماعت مجلس احرار اسلام انتخابات میں بھاری اکثریت کے ساتھ کامیاب ہوتی۔ مگر سر فضل حسین اور دوسرے ٹوڈیوں نے سازش کر کے احرار کو شکست دلوائی ورنہ احرار کی کامیابی کی صورت میں پنجاب میں پہلی مرتبہ متوسط اور غریب طبقہ کی حکومت قائم ہو جاتی اور یہاں جاگیرداروں سے ہمیشہ کیلئے نجات مل جاتی۔۔۔۔ مگر اس سب کچھ کے باوجود شاہ جی نے انگریز اور اُس کے ٹوڈیوں کے خلاف جہاد جاری رکھا۔

اس سلسلہ میں شاہ جی کو بارہا جیل جانا پڑا۔ سالہا سال تک قید و بند کی صعوبتیں برداشت کرنا پڑیں۔ مگر ان کے پائے استقلال میں لحظہ بھر کے لئے بھی لغزش نہ آنے پائی۔ بلکہ جب بھی وہ جیل سے رہا ہوتے تو زیادہ شدت سے انگریز کی مخالفت کرنے لگتے۔ یہ بھی واقعہ ہے کہ شاہ جی نے پہلی مرتبہ قومی سیاست میں متوسط اور نچلے طبقہ کو مسلمانوں کی قیادت سے بہرہ ور کیا اس قیادت نے ایثار اور بے لوثی کی جو مثالیں قائم کیں وہ آج بھی ہماری مختلف تنظیموں کے لئے مشعل راہ کا کام دے سکتی ہیں۔ پاکستان بن جانے کے بعد جب شاہ جی نے پاکستان میں سکونت پذیر ہونے کا فیصلہ کیا تو وہ اپنے بچوں سمیت انتہائی بے سرو سامانی کے عالم میں یہاں پہنچے۔ لیکن انہوں نے اپنی جائیداد کے عوض نہ کسی جائیداد کی خواہش کی اور نہ ہی ان کے فقر و استغنا نے جائیداد کا کلیم داخل کرنا گوارا کیا۔ انہیں امر تسر میں واقع اپنی جائیداد کے ضائع ہونے کا کوئی غم نہ تھا البتہ اس بات کا انہیں ہمیشہ صدمہ رہا کہ امر تسر میں فسادات کے دوران ان کی لائبریری ضائع ہو گئی۔ وہ اکثر اپنی کتب کو یاد کیا کرتے کیونکہ اہل علم کا حقیقی سرمایہ کتب ہی ہوا کرتی ہیں۔

وہ علم و ادب، فکر و دانش، سیاست و تدبر کی محفلوں کا چراغ تھے ۔ **ماسٹر تاج الدین انصاریؒ**

وہ اپنی ذات میں ایک انجمن تھے **قاضی احسان احمد شجاعبادیؒ**

ایک فقیر جس کے دل میں خوف خدا اور عشق رسول کے سوا کچھ نہ تھا **حافظ علی بہادرؒ**

جس سے جگر لالہ میں ٹھنڈک، ہو وہ شبنم، **مولانا عبدالرحمٰن میانویؒ**

ان کا چلن زندگی کے سفر میں چراغِ راہ کی حیثیت رکھتا ہے **محمود علی قصوریؒ**

داعیوں کا کردار

جن لوگوں نے قرن اول سے لے کر اب تک اسلام قبول کیا ہے وہ محض گفتار سے متاثر نہ ہوئے تھے۔ انہیں داعیوں کے کردار نے متاثر کیا اور وہ مسلمان ہوگئے۔
اچھی تعلیم تو ہر مذہب میں مل جاتی ہے اصل مسئلہ اس تعلیم کی اساس اور تربیت پر انسانی معاشرے کا قیام ہے اسلام نے اونچ نیچ ختم کی، غریبوں کو سرداری بخشی، ہزاروں خداؤں سے نجات دلا کر صرف ایک خدا کا بندہ بنایا اور خدا بھی ان دیکھا کہ ہماری آنکھیں اس کو دیکھ ہی نہیں سکتیں۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ساری خدائی میں اسلام پھیلنے لگا یہ گڈریوں کی جہاں بانی کا اعجاز تھا کہ نصف کائنات مسلمانوں کے زیر نگیں ہوگئی۔
لیکن اب مسلمانوں کا یہ حال ہے کہ وہ سیاسی مسلمان ہوگئے ہیں۔ سیاست دانوں نے تبلیغ اسلام کی رفتار روک دی ہے۔ اب کوئی مسلمان ہوتا ہے تو اسے معاشی ضرورت کھینچ لاتی ہے یا پھر عشق و نفس کی مہربانی ہوتی ہے۔
وہ نوجوان جو جدید تعلیم سے آراستہ ہیں اگر دین کی طرف آجائیں تو تبلیغ دین زیادہ مؤثر اور نتیجہ خیز ہوسکتی ہے۔ ہم مولویوں نے دین کو محفوظ رکھا۔ کیا یہی کم ہے؟
نوجوانو!
یہ فریضہ اب تم سنبھالو اور اسلام کے پیغام کو دنیا کے کونے کونے تک پہنچاؤ کہ تم بھی تو اس جدوجہد کے امین ہو۔

بانیٔ احرار امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ

تیری صورت سے مردانِ خدا کی یاد تازہ ہے

برطانوی سیاست وثقافت کے خلاف ہم سب مسلمانوں کو جھنجھوڑ کر بیدار کرنے والے بے مثال خطیب اور مجاہد سید عطاء اللہ شاہ بخاری کی آواز ہر آن میرے ایمان میں شامل ہے

پرانے لشکرِ اسلام کے بچھڑے ہوئے غازی
تِرے دم سے ہے قائم سرفروشی اور سر بازی
تری صورت سے مردانِ خدا کی یاد تازہ ہے
غلامانِ محمد مصطفیٰ کی یاد تازہ ہے
تری سیرت سے عابد اور زاہد یاد آتے ہیں
بصیرت سے مدبر اور مجاہد یاد آتے ہیں
وہ شعلہ جس سے داغِ عشق کی گرمی ہویدا ہے
تری صورت سے ظاہر ہے تری سیرت سے پیدا ہے
صداقت ڈھونڈتا ہوں جب فدا کاری کی راہوں میں
تری تصویر پھرتی ہے تصور کی نگاہوں میں
مرے دل میں یہ شمعِ قوم کا پروانہ زندہ ہے
حسین ابن علی کا اسوۂ مردانہ زندہ ہے

حفیظ جالندھری ——— (چراغِ سحر صفحہ ۱۹۲)

عزیز ہندی امرتسری مرحوم

ترتیب و تلخیص
سید محمد کفیل بخاری

تحریک ہجرت اور شاہ جی

عزیز ہندی امرتسری تحریک خلافت میں ابھر کر سامنے آئے۔ ان کا اصل نام "غلام محمد" تھا مگر عزیز ہندی کے نام سے معروف ہوئے۔ وہ تحریک ہجرت کے زبردست داعی و نقیب تھے۔ آزادی کی مختلف تحریکوں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ قید و بند کی تمام صعوبتیں بخوشی قبول کیں۔ حتیٰ کہ زندگی کے تیس سال جیلوں میں گزار دیئے۔ ہندوستان سے ہجرت کر کے افغانستان گئے تو وہاں بھی قید کر دیئے گئے۔ آخری سترہ سال افغانستان کی جیل میں گزارے۔ قیام پاکستان کے کافی عرصہ بعد غالباً لاہور میں ان کا انتقال ہوا۔ وہ تحریک آزادی کے سبھی مجاہدوں سے محبت رکھتے تھے مگر حضرت امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاری رحمہ اللہ سے انہیں والہانہ محبت تھی اور اپنے دل میں ان کے لئے بڑا احترام رکھتے تھے۔ میری والدہ محترمہ کی روایت ہے کہ تقسیم سے قبل امرتسر میں حضرت امیر شریعت کے ذاتی کتب خانہ میں عزیز ہندی مرحوم کی کتاب "زوال غازی امان اللہ" موجود تھی جس کے سرنامہ پر یہ عبارت تحریر تھی۔

"وہ جو مجھے خادمان ملی کی صف میں سب سے پیارا اور باوصف دکھائی دیتا ہے۔ اس کی خدمت میں اپنی یاد کے طور پر تقدیم کرتا ہوں"۔۔۔ عزیز ہندی
زیر نظر مضمون، ان کی کتاب "تحریک ہجرت" کے مختلف حصوں سے اخذ کیا گیا ہے (مرتب)

دسمبر ۱۹۱۹ء میں (امرتسر میں) منعقد ہونے والے مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس میں صدر حکیم محمد اجمل خان قرار پائے تھے۔

علامہ ڈاکٹر محمد اقبال کو ان دنوں تازہ تازہ انگریزی حکومت کی طرف سے (سر) کا خطاب ملا تھا۔ لوگ ان سے اس بناء پر ناراض تھے کہ کیوں انہوں نے انگریزی خطاب کو قبول کیا ہے۔ مسلمانوں نے ان سے کہا کہ ہم ان کے شعر ہرگز نہیں سنیں گے۔ وہ انگریزی سامراج کے پٹھو بن چکے ہیں، لیکن مولانا شوکت علی اور مولانا محمد علی کے کہنے سے جو صدر مسلم لیگ کے دائیں بائیں بڑی شوکت و شان سے کرسیوں پر بیٹھے ہوئے تھے، سامعین ان کے اشعار سننے پر رضامند ہو گئے۔

یہی حال مولانا ظفر علی خاں کا بھی تھا۔ انہوں نے بھی اپنی طویل نظر بندی کے دوران حالات سے تنگ

آ کر "ستارۂ صبح" کے نام سے اخبار نکالنے کی معذرت کے ساتھ انگریزی حکومت سے اجازت طلب کی تھی جو دے دی گئی تھی۔ اسی بناء پر مسلمان ان سے بھی بپھرے ہوئے تھے۔ انہیں اس جلسہ گاہ میں کوئی پوچھتا تک نہ تھا اور گو وہ نظر بندی سے رہا ہو کر آئے تھے، لیکن ان کی زبان بندی اب تک قائم تھی عین رات کے کھلے اجلاس میں جب ان کی زبان بندی کے ختم ہونے کا حکم بذریعہ ٹیلیگرام موصول ہوا، تو ان کے ہوا خواہوں نے کہہ سن کر جلسے میں انہیں تقریر کرنے کی اجازت دلوا دی، لیکن وہ اپنا رنگ جمانے میں بالکل ناکام رہے، کیونکہ ان سے پہلے سید عطاء اللہ شاہ بخاری جو سیاست کے میدان میں تازہ وارد ہوئے تھے، اپنی فصاحت و بلاغت اور اپنی پر جوش تقریر کی بناء پر پورے جلسے پر چھا چکے تھے۔ انہوں نے اس جلسے میں "فیقتلون و یقتلون" کی تفسیر کرتے ہوئے کھلے بندوں مسلمانوں کو جہاد کرنے کی تلقین کی تھی۔

تحریک ہجرت کا آغاز ۱۹۲۰ء میں اپریل کے مہینے میں دہلی شہر کے اندر ہوا۔ مولانا حسرت موہانی نے یہاں "خدام خلافت کانفرنس" منعقد کی تھی، جس میں غیر منقسم ہندوستان کے تقریباً تمام صوبوں کے مسلمان نمائندے شریک ہوئے تھے۔ میں بھی انہیں نمائندوں میں سے ایک تھا، جو مولانا سید عطاء اللہ شاہ بخاری اور مولانا داؤد غزنوی کے ہمراہ امرتسر سے منتخب ہو کر آیا تھا۔ اس کانفرنس میں گوجرانوالہ سے ملک لعل خان، مشہور خلافتی کارکن اور چارسدہ پشاور سے عبدالغفار خاں، جو بعد میں سرحدی گاندھی اور سرخپوشوں کی تحریک "خدائی خدمتگاروں" کے لیڈر مشہور ہوئے، شریک ہوئے تھے۔

اس کانفرنس کے منعقد کرنے کا مقصد جو ہمیں بعد میں جا کر معلوم ہوا یہ تھا کہ آل انڈین خلافت کمیٹی کے مرکزی دفتر کو دہلی میں تبدیل کیا جائے جو صرف دو مہینے پہلے مولانا شوکت علی نے بمبئی میں قائم کیا تھا۔

دہلی ہندوستان کا دارالخلافہ بن چکا تھا اور اہل دہلی کی یہ خواہش تھی کہ آل انڈیا خلافت کمیٹی کا مرکزی دفتر بھی دارالخلافہ ہی میں ہونا چاہیے۔ مولانا حسرت موہانی اس تحریک کی سربراہی فرما رہے تھے، تمام مندوبین کانفرنس "خدام خلافت" کے نام سے متاثر ہو کر اس کانفرنس میں شرکت کے لئے آئے تھے انہیں اپنے گھروں سے نکلتے وقت یہی خیال تھا۔ کہ مرکزی خلافت کمیٹی کے ماتحت یہ کانفرنس منعقد ہو رہی ہے، جس میں غالباً خدام خلافت کے لیے کوئی جالب نظر لائحہ عمل تجویز ہوگا۔ میں نے بہت سے بھوپال کے مندوبین کو دیکھا جو اپنی ماؤں سے دودھ بخشوا کر آئے تھے۔ انکا خیال تھا کہ وہ جہاد کے لئے بلائے جا رہے ہیں اور شاید اپنے گھروں کو واپس نہیں لوٹ سکیں گے۔ واقعی جو پوسٹر جلب توجہ کے لئے دہلی سے بھیجے گئے تھے، اس میں خدام خلافت کے نام یہی تاکید کی گئی تھی کہ "کفن باندھ کر سر پر آؤ"

اس کانفرنس کا ایجنڈا مرتب کرنے کیلئے جب سبجیکٹ کمیٹی کا اجلاس ہوا تو اس میں دفعتاً یہ راز کھلا کہ مدعوئین کانفرنس کی ساری کاوشیں محض اسلئے ہیں کہ مرکز خلافت جسے مولانا شوکت علی نے بمبئی میں قائم کیا ہے دہلی منتقل ہو جائے۔

میں نے مندوبین کانفرنس کی حوصلہ شکنی دیکھتے ہوئے اسی سبجیکٹ کمیٹی میں ہجرت کا ریزولیوشن

پیش کر دیا، جس سے مندوبین کانفرنس میں ایک کہرام سا مچ گیا اور وہ بغلیں جھانکتے ہوئے آپس میں سرگوشیوں میں مشغول ہو گئے۔ پھر کنویسنگ شروع ہوئی، پھر ووٹنگ ہوئی اور میرا ریزولیوشن دیکھتے ہی دیکھتے گر گیا، لیکن میں نے شکست تسلیم نہیں کی اور اعلان کر دیا کہ میں کانفرنس کے کھلے اجلاس میں اسے پیش کروں گا۔ ایک مندوب کی حیثیت سے یہ میرا آئینی حق تھا، چنانچہ جب دوسرے دن کانفرنس کا کھلا اجلاس ہوا تو میرا نام مقررین کی فہرست میں شامل تھا، مگر جونہی کہ مجھ سے پہلے ایک مقرر نے اپنی تقریر شروع کی، تو منتظمین میں سے ایک نے قریب آ کر میرے کان میں کہا کہ کوئی صاحب آپ سے ضروری مشورہ کرنا چاہتے ہیں آپ ذرا سی دیر کے لئے اسٹیج سے اس طرف آ کر انکی بات سن لیجئے۔ میں یہ سن کر ان کے ساتھ ہو لیا وہ مجھے ایک طرف کو لے گئے وہاں منتظمین میں سے ایک اور نے مجھ سے باتیں شروع کر دیں اور جب میں تھوڑی دیر کے بعد واپس پہنچا تو مجھ سے پہلے مقرر کا وقت ختم ہو چکا تھا اور دوسرا مقرر جس کا نمبر میرے بعد آنا تھا کھڑا ہو کر تقریر کر رہا تھا۔ میں نے صدر صاحب جلسہ سے اس کے متعلق جب استفسار کیا تو انہوں نے کہا کہ آپ کا نام بولا گیا تھا مگر آپ موجود نہ تھے۔ اس لیے آپ کا وقت جاتا رہا ہے۔ میں یہ سن کر غصے سے بھڑک اٹھا اور آپے سے باہر ہو کر منتظمین جلسہ کی اس فریب کاری کے برخلاف پبلک سے احتجاج شروع کرنے لگا۔ تھوڑی دیر کے لئے جلسہ گاہ میں ہنگامی صورت پیدا ہو گئی۔ مولانا حسرت موہانی نے مجھے سکون بخشنے کی کوشش کی اور کہا کہ چونکہ اس کانفرنس کو ہجرت کے مقصد کے لئے طلب نہیں کیا گیا۔ اس لیے آپ اس موضوع کو یہاں زیر بحث نہ لائیں۔ ہم آپ سے وعدہ کرتے ہیں کہ ہم آپ کے لئے آج ہی شام ایک علیحدہ پبلک جلسہ کا انتظام کیے دیتے ہیں۔ مسٹر آصف علی بیرسٹر اس جلسے کی صدارت کریں گے آپ وہاں ہجرت کے موضوع پر تقریر کریں۔ میں نے شرط لگائی کہ میں اس وقت تک آپ کی تجویز کو نہیں مانوں گا، جب تک کہ آپ اس کانفرنس میں اس موعودہ پبلک جلسہ کا اعلان نہ کر دیں۔ چنانچہ اسی وقت مولانا حسرت موہانی نے اعلان کیا کہ آج رات پاٹودی ہوس میں ایک پبلک جلسہ منعقد ہو گا، جس کی صدارت دہلی کے مسٹر آصف علی بیرسٹر صاحب فرمائیں گے۔ اس میں ہجرت کے موضوع پر جناب فلاں (میری طرف اشارہ کر کے) تقریر کریں گے، لوگوں نے بیک آواز کہا کہ ہم ضرور اس جلسے میں آئیں گے۔ میں یہ سن کر اطمینان سے بیٹھ گیا اور شام کے جلسے کا انتظار کرنے لگا۔

شام کو حسب وعدہ اور اعلان جلسہ منعقد ہوا اور لوگ ہزاروں کی تعداد میں آئے۔ کوئی پچیس ہزار کے لگ بھگ کا مجمع تھا۔ جلسے کی صدارت مسٹر آصف علی بیرسٹر نے کی، لیکن وہ اپنی افتتاحی تقریر کرنے کے بعد ایک ضروری کام کا بہانہ کر کے جلسہ گاہ سے چلے گئے اور اپنی صدارت مولانا داؤد غزنوی کے سپرد کر گئے۔

مولانا داؤد غزنوی نے صدارت کے فرائض سنبھالتے ہی مولانا سید عطاء اللہ شاہ بخاری کو تقریر کرنے کا موقع دیا۔ مولانا سید عطاء اللہ شاہ بخاری کی میدان سیاست میں یہ تیسری تقریر تھی، پہلی تقریر وہ امرتسر کے اجلاس میں کر چکے تھے، جس کا ذکر اس سے پہلے کیا گیا ہے اور دوسری تقریر انہوں نے دہلی میں اسی خدام

خلافت کانفرنس میں کی تھی، جس سے انکی دھاک لوگوں کے دلوں پر بیٹھ گئی تھی۔ وہ بلا کے خوش الحان تھے اور جب وہ قرآن کی سورتوں کو خوش الحانی سے پڑھتے تھے تو لوگوں کے دلوں کو گویا چیر دیتے تھے اور ویسے بھی وہ نہایت باذوق اور بلیغ مقرر تھے۔ دہلی میں ان کی ایک ہی تقریر نے لوگوں کے دلوں کو مسخر کر لیا تھا اور ان کی شہرت ایک ہی دن میں دہلی شہر میں پھیل گئی تھی۔ اس ہمارے جلسے میں جس کا موضوع اور مقصد "ہجرت" تھا، دراصل اتنا کثیر مجمع انہی کی متوقع تقریر سننے کے لئے گرد آ گیا تھا لیکن جب وہ اٹھے تو انہوں نے بجائے ہجرت کے عدم تعاون کو اپنا موضوع سخن بنایا اور لوگوں کو اپنے جادوئے تقریر سے مسحور کرنا شروع کر دیا انکی تقریر آٹھ بجے شب کے قریب شروع ہوئی تھی اور اب رات کے بارہ بج گئے تھے۔ لوگوں میں سناٹا چھایا ہوا تھا۔ وہ دم بہ خود ہو کر ان کی دلآویز تقریر سننے میں محو تھے۔ میں انکی تقریر کے اثرات کا لوگوں پر اندازہ کر رہا تھا اور اپنے جی میں گھبرا رہا تھا کہ اب کیا ہوگا۔ مجھے ہرگز امید نہ تھی کہ اس جلسے میں ہجرت کی تحریک کو پیش کر سکوں گا۔ جب بارہ بجنے کے قریب آئے تو میں نے صدر صاحب سے اشارہ کیا کہ اب تو انہیں بٹھائیے۔ اس پر وہ لوگ جو آس پاس بیٹھے تھے اور جنہیں معلوم تھا کہ میں وہ شخص ہوں جو ہجرت کی تحریک پیش کرنا چاہتا ہوں، زور سے چلا اٹھے کہ اگر سید عطاء اللہ شاہ بخاری تمام رات تقریر کرتے رہیں گے تو ہم سنتے رہیں گے۔ لیکن اگر آپ نے ان کو بٹھا دیا تو ہم جلسہ گاہ سے اٹھ کر چلے جائیں گے۔ مجھ پر ان کے اس کہنے سے اوس پڑ گئی۔ پھرے مجمع نے بھی اس چلاہٹ کی بڑے جوش و خروش کے ساتھ تائید کی۔ صدر صاحب نے اشارے سے مجھے خاموش رہنے کو کہا حتیٰ کہ ساڑھے بارہ بج گئے۔ میں جو صدر صاحب کی کرسی کے پاس ہی بیٹھا تھا میں نے صدر صاحب کی پنڈلی میں چٹکی لی۔ انہوں نے میرا اشارہ سمجھ کر سید عطاء اللہ شاہ بخاری کو اپنی تقریر ختم کرنے کے لئے پندرہ منٹ اور دے دیئے۔ اس پر بھی انہوں نے آدھا گھنٹہ اور لے ہی لیا۔ اب جب انہوں نے بیٹھنا چاہا تو لوگوں نے پھر شور مچانا شروع کر دیا۔ مگر داؤد غزنوی نے ان سے اٹھ کر کہا کہ یہ دہلی کے مسلمانوں کی مہمان نوازی کی شان کے برخلاف ہے کہ وہ باہر سے آئے مہمانوں میں سے ایک کی تقریر تو سنیں اور دوسروں کی نہ سنیں۔ لوگوں نے اس بات کا اثر قبول کیا۔ لیکن پھر بھی مولانا سید عطاء اللہ شاہ بخاری کے بیٹھنے اور میرے اٹھنے تک مجمع ہل چکا تھا اور لوگ کافی تعداد میں جانے شروع ہو گئے تھے۔ میری آواز میں اگرچہ دل آویزی نہ تھی لیکن قدرت نے مجھے مارشل آواز عطا کر رکھی ہے۔ مجھے اعتراف ہے کہ جب میں تقریر کرنے کھڑا ہوا تو فرط خوف سے میری ٹانگیں کانپ رہی تھیں۔ پھر بھی میں نے اللہ کا نام لے کر اپنی تقریر شروع کر دی اور ابتداء میں اپنے اور مجمع کے گرمانے کے لئے علامہ اقبال کے جواب شکوہ کے حساس حصوں کو جو مجھے ازبر یاد تھے۔ اپنی بلند اور مارشل آواز سے پڑھنا شروع کر دیا۔ میں نے لوگوں سے کہا کہ جو کچھ میرے بھائی مولانا سید عطاء اللہ شاہ بخاری نے فرمایا ہے، یہ انسانی فطرت کی انتہائی دانش مندانہ بات ہے۔ ہمیں فی الواقعی موجودہ حالات میں ایسا ہی کرنا چاہیئے تھا۔ لیکن وہ علیم و حکیم جو اپنے بندوں کا خالق ہے اور جس نے ہمیں انسانی دانش اور پھر نعمت اسلام عطا کر رکھی ہے۔ ایسے صبر آزما حالات میں اپنی حکمت اور اپنا قانون بھی

بیان فرماتا ہے اور وہ یہ ہے کہ اگر تم کسی جگہ اپنے ایمان اور اپنے اسلام کو سلامت نہ رکھ سکو تو وہاں سے کسی اور طرف ہجرت کر جاؤ۔ اور ساتھ ہی میں نے یہ آیت بھی پڑھ دی۔

یاایھاالذین آمنو ان ارضی واسعہ فایای فاعبدون۔

اے ایمان والو! میری زمین وسیع ہے۔ پس جہاں تم سے ہوسکے صرف میری ہی عبادت کرو۔

پس لوگو! اب تمہارا اختیار ہے خواہ اپنی دانش سے کام لو یا خدائے علیم و حکیم کی حکمت و دانش پر عمل کرو۔

کچھ دنوں بعد مجھے معلوم ہوا کہ سید عطاء اللہ شاہ بخاری نے نہایت مستعدی اور گرم جوشی سے ہجرت کی تبلیغ شروع کر رکھی ہے۔ میں نے اس تائید غیبی پر خدا کا شکر ادا کیا۔ میں نے ازراہ تفنن مولانا سید عطاء اللہ شاہ بخاری سے پوچھا کہ اب تو آپ میرے ساتھ ہی ہجرت کریں گے؟ جس پر انہوں نے فرمایا کہ آپ آگے جائیں میں آپ کے پیچھے مہاجرین کے لشکر روانہ کرتا رہوں گا۔

میں جب ۱۹۳۰ء میں (افغانستان سے رہا ہو کر) ہندوستان واپس آیا تو مولانا سید عطاء اللہ شاہ بخاری اور شیخ حسام الدین وغیرہ اس وقت مجلس احرارِ اسلام میں شامل تھے اور مجلس احرار ان دنوں فروغ پا رہی تھی۔

ان کی باتیں تو عطاء الٰہی ہوتی ہیں

حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانویؒ

وہ یگانۂ روزگار خطیب ہیں۔ قادیانیوں کے خلاف ان کی ایک تقریر ہماری پوری تصنیف سے بڑھ چڑھ کر ہے۔ عطاء اللہ، عہدِ نبوت میں ہوتے تو ناقۂ رسالت کے حُدی خواں ہوتے۔

علامہ محمد انور شاہ کشمیریؒ

ان کا دل صرف اسلام کیلئے دھڑکتا ہے۔ وہ اس زمانہ میں اسلام کی زبان ہیں۔

مولانا سید حسین احمد مدنیؒ

عطاء اللہ شاہ علماء کی آبرو ہیں۔

ابو حنیفۂ ہند حضرت مفتی کفایت اللہ دہلویؒ

وہ ولی کامل اور اسلام کی برہنہ شمشیر ہیں جب تک وہ زندہ ہیں اسلام کو کوئی خطرہ نہیں

مولانا احمد علی لاہوریؒ

وہ کسی ایک کے نہیں سب کے ہیں۔ وہ اسلام کی مشین ہیں۔ اس قسم کے نابغہ لوگ روز روز پیدا نہیں ہوتے۔ وہ روزمرہ کی زبان میں دین کے بڑے بڑے مسئلے حل کر جاتے ہیں۔

مولانا شبیر احمد عثمانیؒ

مقامِ مردِ قلندر ورائے افلاک است

محترم عاصی کرنالی صاحب نے یہ نظم شاہ جی کی حیات میں کہی اور ان کی خدمت میں حاضر ہو کر سنائی۔

زبانِ فیض بیانش فقط رگ تاک است
چکیدہ اش مئے ناب است و گوہر پاک است

چو لب کشا بہ تلاوت شود، ولم گوید
کہ عندلیبِ گلستانِ شاہ لولاک است

بیا بہ اُو، اگرت زہرِ کفر روزی شُد
چو گفتگو بکند، حرف حرف تریاک است

بہ خاک اگرچہ نشیند، بہ خاکیان سازد
مقامِ مردِ قلندر ورائے افلاک است

جنونِ او کہ بہ ارض و سمائی گنجد
تعارفے زمقامش بہ عجز ادراک است

بہ فصل لالہ چہ حال است مرد عارف را
کہ جیب غنچہ، ولے دامنِ دلش چاک است

سلام شوق بہ دیوانۂ کہ در مستی
نفس کشید و گریبان زندگی چاک است

نگہ فسون و ادا سحر و گفتگو اعجاز
زدین و دل ببریدم کہ فتنہ چالاک است

غلط روند مریدان و شیخِ ما نادم
خطا زنا و جبین کرم عرق ناک است

صد آفتاب نہاوند در دلِ پاکش
اگرچہ پیکر مومن ز ذرۂ خاک است

خدا نکردہ کہ ہادے بدیں چراغ رسد
کہ ایں تجلیٔ آخرز نورِ افلاک است

بگوبہ شعلۂ نازے کہ خیز و در ماگیر
وجودِ اہل تمنا تمام خاشاک است

پروفیسر عاصی کرنالی

منشی احمد دینؒ

شاہ جی کی کہانی

مضمون نویسی میرا کام نہیں اور نہ اس کی مجھ میں صلاحیت ہے۔ ایسی حالت میں سید عطاءاللہ شاہ بخاری ایسے مجاہد کامل کی زندگی کے حالات پر قلم اٹھانا اپنی حیثیت اور قابلیت سے زیادہ ابھرنے کے مانند ہے یہ مضمون اگر شرمندۂ اشاعت ہوا تو ہزاروں لوگوں کی نظر سے گزرے گا مضمون میں کہاں غلطی ہے اور کہاں نہیں اس پر بھی نظر جائے گی۔ ایسی حالت میں شاہ جی کے پردے میں اپنا چہرہ لوگوں کے سامنے پیش کرنا زیب نہیں دیتا۔

تاہم جرأت کر رہا ہوں، شورش بھائی کا حکم ہے اور فرض کی ادائیگی بھی ضروری ہے علاوہ بریں مجھے اپنے ایک دوست راہبر اور بزرگ کو اپنی عقیدت کے پھول بھیجنے ہیں۔

شاہ جی زندہ تھے تو ان سے آزادی کے بعد ملاقات کا امکان خارج از خیال تھا۔ کبھی کبھار زبانی سلام و پیام ہو جاتا لیکن جس دن سے ان کی وفات کی خبر اخباروں کے ذریعے آنکھوں کے سامنے آئی ہے وہ مجھے بھولتے نہیں۔ "روز آتے ہیں میرے دل کو تسلی دینے"

ابتدائی زمانہ

سال تو مجھے یاد نہیں رہا۔ البتہ ۱۹۱۹ء سے کئی سال قبل کا زمانہ تھا جب میری نظروں کے سامنے ان کی نورانی تصویر آنے لگی۔ گو میری عمر بھی کچھ زیادہ نہیں تھی۔ گھر سے کام پر جانے کے لئے میرا ایک راستہ تھا۔ دوپہر کے بعد اکثر اس راستہ میں ان کا اور میرا گزر آمنے سامنے سے ہوتا۔ میری ان سے کوئی واقفیت نہ تھی اور نہ میں ان کے نام ہی سے واقف تھا۔ اس زمانے کے سید عطاءاللہ شاہ کی قلمی تصویر جو آج بھی میرے سامنے ہے کچھ اس طرح سے بیان کر سکتا ہوں۔

پانچ فٹ چھ انچ کا ایک دبلا سا مگر مضبوط نوجوان، رنگ گندمی چہرہ کشادہ اور چمکدار آنکھیں بڑی بڑی مگر چمکیلی، ناک سیدھی مگر مناسب، پیشانی کشادہ معمولی چھوٹی چھوٹی داڑھی جو سُرخ و سفید چہرے پر پیاری معلوم ہوتی تھی۔ زلفیں شانوں تک تیل میں بسی ہوئیں تیل کے نشان ان کی شیروانی کے کندھوں پر اکثر ہوتے۔ یہ نوجوان بازاروں سے گزرتا ہوا لوگوں کی نظروں کو ضرور کھینچتا چلا جاتا تھا۔ چونکہ شاہ جی حافظ قرآن تھے اس لئے اکثر لوگ ان کو حافظ جی کہتے تھے۔

شاہ جی مولانا غلام مصطفی صاحب مرحوم کے مدرسہ دینیات میں بغرض تعلیم جاتے اور مولانا مفتی عبدالصمد صاحب مرحوم سے سبق پڑھتے۔ اس زمانے میں شاہ جی کبھی کبھی بعد از نماز جمعہ مسجد میاں جان محمد میں وعظ فرماتے مگر یہ زمانہ ان کی نو آموزی کا تھا۔

قبلہ شاہ جی کے خاندان کے لوگ اور بزرگ زیادہ تر امرتسر ہی میں رہائش پذیر تھے اور کاروباری زندگی میں

مصروف تھے۔ شاہ جی کا اپنے رشتہ داروں سے بہت اچھا تعلق تھا ان میں سے اکثر سے میری ملاقات تھی۔
حضرت شاہ جی کے والد بزرگوار حافظ سید ضیاءالدین رحمہ اللہ موضع ناگڑیاں ضلع گجرات میں قیام پذیر تھے۔
کبھی کبھی شاہ جی والد صاحب کی خدمت میں حاضری کے لئے جاتے تھے۔

قومی زندگی کا آغاز

۱۹۱۹ء کے فوراً بعد جب امرتسر کے لوگ مارشل لاء اور جلیانوالہ باغ کے حادثہ جانکاہ سے بُری طرح نڈھال تھے۔ یکایک لفظ خلافت سننے میں آیا۔ اس وقت مولانا محمد داؤد اور غزنوی پہلے بزرگ تھے جو میدان میں نکلے اور انہوں نے مسلمانوں کو مسئلہ خلافت سمجھانا شروع کیا ساتھ ساتھ دولت عثمانیہ ترکی کے خاتمہ کا ماتم بھی تھا۔ یہ زمانہ عالم اسلام پر چاروں طرف سے مصیبتوں اور آفتوں کا زمانہ تھا۔ جزیرۃ العرب اور دیگر مقامات مقدسہ غیروں کے قبضہ میں تھے۔ جب اس اجمال کی تفصیل مسلمانوں کو سنائی جانے لگی تو مسلمان عوام کے اندر صدمہ اور جوش کی ایک لہر پیدا ہو گئی۔

حضرت شاہ جی اس وقت صرف مذہبی وعظ فرماتے تھے وہ مولانا داؤد غزنوی کے ساتھ شریک نہ ہوئے البتہ کبھی کبھی مولانا غزنوی کے نظریہ پر شاہ جی مخالفانہ انداز بھی اختیار کر لیتے۔ مجھے شاہ جی نے بتایا کہ ایک بار مولانا داؤد غزنوی نے خود کوشش کر کے مجھ سے ملاقات کی اور کئی گھنٹوں کی ملاقات میں موجودہ مسئلہ کو کھول کر بیان کیا۔ تب شاہ جی قائل ہو گئے پھر کیا تھا پھر تو امرتسر کے مسلمانوں کی کایا ہی پلٹ گئی۔ شاہ جی کا عہد جوانی اور ساتھ ساتھ جوش ایمان اور قوت بیان ایک آگ لگ گئی۔

میرے لئے سیاسی جلسوں میں شمولیت کا پہلا موقع تھا۔ مسئلہ خلافت اور انگریز حکومت کی چیرہ دستیاں مسلمانوں کے دلوں کے زخموں پر نمک کا کام دیتی تھیں۔ امرتسر ابھی ابھی زخم کھا کر نکلا تھا مگر مولانا سید عطاءاللہ شاہ بخاری کی تقریروں اور مذہبی وعظوں نے ہندو مسلمان سب کے اندر بے پناہ جذبہ پیدا کر دیا۔ اتنے میں ۱۹۱۹ء کا دسمبر آگیا اور کانگرس کا سالانہ جلسہ زیر صدارت پنڈت موتی لال نہرو امرتسر میں منعقد ہوا، ساتھ ساتھ مسلم لیگ کا سالانہ جلسہ بھی حکیم اجمل خان صاحب کی صدارت میں منعقد ہوا۔

یہ دسمبر امرتسر کے لئے تو باران رحمت ثابت ہوا کہ ہندوستان کے تمام لیڈر امرتسر پہنچ گئے جو جیلوں میں تھے وہ رہا کر دیئے گئے۔ علی برادران بھی جیل سے رہا ہو کر سیدھے امرتسر وارد ہوئے یہ زمانہ علی برادران کے عروج کا زمانہ تھا۔ مولانا شوکت علی کی صدارت میں آل انڈیا خلافت کانفرنس منعقد ہوئی۔ جس میں مولانا محمد علی نے حالات حاضرہ اور عالم اسلام کی تباہی و بربادی پر تقریر کی۔ اس جلسہ میں شاہ جی نے تقریر فرمائی اور دس لاکھ روپیہ چندہ کے لئے اپیل کی جس کا خاطر خواہ اثر ہوا اور روپیہ کی فراہمی شروع ہو گئی۔ مولانا ظفر علی خان اس جلسہ میں موجود تھے مگر حکومت کی طرف سے ان کو تقریر کرنے کی اجازت نہ تھی۔ یہ زمانہ زمیندار اور مولانا ظفر علی خان پر انگریزوں کے انتہائی عتاب کا تھا۔ مگر اسی اجتماع میں ان کو تار ملا کہ مولانا کی زبان بندی ختم کر دی گئی ہے۔ تب امرتسر کا یہ قومی ہفتہ پوری شان سے منایا گیا۔ یہیں شاہ جی کا گہرا تعلق علی برادران سے ہو گیا۔

کچھ عرصہ بعد حضرت مولانا ابوالکلام آزاد کا دورہ پنجاب ہوا- یہ دورہ زیادہ تر مذہبی تھا اور مولانا مسلمانوں سے بیعت جہاد لے رہے تھے- لاہور کی شاہی مسجد میں نماز جمعہ کے بعد رانا فیروزالدین نے جو اس وقت خلافت کمیٹی پنجاب کے سیکرٹری جنرل تھے، اعلان کیا کہ جو مسلمان مولانا آزاد کے ہاتھ پر بیعت کرنا چاہے وہ کرسکتا ہے اس مجمع کے آخر میں شاہ جی حوض کے قریب ہی کھڑے تھے- ان کے ساتھ ہی مولانا عبدالقادر صاحب قصوری بھی تھے- شاہ جی نے سنا تو سخت بے چین ہوئے- مولانا عبدالقادر صاحب سے کہا کہ دیکھو سب کام خراب ہورہا ہے یہ کہہ کر شاہ جی نے ایک چھلانگ لگائی اور لوگوں کے گویا سروں سے گزرتے ہوئے منبر تک پہنچ گئے- صدر خاموش تھا ان سے کہا کہ میں ان کے اس اعلان کی وضاحت کروں گا-

مولانا عبداللہ قصوری خاموش رہے- شاہ جی نے اپنی خداداد قرأت و بلند آواز سے مجمع کو اپنی طرف متوجہ کرلیا یہ پہلا موقعہ تھا کہ مولانا آزاد بھی محو حیرت شاہ جی کی طرف دیکھ رہے تھے- شاہ جی نے اس عظیم الشان مجمع کو چند منٹوں کے اندر اندر اپنی گرفت میں لے لیا اور اس نقطہ کی وضاحت فرمائی کہ جو لوگ پہلے کسی مرشد سے بیعت ہیں ان کی اس بیعت سے اثر نہیں پڑتا وہ بیعت ارشاد تھی اور یہ بیعت جہاد ہے"-

اتنا کہہ کر اپنے ہاتھ مولانا آزاد کے ہاتھوں میں دے دیئے اور کلمات بیعت کا ورد شروع کیا- شاہ جی پہلے پڑھتے پھر تمام مجمع پڑھتا تھا ایسا محسوس ہوتا تھا کہ تمام درودیوار سے یہ ہی آواز آرہی ہے اور خشوع وخضوع کا یہ عالم تھا کہ اس وقت بلاشبہ قرن اول کا یہ واقعہ یاد آگیا جب حضور ﷺ نے حضرت ابوبکرؓ کے ہاتھ میں ہاتھ دے کر مدینہ منورہ میں انصار سے بیعت لی تھی- ایسا منظر پھر زندگی میں کبھی دیکھنے میں نہیں آیا اس واقعہ کے بعد شاہ جی کا تعلق مولانا آزاد سے ہوگیا- (مولانا آزاد نے اسی موقع پر فرمایا تھا- میرے بھائی! آپ کی اس خدمت پر ملک وملت کا ہر گوشہ شکر گزار ہے)

علی برادران امرتسر میں رہا ہو کر پہلی بار آئے تو اس وقت ان کا نعرہ مسلمانوں کے لئے ایک ہی تھا ہجرت یا جہاد کیونکہ مسلمانان عالم پر ایسا تاریک دور تھا کہ انہیں کوئی راستہ نہیں ملتا تھا- برطانیہ پہلی جنگ میں فتح حاصل کرنے کے بعد اتنا مغرور تھا کہ وہ کسی کو خاطر میں نہ لاتا تھا- برطانیہ کے وزیراعظم جنگ عظیم کا فاتح یہودی تھا- اس نے قیصر کی حکومت کو تو پاش پاش کیا ہی تھا مگر عرب کے بھی کئی ٹکڑے کرکے رکھ دیئے- اس کے علاوہ ایشیاء اور افریقہ کا کوئی آزاد ہو- ایران، افغانستان، عرب، مراکش، الجزائر، مصر تمام بلاد اسلامیہ برطانیہ یا اس کے اتحادیوں کے زیر تصرف تھے- فلسطین پر جب انگریزوں کا قبضہ ہوا تو فاتح فوجی افسر کے سینے پر تمغہ آویزاں کرتے ہوئے برطانیہ کے یہودی وزیراعظم نے کہا تھا کہ "یہ آدمی صلیبی جنگ کا فاتح ہے اس نے فلسطین کو فتح کیا ہے"-

حالانکہ دوران جنگ میں برطانیہ نے ہندوستان کے مسلمانوں کو یقین دلایا تھا کہ فتح کی صورت میں عرب اور مقامات مقدسہ آزاد رہیں گے اور یہ جنگ مذہبی نہیں ہے سیاسی ہے- لیکن وہ وعدہ ہی کیا جس کو انگریزوں نے پورا کیا ہو-

ایک وعدہ برطانیہ نے شریف حسین حاکم مکہ سے کیا تھا کہ خاتمہ جنگ پر شریف حسین کو وحدت

عرب کا بادشاہ بنایا جائے گا۔ یہ دونوں وعدے اپنی جگہ پر اور برطانیہ کے دھوکہ اور فریب کی تاریخ اپنی جگہ پر۔

انگریزوں اور امریکنوں نے مل کر فلسطین کو یہودیوں کا وطن بنانا شروع کیا جس کی داستان علیحدہ کتاب کی محتاج ہے۔ اور آج وہ وطن موجود ہے جو تمام عرب کے لئے ایک مستقل خطرہ بنا ہوا ہے۔ مذکورہ بالا سوالوں پر حضرت شاہ جی کی پوری نظر تھی۔ جب وہ اپنی طویل تقریر میں وجد کے عالم میں آتے تھے تو ان آنے والے تاریخی واقعات کا اشارہ بھی فرماتے تھے۔

ہجرت

حضرت شاہ جی کی زندگی کے حالات مختصر ہی کیوں نہ بیان ہوں گے مگر وہ نامکمل اور سراسر نامکمل اگر تحریک ہجرت کا ذکر ان کے ساتھ نہ کیا جائے کیونکہ اس تحریک کے روح رواں شاہ جی ہی تھے۔ گو اس قافلہ کے ہر اول جناب عزیز ہندی تھے جنھوں نے پہلے پہل اس کا بیڑا اٹھایا۔ اس بات کی تفصیل آج میں کافی حد تک بیان کرنے کی پوزیشن میں ہوں۔ جو حقیقت حال پر مبنی ہو گی۔ میرے بعد اب کوئی دوسرا آدمی زندہ بھی نہیں جو اس تحریک کے بنیادی پہلو پر روشنی ڈال سکے۔

ہندوستان کی شمال مغربی سرحد ہمیشہ سے ہندوستان کے انقلاب کی پناہ گاہ رہی ہے۔ اور افغانستان میں جب غازی امان اللہ خان برسر اقتدار آئے تو آزاد ہند کے راہنماؤں کو ایک گونہ تسکین ہوئی۔ کیونکہ امان اللہ خان آزادیٔ ہند کے حامی تھے۔ مگر ان کی مجبوری تھی کہ ان کے والد کے زمانہ ہی سے شاہ افغانستان انگریزوں کا وظیفہ خوار تھا۔ عملاً برطانوی سفیر مقیم کابل کی حکومت افغانستان میں تھی۔ بادشاہ برائے نام ہی تھا۔ امان اللہ نے آتے ہی پہلا حملہ جب انگریزی سرحد پر کیا تو اس وقت انگریزی فوج بہت کم تھی پنجاب میں شورش ہونے کی وجہ سے مارشل لاء نافذ تھا اور فوج پنجاب میں تھی۔ حکومت ہند کے لئے یہ وقت بڑا مشکل تھا اس افغانی حملہ کی وجہ سے ایک تو عملاً مارشل لاء اٹھ گیا۔ دوسرے پنجاب کی شورش کے باعث انگریزوں کو امان اللہ سے عارضی صلح کرنا پڑی۔ اگر یہ صورت نہ ہوتی تو انگریزوں کا پنجاب کو پریشان کرنے کا فیصلہ ابھی بہت باقی تھا۔ اس کا ایک فائدہ ہندوستان کو یہ بھی ہوا کہ حکومت برطانیہ کی پالیسی ہندوستان کی طرف عارضی طور پر کچھ نرم پڑ گئی۔

ان تمام حالات کے باوجود ۱۹۳۰ء کا ہندوستان سخت آزمائش سے گزر رہا تھا۔ اس کو کوئی راستہ نہ ملتا تھا کہ وہ اب کیا کرے؟ یہی وہ دور ہے جب ہجرت کی تحریک یکایک شروع ہو گئی۔ اور اس کا اثر مسلمانوں پر بے پناہ ہوا۔ حضرت شاہ جی نے کافی غور و فکر کے بعد اس میں ہاتھ ڈالا کیونکہ حکومت افغانستان نے اپنی طرف سے ہجرت کرنے والوں کو بلایا۔ اس سے امید کی یہ کرن پیدا ہوئی کہ شاید حکومت پر کچھ دباؤ پڑ جائے اور وہ مسلمانان ہند کے مطالبات پر توجہ دے سکے۔ اب شاہ جی نے ہجرت کی تحریک میں جان ڈالنی شروع کی۔ پنجاب، سندھ اور صوبہ سرحد کے اندر تو یہ قابو سے باہر ہو گئی اور حکومت انگریزی سخت گھبراہٹ میں پڑ گئی۔ سپیشل گاڑیاں بھی چلنی شروع ہو گئیں۔ صوبہ سرحد کے چیف کمشنر سر سملٹن گرانٹ نے تو ایک

قافلہ کو ہاتھ جوڑ کر روکنے کی کوشش کی مگر مسلمان سر بکف جا رہا اور اپنی لاکھوں کی جائیداد کو چھوڑ کر بے وطن ہو رہا تھا۔ جب یہ تحریک زوروں پر تھی تب سرکار انگریزی کی مشنری حرکت میں آئی اور سینکڑوں کی تعداد میں انگریز کے ایجنٹ مسلمان، ان قافلوں میں شامل ہو گئے تاکہ انتشار پیدا کر سکیں۔

حکومت افغانستان نے اپنی بساط کے مطابق مہاجروں کا استقبال کیا اور ان کو جاتے ہی زمین وغیرہ دے دی کہ یہ اپنی روزی وغیرہ کا کچھ بندوبست کریں۔ مگر انتشار پسندوں نے پہلے دن سے ہی مہاجرین کے اندر بددلی پیدا کرنی شروع کر دی۔ حالانکہ راستہ میں غیر علاقہ کے افغانوں نے اپنے اسلامی جذبہ کا بڑھ چڑھ کر ثبوت دیا۔

اسی دوران میں ہندوستان کی تحریک خلافت کے رہنما مولانا شوکت علی نے شاہ امان اللہ خان کو ایک زبانی پیغام بھیجا۔ یہ پیغام لے جانے والا آدمی ابھی تک زندہ ہے جس نے شاہ امان اللہ کو یہ پیغام دے کر اس کا ردعمل معلوم کرنے کی کوشش کی جو خاموشی کی صورت میں ملا مولانا شوکت علی نے شاہ کو یہ پیغام دیا کہ!۔

"آدمی، روپیہ سب طرح سے ہم انگریز کے خلاف تمہاری مدد کریں گے۔ مگر ہندوستان کی زمین کا ایک انچ بھی نہیں دیں گے" یہ پیغام سن کر امان اللہ خان دم بخود رہ گئے۔

دوسری طرف انگریز نے افغانستان کی خود مختاری مان لی جس کے لئے کابل کی حکومت کو اشارہ مل گیا کہ حکومت ہند سے تعلقات بہتر کرنے کی ایک راہ یہ بھی ہے کہ مہاجرین کو ہندوستان واپس بھیج دو۔ ان دونوں باتوں نے حکومت کابل کو اس بات پر آمادہ کر دیا کہ اس نے مہاجرین کی طرف جو دست شفقت دراز کیا تھا وہ واپس لے لیا۔ تب مہاجروں کے لاکھوں کے اجتماع کے اندر پریشانی اور انتشار شروع ہوا۔ پھر وہ طبقہ بھی مہاجرین کے اندر ہی تھا۔ جو اپنے لئے موقع کی تلاش میں تھا۔ اس نے بھی فائدہ اٹھایا۔ اس طرح یہ تحریک ہجرت ناکام ہوئی مگر افغانستان آزاد ہو گیا۔

اس ناکامی کے ساتھ ہی مہاجرین کے قافلے واپس آنے شروع ہوئے اور افغان سرکار کا شکوہ شروع ہو گیا۔ بات بھی یہی تھی کہ افغانستان والوں نے جس طرح دعوت دی تھی پھر ویسا سلوک نہیں کیا۔ وہ بھی مجبور تھے۔ ان کی سیاست اس کی اجازت نہ دیتی تھی۔ اس تحریک کا اثر شاہ جی کی طبیعت پر بھی ہوا۔ انہوں نے اپنا قیام امرتسر کی بجائے گجرات پنجاب میں تبدیل کر لیا۔

تحریک عدم تعاون اور قومی تعلیم

حضرت شاہ جی شروع میں تو عدم تشدد اور عدم تعاون کے قائل نہیں تھے بلکہ اسکے خلاف ان کی کئی ایک تقریریں میں نے سنی ہیں۔ لیکن اگست ۱۹۲۰ء میں کانگریس کا سپیشل اجلاس کلکتہ میں منعقد ہوا۔ جہاں گاندھی جی نے اپنا لائحہ عمل کانگریس کے سامنے رکھا۔ اس کام میں گاندھی جی تن تنہا تھے۔ صرف مولانا آزاد ان کے ساتھ تھے۔ جن کے ساتھ گاندھی جی کی نئی نئی ملاقات ہوئی تھی۔ عوامی ایجی ٹیشن کے لئے شوکت علی ان کے ساتھ تھے باقی سب لیڈر خلاف تھے۔ اس اجلاس کے صدر لالہ جپت رائے بھی اس پروگرام کے خلاف

تھے۔ شاہ جی اسی اجتماع میں مولانا آزاد کی تقریر سے متاثر ہو کر اس پروگرام کے حق میں ہو گئے۔ جب کلکتہ سے لوٹے تو وہ ایک نئے سانچہ میں ڈھلے ہوئے تھے۔ شاہ جی میں انگریز دشمنی کوٹ کوٹ کر بھری تھی۔ اس کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ انگریز کی ڈپلومیسی اور اس کی تلوار نے تمام مسلمانان عالم کو خون کے آنسو رونے پر مجبور کر دیا تھا۔ شاہ جی یہ بھی یقین رکھتے تھے کہ اگر ہندوستان انگریز کی غلامی سے آزاد ہوتا ہے تو عالم اسلام کی غلامی کی زنجیریں سب ٹوٹ کر گر جائیں گی لیکن ہندوستان کی آزادی کے لئے ہندو مسلمان کا اتحاد بنیادی بات ہے۔ اگر یہ نہیں ہے تو سب کام بیکار ہیں چنانچہ کانگرس کی رہنمائی میں ترک تعاون کی تحریک کا آغاز ہوا۔ جمعیت العلماء ہند نے پولیس اور فوج کی نوکری کے حرام ہونے کا اعلان بھی کر دیا۔ گاندھی جی نے کہا کہ وکیل وکالت کا پیشہ چھوڑ دیں۔ اسکول اور کالج کی طالب علمی چھوڑ دیں۔ اس فقرے پر اب سارے ملک میں کام ہونے لگا۔ ہزاروں کی تعداد میں طالب علم اپنی تعلیم ترک کر کے درسگاہوں سے باہر آگئے۔ تب نیشنل تعلیم کے لئے مختلف کالج اور سکول قائم ہوئے جس میں قومی تعلیم شروع ہوئی۔ جس کا مقصد تھا آزادی کی جنگ کے لئے سپاہی اور لیڈر پیدا کرنا۔

حضرت شاہ جی نے گجرات میں آزاد ہائی سکول کی بنیاد رکھی جیسی ان کی طبیعت تھی ویسا ہی کام ہوا۔ ایک طوفان اٹھا اور گجرات جیسے ضلع سے جو سب سے زیادہ رجعت پرست مانا گیا ہے ایک لاکھ روپیہ سکول کے لئے جمع ہو گیا۔ عمارت تیار ہو گئی۔ ہزاروں کی تعداد میں طالب علم حصول علم کے لئے اس سکول میں داخل ہوئے۔ مولانا آزاد خاص کر اسی سکول کی وجہ سے گجرات تشریف لے گئے اور اہل گجرات نے ان کا شاندار استقبال کیا۔

ایک لطیفہ

ویسے تو شاہ جی رونق محفل تھے ہی۔ خلوت ہو یا جلوت، سکہ انہیں کا چلتا تھا۔ مگر قدرت نے مجمع عام میں فتح کا سہرا انہی کے لئے مخصوص کر رکھا تھا۔ آزاد ہائی سکول کا چندہ کرتے کرتے شاہ جی کا دورہ وزیر آباد کے شہر میں ہوا۔ جو گجرات کا ہی حصہ ہے۔ مگر وزیر آباد کے شاطروں نے شروع سے ہی طے کر رکھا تھا کہ اس شہر میں کسی کا قدم نہ جمنے پائے۔ خواہ وہ کتنا ہی نیک مقصد لے کر ہی کیوں نہ آیا ہو۔ اس سازش میں سبھی انگریز پرست شامل تھے جب پہلی بار گاندھی جی بھی اس شہر میں وارد ہوئے (حالانکہ وہ صرف پنجاب پر کئے گئے مظالم کی تحقیقات کے لئے گئے تھے) تو کسی نے بھی ان کو اپنے گھر پر ٹھہرانے کی جرأت نہ کی تھی۔ وزیر آبادی مسلمان کا تو یہ طریقہ تھا کہ اگر کوئی مہمان قومی یا مذہبی کام کے لئے باہر سے آیا ہے تو اس کی خوب خاطر تواضع کرتا اور جب پبلک جلسہ ہو یا مسجد کے اندر نماز جمعہ کا خطبہ ہو تو عین اسی حالت میں آپس میں دست و گریبان ہو جاتا۔ مگر مہمان کو کوئی گزند نہ پہنچتا۔ لیکن اس طرح جلسہ کے امن کو برباد کر دیتا۔ حضرت شاہ جی وزیر آباد تشریف لے گئے اور نماز جمعہ کے لئے شاہ جی سے درخواست کی گئی کہ آپ ہی پڑھائیں۔ شاہ جی کو اس شہر کے لوگوں کا کردار معلوم تھا۔ مگر انہوں نے قبول کر لیا اور خطبہ کے ابتدائی حصہ میں ہی مسلمانوں کو اتنا

گرا دیا کہ سوائے شاہ جی کی بات سننے کے کسی کا اور کسی طرف خیال نہ گیا۔ شاہ جی نے نماز سے قبل ہی چندہ کر لیا اور روپیہ قابو کر کے اپنے ایک آدمی کے سپرد کر دیا کہ وہ لے کر گجرات چلا جائے تب نماز جمعہ ادا ہوئی۔ نماز کے بعد جب ان شیطانوں کو پتہ چلا کہ روپیہ بھی باہر جا چکا ہے تو وہ آ کر شاہ جی کے پاؤں پر گر گئے کہ ہم ہارے اور آپ جیتے یہ قصہ شاہ جی کی زبانی میں نے سنا تھا۔

ابھی آزاد ہائی سکول کا کام زوروں پر تھا اور شاہ جی دن رات اسی میں مصروف تھے کہ امرتسر تشریف لے گئے ان کی ہمشیرہ کی شادی تھی۔ وہ ان کی تیاری کے لئے آئے تھے۔ امرتسر کے لوگوں نے نماز جمعہ کے بعد حضرت شاہ جی کا وعظ مسجد خیر الدین مرحوم میں رکھا یہ وعظ ان کی گرفتاری اور تین سال قید کا باعث ہوا۔ (۱) اس تقریر کا موضوع تھا حضرت موسیٰ علیہ السلام اور فرعون کی ٹکر۔ جس میں آخری شکست فرعون کی ہوئی۔ شاہ جی نے آزادیٔ ہند کی اس تحریک کا انجام انگریز حکومت کی موت اور اہل ہند کی فتح پر ختم کیا۔ شاہ جی کا طرز بیان اور پھر مضمون کی دلچسپی نے اہل امرتسر کو مبہوت کر دیا۔ اس کا اثر حکومت نے بھی لیا دفعہ ۱۲۴ الف کے تحت مقدمہ چلا کر تین سال قید سخت کی سزا دی۔ غالباً یہ پنجاب کا دوسرا مقدمہ تھا۔ اس سے قبل پانی پت کا مقدمہ چل رہا تھا۔ یہ تحریک آزادی کی آزمائش کا زمانہ تھا کہ جو بھی گرفتار ہو وہ مقدمہ میں نہ تو صفائی پیش کرے اور نہ وکیل کرے۔ صرف ایک بیان دے کر عدالت کا فیصلہ سن لے۔ اس وقت یہ بہت اہم بات تھی۔ اور شاہ جی کے لئے بھی یہ روز اول ہی تھا۔ مگر شاہ جی نے بیان میں چند آیات قرآنی تلاوت فرما کر بیان ختم کر دیا۔ اس کا اثر عدالت کے کمرہ میں ایسا ہوا جیسا ماحول ہی بدل گیا ہو۔ سزا کے بعد شاہ جی لاہور سنٹرل جیل میں پہنچا دیئے گئے جہاں کچھ نئے پولیٹکل قیدی پہلے سے موجود تھے۔ اس زمانے میں جیل کی خوراک خدا کی پناہ۔ آدمی کھا نہیں سکتا تھا۔ لاہور جیل کا داروغہ پنجاب کا مشہور جابر و ظالم جیلر تھا۔ جس کو نواب بیگ کے نام سے یاد کرتے تھے۔ جب وہ شخص جیل کے اندر داخل ہوتا تو خدا کو بھول جاتا تھا۔

شاہ جی کا بیان ہے کہ پہلے دن کھانے کی قطار میں بیٹھا تو دو روٹیاں اور دال لوہے کے ایک برتن میں ڈال دی۔ حال یہ تھا کہ اگر دونوں ہاتھ کھول کر وہ روٹی ہاتھوں پر نہ لی جاتی تو زمین پر دو ٹکڑے ہو کر گر جاتی۔ یہ روٹی چنے اور گندم کے آٹے کی ہوتی مگر اس میں آٹے سے زیادہ کچھ اور ہی ہوتا اور کچی رکھی جاتی۔ تاکہ وزن ٹھیک رہے میں نے دال کو دیکھا تو اس میں پانی زیادہ تھا۔ تب میں نے کوشش کی کہ پانی تھوڑا گرا دیا جائے کچھ دال کے دانے نیچے سے مل جائیں گے تو روٹی کھا سکوں گا۔ میں رفتہ رفتہ پانی گراتا گیا اور اس انتظار میں رہا اب دال نظر آتی ہے مگر سب پانی ختم ہو گیا اور دال نہ ملی۔ ادھر جیل کے بند ہونے کا وقت ہو چکا تھا۔ کوئی دوسری صورت سامنے نہ تھی نمک مرچ یا کسی دوسری چیز کا ملنا تو کار مشکل تھا۔ اس شام صرف صبر و شکر کے

۱۔ امرتسر میں شاہ جی کی گرفتاری کے بعد مولوی رحمت اللہ بٹالوی (جنہوں نے احرار کے سٹیج سے مرزائیت کے خلاف زبردست کام کیا) حوالات میں شاہ جی سے ملنے گئے تو شاہ جی نے فرمایا: مولوی رحمت اللہ! تم بھی یہاں آ جاؤ، تصوف و سلوک کی ساری منزلیں ایک ہی رات میں طے ہو گئی ہیں۔ (مدیر)

ساتھ صبح کرنی پڑی۔ اس کے بعد یہ قافلہ کچھ ماہ بعد پنجاب کے سرحدی ضلع میانوالی جیل میں منتقل کر دیا گیا۔

میانوالی ڈسٹرکٹ جیل

گاہ گاہ آراستہ ہوتے ہیں جلسے عیش کے
آنسوؤں کے ساتھ برسوں یاد آنے کے لئے

میانوالی جیل میں ایک کے بعد دوسرا بزرگ آزادی کی راہ اختیار کرتا ہوا پہنچتا رہا۔ اور یہ قید اہل علم و دانش کی اور سیاسی مفکروں کی مجلس بن گئی۔

گاندھی جی نے سول نافرمانی انفرادی طور پر شروع کی۔ میانوالی جیل میں مولانا سید عطاء اللہ شاہ بخاری، مولانا داؤد غزنوی، مولانا عبدالمجید سالک، مولوی اختر علی خاں صاحب، صوفی اقبال احمد انصاری پانی پتی، مولانا لقاء اللہ عثمانی پانی پتی، حضرت مولانا احمد سعید صاحب، عبدالعزیز انصاری، مولانا حبیب الرحمن لدھیانوی اور ان کے علاوہ مشہور کانگرسی بزرگ مولانا عبداللہ چوڑی والے۔ لالہ شنکر لال، دینش بندھو گپتا وغیرہ لوگ تھے۔ باقی والنٹیر کوئی ڈیڑھ سو کے قریب تھے۔ میں بھی ایک رضا کار کی حیثیت سے سزا یاب ہوا اور امرتسر سے میانوالی جیل میں ایک گروہ کے ساتھ پابجولاں بھیج دیا گیا۔ کچھ دن بعد میری پہلی ملاقات جناب شاہ جی سے ہوئی یہ ۱۹۲۲ء کے شروع کی بات ہے۔ مجھ جیسے نو آموز کے لئے یہ ماحول زندگی کا سرمایہ بنا۔ شاہ جی نے بکمال مہربانی مجھے قرآن کریم ناظرہ پڑھایا۔ (۱) میں بالکل نابلد اور جاہل نوجوان تھا۔ اُن کی فیض صحبت نے میری جیل کی زندگی میں تربیت فرمائی جس کا میں شکریہ ادا کرنے کے لئے الفاظ نہیں رکھتا۔ اس کے بعد زندگی بھر کے لئے ایک دلی تعلق قائم ہو گیا۔ جب کبھی امرتسر سے باہر دورے پر جاتے تو واپسی پر اپنے دورے کے خاص خاص واقعات مجھے بٹھا کر سناتے جو آج مجھے حفظ ہیں۔ ہم رہا ہوئے تو زمانہ بدل چکا تھا۔ کانگریس کی تحریک کو بند ہوئے دو سال گزر چکے تھے۔ اور ملک کے اندر فرقہ وارانہ سرگرمیاں جاری تھیں۔ خلافت اور کانگریس تحریک کے مقابلے میں رجعت پرست مسلمان اور ہندو میدان میں اتر چکے تھے جن کو کم و بیش حکومت کی معاونت حاصل تھی۔

اہل گجرات نے شاہ جی کا شاندار استقبال کیا۔ اور کوشش کی کہ وہ گجرات شہر میں ہی قیام کریں۔ مگر وہ اپنے امرتسر شہر میں ہی آکر مقیم ہوئے۔ شاہ جی ہندو مسلم اتحاد کے دل سے قائل تھے وہ کہا کرتے تھے کہ اگر کوئی سیاسی مقصد نہ بھی ہو تو بھی ایک اچھی شہری زندگی کے لئے نیک ہمسایہ کے طور پر ہمیں گزر بسر کرنی چاہیئے۔ وہ ۱۹۲۳ء سے لے کر ۱۹۲۷ء تک پنجاب خلافت کمیٹی کے ہی ممبر رہے اور قومی کاموں کے لئے وہ

۱۔ اسی جیل میں مولانا ظفر علی خان کے چچا راجہ غلام قادر، اختر علی خان اور مشہور پنجابی شاعر عبدالرحیم عاجز نے بھی شاہ جی سے قرآن کریم پڑھا۔ اس کے علاوہ امرتسر میں منشی احمد دین صاحب کی ہمشیرہ اور بیٹی نے بھی شاہ جی کی اہلیہ مرحومہ سے قرآن کریم پڑھا۔ (مدیر)

باہر دورے پر جاتے تھے۔ کیونکہ ان کی مانگ سارے ملک میں ہمیشہ رہتی تھی۔ جس کو وہ بخوبی پوری بھی نہیں کر پاتے تھے۔ شاہ جی مسلمانوں کے اندر رسومات قبیح کے سخت خلاف تھے اور اسی پر اپنی تقریروں میں زور دیتے جو شریعت حقہ کے خلاف تھیں بعض مقامات پر دولت مندوں سے اُن کا جھگڑا بھی ہو جاتا مگر وہ اپنی بات پر پہاڑ کی مانند قائم رہتے۔

خانقاہ ڈوگراں

اگر میں غلطی نہیں کرتا تو ایک آدمی بالکل غریب مفلوک الحال لاہور ہی میں شاہ جی کی خدمت میں حاضر ہوا اور خانقاہ ڈوگراں چلنے کے لئے شاہ جی کو مجبور کرنے لگا۔ وہ انکار کرتے تھے۔ مگر بعد میں پتہ چلا کہ وہ شاہ جی کو اپنے ساتھ ہی لے گیا۔ جب شاہ جی تیسرے دن واپس تشریف لائے تو انہوں نے حسب دستور مجھے یہ بتایا کہ:۔

"جب میں اس بستی پہنچا تو وہاں کسی کو معلوم نہ تھا کیونکہ مجھے لے جانے والا آدمی ہی بالکل اکیلا تھا اور بستی غالباً ساری کی ساری راجپوت مسلمانوں کی تھی جن کو مذہبی وعظ وغیرہ سے کچھ زیادہ لگاؤ نہ تھا۔ میں ایک مسجد میں ٹھہرا۔ اسی آدمی نے خود ہی ٹین بجا کر اعلان وعظ کیا۔ جلسہ کے لئے جو جگہ تجویز کی وہ ایک تکیہ تھا اور اس کے باہر ایک بڑا درخت تھا۔ اس کے نیچے انتظام کیا گیا۔ جب میں جلسہ گاہ میں پہنچا تو وہاں عجیب منظر تھا۔ کوئی پچاس آدمی زیادہ سے زیادہ ہوں گے اور کوئی سو گز کے فاصلہ پر ایک مداری اپنا کھیل وغیرہ دکھا رہا تھا۔ جہاں ڈیڑھ سو آدمی تھے۔ اس کیفیت کو دیکھ کر مجھے سخت مایوسی ہوئی اور میں سوچ میں پڑ گیا۔ کہ کیا کروں؟ یکایک مجھے خیال آیا کہ تو ہزاروں آدمیوں کی حاضری میں خوش ہو کر جذبہ کے ساتھ بولتا ہے مگر یہاں بھی تو خلق خدا ہی ہے۔ اگر اللہ کا پیغام ان چند آدمیوں کو سنائے گا تو کیا تیرا کچھ بگڑ جائے گا۔ اس خیال کا آنا تھا کہ میرے جسم میں زندگی کی ایک لہر دوڑ گئی۔ اور میں نے دل میں دعا کی کہ مولا کچھ سامان یہاں بھی کر دے کہ تیرے بندوں میں تیرا پیغام پہنچا سکوں۔ اتنے میں ایک پولیس والا آیا اس نے ایک مداری کو جو دور تماشا دکھا رہا تھا مار بھگایا۔ جو لوگ وہاں تھے وہ اب میری تقریر میں شامل ہو گئے۔ اب حاضری دو سو کے قریب ہو گئی۔ تب میں نے اپنے وعظ کا ڈھنگ بھی بدلا۔ آدھ گھنٹہ کے اندر اندر گاؤں کے بڑے بڑے زمیندار راجپوت سب کے سب آ کر اس وعظ میں شریک ہو گئے۔ تب میں نے تقسیم وراثت پر قرآن حکیم کا فیصلہ مسلمانوں کے سامنے رکھا۔ اور یہ بھی کہا کہ پنجاب کے زمیندار مسلمان جس میں سید، پٹھان، مغل، راجپوت، جاٹ سب شامل ہیں ۱۸۵۷ء سے لے کر آج تک جتنے بندوبست ہوئے ہیں ان سب نے قرآن سے انکار کر کے ہندو قانون یعنی رواج کو مانا ہے۔ ایسی حالت میں ہم میں سے کون مسلمان ہے اور کون نہیں اس کا فیصلہ تم کسی مفتی شرع سے جا کر کروالو۔

اس بحث کا شروع ہونا تھا کہ زمیندار طبقہ اٹھا اور آوازیں آنی شروع ہوئیں کہ:۔

"ایک مولوی ہماری بے عزتی کر رہا ہے" اس پر شاہ جی بھی حالت جنون میں تبدیل ہو گئے اور فرمایا کہ:۔

"قرآن حکیم کے مع مکمل قانون کا انگریز کی عدالت میں کھڑے ہو کر انکار کرنا وہ بھی اس زمین جائیداد کے لئے، جو اسی کی عنایت سے تمہارے پاس ہے۔ اس پر ناراض ہوتے ہو کہ ایک معمولی مولوی ہماری بے عزتی کر رہا ہے۔ تھوڑا سوچ لو میں لاہور سے چل کر آیا ہوں۔ اور ریل کا کرایہ میں نے اپنی جیب سے دیا ہے۔ واپسی کا میری جیب میں ہے۔ تمہاری مسجد کی روٹی میں نے کھائی نہیں پھر تمہارا مجھ پر دباؤ کیسا! رہا زمانہ جہالت کی یاد ذات پات کا سوال تم راجپوت یا جاٹ ہو تو میں سید ہوں۔ پھر بھی تم سے اونچا ہوں۔ ان سب باتوں کو چھوڑ کر جب میں اللہ کا کلام سنانے کے لئے کھڑا ہوا ہوں تو پھر جواب دہی تو اس کے سامنے ہے تمہاری ہستی ہی کیا ہے؟"

تین گھنٹے کی مسلسل تقریر کے بعد شاہ جی کی فتح ہوئی اور یہ طبقہ زمینداران سرنگوں ہوا۔ پھر تو شاہ جی کی حق گوئی اور جادو بیانی نے وہ منظر پیش کیا کہ آخر شاہ جی بھی خوش ہو کر اس بستی سے شام کو لوٹے۔

شاہ جی کی روزانہ زندگی کے واقعات کچھ اسی قسم کے ہیں۔ اور ہر واقعہ ایک سبق لئے ہوئے ہے۔ قدرت نے ان کو خاص کام کے لئے بھیجا تھا جو انہی کا حصہ تھا۔

شاہ جی کی شخصیت، ان کا جوش عمل، ان کی قربانیاں اور سب سے بڑھ کر ان کی ساحرانہ خطابت، تحریک آزادی وطن، اس کی پرورش اور ترقی کے لئے ایک بڑی مدد اور بیش قیمت اثاثہ تھی۔ ان کی زندگی کے روشن نقوش نہ صرف تاریخ کے صفحات بلکہ لاکھوں اور کروڑوں انسانوں کے دماغوں پر منقش ہو چکے ہیں۔

مولانا حفظ الرحمٰن سیوہارویؒ

آپ اپنی تقریروں کے ذریعے بہت عبادت کر لیتے ہیں **مرشد احرار شاہ عبدالقادر رائے پوریؒ**

شاہ جی! قدرت نے آپ کو لسان پیدا کیا ہے۔ اس میدان میں آپ کبھی بیٹھے نہیں رہیں گے۔

حضرت پیر سید مہر علی شاہ گولڑوی رحمہ اللہ

مجھے ان کے اخلاق و اخلاص کے علاوہ ان کے کمالات نے بھی عقیدت مند بنا چھوڑا۔ وہ ماہر اسرار کلام اللہ ہیں

مولانا خیر محمد جالندھریؒ

عبدالمجید سالکؒ

یارِ زنداں

۴ نومبر ۱۹۲۱ء کا ذکر ہے۔ میں دفتر "زمیندار" میں بیٹھا ہوا تھا کہ مولانا حامد حسین بیدل شاہجہان پوری آ گئے۔ اور کہنے لگے۔ اب تو شام ہو گئی۔ گھر نہیں چلتے؟ میں نے کہا۔ آپ دس منٹ بیٹھئے۔ میں ابھی فارغ ہوا۔ چنانچہ دس منٹ کے بعد میں بیدل صاحب کے ساتھ چل دیا۔ گھر پہنچا تو مردانہ میں بیدل صاحب کو بٹھا کر خود اوپر گیا اور چائے کے لئے کہہ آیا۔ ابھی چائے تیار نہ ہوئی تھی کہ نیچے سے منشی نذیر احمد سیماب (پبلشر زمیندار) نے مجھے پکارا۔ اور کہا ذرا سیڑھیوں میں آ کر میری بات سنیئے۔ میں نیچے اترا تو سیماب صاحب نے بتایا کہ مرزا غلام حسین انسپکٹر پولیس چند سپاہیوں کو ساتھ لے کر میرے مکان پر آئے انہوں نے مجھے گرفتار کر لیا ہے۔ اور آپ کو گرفتار کرنے آئے ہیں۔

چونکہ میں ہر روز اس دن کا متوقع تھا۔ اس لئے مجھے کوئی پریشانی نہ ہوئی۔ میں نے اوپر جا کر اچکن پہنی۔ گھر والوں کو اپنی گرفتاری کی خبر سنائی اور انہیں ہائے وائے کرتا ہوا چھوڑ کر نیچے اتر گیا۔ مرزا غلام حسین نے آگے بڑھ کر سلام کیا۔ مجھے تانگے میں بٹھایا اور تھانہ نولکھا کو چل دیئے۔ انسپکٹر صاحب نے ہمارے لئے چائے اور پیسٹری منگائی ہم کھانے پینے اور قہقہے لگانے میں مصروف ہو گئے۔ کوئی دو گھنٹے بعد مرزا صاحب نے فرمایا کہ اب آپ آرام فرمائیے۔ میں حوالات کی کوٹھڑی میں جو تھانے کی ڈیوڑھی میں ہے بند کر دیا گیا۔

صبح نو بجے مرزا غلام حسین انسپکٹر تشریف لائے۔ مجھے حوالات سے نکالا۔ نہایت "شفیقانہ تبسم" کے ساتھ مجھے ہتھکڑی لگائی اور تانگے میں سوار کرا کر عدالت میں لے گئے۔ وہاں دوست احباب جمع تھے۔ میں لالہ شنکر داس لوتھرا مجسٹریٹ کی عدالت میں پیش ہوا۔ جنہوں نے ایک منٹ میں سماعت مقدمہ کی آئندہ تاریخ مقرر کر دی۔ اور میں قیدیوں کی گاڑی میں سنٹرل جیل کو روانہ ہوا۔

وہاں پہنچا تو جیل کے دفتر میں داخل ہوتے ہی ایک بزرگ نظر آئے۔ معلوم ہوا کہ آپ مرزا نواب بیگ جیلر ہیں۔ آپ نے نگاہ اٹھا کر میری طرف دیکھا۔ اور کہا۔ ان کو حوالات میں لے جاؤ۔ حوالات میں پہنچا تو مجھے ایک کوٹھڑی میں داخل کر کے اس کا سلاخ دار دروازہ مقفل کر دیا گیا۔ منشی نذیر احمد سیماب شروع ہی سے میرے ساتھ تھے۔ وہ بھی ایک کوٹھڑی میں بند کر دیئے گئے۔

کچی مٹی کی کھڈی، کچا فرش، دیواروں پر مٹی کا پلستر، غرض جدھر نظر اٹھتی تھی خاکساری کا جلوہ نظر آتا تھا۔ دن بھر میں دو دفعہ قیدی کھولے جاتے تھے۔ یعنی ان کی کوٹھڑیوں کے قفل کھول کر انہیں اجازت دی جاتی تھی کہ احاطے میں گھوم پھر کر ہوا خوری کر لیں۔ اس وقت آپس میں ملاقات اور بات چیت ہوتی تھی۔ اور ہم ایک دوسرے کے حالات و خیالات معلوم کر لیتے تھے۔

مقدمے کی سماعت ہوئی۔ استغاثہ پیش ہوا۔ استغاثہ کے گواہ پیش ہوئے۔ الزام یہ تھا کہ ملزم نے

"زمیندار کے ایڈیٹر کی حیثیت سے ایسا مضمون لکھا۔ جس سے ملک معظم کی رعایا کے دو طبقوں (ہندوستانیوں اور انگریزوں) کے درمیان نفرت و حقارت پیدا ہوتی ہے (دفعہ ۱۵۳۔ الف تعزیرات ہند) مجھ سے پوچھا گیا۔ جرح کرو گے؟ عرض کیا نہیں۔ پوچھا گیا صفائی پیش کرو گے؟ جواب دیا نہیں۔ صرف ایک تحریری بیان داخل کروں گا۔ جس کے لکھنے کے لئے جیل میں تحریر کی سہولتوں کا طالب ہوں۔ مجسٹریٹ نے حکم دیا کہ سالک صاحب کو جیل میں قلم دوات کاغذ مہیا کر دیا جائے۔

جیل والوں نے یہ فیصلہ کیا کہ سیاسی قیدیوں کو زیادہ تر یکجا کر دیا جائے۔ اس کے بعد ان کے چالان مختلف جیلوں میں بھیج دیئے جائیں۔ چنانچہ ایک دن یورپین وارڈ سے مولانا سید عطاء اللہ شاہ بخاری، مولانا لقاء اللہ عثمانی پانی پتی، صوفی اقبال احمد پانی پتی، مولانا اختر علی خاں، راجا غلام قادر خان، سردار سردول سنگھ کولیشر، سردار منگل سنگھ، پنڈت نیکی رام شرما (بھوانی) اور ایک اور ہریانے کے ہندو جاٹ صاحب (جنکا نام بھولتا ہوں) ہمارے احاطے میں جمع ہو گئے اور خاصی چہل پہل ہو گئی۔

انہی دنوں میں نے اپنا تحریری بیان لکھ کر عدالت میں داخل کر دیا۔ لالہ شنکر داس لوتھرا نے مجھے ایک سال قید بامشقت کی سزا کا مژدہ سنایا۔ میں ان کا شکریہ ادا کرنے کے بعد موٹر کار میں بیٹھا اور سنٹرل جیل پہنچ گیا۔ اب حوالاتی نہ تھا بلکہ قیدی بن چکا تھا۔

اخلاقی قیدیوں کے حوالات سے چلے جانے کے بعد چونکہ سب کے سب سیاسی قیدی ایک جگہ جمع ہو گئے تھے۔ اس لئے میرے انسانی مطالعہ کا دائرہ محدود ہو گیا تھا۔ اب بابا گوردت سنگھ، لالہ لاجپت رائے، پنڈت سنتانم، ڈاکٹر گوپی چند بھارگو، سید عطاء اللہ شاہ بخاری اور ملک لال خان جیسے "سیاسی ڈاکو" پیش نظر تھے۔ ہم نے جیل کے حکام سے کہہ کر یہ انتظام کر لیا تھا کہ کوٹھڑیوں والی بارک میں تو خاص قسم کے سیاسی قیدی رکھے جاتے تھے۔ لیکن کھلی بارک میں ہم سب جمع کر دیئے گئے تھے۔ یہ کھلی بارک گویا ایک ہال تھی جس میں کوئی ایک سو قیدیوں کے رہنے کا بندوبست تھا۔ اور ان کے درمیان کوئی دیوار وغیرہ حائل نہ تھی۔

چند ہی روز گزرے تھے کہ معلوم ہوا۔ حکومت ہم میں سے چند آدمیوں کو میانوالی جیل بھجوانے کا فیصلہ کر چکی ہے۔ چنانچہ ایک دن رات کے وقت گیارہ آدمیوں کا ایک قافلہ تیار کیا گیا۔ اور ان کے بستر، ٹرنک اور دوسرا سامان باندھ کر رکھ دیا گیا۔ اس قافلے میں سید عطاء اللہ شاہ بخاری، مولوی لقاء اللہ عثمانی، صوفی اقبال احمد، اختر علی خاں، راجا غلام قادر خاں، میں اور نذیر احمد سیماب، سردار سردول سنگھ کولیشر، سردار منگل سنگھ، پنڈت نیکی رام شرما اور ایک ہرجانے کے جاٹ ہندو لیڈر۔ یہ گیارہ نفوس تھے۔

جب جیل کے بیرونی دروازہ پر پہنچے تو دیکھا کہ ایک بہت بڑا فوجی ٹرک کھڑا ہے اور پولیس کے بارہ تیرہ جوان ایک اینگلو انڈین انسپکٹر کے زیر سرکردگی موجود ہیں۔ ہمارا سامان بھی ٹرک میں رکھ دیا گیا۔ اور ہم بھی اسی میں سوار ہو گئے۔ لیکن اس سے پیشتر بطور حفظ ماتقدم دو دو آدمیوں کے ایک ہتھکڑی لگا دی گئی مثلاً میں اور نذیر احمد سیماب ایک ہتھکڑی میں تھے۔ میرا بایاں ہاتھ ان کے دائیں ہاتھ کے ساتھ ہتھکڑی میں جکڑا ہوا تھا۔ اور میرا دایاں ہاتھ اور ان کا بایاں ہاتھ آزاد تھے۔ یہ ٹرک رات کے نو بجے جیل سے روانہ ہوا اور جیل

روڈ، لٹن روڈ، لوئر مال سے ہوتا ہوا دریائے راوی کے پاس سے گزر کر بادامی باغ کے ریلوے اسٹیشن پر پہنچ گیا۔ اسٹیشن پر پہنچ کر ہم ٹرین میں سوار کرائے گئے۔ اور اس کے بعد ہر جنکشن پر پولیس کا ایک دستہ پلیٹ فارم پر حاضر ہو کر ہمارا جائزہ لیتا رہا۔ رات گزری اور صبح ہوئی۔

تیسرے پہر میانوالی کے ویران اسٹیشن پر پہنچ گئے۔ لیکن پذیرائی کے لئے کوئی پانچ چھ سو آدمی نعرے لگا رہے تھے۔ اور میانوالی کی پولیس نہایت اہتمام سے موجود تھی۔

جب میانوالی جیل کی عمارت سامنے نظر آئی تو دیکھا کہ اس کے باہر ایک چبوترے پر کوئی تیس بتیس نگ ہمارے سامان کے رکھے ہیں۔ اور جیل کا سپاہی پاس کھڑا پہرہ دے رہا ہے۔ جیل کا دروازہ کھلا۔ ہم اندر داخل ہوگئے۔ یہاں ایک وسیع احاطے میں کوئی پندرہ سولہ کوٹھڑیاں تھیں۔ جن میں سے گیارہ ہمارے حوالہ کر دی گئیں۔

انہی دنوں ہمیں معلوم ہوا کہ مولانا احمد سعید ناظم جمعیتہ العلماء، عبدالعزیز انصاری ایم۔ اے۔ ایل۔ ایل۔ بی (بارہ بنکی) اور سید حبیب بھی اسی جیل میں مقیم ہیں۔ اور عام قیدیوں کی طرح رہتے ہیں۔ ان کے ساتھ طعام و لباس میں کوئی رعایت نہیں کی گئی۔ یہ سن کر بے حد صدمہ ہوا۔ سپرنٹنڈنٹ صاحب سے ذکر کیا۔ چند روز جیل اور حکومت کے درمیان خط و کتابت ہوتی رہی۔ اور آخر یہ حضرات بھی سپیشل کلاس میں ہمارے ساتھ شامل کر دئے گئے۔

جیل میں ایک خاص احاطہ تھا۔ جس کے دو حصے تھے۔ ایک حصے میں صرف چار کوٹھڑیاں تھیں۔ اس کو منڈے خانہ (یعنی لڑکوں کا احاطہ) کہتے تھے۔ اور ایک حصے میں ایک بڑا اور کھلا کمرہ تھا۔ جس میں سات آٹھ قیدیوں کے لئے گنجائش تھی۔ چونکہ یہ کمرہ قید محض (یعنی بے مشقت) والے قیدیوں کے لئے مخصوص ہوتا تھا۔ اس لئے "محض کمرہ" کہلاتا تھا۔ یہ دونوں حصے ایک درمیانی دروازے سے ملے ہوئے تھے۔ اختر علی خاں، مولانا احمد سعید، مولانا داؤد غزنوی، عبدالعزیز انصاری، میں، عطاء اللہ شاہ بخاری، مولانا لقاء اللہ، صوفی اقبال، راجہ غلام قادر خاں، مولانا عبداللہ چوڑی والے دہلوی اور نذیر احمد سیماب "محض کمرے" اور منڈے خانے میں بھیج دیئے گئے۔ اور وہیں ہمارے باورچی خانے کا انتظام کر دیا گیا۔ سردار سردول سنگھ کولیشر، سردار منگل سنگھ اور ان کے دو ہندو ساتھی ہندو لیڈروں کے احاطے میں بھیج دیئے گئے۔ جس میں اب ڈاکٹر ستیہ پال، لالہ گردھاری امرتسری، لالہ ترلوک چند دیش، بندھو گپتا۔ (تیج) اور متعدد اور مشہور کارکن آگئے تھے۔

چند ہی ہفتوں میں میانوالی جیل سیاسی قیدیوں سے معمور ہو گیا۔ اور رضا کاروں کے احاطوں سے قومی نعروں کی دلآویز صدائیں بلند ہونے لگیں۔ پڑھے لکھے قیدیوں نے مطالعہ وغیرہ کا مشغلہ اختیار کیا۔ چنانچہ ہم لوگوں کا پروگرام یہ ہوتا تھا۔ صبح اٹھ کر ضروریات سے فارغ ہوئے۔ نماز باجماعت ادا کی۔ اور چائے پی۔ اس کے بعد میں اور عبدالعزیز انصاری، مولانا احمد سعید سے ادب عربی، صرف و نحو عربی اور منطق کا سبق لینے لگے۔ اختر علی خان اور راجہ غلام قادر خان سید عطاء اللہ شاہ بخاری سے قرآن صحیح کرنے لگے۔ مولوی لقاء اللہ عثمانی اپنی سازشوں اور چوریوں میں مصروف ہو گئے۔ یعنی فلاں فلاں مطلوبہ چیز کیونکر چوری چوری باہر سے منگائی

جائے اور فلاں فلاں پیغام فلاں شخص کو کس تدبیر سے پہنچایا جائے۔ مولوی لقاء اللہ نماز میں ہم سب کے پیش امام بھی تھے۔ اور یہ "چوری چھپے" کے کام بھی انہی کے سپرد تھے۔ چنانچہ میں نے ان کا لقب "امام السافلین" مقرر کیا تھا۔

سید حبیب بعض وجوہ سے ہمارے ساتھ نہ ٹھہر سکے۔ اس لئے دوسرے احاطے میں چلے گئے تھے۔ ایک زمانے میں وہ مولانا داؤد غزنوی کو انگریزی پڑھایا کرتے تھے اور مولانا داؤد سید حبیب کو عربی پڑھاتے تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ان کو انگریزی آئی نہ ان کو عربی۔

خیر میں دن بھر کا پروگرام عرض کر رہا تھا۔ صبح ہم تھوڑی سی "مشقت" بھی کرتے تھے۔ یعنی چرخے پر پانچ تار کا سوت (صرف بقدر دو چھٹانک) دری بانی کے لئے بٹ دیا کرتے تھے۔ یہ کوئی بیس منٹ کا کام تھا۔ اس سے فارغ ہونے کے بعد تعلیم و تعلم کا سلسلہ ایک بجے تک جاری رہتا تھا۔ اس وقت مولانا عبداللہ چوڑھی والے للکار کے کہتے "ارے بھئی کھانا تیار ہے" اگرچہ ہمارا کھانا پکانے پر مشقتی قیدی مقرر تھے لیکن ہم نے باورچی خانے کا چارج مولانا عبداللہ کو دے رکھا تھا۔ اور انہوں نے اپنے فرائض مفوضہ کو جس خوبی اور خوش اسلوبی سے انجام دیا وہ انہی کا حصہ تھا۔ انہوں نے اپنی مہارت فن سے دہلی کے وہ وہ کھانے پکا کر ہمیں کھلائے کہ "جیل کو دیکھ کر گھر یاد آگیا" سب اکٹھے بیٹھ کر لطف کے ساتھ کھانا کھاتے اور پھر قیلولہ فرماتے۔ نماز ظہر اور نماز عصر کے بعد چائے کا دوسرا دور ہوتا۔ مغرب کے بعد کھانا کھایا جاتا۔ عشاء کے بعد بھی دیر تک بحث مباحثے جاری رہتے۔ کبھی کبھی قوالی بھی ہوتی تھی۔ جس میں اختر علی خان گھڑا بجاتے۔ صوفی اقبال تالی بجا کر تان دیتے۔ سید عطاء اللہ شاہ بخاری غزل گاتے، مولانا احمد سعید شیخ مجلس بن کر بیٹھتے اور مولانا داؤد غزنوی اور عبدالعزیز انصاری حال کھیلتے! غرض ہم لوگوں کے مشاغل صوم و صلوٰۃ۔ تلاوت قرآن، تعلیم و تعلم اور تفریح و تفنن کے تمام پہلوؤں سے مکمل تھے۔ لیکن بعض اوقات قوالی میں اتنا غلغلہ اور ولولہ ہوتا کہ دوسرے دن ہمارے ہمسائے یعنی پھانسی کی کوٹھڑیوں والے قیدی سپرنٹنڈنٹ جیل سے شکایت کرتے کہ حضور ہمیں یہاں سے کہیں اور بھیج دیجئے۔ یہ "مولبی لوگ" ہمیں ساری رات سونے نہیں دیتے۔

یوں تو سبھی احباب شفیق اور محبت پرور تھے۔ مگر مولانا احمد سعید بے تکلف دوست ہونے کے علاوہ عربی میں میرے استاد بھی تھے۔ عبدالعزیز انصاری بڑے قابل اور مخلص انسان اور تحصیل عربی میں ہمارے ہم سبق تھے۔ لقاء اللہ عثمانی، صوفی اقبال احمد، اختر علی خاں سبھی سے برادرانہ تعلقات تھے۔ لیکن جو خصوصیت سید عطاء اللہ شاہ بخاری سے تھی وہ اپنے رنگ میں مثال نہ رکھتی تھی۔ شاہ جی اس زمانے میں شعر تو نہ کہتے تھے لیکن اردو اور فارسی میں شعر فہمی اور سخن سنجی کا ملکہ خصوصی رکھتے تھے۔ اس کے علاوہ ان کی شگفتگی طبع ان کا خلوص ان کی محبت پروری بے مثال تھی۔ بارہا ایسا ہوا کہ رات کے وقت دوسرے احباب خواب غفلت میں بڑے خراٹے لے رہے ہیں اور میں اور شاہ جی جو باتیں کرنے لگے تو رات کے تین بج گئے۔ خدا جانے وہ کون سے موضوع تھے جن پر اس قدر طویل گفتگوئیں ہوتی تھیں۔ لیکن دلچسپی کا یہ عالم تھا کہ وقت گزرتا جاتا تھا اور ہمیں احساس تک نہ ہوتا تھا۔

جیل کی زندگی میں لطیفوں کی کمی نہ تھی۔ ایک دن شاہ جی نے قصہ سنایا کہ پٹنہ میں ایک مولوی صاحب وعظ فرما رہے تھے۔ جس میں

لاتنا بزو بالالقاب

کی تفسیر کے سلسلے میں انہوں نے یہ بھی فرمایا کہ کسی کی چڑ مقرر نہ کرنی چاہیئے۔ یعنی کوئی ایسی بات نہ کہنی چاہیئے جس سے دوسرا شخص چڑ جائے۔ مجلس وعظ میں ایک مقامی تحصیلدار صاحب بھی بیٹھے تھے۔ انہوں نے پاس بیٹھے ہوئے ایک صاحب سے کہا کہ لوگ یونہی چڑ جاتے ہیں۔ اگر کوئی شخص کسی کو چڑانے کی کوشش کرے اور وہ نہ چڑے۔ تو کوئی بات ہی نہیں۔ مخاطب نے جواب دیا "نہیں حضرت چڑ کی بات سے آدمی چڑ ہی جاتا ہے۔ اس سے تغافل کرنا بڑا مشکل ہے۔ تحصیل دار صاحب قائل نہ ہوئے تو دوسرے شخص نے خاموشی اختیار کرلی۔

دو چار منٹ گزرے تھے کہ اس شخص نے تحصیل دار صاحب سے پوچھا کیوں صاحب آپ کے ہاں شلجم کا اچار ہے؟ جواب ملا نہیں۔ صاحب میرے ہاں شلجم کا اچار نہیں ہے۔ کوئی دو منٹ کے بعد اس نے پھر سوال کیا کیوں صاحب آپ کے ہاں شلجم کا اچار ہے؟ تحصیل دار صاحب نے جواب دیا "میں عرض کر چکا ہوں کہ نہیں ہے" یہ "بہت خوب" کہہ کر پھر چپ ہو گئے۔ لیکن ابھی پانچ منٹ بھی نہ گزرے تھے کہ پھر پوچھا "تحصیلدار صاحب آپ کے ہاں شلجم کا اچار تو ہوگا" اب تحصیل دار صاحب برہم ہوگئے اور کہنے لگے "کیا آپ نے مجھے مسخرا مقرر کر رکھا ہے۔ تین دفعہ تو کہہ چکا ہوں کہ شلجم کا اچار نہیں ہے۔ لیکن آپ برابر وہی پوچھے جا رہے ہیں۔ اس شخص نے معافی مانگی اور خاموش ہو گیا۔ لیکن ابھی دو ہی منٹ ہوئے تھے کہ اس نے پھر وہی سوال دہرایا۔ کیوں صاحب آپ کے ہاں شلجم کا اچار ہے؟

اب تحصیلدار صاحب کے ضبط کا پیمانہ چھلک گیا۔ کہنے لگے "عجیب بد تمیز ہو تم۔ یہ کیا بکواس ہے شلجم کا اچار ہے؟ شلجم کا اچار ہے؟" ساری مجلس وعظ ان کی طرف متوجہ ہو گئی۔ مولوی صاحب نے وعظ روک دیا۔ اور اس شخص نے فقط اتنا کہا کہ صاحب میں نے تو صرف یہ پوچھا تھا کہ شلجم کا اچار۔۔۔۔۔ تحصیل دار صاحب نے جوتا پکڑ لیا اب آگے آگے وہ شخص اور پیچھے پیچھے تحصیل دار صاحب بھاگتے ہوئے مجلس وعظ سے نکل کر بازار میں پہنچ گئے۔ وہ شخص بار بار پیچھے مڑ کر پوچھتا شلجم کا اچار شلجم کا اچار ہے؟ تحصیل دار صاحب گالیاں دیتے ہوئے اس کو مارنے دوڑتے یہاں تک کہ "شلجم کا اچار" شہر بھر میں مشہور ہو گیا۔ تحصیل دار صاحب جدھر سے گزرتے لوگ بہانے بہانے شلجم کے اچار کا ذکر چھیڑ کر ان کو چڑاتے اور وہ چڑ کر گالیاں بکتے۔

لطیفہ نہایت دلکش تھا۔ دن بھر یاروں میں اس کا چرچا رہا۔ تین چار دن کے بعد دوستوں نے سازش کی۔ کہ سید عطاء اللہ شاہ بخاری کو چڑایا جائے۔ چنانچہ سب سے پہلے صوفی اقبال احمد شاہ جی کی کوٹھڑی کے سامنے پہنچے اور انگشت شہادت سے اشارہ کر کے پوچھا "شاہ جی آپ کے پاس پن ہو گی؟" شاہ جی نے کہا نہیں بھائی میرے پاس پن نہیں ہے۔ کوئی ایک منٹ بعد اختر علی خاں پہنچے۔ اور اسی طرح انگشت شہادت کی پور سے

اشارہ کر کے پوچھا۔ کیوں شاہ جی آپ کے پاس پن ہو گی؟ شاہ جی نے ان کو بھی یہی جواب دیا کہ پن نہیں ہے۔ دو منٹ کے بعد ایک اور صاحب پہنچے "شاہ جی پن ہے؟" اب شاہ جی کے مزاج کا پارہ چڑھنے لگا۔ باہر نکل آئے اور کہنے لگے کیا تم سب کے ٹانکے ادھڑ چکے ہیں۔ کہ باری باری آ کر پن مانگتے ہو؟ اتنے میں ایک اور دوست پہنچ گئے اور نہایت متانت سے فرمانے لگے۔ شاہ جی آپ کے پاس پن ہو گی؟ شاہ جی نے انہیں بری طرح ڈانٹا اس کے بعد جو ہر طرف سے "شاہ جی پن ہے؟" کے سوالات شروع ہوئے تو شاہ جی غصے میں آ گئے اور مغلظات تک سنا دیں۔ خیر ہم نے بڑی کوشش اور خوشامد درآمد سے ان کے غصے کو ٹھنڈا کیا۔ اور بتایا کہ ہم تو صرف شلجم کے اچار والے لطیفے کو دہرا رہے تھے۔

ایک دن صوفی اقبال احمد پانی پتی (جو انگریزی بالکل نہ جانتے تھے) مجھ سے کہنے لگے "سالک صاحب یہ اختر علی خاں بڑا ڈھنجرس آدمی ہے" میں نے پوچھا "ابے ڈھنجرس کیا ہوتا ہے"؟ نہایت معصومانہ انداز سے پوچھنے لگے "بھلا خطرناک" کو انگریزی میں کیا کہتے ہیں؟ میں تو مارے ہنسی کے لوٹ گیا۔ اور یہ لطیفہ بھی احباب میں عام ہو گیا۔ اب ہم سب ڈینجرس کی جگہ "ڈھنجرس" ہی کا لفظ استعمال کرتے تھے۔

جیل میں ہم لوگوں میں سے اولیں رہا ہونے والے مولانا احمد سعید دہلوی تھے۔ میرا بھی قید کا سال ختم ہو رہا تھا۔ آخر رہائی کا دن آن پہنچا۔ میں ان دوستوں سے بچشم نم رخصت ہوا۔ اگرچہ رہائی کی خوشی تھی لیکن دوستوں کے جس جمگھٹے کو چھوڑ کر جا رہا تھا اس کے دوبارہ ملنے کی مدت العمر توقع نہ تھی۔ کیونکہ ایسا اتفاق کہاں ہوتا ہے کہ چند ہم مذاق اور مخلص احباب جمع ہوں۔ اور سال بھر یکجا رہیں۔ اور پھر یکجائی کا بھی یہ عالم کہ چوبیس گھنٹے ایک ہی جگہ رہنے پر مجبور ہیں۔ ہنستے ہیں کھیلتے ہیں۔ پڑھتے ہیں لکھتے ہیں۔ لڑتے بھڑتے بھی ہیں۔ لیکن چند لمحوں میں من بھی جاتے ہیں۔ جیل کی یکجائی میرے نزدیک ہم جماعت طلبہ کی یکجائی سے بھی زیادہ مکمل ہوتی ہے۔ ہم جماعت ایک دوسرے کو بھول جائیں تو بھول جائیں۔ یاران زنداں ایک دوسرے کو ہرگز فراموش نہیں کر سکتے۔

برجستگی

امیر شریعت رحمہ اللہ ۱۹۵۲ء میں تحریکِ تحفظِ ختمِ نبوت کے سلسلہ میں کراچی تشریف لے گئے۔ ریڈیو پاکستان کے مقابل مجلس احرارِ اسلام کے دفتر میں قیام تھا۔ ایک روز صبح ہی صبح عبدالمجید سالک اور مجید لاہوری (مرحومین) دفتر چلے آئے۔ شاہ جی اوراد و وظائف میں مشغول تھے۔ سالک نے چھوٹتے ہی پھبتی کسی:

برزباں تسبیح و در دل گاؤ خر

(زبان پر اللہ کی پاکی کا بیان اور دل میں گائے اور گدھے کا دھیان!)

شاہ جی نے تسبیح مکمل فرمائی اور برجستہ فرمایا "میں تم دونوں کا ہی تصور کر رہا تھا"۔

تین چیزیں

دنیا میں تین چیزیں حقوق العباد کی بنیاد ہیں- جان، مال، آبرو- اور ان تینوں کے متعلق (علی الترتیب) دنیا میں کوئی شخص اس بات کا دعویٰ نہیں کر سکتا کہ میرے ہاتھ سے اس کو آزار پہنچا ہو- ہتھیار تو خیر بڑی چیز ہے- میں نے آج تک کسی شخص کو ایک تھپڑ بھی نہیں مارا- رہا مال، سو اس کے متعلق بھی کوئی شخص یہ دعویٰ نہیں کر سکتا کہ میں نے اس کا روپیہ، پیسہ غصب کیا ہو یا امانت میں خیانت کی ہو، یا لے کر واپس نہ کیا ہو- اگرچہ یہ تو ہوا ہے کہ میں نے کچھ دے کر واپس نہیں لیا- اور اب بھی اگر دنیا داروں کی طرح سوچوں تو ہزاروں نہ سہی- دو چار سو کی معمولی رقم کسی نہ کسی کے ذمہ نکل ہی آئے گی- خود میں فقیر ہوں- میرے پاس تو کیا ہوگا- البتہ آج سے نہیں ہمیشہ سے ہی لوگوں کے روپے پیسے اور جماعتی امانتوں کا بحمد اللہ کفیل اور محافظ رہا ہوں اور کہہ سکتا ہوں کہ

انی لقوی امین

سب سے آخری اور سب سے زیادہ نازک چیز انسان کی عزت و آبرو ہوتی ہے- تو الحمد اللہ! کہ آج تک میری آنکھ میلی نہیں ہوئی اور دنیا میں کسی کی ماں بہن یا بہو بیٹی کی عزت و آبرو کو میری ذات سے گزند نہیں پہنچا- حالانکہ جہاں میں جوان ہوا وہاں شب و روز لوگوں کے ننگ و ناموس سے میرا واسطہ تھا- لیکن ان کو ہمیشہ ماں، بہن اور بیٹی ہی سمجھا- کہا اور بنا کے رکھا- الحمد للہ کہ اس وقت ملک بھر میں میری ہزاروں مائیں بہنیں اور لاکھوں بہو بیٹیاں ہیں اور میں اپنی اولاد ہزاروں بھانجوں، بھتیجوں، نواسوں اور پوتوں والا ہوں اور اس میں میری کوئی خوبی نہیں- میں یہ نہیں کہتا کہ میں متقی اور پارسا تھا- یا ہوں بلکہ سیدھی سادی بات یہ ہے کہ مجھے اپنے باپ دادا کی عزت کا پاس تھا اور ہے- مجھے تو ان کی پگڑی کی لاج رکھنی تھی تا کہ یہ نہ کہا جائے کہ خاندان سادات بخارا کا لڑکا سید نور الدین کا پوتا اور حافظ سید ضیاء الدین کا بیٹا ایسا ویسا نکلا اور اس کے بدلہ میں نیکوں کا یہ گھرانہ بدنام ہو- باقی اللہ کا خوف تو بڑی بات ہے- اور خوش قسمت ہے وہ جسے یہ چیز حاصل ہو- سو الحمد للہ کہ اس بارہ میں انگلی سے غیر محرم کو چھونے اور نگاہ تک غلط نہ ہونے کی بھی قسم کھا سکتا ہوں!

امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاری

(بحوالہ سواطع الالہام)

وہ جس کے فقر سے لرزاں بتِ سرمایہ داری ہے

وہ جس کے فقر سے لرزاں بتِ سرمایہ داری ہے
امیرِ ملتِ بیضا، عطاء اللہ بخاری ہے
شرف بخشا خدا نے جس کو حق کی پاسبانی کا!
پڑھایا درس دنیا کو حیاتِ جاودانی کا
کبھی باطل کے آگے جھک نہیں سکتی جبیں جس کی
دلوں میں گھر بنا لیتی ہے تقریرِ حسیں جس کی
جسے نغمہ سرائے باغِ ختم المرسلیں کہیئے
جسے شیدائے روئے رحمت اللعالمیں کہیئے
نہاں ہے جس کی آنکھوں میں خمارِ بادۂ ہستی
رہینِ ساغرِ کوثر ہے جس کی شانِ سرمستی
نظر ہے جس کی اسرارِ کلام اللہ سے واقف
جہادِ حریت کی روح، رسم و راہ سے واقف
رہا برسوں جو پابندِ جفائے قیدِ جسمانی
بلاشک عصرِ حاضر کا وہی ہے یوسفِ ثانی
نمایاں جس کے چہرے پر جلالِ حیدری اب تک
ہویدا جس کے رخ پر ہے جمالِ سروری اب تک
ودودِ ناتواں کی پوری یارب التجا کر دے
عطاء اللہ کے قدموں پہ اپنی جاں فدا کر دے

ودود علی خان۔ رئیس کیلاش پور (سہارنپور)

شاعرِ احرار، حضرت علامہ انور صابری رحمۃ اللہ علیہ (انڈیا)

کمالاتِ علمیہ و سیاسیہ کا پیکر

امیر شریعت حضرت مولانا سید عطاء اللہ شاہ صاحب بخاری رحمۃ اللہ علیہ کی ذات گرامی کے ساتھ تقریباً ۲۵ سال اس طرح سے گزرے کہ مسلک و مذہب کے ساتھ ساتھ سیاسی جدوجہد میں بھی مکمل ہم آہنگی نصیب رہی۔ میں ۱۹۳۰ء میں پہلی بار ان سے جمیعتہ علماء کانفرنس اودھ میں ملا تھا۔ اس وقت ان کی گرفتاری کے وارنٹ جاری ہو چکے تھے۔ اور وہ پورے ملک کا دورہ کرنے کا عہد کر کے پنجاب سے چلے تھے۔ کانگریس میں غیر مشروط شرکت کی تجویز زیر بحث تھی۔ مولانا سید مرتضیٰ حسن چاند پوری اس گروہ کے ہم نوا تھے جو ہندوؤں کے شانہ بشانہ اشتراک ہی کو مناسب نہ سمجھتے تھے۔ دو دن تک اپنے اپنے نقطہ نگاہ کی وضاحت میں علماء کی تقاریر ہوئیں اور شبانہ روز غور و فکر کے بعد اصل تجویز کا مسودہ ترتیب دیا گیا۔

استبداد فرنگ اس اجلاس کو اپنے مفاد کے خلاف بغاوت سے تعبیر کرتا تھا۔ اُس نے پورے جابرانہ جاہ و جلال کا مظاہرہ کیا۔ فوجی طاقت کی نمائش کی گئی۔ موت و حیات کی کشمکش بروئے کار آئی۔ جلسہ عام کی صدارت کا مسئلہ سامنے آیا تو اکثر بزرگوں کی طبیعتوں میں اضمحلال کے آثار پائے گئے۔ آخر شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی قدس سرہ کے بستگانِ زلفِ محبت کی تقریر نے گریبان کھولے اور مولانا مسند پر صدارت جلوہ افروز محبت ہوئے۔ مجاہد ملت مولانا حفظ الرحمٰن نے تجویز پیش کی۔ تائید کے لئے شیر نیشان رسول بخاری اٹھے کئی گھنٹے انہوں نے وضاحت مقصد میں صرف کئے۔ اوقاتِ نماز کے علاوہ عوام کا بیخود و سرمست اجتماع تھا اور صدارت و تقریرِ تائید حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے دو نواسوں کے سپرد تھی۔

حضرت مولانا مدنی کی چشم مبارک میں جو سرور آمدن دیکھا گیا۔ پھر کبھی نصیب نہ ہوا۔ ارباب حال محسوس کرتے تھے کہ اودھ سے مدینہ تک درمیانی فاصلے باقی نہیں ہیں۔ جبر استعمار کے خلاف مجاہدانہ ماحول تیار ہو گیا۔ عطاء اللہ شاہ کی زبان سے الفاظ نہیں شعلے برس رہے تھے۔ ان کی طباشیری آنکھیں بادہ آشایان کوثر و تسنیم کی طرح گہری سرخ تھیں۔ سننے والوں کی روحوں کا حال کچھ نہ پوچھئے۔ ہر لب پر صدائے تحسین اور ہر آنکھ میں اشکِ ایمان تھے۔

مبارک تجویز۔ مبارک صورت۔ مبارک تحریک اور مبارک تائید کے بعد بالاتفاق منظور ہوئی۔ سی۔ آئی۔ ڈی کے ذمہ دار افسران پنڈال کے چاروں طرف تاک میں تھے۔ لیکن فرزند اسد اللہ، بخاری سب کی آنکھوں میں دھول جھونک کر نکل گیا۔ ڈولی کا پہلے سے انتظام تھا۔ حکیم حسن مثنیٰ صاحب نے قابل داد انداز میں یہ سب کچھ کیا۔ پردہ دار ڈولی میں شاہ جی نور پور اسٹیشن تک تشریف لے گئے۔ وہاں سے مراد آباد کی گاڑی میں سوار ہوئے اور بہار تک اعلائے کلمۃ الحق فرماتے گئے۔

ان کی تقریر نہ تھی۔ ساحرانہ فنکاری کا مخلصانہ گہوارہ تھی۔ مجھے ان سے عشق ہو گیا۔ اور میں نے طے کر لیا کہ اب انہیں کے نقش قدم پر چل کر ملک و ملت کی خدمت میرا فرض ہو گا۔ چنانچہ سترہ سال اسی سفر حیات میں گزرے میرے شاعرانہ ذوق کی پروردگی کا اولین شرف بھی انہیں سے وابستہ رہا۔ نفس میں پاکیزگی، احساس اور شعور میں پختگی بخاری ہی کی رہین منت ہے۔

بار بار ان سے ملاقاتیں ہوتی رہیں۔ حلقۂ احرار کی تاریخ اگر مرتب کی جائے تو اس کی مجموعی قربانی کا نام سید عطاء اللہ شاہ بخاری ہو گا؟۔ ورکنگ کمیٹی کی میٹنگ ہو یا کوئی کانفرنس کچھ نہ کچھ وقت شاہ جی ہم کفش برداروں کے لئے ضرور نکال لیتے تھے۔

نواب زادہ نصر اللہ خاں، عبدالرحیم عاجز، آغا شورش کاشمیری شعر و ادب کی فضا پیدا کرتے تھے۔ میں بھی اپنی بے بضاعتی کے باوجود نذرانۂ شعر و سخن سے گریز نہ کرتا تھا۔ حضرت شاہ جی پر وجد کی کیفیت طاری ہو جاتی تھی کفایت قرآن تفہیم دین اور اسرار سیاست سے واقفیت تامہ کے ساتھ ادب و فن پر بھی ان کی گہری نگاہ تھی۔ محاسن و معائب دونوں پر عبور حاصل تھا۔

پشاور، گوجرانوالہ، لاہور، لائل پور (فیصل آباد)، امرتسر، لدھیانہ، سہارن پور، مراد آباد، لکھنؤ، کانپور، جونپور، علی گڑھ اور دلی کی احرار کانفرنسوں میں کئی کئی راتیں ایسی گزریں جن میں فقر و استغناء کی مکمل پاس داری شامل حال رہی۔ اور عشاء کے بعد سے صبح کی نماز تک مسائل در مسائل پر درس حیات ملتا رہا۔ ان کو اپنے ہزاروں فدائیوں کے نام حلیے اور پتے یاد رہتے تھے۔ ہر شخص کے مزاج میں دسترس تھی۔ جو جس طبعیت کا تھا۔ اس سے اسی کے مناسب احوال مذاق جاری رہتا تھا۔ قدرت نے صدیوں کی تیاری کے بعد انہیں کئی کمالات علمیہ و سیاسیہ سے نواز کر پیدا کیا تھا۔ کلام اللہ کی حکمتوں کو یوں سمجھتے تھے گویا مشکوٰۃ نبوۃ سے تنویر صرف انہیں براہ راست ملی ہے۔ احرار کے دماغوں میں حکومت الٰہیہ کا مفہوم انہوں نے ہی بھرا۔ اور بلالحاظ مذہب و ملت ہر انسان کی خدمت کو احرار کا نصب العین بنا کر انسانیت کی وہ خدمت انجام دی جسے کبھی بھلایا نہ جا سکے گا۔ بلند مرتبہ اجتہادی شان اور مقبولیت عوام کے اونچے معیار کے باوجود عجز و انکسار کا دامن سنبھالے وہ درویشانہ زندگی بسر کرتے رہے۔ دنیا کی کوئی نقرئی فریب کاری انہیں متاثر نہ کر سکی۔

آزادئ وطن کے حصول اور ختم نبوت کی حفاظت کے لئے جو شاہراہ کار انہوں نے متعین کر لی تھی آخری سانس تک اسے نباہتے رہے۔

حضرت علامہ انور شاہ سے تقدس و فراست، مولانا مدنی سے جرأت گفتار و کردار، اور فخر اکابر حضرت مولانا شاہ عبدالقادر صاحب رائے پوری رحمۃ اللہ سے تزکیہ قلب اور تصفیہ روح کی جس قدر وافر سعادتیں ان کے حصہ میں آئیں وہ ان سب امانتوں کے سچے نگہدار اور ثابت قدم پاسبان رہے۔

سیاست جب کسی نازک موڑ پر پہنچی تو ارباب سیاست کی مشکلوں کا حل انہوں نے ہی تلاش کیا۔ قید و بند کی فضائیں نصیب ہوئیں۔ تو وہاں بھی ہونٹوں کا تبسم اور چہرہ کی بشاشت کبھی کم نہیں ہوئی۔

میری اور ان کی آخری ملاقات اس وقت ہوئی جب پاکستان بنے کئی سال گزر چکے تھے۔ اور وہ ملتان میں ایک پرانے مٹی کے گھروندے کو حقیر فقیر سمجھ کر قیام پذیر تھے۔ فالج کا اثر کافی تھا۔ میری آواز سن کر بیتاب ہو گئے اور دیر تک گلے لگائے روتے رہے۔ فرمانے لگے۔

"میری جان تو کب آیا ہے صدیوں کے بعد مل رہا ہے۔ تیرے دیکھنے کی حسرت تھی۔ خدا نے پوری کر دی۔ افسوس ملکوں کے ساتھ روحیں بھی تقسیم ہو گئیں"۔

میں نے چند تازہ غزلیں سنائیں۔ انکی مقدس پلکوں پر تاثر کے بیش بہا موتی رقص کرتے رہے۔ میری دل کی تکلیف کا حال معلوم ہوا تو فرمانے لگے۔

"آفتاب کو رو چکا۔ کوثر قریشی کا غم ابھی تک تازہ ہے۔ کمبخت، علاج سے غافل نہ رہنا۔ اگر تو بھی ان کو مفارقت دے گیا تو پھر قیامت ٹوٹے گی"۔

میں نے عرض کیا قبلہ، زندگی کی ضرورت تو آپ کے لئے ہے جس کی زندگی لاکھوں مردہ دلوں کو زندگی بخشتی ہے۔

مجھے کیا خبر تھی کہ یہ ملاقات بالکل آخری ملاقات ہو گی۔ "اب شیون و فریاد" کے سوا کوئی شعلہ حیات نہیں۔ ایک نظم نہیں ہزاروں نظمیں ان کے مرقد مبارک پر حاضر ہو کر نذر کرنا چاہتا ہوں مگر خدا کی قسم ہوش و حواس جواب دے چکے ہیں۔ برادر عزیز عطاء المنعم کو تعزیتی خط لکھوں تو کیوں کر لکھوں۔ زندہ جاوید شاہ جی کو مردہ کیسے کہوں"؟ (بربادِ غم، انور صابری)

ان کی پاکیزہ نورانی صورت ان کی پاکیزہ سیرت کی ترجمان تھی — **مولانا قاری محمد طیب** قاسمی۔

ان کی موت سے علماء کی صف میں پیدا ہونے والا خلا مدتوں پر نہ ہو گا

مولانا **مفتی محمد شفیع** (مفتی اعظم پاکستان)

ایک ایسی شخصیت جس نے ایسا کام کیا جو ایک صدی میں ایک ادارے سے بمشکل ہو سکے

مولانا سید محمد یوسف بنوری

ان کو حق تعالیٰ نے وہ ملکہ عطا فرمایا تھا کہ جس بات کو بیان کرنا چاہتے سننے والے کے دل میں اتار دیتے

فقیہ العصر **مفتی جمیل احمد تھانوی**

شاہ جی امیرِ جہاد ہیں۔ — مولانا محمد ابراھیم میر سیالکوٹی

حضرت شاہ جی، جو دینی مآثر، بالخصوص قادیانیت کی گمراہی سے لوگوں کو نکالنے کو چھوڑ گئے ہیں۔ اُن کے صدقاتِ جاریہ اور دائمی ثواب ہیں۔ — شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا: (سہارنپور)

بخاری تقریر کر رہا ہے

رفو گرانِ پیمبری کی تمام محنت اُدھڑ رہی ہے
عروسِ شب کی سیاہ زلفوں سے گردِ ایام جھڑ رہی ہے
ہواؤں کو مار پڑ رہی ہے فضاؤں کو مار پڑ رہی ہے
زمانے کی ہر فریب ناکی سے اب ملمع اُتر رہا ہے
بخاری تقریر کر رہا ہے

حدیثِ مولا بھی کہہ رہا ہے وہ ذکرِ لیلیٰ بھی کر رہا ہے
وہ ہاتھ جس میں کتاب بھی ہے وہ ہاتھ ساغر بھی بھر رہا ہے
پرانی شیرازہ بندیوں کا طلسم باطل بکھر رہا ہے
"جہانِ نَو ہو رہا ہے پیدا اور عالم پیر مر رہا ہے"
بخاری تقریر کر رہا ہے

مہکتی شامیں ہیں گیسوؤں میں جبیں پہ صُبحیں ڈھلک رہی ہیں
اور آستیں سے قرونِ اولیٰ کی داستانیں ٹپک رہی ہیں
خرد کی ہچکی بندھی ہوئی ہے جنوں کی نبضیں دھڑک رہی ہیں
خدا مری سادگی کو سمجھے کہ جیسے الہام اُتر رہا ہے
بخاری تقریر کر رہا ہے

یہ داستانِ حرم کے ٹکڑے، یہ نغمہ و حق کی نے نوازی
یہ بوئے مستانۂ مدینہ، یہ رنگِ افسانۂ حجازی
یہ فتحِ روم و عجم کی راہیں، یہ کاروانِ شہید وغازی
وہی زمانہ اُبھر رہا ہے، وہی زمانہ گزر رہا ہے!
بخاری تقریر کر رہا ہے

یہ حُسنِ گفتار جس کی شوخی شراب خانے انڈیلتی ہے
کبھی اُلجھتی ہے تیرگی سے کبھی ستاروں سے کھیلتی ہے
مگر یہ آواز کور ذوقوں کی بد مذاقی بھی جھیلتی ہے
ہمیشہ سے بد نصیب قوموں کا یہ مذاقِ نظر رہا ہے
بخاری تقریر کر رہا ہے

شریف اشرف رح

علامہ طالوت مرحوم

حضرت امیر شریعت

بطل حریت، زعیم ختم نبوت، خطیب الامت، امیر شریعت مولانا سید عطاء اللہ شاہ بخاری جیسی شخصیت پر جامع مضمون لکھنا میرے جیسے کج مج بیان، ہیچمداں آدمی کا کام نہیں یہ درست کہ ہند و پاکستان کے کروڑوں انسانوں کی طرح مجھے بھی ان سے عقیدت رہی اور ہے۔ مگر ہر عقیدت مند اس کا اہل نہیں کہ وہ ایسی جامع الصفات شخصیت پر ہر پہلو سے اظہار خیال کر سکے اور نہ ایک طویل یا مختصر مضمون میں صحیح طور پر اظہار خیال کیا جاسکتا ہے۔

سفینہ چاہیئے اس بحر بیکراں کے لئے

شاہ جی اپنے وقت کے بہت بڑے سیاسی لیڈر تھے اور اتنے بڑے کہ ابوالکلام، محمد علی جوہر اور ظفر علی جیسے اشخاص (جن کے سامنے گاندھی ایسے لوگ سر جھکاتے تھے) ان سے خم کھاتے تھے شاہ جی اپنے وقت کے بہت بڑے عالم اور دینی بصیرت رکھنے والے مبلغ اسلام تھے اور اتنے بڑے کہ محدث العصر حضرت العلام مولانا سید محمد انور شاہ صاحب کشمیری قدس سرہ العزیز نے انہیں امیر شریعت کا خطاب دے کر خود ان کے ہاتھ پر انگریز کے استیصال کے لئے بیعت میں شرکت فرمائی۔ اور ان کے ساتھ جملہ علماء امت اور قائدین ملت نے بھی اس بیعت میں شرکت فرمائی۔

شاہ جی اپنے وقت کے بہت بڑے خطیب و مقرر تھے اور اتنے بڑے کہ ان سے بعد اور پہلے تقریر کرنا وقت کے انتہائی بڑے خطیبوں کے لئے ناممکن تھا اور بقول مولانا محمد علی جوہر کے "اس ظالم سے نہ پہلے تقریر کی جاسکتی ہے نہ بعد میں، کیونکہ ان کی تقریروں کا رنگ جم ہی نہیں سکتا" اسی وجہ سے حضرت مولانا ابوالکلام آزاد کبھی کسی ایسے جلسے میں تقریر نہیں کرتے تھے، جس میں شاہ جی کو بھی تقریر کرنا ہوتی تھی اور وہ ہمیشہ بہ لطائف الحیل ٹال جایا کرتے تھے۔

شاہ جی اپنے وقت کے بہت بڑے مجاہد تھے اور اتنے بڑے مجاہد جو ہمیشہ ہر جنگ میں صف اول میں نظر آتے ہیں، انہوں نے جتنی تحریکات میں کام کیا خود سب سے آگے رہے۔ اور ہمیشہ سب سے پہلے اپنی جان کا نذرانہ اس تحریک کے لئے پیش کیا یہ الگ بات ہے کہ حضرت سیف اللہ خالد بن ولید کی طرح ان کی موت بھی گھر میں بستر پر آئی۔ اور وہ کسی میدان جنگ میں کام نہ آئے مگر بارہا تختۂ دار تک ہو کر واپس تشریف لائے اور شہادت کی حسرت دل کی دل ہی میں رہی۔

شاعر و سخن سنج

شاہ جی اپنے وقت کے بہت بڑے شاعر اور سخن سنج تھے اور اتنے بڑے کہ ان کے فارسی کلام کی پختگی پر جامی اور نظیری جیسے اساتذہ کے رنگ سخن کا گماں ہوتا ہے اور اردو کے طنزیہ اشعار رنگِ اکبر میں ڈوبے ہوئے نظر آتے

ہیں اور پھر یہ سب کچھ اس صورت میں ہے کہ اس میدان سے ہمیشہ بے توجہ رہے کبھی کبھی یوں ہی برائے تفنن و تنوع منہ کا مزہ بدلنے کی خاطر کچھ کہہ گزرتے رہے۔ اگر پوری طرح اس طرف توجہ ہوجاتی تو خدا جانے کتنے شعرائے شباب و انقلاب گرد راہ ہوجاتے۔ شاہ جی اپنے وقت کے بہت بڑے سخن فہم و سخن شناس تھے اتنے بڑے کہ شعرائے زمان اپنا کلام ان کی خدمت میں پیش کرکے داد لینے میں اپنی بہت بڑی کامیابی تصور کرتے تھے۔ اور اتنے بڑے کہ موجودہ دور کے بڑے بڑے نقاد پطرس، تاثیر و سالک ادبی مجلس کا انہیں صدر نشین تصور کرتے تھے اور جب بھی موقع میسر آتا ان کے ہاں پہنچ جاتے یا انہیں اپنے ہاں لے جاتے اور پھر یہ ادبی مجلسیں شاہ جی کی بدولت رات رات بھر جاری رہتیں اور صبح ہونے پر یوں محسوس ہوتا کہ

ابھی آئے ابھی گئے

شاہ جی اپنے وقت کی سب سے زیادہ محبوب شخصیت تھے اور اس قدر محبوب کہ لاکھوں کروڑوں آدمی اپنی جانیں ان کے قدموں میں نثار کرنے کو ہروقت تیار رہتے۔ ایسے جامع الصفات شخص پر مضمون لکھنا آسان کام نہیں اور یہی وجہ ہے کہ اپنی کم مائیگی کے پیش نظر راقم الحروف اب تک خاموش رہا اب بھی ڈرتے ڈرتے "قلم کشائی" کر رہا ہوں۔ اور اس مضمون میں بھی صرف وہ باتیں لکھوں گا جو میرے ذاتی تاثرات کے تحت آئی ہیں شاہ جی کی مکمل شخصیت کے نقوش ابھارنے کی خاطر ایک بہت بڑے جامع الصفات مورخ کا قلم درکار ہے۔

راقم الحروف جب دار العلوم دیوبند میں تعلیم حاصل کررہا تھا تو ایک دن دورۂ حدیث کی کلاس میں ایک پریشاں اور بارعب شخصیت کو دیکھا کہ وہ حضرت حجۃ الاسلام مولانا سید محمد انور شاہ صاحب قدس سرہ کے درس میں طالب علموں کی طرح استفادہ کی خاطر سب سے پیچھے آکر بیٹھ گیا۔ تحقیق کرنے پر معلوم ہوا کہ آپ مولانا حبیب الرحمن لدھیانوی ہیں۔ سب سے پہلے حضرت شاہ جی کا نام راقم الحروف نے انہیں کی زبانی سنا یہ تو یاد نہیں کہ انہوں نے کس سلسلہ میں ان کا ذکر کیا تھا مگر اتنا یاد ہے کہ اس نام میں راقم الحروف نے کچھ کشش ضرور محسوس کی تھی پھر اس کے بعد جب بھی شاہ جی کا نام اخباروں میں نظر سے گزرتا تو راقم شناسایانہ طور پر ادھر متوجہ ہوجاتا۔ اور اس خبر کو ضرور پڑھتا جس میں شاہ جی کی معجز بیانی کا ذکر ہوتا، یا ان کا کوئی بیان درج ہوتا اس طرح وہ خلش جو دل میں پیدا ہوئی تھی بڑھتی رہی تعلیم سے فراغت کے بعد غریب خانہ کی طرف واپسی پر ملتان سے جو گزر ہوا تو برادرم مولانا محمد عبد اللہ صاحب کاتب نے (جو میرے میزبان تھے) مغرب کے قریب فرمایا شاہ جی کی تقریر پر چلوگے؟ انہوں نے کہا "ہاں" میں نے مشتاقانہ کہا ضرور چلوں گا۔ چنانچہ عشاء کے قریب پاک دروازے کے النگ پر ہم جلسہ گاہ میں پہونچے تو کہیں تل دھرنے کو جگہ موجود نہیں تھی۔ عشاء کے بعد شاہ جی کی تقریر شروع ہوئی اور لوگ اس طرح بیٹھے تھے، کان علی روؤسھم الطیور، اس وقت نہ تقریر کا موضوع یاد ہے اور نہ شاہ جی کے وہ نکات یاد ہیں جو انہوں نے اس تقریر میں بیان فرمائے تھے مگر اب بھی جس وقت وہ رات یاد آجاتی ہے تو بلامبالغہ کانوں میں وہی رس، وہی شیرینی محسوس ہونے لگتی ہے جو اس رات کو راقم نے محسوس کی تھی اور صبح کی اذان اچانک ہونے پر جب وہ تقریر ناتمام شاہ جی نے ختم فرمائی تو جملہ سامعین میں ابھی تشنگی باقی تھی۔ اور سب کی متفقہ رائے یہ تھی کہ تقریر ابھی جاری رہتی

چاہیے اور اس کے بعد جب شاہ جی کی عام تقریریں سننے کا اتفاق ہوا تو جملہ تقریروں میں یہی خصوصیت کار فرما دیکھی۔
پھر ایک خصوصیت شاہ جی کی تقریروں کی یہ بھی تھی کہ اس میں دوست، دشمن، موافق، مخالف، اپنے، پرائے، ہندو، مسلم، سکھ، عیسائی سب برابر کے شریک ہوتے تھے۔ اور سبھی محظوظ ہوتے تھے۔ لاہور والوں سے تو اکثر آپ فرماتے تھے کہ تقریر تو آپ میری سنتے ہیں اور ووٹ دوسروں کو دیتے ہیں۔ شاہ جی کی ایک خصوصیت یہ بھی تھی کہ جہاں وہ محسوس کرتے تھے کہ اس جگہ اصلاح کی زیادہ ضرورت ہے یا اس جگہ دوسرے مبلغ بعض وجوہ کی بناء پر جانے سے گھبراتے ہیں، تو وہاں وہ دوبارہ تشریف لے جاتے تھے۔ تاکہ صحیح اسلامی عقائد کی تبلیغ کر کے لوگوں کی اصلاح فرما سکیں چنانچہ ہمارا ضلع (ڈیرہ غازی خان) بھی ایسی ہی جگہوں میں شمار ہوتا تھا۔ پسماندگی، عقائد کی تاریکی، جہالت اور جائے وقوع کی دوری اور ذرائع آمد و رفت کی خرابی کی بناء پر بہت کم لوگ وہاں جاتے تھے۔ اور جو جاتے تھے وہ ان لوگوں کی شدت جہالت سے ناآشنا ہونے کی وجہ سے ایک آدھ سرسری اصلاحی تقریر پر اکتفا کرتے تھے جسے وہ لوگ کچھ سمجھتے، کچھ نہ سمجھتے اور اس طرح وہ تقریر اصلاح کی بجائے فساد کا کام زیادہ کرتی کیونکہ مخالفین بعض اوقات اس کے بعض جملوں کو بگاڑ کر لوگوں کو یہ سمجھا دیتے کہ دیکھئے وہ تو اس طرح کی باتیں کہہ گیا ہے اور کہنے والے کو سال دو سال بعد جب کبھی دوبارہ وہاں آنے کا موقع ملتا تو اسے پتہ چلتا کہ میری باتوں کو کس طرح بگاڑ کر پیش کیا گیا ہے اور وہ اس کے بعد تردید کر پاتا۔ مگر شاہ جی نے ایک آدھ بار ہی وہاں جانے کے بعد ان لوگوں کے مرض کو بھانپ لیا۔ اور ایک تو انہوں نے متواتر آنا شروع کر دیا۔ دوسرے شہروں کے ساتھ ساتھ بستیوں اور دیہات بھی جا جا کر لوگوں کو وعظ و نصیحت سنایا اور سب سے بڑھ کر یہ کہ کلم الناس علی قدر عقولھم کو مد نظر رکھتے ہوئے انہوں نے ان لوگوں کی زبان سیکھی اور انہیں کی زبان میں انہیں باتیں سمجھانا شروع کیں ایک بار ایک دیہاتی علاقہ (وہوا) میں رسوم کی اصلاح پر تقریر فرما رہے تھے۔ شاید شرک کے معنی سمجھا رہے تھے ایک گھنٹہ کی تقریر کے بعد پوچھا۔ کیوں بھئی کچھ سمجھے بھی ہو؟ لوگوں نے کہا کچھ بھی نہیں سمجھے دوسرا کوئی مقرر ہوتا تو بدمزہ ہو جاتا اور مزید تقریر کرنے کو اس کا کبھی دل نہ چاہتا مگر شاہ جی نے پورے جوش سے فرمایا کہ میں تو تمہیں سمجھانے آیا ہوں، چنانچہ انہوں نے پہلے سے بھی دوگنے جوش کے ساتھ دوبارہ تقریر شروع کی اور گھنٹہ دو گھنٹہ پھر انہیں شرک کے معنی سمجھائے اور پھر پوچھا کہ اب کچھ سمجھے؟ لوگوں نے پھر نفی میں جواب دیا۔ پھر شاہ صاحب نے تگنے جوش کے ساتھ پھر فرمایا میرا کام تو کوشش کرنا ہے دلوں کی گھنڈیاں تو وہی کھول سکتا ہے اور قرآن پاک کی وہ مشہور آیت تلاوت فرمائی۔ جو موسیٰ علیہ السلام نے فرعون کے پاس جانے سے پہلے تلاوت فرمائی تھی۔

رب اشرح لی صدری و یسر لی امری و احلل عقدۃ من لسانی یفقھوا قولی

اے اللہ میرے سینے کو کھول دے اور میرے کام کو آسان کر دے اور میری زبان کی گرہ کو کھول دے تاکہ یہ لوگ میری بات سمجھ سکیں۔

اور اس کے بعد پھر جوش و خروش کے ساتھ گھنٹے دو گھنٹے اسی مسئلہ پر تقریر فرمائی اور اس شرح و بسط سے کام لیا کہ لوگ اچھی طرح بات کو سمجھ گئے اور آخر میں جب پوچھا کہ اب کچھ سمجھے؟ لوگوں نے اپنی زبان میں کہا "ہاں بینڈا سائیں اب سمجھ گئے ہیں" شاہ جی نے اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کیا۔ جس نے ان کے کام میں سہولت پیدا فرما دی تھی اور

فرمایا میں تو تہیہ کر چکا تھا کہ یہ بات آپ کو سمجھا کر ہی جاؤں گا، خواہ مجھے اس سلسلہ میں پچاس بار بھی بولنا پڑے۔ اور خواہ مجھے یہاں اس سلسلہ میں مہینہ بھر بھی رہنا پڑے۔ اپنے ضلع میں ایسی تقریریں سننے کے بعد راقم الحروف اور بھی شاہ جی کا معتقد ہو گیا مگر اس سارے اعتقاد و عقیدت کے بعد بھی مجھے یہ جرأت نہ ہوئی کہ میں شاہ جی سے اپنے آپ کو متعارف کراتا یا تقریر کے علاوہ ان کی خصوصی مجلسوں میں بار بار جاتا۔ مولوی فاضل کا امتحان دینے کے بعد راقم نے سکولوں کی راہ لی اور ملازمت کے سلسلہ میں منٹگمری اور لائل پور کے اضلاع میں مختلف مقامات پر رہا۔ شاہ جی کی تقریر کا جہاں بھی اعلان ہوتا اور وہاں پہونچنے کا امکان ہوتا تو راقم ضرور پہونچ جاتا اور مستفید ہوتا۔ بعد میں شیخ الاسلام والمسلمین علامہ کشمیری کے ایک ادنیٰ ترین شاگرد ہونے کی وجہ سے راقم کو بھی ایک تحریک میں تھوڑا بہت کام کرنے کا موقع میسر ہوا زمیندار اور دوسرے اخباروں میں راقم کے مضامین اور نظمیں پڑھ کر شاہ جی نے اپنے دوستوں سے پوچھنا شروع کیا کہ یہ کون صاحب ہیں؟ برادرم مولانا قاضی احسان احمد صاحب شجاع آبادی کو میرے قلمی نام کے متعلق علم تھا۔ چنانچہ انہوں نے شاہ جی کو سب کچھ بتلا دیا جب شاہ جی کو یہ معلوم ہوا کہ مجھے حضرت علامہ کشمیری رحمہ اللہ تعالیٰ سے تلمذ کی برکت بھی حاصل ہو چکی ہے۔ تو انہوں نے ملنے پر اصرار فرمایا۔ راقم لائل پور سے چنیوٹ (ضلع جھنگ) چلا گیا تھا اور مدت کے بعد جب آپ تبلیغ کے سلسلے میں چنیوٹ تشریف لائے تو قاضی صاحب کے ذریعے مجھے آپ کی خدمت میں حاضر ہونے کا موقع ملا۔ اور اس وقت سے آخر دم تک میرے حال پر مہربان رہے۔ اور جب بھی مجھے ان کی خدمت میں جانے کا موقع ملا تو میں نے یہی محسوس کیا کہ پہلے سے زیادہ محبت و عطوفت و رافت و عنایت کی بارش ہو رہی ہے۔

چنیوٹ کا معرکہ

چنیوٹ سیٹھوں اور لکھ پتیوں بلکہ کروڑ پتیوں کا شہر ہے۔ اور جب آپ پہلے پہل وہاں تشریف لائے تھے تو سارا چنیوٹ آپ کے قدموں میں تھا مگر آپ نے نہ اس پر فخر کیا، اور نہ ان کروڑ پتیوں کی طرف توجہ فرمائی غریب اور نادار لوگوں میں سے رضاکار بھرتی کئے اور انہیں کی اصلاح و تربیت کی طرف زیادہ متوجہ رہے پھر ایک وقت ایسا بھی آیا کہ سارا چنیوٹ آپ کا مخالف تھا اور چنیوٹ کے سیٹھ یہ کہتے سنے گئے کہ چنیوٹ دوسرے شہروں کی طرح نہیں یہاں شاہ جی کی تقریر ہرگز نہ ہونے دی جائے گی۔ مگر آپ ان اطلاعات کے باوجود وقت مقررہ پر وہاں تشریف لائے رات کو تقریر کا اعلان ہو گیا تھا۔ راقم الحروف ملازمت کی مجبوریوں کی بناء پر ان کی خدمت میں حاضر نہ ہو سکا۔ اور سارا چنیوٹ تہیہ کر چکا تھا کہ آپ کی تقریر نہ ہونے دی جائے گی۔ آپ جب وقت مقررہ پر جلسہ گاہ میں تشریف لائے اور خطبہ مسنونہ کے بعد بولنا شروع کیا تو ہر طرف سے اعتراضات کی بوچھاڑ ہو گئی آپ نے ایک بہادر مجاہد کی طرح ان اعتراضات کے جواب دیئے۔ اور فرداً فرداً ہر معترض کو خاموش کر دیا۔ اور پھر وہ زوردار تقریر فرمائی کہ تقریر کے اختتام پر سب لوگوں سے اپنی ہمنوائی منوالی اثنائے تقریر میں آپ کی عقابی نظر نے مجھے کہیں کونے میں دبکا ہوا دیکھ لیا تو فرمایا کہ مجھے کون سے سرخاب کے پر لگے ہوئے ہیں یہ صرف خواجۂ دوجہاں ﷺ کی غلامی کا امتیاز ہے کہ آپ لوگ میری باتیں سن رہے ہیں اور میں سنا رہا ہوں۔ ورنہ میں کیا اور میری حیثیت کیا میں بھی مولوی

فاضل پاس کر کے آج کسی سکول میں ملازم ہوتا اور بچوں کے ساتھ سر کھپانے میں مشغول ہوتا اور پھر انتہائی سوز و گداز کی لے میں یہ شعر ارشاد فرمایا

ماؤ مجنوں ہم سفر بودیم در دیوان عشق
او بصحرا رفت و ما در کوچہ ہا رسوا شدیم

اس دن کے بعد جب بھی راقم الحروف ان کی خدمت میں حاضر ہوا تو یہ واقعہ یاد آ کر راقم کی ندامت و احساس کمتری میں ازدیاد کا باعث بنتا رہا۔

چک جھمرے میں ایک بار تقریر میں فرمایا کہ میری عمر کا زیادہ حصہ یا ریل میں گذرا ہے یا جیل میں، راقم الحروف بھی تقریر میں موجود تھا راقم کو وہ مشہور رباعی یاد آ گئی۔

صبح دم کام سے گزرتی ہے
شب دلارام سے گزرتی ہے
عاقبت کی خبر خدا جانے
اب تو آرام سے گزرتی ہے

راقم نے یہ رباعی شاہ جی کے حسب حال بنا کر تقریر کے بعد انہیں سنائی

صبح دم ریل میں گزرتی ہے
شب کسی جیل میں گزرتی ہے
عاقبت کی خبر خدا جانے
اب تو اس کھیل میں گزرتی ہے

شاہ جی نے اسے بہت پسند فرمایا اور کہا میرے بھائی آپ نے ایک رباعی کو مسلمان کر دیا۔ کشمیر کے اللہ رکھا ساغر صاحب ساتھ تھے اس زمانے میں وہ شاید "آزاد" میں کام کرتے تھے انہوں نے اس رباعی سے ایک اشاعت کے فکاہات کا کام چلایا اور راقم الحروف کی غیر شاعرانہ شکل و شباہت پر یہ فقرہ چست کیا کہ فلاں بظاہر تو آلوؤں کے بیوپاری معلوم ہوتے ہیں مگر بباطن ایک خوشگوار شاعر ہیں اس کے بعد راقم نے ہمیشہ آلوؤں کے بیوپاریوں کو غور سے دیکھا مگر شکل و شباہت سے انہیں کچھ بھی مشابہ نہ پایا ممکن ہے کہ کشمیر کے بیوپاری میرے ایسے ہوتے ہوں مگر اس کے بعد نہ اپنا کشمیر جانے کا اتفاق ہوا اور نہ ساغر صاحب سے پھر ملاقات ہو سکی۔ ایک بار شاہ جی تقریر فرما رہے تھے اور بجلی کی روشنی میں ان کا چہرہ اور ماتھا پُر جلال طریقہ پر آفتاب کی طرح چمک رہے تھے راقم کو کسی پرانے استاد کی یہ رباعی یاد آ گئی۔

از سخن شہد ناب مے چکدش
و ز تبسم گلاب مے چکدش
مے تواں گفت کز حرارت مے
از جبیں آفتاب مے چکدش

راقم الحروف نے اس رباعی کو یوں حسب حال بنایا ہے۔

از سخن شہد ناب مے چکدش
و ز تکلم گلاب مے چکدش
مے تواں گفت کز حرارت وعظ
از جبیں آفتاب مے چکدش

تقریر کے بعد یہ رباعی شاہ جی کو سنائی انہوں نے اپنی تعریف اور تغیر الفاظ کو توٹال دیا اور یہ ان کی ادائے خاص تھی کہ اپنی تعریف کو کچھ زیادہ پسندیدگی کی نگاہ سے نہیں دیکھتے تھے۔ اور نہ دوسرے لیڈروں کی طرح جلسے جلوس اور اخبارات میں چھپنے کا اہتمام کرتے البتہ اصل رباعی کو انہوں نے پسند فرمایا اور بار بار مجھ سے سنا پھر بار بار خود پڑھا اور اپنی نوٹ بک میں اسے نوٹ کرلیا۔ اور یہ رباعی دماغ پر ایسی چھائی کہ آخر کار ایک طویل بہار یہ نعت ان سے لکھوائی آپ کی نعت گویا اسی رباعی کا جواب ہے۔ جس کا مطلع ہے

ہزار صبح بہار از نگاہ می چکدش
جنوں زسایۂ زلف سیاہ می چکدش

(یہ مکمل نعت آپ کے مجموعہ کلام "سواطع الالہام" میں چھپ چکی ہے)

ڈیرہ غازیخان میں حضرت شاہ جی تشریف لایا کرتے تھے تو عموماً ان کی تقریریں رد بدعات پر ہوا کرتی تھیں اور ابتدائی زمانہ میں جب ابھی انہوں نے خواجہ غلام فرید رحمہ اللہ تعالی کے کلام کا پورا مطالعہ نہیں کیا تھا بعض تقریروں میں خواجہ صاحب کے غالی مریدوں کے بعض غلو آمیز مدحیہ اشعار کی تردید فرمائی اور اس طرح گویا پیروں فقیروں کی دنیا سے ان کا ایک محاذ بن گیا۔ بعد میں جب بہاولپور سے حضرت خواجہ کا اردو ترجمہ والا دیوان طبع ہو کر آیا اور حضرت نے راقم الحروف کا لکھا ہوا بسیط مقدمہ اور دیوان دونوں ملاحظہ فرمائے۔ تو ایک ملاقات میں راقم سے فرمایا کہ تم نے خواجہ صاحب کے مزار پر جو گرد و غبار پڑا ہوا تھا دھو دیا اللہ تعالی تمہیں جزائے خیر دے اور اسی کے نتیجہ میں آپ نے خواجہ صاحب پر اپنی مشہور فارسی نظم لکھی جس کا مطلع ہے

گلشن عشق چشتیاں بہ طپید
شعلۂ اش خواجہ غلام فرید

ہاں تو یہ اس زمانے کی بات ہے جب آپ خواجہ صاحب کے مخالف سمجھے جاتے تھے اور خواجہ صاحب کے معتقد آپ کے خلاف جلسے کیا کرتے تھے، ڈیرہ غازیخان کے ایک ایسے ہی سٹیج پر جو آپ کی مخالفت میں مشہور تھا ایک بار ایک جلسہ ہوا جس کی صدارت ہمارے ضلع کے مشہور پیر حضرت خواجہ نظام الدین تونسوی صاحب نے فرمائی ایک دوست کی فرمائش پر راقم نے ایک نظم لکھی جو خواجہ صاحب کی تعریف میں تھی اور جلسہ کی ابتداء میں ایک خوش الحان آدمی نے اسے پڑھ کر سنادیا نظم کا مطلع کچھ اس طرح تھا

یہ ہے والطور کی دنیا یہ ہے والتین کی دنیا
الگ ہے ساری دنیا سے نظام الدین کی دنیا

یار لوگوں نے نظم نوٹ کرلی اور شاہ جی تشریف لائے تو انہیں سناڈالی شاہ جی کی نقادانہ نگاہ سے یہ چھپا نہ رہ سکا کہ یہ نظم کس کی کہی ہوئی ہے شاید لوگوں نے بھی میرا نام لے دیا ہو بہرحال انہیں اس پر بہت طیش آیا اور اس طیش کی حالت میں انہوں نے فی البدیہ بہت سے اشعار کہہ ڈالے جن کا کچھ حصہ آپ کے کلام میں طبع ہوچکا ہے اور جس کا مطلع ہے

نہ یہ والتین کی دنیا نہ والزیتون کی دنیا
نہ یہ مفروض کی دنیا نہ یہ مسنون کی دنیا

اور راقم الحروف سے جب ملاقات ہوئی تو یہ ساری نظم سناڈالی مگر واہ رے وضعداری یہ نہیں فرمایا کہ یہ نظم "جواب آں غزل" ہے راقم نے بھی انتہائی اطمینان سے ساری نظم سنی اور پوری پوری داد دی مگر عمر بھر ان کے سامنے یہ کہنے کی جرأت نہیں ہوئی کہ وہ نظم میں نے لکھی تھی اور نہ شاہ صاحب رحمۃ اللہ تعالی رحمۃ واسعۃ نے کبھی مجھے اس سلسلہ میں شرمندہ فرمایا گویا اسے آپ "مقطع کی سخن گسترانہ" بات ہی خیال فرماتے تھے اور مقطع کی سخن گسترانہ بات نہ سمجھتے تو اس کے بعد خواجہ نظام الدین صاحب سے ملاقاتیں ہی نہ ہوتیں جب خواجہ صاحب نے آپ کے مبلغین سے تعاون شروع کردیا اور اصلاحی معاملات میں ان کی مدد فرماتے رہے تو جہاں تک میری معلومات کا تعلق ہے شاہ جی قبلہ نے ان کی تعریف فرمائی اور ملاقات بھی فرمائی بلکہ تونسہ شریف کو تو وہ اپنا پیرخانہ سمجھتے تھے کیونکہ آپ کی ابتدائی بیعت حضرت پیر مہر علی شاہ صاحب گولڑوی سے تھی اور وہ خانوادۂ سیال شریف کے مرید تھے اور سیال شریف والے حضرات تونسہ شریف والوں کے مرید تھے مگر تبلیغ کے سلسلہ میں شاہ جی ایسے شمشیر براں تھے اور حق گوئی میں اتنے بے باک کہ حق کے معاملے میں جس طرح وہ کسی دنیاوی آدمی سے مرعوب نہیں ہوتے تھے اسی طرح وہ کسی دینی شخصیت سے بھی مرعوب نہیں ہوتے تھے۔

کسر نفسی

حضرت شاہ جی نے سب کچھ ہوتے ہوئے اپنے آپ کو کبھی کچھ نہ سمجھا اور تواضع و انکسار کا یہ عالم تھا کہ ہر اس آدمی کو جس کے متعلق یہ کہہ دیا جاتا تھا کہ یہ حضرت علامہ سید انور شاہ کشمیری قدس سرہ کا تلمیذ ہے اپنا استاد تصور فرماتے تھے اور پھر اس کے ساتھ انتہائی انکسار سے پیش آتے راقم الحروف کی استادی بھی جس کا ڈھنڈورا شاہ جی رحمہ اللہ کے فرزند بلند اقبال سید ابوذر بخاری اطال اللہ بقاءہ نے شاہ جی کے کلام سواطع الالہام کے تعارف میں پیٹا ہے کچھ اسی طرح شروع ہوئی جب انہیں بتلایا گیا کہ میں حضرت شیخ الاسلام کشمیری کا شاگرد ہوں تو انہوں نے بڑھ کر مجھے سینہ سے لگایا اور فرمایا پھر یہ تو ہمارے استاد ہوئے۔ گویا جیسے بربنائے ادب استاد، استادزادے کو استاد کہہ دیا جاتا ہے اسی طرح حضرت علامہ کشمیری کی روحانی اولاد کو بھی (خواہ وہ میرے ایسے بدنام کنندہ نکونامے چند ہی کیوں نہ ہوں) اپنا استاد مانا اور اس کے بعد شعر و سخن کے ادوار میں کبھی ایک آدھ مشورہ اس طرح دیدیا جیسے کہ

گاہ باشد کہ کودک ناداں
بغلط بر ہدف زند تیرے

تو آپ نے حوصلہ افزائی فرمائی اور اس مشورے کو قبول فرمالیا اور ساتھ ہی ہر آوند و دادند کو جب وہ نظم سناتے ہیں تو یہ ارشاد ہوتا ہے کہ میں نے یوں لکھا تھا اور فلاں نے اس میں یوں اصلاح کی ہے اور یہ اصلاح مجھے بہت پسند ہے اور کیوں نہ ہو میاں آخر حضرت علامہ کشمیری کے شاگرد ہیں وغیرہ وغیرہ اور شرمندگی کا یہ عالم ہوتا تھا کہ سر ندامت اٹھائے نہیں اٹھتا تھا ایک آدھ بار میرے سامنے بھی جب یہ معاملہ ہوا تو میں نے عرض کیا کہ قبلہ شرمندہ نہ فرمائیے میری استادی صائب کے استاد کی استادی جیسی ہے فرمایا وہ کیسے؟ میں نے عرض کیا کہ صائب نے اپنے استاد کے متعلق لکھا ہے

از ادب صائب خموشم ورنہ در ہر وادئے
رتبہ شاگردئ من نیست استاد مرا

شعر چونکہ بہت شوخ و شنگ تھا اس لئے اسے بہت پسند فرمایا اور کہا کہ نہیں بھائی ابلیس تمہارا استاد ہوتا تو یہ شعر صحیح ہوسکتا تھا بہرحال یہ محض ان کی ادب نوازی اور خورد نوازی ہی تھی کہ وہ ہر آنے جانے والے سے یہی فرماتے تھے کہ میں فلاں سے اصلاح سخن کے سلسلہ میں مشورہ لیتا ہوں۔ ورنہ نہ ان کو مشورہ کی ضرورت تھی اور نہ کبھی باقاعدہ یہ مشورہ بازی ہوئی اور جہاں تک میرا خیال ہے سالک مرحوم سے بھی ان کا یہی سلسلہ تھا یعنی کبھی برسبیل تذکرہ گرمی مجلس میں انہوں نے کوئی بات کہدی ہو اور انہوں نے گرہ میں باندھ لی تو ممکن ہے کہ لیکن باقاعدہ اصلاح سخن کی نہ شاہ جی رحمہ اللہ تعالیٰ کو ضرورت تھی اور نہ اس قدر وہ اپنے کلام کو اہمیت دیتے تھے اور نہ اتنا لکھنے لکھانے میں کچھ انہماک تھا وہاں تو یہ عالم تھا کہ کبھی کبھار کچھ زبان پر آگیا اسے دو چار دن تک یاد رکھا اور آنے جانے والوں سے اس کا تذکرہ بھی فرمایا اور اس کے بعد ایسا بھلایا کہ پھر کبھی زبان پر نہ لائے۔ یہ جتنا بھی کلام جمع ہوا ہے یہ بھی ان کے بیٹے سید ابوذر بخاری نے مختلف مجالس میں مختلف چیزیں سن کر نوٹ کرلیں اور یوں مدتوں کے بعد یہ چھوٹا سا مجموعہ تیار ہوا بہرحال شاہ جی کی غریب نوازی (یاد رہے کہ ان کے پہلے استاد غریب امرتسری تھے) اور سالک نوازی میں تو ممکن ہے کچھ اصلیت بھی ہو مگر راقم کے معاملہ میں محض ان کی ذرہ نوازی ہی تھی ورنہ میں عمر کے لحاظ سے ان کا استاد ہوسکتا ہوں اور نہ علم کے لحاظ سے سخن فہمی کے سلسلہ میں اپنے آپ کو ان کا ایک ادنیٰ شاگرد اگر ثابت کرسکوں تو یہ میری انتہائی خوش بختی ہوگی ورنہ حقیقت یہ ہے کہ وہ اتنے اونچے تھے کہ ہمارے ایسے لوگ ان کی شاگردی کے نابل بھی نہیں تا بہ استادی چہ رسد، یوں ان کی نوازش کی انتہا یہ تھی کہ خواب میں بھی الہامی شعر کہتے تو اٹھتے ہی صلاح کے لئے پیش کردیا کرتے تھے۔ اس سلسلہ میں "سواطع الہام کا اکیسواں ساطعہ ہی نقل کردینا کفایت کرلے گا۔ حظ فرمائیے

وحدت بوجد و حالت کثرت در آمدہ
حرکت بجلوہ، جلوہ بحرکت در آمدہ

موسیٰ و طور و وادیٔ ایمن، حرا، حرم
ہرجا کہ دیدہ ایست بحیرت در آمدہ

اس کے متعلق خود فرمایا انتخاب کے بعد وزارتی مشن کی آمد سے کچھ پہلے دہلی جانا ہوا ایک روز عبد الستار سالار دہلی کے ہاں سویا ہوا تھا تو دیکھا خواب میں یہ شعر بلند آواز سے پڑھ رہا ہوں اتنے میں قاضی احسان احمد نے آ کر جھنجھوڑا اور زور زور سے شاہ جی شاہ جی کہہ کر جگا دیا گھبرا کر اٹھتے ہی میں نے کہا: ارے ظالم مار ڈالا شعر ہو رہے تھے یہ تو نے کیا کیا؟ مولانا طالوت جو ان دنوں کسی کام سے دہلی گئے ہوئے تھے اور میرے ہی مکان میں ٹھہرے ہوئے تھے ان سے باتیں کرتے کرتے سو گیا تھا میں نے فوراً انہیں مخاطب کیا اور غنودگی کی حالت میں ہی ان کے زانو پر ہاتھ رکھ کر کہا ذرا دیکھئے تو مولانا یہ شعر ٹھیک ہیں نا؟ اور یہ شعر پڑھ کر سنائے تو وہ کہنے لگے جی ہاں! بالکل ٹھیک ہیں میں نے کہا مولانا ابھی میں خواب میں یہ شعر پڑھ رہا تھا اگر قاضی نہ جگاتا تو پوری نظم ہو جاتی۔

شاہ جی رحمہ اللہ تعالی ایسے زندگی سے بھرپور انسان تھے کہ اب تک ہمارے بھائی مظہر نواز خان کو ان کی موت ہی کا یقین نہیں آتا اور یقین کیسے آئے جب تصور میں اب بھی ان کی گرمیٔ مجلس کی صدائیں کانوں تک پہنچ جاتی ہیں اللہ تعالی کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے ظفر علی خان کیا خوب فرما گئے ہیں

کانوں میں گونجتے ہیں بخاری کے زمزمے
بلبل چہک رہا ہے ریاضِ رسول میں

✻

اگر کسی زندہ و بیدار قوم میں ایسا باکمال و مخلص پیدا ہوتا تو وہ قوم بامِ عروج پر پہنچ جاتی اور شاید دوسرے ملکوں میں انقلاب کا ذریعہ ہوتی۔

سید ابوالحسن علی ندوی: (لکھنؤ)

اسلام اور مسلمانوں کے سچے وفادار تھے۔

مولانا محمد منظور نعمانی

وہ برطانوی سامراج کے اولیٰ مخالف مجاہد تھے۔ اُن کی بے پناہ قربانیاں ناقابلِ فراموش ہیں۔

شاہ جی اس دور کے علماء و زعماء میں سے ایک تھے جنہوں نے مولانا محمد علی جوہر مولانا شوکت علی، مولانا عبدالباری، اور عبد الماجد بدایونی کے ہمراہ برطانوی سامراج کے خلاف جہاد عظیم میں نمایاں حصہ لیا تھا ان کی تقاریر سحر آفرین تھیں۔

مولانا عبد الحامد بدایونیؒ:

اُن کی ہنس مکھ صورت آنکھوں میں پھر رہی ہے۔ اللہ اللہ!! کیا دم خم تھا، کیا عزم و ولولہ تھا، اور کیا غیر مرعوب شخصیت تھی۔ وہ پیار و محبت، ایثار و غیرت و حمیّتِ اسلامی کے مجسمہ تھے۔

علامہ محمود احمد عباسیؒ:

خطابت ان کا فن نہیں فطرت تھی

علامہ دوست محمد قریشیؒ

درویش جس نے جیتے ہیں شاہوں سے معرکے

جس نے کئے ہیں تاجوروں سے مقابلے
درویش جس نے جیتے ہیں شاہوں سے معرکے

سحر آفریں خطیب اثر آفریں خطاب
اک موج ہے کہ شعلہ! اسے کوئی کیا کہے

جھڑتے ہیں جس کے جلوت و خلوت میں منہ سے پھول
شیریں ہے جس کا ہر کلمہ شہد و شیر سے

ہر نکتے میں فسون فصاحت کی انتہا
ہر بات میں حروف نگینے جڑے ہوئے

الفاظ میں ہے صور اسرافیل کا خروش
اسلوب میں ہیں جوش شہادت کے ولولے

اقلیم پاک وہند کا سرمایۂ غرور،
اس مرد باخدا کے عجب ہیں معاملے

ہر دوست کے لئے سپر اس کے جان و دل
اک تیر بے اماں ہے وہ دشمن کے واسطے

افرنگ کی نگاہ میں کانٹا بنا رہا
جس کی ہر ایک سانس سے صدہا چمن کھلے

صبح شباب، شام کہولت شب حیات
ٹکڑے ہیں اک جہاد مسلسل کے دیکھئے

قرآں کے معارف و انوار کا بیاں
خوش بخت ہے جو اس کی زباں سے کوئی سنے

صورت گرئ مانی وبہزاد خوب تھی
لیکن ہے گرد نطق بخاری کے سامنے

تقریر میں وہ حسن، بیاں میں وہ بانکپن
"کانوں میں گونجتے ہیں بخاری کے زمزمے"

"بلبل چہک رہا ہے ریاضِ رسول میں"

خلیق قریشی مرحوم

فتوحات بخاری کا ایک ورق

قاضی احسان احمد شجاع آبادیؒ

تحفظ داعیان مذہب اور امیر شریعت

انگریز نے اپنی مشہور رسوائے عالم پالیسی "لڑاؤ اور حکومت کرو" کے تحت متحدہ ہندوستان میں جہاں دیگر فتنوں کو جنم دیا وہاں اس نے اپنے مخصوص منصوبے کے پیش نظر ایک نہایت ہی خطرناک کھیل کھیلا، اپنے خود کاشتہ پودے کے زیر سایہ تربیت یافتہ قاسم علی ایڈیٹر فاروق، قادیان سے ایک کتاب لکھوائی جو انیسویں صدی کے مہرشی کے نام سے ۱۹۲۳ء میں فاروق منزل قادیان سے شائع ہوئی۔

اس کتاب کے شائع ہوتے ہی دنیائے آریہ سماج میں ایک زلزلہ سا آگیا واقعی کتاب شرفاء کے مجمع میں پڑھے جانے کے قابل نہیں، اس میں دیانند کی زندگی پر نہایت ہی گھناؤنے انداز میں تبصرے کئے گئے بد بخت آریوں نے بجائے اس کے کہ کتاب کے مصنف کے پیرو مرشد مرزا غلام قادیانی کی زندگی کو زیر بحث لاتے انہوں نے سید الاولین والاخرین رحمت دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات اطہر و اقدس پر نہایت ہی سوقیانہ انداز میں تنقید شائع کی۔ مرزائیوں کے مسلمانوں کی ایک شاخ سمجھنے کا یہ ایک اندوہناک نتیجہ تھا، آریوں کی اس اشتعال انگیز تحریر سے مسلمانوں میں غم و اضطراب کی لہر دوڑ گئی، ایک کتابچہ "رنگیلا رسول" کے نام سے شائع ہوا جس کا مواد بھی مسلمان فرقوں کی باہمی چپقلش اور زبان و قلم کی تیزیوں اور تلخیوں نے مہیا کیا، اس کتابچہ کے خلاف عدالتی چارہ جوئی کی گئی لیکن اس وقت کے ہائیکورٹ کے جج دلیپ سنگھ نے کتابچہ مذکور کے ناشر راج پال کو اس عذر پر بری کردیا کہ قانون میں داعیانِ مذاہب کے تحفظ ناموس کے لئے کوئی دفعہ موجود نہیں۔ ایسے وقت جب کہ قانون بے بس ہو اور کفر و استہزا کرنے والوں کے لئے کوئی ذریعہ باز پرس موجود نہ ہو اہل حق کا اضطراب و الم ناقابل برداشت ہوجاتا ہے۔

حضرت امیر شریعت نے اسلامیان ہند کو ہر شہر اور قریئے میں یہ دعوت دی کہ یا تو سرور دو عالم ﷺ کو برا کہنے والی زبان نہ رہے یا اس توہین کو سننے والے کان نہ رہیں۔

تحفظ ناموس سید المرسلین کی دعوت اور زبان حضرت شاہ جی کی۔ آپ کو تقریروں کے معاً بعد گرفتار کیا گیا۔ ملک کے ہر گوشے میں شاہ جی کی آواز پہنچ گئی، ایک شخص خدا بخش نامی نے راجپال پر حملہ کیا، لیکن ناکام رہا اور اسے چودہ سال کی سزا ہو گئی، پھر ایک اور شخص عبد العزیز نے مضطرب ہو کر حملہ کیا وہ بھی ناکام رہا۔

حضرت شاہ جی کی گرفتاری سے تحریک انتہائے عروج پر پہنچ گئی، انگریز کو اپنے آئین میں خامی کا اعتراف کرنا پڑا اور تعزیرات ہند میں تحفظ ناموس داعیان و اعیان مذاہب کی دفعہ بڑھانی پڑی، گویا حضور خاتم

النبیینﷺ کی رحمتہ اللعالمینی کے صدقے میں دوسری قوموں اور فرقوں کے داعیوں کے ناموس کی حفاظت ہو گئی۔

حضرت شاہ جی کی تقریر سے متاثر افراد میں ایک شخص علم الدین بھی تھا، جس نے نشۂ عشقِ مصطفوی سے سرشار ہو کر راجپال پر ایک کاری وار کر کے اس کو کیفر کردار تک پہنچایا، غازی علم الدین شہید کے مقدمے میں بھی ایک بہت بڑا درس بصیرت ہے، وکلاء آئینی موشگافیاں کرتے تھے اور شاہ جی معراج عشق کی راہ دکھاتے تھے۔ شاہ جی کی رائے تھی کہ علم الدین اپنے مسلک کی صحیح ترجمانی کرتے ہوئے اعتراف قتل کرے اور سچ سچ کہے کہ:

"میں نے بسلامتی عقل و خرد اور بقائمی ہوش و حواس قتل کیا ہے، اگر مجھے اب رہا کر دیا جائے اور کوئی شخص میرے آقا و مولا کی توہین کرے تو پھر اس طرح اسے قتل کر دوں گا"

اس طرح ایک سچے مسلمان کی تصویر سامنے آجائے گی، لیکن انگریزی آئین کے شیدائیوں نے شاہ جی کی تائید نہ کی پھر بھی علم الدین شہید تختۂ دار تک نشۂ عشق نبوی میں سرشار اقرار و اظہار صداقت کرتا رہا۔

بنا کروند خوش رسمے بخاب و خون غلطیدن
خدا رحمت کند ایں عاشقانِ پاک طنیت را

حضرت شاہ جی کی مساعی اور غازی علم الدین کی قربانی نے آریوں کے منصوبے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے دفن کر دیئے اور تقسیم ملک تک پھر کسی ناپاک قلم و زبان کو ایسی جسارت نہ ہوئی۔

تحریکِ تحفظ ختم نبوت ۱۹۵۳ء اور امیرِ شریعت

تحریک تحفظِ ختم نبوت جو مرزائیت پر آخری ضرب کاری ہے جس کے بعد مرزائیت کھل کر مسلمانوں کے مقابلے پر نہ آسکی۔ شاہ جی کی غیر معمولی مساعی کی ایک جھلک ہے۔

ایک وقت تھا جب مرزائی اپنے خطرناک عزائم کی تشہیر کھلم کھلا کرتے اور ان پر قدغن لگانے کا کسی میں حوصلہ نہ تھا وہ ریاست کے اندر ریاست کے تصور اور پاکستان کو ایک مرزائی سٹیٹ بنانے کے خواب ہی

کیوں نہ دیکھ رہے ہوں، ان کی طرف انگلی اٹھانے کی جرأت نہ ہوتی تھی تحریک تحفظ ختم نبوت کے بعد اگرچہ بظاہر مرزائیوں پر اس وقت کی حکومت کی طرف سے کوئی پابندی عائد نہیں ہوئی مگر حالات نے انہیں مجبور کر دیا کہ انگریز کے چلے جانے کے بعد شمع رسالت کے پروانے اور عزت و ناموس رسالت کے دیوانے زیادہ عرصے تک انہیں من مانی نہیں کرنے دیں گے۔ چنانچہ مجبوراً انہیں پینترا بدلنا پڑا جس کا اندازہ آپ موجودہ خلیفہ کے متضاد بیانات سے لگائیے:۔

۱۔ مسلمانوں سے ہمارا اختلاف بنیادی ہے

حضرت مسیح (مرزا) کے منہ سے نکلے ہوئے الفاظ میرے کانوں میں گونج رہے ہیں۔ آپ نے فرمایا یہ غلط ہے کہ دوسرے لوگوں سے ہمارا اختلاف صرف وفات مسیح یا اور چند مسائل میں ہے، آپ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کی ذات، رسول کریم (صلی اللہ علیہ وسلم)، قرآن، نماز اور روزہ، حج، زکوۃ غرضیکہ آپ نے تفصیل سے بتایا ایک ایک چیز میں ان سے (مسلمانوں) سے اختلاف ہے''

(تقریر خلیفہ قادیان مرزا محمود، اخبار الفضل

جلد ۱۹ نمبر ۱۳

اس کے برعکس وہ بیان جو خلیفہ صاحب نے تحقیقاتی عدالت میں دیا ملاحظہ فرمائیے۔

مسلمانوں سے ہمارا اختلاف بنیادی نہیں بلکہ فروعی ہے

سوال: کیا احمدیوں اور غیر احمدیوں کے درمیان اختلافات بنیادی ہیں؟

جواب: اگر لفظ بنیادی کا وہی مفہوم ہے جو ہمارے رسول کریم نے اس لفظ کا لیا ہے تب یہ اختلافات بنیادی نہیں ہیں بلکہ فروعی ہیں

سوال: اگر لفظ بنیادی عام معنوں میں لیا جائے پھر؟

جواب: عام معنوں میں اس کا مطلب "اہم" ہے لیکن اس مفہوم کے لحاظ سے بھی اختلافات بنیادی نہیں ہیں بلکہ فروعی ہیں۔

(تحقیقاتی عدالت میں مرزا محمود کا بیان ص ۱۶)

تمام مسلمان کافر ہیں

"کل مسلمان جو حضرت مسیح موعود (مرزا) کی بیعت میں شامل نہیں ہوئے خواہ انہوں نے مسیح موعود کا نام بھی نہیں سنا وہ کافر اور دائرہ اسلام سے خارج ہیں"

(آئینہ صداقت ص ۳۵ مصنفہ مرزا محمود احمد خلیفہ قادیان)

اب وہ بیان جو مرزا محمود احمد نے تحقیقاتی عدالت میں دیا ملاحظہ فرمائیے

سوال: کیا آپ مرزا غلام احمد کو ان نامورین میں شمار کرتے ہیں جن کا ماننا مسلمان کہلانے کے لئے ضروری ہے؟

جواب: میں اس سوال کا جواب پہلے دے چکا ہوں کوئی شخص جو مرزا غلام احمد پر ایمان نہیں لاتا دائرہ اسلام سے خارج قرار نہیں دیا جاسکتا

(ص ۲۸ تحقیقاتی عدالت میں بیان)

ملاحظہ فرمایا آپ نے یہ ہے تحریک تحفظ ختم نبوت کی فتح عظیم، یہ ہے شہدائے ختم نبوت کے خون بہا کی دنیا میں جزا، اور یہ ہے امیر شریعت کی ضرب کاری جس سے مرزائیت کا ایوان استبداد دھڑام سے زمین پر

آ رہا۔

وہ ٹولہ جو مسلمانوں کے ایمان و عقائد کو بہ جبر و اکراہ تبدیل کرنے پر تُلا ہوا ہو اور جس کی تکفیر سے کوئی مسلمان محفوظ نہ رہا ہو وہ ان مسلمانوں کو جو مرزا کو نبی نہ مانتے ہوں اب دائرہ اسلام سے خارج قرار دینے سے انکاری ہو۔ مرزائیت کی موت سے مترادف نہیں، مرزائیت اپنی موت آپ مر گئی اور شاہ جی اپنے مشن میں کامیاب ہوگئے، انہوں نے جہاں اپنے بد ترین دشمن انگریز کو پسپا کیا وہاں اس کی خطرناک ذریت کو بھی اپنے ہاتھوں دفن کردیا گویا شاہ جی سیاسی و مذہبی دونوں لحاظ سے اپنی زندگی ہی میں کامیابی سے ہمکنار ہوگئے سیاسی لحاظ سے باشندگان ملک کو سفید فام آقاؤں کے سیاہ آئین سے چھٹکارا دلوایا۔ اسی طرح مذہبی لحاظ سے انگریز سے زیادہ خطرناک، مذہب و ملت کے سب سے بڑے دشمن مرزائی ٹولے کو کیفر کردار تک پہنچا دیا۔

مسئلہ وراثت اور امیر شریعت

ایک وقت تھا کہ جائداد کا وارث کنبے میں باپ کا سب سے بڑا بیٹا ہوتا تھا، دوسری اولاد حق وراثت سے محروم رہ جاتی، اس کی وجہ یہ تھی کہ جائداد کے ٹکڑے ہونے اور ریاست کے بٹوارہ میں پیچیدگی کے باعث ایسے صریح مسئلہ سے انحراف برتا جاتا اور جائداد منقولہ و غیر منقولہ بڑے لڑکے کے نام منتقل کردی جاتی۔

غیر منقسم ہندوستان میں جلسوں اور کانفرنسوں میں وراثت کی شرعی تقسیم کے متعلق سب سے پہلے جس مرد مجاہد نے آواز اٹھائی وہ سید عطاءاللہ شاہ بخاری ایک عوامی خطیب اور بیباک مقرر تھا۔ مسلمان زمیندار اور رؤسا کے لئے یہ ایک اجنبی اور ساتھ ہی خطرناک آواز تھی۔ دولت و اقتدار کے نشے میں سرشار رئیسوں نے تو یہاں تک کہہ دیا تھا کہ قرآن کو غلاف میں لپیٹ کر گھروں میں رکھ دو ہمیں اس کی تعلیمات کی ضرورت نہیں۔

غریب جس کی حیات و موت کا دارومدار سرمایہ دار کے اشارۂ ابرو یا جنبشِ زبان میں ہوتا ہے اس کا ہمنوا تھا، اس مسموم اور زہریلی فضا میں

یوصیکم اللہ فی اولادکم للذکر مثل حظ الانثیین

کا قدیم سبق دہرایا ان کے ایمان و ایقان کی حد کو پہنچے ہوئے انحراف جو ان کی موت و حیات کا مسئلہ بن چکا تھا کے خلاف محاذ قائم کرنا اس کے اثرات و نتائج سے بے خبر اپنی دھن میں مگن رہنا۔ یہ صرف حضرت شاہ جی کی مسحور کن شخصیت کا غیر معمولی اثر تھا ورنہ بغیر دولت و اقتدار اور نامساعد و ناموافق حالات میں جب صرف ایک چیز کا رونا نہ ہو بلکہ سیاست و مذہب معیشت و معاشرت، ثقافت و تعلیم ایک غیر ملکی قوم اولی الامر بن کر عہدہ قضا و عدالت پر متمکن ہو وراثت جیسے اہم مسئلے کی تبلیغ اور بیگانوں کے علاوہ یگانوں کا ہدف طعن و تشنیع بننا جان جوکھوں کا کام نہیں تو اور کیا ہے۔ غرضیکہ شاہ جی

وہ اپنی ذات میں اک انجمن ہیں

نے جہاں سیاسیات میں فرنگی اقتدار کو للکارا وہاں مذہبیات میں رسوم و رواج جو ہندوؤں کی مخلوط سوسائٹی کی وجہ سے مسلمانوں میں رواج پا چکی تھیں اور ناموس تک اثر انداز ہو چکی تھیں، اعلان بغاوت کیا۔ ثقافت فرنگی کے

خطرات سے اپنی قوم کو آگاہ کیا، معاشرت و بہبود کے اسرار و رموز سکھائے۔

آپ نے کتاب و سنت کی مقررہ حدود کے اندر کسی رکاوٹ اور چیلنج کو در خور اعتنا نہ سمجھا اور یہ نہ دیکھا کہ آپ کا محارب و مقابل کون ہے۔ وہ باطل کے مقابلے میں یکسر فرزانہ، حق کے میدان میں سر بکف دیوانہ شاید اقبال کے اس شعر کی عملی تفسیر ہے۔

جس سے جگر لالہ میں ٹھنڈک ہو وہ شبنم

دریاؤں کے دل جس سے دہل جائیں وہ طوفاں

بالاخر وہ وقت آیا جب خدائے عزوجل نے شاہ جی کی کوہ پیمائی اور دشت نوردی کا صلہ یوں دیا کہ انڈین پارلیمنٹ میں کھڑے ہو کر کماری لجیاوتی نے اعلان کیا کہ ہمیں وراثت کا حصہ دلوایا جائے ورنہ ہم مسلمان ہوتی ہیں، سارا ایوان ششدر رہ گیا، کسی سے معقول جواب نہ بن پڑا تو پرنسپل چھبیل داس نے یہ کہہ کر ٹال دیا کہ بعض اوقات لڑکا کراچی کا اور لڑکی کلکتے کی ہوتی ہے۔ اس صورت میں انتقال اراضی اور تقسیم وراثت میں حد درجہ تکلیف ہوتی ہے، لجواوتی نے جواب دیا کہ جگر کا ٹکڑا جدا کرنے میں کوئی تکلیف نہیں ہوتی، زمین کا ٹکڑا انتقال کرنے میں مشکلات مانع ہیں، انڈین پریس تامل و تذبذب میں پڑ گیا کہ لجیاوتی کی زبان میں کون بول رہا ہے یہ آواز کچھ مانوس سی معلوم ہوتی ہے

باز گواز نجد اہم یاران نجد

تادر و دیوار را آری بہ وجد

کز برائے صحبتے حق سالہا

باز گور مزے ازاں خوشحا لہا

الغرض پاکستان بن گیا اور پرانے حاشیہ نشینان اسلام جو اپنی طرز فکر اور طرز بیان و استدلال میں بے نظیر و بے عدیل تھے کو یہ قانون بنانا پڑا کہ آئندہ پاکستان میں وراثت کی تقسیم شریعت کے مطابق ہو گی جن کا انڈین پارلیمنٹ میں یہ اعلان ہوتا تھا کہ ہم رواج کے پابند ہیں شریعت ہمیں منظور نہیں۔ جو قائد اور سر خیل حکومت پاکستان کے اس قانون کی تکمیل سے عہدہ بر آنہ ہوسکے۔ کیونکہ اقتدار خود ان کا غلام تھا۔ آج مارشل لاء کے نفاذ کے بعد اور زرعی اصلاحات کے بعد جب زمین کو اپنے ہاتھ سے جاتے دیکھا تو وراثت کی حقدار ماں، بیٹی، اور بہن بھی یاد آ گئی۔ بفضلہ تعالیٰ شاہ جی نے اپنی حیات میں ہی اپنے مشن کی تکمیل دیکھ لی۔

فاالحمد للہ علی ذالک

چوں نشتری بسینۂ ملت خلید و رفت

جوق از درون سینہ، ہستی دمید و رفت	طوفان شعلہ در رگ دوران جہید ورفت
چوں خنجری بقلب عزیزاں فرو نشت	چوں نشتری بسینۂ ملت خلید و رفت
چوں داغ درد دردل حسرت نشت و خاست	چوں اشک غم زدیدۂ حرماں چکیدہ رفت
دیوانہ بود و شیوۂ دیوانگی نمود!	افسانہ گشت و برلب دنیا رسید و رفت
صد قصہ ہائے درد و الم گفت و شد خموش	آشفتہ حالیٔ دلِ یاران ندید و رفت

شہباز ما پرید و رہ آسماں گرفت!
مرغی نہ رفتہ است کہ دیگر تو آں گرفت

رُو تافتہ ز عالم امکان چگو نہ ای	ای رہسپار روضۂ رضواں چگونہ ای
صدِ حشر آفرید بمحفل نوای تو!	برق تپاں ورعد غریواں چگوز ای
یکدَم نبود قلب ترا فرصت قرار	آسودہ درمیاں خموشاں چگونہ ای

خفتی بخاک و طالع یاران تو نخفت	ای بختِ مابخواب پریشاں چگونہ ای
لبِ تشنگی نزد و خونِ آشامی دولت	تا خوردہ آب چشمۂ حیواں چگونہ ای

چوں سربسر رضائے خدا بود کار تو
خود میکشید رحمت حق انتظار تو

صوفی تبسمؔ

محافظ ختم نبوت

مولانا لال حسین اختر رحمۃ اللہ علیہ

امیر شریعت مرحوم کے پیش نظر زندگی کے پہلا لمحے تک تین مقاصد رہے۔ ان کی زندگی کا سب سے آخری مقصد انگریز کی غلامی سے قوم اور ملک کو آزادی دلانا۔ دوسرا مقصد تحفظ ختم نبوت اور تیسرا مقصد استحکام ملک تھا۔ اس بات کو ایک زمانہ بیت چکا ہے۔ جب انگریز نے اختتام جنگ کے بعد مسلمانوں کے مقامات مقدسہ پر خلاف وعدہ قبضہ جما لیا۔ فرنگی کی اس مذموم حرکت نے پوری دنیائے اسلام کو آتش زیر پا کر دیا۔ متحدہ ہندوستان میں مولانا شیخ الہند محمود حسن اسیر مالٹا۔ مولانا حسین احمد مدنی مرحوم، ڈاکٹر انصاری اور حکیم اجمل خاں وغیر ہم نے یہ عہد کیا کہ وہ اپنی جان تک کی بازی لگا دیں گے مگر انگریز کے استعمار پسندانہ اقدامات کو ہرگز برداشت نہیں کریں گے۔ امیر شریعت مرحوم اور ان کی جماعت مجلس احرار اسلام نے بھی اسی عہد کو اپنایا۔ ۱۹۲۰ء میں سید عطاء اللہ شاہ بخاری مرحوم مدرسہ کو چھوڑ کر میدان جہاد میں اتر آئے۔ اور ۱۹۴۷ء تک عظیم الشان قربانیاں دیں۔ ۱۹۲۰ء سے ۱۹۴۷ء تک ۲۷ سال کے عرصہ میں تقریباً دس سال جیل کی صعوبتیں برداشت کیں۔ اس وقت کے خان بہادر سر اور ٹوڈی حضرات کہا کرتے تھے کہ انگریز ہندوستان سے نہیں جائے گا۔ مگر یہ چند مجاہد کہا کرتے تھے کہ یا انگریز کو نکال دیں گے یا اپنی جان ختم کر دیں گے۔ آخر کار امیر شریعت اور ان کی جماعت احرار کا یہ مقدس قافلہ اس ملک کو انگریزوں سے پاک کرنے میں کامیاب ہوا۔ اور فوجوں، خان بہادروں، سروں، جھوٹے ولیوں اور نبیوں والے انگریز کو درویشوں کی راست روی اور راسخ الاعتقادی کے سامنے ہتھیار ڈالنے پڑے۔ اور ہندوستان سے نکل جانا پڑا۔ اس طرح سے شاہ جی مرحوم اپنے زندگی کے مقصد اولیٰ میں کامیاب و کامران ہوئے۔

شاہ جی مرحوم کی زندگی کا دوسرا مقصد تحفظ ختم نبوت تھا۔ جس پر ہمیں تازیست قائم رہنے کا عہد کرنا ہے۔ امیر شریعت مرحوم کہا کرتے تھے کہ ہماری نماز، حج، روزہ، زکوٰۃ، شریعت، طریقت، حقیقت، تہذیب، معاشرت، تمدن، اخلاق، مذہب غرضیکہ مکمل دین اسلام حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ختم المرسلینی کے گرد چکر لگا رہا ہے۔ یہ عقیدے کی بات ہے کہ اگر کوئی شخص پوری زندگی لا الہ الا اللہ کہتا رہے تو وہ مسلمان نہیں کہلائے گا جب تک محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نہ کہے اور حضور کا اتباع نہ کرے۔

موت کا ذائقہ ہر انسان کو چکھنا ہے۔ اس سے ولی، غوث، قطب، اور نبیوں تک کو مفر نہیں ہے۔ مگر قابل غور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد ہے کہ تدفین کے بعد بعض کی قبر جنت کا باغیچہ بن جاتی ہے اور بعض کی قبر جہنم کا گڑھا۔ حضرت امیر شریعت کی پوری زندگی مجاہدانہ گزری ہے۔ ان کی کیا تعریف کی جائے وہ ہماری تعریف سے بے نیاز تھے۔ اور ہیں۔ شاہ جی کی زندگی میں ایک شخص نے سٹیج پر ان کی

تعریف کرنا شروع کر دی تو شاہ جی نے اٹھ کر اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا گویا وہ اپنی تعریف سننا پسند نہیں کرتے تھے۔ آج بھی شاہ جی مرحوم کی اس قدر تعریف کرنے کی ضرورت نہیں۔ جتنی کہ ان کے کردار کو اپنانے کی ضرورت ہے۔ شاہ جی فرمایا کرتے تھے۔ تمام کا تمام دین حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ختم المرسلینی سے وابستہ ہے۔ ان کی نبوت کو الگ کر دیا جائے تو باقی کچھ نہیں رہتا۔ لہٰذا میری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہمیں شاہ جی کے نقش قدم پر چلنے کی توفیق عطا فرمائے۔ جس پر چلتے ہوئے انہوں نے اپنی جان جانِ آفرین کے سپرد کر دی۔

حضرت امیر شریعت مرحوم نے بتایا کہ تین سال قبل جب وہ ایک شب وضو کرنے گئے۔ ان پر فالج کا حملہ ہوا۔ ان میں اتنی سکت نہ رہی کہ پانی کا کوزہ اٹھا سکیں۔ اس وقت انہیں خیال آیا کہ اپنی رفیقۂ حیات یا بچوں میں سے کسی کو پکاریں۔ مگر ان کے ضمیر نے خدا کے سوا کسی کو مدد کے لئے پکارنا گوارا نہ کیا۔ چنانچہ اس لاچاری کے عالم میں بقول امیر شریعت انہوں نے کلمہ توحید یوں پڑھنا شروع کر دیا۔

لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ لا نبی بعدہ

اس کے بعد انہوں نے بڑی مشکل سے وضو کیا۔ اور اشاروں سے نماز ادا کی۔ امیر شریعت خود امیر شریعت نہیں بن گئے تھے۔ اور نہ ہی چند آدمیوں نے بیٹھ کر انہیں یہ خطاب دے دیا تھا۔ دراصل واقعہ یوں ہے کہ محدث العصر حضرت علامہ محمد انور شاہ کاشمیری رحمتہ اللہ علیہ آخری بار لاہور تشریف لائے تو قریباً پانچ صد علماء کا اجتماع ہوا۔ انجمن خدام الدین کا جلسہ تھا۔ اس اجتماع میں علم و فضل کے مالک بڑے بڑے جید علماء اور اکابر موجود تھے۔ جن میں مولانا شبیر احمد عثمانی، مفتی کفایت اللہ، مولانا حسین احمد مدنی ایسی ہستیاں بھی شامل تھیں وہاں علامہ انور شاہ رحمتہ اللہ علیہ نے فرمایا کہ "ہم نے جہاد باللسان کرنا ہے۔ کسی کو امیر بنانے کا مسئلہ درپیش ہے۔ میرا وجدان کہتا ہے کہ اس وقت شریعت کی حفاظت کے لئے سید عطاء اللہ شاہ بخاری نہایت ہی موزوں ہیں اور شاہ جی کا ہاتھ پکڑ کر انہیں اجتماع علماء کے سامنے کھڑا کر دیا۔ اور کہا کہ میں سب سے اول بیعت کرتا ہوں۔ اور عطاء اللہ شاہ صاحب کو امیر شریعت منتخب کرتا ہوں۔ اس وقت سے سید عطاء اللہ شاہ بخاری مرحوم کو امیر شریعت کے خطاب سے یاد کیا جانے لگا۔

ناموس رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا سوال اور بخاری کی زبان۔ آپ اندازہ فرمائیے کیا عالم ہو گا۔ شاہ جی فرماتے تھے کہ حضور کی شان میں گستاخی کرنے والی زبان نہ رہے گی یا سننے والے کان نہیں رہیں گے۔

حضرت امیر شریعت مرحوم علماء کرام کے محبوب، مزدوروں کے حامی، غریبوں کے دوست، ختم نبوت کے محافظ، صحابہ کرام کے مداح اور بزرگان دین کے متبع تھے۔

شاہ جی نے تحریک تحفظ ختم نبوت کے دوران تمام دینی جماعتوں اور مختلف مکاتب فکر کے علماء کو ایک پلیٹ فارم پر جمع کر دیا۔ یہ آپ کا عظیم الشان کارنامہ تھا۔ جس کی گزشتہ پانچ صد سالہ تاریخ میں مثال نہیں ملتی۔

احرار اور سیاست

بعض لوگ ایک غلط فہمی میں مبتلا ہیں کہ "مجلس احرار اسلام" چونکہ "الیکشن بازی" سے الگ ہو گئی ہے لہذا اب اسے ملکی معاملات میں دخل اندازی کی ضرورت نہیں رہی۔

گویا ان کا مطلب ہے کہ ہم لوگ مر چکے ہیں یا ہم نے ملک چھوڑ دیا ہے؟ نہیں اور ہر گز ایسا نہیں! یہ انکی ناتمام خواہش تو ہو سکتی ہے، حقیقت نہیں۔

احرار کا وجود اور کردار تاریخ کی بہت بڑی صداقت ہے۔ سیاست افرنگ کے فریب خوردہ اسیر سن لیں۔

ہم نے اپنے ملک اور اپنے حقوق سے قطعاً کنارا کشی نہیں کی۔ کوئی شریف انسان ایسا نہیں کر سکتا کہ وہ اپنے حقوق شہریت زائل کر دے۔ پاکستان ہمارا ملک ہے اور ہمیں ایک آزاد شہری کی حیثیت سے یہاں رہنا ہے، بات کرنا ہے، صحیح راستہ دکھانا ہے اور غلط روی پر ٹوکنا ہے۔ گرد و پیش کے مسائل اور حالات سے ہم چشم پوشی کر سکتے ہیں نہ لاتعلق رہ سکتے ہیں۔ اس ملک کی تعمیر میں ہمارا ہی خون پسینہ ہے، ہمیں تمام ملکی معاملات پر اپنی رائے کا برملا اظہار کرنا ہے۔ سیاست اور معیشت و تجارت میں حصہ لینا ہے اور ملازمتوں میں اپنا حق بھی وصول کرنا ہے۔ ہمارے بچوں نے یہیں تعلیم حاصل کرنی ہے۔ اور تعلیم کے بعد ملازمت بھی ان کا بنیادی حق ہے ملکی معاملات میں ہمارا بھی اتنا ہی دخل ہو گا جتنا اور کسی کو دعویٰ ہو سکتا ہے ہم اپنا حق شہریت پورا پورا استعمال کریں گے اور کسی قیمت اس سے دستبردار نہیں ہوں گے۔

قافلۂ احرار رکا نہیں ہے ہم نے تو صرف جدوجہد کا رخ بدلا ہے یہ ضروری نہیں کہ ہمیشہ سول نافرمانی، ڈائریکٹ ایکشن یا الیکشن کے ذریعے ہی اپنے حقوق حاصل کئے جائیں اور بہت سے معقول ذرائع سے بھی یہ حقوق حاصل ہو سکتے ہیں۔

مجلس احرار اسلام کو اب ملکی سیاست میں نئی حکمت عملی کے ساتھ ایک فعال کردار ادا کرنا ہے۔

امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاری

اقتباس خطبہ صدارت

کل پاکستان تحفظ ختم نبوت احرار کانفرنس ملتان نومبر ۱۹۵۰ء

جسے ملتا رہا الزام، دل کی بے قراری کا

وہ عالم کون بھولے گا عطاء اللہ بخاری کا
کہ اس کا ہر نفس پیغام تھا بادِ بہاری کا
وہ حق گر تھا، وہ حق بیں تھا، وہ حق پر جان دیتا تھا
ادا اس نے کیا حق، دینِ حق پر جاں نثاری کا
قدم لیتی رہی خود بڑھ کے تاثیرِ زباں اس کے
اسے معلوم تھا ہر راز دل کی کامگاری کا
کبھی بددل نہ اس کو کر سکی زنداں کی تنہائی
ہزاروں بار آیا مرحلہ اختر شماری کا
ہراساں کر سکی اس کو نہ باطل کی ستم رانی
اسے خدشہ نہ تھا انگریز کی ناسازگاری کا
فروغِ زیست تھا وہ شعلۂ بیتاب سینے میں
جسے ملتا رہا الزام، دل کی بے قراری کا
مشائخ ملک و ملت موت کے پنجے میں جا پہنچے
کسی جانب سے کیوں اظہار ہو اب شرمساری کا
نہ روکے تلخیٔ عمرِ رواں میرے تکلم کو!!
کہ میں نوحہ کروں گا وقت کی غفلت شعاری کا
بنائے میکدہ دردل، تہی ساغر بکف انور
زمانہ پائے گا انداز اس کی بادہ خواری کا

علامہ لطیف انور مرحوم

امیر شریعت کی رفاقت میں

حضرت مولانا عنایت اللہ چشتی مدظلہ
سابق خطیب مسجد ختم نبوت (قادیان)

حضرت امیر شریعت کے ساتھ اس عاجز کو طویل عرصہ رفاقت قریبہ کا شرف نصیب ہوا۔ خلوت و جلوت میں اکٹھے رہے۔ سوائے نیکی، شرافت، نجابت کے دوسری کوئی چیز نہیں دیکھی۔ دوستوں سے بے پناہ محبت رکھتے تھے۔ نہ صرف محبت بلکہ انتہائی تواضع و انکساری سے پیش آتے تھے۔ مجھے وہ دن یاد ہے کہ ایک دفعہ قادیان سے امرتسر حضرت کے دولت کدہ پر حاضری کا شرف نصیب ہوا۔ کھانے کا وقت تھا۔ دستر خوان بچھایا اور ماحضر نہایت قرینہ سے چنا گیا۔ فرمایا "عطاء المنعم (آپ کے بڑے فرزند) چچا کے ہاتھ دھلائے؟" انہوں نے عرض کی "ابا جان! میں اوپر کھانا لینے گیا تھا تو انہوں نے خود ہاتھ دھو لئے" گرج کر فرمایا۔ "تم نے کیوں نہیں دھلائے اٹھو اور اپنے ہاتھ سے ان کے ہاتھ دھلاؤ۔ تمہیں علم نہیں کہ مہمان کے ہاتھ دھلانا بھی کارِ ثواب ہے" عطاء المنعم کھانے سے اٹھے اور پانی کا لوٹا اٹھا کر دوبارہ ہاتھ دھلائے۔ بہت خوش ہوئے اور فرمایا "بیٹا میں نے تمہیں ادب سکھانے کے لئے ایسا کہا ہے" سبحان اللہ مکارمِ اخلاق کی کیا شان ہے۔

اس کے بعد جب حاضری ہوتی تو حضرت عطاء المنعم صاحب کھانے سے زیادہ ہاتھ دھلانے کا اہتمام فرماتے۔

آپ کا قلب سرورِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت سے معمور تھا۔ ذرا سا لفظ بھی جو تادّب کے خلاف ہو۔ حضور ﷺ کی شان میں برداشت نہیں کرتے تھے۔

حضرت امیر شریعت کا وہ مشہور و معروف مقدمہ جب آپ کو کوہ مسوری سے گرفتار کر کے گورداسپور لایا گیا۔ یہ مقدمہ حضرت کی اس تقریر کی بناء پر بنایا گیا تھا۔ جو آپ نے قادیان میں ایک لاکھ کے مجمع عام میں احرار کانفرنس کے موقعہ پر کی تھی۔

اس مجمع میں موجود اصحاب کو یاد ہو گا کہ آپ نے فرمایا تھا۔

"فرعونی تخت الٹا جا رہا ہے"

ایک لاکھ کا مجمع بے خود ہو کر جھوم رہا تھا۔ یہ تقریر شام کے آٹھ بجے شروع ہوئی تھی اور صبح اڑھائی تین بجے ختم ہوئی۔ اور مجمع برابر شام سے صبح تک مسحور رہا۔ یہ مقدمہ اور مسٹر کھوسلہ سیشن جج گورداسپور کا فیصلہ ایک تاریخی دستاویز ہے۔ جس کی ہیرو حضرت امیر شریعت کی بلند پایہ شخصیت ہے۔

چودھری افضل حق مرحوم فرمایا کرتے تھے کہ

"حضرت امیر شریعت نہ صرف ایک بلند پایہ خطیب ہیں بلکہ نہایت عمدہ

سوچنے والے مدبر ہیں۔ لیکن میں کیا کروں۔ مجھے تو وہ بہت دیر سے ملتے ہیں۔
جب کبھی کسی اہم سیاسی معاملہ پر ان سے مشورہ کرنا ہوتا ہے تو انکی لاہور آمد کے
لئے شدید انتظار کرنا پڑتا ہے۔ کاش شاہ جی مجھے جلدی جلدی ملتے تو ذہنی کوفت
سے مجھے نجات ملتی"

وقت چلا جاتا ہے واقعات نقش بہ حجر رہتے ہیں۔ ایک دفعہ سیالکوٹ میں حضرت امیر شریعت کی تقریر کا انتظام ایک مندر کے طویل و عریض احاطہ میں کیا گیا۔ سیالکوٹ کے لوگ آپ کی تقریر کے عاشق تھے۔ اتنا مجمع ہوا کہ سیالکوٹ کی تاریخ نے شاید ہی دیکھا ہو۔ خصوصاً ہندو اتنی زیادہ تعداد میں آپ کی تقریر سننے آئے تھے کہ مسلمانوں سے بھی ان کی تعداد زیادہ تھی۔ آپ کی تقریر کا موضوع تھا۔ "ہندوستان کی آزادی" انقلاب زندہ باد کے فلک بوس نعروں سے آپ کی تقریر شروع ہوئی۔ غیر ملکی حکومت کی خرابیاں بیان کرتے ہوئے گفتگو کا ریلا اس موڑ پر پہنچا کہ ہمارے حصول مقصد کے راستے میں مضبوط روڑا کونسا ہے۔ منجملہ اسباب و علل بیان کرتے ہوئے ہندوؤں کی تنگ نظری کا ذکر آیا۔ مجمع میں اکثریت ہندوؤں کی تھی اور تقریر سیالکوٹ کے ایک عظیم الشان مندر میں ہو رہی تھی۔ ہندوؤں کا ایک جم غفیر تقریر سننے کے لئے موجود تھا۔ حضرت نے ہندوؤں کی تنگ نظری پر سیر حاصل تبصرہ کیا۔ آپ نے نہ صرف ہندوؤں کے مذموم اخلاق کو تفصیل سے بیان کیا بلکہ انکی مذہبی تنگ نظری کو بیان کر کے اسلام اور ہندو ازم کا مقابلہ کیا۔ ہندو مجمع مارے شرم کے پانی پانی ہو رہا تھا۔ اور مسلمان فلک شگاف نعرے لگا رہے تھے۔ "اسلام زندہ باد" "امیر شریعت زندہ باد" شاہ جی نے اس مجمع میں جو کچھ فرمایا وہ ان کی شانِ خصوصی تھی۔ ورنہ اگر کوئی دوسرا مسلمان لیڈر اس قسم کا تبصرہ کرتا تو تنگ نظر ہندو قتل و مقاتلہ کے لئے تیار ہو جاتے۔ لیکن وہاں ایک شان ہی نرالی تھی۔ شاہ جی کی زبانِ فیض ترجمان سے جو کچھ نکل رہا تھا۔ ہندو زبانِ حال سے اس کی تصدیق کر رہے تھے۔ اور اندر ہی اندر شرمسار ہو رہے تھے۔ تقریر کے بعد جو غالباً ڈیڑھ دو بجے ختم ہوئی تھی ہندو ہاتھ جوڑ کر آپ کی تعظیم کر رہے تھے۔ اور ملال کا کہیں نام و نشان نہیں تھا۔ ورنہ کیا مجال کہ ایسے مجمع میں جہاں ہندوؤں کی اکثریت ہو ہندو ازم کے خلاف کوئی مسلمان لیڈر ایک لفظ تک کہہ سکے۔

ایک دفعہ حضرت امیر شریعت بٹالہ، گورداسپور تشریف لائے۔ ہندوؤں کا ایک مجمع حضرت کی خدمت میں حاضر ہوا۔ اور خواہش ظاہر کی کہ حضرت آج ہمیں کچھ سنائیں۔ آپ نے فرمایا کیا سناؤں میں تو قرآن جانتا ہوں۔ انہوں نے عرض کیا ہمیں بھی قرآن سنائیے۔ ہم نہایت شوق سے قرآن سنیں گے۔ آپ نے کلمہ توحید لاالہ الااللہ کی تشریح و توضیح اس انداز میں بیان کی کہ ہندو مجمع عش عش کر اٹھا۔ آپ کی تقریر تقریباً دو گھنٹے تک جاری رہی۔ اور وہ اس حد تک متاثر ہوئے کہ اس کے بعد جب کبھی ہم قادیان سے بٹالہ آتے تو لوگ ہم سے خواہش کرتے کہ کبھی حضرت امیر شریعت پھر بٹالہ تشریف لائیں اور ہمیں وہی لاالہ الا اللہ کی تشریح و توضیح سنائیں۔ حضرت کے طفیل وہ لوگ ہماری بھی بہت تعظیم و توقیر کرتے تھے۔ اللہ تبارک و تعالیٰ حضرت شاہ جی مرحوم کے درجات بلند فرمائے اور ان کی مغفرت فرمائے۔ آمین

تصویر کے دو رخ

مرزا قادیانی کے دعویٰ نبوت کی حقیقت

ستم دیکھئے یہ لوگ کس قدر بے بصیرت ہیں، کتنے عاقبت نااندیش ہیں کہ لباس نبوت کس کے بدن پر مزین کرنے کی سعی میں مصروف ہیں۔ جسے گڑ اور کلوخ میں تمیز نہیں، جسے جوتا پہننے کا سلیقہ نہیں، دایاں بائیں میں اور بایاں دائیں میں، گڑ سے استنجا کیا جارہا ہے اور مٹی کھائی جارہی ہے۔

دیکھا! میاں ﷺ کی عزت پر ہاتھ ڈالا تو خدائے غیور نے عقل ہی سلب کرلی اور مخبوط الحواس بنادیا۔ تصویر کا ایک رخ تو یہ ہے کہ مرزا غلام قادیانی میں یہ کمزوریاں اور عیوب تھے۔ اس کے نقوش میں توازن نہ تھا، قدوقامت میں تناسب نہ تھا، اخلاق کا جنازہ تھا کریکٹر کی موت تھا، سچ کبھی بولتا نہ تھا، معاملات کا درست نہ تھا، بات کا پکا نہ تھا، بزدل اور ٹوڈی تھا، تقریر و تحریر ایسی ہے کہ پڑھ کر متلی ہونے لگتی ہے لیکن میں آپ سے پوچھتا ہوں کہ اگر اس میں کوئی کمزوری بھی نہ ہوتی وہ مجسمہ حسن ہوتا، قویٰ میں تناسب ہوتا، چھاتی ۴۵ انچ ہوتی، کمر ایسی کہ سی آئی ڈی کو بھی پتہ نہ چلتا، بہادر بھی ہوتا، مرد میدان ہوتا، کیریکٹر کا آفتاب ہوتا، خاندان کا ماہتاب ہوتا، شاعر ہوتا، فردوسی وقت ہوتا، ابوالفضل اس کا پانی بھرتا، خیام اس کی چاکری کرتا، غالب اس کا وظیفہ خوار ہوتا، انگریزی کا شیکسپیئر اور اردو کا ابوالکلام ہوتا، پھر نبوت کا دعویٰ کرتا تو پھر کیا ہم اسے نبی مان لیتے-------؟

میں تو کہتا ہوں کہ اگر خواجہ غریب نواز اجمیری، سید عبد القادر جیلانی، امام ابوحنیفہ، امام بخاری، امام مالک، امام شافعی، ابن تیمیہ، غزالی، حسن بصری بھی نبوت کا دعویٰ کرتے تو کیا ہم انہیں نبی مان لیتے؟ علیؓ دعویٰ کرتے کہ جسے تلوار حق نے دی اور بیٹی نبی نے دی، سیدنا ابوبکر صدیقؓ، سیدنا عمر فاروقؓ اور سیدنا عثمان غنیؓ بھی دعویٰ کرتے تو کیا بخاری انہیں نبی مان لیتا؟ نہیں اور ہرگز نہیں۔ میاں ﷺ کے بعد کائنات میں کوئی انسان ایسا نہیں جو تخت نبوت پر سج سکے اور تاج امامت و رسالت جس کے سر پر ناز کرسکے وہ ایک ہی ہے جس کے دم قدم سے کائنات میں نبوت سرفراز ہوئی۔

و الصلوٰۃ و السلام علیٰ سید الرسل و خاتم الانبیاء

بانی احرار امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاری

اقتباس خطاب

تحفظ ختم نبوت احرار کانفرنس ستمبر ۱۹۵۱ء کراچی

سلام اے امیرِ شریعت سلام!

سلام اے امیرِ شریعت سلام
سلام کرامت ہے خیر الختام
امیرِ شریعت تھے جیسے کہ آپ
کلام آپ کا تھا امیر الکلام
رہا عمر بھر دین سے انہماک
رہا عمر بھر دین سے انضمام
ودیعت ہوا دل کو عشقِ رسول
زباں کو ملا زادِ حُسنِ کلام
مراتب بڑھائے خدا آپ کے
ملے خُلد میں سب سے اعلیٰ مقام
مجھے فکرِ تاریخ تھی رات جب
تو قدرت نے یوں کر دیا اہتمام
کہا جھک کے ہاتف نے سال وفات
سلام اے کلیم شریعت سلام

۲۸+۱۳۵۳ھ = ۱۳۸۱ھ

علامہ طالوت مرحوم

حضرت مولانا غلام غوث ہزاروی رحمۃ اللہ علیہ

امیر شریعت، جامع الصفات شخصیت

حضرت مولانا غلام غوث ہزاروی رحمۃ اللہ علیہ تقسیم ہند سے قبل قافلہ احرار میں شامل ہوئے۔ وہ مغربی پاکستان مجلس احرار اسلام کے ناظم اعلیٰ بھی رہے۔ برصغیر کی آزادی کے لئے مجلس احرار اسلام کے سٹیج سے بے شمار تحریکوں میں بھرپور حصہ لیا اور قید و بند کی اذیتیں بھی برداشت کیں۔ وہ سیاست دان بھی تھے اور عارف باللہ بھی۔ انہوں نے جہاد آزادی میں حضرت امیر شریعت کی رفاقت میں زندگی کا بہترین حصہ گزارا۔ ۱۹۵۳ء کی تحریک تحفظ ختم نبوت کے بعد مجلس احرار اسلام سے علیحدہ ہو کر جمعیت علمائے اسلام قائم کرلی، جمعیت کو پروان چڑھایا۔ مگر عمر کے آخری حصہ میں اپنے ہی رفیق مولانا مفتی محمود کے ہاتھوں پٹ گئے، مفتی صاحب مرحوم نے انہیں جمعیت سے نکال دیا اللہ تعالیٰ دونوں کی مغفرت فرمائے۔ آمین۔

(ادارہ)

امیر شریعت کے محاسن و مناقب بیان کرنے میں ہر صاحب قلم نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا ہے۔ ہر حساس مسلمان نے ان کی جدائی کا صدمہ محسوس کیا ہے۔ ہر اللہ والے نے ان کے لئے دعا فرمائی ہے۔ مرزائیوں اور رافضیوں کے سوا ہر طبقہ نے ان کی وفات کو عظیم ملی سانحہ قرار دیا ہے۔

میں نے اس صف میں کبھی اپنے کو شمار نہیں کیا۔ مگر حضرت شاہ جی رحمۃ اللہ علیہ کے نام لیواؤں کی فہرست میں شمول کی عزت کی خاطر چند سطریں لکھتا ہوں۔

میں چاہتا ہوں کہ ملت کو اپنے امیر شریعت کے اسوہ سے فائدہ پہنچے اس لئے ان کی چند خوبیاں بیان کرنے کی سعادت حاصل کرتا ہوں۔

تواضع انکسار

حضرت شاہ جی جتنے بڑے انسان تھے اتنا ہی وہ اپنے کو چھوٹا سمجھتے۔ انکسار کا ان پر اتنا غلبہ تھا کہ کبھی ممتاز جگہ پر بیٹھنا پسند نہیں فرمایا۔ جب سادات کو عام طور پر چارپائی پر بٹھاتے ہیں تو خود نیچے بیٹھ جایا کرتے ہیں۔ عوام کے لئے سادات کا احترام تو حسن اسلام کی نشانی ہے مگر سادات کو کیا کرنا چاہیئے اس میں سب کو سب سے بڑے سید یعنی سید الکونین کی پیروی ہی باعث عز و افتخار ہے جب آنحضرت ﷺ صحابہ رضی اللہ عنہم کرام کے ہمراہ راستے پر چلتے تھے تو سب کے آگے ہو کر بلکہ کیف ما اتفق (جیسے بھی ہو جائے) ان میں شامل ہو کر چلتے اور باوجود اس کے بطور معجزہ آپ سب سے نمایاں اور ممتاز نظر آتے۔ یہی حال حضرت شاہ جی کا تھا آپ متبع سنت تھے۔

سب کے برابر چلتے سب کے ساتھ بیٹھتے اور سب سے مل کر کھانا کھاتے۔ آپ امتیاز شان کو کبھی پسند نہ فرماتے۔ کوئی بھی آتا اسے اپنے ساتھ چارپائی پر بٹھاتے۔ دوست اور خدام ہچکچاتے آپ ازراہ مزاح فرماتے کہ بھائی میں کوئی اچھوت تو نہیں مجبور ہو کر سب کو حکم کی تعمیل کرنی پڑتی۔

آپ اگر چاہتے تو آپ کے پروانے آپ کو فرسٹ کلاس کیا ہوائی جہاز میں سفر کراتے مگر آپ کا اکثر سفر تھرڈ کلاس میں ہوتا رہا۔ مگر جہاں بیٹھ گئے وہی جگہ گل و گلزار بلکہ زعفران زار ہو گئی۔ مفسر قرآن جامع شریعت و طریقت حضرت مولانا احمد علی صاحب[1] مدظلہ فرماتے ہیں کہ حضرت شاہ جی کے پاس بیٹھنے سے غم پاس نہ بھٹکتا تھا۔

خورد و کلاں امیر و غریب سب کے ساتھ حضرت شاہ صاحب کا یہی سلوک تھا۔ وہ ہر آدمی کی عزت کرتے اور کسی کو بھی ذلیل نہ سمجھتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ ہر شخص کے دل میں آپ کے لئے محبت کے جذبات موجزن رہے۔

ہاں ان کے دل میں فرنگی اور مرزائیوں کے لئے کوئی گنجائش نہ تھی۔ اور جہاں آنحضرت ﷺ کی عزت و ناموس کا سوال آتا وہاں وہ بے قابو ہو جاتے۔

جفاکشی اور دلیری

اکثر علماء کے دورے بڑے بڑے شہروں میں ہوتے ہیں۔ لیڈروں کا تو کیا کہنا ان کے لئے تو تیار اسٹیج چاہیئے جہاں کہ وہ موٹر سے اتر کر ایک عدد لیکچر جھاڑ دیں۔ بعض مبلغین دیہات میں بھی جاتے ہیں مگر حضرت شاہ صاحب سب سے نرالے تھے۔ ان کی جوانی اور زندگی کا قابل فخر زمانہ ڈیرہ غازی خاں، مظفر گڑھ، ملتان وغیرہ اضلاع کے خشک اور ریتلے میدانوں، گرم ہواؤں اور گرد و غبار کے طوفانوں سے محبت میں گزرا۔ کبھی پیدل کبھی گھوڑے اور کبھی اونٹ پر چلے جا رہے ہیں۔

ان کو بے بس مسلمانوں کی غربت کھائے جا رہی تھی۔ جو روایت و رسوم اور بدعات کے شکار ہونے کی وجہ سے مال و دولت کے سوا ناموس تک کو گروی رکھ دینے پر مجبور ہو جاتے۔

وہ جہاں جاتے۔ سطحی دورہ کر کے کبھی واپس نہ ہوتے نہ تقریریں بیچ کر کمائی کا حساب لگاتے۔ وہ ہر جگہ جم کر کام کرتے کہیں کہیں ڈیرہ ڈال دیتے اور تب نکلتے کہ وہ علاقہ صاف ہو جاتا یا حق کی حامی جماعت بن جاتی۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو جرأت و ہمت کا وہ جوہر عطا فرمایا تھا جو کم کسی کو نصیب ہوتا ہے انگریزوں کے اقتدار کے زمانہ میں پرستاران فرنگی کے غضبناک ہجوم کے اندر فریب خوردہ جوشیلے اور نادان مسلمانوں کی مخالفت کے طوفان میں گھس کر حق کہنا اور پھر سب کے دلوں کو فتح کر لینا شاہ جی پر اللہ تعالیٰ کا خاص کرم تھا۔ کہیں کھانا دیر سے ملا۔ کہیں آرام کی جگہ نہیں۔ کہیں گرمی نے ستایا۔ اور کہیں روحانی اذیت پیش آئی۔ کبھی گرفتاری کا خطرہ لاحق ہوا اور کبھی جیل جانا پڑا کوئی بات ان کو راہ حق سے ہٹا نہ سکی نہ انکی ہمت و حوصلے کو

۱۔ ۱۹۶۱ء تب حضرت لاہوری حیات تھے۔

شکست دے سکی۔

ذالک فضل اللہ یوتیہ من یشاء

استغناء

حضرت شاہ جی نہ صاحب جائیدا تھے نہ موٹر اور بنگلہ کے مالک لیکن وہ امیروں سے بڑھ کر امیر تھے۔ حدیث شریف میں کیا خوب ارشاد ہوا

الغنیٰ غنی النفس

کہ غنی ہونا تو دل کا ہے۔ جسکا دل غنی ہے وہ اصل غنی ہے۔ اس کی نظروں میں دنیا ومافیہا نہیں جچتی۔ جس کا دل فقیر ہے وہ لکھ پتی اور کروڑپتی ہو کر بھی مفلس اور قلاش ہے اللہ تعالیٰ نے حضرت شاہ جی کو قلبی غنیٰ عطا فرمایا تھا۔ جس کی وجہ سے وہ ساری دنیا سے مستغنی تھے۔ حضرت شاہ جی کے کثیر التعداد مرید تھے۔ وفادار دوستوں کا حلقہ اتنا وسیع تھا کہ باید وشاید بعض بڑے بڑے نواب اور زمیندار بھی خدام میں شریک تھے۔ مگر مجال کیا کہ حضرت شاہ جی نے کسی کے سامنے اپنی حاجت پیش کی ہو۔ جو شخص از خود خدمت کرتا اس کو رد نہ فرماتے۔ دورے میں اگر کوئی خدمت نہ ہوتی ماتھے پر بل نہ پڑتا۔ اور دوبارہ اس کی دعوت پر تشریف لے جاتے۔ ایک بار ایبٹ آباد میں دوستوں کے حلقہ میں ذکر فرمایا کہ ایک مرید نے سولہ روپے کا ہدیہ پیش کیا میں نے لے لیا۔ جب دیکھا تو سب کے سب کھوٹے تھے۔ کہا ایسے کھوٹے مرید بھی ہوتے ہیں۔ (او کما قال)

اس فضیلت سے کون انکار کر سکتا ہے کہ اگر حضرت شاہ جی بنگلہ اور کوٹھی بنانا چاہتے یا موٹر وغیرہ کا شوق کرتے تو ان سے بڑھ کر اور کس کو سہولتیں حاصل تھیں مگر انہوں نے کچے مکان میں رہنے جام سفالین میں کھانے اور غریبوں کے ہمراہ چلنے کو ہی ترجیح دی۔ حضرت شاہ جی کا یہ استغناء ہی وہ جوہر تھا جس نے ان کی عظمت کو چار چاند لگا دیئے تھے۔ یہ استغناء ہی ہے جس سے مردان حق اور سگان دنیا کا امتیاز ہوتا ہے۔ اللہ والے اللہ کا کام کرتے ہیں۔ ان کے تمام کاموں کی ذمہ داری اللہ تعالیٰ لے لیتے ہیں۔ جیسے کہ آیت کریمہ اشارہ کرتی ہے۔

وامر اھلک بالصلوٰۃ واصطبر علیھا لا نسئلک رزقاً نحن نرزقک

ترجمہ۔ آپ اپنے گھر والوں کو نماز کی تاکید کریں اور خود اس پر قائم رہیں ہم آپ سے روزی نہیں مانگتے (بلکہ) ہم آپ کو روزی دیتے ہیں۔

آیت کریمہ میں اشارہ ہے کہ تم (للہ) مقصد حیات میں لگ جاؤ۔ اللہ کے دین کا کام کرو۔ تو تمہاری ضروریات کی کفالت ہم پر ہے۔ اہل دنیا اس بات کو نہیں سمجھ سکتے۔

سنا ہے ایک بار سی، آئی، ڈی والے حضرت شاہ جی کے ہاں آبیٹھے ان کا مقصد یہ معلوم کرنا تھا کہ آپ کی معیشت کا کیا انتظام ہے وہ پوچھنے بھی نہ پائے تھے کہ ایک شخص گیہوں کی بوری لے آیا۔ ایک اور گھی کا بھرا ہوا برتن۔ یہ دیکھتے ہی وہ سی، آئی، ڈی والے چپکے سے کھسک گئے۔

سچ ہے جو اللہ کا ہو جاتا ہے اللہ اس کا ہو جاتا ہے۔

قدر دانی

حضرت شاہ جی میں ایک خاص وصف یہ تھا کہ وہ مظاہر فطرت کے آئینہ جمال قدرت کے جلوے دیکھتے اور ہر صاحب کمال کی قدر کرتے وہ فرعون مزاج فرنگی اور اس کے ایجنٹوں کے سامنے تیغ بے نیام تھے۔ تو اللہ تعالیٰ کے برگزیدہ بندوں اور عاجز مخلوق کے لئے آنکھیں بچھاتے۔ کمال علم و کمال تقویٰ کی تعظیم میں ان کی کمر جھکی رہتی۔ حضرت علامہ انور شاہ کشمیری قدس سرہ شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد صاحب مدنی قدس سرہ اور حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی قدس سرہ کے ملفوظات یا کسی تحقیق کا ذکر آتا تو مجسمہ سکوت و حیرت بن جاتے۔ کیوں نہ ہو۔ ولی راولی شناسد

حضرت شاہ جی خود مجاہد اور احیاء سنت اور تردید شرک و بدعت کے علمبردار تھے۔ وہ ان جبال علم و عمل کی بلندیوں سے واقف اور ان کے فیوض باطنی سے لذت آشنا تھے۔ بلکہ حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی رحمتہ اللہ علیہ کے خاندان نے جس نصب العین کو سامنے رکھ کر جدوجہد شروع کی تھی حضرت شاہ جی نے اس کو سرانجام دینے میں اپنی ساری عمر صرف کر دی۔ اللہ تعالیٰ کی ہزار ہزار رحمتیں ہوں اس قبر پر جس میں اللہ تعالیٰ کے یہ نیک بندے اللہ کا نام بلند کرتے کرتے جا بسے اللہ تعالیٰ ہم سب کو ان کی پیروی نصیب کرے۔ آمین

ان کی خطیبانہ سرگرمیوں اور مجاہدانہ عملی زندگی نے ملک کے گوشہ گوشہ میں وطن پروری اور ملکی آزادی کی لہر دوڑادی۔

قادیانیت کے بڑھتے ہوئے سیلاب پر آپ ہی کے جوشِ خطابت نے بند لگایا اور انگریز پرست جماعتوں کے حوصلے پست کئے۔

مولانا عبد الشاہد خان: (علی گڑھ)

آپ اسلام اور پاکستان کی زبردست طاقت تھے۔

مولانا **عبداللہ درخواستی**

آپ کی زندگی اعلائے کلمتہ الحق، زہد و تقوی اور حسن عمل کا مستقل باب ہے۔ مولانا **عبید اللہ انورؒ**

شاہ جی نے ہندوستان کے چپہ چپہ پر فرنگی اقتدار کو چیلنج کیا۔

مولانا **مفتی محمودؒ**

انہوں نے آزادی کے لئے جد و جہد کی تھی، اور قید و بند کی صعوبتیں برداشت کی تھیں اسے مسلمانان برصغیر کبھی فراموش نہیں کر سکتے۔ انہوں نے برصغیر کے مسلمانوں کو بیدار کرنے کے لئے عمر بھر جد و جہد کی!

مولانا **احمد سعید کاظمیؒ**

آپ بڑی خوبیوں کے مالک تھے ان کی خدمات پر ملت ہمیشہ فخر کرے گی۔

مولانا ابو الحسنات قادریؒ

اسلامی نظام حکومت کیوں فٹ نہیں؟

بعض مردہ دل لوگ معترض ہیں کہ دور حاضر کے جدید حالات میں اسلامی نظام حکومت فٹ نہیں بیٹھتا۔ اس کی ایک دلچسپ مثال کچھ یوں ہے کہ ایک لائق ترین درزی نے ایک شخص کے جسمانی اعضاء و تناسب کے مطابق قمیص بنائی۔ سوئے اتفاق سے اس شخص پر فالج گر گیا۔ اعضاء کا تناسب جاتا رہا۔ ایک ہاتھ آگے کو لمبا ہو گیا، دوسرا بازو پیچھے کو مڑ گیا۔ کمر کبڑی ہو گئی۔ چھاتی اندر کو دھنس گئی۔ ٹانگیں ٹیڑھی ہو گئیں ---- اب وہ قمیص میں عیب بتاتا ہے کہ فٹ نہیں۔ درزی پر بھی نکتہ چینی کرتا ہے ---- آپ ہی انصاف کیجئیے کہ قمیص فٹ نہیں یا یہ منحوس خود "ان فٹ" ہو گیا ہے۔

اسلامی نظام حکومت پر حرف گیری کرنے والو! دراصل تمہارے منہ کا ذائقہ صفراوی بخار سے تلخ ہو چکا ہے۔ اور تمہیں میٹھی چیز بھی کڑوی لگتی ہے۔ دوا اور غذا میں تلخی نہیں بلکہ تمہارے منہ کا ذائقہ خراب ہے۔

تو خود حدیث مفصل بخواں ازیں مجمل

سید الاحرار، امیر شریعت
سید عطاء اللہ شاہ بخاری رحمہ اللہ

سوزِ نہاں

سینے میں عجب سوزِ نہاں چھوڑ گیا ہے
دل میں خلشِ زخمِ جواں چھوڑ گیا ہے
ہنستا ہوا پہنچا درِ خلد بریں تک
دنیا میں ہمیں گریہ کناں چھوڑ گیا ہے
پہلو میں وہ سب داغِ جگر بن کے رہیں گے
جو اپنی محبت کے نشاں چھوڑ گیا ہے
اے قافلۂ جادۂ احرار کے رہبر
حیرت ہے ہمیں لا کے کہاں چھوڑ گیا ہے
اللہ رے اعجاز خطابت کی لطافت
جبریل کا اندازِ بیاں چھوڑ گیا ہے
خود چین سے سونے کے لئے کُنجِ لحد میں!
اک محشرِ فریاد و فغاں چھوڑ گیا ہے
اللہ کے قرآن کی تفسیر مجسم
بھر نگۂ حق نگراں چھوڑ گیا ہے
ہر لفظ میں تھیں موجۂ زمزم کی ادائیں
کوثر میں دھلا حسنِ زباں چھوڑ گیا ہے
سلگا کے کلیجوں میں غمِ دل کے شرارے
ماحول میں آہوں کا دھواں چھوڑ گیا ہے
کہتے ہیں جسے ساقیٔ کوثر کا نواسہ
پیاسا ہمیں وہ پیرِ مغاں چھوڑ گیا ہے

انور صابری مرحوم (دیوبند، بھارت)

حافظ علی بہادر خان
ایڈیٹر "دور جدید" بمبئی

عطاء اللہ شاہ بخاری

ثبت است بر جریدہ عالم دوامِ ما

انسانی زندگی یوں سوچو تو ہے ہی کیا۔ کمتر از حباب دریا ہے۔ لیکن کچھ زندگیاں ایسی بھی ہوتی ہیں جن کے لئے کروڑوں انسانوں کے دلوں کی گہرائیوں سے یہ آواز نکلتی ہے۔

تم سلامت رہو ہزار برس
ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار

امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاری کی زندگی ایسی ہی عزیز ہے۔ ہندوستان کی تقسیم کے بعد پاکستانی رفقاء اُن سے مل کر آتش غم فراق ٹھنڈی کر لیتے ہیں مگر بھارت کے دور افتادوں سے کوئی پوچھے کہ ان کے دلوں پر کیا گزرتی ہے۔ ان کی پرانی صحبتوں کی یاد کس کس طرح آتی ہے۔

دل میں اک درد اٹھا آنکھوں میں آنسو بھر آئے
بیٹھے بیٹھے ہمیں کیا جانیئے کیا یاد آیا!

جن لوگوں نے پاک و ہند کی آزادی کے لئے جہاد کیا تھا۔ ان میں آج کتنوں ہی کے جذبات یہ ہوں گے کہ موجودہ آزادی کی زندگی سے وہ جہاد کی زندگی بہتر تھی۔ جس پر ہر قدم پر امتحان تھا اور ہر مرحلے پر کڑی آزمائش تھی۔ اس وقت کا خیال آتا ہے کہ ڈونگری بمبئی کے وسیع میدان میں ایک لاکھ سے زیادہ انسانوں کا سمندر موجیں مار رہا ہے۔ سید عطاء اللہ شاہ بخاری کا انتظار ہے۔ کیونکہ ہم ان کی تقریروں کا اعلان کر چکے تھے۔ مگر یہ نہ پولیس کو معلوم تھا اور نہ ہی عوام کو کہ شاہ جی کہاں ہیں۔ پولیس وارنٹ لئے ان کے پیچھے پیچھے تھی اور وہ یکایک پلیٹ فارم پر کسی گوشے سے نکل آتے تھے۔ (۱) اس جلسے میں بھی ہم ان کو بھیسرٹی سے لائے اور ایک خاص پلان کے تحت پلیٹ فارم پر پہنچا دیا۔ پھر پولیس کی کیا مجال کہ پلیٹ فارم پر تقریر کے دوران گرفتار کر لے۔ اس جلسے میں آزادی کی تحریکات کے مخالفین بھی تھے۔ انہوں نے ایک پٹھان احرار رضا کار (بچہ نور خان شہید) کے چھرا مار کر انتڑیاں نکال دیں۔ وہ اسی جگہ جاں بحق تسلیم ہو گیا۔ (۲)

۱۔ شاہ جی پولیس کو جُل دے کر جلسوں میں پہنچ جاتے اور تقریر کرتے ہی دوسری جگہ نکل جاتے پھر وہاں بھی تقریر کر کے روپوش ہو جاتے۔ اس کیفیت کو دیکھ کر ایک جلسہ میں موجود ایک ہندو دانشور نے کہا تھا "ابھی ایس باجو بول رہا ہے اور ابھی اُوں باجو، بلی ہے بلی (ولی) آکاوانش (آسمانی بولی)

۲۔ شاہ جی فرمایا کرتے کہ "بچہ نور بجلی کی سرعت سے میرے سامنے سینہ تان کر دیوار بن گیا اور مجھ پر ہونے والا وار اپنے پیٹ پر جھیل گیا۔ اس نے میرے ہاتھوں میں جان دی پھر میں نے اس شہید کی لاش ہاتھ میں اٹھا کر تقریر کی۔ تقریر کیا تھی شعلے اور انگارے تھے جو انگریز کے خرمنِ عریاں پر برس رہے تھے" (مدیر)

"شاہ جی کی اس تقریر کا کمال یہ تھا کہ اس کے قتل کے باوجود جلسے میں نظم قائم رہا۔ اور تقریر جاری رہی۔ تقریر ختم ہوتے ہی شاہ جی کے گرد ایسا جلوس چلا کہ پولیس حیران رہ گئی۔ موٹروں پر موٹریں تھیں۔ ان میں بٹھا کر پولیس کی آنکھوں میں دھول جھونک کر انہیں ایک محفوظ مقام پر پہنچا دیا۔ حالانکہ مجھے شاہ جی کی معیت کا فخر اس طرح حاصل نہ تھا۔ جس طرح احراران پنجاب کو۔ لیکن جو کچھ بھی روح پرور تجربات مجھ دور افتادہ رفیق کو بھی حاصل ہوئے۔ ان کے بیان کرنے کے لئے ایک کتاب درکار ہے۔

ان کی طبیعت میں مزاح تھا۔ لیکن جب وہ سنجیدہ مسائل میں اپنی رائے پیش کرتے تو نہ صرف اصابت اور معاملہ فہمی کا بہترین مظاہرہ کرتے بلکہ اس میں درد دل بھی شامل کر دیتے تھے۔ یہ غلط فہمی نہ ہو کہ وہ میدان خطابت ہی کے شہسوار تھے۔ اور آزادی کی تحریکات میں ذہنی قیادت کا رول ادا نہیں کرتے تھے۔ واقعہ یہ ہے کہ خطابت کے کمال نے ان کی دیگر صلاحیتوں کو شہرت سے ہم کنار نہیں کیا۔

اب میں بھارت میں ہوں اور وہ پاکستان میں۔ اس لئے پاکستان کے رفقاء ہی بتا سکتے ہیں کہ پاکستان کے مخصوص حالات اور بیماریوں کے سخت حملوں کے درمیان ان کی ذہنی قیادت کس حد تک بروئے کار آسکی۔ اور اب وہ ان کی ذہنی صلاحیتوں سے استفادہ کرتے ہیں یا نہیں؟ لیکن ہمارے لئے ان کی معیت کے تجربوں کی یادیں ہمیشہ مشعل راہ رہیں گی۔

میری پہلی ملاقات ان سے بلگام خلافت کانفرنس میں ہوئی تھی۔ اس وقت مولانا عبدالقادر قصوری کا گروپ بڑے زور وشور سے علی برادران گروپ کے مقابلے پر آیا تھا۔ یہ بہت پرانی باتیں ہیں اور اندیشہ ہے کہ نہ معلوم جہاد حریت کے کتنے معرکے جن میں شاہ جی اور ان کے ہم جیسے رفیقوں نے ایک رول ادا کیا تھا جدید مؤرخین کی بے اعتنائی یا تعصب کے باعث نسیاً منسیاً ہو جائیں۔

ضرورت ہے کہ عطاء اللہ شاہ صاحب کے دوروں اور قیادت کے تمام واقعات قلمبند کئے جائیں۔ اور اگر اللہ کی توفیق شامل ہو تو خود شاہ جی کی مدد سے ان کو قلمبند کیا جائے۔ یقیناً جنگ آزادی کا یہ ایک اہم ترین باب ہوگا۔ میں رفیقان احرار سے اپیل کروں گا کہ اس بارے میں فوری اقدام کریں۔ کیونکہ اقبال کی طرح یہ نعرہ لگانے سے کوئی فائدہ نہ ہوگا۔

کہیں سے آب بقائے دوام دلا ساقی

ماشاء اللہ حضرت شاہ جی کے کتنے ہی رفیق اہل قلم ہیں اور ان میں سے بعض کو وسائل بھی میسر ہیں۔ وقت اڑا چلا جا رہا ہے۔

العجل۔ العجل۔ الساعۃ بعد الساعۃ

ابھی تو شاہ جی زندہ ہیں۔ گزشتہ نصف صدی کے اہم تاریخی واقعات میں ان کی چشم دید شہادت حاصل ہو سکے گی۔

ایک اور خطرہ یہ ہے کہ ہندوستان کے جہاد حریت کی تاریخ کی تدوین و تالیف میں حقائق و واقعات کو بدلا جا رہا ہے۔ کئی قسم کے ایسے اثرات کام کر رہے ہیں جو بعض شخصیتوں کو نظر انداز کر رہے ہیں اور بعض

واقعات کو اپنے مخصوص تعصبات کے سانچے میں ڈھالا جا رہا ہے۔ اس لئے مولانا سید عطاء اللہ شاہ بخاری کی حیات ہی میں وہ تاریخ مدوّن ہو جائے جس میں انکا رول اتنا نمایاں ہے۔

مجلس احرار کی تاریخ کے ساتھ خصوصاً بے انصافی کی جا رہی ہے۔ حالانکہ جہاد کا جو تصور دماغوں میں ہے اس کا صحیح اندازہ اسی تحریک میں نظر آیا تھا اور حضرت شاہ جی اس کے ممتاز ترین رہنماؤں میں سے ایک ہیں۔

اسی طرح تحفظ ختم نبوت کی تحریک کو اگر شاہ جی کی سرپرستی حاصل نہ ہوتی تو ہندوستان کے مسلمانوں کے عقائد مسخ ہو جاتے۔ نیز ملک میں سامراج کا پانچواں کالم (قادیانی) بہت طاقتور اور موثر ہو جاتا۔ شاہ جی کی تقریروں نے اس فتنے کا بروقت سد باب کر دیا۔ تحریک آزادی کے غیر مسلم علمبرداروں نے شاہ جی کی (تحریک تحفظ ختم نبوت) کے سیاسی اثرات کا کبھی احساس نہیں کیا۔ وہ یہی سمجھتے رہے کہ یہ مسلمانوں کا داخلی مذہبی اختلاف ہے۔ جس کا سیاست سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ حالانکہ قادیانی تحریک کا ایک خطرناک نعرہ یہ تھا کہ انگریز اولی الامر ہیں۔ اس لئے ان کی اطاعت اور ان سے وفاداری اسلامی فرض ہے۔ بعض مفکرین نے تو زبردست دلائل کے ساتھ یہ ثابت کیا ہے کہ قادیانی مذہب کی بنیاد ہی سامراج نے قائم کی تھی اور مرزا غلام احمد اس کا صرف آلہ کار تھا۔

اس بارے میں شاہ جی کا رول اتنا نمایاں ہے کہ کوئی ان کی گرد کو نہیں پہنچتا۔ وہ اس دینی و سیاسی فتنے کی کافی بیخ کنی کر چکے ہیں اور احرار رفیقوں نے ان کی قیادت میں قابل قدر خدمات انجام دی ہیں۔

ایک اور پہلو شاہ جی کی زندگی کا نظر انداز کیا جا رہا ہے۔ احرار نے حکومت الٰہیہ کی جو تحریک شروع کی تھی اس میں بھی شاہ جی کا قائدانہ رول تھا۔ ملک کی تقسیم کے باعث اس تحریک پر زوال آ گیا لیکن مجھے امید ہے کہ اس کا احیاء ضرور ہو گا۔

مراد آباد کی ایک احرار کانفرنس میں جو خطبہ صدارت میں نے ایک کتاب نظام حکومت الٰہیہ کی شکل میں پیش کیا تھا۔ شاہ جی نے اس کی پرزور تائید کی تھی۔

اس کانفرنس میں حضرت والا منہ ڈھانپ کر پنڈال میں گھسنے لگے۔ مراد آباد کے احرار رضا کاروں نے روک کر داخلہ ٹکٹ مانگا۔ لیکن جب شاہ جی نے چہرہ کھولا تو وہ متحیر رہ گئے۔ اس طرح شاہ جی نے مراد آباد کے رضا کاروں کا امتحان لیا تھا جس میں وہ لوگ کامیاب ثابت ہوئے۔ اور شاہ جی نے ان کی بہت تعریف کی۔

ایک خاص بات عطاء اللہ شاہ بخاری کی سیاسی و مذہبی زندگی کو دوسرے اکثر لیڈروں سے ممتاز کرتی ہے۔ وہ یہ کہ ملک کے بہترین خطیب ہونے کے باوجود وہ عہدوں اور ممبریوں کی تمناؤں سے بالاتر رہتے تھے۔

کانگرس اور جمعیت العلماء پر جب مصیبت کا وقت آتا تھا تو وہ شاہ جی کی طرف امداد کے لئے دوڑتے تھے۔ لاہور میں جب جمعیت علماء کے اجلاس پر قبضہ کرنے اور صدر اجلاس حضرت مولانا حسین احمد مدنی کی

پگڑی اچھال دینے کا منصوبہ دشمنوں نے بنایا تھا تو شاہ جی نے ہی احرار کے سرخپوش مجاہدین کو حکم دیا اور انہوں نے مخالفین کے حملہ آوروں کا ذرا سی دیر میں قلع قمع کر کے جمعیتہ علماء کے لئے میدان صاف کر دیا۔

اسی طرح حافظ محمد ابراہیم کے الیکشن کے معرکے میں جب یہ حال تھا کہ

مدد کو دوڑ صنم اب کفن کو آگ لگی (۱)

تو اس وقت سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ ہی کی قیادت کام آئی تھی۔

سلطان ابن سعود کے خلاف جب برطانیہ کے پٹھو شریف حسین کی حمایت میں سارے ملک میں شور برپا کر رہے تھے اور کسی لیڈر کی مجال نہ تھی کہ اس فضا میں تقریر کر سکے مگر عطاء اللہ شاہ بخاری نے اس وقت بھی ہزار ہا جذباتی مخالفین کو اپنی خطابت سے ایسا شیشے میں اتارا کہ وہ تقریر سن کر زار و قطار روتے تھے۔

بمبئی میں جب ایک عظیم الشان احرار کانفرنس منعقد ہوئی تو کانفرنس کے وسیع پنڈال کے تمام راستوں کی سرکاری پارٹیوں نے ناکہ بندی کر دی تھی۔ اس کے بڑے انتظامات تھے کہ لوگ کانفرنس میں شرکت نہ کرنے پائیں۔

لیکن اس کانفرنس میں شاہ جی کی تقریر ہونے والی تھی۔ مخالف پارٹیوں کے یہ منصوبے ایک طرف اور شاہ جی کی تقریر کا اعلان دوسری طرف۔ ہزارہا مسلمان آئے اور تقریر کامیاب ہوئی۔

حضرت شاہ جی کی ان فاتحانہ مہموں کا تذکرہ اتنا طویل ہو سکتا ہے کہ اخبارات کے صفحات میں ان کے لئے گنجائش نہ نکل سکے۔ اس لئے مشتے از خروارے چند واقعات پیش کر دیئے ہیں۔ یہ کرہ زمین اپنے محور پر ہزاروں گردشیں کرنے کے بعد بھی ایسا خطیب نہیں پیش کر سکے گی۔

درویشانہ مزاج کے ساتھ ہی سوز و گداز کا یہ عالم کہ جب تقریروں میں قرآن کی کوئی آیت پڑھتے تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ابھی آسمان سے نازل ہو رہی ہے۔

ایک بار مخالفوں کے زبردست اجتماع میں لوگوں کا خیال تھا کہ آج عطاء اللہ شاہ بخاری پر ضرور حملہ ہو

۱۔ یہ امر قابلِ ذکر ہے کہ شاہ جی نے ہمیشہ علماء کے لئے راستے صاف کئے خصوصاً جمعیت علماء ہند کے اکابر و اصاغر کی عزت و وقار کی حفاظت کے لئے قاتلانہ حملوں کی زد میں بھی آئے۔ جمعیت علماء ہند کے سینکڑوں جلسوں اور کانفرنسوں کی کامیابی تنہا شاہ جی کی وجود کی مرہون منت ہے۔ مگر "علماء ہند کا شاندار ماضی" کے مصنف کو شاہ جی نہ تو علماء کی صف میں نظر آئے اور نہ علماء کے لئے ان کی خدمات ملیں۔ خود شاہ جی فرمایا کرتے تھے "میں محسود العلماء تھا مگر اللہ نے مجھے زبان ایسی عطاء فرمائی تھی جس سے وہ خوفزدہ ہو کر مجبوراً مجھے قبول کرتے"۔ پاکستان بننے کے بعد شاہ جی کی بیماری اور ضعیفی سے بعض علماء نے خوب فائدہ اٹھایا اور وفات کے بعد تو اس کے شواہد عملی طور پر یوں منظر عام پر آئے کہ ان کی جماعت مجلس احرار اسلام، ان کے حقیقی وارث، ان کی اولاد کو اور ان کے قابل فخر رفقاء کو اپنے شخصی اور ذہنی تعصبات کا خوب نشانہ بنایا اور یہ سلسلہ تا ایں دم جاری ہے۔ (مدیر)

گا۔ لیکن جب انہوں نے تقریر شروع کی تو جلسے کا رنگ دیکھتے ہوئے اول عام اصولی باتیں بیان کیں۔ پھر آہستہ آہستہ جلسے کے جذباتی ماحول پر قبضہ کرنا شروع کیا۔ اول جو باتیں کہی گئی تھیں وہ تمہید ثابت ہوئیں۔ ایسی تصریحات کیں جنہوں نے مخالفوں کے تمام منصوبوں پر پانی پھیر دیا۔ کیونکہ پارٹی بند جرگے کی ساری پبلک شاہ جی کے ساتھ ہو چکی تھی۔ تقریر کیا تھی آرٹ تھا اور آرٹ بھی شاہکار۔ جب شاہ جی نے یہ شعر پڑھا:۔

بیاورید گر اینجا بود زباں دانے
غریب شہر سخنہائے گفتنی دارد

افسوس کہ سرکاری مؤرخین نے انقلاب کی اس عظیم الشان شخصیت کو نظر انداز کر دیا ہے لیکن ان شاء اللہ ایسے ارباب قلم حلقۂ احرار میں پیدا ہوں گے۔ جو سرکاری مؤرخین کی اس غلطی کی تلافی کر دیں گے۔ اور شاہ جی کی طرف سے انہیں جتا دیں گے کہ:۔

پتہ پتہ بوٹا بوٹا حال ہمارا جانے ہے
جانے نہ جانے گل ہی نہ جانے باغ تو سارا جانے ہے

افسوس کہ اس عدیم الفرصتی کے باعث اور زیادہ نہیں لکھ سکتا۔ "دور جدید" میں قصہ پارینہ کے عنوان سے جو سلسلہ جاری ہے اس میں شاہ جی کی زندگی کے تذکرہ مفصل ہوں گے۔ (ان شاء اللہ)

تو خود حدیث مفصل بخواں ازیں مجمل!

آج مسلمان ایک اہم شخصیت سے محروم ہو گئے ہیں یہ کہنا مناسب ہوگا کہ مولانا وقت کے سب سے بڑے خطیب تھے

مولانا **ابوالاعلیٰ مودودی**

ہم ایک بڑی طاقتور مذہبی شخصیت سے محروم ہو گئے ہیں۔

مولانا امین احسن اصلاحی:

شاہ جی، جن صفات حمیدہ کے حامل تھے وہ شاید ہی آئندہ کسی ایک شخصیت میں جمع ہو سکیں۔ ان کی شخصیت اتنی جاذب تھی کہ تقریر کے لئے اُٹھتے تو جی چاہتا تھا کہ آپ کو دیکھتا ہی رہے۔

مولانا خان مہدی زمان خان:

آہ! وہ ہستی جن کو ہم پیار سے جیل میں "آتو" کہہ کر پکارتے تھے۔ ہم سے ہمیشہ کے لئے جدا ہو گیا ہے۔ آج وہ، کل ہماری باری ہے۔

مولانا لقاء اللہ عثمانی:

وہ انقلاب لانے والوں کی صف اوّل میں شامل تھے۔ امام الہند، شیخ الاسلام اور سحبان الہند کے ناموں کے ساتھ ساتھ امیرِ شریعت کا نام بھی اصحاب الرقیم کی طرح تاریخ میں رقم رہے گا۔

مولانا اظہار الحق سہیل عباسی:

مجاہد الحسینی

خطیب اعظم کے خطیبانہ معرکے

امیر شریعت مولانا سید عطاء اللہ شاہ بخاری رحمہ اللہ تعالی کا نام آتے ہی آج بھی وہ منظر آنکھوں کے سامنے رقص کرنے لگتا ہے کہ انسانوں کے بحر مواج میں ایک طوفان برپا ہے اور تلاطم خیز موجوں سے شور و غوغا کی خوب معرکہ آرائی ہے کہ ایک کنارے سے کسی نے پکارا وہ آگئے! شاہ جی! بس پھر یہ کیفیت جیسے یہ علاقہ بحر بیکراں سے دور ایک ایسا بے آب و گیاہ چٹیل میدان ہے جس میں زندگی کی کوئی رمق باقی نہیں!

ہر طرف ایک سناٹا اور سکوت طاری ہے کہ ایک جانب سے باوقار، پرشکوہ اور رعنا شخصیت نمودار ہوتی ہے جس کا چہرہ مہرہ تابناک، روشن اور منور جیسے خدا کے مقدس اور برگزیدہ انسان! شمع کی طرح روشن آنکھیں، جن سے غیرت و خودداری کی کرنیں پھوٹ رہی ہیں۔

سر پر دودھ سے دھلے ہوئے سفید گھنگریالے بالوں کا تاج ایک عظمت و وقار کا آئینہ دار، ستاروں کی طرح چمکتی دمکتی پیشانی پر سلوٹیں جیسے کہکشاں! کلیوں کی طرح مسکراتے ہونٹ جن کی جنبش کے لئے ہزاروں دل مضطرب!

پاک و ہند میں اسلام کی دعوت و تبلیغ کا عظیم داعی جس نے لاکھوں کروڑوں انسانوں میں سچے اسلام کی روح پھونکی! اور بے شمار لوگوں کو جہالت و گمراہی کی تاریکیوں سے نکال کر نور اسلام کی ضوفشانیوں سے مستنیر کیا۔

اقلیم خطابت کے فرمانروا جس کے جوش خطابت کے آگے پہاڑوں کے دل دہل گئے اور ان کے پتے پانی ہوگئے جس کی ادنی للکار نے کئی تحریکات کو جنم دیا!

ان محاسن و اوصاف سے متصف یہ ہیں "سید عطاء اللہ شاہ بخاری" آپ خطاب عام کے لئے کھڑے ہوئے، مجمع گوش بر آواز، فضا میں لحن حجازی رقص کرنے لگا۔ سامعین نے دل تھام لئے، شجر و حجر نے سرگوشیاں چھوڑ دیں، اور کائنات دم بخود ہو گئی۔ مکہ کے پہاڑوں، مدینہ کی گلیوں اور طائف کے بازاروں کا منظر آنکھوں کے سامنے گھومنے لگتا! پندرہ منٹ اور بعض دفعہ نصف گھنٹہ کی تلاوت قرآن مجید کے بعد شاہ جی جب "صدق اللہ" کہہ کر سحر طرازیوں کا سلسلہ ختم کرتے تو سامعین کے دل و دماغ پر کیف و مستی چھا گئی ہوتی۔ اور یوں محسوس ہوتا کہ آسمان سے حور و ملائک مجمع پر رحمتوں کے پھول برسا کر جلسہ گاہ کو مشام جاں بنا گئے ہیں۔ اور آب کوثر سے ہر آنکھ پُر نم کر گئے ہیں سامعین کا جی چاہتا کہ شاہ جی آج صرف قرآن پڑھ کر ہی سناتے رہیں۔ یہ اشتیاق اور تقاضا صرف مسلم سامعین کا نہ ہوتا بلکہ غیر مسلموں کی بھی یہی کیفیت ہوتی۔

ایک اعلی تعلیم یافتہ ہندو کا بیان ہے کہ میں دور دراز کا سفر کر کے صرف شاہ جی کی تلاوت قرآن سننے کے لئے مختلف جلسوں میں شریک ہونے کی سعادت حاصل کیا کرتا تھا۔

قرآن حکیم کے بارے میں کبھی کفار کہا کرتے تھے کہ یہ کسی بڑے جادو گر کی سحر طرازی ہے۔ نعوذ باللہ
بیسویں صدی میں امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاری کی تلاوت قرآن سن کر کہا جاسکتا ہے۔

ان هذا الا ساحر عظيم

یہ ایک بہت بڑا جادو گر ہے

نادر روزگار شخصیت

یوں تو سرزمین ہند نے کئی شعلہ بیان اور آتش نوا خطیب پیدا کئے ہیں۔ مگر زبان سے لوچ اسلوب بیان کی دلکشی فکر و خیال کی وسعت اور پختگی ظرافت کی شائستگی حاضر جوابی کی شوخی اور استدلال کی سحر کاری میں جو مقام امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاری کو نصیب ہوا اس میں وہ منفرد اور یگانہ روزگار دکھائی دیتے ہیں۔

شاہ جی کے سحر خطابت کی اس سے بڑی مثال اور کیا ہوسکتی ہے کہ بارہا آپ نے سامعین سے خطاب کرتے کرتے رات گزار دی۔ اور جب طلوع فجر کے وقت موذن کی آواز کانوں میں پڑی تو سراپا حیرت بن کر پوچھا صبح ہوگئی ابھی تو میں تمہیدی کلمات ہی عرض کر رہا تھا۔

لوگو! صبح ہوگئی اور موذن پکار پکار کہہ رہا ہے اے نیند کے ماتو، ہوش میں آؤ۔

میں نے بھی اپنی پوری زندگی تمہیں خواب غفلت سے بیدار کرنے میں صرف کردی۔ لیکن تم بیدار نہ ہوئے، مجھے تو کبھی کبھی یوں محسوس ہونے لگتا ہے جیسے قبرستان میں اذان دے رہا ہوں۔ راقم الحروف ایک دفعہ ملتان میں حضرت شاہ جی کی خدمت میں حاضر ہوا۔ آپ اس وقت مرغیوں کے لئے روٹی کے ٹکڑے بنا رہے تھے۔

میں نے از راہ تفنن عرض کیا شاہ جی آپ کس کام میں لگ گئے۔

فرمانے لگے بیٹا کیا بتاؤں قوم کو زندگی بھر آواز دی، اسے پکارا، حتیٰ کہ میرے بال سفید ہوگئے لیکن اس کے دل کی سیاہی دور نہ ہوئی۔ آخر تھک ہار گیا اور انسانوں سے منہ موڑ کر اب خدا کی دوسری مخلوق کی طرف ملتفت ہوا ہوں۔ یہ مخلوق ایسی باوفا ہے کہ میری ادنی پکار پر دیوانہ وار آتی ہے اتنے میں شاہ جی نے مرغیوں کو آ۔ آ۔ آ کہہ کر بلانا شروع کیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے تمام مرغیاں شاہ جی کے ارد گرد جمع ہوگئیں۔ مجمع دیکھ کر فرمانے لگے۔! کیوں بیٹا ہے نا۔ اطاعت و فرمانبرداری کی ایک مثال۔

اعتقادات

شاہ جی اپنے یقین و ایمان کی بات کرتے تو ہمیشہ یہی فرماتے! خدا کی عبادت، رسول کی اطاعت انگریز کی بغاوت، یہ میرا ایمان ہے اور رہے گا۔ خدا معبود ہے محمد ﷺ محبوب اور انگریز مغضوب۔ خدا کو جو جی میں آئے کہو! اس کا محاسبہ وہ خود کرے گا مگر محمد ﷺ کے متعلق سوچ لینا یہ معاملہ عقل و خرد کا نہیں عشق کا ہے عشق پر زور نہیں ہوتا اور نہ اپنے پر اختیار پھر یہ نہیں سوچا جائے گا کہ قانون کیا کہتا ہے اور زمانہ کیا چاہتا ہے پھر جو ہونا ہوگا ہوجائے گا۔ اور جو ہوگا دیکھا جائیگا۔

انبیاء کرام

نبوت و رسالت کے موضوع پر خطاب کرتے شاہ جی فرمایا کرتے!

حضرت آدم علیہ السلام سے لیکر پیغمبر آخر الزمان حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تک کوئی نبی اور رسول ایسا نہیں آیا ہے جس نے اپنی تعلیمات میں اک جلا پیدا کرنے کے لئے اپنے دور کے کسی انسان کے سامنے زانوئے تلمذ تہہ کیا ہو۔ نبی اور رسول براہ راست اللہ تعالی سے علم حاصل کرتے ہیں۔ نبی کی اللہ تعالی خود رہنمائی کرتے ہیں۔ انبیاء کرام معصوم بھی ہوتے ہیں اور بہادر بھی! آپ انبیاء علیہم السلام کے احوال پر نگاہ ڈالئے۔ جو نبی بھی دنیا میں تشریف لاتا ہے اس کے ایک ہاتھ میں الہام الہی کی کڑکتی بجلیاں ہوتی ہیں اور دوسرے ہاتھ میں تلوار۔ وہ کاشانہ باطل پر برق بن کر گرتا ہے اس کے جلو میں سمندروں کا شور اور طوفانوں کا زور ہوتا ہے۔ اس کی رفتار فرمانرواؤں کا دل دھڑکا دیتی ہے اور اس کی ایک للکار سے کائنات کا دل دہل جاتا ہے۔

عظمت قرآن

قرآن پاک سے شاہ جی کی شیفتگی اور والہانہ محبت کا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے کہ آپ استثنائی صورتوں میں قرآن مجید کے علاوہ کسی دوسری کتاب کو پڑھنے کی ضرورت بھی محسوس نہ کرتے آپ کا عقیدہ تھا کہ میرے لئے جو کچھ ہے قرآن مجید میں موجود ہے۔ اس سے باہر جو بھی ہے باطل ہے اور ایک باطل شے کے مطالعہ کے لئے میرے پاس وقت نہیں اگر آج دنیا قرآن کو چھوڑ کر دوسری کتابوں پر نگاہ کر سکتی ہے تو میں دوسری کتابوں سے روگردانی کر کے صرف آخری کتاب الہی پر اپنی توجہ کیوں نہ مرتکز کردوں۔ میں تو قرآن کا مبلغ ہوں میری باتوں میں اگر کوئی تاثیر ہے تو وہ صرف قرآن کی۔ جو چیز مجھے قرآن سے الگ کرے اسے آگ لگادو۔

اشاعت قرآن

۱۹۵۰ء میں مجلس احرار اسلام کی آل پاکستان کانفرنس منعقد ہوئی ایک اجلاس میں شاہ جی نے دوران تقریر فرمایا

آج قاضی احسان احمد صاحب نے روس کی چھپی ہوئی کتاب مجھے دکھائی جس کا نام "اسٹالن" ہے قاضی صاحب نے اس کی طباعت و کتابت کی خوبیوں اور اس کی دلکشی و دلفریبی کی قصیدہ خوانی کرتے ہوئے بتایا۔ شاہ جی! دیکھو ان تمام خوبیوں کے باوصف اس کتاب کی قیمت روپیہ یا بارہ آنے ہے، میں کہتا ہوں کہ کوئی کمال نہیں۔ اسٹالن کی اپنی حکومت اپنی سیاہی، اپنا قلم، اپنا کاغذ، اپنا پریس، اپنے ملازمین اور کارندے، غرضیکہ اس سلسلہ کے تمام سازوسامان اسے مہیا ہیں وہ جو چاہے جس طرح چاہے اسے شائع کر سکتا ہے۔ اسے تو یہ کتاب دنیا کو مفت تقسیم کرنی چاہیے۔ سٹالن کا یہ کوئی کمال اور خوبی نہیں کمال اور خوبی ملاحظہ کرنی ہو تو قرآن پاک کی تاریخ ملاحظہ فرمائیے!

وہاں نہ قلم، نہ دوات، نہ کاغذ، نہ پریس، نہ عملہ، نہ حکومت اور نہ ہی دنیاوی سازوسامان جن کے بل بوتے پر قرآن کی اشاعت کا اہتمام کیا جاسکے۔ لیکن کمال ملاحظہ ہو کہ آج قرآن مجید کروڑوں انسانوں کے سینوں میں محفوظ ہے۔ میں دنیا کو چیلنج کرتا ہوں کہ قرآن مجید کے مقابلہ میں کوئی ایسی کتاب لائیے جو آج تک اس سے زیادہ اشاعت

پذیر ہوئی ہو اور اس سے زیادہ انسانوں کے سینہ میں محفوظ ہو۔

خطابت کی معجز نمائی

شاہ جی کی معجزانہ خطابت کی کئی مثالیں ہیں لیکن ڈیرہ غازیخان کی یہ مثال اس لئے قابل ذکر ہے کہ وہاں اگر خطابت کی معجز نمائی نہ ہوتی تو قتل وغارت کا بازار خوب گرم ہوتا۔

مجلس احرار اسلام کے زیر اہتمام ڈیرہ غازی خان میں ایک عظیم الشان اجتماع منعقد ہوا اجتماع سے چند روز قبل وہاں کے بعض مقتدر اور بااثر زمینداروں نے شاہ جی کے خلاف خوب خوب پروپیگنڈہ کیا ان دنوں مزارات کے قبوں کا مسئلہ زوروں پر تھا علاقہ کے باشندوں کو شاہ جی کے خلاف خوب بھڑکا دیا گیا کہ آپ قبروں پر قبے تعمیر کرنے کے حق میں نہیں ہیں۔ شاہ جی حسب پروگرام اجتماع میں شرکت کیلئے تشریف لائے جلسہ گاہ کا رنگ بگڑا ہوا تھا۔ سامعین کی اکثریت خراج پیش کرنے کی بجائے لاٹھیوں اور کلہاڑیوں سے مسلح تھی۔

شاہ جی اسٹیج پر رونق افروز ہوئے اور تلاوت کے بعد خطاب شروع کیا تو مجمع کے ایک گوشے سے ایک شخص نے نہایت تلخ و ترش لہجہ میں دریافت کیا۔

شاہ جی کیا آپ بتاسکتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ کے روضۂ اطہر پر قبہ موجود ہے یا نہیں؟

شاہ جی نے ہاں میں جواب دیا سنتے ہی وہ کڑکتے ہوئے بولے تو پھر وہ آپ قبروں پر سے قبے گرانے والے اور اس کے خلاف آواز اٹھانے والے کون ہوتے ہیں شاہ جی نے برجستہ فرمایا میں بھی تو یہی کہتا ہوں جب رسول کریم ﷺ کے روضہ اطہر پر قبہ موجود ہے تو پھر دوسری جگہ نہیں ہونا چاہئے۔ حضور ﷺ جس طرح نبوت و رسالت کے معاملہ میں وحدہ لاشریک ہیں اسی طرح ہر معاملہ میں ان کا کوئی مثیل اور شریک نہ ہونا چاہیئے۔ گنبد خضریٰ کے بعد کسی اور قبہ کی تعمیر شرک فی النبوت ہے۔

شاہ جی کے اس جواب سے مجمع کا رنگ بدل گیا اور فضا امیر شریعت زندہ باد کے نعروں سے گونج اٹھی۔

جرأت و شجاعت

مولانا سید عطاء اللہ شاہ بخاری کی جرأت و شجاعت، بے باکی و حق گوئی بھی ضرب المثل تھی۔ ۱۹۲۱ء کا ذکر ہے کہ آپ کو امرتسر میں ایک باغیانہ تقریر کرنے کے جرم میں گرفتار کرلیا گیا۔ جرم کی تصدیق کے لئے جب آپ کو عدالت میں پیش کیا گیا۔ تو کمرۂ عدالت میں داخل ہوتے ہی آپ کے نرم و نازک ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی مجسٹریٹ نے دریافت کیا۔

شاہ صاحب: آپ نے امرتسر میں اس مفہوم کی تقریر کی ہے؟

شاہ صاحب! ہاں------ میں نے تقریر کی ہے۔

مجسٹریٹ: آپ کو علم ہے کہ ایسی تقریر کی سزا کیا ہوتی ہے؟

شاہ صاحب: ہاں مجھے علم ہے کہ اس کی سزا کیا ہے!

اگر میری تقریر جو ڈائری نویس کی جانب سے آپ کے پاس آئی اس دفعہ کے تقاضوں کو پورا کرتی ہے تو

مجھے اس تقریر کا اعتراف ہے لیکن اگر یہ تقریر اس تقاضوں کو پورا نہیں کرتی ہے تو بامعنی بات کہی ہے جو اس دفعہ کے تقاضوں کو پورا کرسکے!

اس مقدمہ کا فیصلہ سناتے ہوئے جب مجسٹریٹ نے آپ کو تین سال قید بامشقت کی سزا کا حکم سنایا اور آپ میانوالی جیل میں محبوس ہوگئے تو آپ مولانا جوہر کا یہ شعر بادنی ترمیم اکثر پڑھا کرتے

دار کے حقدار کو بس قید سہ سالہ ملے
ہائے مشکل تھی جو آساں ہوتے ہوتے رہ گئی

سکوت و یاس

زندگی کے آخری ایام میں حضرت شاہ جی رحمہ اللہ تعالیٰ کے احساسات میں قدرے مایوسی اور نومیدی جھلکنے لگی تھی۔ جب آپ نے اپنے ساتھ سفر کا آغاز کیا تھا تو عوام کے عقائد میں کجی اور اعمال میں کمزوری ضرور تھی لیکن دماغ اسلام کے شغف اور دل دین کی محبت سے معمور تھے! مگر گردش لیل و نہار کے ساتھ اسلامی روایات کی روشنی پر فرنگی معاشرہ اور ہندی عقائد کی سیاہی غالب آگئی فکر و عمل کا تضاد ہوا۔ دل دماغ سے الجھنے لگا پھر دیکھتے ہی دیکھتے دماغ کی کایا پلٹی دل کا حجاب اٹھا۔ اور زبان بے باک ہوگئی۔

ارکان اسلام کا تمسخر عقائد کا مذاق رسول اللہ ﷺ کی رسالت پر جھگڑا خدا کے وجود پر بحث ------ شاہ جی کی غیرت دینی شعلۂ جوالہ بن گئی۔ مشرقی پنجاب کی افتاد اور عذاب کے باوجود عوام و حکام کا اسلام سے فرار دیکھ کر شاہ جی بہت آزردہ خاطر ہوگئے اور پھر اپنی قوم کو مزرعہ ویران سمجھنے لگے اور بالآخر ملتان میں ایک معرکہ آرا تقریر کے دوران اپنی دل کی بات زبان پر لے آئے "میں نے پورے ایک سال تقریر نہیں کی اور نہ اب کرنا چاہتا ہوں وجہ ظاہر ہے میں تم سے کہوں تو کیا کہوں؟ جو کہنا چاہتا ہوں وہ تم سنتے نہیں ہو اور جو تم سنتے ہو وہ میرے بس میں نہیں!

میں ایک چہار دیواری میں بند ہوں جس کے اندر سب کچھ ہے اور باہر کچھ نہیں۔ وہ ہے اسلام، میرے پاس صرف ایک کتاب ہے اور وہ ہے قرآن اسے معاشرہ انسانی کیلئے ضابطۂ حیات سمجھتا ہوں مگر میرے چاروں طرف فضا میں یہ صدا گونج رہی ہے کہ اسلام کا فرسودہ نظام فی زمانہ فٹ نہیں۔ ارے تم نے اسے کب آزما کر دیکھا؟ ایک بالشت کپڑا درزی سے شکوہ کر رہا ہے کہ پیراہن فٹ نہیں بیٹھتا۔ اب مجھ میں قوم سے الجھنے کی طاقت نہیں میری ہمت تھک چکی ہے مشرقی پنجاب کے واقعات نے تو مجھے مار ہی ڈالا۔ اگر ہم نے صرف قرآن کو نہ چھوڑا ہوتا اور اپنے تئیں دامن رسالت سے وابستہ کئے رکھتے تو ہمیں کوئی زیر نہ کرسکتا اور آج بھی ہندوستان کی تاریخ کے کھنڈر ہمارے قافلۂ برق پیما کے لئے چشم براہ اور ہماری عظمت کے گواہ ہوتے

دار و رسن کے چہرے پہ غبار آہی گیا
ایک بے خوف صدا ڈوب گئی ختم ہوئی
شب کی سنگین سیاہی کا مقدر جاگا
صبح خنداں کی ضیاء ڈوب گئی ختم ہوئی

نبوت، وحدت امت اور مرزائیت

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی ہی وہ واحد ذریعہ ہے جس نے مختلف فرقہ بندیوں کے باوجود مسلمانوں کی وحدت کو برقرار رکھا ہوا ہے۔ یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے بعد کسی نئی نبوت کا تصور وحدت اسلامی کو پارہ پارہ کرنے کے مترادف ہے۔

مرزائیت کی تحریک جو مذہبی روپ میں نمودار ہوئی دراصل مسلمانوں کے دلوں سے جذبۂ جہاد فنا کرنے اور ان کی وحدت کو پارہ پارہ کرنے کی ایک خوفناک سازش ہے جو انگریزی دور حکومت میں تیار کی گئی۔ مرزائیت کی تنظیم انگریزی راج کو دوام بخشنے کی تدبیر ہے۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ اس تحریک کے بانی مرزا غلام احمد قادیانی کی ساری زندگی انگریزوں کی قصیدہ خوانی میں گزری۔ مرزائیت کو ہم ایک ایسے درخت سے تشبیہ دے سکتے ہیں جس کی آبیاری اور حفاظت اپنی سیاسی مصلحت کے تحت انگریز کرتے رہے اور جب تک وہ یہاں رہے اس کے برگ و بار سے متمتع ہوتے رہے"

حضرت امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاری رحمۃ اللہ علیہ

امیرِ شریعت کے بعد

ملا نہ پھر کہیں لطفِ کلام تیرے بعد
حدیث شوق رہی ناتمام تیرے بعد

ترس گئی ہے سماعت تری صداؤں کو
سنا نہ پھر کہیں تیرا پیام تیرے بعد

جو تیرے دستِ حوادث شکن میں دیکھی تھی
وہ تیغ پھر نہ ہوئی بے نیام تیرے بعد

بنا ہے حرفِ شکایت سکوتِ لالہ و گل
بدل گیا ہے چمن کا نظام تیرے بعد

سیف الدین سیف رحمہ اللہ

مجاہد الحسینی

حضرت شاہ جی کی آخری قید

۱۹۵۳ء کی تحریک تحفظ ختم نبوت کے سلسلہ میں گرفتار ہونے والے رہنما مختلف جیل خانوں میں بند تھے اور فسادات پنجاب کی عدالتی تحقیقات کا آغاز ہوچکا تھا تحقیقاتی کمیشن کی طرف تحریک کے سلسلہ میں مختلف دینی جماعتوں کو اپنا اپنا موقف بیان کرنے کو کہا گیا۔ چنانچہ لاہور سنٹرل جیل میں محبوس زعمائے احرار نے کمشنر کی وساطت سے حکومت مغربی پاکستان سے مطالبہ کیا کہ ہماری جماعت کے ممتاز رہنما چونکہ مختلف جیل خانوں میں قید و بند کی صعوبتیں برداشت کر رہے ہیں اور ان سے ضروری مشاورت کے حصول میں سخت الجھنیں پیش آرہی ہیں۔ اس لئے ان سب حضرات کو لاہور سنٹرل جیل میں یکجا کردینا از بس ضروری ہے تاکہ ہم بھی تحقیقاتی کمیشن کے رو برو اپنا موقف اجتماعی حیثیت میں پیش کرسکیں۔ تحقیقاتی کمیشن نے حکومت پر زور دیا کہ جس قدر ممکن ہوسکے ان رہنماؤں کو اکٹھا کرنے کے مواقع فراہم کئے جائیں۔ ادھر کراچی میں گرفتار ہونے والے جلیل القدر رہنما ارباب اختیار کی "مصلحتوں" کے پیش نظر چونکہ حیدر آباد سکھر اور دوسری جیلوں میں الگ الگ کئے جاچکے تھے۔ اس لئے انہیں یکجا کرنے میں تاخیر سے کام لیا گیا ادھر تحقیقاتی کمیشن کا تقاضا شدت اختیار کررہا تھا کہ تحریک کے روح رواں حضرات کی غیر حاضری تحقیقات میں چونکہ رکاوٹ کا باعث بن رہی ہے۔ اس لئے وہ لوگ بلاتاخیر لاہور پہنچ جانے چاہئیں۔

ایک دن لاہور سنٹرل جیل کے ایک افسر نے صبح سویرے آکر ہمیں اطلاع دی کہ آج سکھر جیل کے قیدی یہاں پہنچ رہے ہیں ان سب میں سید عطاء اللہ شاہ بخاری اور مولانا ابوالحسنات کے اسماء گرامی خصوصا قابل ذکر ہیں اس افسر نے اپنی بات کی تکمیل کرتے ہوئے دوسری مسرت افزا خبر یہ سنائی کہ ان حضرات کے لئے بھی آپ کے اسی "دیوانی احاطہ" میں قیام کا انتظام کیا جارہا ہے اور غالباً دوپہر تک وہ حضرات یہاں تشریف لے آئیں گے۔ لاہور سنٹرل جیل کے دیوانی احاطہ میں اس وقت شیخ حسام الدین، مولانا محمد علی جالندھری، مولانا محمد حیات، سید سبط حسن، ملک عبد الغفور انوری، عطاء اللہ جہانیاں اور راقم الحروف محبوس تھے ہم نے جب ان بزرگوں اور بالخصوص شاہ جی کی آمد کا مژدہ جانفزا سنا تو سب کے چہروں پر مسرت و بشاشت کی ایک لہر دوڑ گئی، ان سب کی آنکھیں روزنِ در پر لگی ہوئی تھیں کہ ان اولوالعزم اور جلیل القدر شخصیات کی زیارت کا شرف کب حاصل ہوتا ہے؟

لاہور سنٹرل جیل میں شاہ جی کی آمد

۲۵ جولائی کو دن کے گیارہ بجے گرفتار ہونے والے حضرات کا ایک گروہ جن میں حضرت امیر شریعت مولانا سید عطاء اللہ شاہ بخاری، مولانا سید ابوالحسنات۔ جناب مظفر علی شمسی اور دیگر حضرات شامل تھے سنٹرل جیل میں پہنچ گیا، باقی حضرات تو دیوانی احاطہ میں آگئے۔ لیکن شاہ جی ابھی ڈیوڑھی میں ہی تھے آپ کے استقبال کے لئے ہمارے

علاوہ دوسری بارکوں کے سیاسی اور اخلاقی قیدی اپنے اپنے احاطوں میں سراپا انتظار بنے کھڑے تھے کہ سامنے سے جیل کے ارباب اختیار اور چند دوسرے قیدیوں کے جلو میں شاہ جی تشریف لاتے دکھائی دیئے جونہی لوگوں کی نگاہیں آپ پر پڑیں امیر شریعت زندہ باد! کے فلک شگاف نعروں سے جیل کے در و دیوار گونج اٹھے، شاہ جی کی آمد اور لوگوں کے نعروں کا انداز ایسا ہی تھا جیسا شاہ جی اپنی زندگی میں کسی اجتماع عام سے خطاب کرنے کے لئے جلسہ گاہ میں پہنچا کرتے تھے۔ دیوانی احاطہ میں شاہ جی سب سے آخر میں پہنچے ضعف اور نقاہت کے باعث آپ بے حد پژمردہ تھے۔ آپ کا لحیم و شحیم جسم اب ہڈیوں کا ایک ڈھانچہ رہ گیا تھا گالوں اور تابناک چہرے پر جھریاں پڑ گئی تھی اور جسم پر جگہ جگہ پھوڑے پھنسیوں کے داغ دھبے نمایاں تھے۔ دیوانی احاطہ کے بڑے کمرہ میں شاہ جی اور مولانا ابوالحسنات کے لئے رہائش کا انتظام کردیا گیا۔ ان کی آمد سے قبل چونکہ جیل کے اکثر قیدی چارپائیوں کی بجائے زمین پر اپنا بستر بچھا کر ایام اسیری گزار رہے تھے اور صرف ہمارے احاطہ کے چند نظر بندوں کے پاس جو چارپائیاں تھیں وہ ان بزرگوں کی خدمت میں پیش کردی گئیں۔ جیل کے افسروں نے بعد میں اکثر سیاسی قیدیوں کے لئے چارپائیوں کا انتظام کردیا۔

حکام سکھر جیل کا افسوسناک سلوک

شاہ جی چونکہ بیماری اور سفر کی طوالت کے بعد بے حد نڈھال تھے اس لئے ہم نے اپنی بات چیت صرف علیک سلیک تک ہی محدود رکھی ظہر کی نماز کے بعد جب ارباب سخن نے شاہ جی سے ان کی صحت کے بارے میں دریافت کیا۔ انہوں نے پہلے کراچی کے ارباب اختیار کی کرم بخشیوں کی داستان سنائی کہ ان لوگوں نے ہم بڈھوں (مولانا ابوالحسنات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے) کے ساتھ کیا سلوک کیا۔ پھر سکھر جیل کے افسروں کی اخلاق باختگی اور ان کی سرد مہری کے واقعات سنائے تو سامعین کے رونگٹے کھڑے ہوگئے۔

شاہ جی نے فرمایا کہ "موسم گرما، جون، جولائی کی ہلاکت خیزیاں، سکھر جیل اور پھر اس کے "رحم دل اور ذرہ نواز" ارباب اختیار! بس یہ تو میرے اللہ میاں کا فضل و کرم ہوا کہ ہم وہاں سے زندہ و سلامت آگئے، ورنہ ان لوگوں نے اپنی جانب سے کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا"۔

آپ نے سکھر جیل کی خوراک کا ذکر کرتے ہوئے بتایا کہ "چاول اور نامعلوم اشیاء کے امتزاج سے جو سخت سے سخت روٹی تیار ہوسکتی وہ ہمارے لئے مہیا کی جاتی ساگ پات کی جگہ گھاس پھونس اور مسلسل مسور کی دال یہ ہمارے لئے سب سے اچھی "صحت افزا" غذا تجویز کی گئی تھی، تپتے ہوئے مختصر سے قبر نما کمرے ہمارے لئے مسکن اور قیام گاہیں تھیں جن سے معمولی ہوا کا بھی مشکل سے گزر ہوتا تھا جن کا نتیجہ یہ نکلا کہ ان تکلیف دہ اور دلگداز حالات میں میری صحت کا ستیاناس ہوگیا، جسم کا ستیاناس ہوگیا جسم پر پہلے گرمی دانے نمودار ہوئے۔ پھر وہ سخت پھوڑے بن گئے جنہوں نے میرے بدن میں اس طرح آگ لگادی جس طرح دہکتے ہوئے انگارے جسم پر رکھ دیئے گئے ہوں"۔

شاہ جی نے فرمایا "متحدہ ہندوستان میں ہم نے سخت سے سخت جیل خانے بھی دیکھے ہیں اور سفاک سے سفاک

اور ظالم سے ظالم جیل کے انگریز افسروں سے واسطہ پڑا ہے اور بعض افسروں سے ایسی گٹھی کہ رہائی تک اٹھارہ بنارہا لیکن سکھر جیل میں ہمارے ساتھ نرالا ہی سلوک ہوا میں قید و بند کے مصائب بیان کرنے کا عادی نہیں ہوں بلکہ ان کا تذکرہ معیوب سمجھتا ہوں جو لوگ حوالات میں ایک رات کاٹ آئیں تو باہر آکر اخبارات کے نمبر نکالتے ہیں اور زندان کی ساعتیں منٹوں میں حساب لگا کر بیان کی جاتی ہیں بابو! یہ پراپیگنڈے کی دنیا ہے حضرت یوسف علیہ السلام نے تو ہمارے لئے جیل خانہ گلشن بنادیا تھا جیسے وہاں عطر بیز پھولوں تک رسائی کانٹوں میں الجھنے کے بعد ہی حاصل ہوتی ہے ایسے ہی گلشن زندگی میں تلخیوں اور تنگیوں کے بعد ثمر مراد پاسکتے ہیں"

شاہ جی نے حضرت یوسف علیہ السلام کا ذکر جاری رکھتے ہوئے فرمایا

"سبحان اللہ! انہوں نے کتنی بلند بات کی ہے

ربی السجن الی مما یذعوننی الیہ

اے میرے پروردگار! یہ قید خانہ مجھے اس سے کہیں زیادہ محبوب ہے جدھر وہ مجھے بلا رہے ہیں۔ آپ نے فرمایا یوسف علیہ السلام کے ذکر سے مجھے ڈم ڈم جیل یاد آگئی، ۱۹۳۰ء کے ایام اسیری میں ایک رات سورہ یوسف کی تلاوت کررہا تھا چودھویں رات کی چاندنی، رات کا سناٹا، فضا خاموش اور ماحول دم بخود تلاوت قرآن میں کچھ وقت گزر گیا۔ اتنے میں پنڈت رانجھی لال سپرنٹنڈنٹ جیل نے مجھے پیچھے سے پکارا دیکھا تو اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کی بارش ہورہی تھی۔ کہنے لگا

"شاہ جی! خدا کے لئے بس کرو میرا دل قابو سے باہر ہورہا ہے اور اب مجھ میں رونے کی سکت نہیں رہی"

بھائی! قرآن پڑھا جائے تو آج بھی اس کے اعجاز دکھائی دیتے ہیں آپ نے سلسلہ کلام جاری رکھتے ہوئے فرمایا یہاں ذکر سکھر جیل کا ہورہا ہے میری تو خیر کوئی بات نہ تھی میں تو سرد گرم کشیدہ ہوں اور پوری زندگی جیل یا ریل کی نذر ہوئی ہے یہ بڑے میاں (ابوالحسنات) بیچارے اس وادی پرخار میں پہلی ہی بار قدم رنجاں ہوئے تھے۔ مجھے ان کا بڑا احساس رہا لیکن ماشاء اللہ ان کو تو میں نے اپنے سب ساتھیوں سے زیادہ صابر و شاکر پایا راقم الحروف نے استفہاماً شاہ جی کی خدمت میں عرض کی آپ حضرات کے ساتھ اس قسم کے افسوسناک سلوک کا محرک کہیں انسپکٹر جیل خانہ جات کا انتقامی جذبہ تو نہیں اس پر شاہ جی نے ایک بار پھر میری طرف دیکھا اور خاموش ہوگئے۔

شاہ جی کا موقف

۲۷ فروری کو تحریک تحفظ ختم نبوت کے دوران کراچی میں گرفتار ہونے والے دوسرے مرکزی رہنما جن میں ماسٹر تاج الدین انصاری مولانا عبد الحامد بدایونی اور دوسرے حضرات شامل تھے حیدر آباد جیل سے لاہور سنٹرل جیل منتقل کردئے گئے۔ ان حضرات کی آمد پر تحقیقاتی عدالت کے سامنے مجلس احرار کا موقف پیش کرنے کا مسئلہ آیا چنانچہ مجلس احرار کے رہنماؤں کا ایک خصوصی اجلاس منعقد ہوا۔ جس میں مختلف حضرات نے اپنا اپنا نظریہ پیش کرتے ہوئے اس بات پر زور دیا کہ ہمیں تحقیقاتی کمیشن کے ساتھ تعاون کرنا چاہئیے اور اس کے سامنے اپنا موقف پیش کرنے میں کسی قسم کی ہچکچاہٹ سے کام نہ لینا چاہئیے۔ امیر شریعت حضرت مولانا عطاء اللہ شاہ بخاری نے اپنے

رفقاء جماعت اور ارباب سخن کے خیالات سن کر ایک آہ سرد بھری اور فرمایا
"تم دوست جو فیصلہ کرو مجھے اس سے اختلاف نہیں ہوسکتا۔ آپ حضرات نے اپنی مدلل باتوں سے میرے دماغ کو متاثر کیا ہے لیکن (اپنے دل کی طرف اشارہ کرتے ہوئے) اسے کیا کروں یہ ساتھ نہیں دے رہا ہے کہ یہ کمیشن ہمارے ساتھ انصاف نہیں کرے گا بلکہ میری نگاہ میں تو ہمیں رسوا کرنے کے لئے ارباب حکومت کی یہ ایک دلربا چال ہے (شاہ جی نے یہاں پر اس وقت کے ارباب اقتدار کی ایمانی کمزوری اور باطل پرستی کا بھی ذکر کیا) ہمیں کمیشن سے عدم تعاون کا اعلان کردینا چاہیئے پھر جو ہوگا دیکھا جائیگا ویسے تم لوگوں نے شہید گنج اور ۱۹۴۶ء کے انتخابات کے موقع پر بھی میری بات نہ مانی اور اب بھی نہ مانو گے اور آخر کار وہی ہو کر رہا جس خدشے کا اظہار کیا گیا تھا"

شاہ جی کے اس انداز نے حاضرین اجلاس پر ایک سکوت طاری کردیا ساتھیوں نے جب مختلف کمشنوں کے ساتھ تعاون کی سابقہ مثالیں پیش کیں اور اس سلسلہ میں عدم تعاون کو نامناسب قرار دیا تو آپ نے فرمایا
"اگر آپ لوگ اسی پر مصر ہیں تو ہمیں مشروط تعاون پر آمادگی ظاہر کرنی چاہیئے کہ ہمارا اصل فریق مخالف چونکہ قید سے باہر ہے اس لئے یا تو اسے بھی ہمارے ساتھ یہاں لایا جائے تاکہ مقدمہ کی پیروی کے لئے ہم دونوں کے وسائل و ذرائع یکساں ہوجائیں اور یا پھر ہمیں آزاد کردیا جائے تاکہ باہر جا کر ہم بھی اپنا مؤقف آزادانہ ماحول میں واضح کرسکیں۔ ایک فریق کو آزاد اور دوسرے کو سلاخوں میں بند کرنے کی عملی صورت ہی اس بات کا بین ثبوت ہے کہ ارباب حکومت و اختیار اپنا فیصلہ صادر فرما چکے ہیں میری مانو تو اپنی زندگی کا بقیہ حصہ قید و بند کی نذر کردو اور اپنا معاملہ اللہ کے سپرد کردو وہ بہتر کارساز ہے لیکن اگر آپ حضرات اس کے لئے آمادہ نہ ہوں تو آپ کے فیصلہ کا پورا پابند رہوں گا اور ان شاء اللہ پھر اسی پر عمل ہوگا ہمارے ہاں تو جماعت نام ہے چند دوستوں اور ساتھیوں کی رفاقت کا"

الغرض اس اجلاس میں یہ فیصلہ ہوگیا کہ مجلس احرار کو متوقع نتائج سے بے پرواہ ہو کر من حیث الجماعت تحقیقاتی کمیشن کے سامنے اپنا موقف پیش کردینا چاہیئے چنانچہ بعد میں احرار کا وہی بیان تحقیقاتی عدالت کے روبرو پیش بھی کردیا گیا۔ باوجود کوشش کے جس کی اشاعت کی اجازت نہ مل سکی۔

مارشل لاء کے قیدیوں سے ملاقات

لاہور سنٹرل جیل میں شاہ جی کی آمد کی اطلاع جب مارشل لاء کے قیدیوں کو ملی تو انہوں نے حکام جیل کی اجازت سے شاہ جی سے ملاقات کا پروگرام بنایا۔ ایک دن صبح سویرے ہم اسیران قفس ناشتہ کی تیاریوں میں مصروف تھے کہ دیوانی احاطہ کے انچارج نے آکر شاہ جی سے درخواست کی کہ مارشل لاء کے چند قیدی باہر کھڑے ہیں اور وہ آپ کی زیارت کے مشتاق ہیں۔ اگر اجازت ہو تو انہیں اندر بلالوں ابھی اس کی بات مکمل نہ ہوپائی تھی کہ شاہ جی ننگے سر اور ننگے پاؤں ان قیدیوں کے استقبال کے لئے دیوانہ وار کمرے سے باہر نکل گئے دیوانی احاطہ کے دروازہ پر قیدی خراماں خراماں آرہے تھے ہتھکڑیوں اور بیڑیوں کی جھنکار اور شاہ جی کا استقبال ایک عجیب پر کیف

منظر آنکھوں کے سامنے تھا شاہ جی نے سب کو گلے لگایا ایک ایک کی بیڑی اور ہتھکڑی کو بوسہ دیا۔
پھر آپ نے اشکبار آنکھوں اور غمناک لہجے میں فرمایا
"تم لوگ میرا سرمایہ نجات ہو میں نے دنیا میں لوگوں کو روٹی اور پیٹ یا کسی مادی مفاد کے لئے نہیں پکارا لوگ اس کے لئے بڑی قربانیاں کرتے ہیں میں نے تو اپنے نانا حضرت خاتم النبیین ﷺ کی عزت و ناموس کے تحفظ کی دعوت دی ہے اور تم لوگ صرف اور صرف اسی مقدس مقصد کے لئے قید و بند اور طوق و سلاسل کی صعوبتیں برداشت کر رہے ہو۔ تم میں سے کوئی ایسا نہیں ہے سیاسی شہرت یا ذاتی وجاہت جس کا مقصود ہو تم یہاں جیل میں بھی غیر معروف ہو اور جب تم اس دیوار زنداں سے پرے جاؤ گے تو باہر تمہارا استقبال کرنے والا اور گلے میں پھولوں کے ہار ڈال کر نعرہ لگانے والا بھی کوئی نہ ہوگا نیت اور ارادے کے اعتبار سے جس کی آمد اس مقصد کے لئے ہوتی ہے۔ وہ یہی مقصد لے کر واپس چلا جائے گا۔ میرے لئے اس سے بڑا سرمایہ افتخار اور کیا ہوسکتا ہے"؟
شاہ جی یہ چند جملے فرما چکے تو کسی نے ایک قیدی کی جانب اشارہ کرتے ہوئے بتایا کہ تحریک میں اس کا بھائی گولی کا نشانہ بن چکا ہے اس کے لئے دعا فرمائیں شاہ جی نے تحریک کے دوران متشددانہ کارروائیوں کی مذمت کرتے ہوئے فرمایا
"بھائی ہم ہرگز یہ نہیں چاہتے تھے کہ حکومت یا عوام تشدد پر اتر آئیں اور کوئی ناخوشگوار صورت نمودار ہوجائے، میں نے کراچی جیل میں جب لاہور اور دوسرے مقامات پر گولی چلنے کے واقعات سنے اور معلوم ہوا کہ کئی بوڑھے باپوں کی لاٹھیاں ٹوٹ گئیں ہیں ماؤں کے چراغ گل ہوگئے ہیں اور کئی سہاگ اجڑ گئے ہیں تو مجھے اس کا بڑا صدمہ پہنچا میں نے وہاں کہا تھا کہ کاش مجھے کوئی باہر لیجائے یا ارباب اقتدار تک میری یہ آرزو پہنچا دی جائے کہ تحفظ ناموس رسول کے سلسلہ میں اگر کسی کو گولی مارنا ضروری ہو تو گولی میرے سینے میں مار کر ٹھنڈی کر دی جائے اور کاش اس سلسلہ میں اب تک جتنی گولیاں چلائی گئی ہیں وہ مجھے ٹکٹکی پر باندھ کر میرے سینے میں پیوست کر دی جاتیں۔
مارشل لاء کے ان قیدیوں کے علاوہ جو حضرات شاہ جی سے ملنے کے لئے آئے ان میں سے سید ابوالاعلیٰ مودودی، شیخ الحدیث مولانا محمد اسمعیل سلفی، مولانا غلام محمد ترنم، مولانا اختر علی خان، مولانا عبدالستار خان نیازی، اور مولانا امین احسن اصلاحی کے نام خصوصاً قابل ذکر ہیں۔

جیل میں شاہ جی کے مشاغل

لاہور سنٹرل جیل میں امیر شریعت عطاء اللہ شاہ بخاری کے مشاغل کا عنوان ایسا ہے جس پر کچھ لکھا جاسکتا ہے۔ یہاں پر صرف چند ضروری واقعات پر اکتفاء کیا جاتا ہے۔ جن لوگوں کو شاہ جی کی زندگی کا قریب سے مطالعہ کرنے کا شرف حاصل ہوا ہے وہ اس حقیقت سے بخوبی اندازہ لگا سکتے ہیں کہ شاہ جی کے روزمرہ کے مشاغل بظاہر کسی منظم پروگرام کے تحت نہیں ہوا کرتے تھے یعنی مطالعہ کتب، تحریر ملاقات اور سیر و سیاحت کے لئے کوئی باقاعدہ نظم اوقات مرتب ہو، شاہ جی کی زندگی میں اس انداز کا نظم اگر دکھائی دیتا ہے تو وہ صرف عبادات کا ہے آپ نماز سے فارغ ہو کر قرآن پاک کی تلاوت کرتے یا پھر درود و وظائف میں اور ذکر الٰہی میں منہمک رہتے۔ تہجد کے وقت

جب کبھی آپ اللہ اللہ کا ذکر بالجہر کرتے یا دوسرے اوقات میں تلاوت قرآن مجید کرتے تو وجد میں آجاتے اور اپنا روائتی لب ولہجہ اختیار کرتے تو سکوت زنداں میں ایک ارتعاش پیدا ہوجاتا اور ایک عجیب سماں بندھ جاتا شاہ جی کے مشاغل میں سب سے زیادہ جس بات کو اہمیت دی جاسکتی ہے اور وہ ان کا تذکرہ ماضی ہے شاہ جی اپنے زمانۂ حیات میں جب احباب و رفقاء کی محفل آراستہ کرتے تو اکثر اپنے ماضی کے عظیم الشان واقعات او اپنے مثالی کارناموں کا بے تکلف ذکر اس طرح کرتے جیسے تاریخ کے اوراق پارینہ پڑھے جارہے ہوں شاہ جی اپنی مجلسی زندگی میں تاریخ آزادیٔ وطن کے بڑے سنہری باب پڑھ کر سناتے ہیں کاش ہمارے ہاں کوئی ایسا ادارہ ہوتا جو حیات امیر شریعت کے مختلف پہلوؤں کو اجاگر کرکے آئندہ نسل کے لئے کوئی قابل ستائش مواد فراہم کرنے کا اہتمام کرتا۔

ایک دن چائے سے فارغ ہوکر ابھی دستر خوان پر ہی بیٹھے تھے کہ فتح دین نامی باورچی کا ذکر چھڑ گیا۔ اس باورچی نے اگرچہ پکانے میں خاصی مہارت حاصل کرلی تھی لیکن مولانا ابوالحسنات (جنھیں شاہ جی ہر فن مولا کے نام سے یاد کرتے تھے) اس کی ایک نہ چلنے دیتے اور ضرور کوئی نئی ہدایت جاری فرمادیتے الغرض شاہ جی نے مختلف باورچیوں کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا کہ میں نے ایک بار انگریزوں کے خلاف خانساموں کی تحریک عدم تعاون بھی چلائی مجھے جہاں کہیں سے اطلاع ملتی کہ اس انگریز افسر کے ہاں کوئی مسلمان ملازم خانساماں کی خدمات سرانجام دے رہا ہے تو اسے عدم تعاون پر آمادہ کرتا چنانچہ اس سلسلہ میں ایک خانساماں کانفرنس منعقد کی گئی جس کے اچھے اثرات مرتب ہوئے۔

شاہ جی کے مشاغل کے ساتھ ہی یہاں پر اگر آپ کی جسمانی ورزش کے باب کا ایک حصہ قارئین کے سامنے پیش کردیا جائے تو دلچسپی سے خالی نہ ہوگا تحریک تحفظ ختم نبوت کے رہنماؤں کو ہمارے احاطہ میں تشریف لائے ابھی چند دن ہوئے تھے کہ راقم الحروف نے ازراہ تفنن طبع شاہ جی، مولانا ابوالحسنات، مولانا عبدالحامد بدایونی، شیخ حسام الدین، مولانا محمد علی جالندھری، اور ماسٹر تاج الدین انصاری کی خدمت میں عرض کیا اے بابا حضرات ہمیں یہ ایام اسیری بیمار بن کر نہیں گزارنے جسمانی ورزش کا بھی کوئی پروگرام مرتب ہونا چاہیئے اٹھیئے اور میدان کارزار میں ہمارا مقابلہ کیجئے۔ مولانا ابوالحسنات تو مسکرادئیے شاہ جی نے مجھے ڈانٹ پلادی "جاؤ اپنا کام کرو" میں نے عرض کیا شاہ جی سیفٹی ایکٹ پر مزید سیفٹی ایکٹ نافذ کرنے کا کوئی فائدہ نہیں میں تو والی بال کھلانے کے لئے آپ کو لے جاؤں گا۔

اس اثناء میں مولانا محمد شریف جالندھری اور ملک عبدالغفور انوری میرے ساتھی بن گئے، چنانچہ شاہ جی ہماری درخواست پر کھیلنے کے لئے باہر گراؤنڈ میں چلے گئے اب یہ مسئلہ درپیش تھا کہ والی بال کہاں سے حاصل کیا جائے۔ یا پھر اس کی جگہ پر متبادل کھیل کونسا کھیلا جائے میں نے اپنا تولیہ گول کرکے گیند بنالیا اور شاہ جی کی جانب پھینک کر کھیل کا آغاز کردیا اس پر ایک زور دار قہقہہ بلند ہوا بس پھر کیا تھا مولانا ابوالحسنات کے علاوہ دوسرے حضرات بھی ہمارے ساتھی بن گئے شیخ صاحب اپنے گھٹنے میں تکلیف کے باعث چونکہ کھیل سے معذور تھے اس لئے انہیں کھیل کا منصف ٹھہرایا گیا ایک دو روز تو ہم اس طرح کھیلتے رہے چند دن بعد ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ جیل مہر

محمد حیات صاحب عین اس موقعہ پر دیوانی احاطہ میں آئے جب ہم کپڑے کی گیند کے ساتھ اپنے کھیل میں خوب مصروف تھے۔ مہر صاحب ہمیں دیکھتے ہی کھلکھلا کر ہنس پڑے اور آتے ہی بولے آپ حضرات نے اس سلسلہ میں ہمیں کیوں نہ مطلع کیا۔ ہم آپ کے لئے کھیل کا سارا سامان فراہم کر دیتے اور وہ تو قانونی طور پر آپ کا حق بھی ہے۔ خیر دوسرے دن والی بال نٹ اور بیڈ منٹن کھیلنے کا سامان ہمارے احاطہ میں پہنچ گیا سامان دیکھ کر اب دوسرے رہنماؤں نے بھی کھیل کے لئے آمادگی ظاہر کی چنانچہ اچھی خاصی ٹیم مرتب ہوگئی۔ اب ذرا کھلاڑیوں کی اس ٹیم کے اسمائے گرامی بھی سن لیجئے امیر شریعت مولانا سید عطاء اللہ شاہ بخاری مولانا عبد الحامد بدایونی، ماسٹر تاج الدین انصاری، مولانا محمد علی جالندھری، مولانا محمد حیات فاتح قادیان، مولانا لال حسین اختر، صاحبزادہ فیض الحسن، سید سبط حسن (سابق مدیر لیل و نہار)، مولانا سید نور الحسن شاہ بخاری، ملک عبدالغفور انوری، مولانا محمد شریف جالندھری، سائیں محمد حیات پسروری، مولانا ابو الحسنات اپنے پاؤں میں سخت تکلیف کے باعث کھیل پر آمادہ نہ ہوسکے تھے ویسے گراؤنڈ میں باہر بیٹھ کر کھیل میں خوب دلچسپی لیتے رہے اور اس بات کا تذکرہ تو آپ حضرات کے لئے یقینا معلومات افزا ہوگا کہ ہر جمعہ کو ہماری اس ٹیم کا بم کیس کے محبوس نظر بندوں کے ساتھ میچ ہوتا بم کیس میں بھی اس تحریک کے قیدی جمع تھے۔ اس میں اکثریت چونکہ جماعت اسلامی کے رہنماؤں اور کارکنوں کی تھی اس لئے بم کیس ٹیم کا نام جماعت اسلامی اور دیوانی احاطہ کی ٹیم کا نام احرار رکھا گیا میچ کے دوران جو ٹیم کامیاب و کامران ہوتی رہی ہے "بم کیس ٹیم کو اس کا بخوبی علم ہے"۔

کھیل کا یہ تذکرہ اگرچہ طوالت اختیار کر گیا ہے اور ممکن ہے کہ قارئین حضرات کے ذوق سلیم پر کچھ شاق گزرے مگر چونکہ مقصود شاہ جی کی زندگی کا ایک ایسا پہلو بیان کرنا ہے جس کا نظام صحت کے ساتھ گہرا تعلق اور وابستگی ہے اس لئے امید کی جاتی ہے کہ حضرات قارئین اسے گوارا ہی کریں گے شاہ جی نے اپنی جسمانی ورزش کا ذکر کرتے ہوئے ایک بار یہ بھی بتایا کہ دور جوانی کے عالم میں جبکہ امرتسر کی ایک مسجد میں خطیب تھے اکثر مروجہ ورزشی امور میں دلچسپی لیا کرتے تھے۔ اور ان کے جسمانی حسن میں ورزش کو خاصا دخل رہا ہے۔

تاثرات

ایک دن میں نے شاہ جی سے دریافت کیا کہ آپ ایام اسیری میں کس شخصیت سے اور اس کے کس کارنامہ سے متاثر ہوئے ہیں میرا یہ سوال سن کر پہلے تو حسب معمول ٹالنے کی کوشش کرتے رہے جب میں نے ذرا اصرار کے ساتھ معروضات پیش کیں تو فرمانے لگے

"مجھ سے کیا پوچھتے ہو بھائی میں تو ایک گنہگار انسان ہوں اور گنہگار کسی گنہگار ہی سے متاثر ہوسکتا ہے۔ قید و بند کے دوران جب بعض اخلاقی قیدی چوری ڈکیتی کے جرم میں آتے ہیں اور ایام اسیری گزارنے کے بعد جب واپس لوٹنے لگتے تو ان میں سے پختہ کار مجرم جیل کے برتن چٹائی اور کمبل وغیرہ یہ کہہ کر اپنے ساتھیوں کی تحویل میں دے جاتے کہ انہیں ڈیوڑھی میں جمع نہ کرانا۔ ہم بہت جلد واپس آکر یہ وصول کرلیں گے۔ ان گنہگاروں کے عزائم کی بلندی اور اپنی دھن کی پختگی نے مجھ کو بڑا متاثر کیا یہ لوگ گناہ میں اس قدر پختہ ہیں اور ہم سراسر نیکیوں اور محاسن میں

کمزوری کا اظہار کریں۔

اور بھائی! یہ کفر میں پختگی تو کبھی کبھی انبیائے کرام کی خصوصی توجہ اور دعاؤں کا مرکز بن جایا کرتی ہے جبھی تو حضرت خاتم النبیین ﷺ نے اللہ میاں سے حضرت عمرؓ کو مانگا اور پھر اسلام میں انہوں نے استقلال اور شجاعت وہ کا ثبوت دیا جو تحریک اسلام کے ایک سنہری باب کی حیثیت سے ہمیشہ درخشندہ اور تابناک رہے گا۔

شاہ جی نے سلسلہ کلام جاری رکھتے ہوئے فرمایا بات یہ ہے تو طنز و مزاح کی لیکن خدا بھلا کرے علامہ حسین میر کاشمیری کا وہ مزاح میں بھی کمال کی بات بتلا گئے۔

تحریک عدم تعاون کے سلسلہ میں ایک بار علامہ حسین میر کاشمیری گرفتار ہو کر غالباً کیمبل پور جیل میں چلے گئے جماعتی دوستوں میں سے خصوصاً چودھری افضل حق نے جماعتی احباب کا اہم اجلاس دفتر مرکزیہ مجلس احرار لاہور میں طلب کیا چنانچہ اجلاس میں یہ فیصلہ طے پا گیا کہ علامہ صاحب سے جیل میں ملاقات کے لئے ان حضرات پر مشتمل ایک وفد بھیجا جائے اور اس قدر رقم ان کے اخراجات کے لئے مخصوص کردی جائے تو یکایک باہر کسی نے بند کمرے کا دروازہ خوب زور سے کھٹکھٹانا شروع کر دیا پہلے تو ہمیں اس حرکت پر بہت غصہ آیا مگر جب دوسری بار اسی انداز سے دروازہ کھٹکھٹایا گیا تو چودھری افضل حق صاحب نے اٹھ کر دروازہ کھولا دیکھتے ہیں علامہ حسین میر اپنے کندھوں پر بستر اٹھائے کھڑے ہیں۔ چودھری صاحب نے دیکھتے ہی اظہار حیرت کے طور پر فرمایا اے علامہ تم کیسے! علامہ حسین میر نے اتنے میں اپنا بستر اجلاس کے عین وسط میں لاکر زور سے ٹیک دیا اور دوسری طرف متوجہ ہو کر بولے شاہ جی! میں تو انگریز اور انگریز کی جیل پر لعنت بھیج کر آگیا ہوں میں نے پوچھا علامہ! لعنت کے معنی! جھٹ بولے لعنت! یعنی لکھ کر دے آیا ہوں تمہارا مقصد انگریز سے عدم تعاون ہے جب جیل سے باہر ہوتے ہیں تو انگریزوں کی انتہائی کوشش یہ ہوتی ہے کہ یہ جیل کے اندر جائیں اور جب اندر چلے جاتے ہیں تو ان کی انتہائی کوشش یہ ہوتی ہے کہ یہ جیل سے باہر نہ جائیں۔ میں نے یہی سمجھا کہ جیل میں بھی عدم تعاون کرنا چاہیئے علامہ حسین میر کی یہ نرالی منطق سن کر محفل زعفران زار بن گئی۔

❄

ایسا بزرگ، جس پر جماعت کو ناز تھا۔

مولانا سید محمد میاں: (دہلی)

ان کی موت سارے علام اسلام کے لئے نقصان عظیم ہے

مولانا احتشام الحق تھانوی

اردو میں شاہ جی سے بڑا خطیب پیدا نہیں ہوا اور آئندہ بھی کئی نسلیں اتنا بڑا خطیب پیدا نہ کر سکیں گی۔

مولانا ظفر علی خان

انہیں دیکھ کر قرون اولی کے مسلمان یاد آتے ہیں۔

خواجہ حسن نظامی

ان کے وجود کی ماہیت اور معنویت کا ذرہ ذرہ اسلامیت سے سرشار تھا

غلام رسول مہر

عظمت کی سجدہ ریزی

میں تو کبھی کبھی یوں بھی سوچا کرتا ہوں کہ امام الانبیاء ﷺ کے اوصاف حمیدہ، آپ کے کمالات، آپ کے محاسن، غرض یہ کہ آپ کی مختلف الانواع بے مثال خوبیوں کو دیکھ کر جی یہ چاہتا ہے کہ ایسے گونا گوں محاسن سے متصف شخصیت کو کیوں نہ معبود بنا لیا جائے مگر جب اس عظمت کو کسی دوسری عظمت کے حضور انتہائی عاجزی اور انکساری کے عالم میں پوری دردمندی کے ساتھ سبحان ربی الاعلیٰ کہتے ہوئے سجدہ ریز پاتا ہوں تو خیال آتا ہے کہ جس کے آستانۂ عالیہ پر یہ عظمت سرنگوں ہے وہ ذات کتنی عظیم، کتنی بلند اور کتنے اوصاف و محاسن کی مالک ہے۔ سچی بات تو یہ ہے کہ ہمیں تو ختم المرسلین ﷺ کی عظمت نے احکم الحاکمین کی عظمت و رفعت سے روشناس کرایا ہے۔

یتیم مکہ کہ محمد کہ آبروئے خدا است
کسے کہ خاک رہش نیست برسرش خاک است

امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاری رحمہ اللہ

القصہ ایک عہدِ صحابہ کی یادگار

اچھا ہوا کہ آپ بھی ہم سے بچھڑ گئے
ورنہ امید و یاس کا قصہ دراز تھا
تھے لوگ بے حسی کے سمندر میں غوطہ زن
اور اس پہ یہ ستم کہ خدا بے نیاز تھا
تیری زباں کے پھول تھے در ہائے تابدار
تیرے بیاں پہ فنِ خطابت کو ناز تھا
تیرے دل و دماغ تھے قدرت کا معجزہ
سینہ ترا مدینۂ سوز و گداز تھا
ہر مرحلہ میں جبر و تشدد کا سامنا
ہر معرکہ میں فضل خدا کار ساز تھا
جس کا وجود نغمہ طرازِ حجاز تھا
القصہ ایک عہدِ صحابہ کی یادگار
شورش وہ آج عازم فردوس ہو گیا
دار و رسن کے خوف سے وہ بے نیاز تھا
اے وائے! داستانِ وفا ختم ہو گئی
صر صر کی چوٹ کھا کے صبا ختم ہو گئی
جو کچھ ہوا درست ہوا، خوب تر ہوا!
نوکِ قلم پہ آہ و فغاں آگئی تو کیا؟
برہم رہا ہے نقشۂ عالم اسی طرح
آندھی افق سے تا بہ افق چھا گئی تو کیا؟
نالہ بلب ہیں نغمہ سرایانِ فصلِ گل،
بوئے چمن کو بادِ خزاں کھا گئی تو کیا؟
وہ لوگ جو قفس میں رہے ہیں تمام عمر
اُن کے چمن پہ برقِ ستم ڈھا گئی تو کیا؟
جن کا وجود برقِ جہاں تاب کا جواب
اک مرگ ناگہاں انہیں تڑپا گئی تو کیا؟
کوثر پہ آملیں گے حریفانِ بادہ نوش
اے مرگ شکریہ ترا تو آگئی تو کیا؟
"لائی حیات آئے قضا لے چلی چلے
اپنی خوشی نہ آئے، نہ اپنی خوشی چلے"
دل انقلاب حال سے نالاں ہے دوستو
شیرازۂ حیات پریشاں ہے دوستو
ناسازگار آب و ہوا ہے کہاں چلیں
صر صر کی زد میں نظم گلستاں ہے دوستو
جو کچھ سلوک ہم سے چمن میں کیا گیا
تاریخ اس پہ ششدر وحیراں ہے دوستو
اپنے لہو سے لالہ و گل کو نکھار دو
یہ بھی علاجِ گردشِ دوراں ہے دوستو
کچھ دوستوں کے غم ہیں تو کچھ ساتھیوں کی یاد
اس پہ مدارِ دیدۂ گریاں ہے دوستو
آخر کہاں چلا گیا سالارِ کارواں؟
کس سے کہیں کہ حشر کا ساماں ہے دوستو
اک زد پڑی ہے زندگیٔ مستعار پر
اور سچ کہوں تو موت کا احساں ہے دوستو

چکمہ دیا اجل نے "غریب الدیار" کو
لوٹا ہے فصل گل میں خزاں نے بہار کو

شورش کاشمیریؒ

پروفیسر خالد شبیر احمد

امیر شریعت ایک کلیم سربکف

حضرت امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاری رحمہ اللہ ایک جامع الصفات شخصیت ہیں جن کے بارے میں یہ بات برملا کہی جاسکتی ہے کہ وہ اپنی خوبیوں کی بنیاد پر اپنے ہمعصر رہنماؤں میں ایک نمایاں اور منفرد مقام رکھتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے جب کسی قوم سے کوئی اہم کام لینا ہو تو ان کے ہاں یہ دستور ہے کہ وہ اس قوم کو ایسے رہنماؤں سے نواز دیتے ہیں جن کے اخلاق و کردار ایثار و قربانی اور عزم اور استقلال سے انقلاب پیدا ہو جائے۔ چنانچہ آج جب ہم غلام ہندوستان کے دور پر نگاہ دوڑاتے ہیں تو ہمیں ایسی ہی عظیم ہستیوں کی ایک لمبی قطار نظر آتی ہے۔ مولانا ابو الکلام آزاد، مولانا حسین احمد مدنی، مولانا محمد علی جوہر، مولانا شوکت علی، مولانا حسرت موہانی، سید عطاء اللہ شاہ بخاری اور ایسے کئی دوسرے حضرات یہ سب اپنی اپنی جگہ ایک ادارہ تھے۔ آج ہماری قوم کے افراد کو اگر خدا فرصت کے لمحات مہیا کرلے اور وہ مادی تگ و دو سے چند لمحات علیحدہ رہ کر اس دور کی داستان کو پڑھیں تو انہیں پتہ چلے کہ جنگ آزادی کے ان رہنماؤں نے کن نامساعد حالات میں کس جرات و بے باکی کے ساتھ کام کیا ہے۔ مولانا ابو الکلام آزاد کے الہلال و البلاغ، مولانا حسرت موہانی کے اردو معلی، مولانا محمد علی جوہر کے کامریڈ اور ہمدرد اور مولانا ظفر علی خان کے زمیندار نے کیا کیا کارہائے نمایاں سرانجام نہیں دئیے۔ لیکن ان سب بزرگوں کے انداز کار سے ہٹ کر حضرت امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاری کے کارناموں کا ایک انوکھا اور جداگانہ رنگ ہے۔ ان سب کے اخبار وہ سماں نہ پیدا کرسکے جو سید عطاء اللہ شاہ بخاری کی قوت گفتار نے پیدا کر دکھایا۔ وہ لوگ جو پڑھے لکھے نہ تھے اور دور دراز کے شہری یا دیہاتی علاقے میں رہائش پذیر تھے انہیں سید عطاء اللہ شاہ بخاری اور دبستان بخاری کے دوسرے خطباء (چودھری افضل حق، شیخ حسام الدین، تاج دین انصاری، مولانا مظہر علی اظہر، شورش کاشمیری، قاضی احسان احمد، مولانا گل شیر شہید، مولانا حبیب الرحمن لدھیانوی) نے خواب غفلت سے جگایا۔ نعرۂ تکبیر سے ان کا خون گرما کر انہیں میدان جنگ میں لاکھڑا کیا۔ اس طرح اگر دیکھا جائے تو حضرت امیر شریعت کے دم قدم سے وہ معرکہ بھی سر ہوا جو آزادی کے ان مقتدر رہنماؤں کی دسترس سے باہر تھا۔ حضرت شاہ جی میں ایک خاص بات یہ تھی کہ وہ بڑے پرخلوص اور دل آویز طریقے سے لوگوں کے ساتھ محبت و دلداری کا مظاہرہ کرتے اور نوجوان اپنی جوانی لاکر ان کے قدموں پر ڈھیر کر دیتے تھے۔ اخلاق و کردار کی بلندیوں پر کھڑا ہوا یہ مرد مجاہد اپنی ایک للکار سے جوانوں کو اکٹھا کر لیتا اور ان سے جیسے چاہتا تھا کام لے لیتا۔ تحریک تحفظ ختم نبوت کے متعلق اس وقت کی حکومت نے جب حضرت شاہ جی پر لوگوں کو مرزائیوں کے خلاف اکسانے کا الزام لگایا تو حضرت مولانا احمد علی لاہوری نے اس کے جواب میں فرمایا تھا۔

> "خدا کا شکر ہے کہ سید عطاء اللہ شاہ بخاری تشدد کے قائل نہیں ورنہ اللہ تعالیٰ نے انہیں ایسی زبان عطا فرمائی ہے کہ اگر وہ تشدد پر اتر آئیں اور مسلمانوں کو حکم دے دیں تو چند گھنٹوں

کے اندر اندر ربوہ کی اینٹ سے اینٹ بج جائے بلکہ پورے ملک کے اندر ایک قیامت برپا ہوجائے"

حضرت شاہ جی رحمتہ اللہ علیہ اپنی تقریروں سے ایسا سحر پھونکتے تھے کہ دم تقریر سامعین کی سوچنے سمجھنے کی صلاحیتیں مفقود ہو کر رہ جاتیں اور سید عطاء اللہ شاہ بخاری لوگوں کی سوچ کے دھارے کو جدھر چاہتے موڑ دیتے تھے۔ میں نے ان کی بیسیوں تقریریں سنی ہیں۔ ان کے الفاظ کانوں میں رس گھولتے اور دل و دماغ کی گہرائیوں میں اتر جاتے تھے۔ لوگ ان کے سامنے منہ کھولے اور آنکھیں پھاڑے بیٹھے رہتے جیسے انسان نہیں پتھر کی مورتیاں ہیں شورش کاشمیری مرحوم نے ان کی خطابت کو خوبصورت الفاظ کا جامہ پہنا کر ایک مخصوص تاثر قائم کیا ہے وہ لکھتے ہیں۔

"کالی داس نے عورت کے روپ کی تصویر کھینچتے ہوئے کائنات کی جن تصوری اور نظری خوبیوں کو یکجا کیا ہے ان تمام خوبیوں کا مرقع شاہ جی کی خطابت ہے رعد کی گونج، بادل کی گرج، ہوا کا خراٹا، فضا کا سناٹا، صبح کا اجالا، چاندنی کا جھالا، ریشم کی جھلملاہٹ، ہوا کی سرسراہٹ، گلاب کی مہک، سبزے کی لہک، آبشار کا بہاؤ، شاخوں کا جھکاؤ، طوفان کا جوش، سمندروں کا خروش، پہاڑ کی سنجیدگی، صبا کی چال، اوس کا نم، چنبیلی کا پیراہن، تلوار کا لہجہ، بانسری کی دھن، عشق کا بانکپن، حسن کا اغماض، اور کہکشاں کی مسجع و مقطع عبارتیں آواز میں ڈھلتے ہی خطابت کی جو صورت اختیار کرتی ہیں اس کا جیتا جاگتا مرقع شاہ جی کی ذات ہے"

ایک دوسری جگہ آغا شورش اس طرح تحریر فرماتے ہیں۔

"حضرت شاہ جی عوامی خطابت کی اقلیم کے فرمانروا ہیں آپ کی زبان کا لوچ، اسلوب کی دلکشی، خیالات کی پختگی، روانی کا بہاؤ، ظرافت کا شستہ پن، حاضر جوابی کی شوخی، تمثیلات کا قرآنی رنگ، دلائل کی سحر کاری، نہ صرف اردو خطابت کے لئے بے مثال ہے بلکہ وقت کی دوسری زبانوں میں بھی آپ کا ہم مرتبہ خطیب بحیثیت فن ملنا دشوار ہے۔ شاہ جی کی خطابت کا بنیادی وصف یہ ہے کہ وہ مجمع کے ذہنوں کو اکائی میں بدلنے کی قدرت رکھتے ہیں اور بقول "سسرو" ایک خطیب کا منتہائے کمال یہ ہے کہ وہ جس حد تک سامعین کو اپنا ہمنوا بنا سکتا ہے اسی درجے کا خطیب تسلیم ہوتا ہے۔ شاہ جی کے بیان کی ایک خوبی اور ہے کہ وہ آنسوؤں کے تاگے میں قہقہوں کے پھول پرو دیتے ہیں اور قہقہوں کے شور میں آنسوؤں کے موتی بکھیر دیتے ہیں"

اسی طرح ہندوستان کے ایک مشہور مصنف کے ایل گابا جنکی کتاب "مجبور آوازیں" کا پاکستان کے اہل علم و سیاست میں کافی چرچا رہا ہے اپنی کتاب BATTLE AT BAR "بیٹل ایٹ بار" میں شاہ جی کی خطابت اور دیانت کے بارے میں تحریر کرتے ہیں

"مولانا سید عطاء اللہ شاہ بخاری کئی لحاظ سے اپنے دور میں ہندوستان کے سب سے بڑے

خطیب تھے ان کے زمانہ عروج میں اگر کوئی تھے تو فقط چند ہی ان کے ہم پایہ خطیب تھے۔ تین سے پانچ گھنٹے کی خطابت ان کے بائیں ہاتھ کا کھیل تھا۔ بعض اوقات تو ساٹھ ہزار کے بڑے مجمع کو ان کے انتظار میں دیکھا گیا۔ وہ نماز عشاء کے بعد گیارہ بجے کے قریب سٹیج پر تشریف لاتے اور صبح کو ہی سامعین کو گھر جانے کی اجازت دیتے تھے۔ جبکہ سامعین اس وقت بھی گھر جانے کے لئے ذہنی طور پر تیار نہ ہوتے تھے۔ شاہ جی اس لئے جلسہ برخاست نہ کرتے تھے کہ سامعین نے بہت کچھ سن لیا ہے یا پھر ان کے پاس کہنے کو کچھ نہیں رہا۔ بلکہ اس لئے جلسہ برخاست کرتے تھے کہ اس طرح وہ لوگوں کو۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ لیکر آرام کرنے کا موقع دینا چاہتے تھے۔ انہیں تقریر کے دوران سامعین کو رلانے اور ہنسانے کے پوری قدرت حاصل تھی وہ اپنے سامعین میں نفرت اور طنز کے جذبات بھی اتنی ہی آسانی کے ساتھ پیدا کرسکتے تھے جتنی آسانی کے ساتھ رحم، محبت اور تعاون کے جذبات۔ عطاء اللہ عربی النسل تھے وہ عربی، فارسی اور اردو بڑی آسانی کے ساتھ بول سکتے تھے انہیں انگریز اور قادیانیوں کے ساتھ انتہائی نفرت تھی۔ وہ کئی مرتبہ جیل گئے، لیکن انہوں نے اپنی صلاحیتوں، اپنے نظریات اور اپنی قربانیوں کا کبھی سودا نہ کیا''

اسی طرح ڈبلیو، سی، سمتھ اپنی کتاب MODERN ISLAM IN INDIA ''ماڈرن اسلام ان انڈیا'' میں شاہ جی کے بارے میں اس طرح تحریر کرتا ہے۔

''شخصی اثر اور مقبولیت کی سب سے بڑی مثال سید عطاء اللہ شاہ بخاری کی ذات میں دکھائی دیتی ہے۔ یہ غیر معمولی شخصیت ہندوستان کے سب سے بڑے اور مؤثر ترین خطیب ہونے کا دعویٰ کرسکتی ہے جس نے کئی بار اپنے سحر بیان سے لاکھوں افراد کے دلوں کو مسخر کیا۔ اور لوگ اکثر اکتائے بغیر گھنٹوں تک انہیں غور سے سنتے رہے اور متاثر ہوتے رہتے۔ سید عطاء اللہ شاہ بخاری اپنی تقریروں میں آیات قرآنی اور اشعار سے ایک عجیب و غریب رنگ پیدا کردیتے اور پھر انگریزوں کو ہندوستان سے نکالنے کے ایک غیر متزلزل مطالبے پر اصرار کرتے، انہوں نے قرآن کی روشنی میں ایک مثالی معاشرے کی تصویر پیش کرکے ایک مدت تک لوگوں کو بے چین اور سرگرم عمل رکھا''

ان اقتباسات سے ان کی شخصیت کے صرف ایک پہلو خطابت کا پتہ چلتا ہے۔ کہ وہ کس پائے کے خطیب تھے۔ اور لوگ انہیں کتنے شوق سے سنتے اور وہ کس طرح لوگوں کو ہنسانے اور رلانے کی صلاحیت رکھتے تھے۔ اور یہ کہ وہ جیسا چاہتے لوگوں کو اپنے ارشادات دل نواز سے نوازتے رہتے۔ لیکن یاد رکھیئے امیر شریعت کی عظمت کی وجہ خطابت ہرگز نہ تھی۔ بلکہ آپ نے خطابت کو جس مقصد کیلئے استعمال کیا اصل وجہ افتخار وہ مقصد اور اس مقصد کے حصول کے لئے قربانیوں کو پیش کرنا تھا۔ انہوں نے زندگی جس بے چینی اور اضطراب کے ساتھ بسر کی ہے جس طرح انگریز جیسی جابر طاقت کے ساتھ ٹکر لی ہے۔ اور جس طرح انہوں نے اپنے مشن کی تکمیل کی خاطر ایثار و قربانی

پیش کی ہے یہ سب کچھ ان کی عظمت اور بڑائی کی بنیاد ہے۔ بہت کم لوگوں کو جدوجہد کے دوران ثبات اور استقلال نصیب ہوا ہے۔ جو حضرت شاہ جی رحمتہ اللہ علیہ کو نصیب ہوا ہے مصائب و مشکلات ان کے عزم و استقلال کو سرنگوں کرنے میں کبھی کامیاب نہ ہوسکے۔ ہمیشہ جس بات کو حق جانا برملا اس کا اظہار کیا اور شاید ان کی باتوں میں اثر بھی اسی لیئے ہوتا کہ وہ جو سچ سمجھتے تھے اسے بیان کر دیتے۔

سید عطاء اللہ شاہ بخاری کی زندگی کی تمام تر جدوجہد کا مرکز و محور، ان کا اپنا قول ہے کہ "میں زندگی میں ایک چیز سے محبت کرتا ہوں اور ایک ہی چیز سے نفرت کرتا ہوں، قرآن سے محبت اور انگریز سے نفرت" حقیقت بھی یہی ہے کہ قرآن سے محبت انہیں انگریز سے نفرت کے لیئے مجبور کرتی رہی۔ یہود و نصاریٰ کی ازلی اور ابدی اور ناقابل مصالحت دشمنیٔ اسلام کے تذکرے قرآن پاک کے مقدس صفحات پر بکھرے پڑے ہیں وہ اکثر اپنی تقریروں میں نوجوان نسل کو قرآن پاک کے مطالعے کی تلقین کرتے ہوئے ارشاد فرماتے

"بابو لوگو! اس کتاب کی قسمیں نہ کھایا کرو، اسے پڑھا کرو، قربان جاؤں قرآن پاک کے۔ خود گواہی دیتا ہے کہ میں محمد الرسول اللہ پر اتارا گیا ہوں۔ اسے شاہ ولی اللہ، شاہ اسماعیل شہید اور سید احمد شہید کی طرح نہیں پڑھ سکتے تو نہ سہی، علامہ اقبال کی طرح پڑھ لو۔ دیکھا اس نے قرآن کو ڈوب کر پڑھا تو دانش فرنگ پر ہلہ بول دیا۔ پھر اس نے قرآن کے سوا کچھ دیکھا ہی نہیں یقیناً اقبال تمہارے بتکدہ میں اللہ اکبر کی صدا تھے"

حضرت شاہ جی کے خیال کے مطابق جس نے بھی قرآن کو ڈوب کر پڑھا وہ انگریز کی نفرت پر مجبور ہو گیا۔ کہ اس کے علاوہ اس کے سامنے کوئی چارہ کار ہی نہیں۔ آپ نے ساری عمر کی جدوجہد اور تقاریر کے ذریعے یہ نفرت لوگوں کے دل و دماغ میں منتقل کرنے کا دینی فریضہ ادا کیا آپ صرف انگریز کے ہی نہیں بلکہ اس کے دیئے ہوئے پورے نظام کے مخالف تھے آپ کے دل میں انگریز کے خلاف نفرت کس درجہ موجزن تھی اس کا انداز آپ ان کی ایک تقریر کے اس اقتباس سے لگا سکتے ہیں۔ فرماتے ہیں

"اگر کوئی شخص آسمان سے فرشتوں کے پروں پر ہاتھ رکھ کر نازل ہوتا دیکھوں جو روزانہ آب زمزم سے غسل بھی کرتا ہو اور غلاف کعبہ کا لباس بھی زیب تن کرتا ہو۔ لیکن وہ اپنے کسی قول یا فعل سے انگریزوں کی حمایت کا دم بھرتا ہو تو قسم ہے مجھے اس قادر مطلق کی جس کے قبضۂ قدرت میں میری جان ہے اس شخص کی مخالفت میرے لیئے جزو ایمان کا درجہ رکھتی ہے۔ میں کٹ تو سکتا ہوں لیکن اسکی مخالفت سے باز نہیں رہ سکتا۔ کیونکہ انگریز سے بڑا اسلام اور مسلمانوں کا دشمن اس دھرتی نے آج تک پیدا ہی نہیں کیا۔ یہ ظالم چھوٹے پانی سے ہاتھ پکڑ کر باہر نکالتا ہے احسان جتاتا ہے اعتماد بحال کرتا ہے اور پھر ایسی جگہ ڈبوتا ہے جہاں سے بچنا محال ہو۔ لعنت بر پدر فرنگ"

لعنت بر پدر فرنگ کا قلندرانہ نعرہ وہ اکثر بلند کرتے جس کا مقصد انگریز سے شدید نفرت کا اظہار ہوتا تھا۔ آپ کی تمام عمر کی تقریروں کا تجزیہ کیا جائے تو یہی ثابت ہوتا ہے کہ آپ نے اپنی خطابت کے ذریعے بنیادی طور

پر دو ہی کام کئے ہیں۔ انگریز سے نفرت کا اظہار اور قرآن و دین سے محبت کا پرچار۔ آپ کی ایک تقریر کا مشہور اقتباس آپ کے اس مسلک کا ترجمان ہے۔

"میں ان علمائے حق کا پرچم لئے پھرتا ہوں جو ۱۸۵۷ء میں فرنگیوں کی تیغ بے نیام کا سکار ہوئے۔ رب ذوالجلال کی قسم مجھے اس بات کی کچھ پرواہ نہیں کہ لوگ میرے بارے میں کیا سوچتے ہیں لوگوں نے پہلے ہی کب کسی سرفروش کے بارے میں راست بازی سے سوچا ہے وہ شروع سے ہی تماشائی ہیں اور تماشہ دیکھنے کے عادی ہیں۔ میں اس سرزمین پر مجدد الف ثانی کا سپاہی ہوں، شاہ ولی اللہ اور ان کے خاندان کا متبع ہوں، سید احمد شہید کی عزت کا نام لیوا، شاہ اسماعیل شہید کی جرأت کا پانی دیوا ہوں، میں اُن پانچ مقدمہ ہائے سازش کے پا زنجیر صلحائے امت کے لشکر کا ایک ادنی خدمت گار ہوں، جنہیں حق کی پاداش میں عمر قید اور موت کی سزائیں دی گئیں۔ ہاں۔ ہاں میں انہی کی نشانی ہوں انہی کی صدائے بازگشت ہوں، میری رگوں میں خون نہیں آگ دوڑتی ہے۔ میں علی الاعلان کہتا ہوں کہ میں قاسم نانوتوی کا علم لیکر نکلا ہوں، میں نے شیخ الہند کے نقش قدم پر چلنے کی قسم کھا رکھی ہے، میں زندگی بھر اسی راہ چلتا رہا ہوں اور چلتا رہوں گا۔ میرا اس کے سوا کوئی موقف نہیں میرا ایک ہی نصب العین ہے اور وہ برطانوی سامراج کی لاش کو کفنانا اور دفنانا"

شاہ جی کی تمام زندگی اسی جہاد میں بسر ہوئی تمام عمر انگریز کی مخالفت اور ان کے ایجنٹوں کی سرکوبی میں گزار دی۔ اپنے ارد گرد مخلص اور جاں نثاروں کی جماعت اکٹھی کرلی اور ان غریب ساتھیوں میں اعتماد، لگن اور دلیری کی وہ آگ روشن کردی جس کی وجہ سے مجلس احرار اسلام کا ادنی رضاکار بھی موت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کرتا تھا۔ ان جیالے رضاکاروں کو جب کبھی موت کا مژدہ سنایا جاتا تو ان کے چہرے پر مسرت و انبساط رقص کرنے لگتی اور یہ حضرت شاہ جی کی شخصیت کا پرتو تھا، خود فرمایا کرتے تھے۔

"میں یہ تو نہیں کہہ سکتا کہ میں ہی آزادی کا ہیرو ہوں، اس میدان میں مجھ سے بڑے بڑے لوگ قربانی و ایثار کا مظاہرہ کرتے ہوئے مجھ سے بہت آگے نکل گئے۔ لیکن ایک بات جس سے میرا ضمیر مطمئن اور میرے دل کو ٹھنڈک نصیب ہوتی ہے یہ ہے کہ میں نے اس دھرتی کے لاکھوں انسانوں کے دل ودماغ سے انگریزی رعب اور انگریزی دبدبہ نکال باہر کیا ہے اور غریب لوگوں کے اندر آزادی کی ایسی تڑپ پیدا کردی ہے کہ اب وہ انگریزی استبداد کے سامنے سرنگوں ہونے کی بجائے آزادی کی خاطر تختہ دار پر لٹک جانے کو ترجیح دیتے ہیں"

امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاری کی زندگی ایک بے مثال خطیب کی ہی زندگی نہیں بلکہ ان کی ہمہ گیر شخصیت کو صرف خطابت میں محدود کردینا تاریخ کی بہت بڑی بددیانتی ہے ان کی زندگی ایک عظیم انسان کی

زندگی ہے۔ ان کی عظمت کا راز ان کی خطابت میں نہیں ان کی بھرپور مجاہدانہ دینی زندگی میں ہے۔ انکی شجاعت میں ہے۔ بڑے سے بڑا خوف ان کے پائے ثبات میں لغزش پیدا نہ کرسکا۔ سر سکندر حیات جب وزیر اعظم پنجاب تھے تو اسی کے ایماء پر آپ پر برطانوی سامراج کے خلاف مسلح بغاوت کے الزام میں بیک وقت دس مقدمات بنائے گئے جس کے نتیجے میں کم از کم سزا حبس دوام بہ عبور دریائے شور تھی اور اصل سزا، سزائے موت تھی لیکن کیا مجال ہے کہ ایک لمحے کو بھی بزدلی کو انہوں نے اپنے قریب بھٹکنے دیا ہو، خدا نے خود ان کی مدد فرمائی اور صفائی کے سامان سرکاری عملے کے اندر سے مہیا ہوگئے۔ سرکاری گواہ پولیس رپورٹر لدھا رام اپنے بیان سے منحرف ہوگیا اور شاہ جی کو بغاوت کے مقدمے میں پھنسا کر سزائے موت دلوانے کی سرسکندر حیات کی سازش کو طشت از بام کردیا اس نے اس سازش کی تمام تر ذمہ داری سکندر حیات پر ڈال دی۔

سید عطاء اللہ شاہ بخاری نے صرف جنگ آزدی ہی نہیں لڑی بلکہ بنیادی طور پر تبلیغ اسلام کا فریضہ سرانجام دیا ہے۔ وہ صرف مجاہد تحریک آزادی ہی نہ تھے بلکہ ایک بے مثال مبلغ اسلام بھی تھے آج بھی بہاولپور، رحیم یار خان، ڈیرہ غازیخان، مظفر گڑھ اور ڈیرہ اسمٰعیل خان کے دیہات اس بات کے گواہ ہیں کہ یہاں کے پس ماندہ اور دور افتادہ علاقے کے رہنے والوں کو دینی شعور سید عطاء اللہ شاہ بخاری نے دیا ہے ورنہ ان پسماندہ علاقوں کے باسیوں کو قطعاً کوئی مذہبی شعور نہ تھا وہ دینی معلومات سے بے بہرہ تھے اور صحیح معنوں میں سادہ لوح تھے۔ یہ لوگ فقط نام کے مسلماں تھے لیکن سید عطاء اللہ شاہ بخاری کی قوتِ کار کا آپ اندازہ لگائیں کہ اپنی مصروف اور ہنگامہ خیز زندگی میں سے بھی اکثر وقت بچا کر ان دیہاتوں میں تشریف لے جاتے بمبئی اور دہلی کی بڑی بڑی کانفرنسوں کو چھوڑ کر ان پسماندہ علاقوں میں پیدل سفر کرتے بستر سر پر اٹھا کر ایسے علاقوں میں بھی جاتے جہاں پر جانا آج بھی جوئے شیر لانے کے مترادف ہے۔ کہا کرتے تھے کہ جسے ہندوؤں کی نمائندگی کا طعنہ دیتے ہو، اس فقیر نے تو راہ چلتے کئی غیر مسلموں کو کلمہ پڑھادیا ہے اور حقیقت یہ ہے کہ شاہ جی نے ہندوؤں کے مجمع میں خدا کی وحدانیت اس دھڑلے سے پیش کی کہ ہندو اکثر چیخ اٹھتے اور کہتے کہ یہ شخص ہمارے درمیان بیٹھ کر ہمارے بتوں کو مسمار کرتا ہے۔ اس کی جگہ کوئی دوسرا ہوتا تو ہمارے ہاتھوں سے بچ کر نہ جاسکتا۔ یہ ظالم تو ہماری سوچنے سمجھنے کی قوت کو ماؤف کرکے رکھ دیتا ہے۔ حضرت قاری محمد طیب رحمہ اللہ (سابق مہتمم دار العلوم دیوبند) نے شاہ جی کی وفات پر تعزیتی پیغام میں شاہ جی کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے کہا تھا کہ شاہ جی کے ارشادات سے ہندو مسلم دونوں مستفید ہوتے تھے۔ قاری صاحب ایک مضمون میں یوں تحریر فرماتے ہیں

> "جہاں تک ان کے بیان سے مجھے استفادہ کا موقع ملا ہے محسوس ہوتا ہے کہ قرآن ان کے سامنے کھلا ہوا ہے اور وہ اس کے بلیغ جملوں کی مجسم شرح و تفسیر بنے ہوئے ہیں۔ سحر بیانی سے مجمع کو باندھ کر رکھ دینا گویا ان کا اختیاری فعل ہوتا تھا کہ جب چاہیں اسے کھول دیں اور جب تک چاہیں باندھے رکھیں اور پھر یہ ان کے بیان کی بلاغت اور سلاست کی خوبی تھی کہ مسلم و غیر مسلم یکساں طور پر ان سے مستفید ہوتے تھے اور دست و پا بستہ ہوجاتے تھے مجلس

احرار اسلام کے ذریعے انہوں نے ملک و قوم کی جو عظیم خدمات ایک طویل عرصہ تک سرانجام دی ہیں برصغیر پاک و ہند کا گوشہ گوشہ اس پر گواہ ہے اور تحریک آزادیٔ پاک و ہند میں ایک بلند مقام اور عظیم خصوصیت کا حامل ہے۔ اس دور میں آراء الگ الگ تھیں اور ایک رائے کا دوسرا پابند نہ تھا لیکن ان کے دینی جوہروں کے معترف ان کے مخالف بھی تھے۔ اور سب ان سے متاثر ہوتے تھے۔ کبھی سفر میں اتفاقی طور پر ساتھ ہوتا تو معلوم ہوتا تھا کہ وہ مقناطیس کی حیثیت سے ہیں۔ اور لوگ بمنزلہ لوہا اور پیتل کے ہیں جو کھچ کھچ کر ان سے چسپاں ہو رہے ہیں"

غیر مسلموں میں بیٹھ کر تبلیغ اسلام کا فریضہ جس خوبصورتی کے ساتھ آپ نے ادا کیا ہے۔ اس کی ایک ہلکی سی تصویر حضرت مولانا محمد یوسف بنوری رحمہ اللہ کے ایک مضمون کے اس اقتباس سے واضح ہوتی ہے جو آپ نے حضرت شاہ جی کی وفات پر تحریر فرمایا تھا

"قدرت نے فوق العادت زبان کی شیرینی، بیان کی روانی اور فوق العادت تعبیر کی قوت آپ کو عطا فرمائی تھی۔ ایک دفعہ "نوساری" ضلع سورت میں ہندوؤں اور سکھوں کی ایک دعوت پر تقریر کرنا منظور فرمائی ایک تھیٹر ہال کا انتخاب ہوا، جامع "ڈابھیل" کے کل اساتذہ اور طلباء بھی شریک تھے۔ حضرت مولانا شبیر احمد عثمانی بھی تشریف فرما تھے اس تقریر کی تاثیر و حلاوت، فوق العادت خطابت کا کمال آج بھی آنکھوں کے سامنے ہے۔ اس کی شیرینی کام و دہن میں ہے۔ ہندوؤں اور سکھوں سے اللہ اکبر کے بلند شگاف نعرے بلند کرائے تھے۔ اسلام کی حقانیت، اللہ تعالیٰ کی عظمت اور توحید، گوشت خوری کے منافع اور بت پرستی کی قباحت پر حیرت انگیز بیان تھا۔ حضرت مولانا شبیر احمد عثمانی زار و قطار رو رہے تھے۔ میں نے کبھی انہیں اتنا روتے نہیں دیکھا۔ تقریر کے بعد میں نے سنا حضرت شبیر احمد عثمانی فرماتے تھے میں نے سید عطاء اللہ شاہ کی بیسیوں تقریریں سنی ہیں لیکن اتنی مؤثر تقریر آجتک نہیں سنی اور فرمایا آج عطاء اللہ نے حق تبلیغ ادا کر دیا ہے۔ اپنے وقت کے سب سے بڑے متکلم عالم اور خطیب کا حضرت شاہ صاحب کو خراج تحسین کتنا قیمتی ہے"

لیکن ہم کتنے ظالم ہیں کہ تاریخ اسلام کے اس عظیم الشان مبلغ اسلام کو بھی الزام تراشیوں کا نشانہ بنانے سے باز نہ آئے۔ جس کی زندگی ایک مثالی زندگی اور جس کا مشن خدائی مشن تھا۔ جس کے ایمان کو بطور مثال پیش کیا جاسکتا ہے۔ جسکے خلوص و محبت کے اپنے چھوڑ بیگانے بھی معترف ہیں جس نے لاکھوں نہیں کروڑوں دلوں میں آزادی کی تڑپ پیدا کی۔ جو ہر خلاف اسلام قوت کے سامنے ڈٹ گیا۔ جس نے قادیانیت کا اس طور محاسبہ کیا کہ مرزا غلام احمد کی روح بھی چیخ اٹھی جس نے غریبوں کی مدد کی اور امراء کا مقابلہ۔ جو ہر انسان کا دوست اور غم گسار تھا۔ جس نے اپنے رضاکاروں کے ساتھ حسن سلوک شفقت، پیار اور محبت کی انتہا کر دی، جو عام لوگوں میں رہ کر سکون و

راحت حاصل کرتا، جو امراء سے دور بھاگتا کہ بقول اس کے وہ دل کے غریب ہوتے ہیں۔ جس نے تمام عمر ایک لگن ایک تڑپ میں بسر کردی جو زندہ رہا تو اس طرح کہ قرون اولیٰ کے مسلمانوں کی یاد تازہ کردی، اور جو مرا تو اس طرح کہ لاکھوں افراد اس کے جنازہ پر اشک بہار ہے تھے۔ اور ان لاکھوں میں ہر ایک اپنی جگہ خیال کرتا تھا کہ شاہ جی اس کے سب سے زیادہ قریب ہیں اور یہی ان کی عظمت کی دلیل ہے کہ انہوں نے خلوص کے ساتھ انسانوں سے محبت کی اور اپنے اخلاق و کردار سے انہیں متأثر کیا۔ الغرض سید عطاء اللہ شاہ بخاری کروڑوں انسانوں کے دلوں میں اپنی عظمت کے نقش چھوڑ گئے ہیں جسے وقت کا بہتا ہوا دھارا بصد کوشش بھی نہ مٹاسکے گا۔ آج بھی ہزاروں انسانوں کو دیکھتا ہوں کہ جب سید عطاء اللہ شاہ بخاری کا ذکر ہوتا ہے تو ان کے چہروں پر رونق کی عجیب سی لہر ابھر آتی ہے۔ غم محبت میں ان کی آنکھیں اشک بار ہوجاتی ہیں اور احترام سے ان کے دل و دماغ سرنگوں ہوجاتے ہیں آخر ایسا کیوں ہے؟ لوگ اس کو اس انداز سے کیوں یاد کرتے ہیں؟ فقط اس لئے کہ وہ مخلص تھے اس لئے کہ وہ کسی کے دشمن نہ تھے اس لئے کہ انہوں نے بے مثال زندگی بسر کی۔ ایسی زندگی جس میں ریاکاری دھوکا بازی، دنیاداری، بزدلی، سازش، جوڑ توڑ نام کی کوئی چیز نہ تھی۔ بلکہ اس کے برعکس جس کی زندگی کے اوراق پر شجاعت، بیباکی، اخلاص، مروت، عزم، استقلال، ایثار، قربانی، شفقت، ہمدردی، تحمل، صبر، بردباری، مصائب و مشکلات کو برداشت کرنے کے مثالی کردار کی لازوال داستان بکھری پڑی ہے۔ جس کو ہم آج بھی بطور نمونہ نئی نسل کے سامنے پیش کرسکتے ہیں۔ کہ کس طرح ایک فقیر نے انگریزی جبر و استبداد سے نبرد آزمائی کرکے اپنے لئے لوگوں کے دلوں میں گھر کرلیا تھا۔ کس طرح سے وہ امرتسر کی گلیوں سے اٹھا اور پورے ہندوستان پر چھا گیا۔ کوئی گوشہ، کوئی قریہ، کوئی دیہات، کوئی شہر آج سرزمین پاک و ہند پر ایسا نہیں ہے۔ جہاں سید عطاء اللہ شاہ بخاری کے زمزمے نہ گونجتے رہے ہوں، کوئی فرد ایسا نہیں ہے جس نے انہیں قریب سے دیکھا ہو، اور وہ ان کے خلوص کا معترف اور ان کی محبت کا اسیر نہ ہوگیا ہو، یہ مختصر مضمون ان کی عظیم شخصیت کی ہر خوبی کو اپنے دامن میں سمیٹنے سے قاصر ہے، ان کی زندگی کے کس کس پہلو پر قلم اٹھایا جائے، ان کے خطابتی معرکے تحریر کریں، یا ان کے جواں عزم کی داستانیں سپرد قلم کریں، ان کے تبلیغ اسلام کے واقعات سنائیں، یا ان کی حاضر جوابی اور بذلہ سنجی پر قلم اٹھائیں ان کی مہر و محبت کے ترانے سنائیں یا ان کی محبت کی کہانیاں، ان کی خلوت و جلوت کا ذکر کریں یا ان کی رزم و بزم کی روئیداد نئی نسل کو منتقل کریں، ان کی زندگی کے کون کون سے پہلو اور کون کون سے گوشے کو قارئین حضرات کے سامنے پیش کیا جائے کہ وہ ایک جامع الصفات انسان تھے، جن کی کوئی خوبی بھی نظر انداز کردینے کے قابل نہیں ہے۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ نئی نسل میں ان کے مشن کو عام کیا جائے اور اس دور الحاد میں جس قدر آپ کے نظریات، خیالات، عقائد، اور اعمال کی نشر و اشاعت کی ضرورت ہے شاید پہلے کبھی نہ ہو، ماہنامہ نقیب ختم نبوت ملتان لائق صد مبارک باد ہے کہ اس نے حضرت شاہ جی کے صد سالہ تقریب کے موقع پر ان کی شخصیت پر ایک خصوصی نمبر شائع کرنے کا اہتمام کیا ہے ان کا یہ اقدام اس اہم ضرورت کو کافی حد تک پورا کرنے میں کامیاب ثابت ہوگا۔

اس عظیم انسان کو خراج عقیدت پیش کرنے کا ایک ہی طریقہ ہے کہ انکے نقش قدم پر چلنے کی قسم کھائی

جائے راہِ حق میں مصائب و مشکلات کو برداشت کرنے کا حوصلہ پیدا کیا جائے مایوسی و بددلی کو قریب نہ آنے دیا جائے۔ سادہ اور غریبانہ زندگی بسر کر کے عزائم کی آبیاری کی جائے اور جب تک زندگی باقی رہے انکی آواز میں اپنی آواز ملا کر اسے بلند رکھا جائے۔ کہ وہ آواز "خدا کی دھرتی پر خدا کی حکمرانی کی آواز" ہے وہ آواز دنیائے اسلام کے خلاف طاقتوں کی سرکوبی کی آواز ہے، وہ آواز اتحاد بین المسلمین کی آواز ہے۔ وہ آواز یہود و نصاریٰ کے اصلی خدوخال سے مسلمانوں کو آگاہ کرنے کی آواز ہے۔ وہ آواز امراء و رؤساء کے استحصال سے غرباء کو چھڑانے کی آواز ہے۔

یاد رکھو آج بھی شاہ جی ہمارے درمیان موجود ہیں وہ زندہ ہیں اور ہمیشہ زندہ رہیں گے اور ہمیں تلقین کر رہے ہیں کہ زندہ رہو تو فقط اسلام کی سربلندی کی خاطر اور مرمٹو تو بھی صرف اور صرف اسلام کی خاطر، اس مقصد میں کامیابی حاصل کرنے کے لئے اپنی صفوں میں اتحاد پیدا کرو، اپنے سیاسی اور مذہبی اختلاف کو مٹا کر اپنے اندر محبت، پیار کے دیپ روشن کرو، ایسی فضا پیدا کرو کہ جس میں تم سب پاکستانی دشمن اسلام قوتوں کے لئے ایک ناقابل تسخیر قوت بن سکو، حضرت امیر شریعت کی زندگی کا حاصل بھی یہی تھا۔ انہوں نے کمال خوبی سے ہر مدرسہ فکر کے لوگوں کو بڑے خلوص کے ساتھ یکجا کر کے ان سے ملت اسلام کے تحفظ، اسکی آزادی اور اس کے وقار کے لئے کام لیا تھا۔ وہ اپنوں کو گلے لگاتے تھے ان میں عزت نفس پیدا کر کے انہیں اتحاد و اتفاق کے ذریعے ایک قوت بنا دیتے تھے، اور اس قوت کو دشمنان اسلام کے خلاف اتنی شدت کے ساتھ استعمال کرتے کہ دشمن کی صفوں میں تہلکہ مچ جاتا تھا۔ آج اسی جذبے کو اجاگر کرنے کی اشد ضرورت ہے جس کے لئے حکومت پاکستان کو چاہئیے کہ وہ امیر شریعت کو قومی ہیرو تسلیم کرتے ہوئے انکے افکار قربانی و ایثار اور اسکی خدمات سے قوم کو روشناس کرائے تاکہ قوم پھر ایک مرتبہ علامہ اقبال کے اس شعر کی تصویر بن جائے

ہو حلقہ یاراں تو بریشم کی طرح نرم
رزم حق و باطل ہو تو فولاد ہے مومن

جیل خانے کی چار دیواری میں آپ کے قہقہے زیادہ وسیع ہو جاتے ہیں
عبدالمجید سالک

شاہ جی تقریر نہیں کرتے غزل کہتے ہیں' ہر شعر علیحدہ اور مکمل ہوتا ہے۔
چراغ حسن حسرت

وہ واقعی ان عظیم اشخاص میں سے تھے جن کی ہستی یک ترکیب و تعمیر میں قدرت کے غیر معمولی تعین نے کار فرمائی کی
ڈاکٹر سید عبداللہ

اسلام اور آزادی پر دل و جان سے قربان ہو جانا ان کی زندگی کا منتہا تھا
علامہ علاء الدین صدیقی۔

محمدؐ کی سیرت کا پیغامبر

(رئیس الاحرار) حضرت سید عطاء اللہ شاہ بخاری کے عارضی سکوت پر)

اخوت کے پرچم اڑاتا ہوا
محبت کے خطبے سناتا ہوا
گرجتا ہوا دندناتا ہوا
مگر دمبدم مسکراتا ہوا
صداقت کے چہرے سے بیساختہ
توہم کے پردے اٹھاتا ہوا
خدا کی محبت کے عرفان سے
چمکتا ہوا، جگمگاتا ہوا
مخالف ہواؤں کی یلغار پر
عزائم کے خنجر چلاتا ہوا
ضمیر منور کی تلوار سے
رگیں شرک کی کاٹ جاتا ہوا
محمد کی سیرت کا پیغام بر
خدا کے سندیسے سناتا ہوا
جوانوں کا عاشق سپاہی کی ہتھ
حمیت کے جوہر دکھاتا ہوا
بڑی منزلیں کر کے طے حلم کی
بڑی دیر چلتا چلاتا ہوا
نہایت اہم سوچ میں کھو گیا
گھڑی دو گھڑی کے لئے سو گیا
اگرچہ وہ مصروف ہے خواب میں
حسیں ولولے اس کے بیدار ہیں
صبا اس کے اخلاق کا گیت ہے
ریاض و چمن اس کے اطوار ہیں
ہیں لوحِ ابد پر جو لکھے ہوئے
وہ اس کی ریاضت کے اشعار ہیں

بقاء اس کی مرغوب پوشاک ہے
جدا اسکی تحقیق ادراک ہے

سید عبدالحمید عدمؔ

چند واقعاتی "جھلکیاں"

(رفیقِ امیرِ شریعت) مرزا محمد حسن چغتائی رحمہ اللہ
سابق امیر مجلس احرار اسلام پاکستان

میں نے ۱۹۳۴ء میں میٹرک کا امتحان پاس کیا۔ اس وقت میری عمر سولہ سال کے قریب تھی۔ کہروڑ پکا میں انہیں دنوں ایک ایسا واقعہ پیش آیا جس نے شہر کے دیندار طبقے کے دلوں کو ہلا دیا۔ جبکہ قریشی حضرات نے ریاست بہاول پور کے ایک حق پسند عالم دین سے اپنی جامع مسجد میں وعظ کرایا۔ جن کے ارشادات تبرائی پارٹی پر کچھ گراں گزرے۔ واپسی پر لودھراں اسٹیشن پر ایک مقامی ذاکر نے موقع پا کر واعظ موصوف کی توہین کی۔ خبر کہروڑ پکا میں پہنچی تو جامع مسجد میں مسلمانوں کا ایک اجتماع ہوا جس میں بندہ بھی موجود تھا۔ وہاں ایک جماعت کی داغ بیل ڈالی گئی۔ جس کا نام "خدام الدین" رکھا گیا۔ مجھے اس کا سیکرٹری منتخب کیا گیا۔ تھوڑے عرصہ بعد جماعت کا نام بدل کر "شعبۂ تبلیغ مجلس احرار اسلام" رکھا اور مرکز سے الحاق کر لیا گیا۔ اس طرح حضرت امیر شریعت سے تعلق قائم ہو گیا۔ شاہ جی سے تعلق استوار ہو جانے کے بعد سرکاری ملازمت کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا۔ کچھ عرصہ بعد بسلسلۂ روزگار سابق ریاست بہاولپور میں رہائش اختیار کر لی۔ لیکن ریاست بہاول پور اور ضلع ملتان کی تبلیغی اور حریت پرور جماعتوں اور تحریکوں میں برابر نمایاں حصہ لیتا رہا۔ شاہ جی سے وابستگی بڑھتی چلی گئی۔ اور بیٹا کہہ کر پکارنے لگے۔

۱۹۴۹ء کے اوائل میں بیعت بھی کر لی اور آخری وقت تک آمد و رفت، خط و کتابت اور جماعتی تعلق قائم رہا۔ میں نے اس مضمون کے ذریعہ اپنے مشاہدات کی روشنی میں شاہ جی کے کردار کی چند جھلکیاں دکھانے کی کوشش کی ہے جو اس سے قبل پریس نہیں پہنچیں۔

ایفاء عہد

لاہور میں احرار کانفرنس کے اجلاس ہو رہے تھے۔ دفتر میں حسب معمول شاہ جی کے ارد گرد پروانوں کا اجتماع تھا۔ اور مجلس کشت زعفران بنی ہوئی تھی۔ دوسری طرف حافظ علی بہادر خان، شیخ حسام الدین صاحب اور دیگر زعماء غیر رسمی گفتگو میں مصروف تھے۔ شیخ صاحب نے شاہ جی کو اپنی طرف متوجہ فرما کر کہا کہ حافظ صاحب بمبئی کے لئے وقت چاہتے ہیں۔ شاہ جی نے فرمایا کہ مجھے کیا عذر ہو سکتا ہے۔ چنانچہ شیخ صاحب نے حافظ صاحب کو مخاطب کر کے کہا کہ آپ ۱۰ محرم کے لئے کانفرنس کا پروگرام بنا لیجئے۔ اس پر شاہ جی چونکے اور فرمایا کہ اس تاریخ کو میں بمبئی نہ جا سکوں گا۔ شیخ صاحب نے ملک عبدالغفور انوری (مرحوم) کی طرف معنی خیز نگاہوں سے دیکھا۔ ملک صاحب بات پا گئے۔ اور کہا کہ دفتر میں تو اس تاریخ کو شاہ جی کا کوئی پروگرام مرتب نہیں ہوا۔ اس پر شاہ جی نے اپنا اٹیچی منگوا کر ڈائری نکالی۔ اور شیخ صاحب کی طرف بڑھا دی۔

شیخ صاحب نے ورق گردانی کرتے ہوئے با آواز بلند پڑھا "سمہ سٹہ جنکشن، عثمان پور، سید محمد علی شاہ" اور پھر اپنے مخصوص انداز میں ایک لمبی "ہوں" نکالتے ہوئے یوں گویا ہوئے کیا ہوا کوئی معمولی بستی ہو گی نہ سہی اطلاع دے دی جائے گی۔ لیکن شاہ جی نے فرمایا۔

"میں سید زادہ ہوں اور اپنے عہد سے نہیں پھر سکتا۔ اگر میں بقید حیات ہوا اور باہر رہا تو ان شاء اللہ العزیز اپنا وعدہ پورا کروں گا" اس پر شیخ صاحب نے اپنا زور تکلم صرف کر ڈالا۔ بمبئی کی اہمیت اور جماعتی مفاد کے موضوعات زیر بحث لائے گئے۔ لیکن شاہ جی اپنے مقام پر قائم رہے۔ اور بالآخر طے پایا کہ بمبئی کے لئے کوئی دوسری موزوں تاریخ مقرر کی جائے۔

ملک پیر بخش صاحب گھلو (مرحوم) (علاقہ بہاولپور کی بستی بہاولپور گھلواں کے ایک زمیندار) شاہ جی کے مرید تھے۔ ایک بار ۱۲ ربیع الاول کو جلسہ کا پروگرام بنایا۔ شاہ جی حسب وعدہ تشریف لے گئے۔ موقع پا کر وہاں کی بزرگ اور قابل احترام شخصیت حافظ کریم بخش مرحوم کی وساطت سے اس تاریخ کو آئندہ کے لئے مستقل ریزرو کرا لیا گیا۔ چنانچہ جب بھی اس موقع پر شاہ جی جیل سے باہر اور تندرست ہوئے۔ دہلی، آگرہ، لاہور، جالندھر اور بمبئی جیسے مقامات کی دعوتوں کو ٹھکرا کر اور جماعتی پروگرام کو پس پشت ڈال کر ریلوے اسٹیشن سے پندرہ بیس میل کا کٹھن سفر کبھی گھوڑے اور کبھی اونٹ پر طے کر کے وہاں پہنچے اور سالہا سال تک یہی سلسلہ جاری رہا۔

سمہ سٹہ کی ایک نواحی بستی کے دکاندار حاجی فیض بخش کو ان کے اصرار اور منت سماجت پر وقت دے دیا۔ مابعد احرار ورکنگ کمیٹی کا اجلاس ان ہی تواریخ میں مقرر ہو گیا۔ اب شاہ جی کو امرتسر سے سمہ سٹہ سے چار میل کے فاصلہ پر دریا کے کنارے تقریر کے لئے پہنچنا تھا۔ اور پھر لاہور واپس جا کر اجلاس میں شریک ہو تھا۔ ایک طرف ایفائے عہد اور دوسری طرف احساس فرض۔ رفقاء کرام نے سمہ سٹہ کے پروگرام کی منسوخی کا مشورہ دیا۔ لیکن اس مرد مومن نے دو جھگوں کی اس بستی میں پہنچ کر اپنے وعدہ کو نبھایا اور اجلاس کے اختتام سے قبل لاہور پہنچ کر دو روزہ بحث میں الجھے ہوئے مسائل کو بھی چٹکی بجاتے میں حل کر دیا۔

تدبر اور وفاداری

کہروڑ پکا سے سات میل کے فاصلہ پر بیلہ واہگہ کے مضافاتی دیہات میں احرار رضا کاروں کی بہت بڑی تعداد موجود تھی۔ ان کے اصرار پر دو روزہ کانفرنس کی منظوری مرکز سے حاصل کی گئی۔ علاقہ کے زمینداران اگرچہ رضا کاروں کی بڑھتی ہوئی قوت سے خائف تھے۔ اور انہوں نے کبھی تعاون نہ کیا تھا۔ لیکن اب کانفرنس کے انعقاد اور پھر شاہ جی کی تشریف آوری کی خبر سے وہ تعاون کرنے پر مجبور ہو گئے۔ اور پیش کش کی کہ مقررین حضرات کی رہائش اور مہمانوں کے خورد و نوش کا انتظام ان کے ذمہ ہو گا۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ اس موقع پر شاہ جی کے علاوہ مولانا قاضی احسان احمد، مولانا عبدالرحمٰن میانوی، اور دیگر مقررین شریک کانفرنس تھے۔ پہلے اجلاس کی ابتدائی کارروائی کے بعد پروگرام کے مطابق قاضی صاحب کی تقریر کا آغاز ہوا۔ اجتماع حاضری

کے لحاظ سے عدیم النظیر تھا اور علاقہ کے باوردی مسلح رضا کار قریباً ایک صد کی تعداد میں ڈیوٹی پر موجود تھے۔
قاضی صاحب نے مجلس احرار کے کارناموں کی مختصر تاریخ بیان کرنے کے بعد اصلاح الرسوم کے موضوع پر اپنے خیالات کا اظہار شروع کیا۔ جب وہ شادی بیاہ کے موقع پر کنجریوں کے مجرا وغیرہ پر پہنچے اور علاقہ کے زمینداران کو اپنے زور دار اور مخصوص انداز میں ایسی قبیح رسومات پر شرم دلائی تو وہ اسے برداشت نہ کر سکے۔ ان میں سے ایک دو نے کھڑے ہو کر اعتراض کیا تو قاضی جی کا پارہ اور تیز ہو گیا بالآخر علاقہ کے ایک مقتدر زمیندار نے جلسہ گاہ (جلسہ عید گاہ میں ہو رہا تھا جو چار دیواری سے محیط تھی) کی دیوار پر کھڑے ہو کر اعلان کیا کہ "ہم زمینداران علاقہ کی جس قدر رعیت یہاں موجود ہے وہ جلسہ گاہ سے باہر نکل آئے۔ اس پر قاضی نے جواباً اپیل کی۔ خدا کی مخلوق اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی امت میں سے کوئی بھی باہر نہ جانے پائے" زمینداران اپنا سا منہ لے کر رہ گئے اور کھسیانے ہو کر باہر چلے گئے۔ باہر جا کر جلسہ کو ناکام بنانے کی تدابیر پر غور کرنے لگے۔ چونکہ فساد کا اندیشہ تھا۔ اس لئے میں ایک رضا کار کو ہمراہ لے کر فوراً قیام گاہ پر پہنچا اور شاہ جی سے واقعات بیان کئے۔ شاہ جی فوراً اٹھے۔ وضو فرمایا۔ اور جلسہ گاہ کی طرف چل کھڑے ہوئے۔ باہر کھڑے زمینداران نے جب شاہ جی کو آتے دیکھا تو راستے ہی میں قاضی جی کی شکایت کی۔ شاہ جی نے ان کو اطمینان دلایا اور جلسہ گاہ میں ہمراہ لے آئے۔ جلسہ گاہ نعرہ ہائے تکبیر سے گونج اٹھا۔ قاضی صاحب کی تقریر کچھ دیر تک جاری رہی۔ شاہ جی تقریر کے لئے اٹھے۔ اور خطبہ مسنونہ کے بعد یوں مخاطب ہوئے۔
"آپ دیہات کے رہنے والے ہیں آپ کے ہاں گلی کوچوں کی صفائی کا انتظام نہیں لیکن ضروریات کے پیش نظر شہر میں آتے جاتے ہوں گے وہاں آپ نے دیکھا ہو گا کہ کمیٹی کے خاکروب سڑکوں اور کوچوں میں جھاڑو لئے صفائی کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ نالیاں بھی صاف کرتے ہیں۔ اگر کسی شہر میں دو تین روز عملہ صفائی اپنا کام نہ کرے۔ تو شہر میں عفونت پھیل جائے۔ گندگی کے انبار لگ جائیں۔ راستے مسدود ہو جائیں اور زندگی دوبھر ہو جائے۔ اس طرح سے انسانوں کی روحانی گندگی کی صفائی کے لئے اللہ تعالیٰ نے علماء کو ڈیوٹی پر لگایا ہے۔ جو وعظ اور تبلیغ کے ذریعہ روحانی گندگی کو صاف کرتے رہتے ہیں۔ اگر کچھ عرصہ یہ سلسلہ رک جائے تو دنیا فسق و فجور اور فساد سے بھر جائے۔ شہر کی سڑکوں پر جب خاکروب صفائی کر رہے ہوں تو آپ نے مشاہدہ کیا ہو گا کہ کہیں تو یہ عالم ہو گا کہ خود صفائی کرنے والے اور راہگذر لوگوں کے چہرے اور پوشاکیں گرد آلود ہوں گی اور کہیں نالی کے چھینٹوں کے نشانات ہوں گے۔ لیکن کہیں ایسا بھی ہو گا کہ صفائی بھی اپنی جگہ پر درست ہو گی لیکن نہ تو کسی راہ گذر کے چہرے پر گرد کے آثار ہوں گے اور نہ خاکروب گرد آلود ہو گا۔ اس میں صرف تجربہ کا فرق ہے۔ پہلا خاکروب ناتجربہ کار ہو گا اور دوسرا اپنی عمر کا بڑا حصہ اس کام میں صرف کر کے تجربہ حاصل کر چکا ہو گا۔ یہی حال ہمارا ہے۔ مجھے افسوس ہے کہ میرے ساتھی کی ناتجربہ کاری سے سامعین میں سے کچھ صاحبان پہلے خاکروب والی کارروائی کی زد میں آ گئے۔ اب میں آپ کا پرانا خدمت گذار آپ کے سامنے آیا ہوں میں ہلکا چھڑکاؤ کر کے گرد جماؤں گا اور پھر ایسے طریق پر صفائی کروں گا۔ کہ ان شاء اللہ

تعالیٰ کوئی گرد نہ اڑے گی اور گندگی نام کو نہ رہے گی"۔

فضا نعروں سے معمور ہو گئی شاہ جی کی تقریر مسلسل تین گھنٹے جاری رہی۔ اعتقادات، رسومات، سیاسیات، حقوق العباد غرضیکہ ہر چیز پر اظہار خیال فرمایا۔ تقریر کے اختتام پر اجلاس کی کارروائی ختم ہوئی۔ اور شاہ جی دیگر ساتھیوں کے ہمراہ رہائش گاہ کی طرف جانے لگے۔ تو زمینداران میں سے ایک صاحب نے آگے بڑھ کر کہا کہ قاضی صاحب کو ہمارے ڈیرے میں نہ لے جائیں۔ شاہ جی نے وہیں رک کر رخ پھیر لیا اور علاقہ کے برسر آوردہ کارکن مولوی اللہ داد سے مخاطب ہو کر فرمایا کہ ہم تمہارے گھر چلیں گے۔ چنانچہ رضا کاروں کو ہدایت دی گئی کہ وہ مہمانوں کا سامان لے کر نصف میل کے فاصلہ پر مولوی صاحب کی بستی میں پہنچا دیں۔ اس پر زمینداران نے عذر خواہی کی۔ قاضی صاحب کو منانے کی کوشش کی لیکن آپ نہ مانے وہاں نہ روٹی کا انتظام نہ چارپائیوں کا۔ بستر کھلی چٹائیوں پر بچھا دیئے گئے اور شاہ جی نے علاقے کے رضا کاروں کو حکم دیا کہ اپنے گھروں میں جا کر اپنی اپنی روٹی لے آئیں۔ چنانچہ ایک گھنٹہ کے اندر اندر علاقہ کے پچاس ساٹھ رضا کار اپنے کھانے لے کر آ گئے جنہیں ایک دستر خوان پر رکھ دیا گیا۔ اس طرح نہ کوئی رضا کار بھوکا رہا اور نہ کوئی مہمان۔ روکھی پھیکی غذاؤں کے دستر خوان پر حضرت شاہ جی کی مرغن گفتگو نے وہ سماں پیدا کیا کہ کان آج تک اس کی لذت سے آشنا ہیں۔ کانفرنس کے اجلاس دوسرے روز بھی ہوئے اور عدیم النظیر کامیابی کے ساتھ ختم ہوئے۔

علماء و صلحاء کا احترام

الہ آباد (علاقہ بہاولپور) میں جلسہ ہو رہا ہے شاہ جی اپنی قیام گاہ میں معتقدین کے جھرمٹ میں بیٹھے ہیں۔ مجلس گرم ہے کہ اتنے میں جلسہ گاہ سے قرآن مجید پڑھنے کی آواز سنائی دی۔ مولوی عبدالحق صاحب احمد پوری تقریر فرما رہے تھے۔ شاہ جی آواز پہچان گئے اور حاضرین کو کہا "میرے پاس بیٹھے کیا لو گے۔ جاؤ ریاست کا محدث بول رہا ہے۔ ان سے کچھ حاصل کر لو"۔

غالباً ۴۲ء کا ذکر ہے۔ پہلی راجن میں جلسہ ہو رہا تھا۔ رہائش گاہ کے اندرونی حصہ میں تشریف فرما تھے۔ کسی نے خبر دی کہ حضرت حافظ کریم بخش صاحب مرحوم بہاولپور گھلواں والے تشریف لا رہے ہیں۔ آپ پان بنا رہے تھے۔ پاندان کھلا چھوڑ دیا اور اٹھ کھڑے ہوئے مکان سے باہر آئے تو نہر کے کنارے حافظ صاحب (مرحوم) کا اونٹ بٹھایا جا رہا تھا جلدی سے وہیں پہنچ کر استقبال کیا۔ حافظ صاحب نے فرمایا کہ آپ نے اس قدر تکلیف کیوں کی۔ اس پر شاہ جی نے فرمایا "میری جدوجہد آپ جیسے بزرگوں کی دعاؤں کا ہی تو نتیجہ ہے۔ اگر آپ کا احترام نہ کروں تو اور کس کا"۔

بہاولپور میں غریب خانہ پر مقیم تھے۔ مولوی جمیل الدین صاحب انسپکٹر مدارس عربیہ تشریف لائے اور بتایا کہ ان کے استاد محترم قاری عبدالرحمان صاحب پانی پتی مرحوم (والد مولوی عبدالرحیم معلم جامع

عباسیہ) انتقال آبادی کے بعد بہاول پور میں رہائش پذیر ہیں اور شاہ جی سے ملنے کے خواہش مند ہیں۔ لیکن صاحب فراش ہونے کے باعث قیام گاہ تک نہیں آسکتے۔ شاہ جی کے پاس وقت بہت تھوڑا تھا تاہم اسی وقت تیار ہوگئے اور کوچہ گل حسن میں قاری صاحب مرحوم کی فرودگاہ پر تشریف لے گئے۔ بندہ ہمراہ تھا۔ حضرت قاری صاحب مرحوم بہت کمزور تھے شاہ جی کو دیکھ کر ان کا چہرہ خوشی سے تمتما اٹھا۔ کافی دیر تک بھولی بسری باتیں یاد دلاتے رہے۔ اور شاہ جی پر دعاؤں کے گجرے نچھاور کرتے رہے۔ جب شاہ جی نے اجازت طلب کی تو قاری صاحب مرحوم نے پانچ روپے کا نوٹ سرہانے کے نیچے سے نکال کر شاہ جی کی خدمت میں ہدیتہً پیش کیا شاہ جی نے معذرت کی اور فرمایا کہ آپ جیسے بزرگوں کی خدمت تو مجھے کرنی چاہیئے۔ آپ کیوں تکلیف فرمائیں۔ لیکن قاری صاحب مرحوم مصر رہے۔ اور اپنی بات منوا کے چھوڑی۔ اس پر میں نے جھٹ اپنی جیب سے دس روپے کا نوٹ نکالا اور پورے ادب و احترام کے ساتھ حضرت قاری صاحب مرحوم کی خدمت میں پیش کر دیا۔ جو انہوں نے قبول فرمالیا۔ شاہ جی کے چہرے پر مسکراہٹ کے آثار ہویدا ہوگئے اور باہر آکر فرمایا "حسن تم نے میرا بوجھ ہلکا کر دیا"

مسلسل بیماری کے آغاز سے قبل جب آخری بار بہاولپور میں تشریف لائے برادر عزیز سیٹھ عبدالخالق صاحب کے پاس قیام تھا۔ مجھے فرمایا کہ مولانا محمد صادق صاحب کو ملنا ہے۔ میں نے عرض کیا میں حضرت مولانا کو یہاں لے آتا ہوں۔ اس پر ارشاد فرمایا کہ "تم مولانا کی قدر کیا جانو وہ بہت بلند پایہ عالم ہیں۔ میں کون ہوں کہ انہیں اپنے پاس بلاؤں میں خود تمہارے ساتھ چلوں گا" چنانچہ شاہ جی موری دروازے تشریف لے گئے۔ میں ہمرکاب تھا۔ وہاں پہنچ کر ایک لطیفہ بھی ہوگیا۔ مولانا موصوف اپنی مسجد میں تشریف فرماتھے۔ شاہ جی کو آتا دیکھ کر مسجد کے دروازے تک پہنچ گئے اور آتے ہی اپنا ہاتھ شاہ جی کے گھٹنوں کی طرف لے گئے۔ شاہ جی کے اظہار استعجاب پر ارشاد فرمایا کہ میں نے مولانا غلام محمد صاحب شیخ الجامعہ مرحوم کو علامہ انور شاہ کشمیری سے اسی طرح ملتے دیکھا ہے۔ اس پر شاہ جی نے تبسم فرمایا اور کہا "ان کے کیا کہنے وہ تو علم کے بادشاہ تھے"۔

موتیٰ سے ہمدردی

سندھ کی طرف سے لاہور کو تشریف لے جا رہے تھے سفر حسب معمول تھرڈ کلاس میں تھا۔ (فرمایا کرتے تھے کہ عوام الناس کو سفر میں تبلیغ ہو جایا کرتی ہے) احقر کو پروگرام کا علم تھا۔ اسٹیشن پر ڈیرہ نواب صاحب سے بہاول پور تک ہمراہ رہا۔ مبارک پور اور کلانچوالہ کے درمیان ایک قبرستان ریلوے لائن کے بالکل متصل واقع ہے مجلس گرم تھی۔ اور پروانے شمع کے گرد جمع تھے کہ قبرستان کو دیکھ کر شاہ جی نے بات چیت بند کر دی اور خاموشی سے کچھ پڑھنا شروع کر دیا۔ دو تین منٹ کی خاموشی کے بعد فرمایا کہ موتیٰ اس امر کے منتظر رہتے ہیں کہ کوئی راہگذر مسلمان ان کے لئے ایصال ثواب کرے جو ان کے ترقی درجات یا تخفیف عذاب کا

موجب ہو۔ اس لئے جب کبھی کسی مسلمان کی قبر دیکھو ٹھہر کر نہ سہی چلتے چلتے ہی قرآن مجید کی چند آیات اور یاد نہ ہو تو سورۂ فاتحہ یا اخلاص پڑھ کر ایصال ثواب اور دعاء مغفرت کر دیا کرو۔ اگر آج آپ لاپرواہی سے گزر جائیں گے تو آئندہ نسلیں آپ سے بھی یہی سلوک کریں گی۔

مسلک کی پابندی

کون نہیں جانتا کہ شاہ جی اہلسنت و الجماعت سے تعلق رکھتے تھے۔ اور تادم آخر اسی مذہب پر قائم رہے۔ آئمہ اربعہ میں جب بھی کسی کا نام آیا تو آپ نے کمال عقیدت اور احترام سے ذکر کیا۔ لیکن تقلید حضرت امام اعظم ابو حنیفہ کی کرتے تھے۔ اور بالخصوص اپنے امام کی تعریف و توصیف میں رطب اللسان رہا کرتے تھے۔ آپ نے جو مسلک اختیار کیا تھا اس پر کسی حد تک پابند تھے۔ چند ایک واقعات اس سلسلہ میں جو میرے مشاہدہ میں آئے ان کا ذکر خالی از منفعت نہ ہو گا۔

بہاولپور میں بندہ کے ہاں قیام تھا۔ نماز ظہر کے وقت محلہ کی مسجد میں تشریف لے گئے۔ جب جماعت کھڑی ہونے لگی اور امامت کے لئے ہر مقتدی کی نگاہ حضرت شاہ جی کی طرف اٹھی تو آپ نے دریافت کیا کہ امام نہیں ہے؟ جواباً امام صاحب نے شاہ جی کی خدمت میں نماز پڑھانے کی استدعا کی جس پر شاہ جی نے اپنے سفر کا حوالہ دیتے ہوئے معذرت کی۔ اس پر محلے کے ایک معتبر بزرگ نے کہا کہ دو رکعت بقیہ ہم خود پڑھ لیں گے شاہ جی نے مصلے پر تشریف لے جا کر امامت سے قبل مقتدیوں کو مخاطب کر کے دریافت فرمایا کہ اچھا بتایئے آپ دو رکعت میں کیا پڑھیں گے؟ اس پر جلدی سے ایک معمر اور تعلیم یافتہ بزرگ نے جواب دیا کہ الحمد پڑھ لیں گے اور حسب دستور نماز پوری کریں گے اس پر آپ نے پوچھا کہ کس امام کے مقلد ہیں۔ سبھی نے بیک زبان جواب دیا کہ ہم حنفی ہیں۔ اس پر آپ نے ارشاد فرمایا "اگر آپ حنفی المذہب ہیں تو خوب یاد رکھیں کہ اس مسئلہ میں حضرت امام اعظم کا مذہب یہ ہے کہ مسافر امام کے پیچھے مقیم مقتدیوں کی آخری دو رکعت بھی امام کی اقتداء میں سمجھی جائے گی اور انہیں ان دو رکعتوں میں بھی وہی کچھ پڑھنا ہو گا جو امام کے اقتداء میں پڑھا کرتے ہیں۔ اس لئے آپ لوگ بجائے سورۃ فاتحہ پڑھنے کے خاموشی کے ساتھ انداز قرأت کے وقت قیام کر کے رکوع میں چلے جائیں گے۔

بہاولپور میں علامہ رحمتہ اللہ ارشد صاحب کے مکان پر بیٹھے ہوئے تھے کہ نماز مغرب کا وقت ہو گیا۔ سات آٹھ آدمی نماز پڑھنے والے موجود تھے۔ اس لئے جماعت کے لئے استدعا کی گئی۔ سب لوگوں نے وضو کر لیا صف بندی ہو گئی اور شاہ جی مصلے کی طرف بڑھے تو میں نے اقامت کہنی شروع کر دی۔ آپ نے روک کر دریافت فرمایا کہ اذان کہہ دی؟ عرض کیا کہ نہیں۔ فرمایا کہ "ترک سنت کو عادت نہ بناؤ بلکہ بھولی بسری سنتوں کو زندہ کر کے اپنا گھر بہشت میں بنا لو۔ اذان کہنا سنت ہے۔ اسلئے پہلے اذان کہہ دو" چنانچہ پہلے اذان کہی گئی اور پھر جماعت کھڑی ہوئی۔

جامع مسجد شریف بہاول پور میں مجلس حزب اللہ کے زیر اہتمام مولانا حبیب الرحمن صاحب لدھیانوی مرحوم اور شاہ جی کی تقاریر کا پروگرام تھا۔ خطبہ جمعہ شاہ جی نے اپنے مخصوص زور دار انداز میں پڑھا۔ بعد نماز تقریر کے دوران فرمایا۔ "میں نے خطبہ کے دوران میں دیکھا کہ بعض لوگوں نے اذان کے بعد اور بین الخطبتین ہاتھ اٹھا کر دعا مانگی جہاں تک فقہ حنفی کا تعلق ہے اذان کے بعد اور خطبتین کے درمیان دعا کی اجازت نہیں ہے۔ خطبہ دو رکعت فرض کا قائم مقام ہے۔ اور اس کو خاموشی سے سننے کا حکم ہے (نماز کے وقت صفوں میں چھوٹے چھوٹے بچے موجود تھے) اچھی طرح سمجھ لو کہ نابالغوں کے لئے علیحدہ صف بندی کا تاکیدی حکم ہے۔ نابالغوں کا بالغوں کی صفوں میں نماز ادا کرنا تنقیص جماعت کا موجب ہے۔ علماء کرام موجود ہیں اگر میں کوئی غلط بات کہوں تو ٹوک دیں"۔

احتساب

حکیم غوث محمد جامپوری مجلس احرار کے قدیم کارکن اور چودھری افضل حق مرحوم کے خاص معتمدین میں سے تھے۔ ایک عرصہ تک مرکزی دفتر کے آڈیٹر کی حیثیت سے ماتحت مجالس کے حسابات اور ریکارڈ کی پڑتال کرتے رہے۔ لودھراں میں تبلیغی کانفرنس ہو رہی تھی۔ شاہ جی تشریف لائے ہوئے تھے۔ بازار کے متصل ایک مکان کی بالائی منزل میں قیام تھا۔ عصر کی نماز پڑھ کر بیٹھے تھے کہ حکیم صاحب وارد ہوئے ادھر اُدھر کی باتیں ہو رہی تھیں کہ شاہ جی کی نگاہ حکیم صاحب کے سر پر پڑی ایک میلی کچیلی سی رومی ٹوپی (جسے عرف عام میں ترکی ٹوپی کہتے ہیں) پہنے ہوئے تھے۔ شاہ جی نے اشارہ سے طلب کی اور دوسرے لمحہ ٹوپی پھندنے کے ساتھ لہراتی ہوئی کھڑکی کے راستے بازار کے فرش کی زینت بن گئی۔ اس کے بعد آپ نے اول تو حکیم صاحب کی خبر لی اور پھر حاضرین سے مخاطب ہو کر فرمایا کہ ترکی ٹوپی تو اس کا نام پڑ گیا ہے ورنہ یہ ترکوں کے قومی لباس کا جزو نہیں ہے۔ اس کی ساخت اٹلی میں ہوتی ہے۔ اور پھر اٹلی کی اسلام دشمنی کی داستانیں کھول کر بیان کیں۔ بہاول پور میں رومی ٹوپی ریاستی حکومت کے دفتری لباس کا جزو تھی۔ اس لئے اس کا یہاں عام رواج تھا۔ میں بھی کبھی کبھی پہن لیا کرتا تھا۔ خدا کا شکر ہے کہ لودھراں پہن کر نہ گیا تھا۔ ورنہ حشر معلوم۔ بہرحال لودھراں سے واپسی پر اس کا استعمال ترک کر دیا۔ اور دریافت پر گھر میں بھی حکیم صاحب کے واقعہ کا تذکرہ آیا۔ کچھ عرصہ بعد یاد نہیں کیا ضرورت پیش آئی کہ ایک دن پھر وہی ٹوپی پہن لی۔ میری اہلیہ نے لودھراں کا واقعہ یاد دلایا۔ میں نے ہنس کر ٹال دیا۔ رات کو خواب میں حضرت شاہ جی کو غضبناک حالت میں دیکھا۔ سر پر ہلکا سا تھپڑ مار کر ٹوپی نیچے گرادی۔ میری نیند اسی وقت کھل گئی۔ استغفار پڑھتا ہوا اٹھا اور آئندہ کے لئے ترکی ٹوپی کا استعمال قطعاً ترک کر دیا۔

مئی ۱۹۳۹ء میں بہاولپور کے آئینی ایجی ٹیشن میں عملی حصہ لینے کی پاداش میں مجھے ایک سال کے لئے ریاست بدر کر دیا گیا۔ اور کہروڑ پکا چلا گیا۔ شاہ جی کے ارشاد کے مطابق ریاست کی تحریک حریت کے سلسلہ میں ہی وہیں بیٹھ کر کام کیا تا آنکہ مولانا مظہر علی اظہر کی اپیل پر یوم بہاولپور منایا گیا۔ اور کہروڑ پکا سے رضا

کاروں کا ایک جتھہ بھی بھجوایا گیا۔ لیکن کھروڑ پکا میں مقیم ریاستی خفیہ پولیس کی بروقت اطلاعات کی بناء پر رضا کاروں کے داخلہ سے قبل ہی بقول چودھری افضل حق مرحوم حکمران کی ساحری کام کر چکی تھی۔ اور ریاستی کارکنان کمر ہمت توڑ کر گھر پہنچ چکے تھے۔ میں نے کھروڑ پکا ہی میں معمولی کاروبار شروع کر دیا۔ ساتھ ہی مجلسی تنظیم کا سلسلہ جاری رہا اور مضافاتی علاقہ میں جیوش احرار کا جال پھیل گیا۔ اس کے تھوڑے ہی عرصے بعد جنگی بھرتی کے خلاف مجلس احرار کی سول نافرمانی شروع ہوئی تو مجھے ڈکٹیٹر منتخب کیا گیا۔ شبانہ روز تقریریں اور مظاہرے ہوتے۔ علاقہ کے پانچ سو کارکنوں اور رضا کاروں نے گرفتاری کے لئے اپنے آپ کو پیش کر دیا۔ لیکن گرفتاری کوئی نہ ہوئی۔ (حالات (ا) معمول پر آنے کے بعد معلوم ہوا کہ تھانہ کھروڑ کے تجربہ کار تھانیدار نے حکام کو مطلع کر دیا تھا کہ ہر بستی ہر گاؤں اور ہر کنوئیں پر رضا کار گرفتاری کے لئے تیار ہیں جس پر فیصلہ ہوا کہ کوئی چھیڑ چھاڑ نہ کی جائے) رہائی کے بعد حاجی عبدالرشید صدیقی (مرحوم) اور ملک عبدالغفور صاحب انوری نے (مرحوم) بتایا کہ اخباری رپورٹوں کی بناء پر ملتان جیل میں ہمیں روزانہ آپ کا انتظار رہتا تھا۔ بہرحال جب یہ دور گزر گیا اور شاہ جی کھروڑ تشریف لائے تو اس امر پر اظہار تعجب فرمایا کہ کھروڑ سے ایک رضا کار بھی گرفتار نہ ہوا۔ جس پر "احرار" سہارنپور اور دیگر اخبارات کی فائلیں پیش کر دی گئیں۔ فرمایا " یہ سب کچھ اپنی جگہ صحیح ہے مقصود گرفتاری تھی اور ضروری نہیں کہ کھروڑ ہی میں آپ کی گرفتاری ہوتی۔ جس عورت نے گھر سے بھاگنا ہوتا ہے وہ دروازوں کی طرف نہیں تاکا کرتی۔ آپ ملتان اور خانیوال جا کر اپنے آپ کو گرفتاری کے لئے پیش کر سکتے تھے" اس پر ندامت سے ہمارے سر جھک گئے۔ اور بیس سال کے عرصہ میں جب کبھی شاہ جی سے ملاقات ہوتی اور شاہ جی کے یہ الفاظ یاد آجاتے تو پیشانی عرق آلود ہو جاتی۔

محترم حاجی نور محمد صاحب کھروڑ پکا کے قدیم جاں نثار قومی کارکن اور شاہ جی کے لاڈلے مریدوں میں سے ہیں۔ اس اعتبار سے یقیناً خوش قسمت ہیں کہ ان کے اکثر بیٹے بیٹیوں کے نکاح شاہ جی نے پڑھے۔ ایک بار شاہ جی کو بہت تنگ کر کے اور بڑی منت سماجت سے اپنے لڑکے کے نکاح میں شمولیت کی دعوت منوا آئے اور یہاں آکر دیگر مقامی کارکنوں کے مشورہ سے اندر ہی اندر اس موقع پر شاہ جی کی تقریر کا پروگرام مرتب کر لیا۔ مضافات کے کارکنوں اور رضا کاروں کو بھی اطلاع بھجوائی گئی۔ شاہ جی کی تشریف آوری پر باوجود ان کی علالت طبع کے خاموشی سے جلسہ کا اہتمام بھی کر لیا گیا۔ شاہ جی اپنی قیام گاہ (محترم حاجی گل حسن صاحب کی بیٹھک) پر مقامی کارکنوں اور مضافاتی رضا کاروں کے جھرمٹ میں بیٹھے ان کے سروں پر احتساب کا لٹھ گھما رہے ہیں۔ دیہاتی کارکنوں کی جیبوں سے برآمد چٹھیاں زیر غور ہیں کہ کس نے لکھ کر بلایا۔ کوئی بھی اقرار نہیں کرتا۔ اس اثناء میں بندہ بھی پہنچ گیا اور شاہ جی کی دریافت پر تحریروں کو پہچان کر اپنے دو کارکنوں کے نام بتا دیئے۔ اب شاہ جی کا غصہ انتہا کو پہنچ گیا۔ اور دو ٹوک فیصلہ دیا کہ "میری تقریر نہ ہو گی" اس فیصلہ پر مقامی کارکنوں کو جو خفت اٹھانا پڑی۔ اس کا اندازہ کرنا آسان نہیں۔ لیکن آئندہ کے لئے سب محتاط ہو گئے اور اس کے بعد کبھی خلاف اصول حرکت کی جرأت نہیں کی۔

ختم نبوت اور مرزائیت

عقیدہ ختم نبوت اساس اسلام اور روح قرآن ہے۔ اگر مسلمان اس سے بال برابر بھی ادھر ادھر ہو جائیں تو پھر محمد عربی ﷺ کا قرآن باقی رہتا ہے اور نہ اللہ تعالیٰ کی وہ تنزیہہ و تقدیس کہ جس پر آدم علیہ السلام سے لے کر نبی ختمی مرتبت ﷺ تک تمام انبیاء متفق ہیں۔

مرزائیت اسی اساسِ دین، روح قرآن اور جان اسلام پر مرتدانہ ضرب ہے میں اس کے استیصال کو ہر مسلمان کے لئے فرض نہیں الفرض جانتا ہوں۔ میں عقیدہ ختم نبوت کے تحفظ کے لئے اپنی زندگی کی آخری بازی لگا دوں گا۔

مرزائیت پاکستان کے مقدس جسم کا سیاسی ناسور ہے اگر حکمرانوں نے اس کا آپریشن نہ کیا تو یہ ناسور سارے جسم کو خدانخواستہ تباہ کردے گا۔

امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ
لاہور ۱۱ ستمبر ۱۹۵۲ء
۱۲ ذوالحجہ ۱۳۷۱ھ

مرگِ عظیم

موت کی جرأت بے باک پہ حیراں ہوں میں
شیشۂ فکر و نظر چور ہوا جاتا ہے
ہر شگوفہ مری تخیل کا مرجھایا ہے
ہر نفس نالۂ رنجور ہوا جاتا ہے
آج وہ پھول لٹا ہے مرے گلشن کا ندیم
جس کی خوشبو سے معطر تھے بہاروں کے دماغ
موت کو راہ میں ظلمات کا اندیشہ تھا
چھین کر لے گئی ایوانِ مشیّت کا چراغ
مہر سی جس کی جبیں ماہ سا جگا چہرہ
قبلۂ اہل نظر نقشِ قدم تھے جس کے
جگمگاتے ہوئے سینے میں گدازِ قرآں
نطق و ادراک اشاروں کا حشم تے جس کے
سوگیا راہِ سیاست کا جیالا راہی
بجھ گئیں شمع فصاحت کی ضیائیں افسوس
اب ہمیں کون سنائے گا شریعت کا پیام
مٹ گئیں حسن خطابت کی ادائیں افسوس
درد میں ڈوبے سیہ پوش فلک پر بادل
آہ و ماتم کے نشان آب و الم کی دنیا
آج مٹی کا وہاں ڈھیر سا ہو گا ساغر
سرجھکاتی تھی جہاں لوح و قلم کی دنیا!

ساغر صدیقی مرحوم

مرزا محمد حسن چغتائی رحمۃ اللہ علیہ
سابق امیر مجلس احرار اسلام پاکستان

حضرت امیر شریعت کا رام کلی (میلسی) میں پہلی بار ورُود

قبل از قیام پاکستان (کوئی چار پانچ سال پہلے) رام کلی کا ایک شخص حضرت امیر شریعت کی خدمت میں کسی جگہ پہنچا اور وہاں کے حالات بیان کرنے کے بعد ضرورت کے پیش نظر ایک تاریخ مقرر کرنے کی استدعا کی۔ حضرت شاہ جی نے ڈائری کا جائزہ لیا اور تاریخ دے دی۔ اس کے بعد داعی نے شاہ جی سے کوئی رابطہ قائم نہ کیا۔ لیکن شاہ جی اپنے وعدے پر قائم تھے۔ جیسا کہ اکثر و بیشتر کہا کرتے تھے کہ میں سید زادہ ہوں اور مجھ سے وعدہ کی خلاف ورزی نہیں ہو سکتی۔ چنانچہ باوجود رابطہ نہ ہونے کے آپ نے امرتسر سے کھروڑ پکا کا سفر طے کیا۔ اور بغیر پیشگی اطلاع کے مقررہ تاریخ کی صبح کو کھروڑ پکا پہنچ گئے۔ اطلاع ملنے پر سبھی ورکر جمع ہو گئے۔ اور حکم دیا کہ مجھے رام کلی بھجوایا جائے۔ جلسہ کے سلسلے میں کارکنان نے بالکل بے خبری کا اظہار کیا۔ لیکن تعمیل حکم میں حاجی نور محمد صاحب مرحوم نے تانگہ کا انتظام کر کے حافظ عبدالمجید شاکر (مرحوم) کو شاہ جی کی معیت میں روانہ کر دیا۔ راستہ میں واقف کار لوگ دریافت کرتے اور کسی پروگرام سے لاعلمی کا اظہار کرتے۔ تاآنکہ بستی کے بالکل قریب پہنچے کہ جب کسی سے اس داعی کا نام لے کر شاہ جی نے اس کے بارے میں دریافت کیا۔ تو اس نے بتایا کہ وہ شخص "وہابی" قسم کا تھا۔ جس کو بستی والوں نے کافی دنوں سے یہاں سے نکال دیا ہے اور اب پتہ نہیں کہاں رہتا ہے۔

بستی کے کنارے سکول کی عمارت تھی۔ جب یہ قافلہ وہاں پہنچا تو مدرس صاحبان نے یہ معلوم کر کے کہ سید عطاء اللہ شاہ بخاری آ گئے ہیں۔ اپنی عافیت اس میں سمجھی کہ سکول بند کر دیا۔ لیکن بند کرتے کرتے جلدی میں ایک چارپائی، کرسی اور میز باہر بھول گئے۔ اس اثناء میں سکول سے نکلنے والے بچے بھی شاہ جی کے ارد گرد جمع ہو گئے۔ اور شاہ جی نے سکول کی چھوٹی سی چار دیواری والی بغیر چھت کی مسجد میں ڈیرہ لگا دیا۔ اور بچوں سے کہہ کر چارپائی، کرسی اور میز وہیں منگالی۔ حافظ عبدالمجید صاحب کو فرمایا! ظہر کی اذان کہی جائے۔ اذان سن کر پانچ سات آدمی بستی کے اور دو چار رہ گزر بھی آ گئے۔ بہر حال اچھی خاصی جماعت کے ساتھ نماز ہوئی۔ نماز سے فارغ ہو کر شاہ جی نے حافظ عبدالمجید شاکر کو حکم دیا کہ وہ کچھ بیان کرنا شروع کریں۔ چنانچہ انہوں نے وعظ شروع کر دیا۔ اور جو آدمی نماز میں شریک ہوئے وہ وعظ سننے بیٹھ گئے۔ دس پندرہ منٹ میں کچھ چار پانچ آدمی اور بھی آ گئے۔ جس کے بعد شاہ جی نے اپنی گرجدار اور مؤثر آواز میں قرآن پاک کی تلاوت شروع کر دی۔ جہاں جہاں شاہ جی کی آواز پہنچتی گئی لوگ آواز سن کر جلسہ گاہ میں پہنچتے گئے۔ کوئی پندرہ بیس منٹ کی تلاوت کے بعد شاہ جی نے خطبہ دے کر باقاعدہ تقریر شروع کر دی۔ اس اثناء میں اچھا خاصا اجتماع ہو گیا۔ شاہ جی نے اختلافی مسائل کے حل کو سمجھانے کے لئے جب یہ شعر پڑھا

محمّد بشر ولیس کالبشر

بل ہو یاقوت والنّاس کالحجر

اور اس کے مطالب پر روشنی ڈالی تو تمام مختلف مسائل حل فرما دیئے۔ آپ نے زور دار انداز میں فرمایا "یاد رکھو، بشر بشر میں فرق ہے۔ جیسے پتھر پتھر میں فرق ہے۔ ایک وہ پتھر ہے جو سڑک میں کوٹ دیا گیا۔ وہ بھی تو پتھر ہی ہے جو کسی بادشاہ کی انگوٹھی کا نگینہ ہے۔ اور تاجِ شاہی میں ٹک رہا ہے۔ حجرِ اسود بھی تو پتھر ہے جس کو چومنے کے لئے دنیا ترس رہی ہے" پھر تقریر مسلسل دو گھنٹوں تک جاری رہی۔ اور تقریر کے اختتام پر وہی لوگ جو داعی کو مار بھگانے کے مرتکب تھے۔ شاہ جی کے حلقہ بگوش بن گئے۔ جن میں مہر جان محمد وغیرہ شامل تھے۔ جو زندگی بھر مجلس احرار اسلام کے کارکن رہے۔

مزاح لطیف

اپنی تقریر کے دوران حافظ عبدالمجید صاحب کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا کہ مجھ سے پہلے میرے عزیز نے جو آیت پڑھ کر اس کا ترجمہ کیا معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے اس کا ترجمہ کسی مسلم لیگی سے پڑھا ہے۔ یہ بات کہہ کر مجمع کو ہنسی سے لوٹ پوٹ کر دیا۔

(۔۔۔۔ میں نے حافظ صاحب سے دریافت کیا تو انہیں آیت یاد نہ تھی۔ محمد حسن)

حافظ عبدالمجید شاکر اور شاہ جی

حافظ عبدالمجید شاکر مرحوم جو میرے حقیقی بھانجے تھے۔ وہ اپنی والدہ سمیت شاہ جی سے بیعت تھے۔ مجھ سے بیان کیا کہ میں شاہ جی سے کچھ باتیں کرنا چاہتا تھا۔ لیکن خلوت کا موقع میسر نہ آتا تھا۔ ایک بار ملتان میں حاضری دی تو حضرت اپنی فرودگاہ میں چارپائی پر دراز تھے۔ اور میں بیٹھا پاؤں دبانے کی سعادت حاصل کر رہا تھا۔ الحمد للہ کہ خلوت کا موقع مل گیا۔ بے باکانہ عرض کیا۔

"حضرت آپ کے ہزاروں مرید ہیں۔ آپ نے مرید تو بنائے لیکن آپ نے ان کے اصلاح کی کوئی فکر نہ کی۔ قیامت کے دن کیا جواب دیں گے"؟

میرا یہ کہنا تھا کہ حضرت اٹھ بیٹھے آنکھیں سرخ ہو گئیں۔ فرمانے لگے۔

"آج تم نے ایسی بات کی ہے جو آج تک کسی نے نہیں کہی۔ ہزاروں مرید آتے ہیں کوئی مسترات پوچھتا ہے۔ کوئی مال و اولاد کی خواہش کا اظہار کرتا ہے۔ بس دنیوی جاہ و جلال کی باتیں ہوتی ہیں"۔ یہ کہہ کر تھوڑی دیر سکوت فرمایا۔ پھر معنی خیز نگاہوں سے میری طرف دیکھ کر استفسار کیا کہ کیا پوچھتے ہو؟ میں نے عرض کیا کہ مدعا تو حضرت نے معلوم کر لیا ارشاد ہوا کہ

پانچ وقت کی نماز، رزق حلال کی سعی، اور کلمۂ تمجید کا ورد

میں نے عرض کیا کچھ اور؟ فرمایا۔ بس میرے مرشد کا فرمان ہے کہ جو شخص رزق حلال کماتا ہے۔ پانچ وقت کی نماز کا پابند ہے۔ اور کلمۂ تمجید کے ورد کا صبح و شام اہتمام رکھتا ہے اگر روزِ قیامت خداوند قدوس اسے جہنم کی

طرف دھکیلیں گے تو میں خدا سے لڑ پڑوں گا۔

زندگی کے آخری ایام میں جب آپ مسلسل علالت کا شکار تھے۔ مجھے ملتان میں محترم منشی ابوالحسن کھہروڑوی کی معیت میں حاضری کا موقع نصیب ہوا۔ گھر پر گئے تو معلوم ہوا کہ حکیم حنیف اللہ صاحب کے مطب پر گئے ہوئے ہیں۔ چنانچہ ہم وہاں حاضر ہوئے آپ تیار بیٹھے تھے۔ اٹھ کھڑے ہوئے۔ اس وقت مرد مجاہد کی نقاہت کا یہ عالم تھا کہ ایک ہاتھ میرے کندھے پر رکھا اور دوسرا منشی صاحب موصوف کے کندھے پر اور چلنا شروع کیا۔ راستے میں فرمایا کہ عزیز! میرے پاؤں اب انتقام پر اتر آئے ہیں۔ میں نے بھی تو انہیں کچھ کم سزا نہیں دی۔ اب یہ مجھے سزا دے رہے ہیں۔

حرف آخر

آخر میں حافظ عبدالمجید شاکر مرحوم نے کہا کہ شاہ جی اس دنیا میں نہیں رہے اور رہنا کسی نے بھی نہیں۔ موت کا ایک دن معین ہے۔ نامعلوم شاہ جی جیسا قادر الکلام اور فصیح اللسان اور مجاہد جلیل پھر کب پیدا ہو۔ الحمد للہ ہمارے احباب میں حق گو علماء و فضلاء اور مقررین کی کمی نہیں۔ ہر دوست کا فرض ہے کہ وہ بخاری کے مشن کو زندہ رکھنے اور اسے کامیابی کی منزل تک پہنچانے میں اپنے شب و روز صرف کر کے اپنے فرض سے سبکدوش ہوں۔

بہاول پور گھلواں میں پہلی بار ورود

شاہ جی جب اول بار بہاول پور گھلواں (تحصیل احمد پور شرقیہ) میں تشریف فرما ہوئے۔ تو جلسہ کا انتظام ایک ایسے میدان میں کیا گیا۔ جہاں ایک پرانے پیپل کے درخت کا وسیع و عریض سایہ جلسہ گاہ کے لئے موزوں تھا۔ شاہ جی نے وہاں تقریر شروع کرنے سے قبل فرمایا کہ مجھے اس جگہ ریچھوں، کتوں کی بدبو آ رہی ہے۔ اس لئے میں اس جگہ وعظ نہ کروں گا۔ منتظمین اور دیگر معتبران علاقہ نے بتایا کہ اس بات سے ہمیں انکار نہیں کہ یہاں ریچھ اور کتے لڑائے جاتے ہیں۔ لیکن ہماری مجبوری ہے کہ اس جگہ کوئی موزوں میدان موجود نہیں۔ جہاں سایہ کا انتظام ہو۔ اور مجمع کے لئے کافی گنجائش ہو۔ وہ شخص جو ریچھ کتوں کی لڑائی کا دھندا کرتا تھا۔ وہ بھی مجمع سے نکل کر شاہ جی کی خدمت میں حاضر ہوا۔ اور توبہ کر کے یقین دہانی کرائی کہ آئندہ وہ اس مذموم فعل کا اعادہ نہ کرے گا۔ پھر بھی شاہ جی نے خوشی سے نہیں بلکہ طوعاً و کرہاً تقریر کرنے پر آمادگی کا اظہار کیا تقریر تین چار گھنٹوں تک جاری رہی۔ اور جب اختتام کو پہنچی تو شاہ جی نے قیام گاہ کی طرف روانہ ہوتے ہوئے لوگوں کو بتایا کہ "یہ پیپل کا درخت ان شاء اللہ کل یہاں نہ ہو گا" شاہ جی کی اس بات کو لوگوں نے استعجاب سے سنا لیکن دوسرے روز خدا کا کرنا کیا ہوا کہ صبح ہی صبح دریا میں سیلاب آیا۔ جس سے یہ بستی بھی محفوظ نہ رہی اور پیپل کے درخت کی یہ کیفیت ہوئی کہ وہ جڑوں سمیت نکل کر باہر آ پڑا۔ اور اس کا نام و نشان تک نہ رہا۔

اس واقعہ کو سن کر ملک پیر بخش خان گھلو ذیلدار شاہ جی کی خدمت میں حاضر ہو کر بیعت ہوئے۔ اور اس

طرح سے ملک صاحب اور ان کے خاندان کا دائمی تعلق شاہ جی سے استوار ہو گیا۔ بلکہ علاقہ کے ولی اللہ حافظ کریم بخش کی بدولت شاہ جی کی ڈائری میں تقریب میلاد النبی علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والتسلیمات ہمیشہ ہمیشہ کے لئے بہاول پور گھلواں کے لئے "ریزرو" ہو گئی۔

علاقہ میلسی کا ایک واقعہ

علاقہ میلسی کے ایک زمیندار نے شاہ جی سے وعظ کے لئے وقت لیا۔ شاہ جی وعدہ کے مطابق پہنچ گئے۔ زمیندار نے جلسے کے آغاز سے تھوڑی دیر قبل شاہ جی کو بتایا کہ اس کے بیٹے نے ایک طوائف کو اپنے گھر میں بٹھا دیا ہے۔ اور ہماری عزت خاک میں مل گئی ہے۔ اپنی تقریر میں اس کو شرم دلائیں۔ ان لوگوں نے صدارت کی کرسی پر بغیر شاہ جی کو بتلائے اس نوجوان کو بٹھا دیا۔ شاہ جی نے خطبۂ مسنونہ کے بعد ارکان اسلام کی پابندی اور اصلاحِ رسوم کے بارے میں بیان شروع کیا اور جب تقریر عروج پر پہنچی تو اس معاملہ کا ذکر چھیڑا۔ صدارت کی کرسی پر بیٹھا ہوا نوجوان پہلے تو شرم کے مارے پانی پانی ہو گیا۔ لیکن پھر تھوڑی دیر بعد جرأت کر کے اپنی کرسی سے اٹھ کر شاہ جی سے مؤدبانہ عرض کیا کہ حضرت! میں نے کوئی جرم نہیں کیا بلکہ باقاعدہ نکاح کر کے عورت کو گھر میں لایا ہوں۔ شاہ جی کا یہ سننا تھا کہ فوری طور پر تقریر کا کانٹا بدلا۔ اس نوجوان کو گلے لگا کر تھپکی دیتے ہوئے کہا کہ شاباش بیٹے! تم نے بہت بڑا جہاد کیا اور بڑی نیکی کا کام کیا ہے۔ مجھے تو اندھیرے میں رکھا گیا اور نکاح کا ذکر تک نہیں کیا گیا۔ ورنہ میں تمہیں مبارک باد دیتا کہ تم نے ایک فاحشہ کو ذلت کی زندگی سے نکال کر عزت بخشی اور خود بھی کارِ بد سے بچ گئے۔

پھر اس کے بعد اسی واقعہ کو موضوعِ سخن بنا کر اس قدر مؤثر خطاب فرمایا کہ مجمع عش عش کر اٹھا۔

روایت: حافظ نور الحسن (عطر فروش۔ مقیم مکہ مکرمہ)

حافظ پیر بخش نابینا کا واقعہ

قبل از تقسیم کے زمانہ کی بات ہے کہ امیر شریعت کی تقریر کا چوکی مستی خان (علاقہ کہروڑ پکا) میں پروگرام بنا۔ امیر پور سادات میں حافظ پیر بخش نابینا رہا کرتے تھے۔ جو کوئی پانچ سات سال قبل فوت ہوئے ہیں۔ انہوں نے جلسہ میں شمولیت کا ارادہ کیا۔ لیکن اپنے دوست احباب سے اس امر کا تذکرہ کرتے رہے کہ "میرا دل شاہ جی کو ملنے کے لئے بے تاب ہے۔ لیکن مجھ محتاج آدمی کو کون ان کے نزدیک بھٹکنے دے گا۔ گلے ملنے کا شوق کون پورا کرنے دے گا۔ چلو کہیں دور سے تقریر سن لوں گا یہی غنیمت ہے" وہ اس قسم کی باتیں کرتے رہے حتیٰ کہ جلسہ کا موقعہ آ گیا۔ اور یہ حافظ جی بھی وہاں شاہ جی کی تشریف آوری سے قبل پہنچ گئے۔ جس وقت شاہ جی تشریف لائے ہزاروں لوگوں کا اژدھام تھا۔ یہ نابینا حافظ کہیں ایک طرف کھڑے ہو کر دل ہی دل میں کڑھتا رہا۔ شاہ جی کے تشریف لانے پر لوگ مصافحہ کے لئے ٹوٹ پڑے۔ نعروں کا غلغلہ اس قدر تھا کہ کسی کی آواز بھی ایک دوسرے کو سنائی نہ دیتی تھی۔ کہ معاً شاہ جی نے مجمع کے درمیان میں راستہ بنانا شروع کر دیا۔ اور فرمایا کہ مجھے ایک آدمی کو ضروری ملنا ہے۔ اور دیکھتے ہی دیکھتے شاہ جی حافظ صاحب کے پاس

پہنچ گئے۔ اور ان کو جھنجھوڑ کر کہا۔ "حافظ جی! آپ پریشان نہ ہوں عطاء اللہ شاہ خود بخود آپ کی خدمت میں حاضر ہے" اور مصافحہ کر کے معانقہ کیا اور ان کو خوب بھینچ کر بولے کہ "حافظ جی آپ راضی ہیں؟ چلو آپ کو سٹیج کے قریب بٹھا دیتا ہوں" ان کو پکڑ کر سٹیج پر ہمراہ لائے۔ اور نزدیک ہی بٹھا دیا۔ حافظ جی کی یہ حالت تھی کہ خوشی سے پھولے نہ سماتے تھے۔ اور پھر زندگی بھر اس واقعہ کو دہراتے رہے اور اپنی خوش قسمتی پر نازاں رہے۔ یاد رہے کہ چوکی مستی خان میں مجلس احرار اسلام کی باقاعدہ شاخ تھی۔ حاجی گھنے خان بلوچ اور اس کے خاندان کے اکثر افراد شاہ جی سے بیعت بھی ہوئے۔ اس علاقہ میں پچاس کے قریب باوردی سرخپوشوں پر مشتمل جیش احرار بھی تھا۔

❋

دور اول کے مجاہدین اسلام کے گروہ سے ایک سپاہی راستہ بھول کر اس زمانہ میں آنکلا ہے وہی سادگی مشقت پسندی، یکسر عمل، اخلاص اور للہیت جو ان میں تھی وہ عطاء اللہ شاہ میں بھی ہے۔

ان کی تقریر حضور ﷺ کے باقی ماندہ معجزات میں سے ایک معجزہ ہے!

ابوالاثر حفیظ جالندھری

خطابت شاہ جی کی کرامت تھی۔ ان کی زندگی جفاکشی اور مجاہدہ کی زندگی تھی۔ آدابِ شریعت کی وہ نگہداشت نہ کرتے تو اور کون کرتا کہ وہ "امیر شریعت" تھے۔

ماہر القادری

میں اپنے آپ کو تصوف کا پیرو سمجھتا ہوں اور میں نے سید عطا اللہ شاہ بخاری سے کسب فیض کیا ہے
(جنگ لندن کو انٹرویو)

فیض احمد فیض

قرون اولیٰ میں پیدا ہوتے تو یقیناً ایک جلیل القدر صحابی ہوتے

آغا شورش کاشمیری

وہ لیلائے حریت کی تلاش میں سیاست کی پر خار وادیوں میں دیوانہ وار مصروف رہے

عبداللہ ملک

ان کے بے داغ و بیلوث خلوص کی قسمیں صدیوں بعد بھی کھائی جاتی رہیں گی

احمد ندیم قاسمی

ایک ایسا شخص۔۔۔۔۔۔۔ جو اپنے زمانے میں، مسلمان معاشرے کے سارے طبقوں میں ہر دلعزیز تھا۔ جس میں بلا کی استقامت تھی۔ اور جسے اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک نگاہِ دور بین کے علاوہ دلِ پُردرد بھی عطا ہوا تھا۔

ڈاکٹر وزیر آغا

اردو نے جب بھی اپنے سرمایہ افتخار پر ناز کیا تو اسے بہت سے لوگ یاد آئیں گے ان میں سید عطاء اللہ شاہ بخاری بھی شامل ہوں گے جن کے لئے سیاست دراصل ایک اسٹیج، سیاسی جماعتیں صرف منتظمین جلسہ، ملک بھر کی آبادی محض سامعین اور زندگی ایک طویل اردو تقریر تھی اس خطیبانہ زندگی میں ان کے ہم عصر تو بہت تھے مگر ہمسر کوئی نہ تھا۔

مختار مسعود

حضرت مرزا محمد حسن چغتائی رحمہ اللہ

حضرت امیر شریعت
مولانا عبدالرحمن میانوی کی نظر میں

خلد آشیانی حضرت مولانا عبدالرحمن میانوی مرحوم و مغفور کو اس وقت سے جانتا ہوں جب میرے طالب علمی کے زمانہ میں ۳۲-۱۹۳۰ء میں جمیعتہ المسلمین کھروڑ پکا ــــــــــــ کے تبلیغی اجتماعات میں شرکت کے لئے مولانا ظہور احمد بگوی کے ہمراہ تشریف لایا کرتے تھے۔ پھر قدرت نے ہمیں مجلس احرار اسلام میں ایک ساتھ کام کرنے کے مواقع بہم پہنچائے تو مخلصانہ تعلقات کا ایک غیر منتہی سلسلہ جاری ہو گیا۔ جو ان کے دم واپسیں تک قائم رہا۔

۲۶ جون ۱۹۶۹ء کو موصوف نے اپنی شدید بیماری کے دوران کراچی سے مجھے ایک ذاتی نوعیت کا گرامی نامہ تحریر کیا۔ اس میں شاہ جی کا تذکرہ جس والہانہ انداز سے کیا گیا ہے اگر میں اسے اپنی احرار برادری سے اوجھل رکھوں تو یہ شاہ جی کی ہمہ صفت شخصیت سے ناانصافی کے مترادف ہو گا۔

"میں اب کہ رجب میں بیمار ہوا چیچہ وطنی میں جماعتی خطابت تھی۔ وہاں علاج کرتا رہا۔ مگر آرام نہ آیا شعبان میں ملتان آیا اور حکیم خلیل صاحب جو آبائی طور پر پیشہ حکمت کرتے ہیں سے علاج کرایا۔ انہوں نے غلط مرض سمجھ کر علاج کیا۔ مجھے ۱۹۵۱ء میں تپ مرقہ ہوا تھا اس کی وجہ سے معدہ آنتیں خراب ہو چکی تھیں۔ تین سال متواتر بیکار رہا۔ ایک سال تو بخار دامن گیر رہا۔ ۱۰۶ ٹمپریچر اور اسہال کی کثرت مگر قدرت نے بچا لیا۔ اس وقت میرے محسن اعظم میرے مرّبی اعلیٰ حضرت امیر شریعت سر پر کھڑے علاج کرا رہے تھے۔ قصبہ میانی میں تین دفعہ تشریف لائے۔ تین دن تک غربت کدہ پر قیام فرمایا۔ بچیوں بیٹوں کے سر پر روانگی کے وقت ہاتھ رکھ کر کہا کہ "میرے پاس حیات کا انجکشن نہیں کہ میانوی کو لگا دوں۔! خدانخواستہ میرے منہ میں مٹی پڑے اگر یہ مر گیا تو اپنے آپ کو اکیلا نہ سمجھنا میں بخاری تمہارا ابا جب تک زندہ ہوں تمہاری حال پرسان کرتا رہوں گا۔ اور اپنی عزیزہ صادقہ کی طرح سمجھوں گا"۔ تمام ادویات کا خرچہ اپنی جیب سے دیا۔ پھر ملتان آیا تو حکیم عطاء اللہ صاحب سے مقویات کھلائیں۔ ذاتی خرچہ دیا جماعت کا ایک پیسہ خرچ نہ ہونے دیا۔ بچی ہمشیرہ کا نکاح ہوا۔ بحیثیت باپ شرکت کی۔ ہر قسم کی اعانت فرمائی۔

ملک تقسیم ہوا۔ ملتان تشریف فرما ہوئے ختم نبوت مجلس کی بنیاد پڑی۔ مولانا محمد علی صاحب، مولانا لعل حسین اور مجھے ارشاد فرمایا کہ "عمر وقف کرو اور کچھ مشاہرہ مقرر کر لو" میں نے عرض کیا۔ جوانی صحرانوردی، شہروں، قصبات، دیہات میں بلامعاوضہ لگا دی۔ اب بوڑھاپے میں مول ڈالیں۔ میری غیرت گوارا نہیں کرتی جو چاہیں مقرر کر دیں۔ ہمارے حالات آپ سے مخفی نہیں"۔ بد قسمتی سے ختم نبوت اور مجلس احرار میں تعاون نہ ہونے سے پرانے ساتھی خصوصاً آپ جیسے مشفق، مخلص دوست بچھڑ گئے۔ اگرچہ ملاقات ہوتی رہی مگر کہاں وہ سابقہ رفاقت اور کہاں گا ہے گا ہے ملاقات۔

والسلام

آزادیٔ کشمیر

عزیزو! خدا جانے اب آپ کس کشمیر کو لینے کے ارادے کر رہے ہیں یا کس کشمیر کے متعلق سوچتے ہیں؟ ورنہ وہ کشمیر جو ذہن میں جنت کا نشان ہے جس کے متعلق میری رائے ہے کہ پروردگار عالم نے آسمانوں پر اپنی موجودگی میں تیار کرا کے اسے زمین پر اتارا اور وہ جنت کا ایک ٹکڑا ہے۔ اس جنت ارضی میں اب نہیں بلکہ ۱۹۳۱ء سے مسلمانوں پر ظلم ہورہا ہے اس زمانے میں ہم احرار نے اسی کشمیر کے متعلق مسلمانوں سے بات کہی تھی۔ لیکن اس وقت کے رئیس مسلمانوں نے جن کا دخل فرنگی ایوانوں میں تھا ہماری بات نہ سنی احرار کی تحریک پر آزادیٔ کشمیر کے لئے چالیس ہزار مسلمان قید ہوئے اور بائیس نوجوانوں نے جام شہادت نوش فرمایا۔ تب ہماری بات مان لی ہوتی تو آج کشمیر کا نقشہ یوں نہ ہوتا۔

اب آپ بھی سن لیں اور چودھری صاحب[1] بھی! کشمیر تو آپ اپنے ہاتھ سے دے چکے اگر فائر بندی کی بات نہ ہوتی تو ممکن ہے کوئی بات بن جاتی میری بات لکھ رکھو کہ فرنگی اور ہندو اب کسی صورت میں بھی آپ کو کشمیر نہیں دینا چاہتے ہاں البتہ اگر کبھی فرنگی کو ضرورت ہو کہ وہ اس مستقل فساد کو ختم کرنا چاہے تو ممکن ہے کہ اس کا کچھ حصہ آپ کے پاس آجائے۔

امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاری
دفاع پاکستان احرار کانفرنس
۱۴ جنوری ۱۹۴۹ء دہلی دروازہ لاہور

۱۔ کشمیری رہنما چودھری غلام عباس مرحوم جو دفاع کانفرنس میں شریک تھے۔

تخلیق کے ماتھے کا چمکتا ہوا غازہ،

تھا زندہ و پائندہ و تابندہ و بیدار
وہ مرد جری شیر خدا صاحب اسرار

تخلیق کے ماتھے کا چمکتا ہوا غازہ
تعمیر کے چہرے کا دمکتا ہوا سنگھار

آئینۂ اخلاص و وفا جس کی نگاہیں
جو وقت پہ تھیں خارا شگافی کو بھی تیار

ہونٹوں کی نوا درس براہیم کا اعلان
ہاتھوں کا عصا ضرب کلیمی کا نشاندار

بت خانہ افرنگ میں اک مرد حق آگاہ
تھا عظمت کعبہ کا نگہبان و نگہدار

اسلام کی صف ہو تو ہر اک درد کا درماں
کفار کا لشکر ہو تو بپھری ہوئی تلوار

وہ شاہ تھا ہاں شاہ قلمروئے بیاں کا
فن اس کی خطابت کا کمال لب اظہار

تقریر کے ہنگام امڈتا ہوا دریا
تحریر کے دوران وہ صد قلزم ذخار

یہ حسن بیاں، حسن ادا، حسن تلفظ
جذبات کی تلخی میں بھی شیرینئ گفتار

قرآں کی تلاوت میں پیام سحر انگیز
سن لیں تو فرشتوں کی بھی تقدیر ہو بیدار

تفسیر کا موقع ہو تو اللہ غنی علم
گرتی ہی چلی جائے ہر اک کفر کی تلوار

پُر مغز تھا پُرشوق تھا پُرشوق بخاری
وابستۂ توحید تھا دانندۂ اسرار

پروفیسر اصغر سودائی رحہ

محترم مرزا محمد حسین چغتائی رحمۃ اللہ علیہ
سابق امیر مجلس احرار اسلام پاکستان

روایت۔ ماسٹر عبداللہ مسعود مرحوم

۱۹۴۳ء کا قحط بنگال اور دہلی احرار کانفرنس میں شاہ جی کا خطاب

ماسٹر مولوی عبداللہ مسعود درمیانی قد و قامت کے بھرے بھرے جسم، کتابی چہرے، گوری چٹی رنگت والے جن کے چہرے پر سرخ مہندی والی ڈاڑھی خوب بہار دکھاتی تھی۔ بہاول پور کے ہنس مکھ اور خلیق، سکول ماسٹر، جالندھر کے مہاجرین میں شمار ہوتے تھے۔ مجلس احرار اسلام سے ان کا قدیم تعلق تھا جو شاید خاندانی بھی ہو۔ جالندھر میں وہ طلبہ کی رضا کار تنظیم "افضل کور" کے سالار رہے۔ میرا ان سے تعارف جانشین امیر شریعت سید ابو معاویہ ابوذر بخاری مدظلہ کے ذریعہ سے ہوا تھا ماسٹر صاحب بھی انہی دنوں خیر المدارس جالندھر میں زیر تعلیم تھے۔ جن دنوں سید ابو معاویہ ابوذر بخاری اور سید عطاء المحسن بخاری بھی وہیں زیر تعلیم تھے۔ شاہ جی کی ذات گرامی سے انہیں والہانہ محبت تھی۔

ذیل میں قحط بنگال کے سلسلہ میں شاہ جی اور احرار کی خدمات کے ضمن میں ان کی یادداشت ہدیہ قارئین کی جارہی ہے۔ یہ داستان ماسٹر صاحب نے مجھے ستمبر ۱۹۷۱ء کو ان دنوں قلم بند کرائی تھی جب وہ سمہ سٹہ ہائی سکول میں بطور ٹیچر تعینات تھے اور ماڈل ٹاؤن بہاول پور میں رہائش رکھتے اور جلد سازی کی دکان بھی کرتے تھے۔ بعد میں وہ سیٹلائٹ ٹاؤن منتقل ہو گئے۔ اور ستمبر ۱۹۹۱ء میں وفات پا گئے۔

اواخر ۱۹۴۳ء کا واقعہ ہے۔ حضرت مفتی کفایت اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے مدرسہ امینیہ دہلی میں زیر تعلیم تھا۔ جب کہ مجلس احرار اسلام سے میرا تعلق بچپن سے چلا آتا تھا۔ اور میں اپنے وطن جالندھر میں "افضل حق کور" کا سالار تھا۔ انہیں دنوں کی بات ہے کہ دہلی میں احرار پولیٹیکل کانفرنس کے اجتماعات ہوئے۔ گاندھی گراؤنڈ (متصل چاندنی چوک) میں عظیم الشان پنڈال بنایا گیا تھا۔ اس کانفرنس میں خطاب کے لئے حضرت امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاری رحمۃ اللہ بھی تشریف لائے ہوئے تھے۔

اس کانفرنس کے انعقاد سے قبل دہلی کے لوگوں کا عام خیال یہ تھا کہ جہاں سحبان الہند مولانا احمد سعید جیسے مقرر موجود ہوں وہاں ایک پنجابی سید عطاء اللہ شاہ کی بات کون سنے گا۔ ان دنوں بنگال میں قحط پڑا ہوا تھا۔ اور کانفرنس کا سب سے اہم مقصد بنگالی بھائیوں کی امداد پیش نظر تھا۔ اس سے قبل شاہ جی بذات خود بنگال کا دورہ کر کے تشریف لائے تھے۔ اور انہوں نے آنکھوں دیکھا حال بیان کر کے عوام کو امداد کے لئے آمادہ کرنا تھا۔

گرمی کا موسم تھا۔ کانفرنس کے اجلاس رات کے وقت ہوا کرتے تھے۔ داخلہ بذریعہ ٹکٹ تھا۔ ٹکٹ کی عام قیمت ایک روپیہ اور خصوصی ٹکٹ سو روپیہ تک کی مالیت کے تھے۔

اول شب کا جلسہ

اول روز جب شاہ جی کی تقریر کا اعلان ہوا تو تقریر سے قبل ہی پنڈال بھر گیا جس کے نتیجے میں ٹکٹوں کا مطالبہ شد و مد سے جاری تھا۔ جب کہ ایک لاکھ روپیہ سے متجاوز رقم کے ٹکٹ فروخت کرنے کے بعد رات کے گیارہ بجے کے عمل میں شاہ جی سٹیج پر تشریف لائے۔ اس وقت تک بھی یہ چہ مہ گوئیاں ہو رہی تھیں کہ پنجاب کے لوگ کیا تقریریں کر سکیں گے۔ لیکن جونہی شاہ جی نے اپنے لحن داؤدی میں خطبہ مسنونہ ادا کیا۔ تو باہر کھڑے ہوئے لوگوں نے نعرے بلند کر کے داخلہ کا مطالبہ شروع کر دیا۔ منتظم رضا کاروں نے شاہ جی کو صورت حال سے مطلع کیا۔ جس پر شاہ جی نے سٹیج ہی سے حکم دیا کہ جلسہ گاہ کی قناتیں ہٹا دی جائیں اور عام داخلہ کی اجازت دے دی جائے۔

شاہ جی کی تقریر کا مرکزی نقطہ قحط بنگال تھا۔ آپ وہاں کے جستہ جستہ چشم دید حالات بیان کر رہے تھے۔ اس ضمن میں ایک دردناک واقعہ اس طرح بیان کیا کہ۔

"میں ایک دیہات میں جا رہا تھا میرے بیس ہمراہی رضا کاروں نے چاول کی گٹھڑیاں اٹھائی ہوئی تھیں۔ ہم کلکتہ سے کوئی دس میل دور فاصلہ پر تھے۔ جہاں حالات بہت نازک تھے۔ ہم جب گاؤں کے قریب پہنچے تو ہم نے دیکھا کہ ایک چیل فضا میں تڑپتی ہوئی قلابازیاں کھاتی زمین پر آ گری۔ جس سے اچھی خاصی آواز پیدا ہوئی۔ بھوک سے بے تاب ایک کتا اسے کھانے کو لپکا اور دوسری طرف ایک مریل انسان جس کا فاقوں سے برا حال ہو رہا تھا۔ آگے بڑھا ایک پَر چیل کا کتے کے منہ میں اور ایک پَر اس انسان کے ہاتھ میں دونوں اپنی طرف کھینچ رہے تھے۔ مگر اس کشمکش میں دونوں جان ہار گئے اور کھانا کسی کو نصیب نہ ہوا"

جب شاہ جی کی زبانی لوگوں نے یہ دلدوز واقعہ سنا تو دھاڑیں مار مار کر رونے لگے۔ شاہ جی نے فرمایا کہ "یہ کربناک منظر دیکھ کر مجھ میں دیہات میں داخل ہونے کی سکت نہ رہی۔ وہیں بیٹھ گیا اور رضا کاروں کو آگے بھیجا وہ سامان تقسیم کر کے واپس آ گئے۔ جو کچھ میری آنکھوں نے دیکھا ہے اگر تم دیکھ لیتے تو تمہارا جگر پھٹ جاتا۔" آپ نے لوگوں سے اپیل کی کہ "وہاں کے مسلمانوں کی یہ حالت ہے ورنہ انسان تو ہیں ہی۔ وہ سبھی امداد کے مستحق ہیں" لوگوں کی طرف سے اس اپیل پر نوٹوں کی اس قدر بارش شروع ہو گئی کہ جس کا سمیٹنا بھی مشکل ہو گیا۔

جلسہ سے پہلے بعض مقامی احباب کا کہنا تھا کہ یہاں پر اجلاس کامیاب نہ ہو سکے گا۔ شاہ جی نے فرمایا کہ "ہمیں خلوص سے کام کرنا ہے۔ کامیابی، ناکامی، کسی اور طاقت کے ہاتھ میں ہے۔" چنانچہ رات بھر تقریر جاری رہی ادھر صبح کی اذان بلند ہوئی ادھر شاہ جی نے "باقی کل" کہہ کر دعا فرمائی اور نماز صبح وہیں پنڈال میں ادا کی گئی۔

دوسری شب کی نشست

دوسرے دن بھی کانفرنس کے انتظامات جاری رہے۔ اور شب کو اس قدر اژدہام تھا کہ چار ہزار رضا

کاروں کی نفری بھی انتظام پر بہ مشکل پوری اتری۔ داخلہ دوسری شب کو بھی بذریعہ ٹکٹ رہا۔ جب کہ اجلاس کے آغاز سے قبل ہی ٹکٹ پیشگی فروخت ہو چکے تھے۔ مزید ٹکٹوں کی چھپائی کا فوری انتظام ناممکن تھا۔ ہجوم بے پناہ تھا۔ لوگ بازاروں، دوکانوں، اور مکانوں پر کھڑے تقریر سنتے رہے۔ شاہ جی نے چندہ کی فراہمی کی کیفیت دیکھ کر یہ شعر برسر اجلاس پڑھا۔

دینا ہے تو اتنا دے کہ کروں تنگیٔ داماں کا گلہ
ورنہ وہ بھی چھین لے جو کاسۂ سائل میں ہے

جس پر عوام الناس نے بڑھ چڑھ کر عطیات دیئے اور نوٹوں کے ڈھیر لگا دیئے جب کہ اس شب بھی تقریر صبح تک جاری رہی۔ دوسرے روز شاہ جی نے اپنی موجودگی میں رضا کاروں کی ٹولیاں مرتب کرائیں جو مسلسل کئی روز تک زر اعانت اور دیگر سامان لے کر بنگال کو روانہ ہوتی رہیں اور اس طرح سے مجلس احرار اسلام کے رضا کاروں کو اپنے قحط زدہ ہم وطنوں کو سہارا دینے کی سعادت نصیب ہوئی۔

خانوادۂ شاہ ولی اللہ

اسی دوسرے روز ایک عجیب واقعہ پیش آیا جس کا تذکرہ دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔ دوسرے روز جب شاہ جی کا قیام خیمے میں تھا۔ دس بجے دن کے قریب میں بیٹھا شاہ جی کے پاؤں دبا رہا تھا اور شاہ جی لیٹ رہے تھے کہ ایک رضا کار نے آکر کسی ملاقاتی کے بارے میں بتایا۔ کہ اجازت چاہتا ہے۔ شاہ جی نے فرمایا کہ میں ایسا آدمی نہیں کہ میرے ملنے والوں کو اجازت کی ضرورت ہو جو کوئی ملنا چاہے آجائے۔ جس پر رضا کار چلا گیا اور پھر تھوڑے وقفہ میں ایک خوب رو نوجوان بے تکلفانہ انداز میں داخل ہوا۔ اور سلام کر کے شاہ جی کے تکیئے کے ساتھ لگ کر سر جھکا کر بیٹھ گیا۔ شاہ جی اس وقت ہاتھ میں ایک کبوتر بھی لئے ہوئے تھے۔ جو شاید کسی نے ہدیتہً پیش کیا تھا۔ کبوتر بہت خوبصورت تھا۔ شاہ جی کبھی اس کو دباتے کبھی کوئی پر کھینچتے ان کی خواہش تھی کہ وہ بولے۔ لیکن وہ چپ سادھے ہوئے تھا۔ شاہ جی نے اسے چھوڑا اور آنے والے نوجوان کی طرف متوجہ ہوئے۔ اتنے میں کسی نے تعارف کرایا کہ یہ خاندان ولی اللّٰہی کے چشم و چراغ ہیں۔ یہ سن کر شاہ جی بے تابانہ اٹھے اور اسے سینے سے لگا لیا۔ پیشانی کو کئی بار چوما۔ ہاتھوں کے بوسے لئے۔ فوری طور پر چائے اور فروٹ وغیرہ کا انتظام کیا۔ معلوم یوں ہوتا تھا جیسے شاہ جی ماحول سے بالکل بیگانہ ہو گئے۔ گرد و پیش سے بے نیاز ہو گئے۔ رضا کاروں کو بلکہ جیسے خود اپنے آپ کو بھی بھول گئے ہوں۔ والہ و شیدا ہو کر بڑی دیر تک ان سے خاندانی حالات دریافت کرتے رہے۔ وہ نوجوان بہت دیر کے بعد جب جانے لگے تو شاہ جی سے دوسرے دن اپنے گھر آنے کا وعدہ لے کر گئے۔ شاہ جی نے فرمایا کہ میرے لئے وہاں جانا باعث برکت ہے میں انشاء اللہ کل چلوں گا۔

تیسرا اجلاس

تیسرے روز پھر شاہ جی کی تقریر کا انتظام ہوا۔ لیکن شاہ جی نے ٹکٹ کے ذریعہ داخلہ کی ممانعت فرما

دی۔ اور کہا کہ جب لوگ از خود ہی تعاون کر رہے ہیں تو ٹکٹ کا تکلف کس لئے؟ چنانچہ حسب دستور رات کو جلسہ ہوا اور شرکاء جلسہ کا اژدہام دونوں راتوں سے بڑھ کر رہا۔ اس اجلاس میں شاہ جی نے اپنی مجلسی پالیسی کے ماتحت جنگ عظیم دوم میں فوجی بھرتی بائیکاٹ کا تذکرہ فرمایا اور بتایا کہ صوبہ بنگال نے اس جنگ عظیم کے سلسلہ میں انگریز کو بھرتی نہیں دی۔ جس کا خمیازہ اس قحط کی صورت میں بھگتنا پڑا ہے۔ جس سے آٹھ لاکھ انسان سسک سسک کر مر گئے۔ جبکہ حقیقت یہ ہے کہ بندر گاہ پر غلہ اور چاول افراط میں موجود تھا۔ جو سمندر میں جان بوجھ کر پھینک دیا گیا۔ لیکن بھوک سے مرتے انسانوں کو دینا گوارا نہ کیا گیا۔ اس طرح سے ان یورپین فرنگی، انسان نما بھیڑیوں نے حریت پسند اور غیرت مند بنگالیوں سے انتقام لیا۔

اس آخری اجلاس میں شاہ جی نے فرمایا کہ اب انگریز زیادہ دیر تک ہمارے ملک پر حکمران نہیں رہ سکے گا۔ اور ان شاء اللہ اس جنگ کا اختتام ہمارے ملک کی آزادی کا پیش خیمہ ہوگا۔

اس سے اگلے روز وعدہ کے مطابق شاہ جی نے اقامت گاہ ولی اللّٰہی میں تشریف لے جانا تھا۔ لیکن رضا کاروں سے گفتگو اور مجلس کی وجہ سے معمول کے مطابق بہت دیر ہو گئی۔ چنانچہ خاندان کی باعظمت خواتین اس نوجوان کی معیت میں از خود شاہ جی کے کیمپ میں تشریف لے آئیں۔ شاہ جی کی عجیب حالت تھی۔ معلوم ہوتا تھا جیسے فرطِ عقیدت سے بچھے چلے جاتے ہوں۔ بہرحال شاہ جی کے پاس وہ کافی دیر رہیں اور شاہ جی ان سے اسلاف کے حالات سنتے رہے۔ انہوں نے بیعت کی خواہش کا اظہار کیا تو شاہ جی نے رومال ان کے ہاتھ میں دیکر اس کا کنارا پکڑ کر ان باعصمت خواتین کو بیعت فرمایا۔ بعد ازاں اپنا وعدہ پورا کرنے کی غرض سے شاہ جی ان کے ساتھ ہی ان کے گھر تشریف لے گئے اور کچھ وقت وہاں رہے۔ پھر ولی اللّٰہی قبرستان میں بھی حاضری دی اور کافی دیر تک وہاں قیام فرما کر مراقبہ بھی فرمایا۔

جب آزادی کا قافلہ نئے حوصلوں اور تازہ ولولوں کے ساتھ تنگ و تاریک اور ناہموار راستوں پر نمودار ہو رہا تھا اور جب انگریز کی سلطنت کا سورج غروب نہیں ہوتا تھا تب سید عطاء اللہ شاہ بخاری کا دل و دماغ، روحِ آزادی کا امین تھا، جو لوگ آزادی کے قافلوں کے مقتدا اور پیشوا ہوتے ہیں ان کے متعلق صرف یہ لکھا جاسکتا ہے کہ جس رات میں انہوں نے اپنے سوئے ہوئے قافلے کو آوازیں دی تھیں وہ کتنی تاریک اور بھیانک تھی اور کیسی پامردی اور حوصلہ مندی کے ساتھ انہوں نے وقت کی آندھیوں اور طوفانوں کے سامنے عزم و یقین کی مشعلوں کو روشن کئے رکھا۔ میں پورے وثوق سے کہتا ہوں کہ جب کہیں آزادی کے درس کی تشریح کی جائیگی تو سید عطاء اللہ شاہ بخاری کا وہاں ذکر ضرور آئے گا۔

نسیم حجازی

میں سید عطاء اللہ شاہ بخاری جیسے جید عالم دین کے دست شفقت سے سرفراز ہوا۔ ساغر صدیقیؒ

میں ان کی سادگی اور خطابت کا قلب و جگر سے معترف ہوں۔ میاں شفیع (م۔ش)

اظہار حق

"حق بات کہنے سے کبھی گریز نہ کرو خواہ تمہارے سر پر تلوار ہی کیوں نہ لٹک رہی ہو؟ کیا تم موت سے ڈرتے ہو؟ حالانکہ رب کائنات نے موت کا ایک دن اور ایک وقت مقرر کردیا ہے پھر موت سے ڈر کر سچی بات کہنے میں ہچکچاہٹ اختیار کرنا انتہائی بزدلی اور ایمان کی کمزوری ہے۔ کمزور اور بزدل قوم کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ زمین کی پیٹھ کا بوجھ بن کر زندہ رہے، کمزوری اور ضعیف ایمان ایسا گھن ہے جو اندر ہی اندر قوم کو کھاجاتا ہے۔ مشکلات کے راستے سے ڈر کر اللہ کے راستے سے فرار اختیار کرنا بغاوت ہے اور باغی کی سزا تم جانتے ہی ہو، کیا تم چاہتے کہ تمہارا حشر بھی وہی ہو جو تم سے پہلے قوموں کا ہوا، کیا کھنڈروں میں ڈھلی ہوئی بستیاں جو قہر خداوندی کا نشانہ بنیں اور صفحۂ ہستی سے حرف غلط کی طرح مٹ گئیں، تمہاری عبرت کے لئے کم ہیں؟ جہاد ایمان کی روح ہے اور مجاہد دین کا ستون، جہاد سے انکار کفر ہے اور کفر ظلمت قلب، دل سیاہ ہو تو انسان انسانیت کے دائرے سے نکل جاتا ہے، دل کی بستی تاریک ہو تو انسان خدا کو بھول کر عیش و عشرت میں کھوجاتا ہے دل ہی ظلمت نگر ہو تو تیغ وسناں جو انسان کے زیور ہیں، انکی جگہ طاؤس و رُباب لے لیتے ہیں۔ جب قومیں طاؤس و رباب کی رسیا ہوجاتی ہیں تو مٹ جاتی ہیں اور انکی تباہی دوسروں کے لئے عبرت کا درس بن جاتی ہے"

بانیٔ احرار امیر شریعت
سید عطاء اللہ شاہ بخاری رحمہ اللہ تعالی

ہم ایک گوہرِ یکتا گنوا کے بیٹھ گئے!

سکونِ زیست کی دولت لٹا کے بیٹھ گئے
ہم ایک گوہرِ یکتا گنوا کے بیٹھ گئے

وہ جب سے چہرۂ انور چھپا کے بیٹھ گئے
ہم اپنی پلکوں پہ شمعیں جلا کے بیٹھ گئے

ترس رہی ہیں نگاہیں تمہاری صورت کو
اب آ بھی جاؤ کہ سب لوگ آ کے بیٹھ گئے

قریب کر لیے محبت سے ایک دنیا کو
عجیب بات ہے خود دور جا کے بیٹھ گئے

وفا شعار تھے تم کیا ہوا خدا کے لئے
کہ اپنے یاروں سے دامن چھڑا کے بیٹھ گئے

ہمارا جی نہیں لگتا کہیں تمہارے بغیر
مگر ہو تم، کہ کہیں جی لگا کے بیٹھ گئے

زمیں پہ پھولوں میں کم ہو گئی تھی بوئے وفا
کہ اب فلک پہ ستاروں میں جا کے بیٹھ گئے

رواں رہے گا یونہی کارواں بخاری کا
عدو نہ سمجھیں کہ ہم دل بجھا کے بیٹھ گئے

تڑپ کے چاک گریباں کریں گے باطل کا
وہ یہ نہ سمجھیں کہ ہم چوٹ کھا کے بیٹھ گئے

سید امین گیلانی

شاہ جی زندہ ہیں

مظہر نواز درانی (ملتان)

بھائی شورش: میرا حال تو حضرت عمرؓ جیسا ہے، جیسے انہیں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کا یقین نہیں آتا تھا، سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھنے اور سب کام اپنے ہاتھوں سے کرنے کے باوجود شاہ جی کی موت باور کرنے کو دل نہیں چاہتا۔ دل کو سمجھاتا ہوں تو عقل نہیں مانتی کہیں وہ مجسم زندگی بھی موت کا شکار ہو سکتی ہے۔ میرے نزدیک تو شاہ جی زندگی کا دوسرا نام ہے۔ البتہ ان کے سامنے نہ ہونے سے ہم لوگ اب ضرور مر چکے ہیں۔ مردوں سے مضمون لکھوانا اور پھر باصرار ناراض ہو کر لکھوانا آپ کا کام ہے۔ شاہ جی جیسی باغ و بہار شخصیت پر لکھنا تو آپ جیسے عبقری لوگوں کا کام ہے۔ میرے ایسے رضا کار جن کا کام عمر بھر جلسوں کی دریاں سمیٹنا اور بچھانا رہا ہو یا اور آگے بڑھے تو کسی قسم کے زخمیوں یا بیماروں کی کوئی سوشل خدمت کر دی، کیا شاہ جی پر مضمون لکھیں گے اور پھر لکھنے بھی تو ان کی کون کون سی بات کو لکھے انہی سے ایک سنا ہوا شعر بار بار سامنے آ کر ہاتھ پکڑ لیتا ہے کہ میاں کیا لکھو گے۔

دامان نگہ تنگ گل حسن تو بسیار

گل چین نگاہ تو زداماں گلہ دارد

ذاتی تاثرات کی یہ چند سطریں بھی اس لئے لکھوا رہا ہوں تا کہ آپ کی وہ بدگمانی دور ہو جائے جو آپ کے ذہن میں پیدا ہو چکی ہے۔ دوسرے یہ بھی خیال ہے کہ یوسف کے خریداروں میں نام تو لکھا جائے گا۔ میرے جیسے لوگوں کے لئے یہی نسبت ہی کافی ہے۔

بلبل ہمیں کہ قافیہ گل شود بس است

شاہ جی کا ملتان میں آنا جانا بھی کافی تھا اور مجھے سکول ہی کے زمانے سے ان کی تقریریں سننے کا شوق تھا۔ ملتان کی سیٹھ فیملی کے ایک رکن "پورن چند" میرے کلاس فیلو تھے اور وہ بھی شاہ جی کی تقریروں میں عموماً میرے ساتھ جاتے تھے۔ سکول کا زمانہ ختم ہوا تو پورن چند نے ڈی۔ اے۔ وی کالج لاہور میں داخلہ لیا اور میں اسلامیہ کالج لاہور میں داخل ہوا۔ اب ہمیں شاہ جی کی مزید تقریریں سننے کا بہترین موقعہ میسر آیا اور لاہور میں بھی پورن چند ہمیشہ میرے ساتھ جاتا۔ اور جہاں شاہ جی کی تقریر کا اعلان ہوتا، میں پورن چند اور دوسرے احباب وہاں ضرور پہنچ جاتے۔ شاہ جی کی تقریر سننے کے بعد پورن اکثر چپ سادھ لیتا بلکہ تقریر کے دوران میں بھی اس کی حالت ہمیں متغیر نظر آتی۔ میں نے بارہا اس سے دریافت کیا کہ یہ کیا معاملہ ہے مگر وہ عموماً بتلانے سے گریز کرتا، آخر میرے اصرار پر ایک دن اس نے بتلایا کہ شاہ جی جب قرآن پڑھتے ہیں تو مجھے یوں محسوس ہوتا ہے کہ یہ الفاظ ابھی ابھی آسمان سے اتر رہے ہیں، وغیرہ۔

اس کی یہ کیفیات سن کر میں نے اسے اسلام لانے کی ترغیب دینے کی خاطر کہا" پھر اسلام کے متعلق

تمہاری کیا رائے ہے؟'' اس نے معاً کہا۔ آپ کے مذہب کے متعلق تو میں کچھ نہیں کہہ سکتا لیکن آپ کی قوم کا مستقبل مجھے روشن نہیں دکھائی دیتا۔ بخاری جیسے آتش بیان مقرر تو آپ کے ہاں بے شک موجود ہیں لیکن دت اور بھگت سنگھ جیسے رضا کار مفقود ہیں۔ میں نے بے ساختہ اسے جواب دیا میں شاہ جی کا رضا کار ہوں اور تا زندگی ان کا رضا کار رہوں گا۔ اور یہ صرف وقتی جواب نہیں تھا بلکہ میں نے دل میں تہیہ کر لیا تھا کہ میں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے شاہ جی کا رضا کار رہوں گا اور وہ جو خدمت بھی میرے سپرد کریں گے میں اسے ہر صورت میں بجا لاؤں گا۔ اور اس وقت سے آج تک کہ تیس پینتس برس گزر گئے، میں اپنے آپ کو شاہ جی کا رضا کار ہی سمجھتا ہوں۔ مواقع اگرچہ میسر آئے اور دوستوں نے آگے بڑھانا بھی چاہا مگر میں نے کبھی آگے بڑھکر لیڈر بننے کی کوشش نہیں کی حتیٰ کہ کبھی سٹیج پر نمایاں ہو کر بیٹھنے کی کوشش بھی نہیں، کبھی تقریر نہیں کی کبھی قلم کی گھس گھس کو پیشہ نہیں بنایا اور معاف کرنا آج بھی آپ کے اصرار کو یہ مضمون لکھوا کر پورا کر رہا ہوں لکھ نہیں رہا ہوں، صرف اس لئے کہ میں اپنے عہد نبھانے کا ارادہ رکھتا ہوں اور رضا کار رہنے کو زیادہ پسند کرتا ہوں۔

یاران تیز گام نے محمل کو جا لیا
ہم محو نالۂ جرس کارواں رہے

شاہ جی تو شورش بھائی! ایک نجم ہدایت تھے ہم انہیں دیکھ کر نشان راہ کا پتہ پاتے تھے۔ بلکہ وہ ماہتاب مسرت تھے کہ ہم ان کی ٹھنڈی اور میٹھی چاندنی سے دلی مسرتوں کی کیفیتیں سمیٹتے تھے۔ نہیں نہیں بلکہ وہ آفتاب رشد و ہدایت تھے۔ جن سے ہم خون کی گرمی حاصل کر کے اپنے ایمان کو تازہ کرتے تھے۔ وہ وقت کے شہنشاہ تھے اور اسی طرح اپنے وقت کے بہت بڑے فقیر بھی تھے۔ وہ عالم نہیں بلکہ عالم گر تھے وہ بظاہر طبیب نہیں تھے مگر حقیقت میں وہ دلوں کے طبیب اور حکیم الامت تھے۔ میں نے بڑے بڑے وزراء، حکام اور رؤساء کو انکی چوکھٹ پر آتے دیکھا مگر وہ کبھی نہ کسی سے مرعوب ہوئے اور نہ ان کی کسی ناجائز خواہش کو مانا اور ہمیشہ غریبوں میں بیٹھ کر اپنے آپ کو انہی میں سے ایک فرد بنا لیتے اور اس بات میں زیادہ خوشی اور مسرت محسوس کرتے تھے۔ مجھے یاد ہے جن دنوں آپ کی رہائش خان گڑھ میں تھی اور خان گڑھ کو سیلاب نے آگھیرا تو ملتان کے دوست بہت مضطرب تھے میرے بھائی ملک عطاء اللہ ''نیا مکتبہ'' والے روزانہ سائیکل پر خان گڑھ جاتے اور شام کو واپس آ کر شاہ جی کی خیریت احباب کو سناتے ایک دن محمد اشرف درزی بھی فرط محبت میں اپنی بیماری اور کمزوری کے باوجود سائیکل پانی میں چلاتے شاہ جی کے پاس پہنچے تو شاہ جی ان سے بہت ناراض ہوئے اور فرمایا تم نے بیماری اور کمزوری میں اتنی تکلیف کی ہی کیوں!۔۔۔ اس وقت ان کا اضطراب دیدنی تھا، فوراً اس کے لئے شربت پانی اور روٹی کا اہتمام کرنے میں مصروف ہوگئے، مگر جب اشرف نے کہا میں روزے سے ہوں تو شاہ جی اضطراب دوگنا ہو گیا۔ پہلے تو یقین نہ کیا کہ کہیں میری تکلیف کو دیکھ کر یہ بہانہ ہی نہ بنا رہا ہو پھر جب یقین آ گیا کہ واقعی یہ روزے سے ہے تو خود اٹھ کر اندر سے ایک کپڑا لے آئے اور اشرف سے فرمایا اسے باندھ کر جلدی سے نلکے کے نیچے بیٹھ جاؤ اور خود نلکا چلانا شروع کر دیا۔ دوسرے

دوستوں نے عرض کیا کہ ہم اسے نہلا دیتے ہیں مگر نہ مانے اور فرمایا مجھے مسرت اسی طرح حاصل ہوتی ہے اور گھنٹہ بھر اسے نلکے سے علیحدہ نہ ہونے دیا اور پورا گھنٹہ خود نلکا چلاتے رہے۔ کیا کوئی دوسرا لیڈر آپ ایسا بتا سکتے ہیں کہ اپنے ادنیٰ رضا کاروں کے ساتھ ایسا سلوک کرتا ہو!

انہیں دنوں میں احباب نے بہت کوشش کی شاہ جی کے لئے کوئی مکان ملتان میں الاٹ کرالیں کیونکہ یہ واقعہ تھا کہ وہ امرتسر میں اپنا بہترین مکان چھوڑ کر آئے تھے اور شاہ جی کے اشارے یا رضا کے بغیر یہ کوششیں تادیر جاری رہیں مگر "نمائشی دینداروں" کی ٹولی نے ہماری یہ کوششیں بار آور نہ ہونے دیں آخر میں مجبور ہو کر ٹبی شیر خاں کے محلہ میں ایک چھوٹا سا کچا مکان ہم نے شاہ جی کی خاطر کرایہ پر لے لیا۔ اس زمانے میں اس کا کرایہ بارہ روپے ماہوار تھا اور کوئی دوسرا اچھا مکان مل نہیں رہا تھا اس لئے ہم نے کوشش کی کہ شاہ کسی طرح ایک بار ملتان تشریف تو لے کر آئیں۔ پھر موقعہ ملنے پر مکان بدلا جا سکتا ہے۔ جب ملک عطاء اللہ شاہ جی کو مع سامان لے آئے تو میں نے معذرت کے انداز میں کہا یہ مکان اگرچہ آپ کے لائق نہیں مگر یہ عارضی انتظام ہے اور بہت جلد ہم کوئی اچھا سا مکان آپ کے لئے ڈھونڈ لیں گے مگر آپ نے ہنستے ہوئے پر مسرت لہجے میں فرمایا! میری جو حیثیت ہے وہ میں بھی جانتا ہوں اور آپ بھی جانتے ہیں میری حیثیت سے تو یہ مکان بھی بڑا ہے میرے بزرگوں نے تو کھجور کی عارضی چھتوں اور کچی دیواروں میں ہمیشہ گزارا کیا جنہیں مکان کہنا آپ لوگ شاید گناہ سمجھیں گے اور یہ تو بہر حال مکان ہے اور مجھے اس واسطے بھی بہت پسند ہے کہ آپ لوگوں نے اسے میرے لئے پسند کیا ہے۔ بات دوسری طرف جاتے دیکھ کر میں نے بات بدلنے کی کوشش میں عرض کیا کہ شاہ جی یہ محلہ کچھ اچھا نہیں اس محلہ کے لوگ آپ کو وہابی سمجھتے ہیں اس لئے مکان تو بہرحال ہم کہیں اور لیں گے البتہ عارضی طور پر چند دن آپ کو یہاں گزارنے ہی پڑیں گے۔ یہ سن کر ہنس پڑے اور فرمایا وہابیت کا انتظام میں خود کر لوں گا۔ اور پھر مکان نہ بدلنا تھا نہ بدلا اور آخر وقت تک اسی مکان میں رہے اور وہیں سے آپ کا جنازہ اٹھا اور وہابیت کا انتظام یوں ہوا کہ سال بھر کے اندر میں نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ محلے کے بڑے چھوٹے جوان اور عورتیں آپ کے ساتھ "اباجی اباجی" کے الفاظ سے مخاطب ہوتے تھے وہ سب کی غمی شادی میں صرف شریک ہی نہیں بلکہ مشیر بھی تھے اور ڈیوڑھی کے بارہ فٹ کمرے میں ہر وقت پندرہ بیس آدمی موجود رہتے کوئی باتیں کر رہا ہے کوئی کمر دبا رہا ہے اور کوئی پاؤں دبانے میں مصروف ہے اور شاہ جی ہیں کہ بچے بوڑھے سب کے ساتھ باتیں کئے جا رہے ہیں اور مجلس ہر دومنٹ کے بعد کشت زعفران بن جاتی ہے۔

ایک دن محلے کا ایک آدمی کمرے میں داخل ہوا اور داخل ہوتے ہی کہنے لگا "شاہ جی میں مر رہا ہوں اور آپ توجہ ہی نہیں کرتے"۔ فرمایا بھئی، بیٹھو میں ذرا ہاتھ صاف کر لوں۔ ہاتھ صاف کر کے تشریف لائے تو اس آدمی کے رو برو بیٹھ گئے اور فوراً منہ کھول کر اپنے مصنوعی دانت نکال لئے اور پھر فرمایا کہ دیکھ بھائی سید کا ایک دانت بھی باقی نہیں بچا سب ایک ایک کر کے گر گئے ہیں اب تیرے دانت کا کیا علاج کروں! ڈاکٹر کے پاس جاؤ دوائی لگواؤ اور دعا میں کروں گا کہ اللہ تعالیٰ تمہیں جلد شفا عطاء فرمائیں۔ اور لاکھ بات کی کہو تو ایک

بات اور بھی بتا دوں جس سے ڈاکٹر بھی متفق ہیں۔ پھر مسکرائے اور فرمایا۔

علاج دنداں اخراج دنداں

ایک روز شاہ جی نے اپنی ابتدائی بیعت کا واقعہ سنایا کہ میں حضرت پیر مہر علی شاہ گولڑوی رحمہ اللہ کے پاس بیعت کے لئے حاضر ہوا کئی روز وہاں رہا مگر حضرت نے میری طرف توجہ نہ فرمائی ادھران کی بے رخی سمند شوق پر تازیانہ ثابت ہوئی حتیٰ کہ جب ایک دن وہ گھوڑے پر سوار ہو کر کہیں باہر تشریف لے جا رہے تھے تو میں بھی گھوڑے کے پیچھے پیچھے چل پڑا۔ انہوں نے گھوڑا دوڑایا تو میں نے بھی پیچھے دوڑنا شروع کر دیا۔ جب ان کی نظر پڑی تو پوچھا کیا بات ہے! میں نے عرض کی، حضور آپ کی توجہ کا طلب گار ہوں۔ فرمایا۔ جاؤ ایک دو روز اور انتظار کرو۔ میں نے حکم کی تعمیل کی دو روز کے بعد مجھے بلایا بیعت فرمائی اور چند کلمات پڑھنے کے لئے بتلائے میں نے عرض کیا اگر اجازت ہو تو قصیدہ غوثیہ بھی پڑھا کروں۔ فرمایا میں نے تمہیں وہ چیز بتلائی ہے جس کو پڑھکر غوث الاعظم غوث بنے اور تم قصیدہ غوثیہ پڑھنے کی اجازت مانگتے ہو؟

شاہ جی ایک مرد قلندر تھے اور آپ جانتے ہیں

قلندر جز دو حرف لاالہ کچھ بھی نہیں رکھتا

اس لئے طبعاً بہت بے نیاز واقع ہوئے تھے۔ ان کے دوستوں کو ان کا ذاتی مکان نہ ہونا بہت کھٹکتا تھا اور اکثر ان کی محفل میں بھی اس موضوع پر باتیں شروع ہو جایا کرتی تھیں۔ مگر آپ ہمیشہ ہنس کر ایسی بات کو ٹال جایا کرتے تھے بلکہ فوراً موضوع سخن بدل لینے کی کوشش فرماتے تھے۔ ایک دن میری موجودگی میں ایک (شیخ محمد دین) صاحب جن کی میاں چنوں میں لکڑی کی دکان تھی دس ہزار روپے لائے اور آپ کی خدمت میں پیش کر کے عرض کیا کہ یہ مکان کی خاطر ہے آپ اس میں کچھ اور روپیہ ملا کر کوئی چھوٹا موٹا مکان خرید لیں۔ آپ نے بہت خوشی کا اظہار فرمایا مگر ساتھ ہی کہا آپ ابھی یہ روپیہ اپنے پاس رکھیں میرے پاس رہا تو خرچ ہو جائے گا بھائی مظہر میرے لئے مکان کا انتظام کر رہے ہیں۔ جب انتظام ہو جائے گا۔ اور ضرورت ہو گی تو روپیہ آپ سے منگوا لیں گے۔ وہ خوش خوش واپس گئے اور اس کے بعد وہ ہفتے عشرے کے بعد جب بھی ملتان آتے تو مجھ سے پوچھنے کے لئے آتے کہ مکان کا کچھ انتظام ہوا اور میں بھی ہمیشہ انہیں یہی جواب دیتا ابھی تو نہیں ہوا ہو جائے گا۔

ایک دن تنگ آ کر انہوں نے کہا اگر دیر ہے تو یہ روپیہ اپنے پاس رکھ لو کہیں مجھ سے خرچ نہ ہو جائے اور چونکہ یہ منت کا روپیہ ہے اس لئے میں اسے خرچ کرنا نہیں چاہتا۔ میں نے دریافت کیا کہ منت کیسی؟ تو شیخ صاحب نے بتایا کہ میرے ہاں لڑکیاں ہی لڑکیاں پیدا ہوتی تھیں اور لڑکا کوئی نہیں تھا۔ میں نے شاہ جی کی خدمت میں استدعا کی آپ نے مجھے ایک دعا بتائی جس کے پڑھنے سے اللہ تعالیٰ نے مجھ پر فضل فرمایا اور میری مراد پوری ہو گئی۔ جس دن لڑکا پیدا ہوا تو میں نے عہد کیا تھا کہ شاہ جی کے مکان کے لئے میں بھی امداد کروں گا میں صاحب کی بات سے متاثر ہوا اور ان سے کہا میں شاہ جی سے اجازت لے کر ہی روپیہ اپنے پاس رکھوں گا اور جب میں نے یہ ساری بات شاہ جی کے گوش گزار کی اور ان کی اجازت کا طلب گار ہوا تو انہوں نے فرمایا۔

میرے بھائی صاحب سفید پوش آدمی ہیں کثیر الاولاد ہیں۔ وہ تو محبت کی وجہ سے دیتے ہیں لیکن میں اپنی خواہشات پر ان کے بچوں کو قربان نہیں کرسکتا اگر سو پچاس ہوتے تو میں لے بھی لیتا مگر تم بھی ان کی دل شکنی نہ کرو اور کسی نہ کسی طرح انہیں ٹال دو تاکہ ان کے دل کو ٹھیس بھی نہ لگے اور روپیہ بھی انہیں کے پاس رہے یہ تھا پیسے ٹکے کے سلسلے میں ان کا کردار اور سوائے مرد قلندر کے اور ایسا کون کرسکتا ہے۔؟

ایک دن لائل پور سے ایک شخص آپ کی خدمت میں حاضر ہوا اور دس روپے آپ کی خدمت میں پیش کئے۔ آپ نے لے کر اسے واپس کر دیئے اس نے بار بار اصرار کیا تو آپ نے فرمایا بھائی میں نے لے تو لئے ہیں اب اپنی طرف سے تمہیں دیتا ہوں اس میں کیا حرج ہے۔ مگر وہ شخص نہ مانا۔ اس پر آپ غصے ہو گئے اور قطعاً روپے لینے سے انکار کر دیا وہ مغموم ہو کر چلا گیا تو میں نے عرض کیا آپ نے ایک غریب آدمی کو مغموم کر دیا، لے لینے میں کیا مضائقہ تھا تو فرمایا بھائی مظہر تمہیں معلوم ہے میری کوئی جاگیر نہیں کوئی تجارت نہیں مسلمان دیتے ہیں میں کھاتا ہوں اور میرا کام ہی یہی ہے مگر ہمیشہ یہ خیال ضرور رکھتا ہوں کہ دینے والا ایک تو صاحب حیثیت ہو اور اپنی حیثیت کے مطابق دے رہا ہو دوسرے اس کا یہ کام صرف رسماً نہ ہو بلکہ محبتاً ہو۔ لوگوں میں یہ بھی ایک رسم ہے کہ پیر کے پاس خالی ہاتھ نہیں جانا چاہیے اب وہ بیوی کا زیور بیچ کر بھی کچھ ساتھ لے کے آتے ہیں ایسے آدمیوں سے میں کسی طرح بھی کچھ لینے کا روادار نہیں ہوسکتا۔

بہت پرانے زمانے کی ایک اور بات یاد آئی ہے۔ ایک بار ملتان میں آئے اور ردّ رسومات پر آپ نے تقریر فرمائی تعزیہ اور دوسری رسوم سب کا پوسٹ مارٹم کیا وہ تو تقریر فرما کر چلے گئے مگر رسوم کے پجاریوں نے زمین و آسمان کے قلابے ملا دیئے اور شاہ جی کے خلاف وہ طوفان بد تمیزی اٹھایا کہ الامان! چند ماہ کے بعد شاہ جی پھر تشریف لائے اور ہم لوگ حافظ محمد یار مرحوم کے مکان پر ان سے ملنے گئے اور انہیں سب حال سنایا اور انتقامی و جوابی کارروائی کی اجازت چاہی، تو آپ ہنس پڑے اور فرمایا بھائی ایسی باتوں سے آزردہ کیوں ہوتے ہو۔ کوئی جو کچھ کہے اسے کہنے دو۔ اور وہ اپنا کام کر رہے ہیں تم اپنا کام کئے جاؤ۔ اور ہمیں تو وطن کی آزادی کے سلسلے میں اس قدر کام ہے کہ ایسی باتوں پر توجہ دینے کی فرصت ہی میسر نہیں۔ وطن آزاد ہو جائے گا تو سب کام درست ہو جائیں گے یہ سب فتنے انگریز کے کھڑے کئے ہوئے ہیں۔ پھر انتہائی سوز ناک لے میں ایک بند پڑھا مجھے اچھی طرح تو یاد نہیں مگر خیال آتا ہے کہ کچھ ایسے ہی الفاظ تھے

اپنا کچھ غم نہیں پر یہ خیال آتا ہے
مادرِ ہند پہ کب تک یہ زوال آتا ہے
دیس آزادی کا کب ہند میں مال آتا ہے
قوم اپنی پہ یہ رہ رہ کے ملال آتا ہے
منتظر رہتے ہیں ہم خاک میں مل جانے کو

پھر رات کو جو تقریر ہوئی تو آپ نے فرمایا۔

میرے ملتانی بھائیو! تم یہ کیوں دیکھتے ہو کہ میں کون ہوں اور کیسا ہوں (ا) فی الحال تو تمہیں یہ دیکھنا چاہیے کہ میں جو قرآن تمہیں پڑھ کر سناتا ہوں اور اس کا ترجمہ کرتا ہوں وہ صحیح ہے یا غلط ہے۔ اگر صحیح ہے تو اس پر عمل کرو اور اگر غلط کہتا ہوں تو میرے منہ پر دے مارو۔ رہا میرا نسب تو مجھے ابھی اس کے بیان کی کوئی ضرورت نہیں۔ اس کے پوچھنے کا حق صرف اس آدمی کو ہے جس کے گھر میں اپنے بیٹے کے رشتے کے لئے جاؤں وہ پوچھے گا تو میں کم از کم اپنی سولہ پشتوں تک کا حال اس کو بتا سکوں گا" یہ سن کر گالیاں دینے والوں کو اپنے پاؤں کے نیچے سے زمین کھسکتی ہوئی معلوم ہوئی۔

شاہ جی مجھ نالائق و ناکارہ پر بہت ہی مہربان تھے اور جب کبھی ملتان میں تشریف لاتے تو میرے غریب خانے پر ملنے کے لئے ضرور آتے تھے چونکہ میں ایک ایسے محلے کا رہنے والا تھا جس کی زندگی کے طور طریق عام لوگوں سے مختلف ہیں اس واسطے ہمیشہ خیال رکھتا تھا کہ شاہ جی کو کوئی بات ناگوارا نہ گزرے۔ ایک بار آپ مغرب کی نماز کے وقت ہی تشریف لے آئے میں مسجد میں تھا، مسجد کے دروازے کے قریب کڑی مصری خان کا ایک پٹھان کھڑا تھا۔ اس نے شاہ جی کو دیکھتے ہی ایک نامعقول بات کہی۔ وہ میں نے بھی سن لی اب شاہ جی مسجد کے اندر تشریف لے آئے اور میں مسجد کے باہر چلا گیا اور طیش میں آکر اس پٹھان سے الجھ گیا اُدھر لوگ آپ سے مصافحہ کرنے کو لپکے مگر آپ سب کو چھوڑ کر فوراً مسجد سے باہر آگئے اور نہایت ٹھنڈے انداز میں میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر فرمایا بھئی طیش میں کیوں آگئے بندۂ خدا کس کس سے لڑو گے؟ میرا چونکہ رواں رواں جل رہا تھا، اس لئے میں برابر جلی کٹی کہتا گیا مگر آپ نے مجھے دھکیل کر مسجد کی طرف میرا منہ کر دیا کہ چلو نماز کو دیر ہو رہی ہے اور اس کی طرف دیکھ کر فرمایا۔

"اس نے ہمارے دوست کو ناراض کر دیا ہے خوش یہ بھی نہیں رہ سکے گا"

فقیر کے ان الفاظ کا یہ نتیجہ نکلا کہ وہ چند دن کے اندر اندر بیمار ہو گیا دو سال تک چارپائی پر پڑا رہا اور اس کے بعد لکڑی کے سہارے بڑی کوشش کرتا تو سو دو سو گز تک جا سکتا۔

ملتان میں ایک نواب زادے کی وفات پر ملتان کے جملہ رؤساء اور نواب صاحبان جمع تھے ایک کمرہ میں جس میں نواب مرید حسین قریشی بھی موجود تھے بخاری کا ذکر بھی چھڑ گیا میں کمرے سے باہر کھڑا خود اپنے کانوں سے باتیں سنتا رہا نواب مرید حسین نے فرمایا باتیں تو بخاری سچی کہتا ہے مگر ہمارے پیٹ کا سوال درمیان میں ہے۔ اس لئے ہم ان کی باتوں کو اچھی نگاہ سے نہیں دیکھتے۔ مجھ سے نہ رہا گیا میں نے آگے بڑھ کر کہا! نواب صاحب آج تو آپ نے سچ فرمایا" وہ ہنسے اور کہنے لگے۔ برخوردار میں ہمیشہ سچ کہتا ہوں۔

شاہ جی بیماری کے زمانہ میں بھی تبلیغ کے فریضہ کو نہ بھولے ہر آنے جانے والے سے ختم نبوت کی حفاظت کا عہد لیتے اور اپنی تکلیف کا ذکر نہ کرتے۔ مولیٰ کی دی ہوئی تکلیف کا خندہ پیشانی سے استقبال کرنا

ا۔ ملتان میں انگریز کے ٹوڈی گیلانی اور قریشی خاندان کے پیرانِ تسمہ پا نے شہر میں جلوس نکلوایا اور شاہ جی کو نہ صرف مادر زاد گالیاں بکیں بلکہ شجرۂ نسب دکھانے کا مطالبہ کیا اور قتل کی دھمکیاں بھی دیں۔ (مدیر)

صرف انہیں کا کام تھا کبھی ناشکری یا احساس تکلیف کا ایک لفظ بھی ان کی زبان سے نہ نکلا وہ ہمیشہ اپنے مولیٰ سے راضی رہے اور یقیناً مولیٰ بھی اُن سے راضی رہا وہ درجنوں محلے کی بیواؤں اور یتیموں کی پرورش فرماتے تھے محبت ووفا کے وہ پتلے تھے اور جس طرح کا تعلق جس سے تھا اسے آخر تک نبھانے کی کوشش فرماتے رہے۔

ایک دن ان کی محفل میں ایک شخص نے کہا کہ شورش کاشمیری نے "بوئے گل نالۂ دل" میں کسی کو معاف نہیں کیا۔ آپ نے فوراً فرمایا مجھے تو معاف کیا ہے۔ محفل کشت زعفران ہو گئی۔ پھر فرمایا! میرے بھائی شورش نے جتنی محنت کی ہے وہ میں جانتا ہوں وہ ساری ساری رات آنکھوں میں کاٹتا ہے دن رات محنت کرتا ہے۔ اللہ نے اس کی محنت کا اس کو اجر دیا ہے میرا دل ٹھنڈا ہے۔ اللہ اس کو اس سے اور زیادہ دے۔

اُن کی ذات میں جو ذاتی رشتہ تھا اس کے سوا بھی اُن کی شخصیت برصغیر پاک وہند کی جدوجہد آزادی میں س قدر اہم کردار اداء کر چکی ہے کہ اُن کی عظمت اور یاد ہمیشہ دلوں میں زندہ رہے گی۔

ابو سعید انور:

میں نے زندگی میں سید عطاء اللہ شاہ بخاری سے زیادہ مؤثر مقرر نہیں سنا۔ ایک بار دہلی میں گھر سے کچھ خریدنے کو جامع مسجد کے پاس بازار کو بھیجا گیا تو دیکھا کہ مسجد کے سامنے لال قلعے کے قریبی قطعے پر شامیانے لگے ہوئے ہیں، جلسہ ہو رہا ہے اور شاہ صاحب خطاب فرما رہے ہیں۔ سودا سلف بھول گیا اور سننے لگا۔ چھے گھنٹے کھڑا رہا شاہ صاحب ہنساتے رلاتے رہے۔ قرآن کریم کی ایسی دل کھینچ لینے والی تلاوت فرماتے کہ آدمی دنیا و مافیہا سے بے خبر اور بے نیاز ہو جاتا۔

زیڈ۔ اے۔ سلیری

میرے پلّے رتی بھر ایمان کی دولت جو ہے، اس کا ذرہ میرے قلب میں شاہ جی نے اور ظفر علی خاں نے ودیعت کیا تھا۔ میں اس جہاں میں بھی ان دونوں کی جوتیوں کا خادم اور اگلے جہاں میں بھی!

پروفیسر مرزا محمد منوّر

وہ جنگ آزادی کے عظیم سپاہی اور اسلام کے بہت بڑے مجاہد تھے قدرت نے انہیں علم وبیان کی نعمتوں سے نوازا تھا

فیلڈ مارشل محمد ایوب خان

شاہ جی اردو کے سب سے بڑے خطیب تھے' انہوں نے مرزائیت کے خلاف زبردست جدوجہد کی

ذوالفقار علی بھٹو

آج ہر گوشۂ گلزار میں ویرانی ہے

پھر مرے نغمۂ جذبات کی لَے ٹوٹ گئی
ساز روتے ہیں غزل زار میں ویرانی ہے

خاک سی اڑتی ہے اب وقت کے ویرانوں میں
عقل کے کوچہ و بازار میں ویرانی ہے

عشق پھر دست بہ دل خاک بہ سر بیٹھا ہے
آج پھر حسن کے بازار میں ویرانی ہے

جن کے لہجے میں خیالوں کی کھنک ہوتی تھی
اُن کے پیرایۂ اظہار میں ویرانی ہے

چند لمحوں کے لئے فصلِ وفا مہکی تھی
آج ہر گوشۂ گلزار میں ویرانی ہے،

اس نے پھولوں پہ رگِ جاں کا لہو چھڑکا تھا
تو نے وہ رنگ بھی اے دستِ صبا چھین لیا

کس نے پیراہنِ لیلائے چمن چاک کیا
کس نے کلیوں سے وہ اندازِ حیا چھین لیا

رہنماؤں نے دیا ہم کو وہ دستورِ حیات
جس نے مفہومِ رہ و رسمِ وفا چھین لیا

ہر نئے دور میں وہ ظلِ الٰہی ٹھہرا
جس نے جمہور کی محنت کا صلا چھین لیا

میں نے جب بھی ترے نغمات کی دھن چھیڑی ہے
میرِ محفل نے میرا سازِ نوا چھین لیا!

تجمل حسین دل

مولانا محمد یسین مدظلہٗ
نائب مہتمم جامعہ قاسم العلوم ملتان۔

باتیں ان کی یاد رہیں گی!

۹ مئی ۱۹۵۸ء کو سابق صدر سکندر مرزا ملتان آئے۔ ان کی خواہش تھی کہ شاہ جی انہیں گیلانیوں کی دعوت پر ملیں۔ انہوں نے مظفر علی شمسی کو شاہ جی کی خدمت میں بھیجا۔ مظفر علی شمسی نے جب اپنی آمد کا مدعا بیان کیا تو شاہ جی نے کہا شمسی! میں تمہارے کہے پر عمل نہیں کر سکتا۔ اگر مرزا صاحب میرے جھونپڑے پر آجائیں تو وہ بھی بلند ہو جائیں گے۔ اور میں بھی۔ لوگ کہیں گے صدر مملکت ایک درویش کی کٹیا میں گیا۔ اگر میں انہیں ملنے جاؤں تو اپنی عمر بھر کی کمائی برباد کر بیٹھوں گا۔ پھر مجھے اُن سے کوئی کام نہیں، انہیں کام ہے تو خود آجائیں۔ شمسی صاحب اپنا سا منہ لے کر چلے گئے اور سکندر مرزا کی یہ خواہش پوری نہ ہو سکی۔

الاٹمنٹ

شاہ جی نے امرتسر میں دو مکان چھوڑے تھے۔ جب پاکستان آئے تو عقیدت مندوں نے اصرار کیا کہ متروکہ مکانوں کی الاٹمنٹ کے لئے درخواست دیں مگر شاہ جی نے کہا بھائی! عمر بھر میں نے مالک حقیقی کے سوا کسی کے سامنے فدوی بن کر درخواست نہیں گزاری اب کون سی ایسی ضرورت ہے اپنے مالک سے منہ موڑ لوں۔ چنانچہ آپ نے کرائے کے ایک تین کمروں کے مکان میں اپنی بقیہ عمر گزاری۔

آمدنی

آپ اپنا راشن کارڈ بھی بنوانے پر رضامند نہیں ہوتے تھے۔ آخر ایک روز آپ کے ایک عزیز ترین عقیدت مند سلیم اللہ خان راشن کارڈ کا فارم لے آئے۔ سلیم اللہ خان مرحوم نے جب آمدنی کی بابت پوچھا تو آپ نے مسکرا کر یوں کہا "کبھی دھن دھنا، کبھی مٹی بنا، کبھی یہ بھی منع" آپکا ذریعہ معاش فقط ذات باری پر توکل تھا۔ آپ نے کبھی کسی عقیدت مند کے سامنے دست سوال دراز نہیں کیا۔ ایک دفعہ ایک فقیر نے دروازے پر صدا دی۔ شاہ جی نماز کے بعد دعا مانگ رہے تھے۔ اپنے رب حقیقی سے مخاطب ہو کر کہا میں تیرا سائل ہوں اور یہ تیرے بندوں کا سائل ہے۔ جب کبھی آپ سے کوئی واقف ایسا سوال کر بیٹھتا تو آپ عربی کا قطعہ پڑھ دیتے۔

لا تسئلن بنی آدم حاجتہً
واسئل الذی ابوابہ، لا تغلق،
واللہ یغضب ان ترکت سؤالہٗ
وبنوا آدم حسین یسئل یغضب

ترجمہ: آدم کی اولاد سے کوئی حاجت نہ مانگ۔ اس سے مانگ جس کے دروازے کبھی بند نہیں ہوتے۔ اللہ اُس وقت ناراض ہوتا ہے جب اُس سے تو مانگنا چھوڑے۔ اور اولاد آدم اس وقت غصے ہوتی ہے جب اُس سے کوئی مانگے۔

جیل

یہ ان دنوں کی بات ہے جب آپ کو دیناج پور جیل بھیج دیا گیا۔ آپ کے ساتھ مولانا ابوالکلام آزاد اور جمعیت العلمائے ہند کے چند رہنما بھی تھے۔ جیل کے دروازے پر وارڈ نے تلاشی لینی شروع کر دی۔ جیل میں سیاسی قیدیوں کے لئے روپے لے جانا سخت منع تھا۔ جن لیڈروں کے پاس رقم تھی انہوں نے واپس کر دی۔ شاہ جی کے پاس بھی ۲۶ روپے کی رقم تھی۔ انہیں جیل میں رقم کی اہمیت کا علم تھا۔ اس لئے ہر قیمت پر یہ روپے اندر لے جانا چاہتے تھے۔ ساتھیوں نے منع کیا مگر آپ باز نہ آئے۔ آخر تلاشی کرتے کرتے ان کی باری بھی آگئی۔ انہوں نے بڑے رومال کے پہلو میں روپے باندھ رکھے تھے وارڈر کے دیکھتے دیکھتے انہوں نے رومال اگلے قیدی کے کندھے پر ڈال دیا اور اپنے ہاتھ تلاشی دینے کے لئے بلند کر دیئے۔ اس طرح یہ ۶۲ روپے جیل میں پہنچ گئے۔ شاہ جی نے اس رقم سے سگریٹ خرید کر ان سیاسی قیدیوں میں تقسیم کر دیئے جو محض سگریٹ نہ ملنے کے باعث معافی مانگ کر رہا ہو جاتے۔

مولانا آزاد کی چائے

اسی جیل کا واقعہ ہے۔ ایک روز مولانا آزاد نے بڑے اہتمام سے چائے بنائی۔ اور شاہ جی کو پیش کی۔ شاہ جی نے چائے پی لی اور چپکے ہو رہے۔ مولانا آزاد اپنی چائے کی تعریف کرانے کے معاملے میں بڑے حریص واقع ہوئے تھے اور یہ تعریف ان کی بڑی کمزوری تھی۔ شاہ جی کو چپکا دیکھ کر انہوں نے خود کہا "میرے بھائی! چائے کیسی رہی؟ شاہ جی بولے کہ ایک چیز کی کمی تھی۔ مولانا آزاد کا ماتھا ٹھنکا اور چہرے پر شکنیں آگئیں۔ فرمانے لگے وہ کیا میرے بھائی؟ شاہ جی نے کہا اس میں زعفران نہیں ہے۔ مولانا نے اطمینان کا سانس لیا اور فرمایا ہاں میرے بھائی! پھر وعدہ کیا کہ اگلے روز مزعفر چائے پلائیں گے۔ دوسرے روز زعفران سے معطر چائے تیار تھی مگر عین اس وقت سپرنٹنڈنٹ دور سے آتا دکھائی دیا۔ مولانا بڑے گھبرائے کیونکہ جیل کے ضوابط کے مطابق دو طرح سے مجرم تھے ایک یہ کہ انہیں مولانا کے پاس آنے کی اجازت نہیں تھی وہ وارڈر کو جل دے کر ان تک پہنچے تھے۔ دوم یہ کہ چائے کا لطف اٹھایا جا رہا تھا۔ آخر مولانا اٹھے اور دور جا کر ان کا نہایت خندہ پیشانی سے استقبال کیا۔ سپرنٹنڈنٹ کے لئے یہ بہت بڑا اعزاز تھا۔ وہ پھولا نہ سمایا اور مولانا سے باتیں کرتا ہوا دوسری جانب چلا گیا۔ ادھر شاہ جی مزے سے چائے پیتے رہے۔

باخبر از مقام آدمی!

ایک دفعہ سید عبدالحمید عدم آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے آپ کافی دیر تک عدم کا کلام سنتے رہے اور دل کھول کر داد دیتے رہے۔ عدم کے جانے کے بعد ایک عقیدت مند نے کہا کہ "قبلہ یہ شاعر شراب پیتا ہے" آپ کے چہرے پر رنج سے شکنیں ابھر آئیں۔ اور کبیدہ خاطر ہوگئے۔ آپ نے کہا "تم نے اپنی آنکھوں سے انہیں شراب پیتے دیکھا"۔ وہ بولا ہاں اس پر آپ نے کہا کہ "درگزر اور چشم پوشی ربانی صفت ہے اس لئے تم بھی چشم پوشی سے کام لیا کرو"

محلے کے ایک شخص پر قتل کا الزام لگا۔ اس کا کردار بھی اچھا نہیں تھا۔ شاہ جی ہمیشہ اس سے شفقت سے پیش آیا کرتے تھے۔ آپ کہا کرتے تھے کہ "مجھے بزدل جھوٹے اور چور سے سخت نفرت ہے ان دو کے سوا میں نے کبھی کسی کی برائی نہیں چاہی۔ البتہ مرزائی اور انگریز اس زمرے میں نہیں آتے۔ ان دونوں کا میں نے برا چاہا بھی ہے اور برائی کی بھی ہے۔ بزدل کے بارے میں فرمایا کرتے تھے کہ بزدل کے ساتھ قبر بھی نہ بنے کم بخت جلے گا تو آنچ آئے گی"۔

ڈاکٹر تاثیر

ہم عصر شاعروں میں سے آپکو تاثیر سے خاص انس تھا۔ آپ ہمیشہ ان کی غیر ملکی بیوی کو بیٹی کہہ کر پکارا کرتے تھے۔ بیگم تاثیر آپ کا بڑا احترام کرتی تھیں۔ حتیٰ کہ آپ کو تعجب ہونے لگا۔ ایک دن اپنے اسی تعجب کا اظہار ڈاکٹر تاثیر سے کیا۔ تو تاثیر نے جواب دیا شاہ جی یہ جس ملک کی رہنے والی ہے وہاں بہو بیٹی کا سا مقام نہیں دیا جاتا۔ ۱۹۴۶ء میں کرپس مشن کی ہندوستان آمد کے موقع پر دہلی سیاسی سرگرمیوں کا مرکز بنا ہوا تھا۔ اُن دنوں شاہ جی بھی دہلی میں ہی مقیم تھے۔ ڈاکٹر تاثیر سرکاری ملازم تھے۔ شاہ جی کو اپنے گھر لے گئے دیر تک ملاقات رہی پھر اپنے ہاتھ سے شاہ جی کی ڈائری پر درج ذیل اشعار لکھے:

دل است بندۂ احرار و جاں اسیرِ فرنگ
نہ چارۂ ہمہ صلح نہ بہرۂ ہمہ جنگ
میان کعبہ و بت خانہ عرصہ یک گام
میان شیخ و برہمن ہزارہا فرسنگ
نمود سر بسر اظہار و کوہ کنی یک تن
ہزار پیکر شیریں فسردہ رارگِ سنگ

ایک جلسہ

مراد آباد میں سائمن کمیشن کی رپورٹ کے خلاف ایک جلسہ تھا۔ جس میں شاہ جی کے علاوہ پنڈت نہرو

کے والد موتی لال نہرو، سید محمود اور دیگر معزز لیڈر شامل تھے۔ سائمن کمیشن کی سفارشات ایک خاص ٹیکنیکل مسئلہ تھا۔ شاہ جی کو آخر میں تقریر کرنی تھی۔ شاہ جی نے محسوس کیا کہ جو کچھ مجھے کہنا تھا یہ حضرات کہہ چکے ہیں۔ زندگی میں پہلی بار شاہ جی کو پریشانی کا احساس ہونے لگا کہ آخر وہ کھڑے ہو کر کیا کہیں گے۔ اب سوائے اس کے چارہ کار کیا تھا کہ وہ اپنی تقریر کو ان جملوں کے ساتھ ختم کر دیں "حاضرین اس موضوع پر میں جو کچھ کہنا چاہتا تھا وہ مجھ سے پہلے کہا جا چکا ہے۔ لہٰذا میں شکریے کے ساتھ اجازت چاہتا ہوں مگر یہ تو اظہار شکست تھا۔ آخر بادل نخواستہ شاہ جی مائیک کا سہارا لے کر اٹھے۔ جب کھڑے ہوئے تو دیکھا سامنے کچھ لوگ سائمن کا جنازہ لئے کھڑے ہیں۔ آپ کے منہ سے بے ساختہ غالب کا شعر نکل گیا

ہوئے مر کے ہم جو رسوا ہوئے کیوں نہ غرق دریا
نہ کہیں جنازہ اٹھتا نہ کہیں مزار ہوتا

یہ شعر کہنا تھا کہ حاضرین پر جذب کی کیفیت طاری ہو گئی۔ کافی دیر تک آہ و فغاں کا شور بلند ہوتا رہا۔ یہ شعر لوگوں نے کئی بار سنا ہو گا مگر بخاری کی زبان میں کچھ اور رس تھا۔ یہ حالت دیکھ کر موتی لال نہرو پکار اٹھے۔ ارے ارے ارے! شاہ جی غضب کے آدمی ہو۔ کیا ہو گیا لوگوں کو۔

وہ ہوا کو روک کر اس سے روانی اور سمندر کو ٹھہرا کر اس سے طغیانی لیتے ہیں۔ شاہ جی وہ آگ ہیں جو دشمنوں کے نشیمن پھونکتی اور دوستوں کے چولہے جلاتی ہے۔

مہاتما گاندھی

شاہ صاحب، آپ ہندوستان کے دل کی آواز ہیں۔ کانگریس ستیہ گرہ کی کامیابی صرف آپ سے وابستہ ہے۔

موتی لال نہرو

ان کی وفات سے اردو خطابت کا تاج محل ڈھے گیا ہے اور زمانہ ایک ایسی شخصیت سے محروم ہو گیا ہے جس کا وجود اس برِ عظیم کیلئے ایک عظیم عطیہ تھا۔ تاریخ ان کے مقام کا ضرور فیصلہ کرے گی لیکن ہمارے دل ان کے مقام کا تعین کر چکے ہیں کہ ان کی رحلت سے آنکھیں اشک بار ہیں۔ نجانے اب ان سے کہاں ملاقات ہو گی۔

جواہر لال نہرو۔

وہ ان چند بے خوف شخصیتوں میں سے ہیں جن کے لئے میرا دل ہمیشہ بے پناہ احترام کے جذبات سے معمور رہا ہے

بھیم سین سچر

وہ تاریخ آزادی کے ایک بہادر، نڈر مجاہد بیباک اور حق گو شخصیت کے مالک ہیں

دیوان سنگھ مفتون

مولانا محمد یسین مدظلہ
نائب مہتمم جامعہ قاسم العلوم ملتان

وہ اکثر یاد آتے ہیں۔

ایک دفعہ ان کے سامنے کسی نے خواجہ حافظ کی مشہور غزل کے یہ چند اشعار پڑھے

نہ ہر کہ چہرہ برا فروخت دل بری داند
نہ ہر کہ آئینہ سازد سکندری داند
نہ ہر کہ طرف کلہ کج نہاد و تند نشست
کلاہ داری و آئین سروری داند
ہزار نکتۂ باریک تر زمو اینجا است
نہ ہر کہ سر بہ تراشد قلندری داند

فرمایا کہ یہاں خواجہ حافظ رہ گئے اور حزیں بنارسی بہت آگے نکل گئے ہیں۔ پھر حزیں کے حسبِ ذیل اشعار پڑھے:

نہ ہر کہ طبل و علم ساخت سروری داند
نہ ہر کہ تاخت بہ لشکر سکندری داند
خیال سایہ نشینان قد یار جدا است
وگرنہ ہر شجرے سایہ گستری داند
علو فطرت و طبع رسا خدا داد است
نہ ہر گیا ہے کہ روید صنوبری داند
زہر دہان و لب نکتہ دل نشیں نہ شود
نہ ہر کہ خطبہ بخواند پیغمبری داند

حضرت مولانا شاہ عبدالقادر رائے پوری رحمہ اللہ کی خدمت میں حاضر تھے راقم کو بھی رفاقت کا شرف حاصل تھا۔ شیخ محمد اکرام کا "ارمغان پاک" دیکھا فرمایا ذرا شعرا کی فہرست پڑھو، راقم نے حزیں بنارسی کا نام پڑھا تو کہا اس کا منتخب کلام سنائیے۔

راقم نے حزیں کا سارا کلام جو ارمغان پاک میں منتخب تھا سنایا فرمایا "جس شخص نے حزیں کے کلام کا انتخاب کرتے وقت حسب ذیل اشعار نظر انداز کر دیئے ہیں۔ اس نے چنداں انصاف نہیں کیا ہے بہرحال اپنا اپنا ذوق ہے،

پھر یہ اشعار سنائے۔

حلالم بادمستی ہا مبارک سینہ چاکی ہا
قدح پیمودہ و گل در گریباں کردہ می آید

حزیں امشب نگاہ رہزن میغا نہ پردازش
زمستی تکیہ ہر جانب بہ مژگاں کردہ می آید

پھر حزیں کے لوح مزار کے حسب ذیل اشعار سنائے

زباں دان محبت بودہ ام دیگر نمی دانم
ہمی دانم کہ گوش از دوست پیغامے شنید ایں جا
حزیں از پائے رہ پیما بسے سرگشتگی دیدم
سر شوریدہ برہالین آسائیش رسید ایں جا

یہ تو قلندر کی ایک بات تھی۔ اب سالک کی سنیئے یعنی نظام الدین اولیا کی:

شرط است کہ باامر خدا دم نہ زنی
کیں نوع کہ گفتی نہ تو مردی نہ زنی
گِل را چہ مجال است کہ پرسد زکلال
از بہر چہ سازی و چرامی شکنی

بیماریوں کے ہجوم اور مصائب کی یلغار میں اس کوہ استقامت کے معتقدات میں ادنیٰ لغزش بھی رونما نہ ہوئی، ہر مزاج پرسی کرنے والے کو خندہ پیشانی سے الحمدللہ کہہ کر جواب دیتے فرماتے "ہاں بھائی! الحمدللہ نہ کہوں تو اور کیا کہوں۔ اس سے بدتر حالت بھی تو ہو سکتی ہے اور میں تو ادھر سے شر کا قائل ہی نہیں ہوں، کوئی اللہ تعالیٰ ہمارے دشمن یا شریک ہیں جو ہمیں شر اور ایذا پہنچائیں، ادھر تو خیر ہی خیر ہے، صرف ہمارا استعمال بعض چیزوں کو شر بنادیتا ہے وہاں تو خیر ہی خیر ہے، وہ جو کچھ ہمارے لئے کرتے ہیں بہتر ہوتا ہے اگرچہ وہ ہمارے فہم سے بالاتر کیوں نہ ہو"

اس کے بعد ایک مجذوب کا واقعہ ارشاد فرمایا کہ ان کی خدمت میں ایک رئیس حاضر ہوا اس نے عرض کیا "حضرت کچھ پریشانیاں ہیں دعا کرو" حضرت مجذوب نے فرمایا "یہی پریشانیاں کہ خدا آپ کی بات نہیں مانتا یعنی جو کچھ آپ چاہتے ہیں وہ نہیں ہوتا۔ تو آپ اس کی بات مان لیجئے وہ اس کے زیادہ لائق ہے پریشانیاں دُور ہو جائیں گی۔ مصیبتوں کا خاتمہ ہو جائے گا۔ بھائی اس کے سوا چارہ نہیں۔ الحمدللہ کہنے ہی میں خیر ہے۔ حضرت قلندر پانی پتی نے اس مسئلہ پر اعتراض کیا تو حضرت نظام الدین اولیاء نے کیا خوب جواب دیا۔

گہے راست کند او صورت مردی و زنی
گہہ بشکند جامۂ جاں راز تنی
کس نیست کہ پرسد استاد قضا را
از بہرچہ سازی و چرامی شکنی

فرمایا میری دوستی اور دشمنی ایک دفعہ ہوتی ہے۔ اگر ایک دفعہ دوست سے گزند پہنچ جائے یا کوئی دوست بن کر مکاریوں اور فریب کاریوں کا ہدف بنائے۔ تو عمر بھر اس پر کبھی اعتماد نہیں کیا۔

"چناں رویم کہ دیگر بگردِ ما نرسی"

یہ بلیغہ فرابیہ کے شعر کا دوسرا مصرعہ ہے مکمل شعر یہ ہے۔

شدیم خاک رہت گر بہ دردِ ما نرسی
چناں رویم کہ دیگر بگردِ ما نرسی

کسی ایک اور محفل میں جب اپنے اس نظریہ کا اظہار فرمایا تو ارشاد ہوا

دل نیست کبوتر کہ پرد باز نشیند
از گوشہ ہامے کہ پریدیم پریدیم

ما بخیر شما بہ سلامت۔ بس اسے کنارہ کشی سمجھئے یا دشمنی، میری طرف سے صرف اتنا ہوتا ہے، الحمد للہ کہ میں نے آج تک نہ کسی کے متعلق برا سوچا ہے اور نہ برا کیا ہے۔ انگریز اور مرزائی کے سوا، جہاں تک بس چلا ان کے متعلق برا سوچا بھی اور کیا بھی"!

"عمر بھر ان پر کبھی اعتماد نہیں کیا" اس فقرے کو بڑے زور دار لہجے میں فرما رہے تھے، راقم نے چھیڑنے کی غرض سے کہا کہ "کمال ضد ہے" تو فرمایا ارے جاہل ضد نہیں یہ ایمان ہے حدیث میں کیا پڑھا ہے؟

لایلدغ المومن من حجر واحد مرتین

"مومن ایک سوراخ سے دو دفعہ ڈنگ نہیں کھاتا"۔

فرمایا لوگ تعجب کرتے ہیں کہ میں کہاں سے کھاتا ہوں؟ ہائے اصغر کس وقت یاد آ گئے

میں رند بادہ کش بھی بے نیاز جام و ساغر بھی
رگ ہر تاک سے آتی ہے کھنچ کر میری قسمت کی

میرا تو ہمیشہ خدا کی دستگیری پر ہاتھ رہا ہے، میرا رزق میرے پیچھے دوڑتا ہے، کبھی قبول کرتا ہوں اور کبھی رد کرتا ہوں، میں تو اپنے اللہ کا کوڑھی ہوں، مجھے وہ صرف رزق دیتا ہی نہیں بلکہ میری ٹھوڑی سے پکڑتا ہے اور میرے منہ میں ڈالتا ہے

بے مگس ہرگز نہ باشد عنکبوت
رزق را روزی رساں پر می دہد

دنیا میں چار قیمتی چیزیں محبت کے قابل ہیں۔ مال، جان، آبرو، ایمان، لیکن جب جان پر کوئی مصیبت آئے تو مال قربان کرنا چاہیے اور آبرو پر کوئی آفت آئے تو مال اور جان دونوں کو۔ اور اگر ایمان پر کوئی ابتلا آئے تو مال، جان اور آبرو سب کو قربان کرنا چاہیے اور اگر ان سب کے قربان کرنے سے ایمان محفوظ رہتا ہے تو یہ سودا سستا ہے

فرمایا "شریف کبھی بزدل نہیں ہوتا، کمینہ کبھی بہادر نہیں ہوتا۔ کمینے پر جب کوئی ابتلا آتی ہے تو دشمن کے سامنے ایڑیاں رگڑتا ہے اور شریف۔ جب دشمن اس کے قابو میں آتا ہے تو اسے معاف کردیتا ہے اور نہ ماضی کے کسی واقعہ پر اسے مطعون ہی کرتا ہے میاں (وہ اپنی زبان میں حضور ﷺ کو میاں کے نام سے پکارتے) کی شرافت اور بہادری دیکھئے جب حضرت عمرؓ نے ایمان لانے کے بعد عرض کیا حضرت کعبہ میں کیوں نماز نہیں پڑھتے؟" تو فرمایا

"تیری قوم نہیں پڑھنے دیتی"

حالانکہ کعبہ میں نماز پڑھنے سے رکاوٹ تو حضرت عمرؓ تھے مگر یہ نہیں فرمایا کہ آپ نہیں پڑھنے دیتے تھے، سبحان اللہ، سبحان اللہ کیا شرافت ہے"

اس کے بعد چند کمینے سیاسی لیڈروں کا ذکر آیا اور چند کمینہ صفت صحافیوں کا جو لوگوں کے ماضی کے بخیئے ادھیڑتے ہیں اور بزعم خویش اسے حب الوطنی خیال کرتے ہیں، چنانچہ اسی مناسبت سے مندرجہ ذیل اشعار پڑھے:

خونے کہ مشک گشت دلش می شود سیاہ
زاں سفلہ کن حذر کہ بہ دولت رسیدہ است
غنی

انار دانہ پختہ شود بکنداند پوست را
کمینہ گر بزرگ شود برنجاند دوست را
صائب

نہ ہر کہ صدر نشیند عزیز شد کہ غبار
اگر بدیدہ فتد طوطیہ طیا نخواہد بود
یحییٰ

سفلۂ خوش پوش را برمسند خود جا دہ
کفش گر زریں بود برسرنمی باید نہاد
یحییٰ

اس عالم کی بے ثباتی اور ناپائیداری حیات کے متعلق حضرت کے ملفوظات نہایت دلچسپ اور علمی ہوتے تھے، اس موضوع پر غالب ان کا بڑا معاون ثابت ہوتا، راقم نے مختلف مجلسوں میں اس موضوع پر حسب ذیل اشعار سنے

ہستی کے مت فریب میں آجا ئیو اسد
عالم تمام حلقہ دامِ خیال ہے

مصرعہ ثانی کو کچھ اس رنگ سے پڑھتے کہ کائنات کا ایک ایک ذرہ اسیرِ دام خیال ہو جاتا

ہاں کھائیو مت فریب ہستی
ہر چند کہیں "ہے" کہ نہیں ہے

دوسرے مصرعہ میں جس نفی و اثبات کا ذکر ہے اس کے پڑھنے میں ایک عجیب سماں پیدا کرتے۔

جزنام نہیں صورتِ عالم مجھے منظور
جزو ہم نہیں ہستیِ اشیا مرے آگے

یہ حیات دنیوی ان کے نزدیک مرگ کا درجہ رکھتی تھی۔ انہوں نے اپنے کلام میں بھی اس طرح ذکر کیا ہے "مردیم ورد انتظار مرگیم" فرماتے یہ کوئی حیات ہے لاحول ولاقوت، ہمیں تو اس حیات کے مسئلہ میں ابو طالب کلیم کی تعبیر پسند ہے۔

بدنامی حیات دو روزے نبود بیش
واں ہم کلیم باتو چہ گویم چساں گزشت
یک روز صرف بستنِ دلِ شد باین واں
روز گر بکندنِ دل زین و آں گزشت

کلیم نے حیات نہیں کہا بلکہ تہمت حیات سے تعبیر کیا ہے"

اپنی نشست گاہ میں تشریف فرما تھے، ان دنوں روس کے مصنوعی سیارے فضا میں پرواز کر رہے اور اشتراکی مبلغ لوگوں کو یہ باور کراتے پھر رہے تھے کہ از روئے مذہب اسلام آسمان پر کوئی نہیں جاسکتا ہے۔ حضرت مرحوم کے سامنے کسی نے اس کا ذکر کیا تو حضرت نے ارشاد فرمایا:

ہم تو انسان کے اعلیٰ علیین تک پہنچنے پر ایمان لائے بیٹھے ہیں، یہ چاند اور ستارے تو راستے میں ہیں۔ لیکن مجھے اس کامیابی (فضائی تسخیر) پر کوئی مسرت ہے نہ تعجب، ہم تو تب مانیں گے جب یہ موت کا کوئی علاج کر دکھلائیں اور کسی آدمی کے متعلق یہ فیصلہ کر دیں کہ اب وہ نہیں مرے گا تو پھر میں انہی کو سجدہ کرلوں گا۔

مدت سے لئے پھرتا ہوں اک سجدۂ بے تاب
ان سے کوئی پوچھے وہ خدا ہیں کہ نہیں ہیں

کبھی کبھی اپنے احوال کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے:

شادم کہ از رقیباں دامن کشاں گزشتی
گومشتِ خاک ماہم برباد رفتہ باشد

شاہ جی کی قرآن کریم سے شیفتگی اور والہانہ محبت کا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے کہ آپ استثنائی صورتوں میں قرآن مجید کے علاوہ کسی دوسری کتاب کے پڑھنے کی ضرورت محسوس نہ کرتے آپ کا عقیدہ تھا کہ میرے لئے جو کچھ ہے قرآن مجید میں موجود ہے۔ اگر آج دنیا قرآن کو چھوڑ کر دوسری کتابوں پر نگاہ

کر سکتی ہے۔ تو میں دوسری کتابوں سے روگردانی کر کے صرف کتاب الہیٰ پر اپنی توجہ کیوں نہ مرتکز کروں، میں تو قرآن کا مبلغ ہوں میری باتوں میں اگر کوئی تاثیر ہے تو وہ صرف قرآن کی۔

خواجہ غلام فرید رحمتہ اللہ علیہ کے ایک جولاہے مرید کا واقعہ ارشاد فرمایا کہ وہ ہر سال حضرت خواجہ کی خدمت میں ایک لنگی ہدیہ لایا کرتا تھا۔ ایک سال ناغہ کرنے کے بعد دوسرے سال دو لنگیاں ہدیہ لایا، حضرت نے گزشتہ سال غیر حاضری کا سبب پوچھا تو اس نے عرض کیا کہ گزشتہ سال لنگی مکمل نہیں ہوسکی تھی۔ اس لئے حاضر نہ ہوسکا، تو فوراً حضرت نے لنگیوں کو آگ لگوادی اور فرمایا

"جھڑمی شئے یار کنوں نکھیڑے اونکوں بھالا"

"یعنی جو چیز یار سے جدا کرے اسے آگ لگا دو"۔ میں بھی یہی کہتا ہوں جو چیز مجھے قرآن سے جدا کرے اسے آگ لگادو۔

چوں غلامِ آفتابم ہمہ ز آفتاب گویم
نہ شبنم نہ شب پرستم کہ حدیث خواب گویم
ماقصہ سکندر و دارا نخواندہ ایم
از ما بجز حکایت مہر و وفا پرس

شاہ جی کے ایک عقیدت مند عالم دین حج بیت اللہ کا فریضہ ادا کر کے ملاقات کے لئے حاضر ہوئے۔ وہ اپنے پاکیزہ سفر کے تاثرات بیان کر رہے تھے۔ دوران گفتگو انہوں نے ایک حدیث کا یہ مفہوم بیان کیا کہ جب تک حج بیت اللہ کا سلسلہ جاری ہے اس وقت تک قیامت نہیں آئے گی، حج و طواف جب لوگ چھوڑ دیں گے تو دنیا نیست و نابود ہوجائے گی" اس حدیث کے بعد حضرت شاہ جی نے رشید الدین وطواط کا حسب ذیل شعر پڑھا۔

از صد سخنِ پیرم یک نکتہ مرا یادست
عالم نشود ویراں تا میکدہ آبادست

اوصافِ حمیدہ اخلاق عظیمہ کا مجسمہ تھے۔ اپنی شخصیت کو ابھارنے کا خیال تک نہ لاتے ہمیشہ دوسروں کے محاسن کا بڑی فراخ دلی سے اعتراف کرتے، خود بینی سے احتراز فرماتے، اکثر کہا کرتے، میں تو گندگی کا ڈھیر ہوں، اللہ میاں نے سفید چادر ڈال کر اوپر عطاءاللہ لکھ دیا ہے۔ ارے بھائی ہم دوسروں کے عیب کیا دیکھیں، ہمیں تو اپنے عیبوں سے فرصت نہیں ملتی۔

ہم نے مجنوں پہ لڑکپن میں اسد
سنگ اٹھایا تھا کہ سر یاد آیا

دوسروں کے عیب تلاش کرنا کوئی آدمی کا کام ہے۔ حضرت شیخ سعدی دو باتوں میں دین کا خلاصہ ذکر کر گئے ہیں۔

مرا پیر دانائے مرشد شہاب
دو اندرز فرمود برروئے آب
یکے آن کہ برغیر بد بیں مباش
دگر آں کہ برخویش خود بیں مُباش

سادہ طریق زندگی حضرت مرحوم کو بے حد پسند تھا۔ اسباب کی فراوانی اور تکلفات کے بندھنوں کو قہر خداوندی سے تعبیر کرتے، افرنگی صوفے، ایرانی قالین " انہیں لہو رلاتے، حجاج کرام سے جب عربوں کے عیش و عشرت کے واقعات سنتے تو بے حد افسوس کا اظہار کرتے اور اپنی گرجدار آواز میں فرماتے "کروڑ لعنت ہو اس رحم پر جہاں سے فرنگی کا نطفہ ڈھل کر آتا ہے۔ دیکھو عربوں کو کس کثرت سے اسباب عیش و تنعم فراہم کر رہا ہے۔ تاکہ یہ مشکل پسند شتربان کسی کام کے نہ رہیں"

عیش کوشی، آرزوؤں کا ہجوم، کثرتِ حاجات خدا سے بُعد کے اسباب شمار فرماتے۔ ایک دفعہ میر کا یہ شعر۔

سراپا آرزو ہونے نے بندہ کردیا ہم کو
وگرنہ ہم خدا تھے گر دل بے مدعا ہوتے

پڑھتے ہوئے فرمایا کہ حاجتیں جس قدر کم ہوتی ہیں بندہ خدا کے قریب ہوتا جاتا ہے اور کوئی حاجت نہ ہو تو خدا ہے۔

اپنے بارے میں ارشاد فرمایا کہ اگر میرے ساتھ بیوی بچوں کا دھندا نہ ہوتا تو میں کسی دریا کے کنارے خاک و خس کی کٹیا میں زندگی گزارتا، وقتِ ضرورت اعدائے دین، دشمنان اسلام پر حملہ آور ہوتا اور پھر اپنی کٹیا میں آ پناہ لیتا"

اس کے بعد جمالی، ابن یمین، احمد رضا کے چند اشعار سنائے جنہیں طوالت کے پیش نظر چھوڑ رہا ہوں۔ صرف جمالی کے اشعار عرض ہیں۔

لنگکے زیرو لنگکے بالا
نے غم و زرد و نے غم کالا
گزکے بوریا و پوستکے
دلکے درد مند و دوستکے
ایں قدر بس بود جمالی را
عاشقِ رند لا ابالی را

ایک عقیدت مند حضرت کی خدمت میں حاضر ہوا، وہ کہیں ملازمت کا امیدوار تھا، اس نے اپنی آمد کا مقصد عرض کیا اور ایک آفیسر کے نام سفارشی مکتوب کی خواہش کا اظہار کیا، جواباً شاہ جی نے فرمایا:

" بھائی میں تو نوکریاں چھڑانے والا پیر ہوں، اگر ملازمت کے لئے کسی سفارش کی ضرورت ہے تو کسی

سجادہ نشین یا کسی مخدوم یا کسی بڑے لیڈر کے پاس جاؤ، ہماری آشنا نوازی کا یہ عالم ہے کہ اگر آپ کہیں ملازم ہوں اور آپ کے اعلیٰ افسر کو معلوم ہو جائے کہ یہ عطاءاللہ شاہ کا ملنے والا ہے تو فوراً آپ پر کوئی آفت ٹوٹ پڑے گی۔ اور آپ ملازمت سے سبکدوش ہو کر آرام سے گھر میں بیٹھے ہوں گے۔

اس کے بعد ارشاد فرمایا کہ میرا رشتہ میں پھوپھی کا بیٹا فوج میں بھرتی ہو گیا، میں اس کی خالہ کو ملنے کے لئے گیا جو میرا بھانجا نہیں تھا رشتہ کی پھوپھی کا بیٹا تھا والدہ فوت ہو چکی تھیں خالہ نے پالا تھا۔ وہ اپنے بیٹے کے غم میں رو رہی تھی میں نے اسے کہا دیکھو پھوپھی اگر تیرا بیٹا ہفتے کے اندر واپس آوے تو میرا کیا انعام؟ کچھ انعام طے پا گیا۔ میں نے اسی روز اس کو ایک خط لکھا (وہ اس وقت بنگال کی کسی چھاؤنی میں تھا)

"عزیزم: آپ بڑی مناسب جگہ پہنچ گئے ہیں اپنے کام کی رفتار سے مجھے مطلع کرتے رہنا وغیرہ وغیرہ"

نیچے میں نے دستخط کئے

سید عطاءاللہ شاہ بخاری

خط سنسر ہو کر اس یونٹ کے انگریز کرنل کو پہنچا۔ اس نے فوراً میرے بھائی کو بلایا اور پوچھا کون ہے عطاءاللہ شاہ؟" اس نے بتایا تو کرنل نے اسے واپس نہیں جانے دیا بلکہ اس کا سامان وغیرہ منگوا کر فوراً چھاؤنی سے نکل جانے کا حکم دیا"

اس کے بعد سفارشی مکتوب لینے والے کو فرمایا بھائی ہمارا نام تو اس کام کے لئے ہے اگر کہیں ملازم ہو جاؤ تو پھر میری خدمات حاضر ہیں۔

اے ہم نفساں آتشم از من بگریزد
ہر کس کہ شود ہمرہ ما دشمن خویش است

✻

شاہ جی ویدوں اور اپنشدوں کے زمانے کے رشی ہیں ان کی شکل "والمیک رشی" کی لاہور کے عجائب گھر میں رکھی ہوئی تصویر سے مشابہ ہے آواز میں ان کی گنگا کی پوترتا اور جمنا کی سندرتا ہے۔ (۱۹۲۹ء)

پون کمار لاہوری (ہندو قلم کار)

شہداءِ ختم نبوت

میں کہتا ہوں کہ جب تک احرار زندہ ہیں جھوٹی نبوت نہیں چلنے دیں گے۔ جب بھی کوئی کذاب سر اٹھائے گا صدیق اکبرؓ کی سنت جاری کی جائے گی۔

ماضی میں احرار کی بے پناہ جدوجہد، جانکاہ محنت و ایثار اور ہماری برپا کردہ تحریک "تحفظ ختم نبوت" میں ہزاروں جوانان گل گوں قبا، سرخ پوشان راہ بقا اور سرمستان عہد و وفا کی قربانی و شہادت احرار کے اخلاص کی زندہ مثال ہے۔

جو لوگ تحریک "تحفظ ختم نبوت" میں جہاں تہاں شہید ہوئے ان سب کی ذمہ داری مجھ پر ہے اور جو آئندہ ہوگا اس کی بھی۔ شہداء ختم نبوت کے لئے میں کیا دعا کروں؟ دعا تو یہ ہے کہ انکے صدقے میں ہمارا ایمان بچ جائے۔ (آمین)

یاد رکھو!

میں تو زندہ نہیں رہوں گا مگر تم دیکھو گے کہ شہداء ختم نبوت کا خون بے گناہی رنگ لا کر رہے گا۔

تلخیص خطاب

امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاری

راولپنڈی

۱۹۵۴ء

وہ ایک مومن جو لطف احمد کی برکتوں سے قمر بنا تھا

فضا کے سینے پہ خونی کرگس کے تیز پنجے مچل رہے ہیں
چراغ علم و عمل کی لو سے دھوئیں کے بادل اُبل رہے ہیں
کہ آج احرار کا نگہباں جو تخت عملی پہ تھا فروزاں!
حیات فانی سے ہو کے گریاں سدھارا سوئے جہانِ یزداں
وہ ایک عالم جسے جہاں نے خراج تحسیں ادا کیا تھا

وہ ایک مومن جو لطفِ احمد کی برکتوں سے قمر بنا تھا
وہ ایک رہبر کہ جس کی نظروں میں ساری دنیا تھی کوزۂ گل
وہ اک معلم کہ جس کے صدقے میں رہنوردوں نے پائی منزل
وہ اک مفسر دلوں سے جس نے نکالے شبہاتِ نود میدا
وہ اک مقرر کہ جس کے طرزِ بیاں میں شعلوں کا سوز پیدا
اسی چراغ سر بہ پہلو کے غم میں عالم یہ رو رہا ہے!
مگر وہ ہادِ فضا سے بجھ کر زمیں کے پہلو میں سو رہا ہے

فانی مراد آبادی

مولانا محمد یسین
نائب مہتمم قاسم العلوم ملتان

از شاخ جنوں فتادہ بر گیم

شاہ جی کی صحبت میں گذرے ہوئے حسین لمحات میری زندگی کا سب سے قیمتی سرمایہ ہیں گذشتہ بارہ سال سے راقم الحروف نے شاہ جی کے بے شمار کمالات و خصوصیات کو دیکھا اور ان ہی خصوصیات کی وجہ سے شاہ جی ہر طبقہ کے مقبول و محبوب تھے شاہ جی کے کرائے والے کچے مکان کی بوسیدہ دری اور شکستہ چٹائی پر اعاظم رجال بیٹھنے میں فخر محسوس کرتے بڑے بڑے رؤساء، وزراء، علماء، شعراء، صوفیاء اس مرد قلندر کی بارگاہ میں حاضر ہوتے، کبھی محفل شعر و سخن گرم ہوتی تو ایسے معلوم ہوتا کہ کوئی محفل مشاعرہ ہے۔ خدا نے بے پناہ حافظ کی قوت عطا کی تھی ایک ہی مجلس میں سینکڑوں اساتذہ کے منتخب معیاری اشعار پڑھ دیتے۔ تصوف کے رموز و اسرار بیان فرماتے تو یہ بھی ڈیوڑھی (شاہ جی اپنی نشست گاہ کو ڈیوڑھی کے نام سے یاد کرتے تھے) ایک بہت بڑی خانقاہ میں تبدیل ہوجاتی۔ علماء کے سامنے جب اپنے ذوق کے مطابق قرآن کریم کی آیات کا ترجمہ کرتے تو معلوم ہوتا شاید کسی عربی درس گاہ میں قرآن کریم کی تفسیر کا درس شروع ہے۔ ظرافت کے پھول بکھیرتے تو محفل کشت زعفران بنادیتے القصہ بہت سی متضاد خوبیوں کا ایک حیرت انگیز مجموعہ تھے۔

و لیس علی اللہ بمستنکر
ان یجمع العالم فی واحد

ترجمہ: اللہ پر کوئی مشکل نہیں کہ تمام عالم کو ایک شخص میں جمع کردے۔

محبوبیت و مقبولیت کا بارہا یہ عالم دیکھا کہ بلند پایہ شعراء بھی شاہ جی کی لب کشائی کے لئے بے تاب ہیں اور علماء و صوفیاء بھی جنبش لب کے منتظر ہیں۔

حکیم محمد حنیف اللہ صاحب کے مطب پر تشریف آوری کا روزانہ معمول تھا۔ کبھی ایسا ہوتا کہ راستے میں ضعف و ناتوانی کا شکوہ کرتے اور فرماتے مولوی یسین پاؤں جواب دے رہے ہیں دشواری سے حکیم صاحب کے پاس پہنچتے۔ حکیم صاحب کی جانب ہاتھ بڑھاتے "حکیم صاحب نبض دیکھئے تو؟" حکیم صاحب فرماتے "ہاں شاہ جی! آج کچھ زیادہ ضعف ہے" اتنے میں کوئی اہل ذوق وارد ہوا۔ شعر و سخن اور علم و ادب کی محفل سرگرم ہوگئی۔ ایسا معلوم ہوتا کہ جوانی کی تمام قوتیں عود کر آئی ہیں اور شاہ جی بالکل صحت مند ہیں۔ اسی اثناء میں بڑی قوت کے ساتھ ہاتھ حکیم صاحب کے سامنے بڑھاتے اور کہتے "حکیم صاحب! اب نبض دیکھئے تو؟ حکیم صاحب کہتے ماشاء اللہ اب تو نبض کی حالت بہت اچھی ہوگئی ہے۔ شاہ جی فرماتے "حکیم صاحب! میں فالج اور ذیابیطس کا مریض نہیں ہوں" میری محفلیں اجڑ گئی ہیں دیکھئے حکیم صاحب! شاہ عظیم آبادی کیا کہہ گئے ہیں۔

کانٹوں میں ہے گھرا ہوا چاروں طرف سے پھول
پھر بھی کھلا ہی پڑتا ہے کیا خوش مزاج ہے

ایسی محفلیں دو دو تین تین گھنٹے قائم رہتیں۔ حکیم صاحب کے ہاں مریضوں کا ہجوم ہے۔ مگر حکیم صاحب مریضوں سے بے نیاز شاہ جی کی طرف متوجہ ہیں۔ مریض اپنی تکالیف فراموش کئے بیٹھے ہیں گھنٹوں کے بعد جب گھڑی دیکھتے "بڑا وقت گذر گیا ہے چلیں حکیم صاحب اللہ کے نام کا کوئی ٹکڑا ملتا ہے تو کھائیں" ایسی محفلوں میں گذشتہ دور کے واقعات اور لطائف و ظرائف بیان کرتے۔ راقم الحروف گو قلم بند نہیں کرسکا تاہم یادوں کا ایک ذخیرہ ذہن موجود ہے۔ جس میں سے کچھ "امروز" کے قارئین کے لئے پیش کررہا ہوں۔ اس کے باوجود کہ مجھے اپنی کوتاہ قلمی کا شدید احساس ہے لیکن "امروز" کے لئے کچھ لکھنے کا مطالبہ رد کرنا بڑا مشکل تھا۔ کیونکہ "امروز" شاہ جی کے چند پسندیدہ اخباروں میں سے تھا شاہ جی اسے روز پڑھتے یا راقم الحروف سے سنتے۔

انگریز دشمنی

انگریز دشمنی شاہ جی کے رگ و ریشہ میں سرایت کی ہوئی تھی ہندوستان کے گوشہ گوشہ میں امیر شریعت نے جس طرح انگریز کے خلاف آگ لگائی اس کا اندازہ کچھ وہی لوگ کرسکتے ہیں جنہوں نے تقسیم ملک سے قبل براہ راست شاہ جی کی تقاریر کو سنا لیکن اب ابھی اپنی بیماری کے دنوں میں جب گذشتہ دور کے واقعات کو یاد کرتے تو ان کا پر جلال و پرہیبت چہرہ دیدنی ہوتا، فرماتے اس کرہ ارضی پر آج تک انگریز سے بڑھ کر عدو اللہ و عدو الرسول عدو القران عدو المسلمین پیدا نہیں ہوا۔ ان فقروں میں کچھ اس قسم کی حرارت ایمانی کا امتزاج ہوتا کہ سامعین کے رونگٹے کھڑے ہوجاتے اور اپنی مخصوص دردناک اور فلک شگاف آواز میں اپنا یہ شعر پڑھتے۔

چہ گویمت ز کمال فرنگ دشمن دیں
نشاں دہد ز مقام اہرمن چہ رسد

راقم نے بارہا شاہ جی کو اپنے احباب سے یہ کہتے سنا کہ "فرنگی یا غلامان فرنگ آپ سے کبھی خوش ہوجائیں تو یہ آپ کے ایمان کے قریب مرگ ہونے کا وقت ہوگا۔ ان کا ہمارے درپئے آزار رہنا ہی ہمارے ایماندار ہونے کی ضمانت ہے۔ فرماتے "ایمان کی شرط میں سے ایک اہم شرط یہ بھی ہے کہ جس کشتی میں انگریز سوار ہیں سوراخ کیا جائے اور اس کی تبلیغ میری زندگی کا مقصد ہے۔"

(۱) قبل از آزادی آپ کا معمول تھا کہ ہر سال دو مہینے مظفر گڑھ، ڈیرہ غازیخان کے اضلاع میں تبلیغی دورہ فرماتے۔ احباب پوچھتے اس خطہ پر عنایت خاص کیوں ہے؟ تو فرماتے کہ وہ علاقے پسماندہ ہیں جہاں فرنگی کی ہیبت و جبروت مثالی طور پر سکہ بٹھائے ہوئے ہے۔ شاید اللہ تعالی میری کوششوں سے اس کی ہیبت کے بتکدہ کو ویران کردے۔ واقعات ذیل سے شاہ جی کی شجاعت و جرأت اور اس راہ میں ہر قسم کی قربانی دینے کی خدمات کا اندازہ ہوتا ہے ایک مجلس میں ارشاد فرمایا کہ ایک دفعہ جیل میں میں نے پھانسی خانے کو دیکھا اور تختہ دار پر بھی قدم رکھا اور پھر اپنے آپکو تولا کہ اگر اس راہ میں پھانسی آجائے تو! فرماتے ہیں کہ میں نے اپنے آپ کو مطمئن اور تیار پایا۔

بیماری کے دوران جب کوئی بزرگ مزاج پرسی کو تشریف لاتے تو فرماتے "ساری زندگی یہی تمنا رہی کہ انگریز کے خلاف جہاد کرتے ہوئے یہ جان کام آجائے (اپنی شہادت کی طرف اشارہ کرتے) اس سے تو محروم ہوگئے

اب دعا کرو کہ ایمان پر خاتمہ ہو جائے۔

انگریز دشمنی کی آگ اللہ تعالیٰ نے شاہ جی کی فطرت میں ودیعت کی تھی البتہ ماحول اور مطالعہ کے اثرات نے اس آگ کو بھڑکایا۔

ایک محفل میں ارشاد فرمایا کہ میری طفولیت کے ایام اپنے آبائی گاؤں ناگڑیاں ضلع گجرات میں بسر ہو رہے تھے۔ ایک دن دیکھا کہ بہت سے آدمیوں کا ہجوم قطار میں کھڑا ہے میں بھی تماشائی کی حیثیت سے قطار میں شامل ہو گیا دیکھا کہ ایک سرے سے ایک انگریز افسر سب لوگوں کے ساتھ ہاتھ ملا رہا ہے جب وہ انگریز افسر میرے قریب آیا تو میں قطار سے پیچھے سرک گیا۔ اس نے شاید برا منایا ہو لیکن گاؤں کے زمینداروں نے اور بعض خاندانی بزرگوں نے بہت برا خیال کیا تو میں نے کہا کہ میں اس دشمن دین کافر سے ہاتھ نہیں ملا سکتا۔

اپنی جوانی کے دوران کا ایک واقعہ ذکر کیا کہ ایک دفعہ کسی گاڑی کی انتظار میں میں امرت سر کے پلیٹ فارم پر گھوم رہا تھا کہ کسی دوسری جانب جانے والی گاڑی کے ایک درمیانہ درجہ کے ڈبہ کے سامنے کچھ لوگ جمع ہیں۔ نزدیک جا کر دیکھا تو معلوم ہوا کہ سالم ڈبہ میں دو انگریز نوجوان دروازہ بند کئے بیٹھے ہیں اور کسی ہندوستانی کو اندر گھسنے نہیں دیتے کچھ دیر تو میں اسی انتظار میں رہا اتنے آدمی جو موجود ہیں شاید ان میں سے کوئی جرأت کرے مگر سب پر خوف و ہیبت طاری تھی، زیادہ دیر تک یہ ذلت آمیز منظر دیکھ نہ سکا۔ میرے پاس موٹا سونٹا تھا میں نے زور سے وہ سونٹا دروازہ میں مارا اور اندر داخل ہو گیا ایک انگریز نوجوان میری طرف بڑھا میں نے سونٹے کی نوک سے اس کو ڈبہ میں گرا ڈالا دوسرا اس کی امداد کو بڑھا تو اس کو بھی گرے ہوئے پر دے مارا۔ مگر دیکھتا ہوں کہ کہ اس کے بعد کوئی اندر داخل ہونے کی جرأت نہیں کرتا۔ سٹیشن ماسٹر اسٹیشن کو چھوڑ کر روپوش ہو گیا۔ لوگوں کو کہہ سن کر باصرار اندر بلایا ان انگریز نوجوانوں کو دیکھا کہ وہ سہمے ہوئے ایک جانب آرام سے بیٹھ گئے ہیں میں نے ڈنڈا دکھاتے ہوئے کہا کہ پھر کوئی شرارت کی تو یہ اب آپ کے سر پر برسے گا۔

۱۹۲۱ء میں پہلی دفعہ دو سال کی سزا ہوئی اور شاہ جی کو میانوالی جیل منتقل کر دیا گیا۔

ان اسیری کے دنوں میں کن لوگوں کی رفاقت میسر آئی اور کیا واقعات رونما ہوئے یہ ایک مستقل کتاب ہے فرمایا کہ ایک دن سپرنٹنڈنٹ جیل لالہ رام داس آئے اور مجھے کہنے لگے کہ گورنر بہادر کی چٹھی آئی ہے کہ اگر عطاء اللہ شاہ صرف اظہار افسوس کردے تو میں اس کی فوری رہائی کے احکام صادر کردوں گا۔ تو میں نے کہا لالہ جی جو میں کہوں گا وہ لکھو گے؟ لالہ جی نے کہا کہو تو! "میں نے کہا لکھو کہ میں جب تک زندہ رہوں گا تمہاری جڑوں میں پانی پھیرتا رہوں گا (تمہاری جڑیں کاٹتا رہوں گا) لالہ جی ہنس کر چل دیئے اور کہنے لگے "بس کرو شاہ جی جواب ہو گیا"

دیناج پور جیل

بنگال کے ضلع دیناج پور کی جیل میں جب پہلی دفعہ وارد ہوئے تو فرمایا "میرے سر پر مراد آبادی ٹوپی تھی اندرون جیل مولانا عبد اللہ الباقی اور دیگر علماء و رہنمایان بنگال پہلے ہی سے موجود تھے میری دیکھا دیکھی انہوں نے بھی مراد آبادی ٹوپیاں استعمال کرنا شروع کر دیں۔ جیل کے انگریز افسروں کو یہ ٹوپیاں سخت ناگوار تھیں اور ہم سب

سیاسی قیدیوں نے یہ فیصلہ کرلیا کہ اگر انگریزوں کو یہ ناگوار ہیں تو استعمال ہرگز ترک نہ کریں گے۔ ایک دن سپرنٹنڈنٹ جیل اور مسٹر سمپسن (SIMPSON) انسپکٹر جیل خانہ جات معائنہ کے لئے آئے اور ہم سب سیاسی قیدیوں سے مخاطب ہو کر کہنے لگے "یہ گاندھی کیپ ہیں انہیں آپ لوگ نہ پہنا کریں میں نے آگے بڑھ کر کہا یہ گاندھی کیپ نہیں بلکہ مراد آبادی کیپ ہیں" مگر گاندھی کیپ کے متعلق ان کا اصرار جاری رہا۔ میں نے غصے میں کہا تو پھر یہ قمیض بھی گاندھی ہے اور یہ پاجامہ بھی اس پر سمپسن بہت چڑا اس نے سپرنٹنڈنٹ جیل کو حکم دیا "ان سب کی ٹوپیاں اتروالو" یہ حکم سنتے ہی اکثر اصحاب نے ٹوپیاں خود بخود اتار کر حکام جیل کے حوالے کردیں سپرنٹنڈنٹ میری طرف بڑھا اور اس نے کہا کہ آپ بھی ٹوپی اتار دیں میں نے کہا کہ "سر اترنے سے پہلے یہ ٹوپی نہیں اتر سکتی۔ پہلے سر اتارو پھر ٹوپی اتار لینا" فرماتے کہ میں ساری زندگی عدم تشدد کا مبلغ رہا ہوں، لیکن اس دن میں نے تشدد کا عزم کرلیا تھا۔ میں نے فیصلہ کرلیا تھا اگر میری ٹوپی پر اس نے ہاتھ ڈالا تو دونوں کو نیچے گرا کر آج میں سمپسن کا خون پیوں گا اس وقت بہادر شاہ ظفر کے بیٹوں کا خون میرے سامنے تھا۔ میری صحت اس وقت ماشاء اللہ بہت اچھی تھی، سپرنٹنڈنٹ نے جب میری طرف ہاتھ بڑھایا تو میں نے اس کی کلائی پکڑلی اس پر کچھ اس قسم کی ہیبت طاری ہوئی کہ چوٹی سے لیکر ایڑی تک وہ پسینہ میں لت پت ہوگیا اور پیچھے ہٹنے لگا میں نے اس کا ہاتھ چھوڑ دیا وہ دونوں بڑبڑاتے ہوئے ہمارے احاطہ سے باہر چلے گئے۔ اس کے بعد میرے سب رفقاء میرے لئے کسی بڑی عقوبت کا انتظار کرنے لگے ادھر جب سمپسن دفتر پہنچا ابھی آرام سے بیٹھا ہی نہیں تھا کہ دو پستولوں سے مسلح نوجوان آئے اور انہوں نے سیمسن کو للکار کر کہا۔ (READY MR SIMPSON) تیار ہوجاؤ مسٹر سمپسن پھر بیک وقت دونوں نے فائر کئے چشم زدن مین سمپسن خاک کا ڈھیر تھا۔ کچھ وقفہ کے بعد جب ہمیں اطلاع ملی تو میں نے مارے خوشی سے زور سے کہا وہ مارا میری اس گرج سے میرے رفقاء گھبرا گئے کہ کہیں اس سازش میں ہم پر اور مقدمہ نہ قائم ہوجائے میں نے کہا کہ ظالم دشمن مارا ہے اب بھی خوشی نہ منائیں۔

صدر ناصر کی فرنگ دشمنی کو بڑی قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھتے اور جب ناصر نے نہر سویز کو قومی ملکیت قرار دیا تو شاہ جی بے حد مسرور ہوئے اور فرمایا کہ سیاسی دور میں میرے رفقاء کے درمیان یہ مسئلہ کئی دفعہ زیر بحث آیا کہ اگر نہر سویز ان کے چنگل سے نکل جائے تو ہندوستان پر انگریزوں کی گرفت بہت ڈھیلی ہوجائے گی۔ الحمد للہ زندگی میں اللہ نے یہ آرزو پوری کردی۔ چونکہ سامراجی سازشوں سے کما حقہ واقف تھے اس لئے کبھی صدر ناصر کے بارہ میں جانی خطرہ کا اظہار کرتے اور پھر صدر ناصر کو دعائیں دیتے۔

بایں ہمہ ذوق عداوت افرنگ انگریزوں کی بعض خوبیوں کا اعتراف کرتے جب ان خوبیوں کا ذکر کرتے تو بڑے افسوس اور حسرت سے کہتے کہ یہ خوبیاں مسلمانوں نے ترک کردیں اور انگریز نے اپنالیں فرمایا ڈیرہ غازی خان میں کچھ دنوں کا پروگرام تھا چند مقامات پر جلسے منعقد ہونے تھے محکمہ پولیس نے انگریز ڈپٹی کمشنر کو تجویز بھیجی کہ بخاری کے ڈیرہ غازی خان میں داخلہ پر پابندی عائد کردی جائے تو اس نے کہا ارتکاب جرم سے پہلے کسی کو سزا دینا بہت بڑی ناانصافی ہے اگر خلاف قانون تقریر کرے گا تو خود بھگتے گا۔ ہمارے پاس دفعات موجود ہیں اور مقدمہ چلایا جاسکتا ہے۔

اس آخری بیماری کے دوران جن چیزوں کا شاہ جی کو اکثر غم رہتا وہ مسلمانوں کی بدمعاملگی تھی آئے دن اخبارات میں ملاوٹ، دھوکہ دہی، کم تولنے کے واقعات پڑھتے یا زبانی سنتے تو بہت کڑھتے اور پھر فرماتے کہ انگریز سیاست کا تو پکا ابلیس ہے لیکن کاروبار کا مومن ہے اور فرماتے کہ یورپ میں ملاوٹ اور اپنی قوم کو دھوکا دینے کے واقعات بہت کم رونما ہوتے ہیں۔

شاہ جی کی شجاعت اور جرأت کے ان گنت واقعات ہیں جنہوں خوف طوالت سے نظرانداز کیا گیا ہے اور اس مردِ قلندر کی تصویر کے کئی رخ ہیں جنہیں صفحہ قرطاس پر پیش کرنے کے لئے ایک طویل مدت درکار ہے۔ لہذا اس سلسلہ کو شاہ جی کے اپنے اشعار پر ختم کرتا ہوں۔

از شاخ جنوں فتادہ بگیم
مردیم دور انتظار مرگیم
با ایں ہمہ ضعف و ناتوانی
دانی! کہ چہ کارہا نہ کردیم
ما مسلک روبہی نہ رفتیم
ما پیرویٔ خراں نہ کردیم
بر مسند فقر یگانہ فردیم

پاسبانِ ملت

حقیقت یہ ہے کہ کسی کے متعلق کچھ لکھنا کارے دارد اور بالخصوص حضرت امیر شریعت رحمۃ اللہ علیہ کے حالات لکھنا تو بڑے آدمیوں کا کام ہے۔ اور پھر اس شیر بیشۂ حریت و پاسبانِ ملت کا اپنا کردار اپنے آپ پر شاہد اور برہانِ ناطق ہے کسی بڑے چھوٹے کے لکھنے کا محتاج نہیں۔ آفتاب آمد دلیل آفتاب! اپنے تو اپنے بیگانے بھی امیر شریعت مرحوم کے کردار اعلیٰ یعنی استقامت فی الدین اور طمانیت قلب کا مشاہدہ ہر بار کر کے اپنی جگہ ثنا خواں تھے اور ہیں کہ ایسا مجاہد مردِ میدان کبھی ہم میں ہوتا تو کام بن جاتا۔ افسوس کہ بے قدر اور نااہل و نادان لوگوں سے اس کا واسطہ رہا۔

ہے جو حسد کسی کو تجھ سے یہ بھی ہے تیری ہی خوبی
کہ جو تو نہ خوب ہوتا تو وہ کیوں حسود ہوتا

شاہ صاحب جامع شیون تھے۔ یہ واقعہ ہے کہ ہم کمزور دل لوگ بھی ان کے بہادرانہ کردار اور گفتار سے سبق لیتے تھے۔ اب وہ جبلِ استقامت و شجاعت بھی ہم سے چھن گیا۔ اللہ تعالیٰ ان کو اپنے جوار رحمت میں جگہ نصیب فرما کر درجات بلند فرمائے (آمین)

حضرت مولانا خدا بخش (ملتانی) رحمۃ اللہ علیہ

قطعہ تاریخ وفات

جھونکا خطا بتوں کے چمن میں خزاں کا ہے
یا رخصتی باد بہاری کی ہوگئی ..!
لطف خطابت اب ہے نہ وہ بذلہ سنجیاں
تقریر چیز وقت گذاری کی ہوگئی ... !
رخصت ہوئے جو شاہ عطاء اللہ دہر سے
پھیکی سی بزم دین شعاری کی ہوگئی !
مجلس کہ جس میں رہتے تھے پرکیف قہقہے
اب رنج و غم سے گریہ وزاری کی ہوگئی
وہ قوت بیاں ، کہ مخالف کے ذہن پر
تاثیر لفظ حربہ کاری کی ہوگئی !
خود لطف بزم تھے تو ملا ان کو لطف و کیف
بارش جو ان پہ رحمت باری کی ہوگئی !
یوں ایک دم جو راہ عدم پر ہیں گامزن !
شاید تجلی جلوہ طاری کی ہوگئی !
پوچھے جو شاہ جی کا کوئی سال انتقال
کہہ دیجئے " وفات بخاری کی ہوگئی "

۱۳۸۱ھ

از حضرت مولانا مفتی جمیل احمد صاحب تھانوی مدظلہ

شاہ جی!
آپ کہاں ہیں

منظور احمد بھٹی مرحوم

شاہ جی! آج جب کہ ساڑھے تین سال کے مسلسل جبری سکوت کے بعد زبانوں کو اذنِ کلام ملا ہے۔ دماغوں کو سوچنے کی اجازت ملی ہے۔ فکر کو قوت پرواز نصیب ہوئی ہے اور منہ کو جرأت و بیباکی کا وقار حاصل ہوگیا ہے۔ اور اب پاکستان میں زندگی ایک نئے انداز سے کروٹ لے رہی ہے۔ ملت اسلامیہ کو آپ کی شدید ضرورت ہے۔

ایک ایسے دور میں جب کہ رہنماؤں میں اتحاد عمل اور اتحاد فکر وقت کا سب سے بڑا تقاضہ ہے وہ ایک دفعہ پھر جنگ زرگری اور کش مکش اقتدار میں ایک دوسرے سے دست و گریباں ہونے کی تیاریاں کر رہے ہیں۔ آپ کی غیر حاضری اور عدم موجودگی میں انہیں کون سمجھائے کہ ملک وملت کی خدمت اقتدار سے علیحدہ رہ کر بھی ہوسکتی ہے۔ آج اگر آپ جیسا درویش صفت انسان زندہ ہوتا تو ان رہنماؤں کو خدمت ملک و قوم کے اسرار و رموز سمجھاتا۔ انہیں بتاتا کہ عوامی خدمت کے نام پر زرگری کے کھیل کھیلنا سب سے بڑی لعنت ہے۔

شاہ جی! آج آپ اگر موجود ہوتے تو ان بازی گروں کو جو سیاست کے نام پر اپنی امارت اور اپنی صدارت کے شیش محل استوار کرنے کی فکر میں غلطاں ہیں بتاتے کہ پاکستان کو آج ایسے رہنماؤں کی ضرورت ہے جو موٹا جھوٹا پہن کر روکھا سوکھا کھا کر اور جھونپڑیوں میں زندگی گزار کر اقتدار سے بے نیاز قربانی اور اخلاص کے جذبے کی پرورش کرتے ہوئے اس مملکت خداداد کا مستقبل سنوارنے کی فکر کریں۔

شاہ جی! آج کہ رہنماؤں میں کوئی بھی نہیں جو راہ عمل متعین کرنے کے لئے رسول خدا کے اسوۂ حسنہ پر نظر رکھے۔ کوئی نہیں جو خلفائے راشدین کے اصول سیاست کو مشعل راہ بنائے۔ سبھی ایک دوسرے کے گریبانوں کی دھجیاں بکھیر کر اپنی دکانیں سجانے کا سامان کر رہے ہیں۔ لیکن

آپ کے بغیر انہیں کون بتاتا کہ خدا کا آخری پیغمبر جو ضابطۂ حیات ہمارے لئے لایا اسی کو اپنا کر ہم اپنی دنیا اور آخرت جگمگا سکتے ہیں۔ انہیں کون بتاتا کہ خلفائے راشدین نے اپنا سب کچھ قربان کر کے ہی ملت اسلامیہ کو چار چاند لگائے تھے اور اس کے مستقبل کو تابناکی بخشی تھی۔

اور جب

"سیاست نے خود غرضی، ہوس اقتدار اور حرص امارت کا روپ دھار لیا تو مفاد پرستی کا میدان سج گیا۔

شاہ جی! یقین مانیئے آج ضرورت ہے۔

آپ کی شعلہ بیانی کی جو مردہ دلوں میں خوابیدہ غیرت کو جوش میں لائے۔ آپ کے عشق رسول ﷺ کی جو

اسلام کی حرمت پر اور ناموس رسالت ﷺ پر اپنا سب کچھ قربان کر دے۔
آپ کے جذبۂ خدمت کی۔ جو اپنا سب کچھ لٹا کر عوام کے دکھ اور تکلیف کو دور کرے۔
آپ کے جوہر صداقت کی۔ جو کفر و باطل کے طوفانوں میں بھی کلمۂ حق کہنے سے گریز نہ کرے۔
آپ کی جرأت و بیباکی کی۔ جو بے سرو سامانی کے باوجود ہر طاغوتی طاقت سے ٹکرا جائے۔
آپ کی اسلامی غیرت کی۔ جو کسی غیر اسلامی طاقت کی غیر اسلامی حرکت کو برداشت نہ کرے۔
آپ کے اصول سیاست کی۔ جو کش مکش اقتدار سے دور رہ کر ملک و ملت کی خدمت سرانجام دے۔

لیکن

آپ کہاں ہیں۔ آپ کیوں نہیں بولتے؟ آپ تو یوں خاموش نہ رہتے تھے۔ آپ تو ایسے حالات پر تڑپ جاتے تھے۔

شاہ جی! اب تو آپ کے ساتھ آپ کے ساتھی بھی بے وفائی کرنے لگے ہیں۔
مجلس احرار آپ کو کتنی عزیز تھی۔ آپ کے الفاظ آج بھی میرے کانوں میں گونج رہے ہیں کہ:
"خواہ ساری دنیا مجھے چھوڑ جائے مگر میں مجلس احرار اسلام کا علم بلند رکھوں گا حتیٰ کہ جب میں مر جاؤں گا تو میری قبر پر یہ سرخ پھریرا لہراتا رہے گا"!

لیکن

آپ کے ساتھی جنھوں نے آپ کے خون سے اپنی عظمت کے چراغ روشن کئے جنھوں نے مجلس احرار اسلام کے اُسٹیج پر رہنمائی کے تاج محل تعمیر کئے۔ آج مجلس احرار اسلام کا نام لیتے ہوئے شرماتے ہیں۔
شاہ جی! ابھی آپ کا کفن میلا نہیں ہوا کہ آپ کے ان معزز ساتھیوں نے کھلم کھلا بغاوت کا اعلان کر دیا ہے۔ جو آپ کے گلستان خطابت سے خوشہ چینی کر کے اپنے کو خطیب کہتے ہیں۔ وہ آپ کی رفاقت سے انکار کر رہے ہیں۔ وہ لوگ جنھوں نے آپ کی صحبت میں بیٹھ کر دین کا علم سیکھا۔ آج مجلس احرار اسلام کی بجائے دوسروں کی محفل سنوارنے کو زیادہ مفید سمجھتے ہیں۔ کچھ لوگوں کے ساتھ زندگی نے وفا نہ کی اور کچھ آپ کے ساتھ بے وفائی کر رہے ہیں۔ چند دیوانے ہیں جو آپ کی محترم و مقدس یاد کی شمع کے پروانے بنے مجلس احرار اسلام کی تنظیم نو کے لئے مضطرب ہیں۔

کاش!

آپ آج زندہ ہوتے تو اپنے وفادار ساتھیوں کی بے وفائیوں کا تماشا اپنی آنکھوں سے دیکھتے!
(ماہنامہ تبصرہ لاہور۔ اگست ستمبر ۶۲ء)

احرار رضا کار

یہ احرار رضا کار مجھے اپنے بچوں سے بھی زیادہ پیارے اور عزیز ہیں نخل احرار کو سایہ دار بنانے کے لئے سیکڑوں نوجوانوں نے اپنا خون دیا، قید و بند کی صعوبتیں برداشت کیں، سینوں پر گولیاں کھائیں، تختہ دار پر لٹک گئے، خود باطل سے ٹکرا گئے، دریاؤں میں کود گئے اور پہاڑیوں کی چوٹیوں پر احرار کا سرخ ہلالی پرچم لہرا گئے، وہ شیروں کی طرح جبر و تشدد کے طوفانوں اور سیلابوں میں، دیو استبداد کے مقابلے میں سیدھا تیرتے رہے، وہ بیڑیوں اور زنجیروں کی کھڑکھڑاہٹ اور جھنکار پر رقص کرتے رہے، انہیں کوئی مصیبت، کوئی مشکل اور کوئی لالچ جماعت کے دامن سے الگ نہ کرسکا۔ انہوں نے بھوکا رہ کر بھی جماعت کو زندہ رکھا، مصائب و آلام برداشت کئے اور جماعت کے اعلان پر بڑی سے بڑی جبروتی و قہرمانی طاقت سے ٹکرا گئے، ان کی سرخ وردی خون شہادت کی آئینہ دار ہے، میں ان لوگوں کو کیسے فراموش کردوں، میں ان کا ساتھ کیسے چھوڑدوں، میں ان ننگے بھوکوں سے کیسے منہ موڑلوں، یہی تو میری متاع عزیز ہیں، یہی وہ ہیں جو کسی لالچ کے بغیر صرف جذبۂ ایمان کے تحت میرا ساتھ دیتے رہے ہیں، آزادی کے طویل سفر میں اگر کسی سے میں نے خدا کے بعد اپنی امیدوں کو وابستہ کیا تو وہ یہی عاشقان حق و صداقت تھے۔

بانئ احرار، اسیر شریعت

سید عطاء اللہ شاہ بخاری رحمہ اللہ ۱۹۵۸ء

اس کا جنوں دانش کا بدل

اس کی تقریریں جل تھل ۔۔۔ اس کی سیاست مست کنول
اس کی محفل باغ و بہار ۔۔۔ اس کی ہر اک بات غزل
اس کی خرد کشمیر سرور ۔۔۔ اس کا جنوں دانش کا بدل
اس کی مست گرج کے حضور ۔۔۔ رقص میں آتے تھے بادل
اس کا ارادہ کوہ شکوہ ۔۔۔ اس کا جواں کردار اٹل
اس کا جنوں خانہ بدوش ۔۔۔ اس کا مرن ملتان محل
وہ جرأت کا چیت گلاب ۔۔۔ اس کا بھنورا شیر افضل
اس کی زباں قرآن طراز ۔۔۔ اس کے گلے میں سوز ازل

اُس کی لحد پر پھول گسار
رحمت کا رنگیں آنچل،

شیر افضل جعفریؒ

شاہ جیؒ! آپ کہاں چلے گئے؟

تاریخ رفتگاں کے الٹتا رہا ورق
کس کو تلاش کرتا ہوں کیا ڈھونڈتا ہوں میں

شاہ جی! آپ کہاں چلے گئے!
کاش آپ جان سکتے
کہ--------
آپ کے نام اور آپ کے صدقے میں------
رزق کمانے والے،
بہت سے واعظ، مولوی اور پیر
حق اور حق کی روایت-----
منبر و محراب کی عظمت-----
علماء سلف کی غیرت و حمیت
ہدایت اور راہِ ہدایت
اپنی اور آپ کے نام کی حرمت سے عاری ہو چکے ہیں
وہ رات دن
اپنے دل و ضمیر کو بیچ رہے ہیں
دین کے نام پر
تجارت کر رہے ہیں۔
علماء-----علماء کی منڈیاں سجائے بیٹھے ہیں
دین کی آڑھت کر رہے ہیں۔
کوئی نہیں جوان کو روکے
کوئی نہیں جوان کو ٹوکے
شاہ جی!
آپ کہاں چلے گئے؟

کاش آپ آسکتے
اور آکر
ان دین فروشوں کی درۂ عمرؓ سے پٹائی کرتے
تاکہ----------
ایک بار پھر
یہاں حق کی روایت قائم ہو جائے
اور تیغ حق بے نیام ہو جائے۔

حفیظ رضا پسروری

سید امین گیلانی

تقویٰ

فالج کے پہلے حملہ کے بعد جب شاہ جی کی طبیعت کچھ سنبھل چکی تھی ۔ میں ملتان خدمت میں حاضر ہوا تو چارپائی سے اتر کر فرش پر آ بیٹھے ۔ اشعار سنتے رہے اور سناتے بھی رہے ۔ پھر باتوں سے باتیں نکلتی رہیں ۔ قرآن و حدیث ، تاریخ و ادب ، لطائف و ظرائف غرض محفل خوب جمی ہوئی تھی کہ اتنے میں ڈاکیہ آیا اور ڈاک دے گیا شاہ جی نے اپنے دوسرے فرزند مولانا سید عطاء المحسن بخاری سے کہا بیٹا تم پڑھ کر سناتے جاؤ بھائی عطاء المحسن نے جب ایک خط کے اس فقرہ کو ختم کیا کہ

" آپ نے دریافت فرمایا ہے کہ یہ رقم کیسی ہے ؟ یہ روپیہ زکواۃ کا ہے جس جگہ مناسب ہو دیدیں "۔

"

یہ فقرہ سن کر شاہ جی نے بے ساختہ کہا الحمد اللہ ، الحمد اللہ ۔ میں کچھ چونکا کہ یہ زکواۃ کے روپے پر الحمد اللہ کیسی ۔ جب ڈاک سن کر فارغ ہوئے تو میں نے عرض کیا شاہ جی یہ زکواۃ کے روپیہ پر الحمد اللہ سمجھ میں نہیں آئی فرمایا کچھ دن ہوئے میرے نام ایک سو روپیہ کا منی آرڈر آیا تھا جس میں تفصیل کچھ نہ تھی کہ یہ روپیہ جماعت کے لئے ہے یا میری ذات کے لئے ہے ۔ پھر کچھ دوست مجھ پر اعتماد کرتے ہوئے صدقات اور زکواۃ کا روپیہ بھی بھیج دیتے ہیں میں وہ روپیہ انہی حدود شرعی میں تقسیم کر دیتا ہوں ۔ مگر ان صاحب نے کچھ بھی تو نہ لکھا ۔ پوچھا تو پتہ چلا کہ زکواۃ تھی ۔ پھر اپنا ہاتھ گریبان میں ڈال کر صدری کی طرف اشارہ کر کے فرمایا وہ روپیہ میرے پاس محفوظ ہے اس لئے الحمد اللہ کہا میرا ذہن فوراً اس طرف گیا کہ ساری عمر انگریز کی مشینری کانگرس اور سکھوں سے روپیہ لینے کا الزام شاہ جی پر لگاتی رہی ۔ کوئی ان سے پوچھے کہ اس روپے کا کسے علم تھا جس کی شاہ جی نے اتنی تحقیق اور فکر کی ! ۔

شاہ جی سے میری ملاقات

میری ملاقات حضرت مولانا سید عطاء اللہ شاہ صاحب بخاری سے ایک ہی دفعہ ملتان میں ہوئی تھی ۔ جب ان پر فالج کا دورہ پڑا تھا میں عیادت کے لئے گیا تو بڑے تپاک سے ملے ۔ بہت خوش ہوئے اور حضرت حکیم الامت مولانا محمد اشرف علی تھانوی صاحب قدس سرہ کا تذکرہ کرتے ہوئے فرمانے لگے کہ " میں اپنی زندگی کے ان چند لمحات کو اپنے لئے وسیلہ نجات سمجھتا ہوں جو تھانہ بھون میں حضرت کی صحبت میں گذرے " یہ فرما کر آبدیدہ ہوگئے اور مجھ پر بھی کیفیت طاری ہوگئی ۔ مرحوم میں بڑی خوبیاں تھیں اللہ تعالی جنت الفردوس کی نعمتوں سے مالا مال فرمائیں

حضرت مولانا ظفر احمد عثمانی ۲۵ ربیع الثانی ۱۳۸۱ھ

تحریک تحفظِ ختم نبوت ۱۹۵۳ء اور مودودی صاحبؒ

جماعت اسلامی کی مسلسل نیش زنی سے تنگ آکر امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاری نے لائل پور تبلیغ کانفرنس میں مودودی صاحب کی غلط بیانی پر انہیں شرعی انداز میں ٹوکا۔ ان کے الفاظ تقریباً یہ تھے:

"یا اللہ! تحریک ختم نبوت میں شمولیت سے اگر میرے دل میں خلوص نیت کے علاوہ رائی کے دانہ کے برابر بھی کوئی ایسا خیال تھا کہ تحریک تحفظ ختم نبوت کے ذریعے سیاسی اقتدار حاصل کیا جائے تو مجھ پر اور میرے اہل و عیال پر غضب نازل ہو"

اس کے بعد فرمایا۔ مودودی صاحب کراچی کونشن میں میرے گھٹنے سے گھٹنا ملا کر بیٹھے ہوئے تھے۔ ان کی موجودگی میں راست اقدام کا ریزولیشن پاس ہوا۔ جس پر دوسرے سینکڑوں علماء سمیت انہوں نے بھی دستخط کئے اور وہ کاغذ میز انکوائری کورٹ میں بھی پیش ہو چکا ہے۔ وہ آخر دم تک تحریک میں شامل رہے۔ اگر وہ کہتے ہیں کہ وہ تحریک میں شامل نہیں تھے تو میں انہیں دعوت مباہلہ دیتا ہوں۔

امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ
اقتباس خطاب احرار تبلیغ کانفرنس لائل پور (فیصل آباد)۱۹۵

میرے ابا جی

جب کبھی وہ سفر پہ جاتے تھے — دل بہت بے قرار ہوتا تھا
ان کی آمد کا بالخصوص مجھے — رات دن انتظار ہوتا تھا
مجھ سے اکثر خطائیں ہو جاتیں — ان کی جانب سے پیار ہوتا تھا
اس زمانہ میں جبکہ بیٹی سے — بات کرنا بھی عار ہوتا تھا
مجھ پہ بیٹوں سے کچھ سوا شفقت — انکا خاص اک شعار ہوتا تھا

وہ انوکھا پیار کرتے تھے — جان ہم پر نثار کرتے تھے
ہم تو اولاد تھے وہ غیروں سے — اس طرح کا پیار کرتے تھے
لوگ اپنوں کو بھول جاتے تھے — وہ جان ان پر نثار کرتے تھے

بنتِ امیر شریعت سیدہ اُمِ کفیل

بنتِ امیرِ شریعت سیدہ ام کفیل

تری حیات ہے قندیل، رہ دکھاتی ہے۔

اگر مہر نیم روز کے سامنے مٹی کا دیا جلا کر سورج کی روشنی میں اضافہ کیا جا سکتا ہے یا شب ماہتاب میں شمع جلا کر رات کی تاریکی کم کی جا سکتی ہے یا نسیم سحر کے روح پرور اور جاں فزا جھونکوں کے روبرو دستی پنکھے ہواؤں کو روح میں اتار سکتے ہیں تو پھر میرے اباجی کی شخصیت کا حسن و وقار الفاظ سے اجاگر کیا جا سکتا ہے۔ اولاد ہونے کے ناطہ سے اباجی ہمارے لئے دنیا و آخرت کی سب سے بڑی نعمت تھے۔ اور ہمارے لئے تو۔ ع

پھر ان کے بعد چراغوں میں روشنی نہ رہی

ان کی زندگی کے تمام نشیب و فراز ہمارے لئے تو اصول زیست تھے اور ہیں۔ انکی قدر و منزلت۔ تو ان کور بصر اپنوں، بیگانوں سے پوچھی جائے کہ جنہوں نے ان سے نہ صرف یہ کہ اختلاف کیا بلکہ مخالفت کی پستیوں میں اترتے چلے گئے۔ الزام و دشنام کا کون سا گوشہ ہے جو مسلمان کہلانے والوں نے کفار و مشرکین کے ہم نوا ہو کر نہ بسایا کہ ہر سو شرافت دم توڑ گئی اور حیاء سرنگوں ہو گئی۔

پھر حالات کو ان کے پیش کردہ خدشات کے مطابق ڈھلتے دیکھا تو یہ غدار کہنے اور گالیاں دینے والے روتے ہوئے ان کی چوکھٹ پر آئے اور انہوں نے گلے لگاتے ہوئے وہی سلوک کیا جو ایک باپ بے وقوف اولاد کے نادم ہونے پر کرتا ہے۔

جب بھی وہ یاد آتے ہیں تو ذہن میں ایک طوفان برپا ہو جاتا اور سمجھ نہیں آتا کہ اگر ان یادوں کو قلم بند کروں تو کہاں سے شروع کروں۔ میرے بچے جب ان کی باتیں سنتے تو باصرار ان کی فرمائش ہوتی کہ اپنی یادداشتیں قلم بند کر دیں۔ مگر پہلے گھر کے کام اور بچوں کی نگہداشت سے فرصت نہ ملتی۔ بچیوں نے گھر کا کام سنبھال لیا تو اپنی صحت جواب دے گئی۔ نور العیون، کفیل احمد اور محمد ذوالکفل سلمہما کا دھیما دھیما اصرار کئی دن سے جاری ہے اور میں عجوزۂ مصر کی طرح سوت کی انٹی لے کر خریداری کا ارادہ اس لئے باندھ رہی ہوں کہ وہ جس کی نگاہ برق اور چہرہ آفتاب تھا۔ وہ مجھ پر محبتوں کی بارش برسانے والا میرا باپ تھا۔ محبت صرفی نحوی قواعد سے آزاد ہوتی ہے۔ بس مجھے جو جہاں یاد آتا جائے گا لکھتی رہوں گی۔

مجھے اپنے بچپن کا سب سے پہلا واقعہ جو یاد آتا ہے وہ چار برس کی عمر کا ہے۔ امرتسر میں ہمارا مکان گلوالی دروازہ کے اندر تکیہ بابا ستار شاہ سے ورے اور مولانا بہاء الحق قاسمی مرحوم کے گھر کے سامنے تھا۔ ہمارے گھر کا دروازہ سڑک پر کھلتا تھا اور گھر کی جنوب مشرقی سمت کی کھڑکیاں بھی سڑک پر کھلتی تھیں۔ محلے کی سڑک تھی شاہراہ نہ تھی۔ ٹریفک کی کمی کی وجہ سے بچے سڑک کے اس پار سے اس پار آسانی سے آ جا سکتے تھے۔

سڑک پر خوانچے والے پے در پے گزرتے اور گزرتے بھی صدائیں لگاتے ہوئے تو کسی وقت ایمان

"متزلزل" ہو ہی جاتا!

ایک دن بیر بیچنے والے کی آواز کان پڑی تو میں نے (ا) اماں جی سے ایک پیسہ مانگا جو مل گیا اور میں "بانو" کے ہمراہ دروازہ پر پہنچی تو بیر والا پچھواڑے میں "گورکندوں" کی گلی میں پہنچ چکا تھا۔ ہم نے اس سے بیر لئے اور گلی میں بانو مجھے اپنے مکان میں لے گئی۔ وہاں کچھ دیر ہو گئی ادھر میری تلاش شروع ہو گئی۔ ڈھونڈنے والا یاد نہیں کون تھا۔ بہرحال وہ "بانو" کے مکان تک پہنچ گیا اور ہمیں لے کر گھر آ گیا۔ ابا جی اس تاخیر پر پریشان تھے۔ انہوں نے اظہار ناراضی اور تنبیہ کے لئے ایک ہلکا سا طمانچہ میری گال پر جما دیا۔ میرے لئے تو گویا قیامت ٹوٹ پڑی۔ میں جو اونچی آواز سے ڈانٹ سننے کی عادی نہ تھی رخسار پر طمانچہ کھا کے پھوٹ پھوٹ کر روئی اور روتے روتے وہیں ابا جی کے پاس ہی سو گئی۔

اس واقعہ کو نصف صدی بیت چکی ہے اور مجھے خوب یاد ہے کہ جس وجہ سے میری آنکھ کھلی وہ یہ تھی کہ میرے ابا جی میرے گال اسی جگہ سے چوم رہے تھے جہاں انہوں نے طمانچہ مارا تھا۔

ہمارے گھر میں ۱۹۳۸ء تک (۳۸ء میں بھائی عطاء المحسن سلمہ کی ولادت ہوئی) میرے اور بھائی جان (سید ابو معاویہ ابوذر بخاری مدظلہ) کے علاوہ ایک شخصیت اور تھی جو سن شعور کو پہنچنے تک ہمارے ہاں بطور فرد خانہ مقیم رہی اور وہ تھی "بانو" بانو محلہ کے ایک غریب کشمیری خاندان کی لڑکی تھی کسی استاد کے قابو نہ آتی تھی۔ اس کی والدہ اماں جی کے پاس قرآن پاک پڑھنے کے لئے بٹھا گئی۔ مجھے بانو کی آمد کا سماں آج بھی اچھی طرح یاد ہے کہ ہمسایوں کے لڑکے بانو کے ہاتھ پاؤں پکڑے اس کا "ڈولی ڈنگا" بنا کر اٹھائے ہوئے لے آئے اور بانو بھی ہاتھ پاؤں مارتی چلاتی ہوئی اپنا آپ ان ظالموں سے چھڑانے کی اپنی سی کوشش کر رہی تھی۔ اور پھر یہ منظر اکثر دیکھنے میں آتا کہ محلے کے ہمسایہ بچوں کی دستی زنجیر میں جکڑی ہوئی بانو تڑپتی پھڑکتی ہمارے ہاں پہنچائی جا رہی ہے۔ آخر ایک وقت ایسا بھی آیا کہ بانو ہم بھائی بہنوں کے ساتھ یوں گھل مل اور رچ بس گئی گویا بانو میری بہن ہے۔ بانو کے اس انقلاب میں میرے ابا جی کے روح میں اتر جانے والے پیار کا بہت زیادہ حصہ تھا۔ اگرچہ اماں جی نے بھی اس سے کم محبت نہیں کی تھی مگر اماں جی اس کی معلمہ تھیں اس ناطے کبھی کبھار "مرمت" بھی ہو جاتی لیکن بانو ابا جی کی مودّت و رأفت سے اس گھر کے ایک فرد کی صورت میں ڈھل گئی تھی۔ پھر دیکھتے ہی دیکھتے ماہ و سال یوں گزر گئے کہ مجھ میں اور بانو میں جدائی کا تصور بھی کبھی نہ ابھرا تھا کہ اچانک بانو کی شادی کا مسئلہ کھڑا ہو گیا۔ پھر وہ دن بھی آیا کہ بانو شادی کی رسموں کے لئے ماں باپ کے گھر نہیں جاتی بلکہ اس کا اصرار یہ ہے کہ یہ رسمیں بھی ہمارے ہی گھر میں ادا ہوں گی۔ پھر ایسا ہی ہوا۔ کیا ہوا جو بانو مہینے میں کبھی کبھار اپنے ماں باپ کے گھر بھی ہو آئے۔ پھر وہ دن بیٹیوں کی رخصتی کی تاریخ میں انوکھا دن تھا کہ ادھر دولہا کی بارات آئی ہوئی ہے ادھر بانو دلہن بنی ہمارے گھر اور ایک ایک کے گلے لگ کے رو رہی ہے اور چیخ کر اماں جی کے گلے میں بانہیں ڈالے چلا چلا کر ایک بات کہے جا رہی ہے "بیوی جی اج میں تہانوں کیوں نئیں چنگی لگدی اج مینوں کیوں گھروں کڈن لگے او۔ اج تسی مینوں کیوں اپنے کول نہیں رکھدے" بی بی جی آج میں آپ کو کیوں اچھی نہیں لگتی آج مجھے کیوں گھر سے نکالنے لگے ہو۔ آج آپ مجھے

کیوں اپنے نہیں رکھتے۔

ہمارے گھر میں کہرام بپا ہے۔ ابا جی اور ہم سب اشکبار ہیں روتے روتے ہماری ہچکیاں بندھ گئیں بڑی منتوں اور سماجتوں سے بانو اپنے میکے سے نہیں ہمارے گھر سے سید عطاء اللہ کی محبتوں کے گہوارے سے سسرال جارہی تھی یہ اس دور کی بات ہے جب بیٹیاں میکے چھوڑتے رویا ہی کرتی تھیں۔ ہماری بانو جو اب اس دنیا میں نہیں ہے اس کی محبتوں کا تذکرہ تفصیل چاہتا ہے۔ روح وفا، جان اخلاص بانو! تیری تربت پہ اللہ کی رحمتوں کا نزول ہو۔

بانو! اے کاش تو اب سن سکے کہ دنیا نے شرم و حیا، اخلاص و وفا، غیرت و حمیت اور محبت و پیار کی وہ تمام روشیں پامال کر دی ہیں۔ بانو! وہ چمن اس ظالم و سفاک مغربی تہذیب و معاشرت نے اجاڑ کے رکھ دیا ہے۔ اے کاش! حوازادیاں شرافت کے وہ رات دن پھر واپس لے آئیں۔

مسوری ہندوستان میں ایک بہت صحت افزا پہاڑی مقام ہے۔ اماں جی کا بخار ایک دفعہ بگڑ گیا۔ ڈاکٹروں نے ٹی۔ بی کا شک ڈال دیا اور بحالی صحت کے لئے معالجوں کے مشورہ سے چار برس موسم گرما میں ابا جی ہمیں وہاں لے جاتے رہے۔ خود پورے ہندوستان میں تبلیغی دوروں پر بھی جاتے تھے اور ہمارے پاس بھی کچھ وقت گزار آتے۔ قیام پاکستان کے بعد جب ہم لوگ ترک سکونت کر کے ملتان آئے۔ یہاں ایک بار فرمانے لگے کہ "میں نے ساری زندگی میں تمہیں ایک بار طمانچہ مارا تھا۔ مسوری میں تو زمین پر لیٹی ہوئی تھی اٹھتی نہ تھی"۔ میں کہہ بیٹھی کہ نہیں ابا جی ایک تھپڑ اور بھی ہے اور بیر خریدنے کا قصہ سنایا۔ انکی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ فرمانے لگے۔ "مجھے معاف کر دو! تم نے اب تک یاد رکھا ہوا ہے"؟ میں نے عرض کیا نہیں جی کبھی پٹتی جو نہ تھی اس لئے یاد رہ گیا ہے عمداً تو یاد نہیں رکھا! اللہ کی رحمتیں بارش کی طرح ان کے مرقد پر برسیں! مسوری ہی کا ایک اور واقعہ چند دفعہ انہوں نے دہرایا اور ہر بار آبدیدہ ہو جاتے۔ ہوا یوں کہ ایک دن سیر کے لئے نکلے تو مجھے گود میں لیا ہوا تھا۔ ڈھلوان سے نیچے اترتے ہوئے پاؤں پھسل گیا۔ ابا جی منہ کے بل گرے مگر مجھے بچانے کی کوشش کی میں گری تو سہی لیکن صرف ان کے ہاتھ کا بوجھ مجھ پر آیا فرماتے تم نے اٹھ کر یہ نہیں کہا کہ مجھے چوٹ لگی بلکہ ماں کو شاگردوں کی پیروی میں کہا! "بیوی جی شاہ جی ڈگ پئے شاہ جی نوں سٹ لگی اے" (بی بی جی شاہ جی گر گئے، شاہ جی کو چوٹ لگی ہے) بیٹی تھی نا! گھر میں ان کا آنا سب کے لئے خوشی کا باعث ہوتا مگر مجھے تو ایسی ہی خوشی ہوتی تھی جیسی بچپن میں عید کی! وہ کبھی خالی ہاتھ گھر نہیں آتے تھے۔ اسٹیشن سے گلوالی دروازہ آتے ہوئے ہال بازار سے موسم کا عمدہ پھل خرید کر آتے۔ اچھے سے اچھے کھانے کھلاتے اور یوں بھی ان کے طفیل اللہ کی نعمتیں گھر کا احاطہ کئے رہتیں مگر جو چیزیں ان کے لئے قطعی ناقابل برداشت تھیں۔ ہمارے حق میں بالخصوص اور متعلقین کے لئے بالعموم وہ تھیں جھوٹ اور چوری۔ بڑے سے بڑا نقصان سچ بولنے پر معاف فرما دیتے تھے۔ سزا نہیں دیتے تھے بلکہ سمجھاتے تھے۔ امرتسر کا مکان مختصر مگر بڑے قرینے کا پختہ بنا ہوا تھا جو ابا جی نے اپنے استاد زادے اور ہم سبق حضرت مولانا بہاء الحق قاسمی مرحوم و مغفور سے خرید ا تھا۔ حضرت مفتی غلام مصطفیٰ صاحب قاسمی رحمہ اللہ کے مرید مستریوں نے بڑی عقیدت سے بنایا ہوا تھا۔

مولانا مرحوم نے وہ اباجی کے ہاتھ بیچ دیا اور بالکل سامنے اور بنا لیا۔ ۱۹۴۷ء تک ہم لوگ آمنے سامنے رہے۔ بیٹھک، صحن اور دونوں ڈیوڑھیوں میں سیاہ و سفید ٹائلوں کا فرش تھا۔ بچپن میں چینی کا کوئی برتن ہاتھ سے چھوٹ جاتا تو کرچی کرچی ہو جاتا۔ اماں جی ہلکی سی سرزنش کرتیں۔ جب کبھی اماں جی چھت پر ہوتیں اور میں نیچے برتن توڑ لیتی تو پھر دل سے بے اختیار اباجی کی آمد کی "پرخلوص" دعائیں نکلتیں کیونکہ سچ بولنے پر ایک تھپڑ بھی نہیں پڑتا تھا صرف احتیاط سے اٹھانے کا کہتے تھے۔ ویسے بچپن میں مجھ سے برتن ٹوٹے بھی بہت! ایک دن مولانا بہاء الحق صاحب کی ایک لڑکی سے کھیلتے کھیلتے لڑائی ہو گئی۔ وہ برا بھلا کہہ کر گھر چلی گئی۔ چھت پر کھیل رہے تھے۔ مجھے اپنے غصہ کے فرو کرنے کی یہ صورت نظر آئی کہ سلیٹی سے دیوار پر اس کا نام لکھ کر آگے کوئی نازیبا لفظ لکھ دیا کچھ دیر بعد اباجی چھت پر گئے اور وہ لفظ انہوں نے لکھا دیکھ لیا۔ نیچے آئے اور مجھے آواز دے کر بیٹھک میں بلایا۔ پاس بٹھا کر آرام سے پوچھا کہ اوپر دیوار پر فلاں لفظ تم نے لکھا ہے؟ مارے ندامت اور خوف کے میرا خون خشک ہونے لگا اور قوت گویائی جواب دینے لگی۔ مجھے علم تھا کہ وہ ماریں گے نہیں۔ مگر جب کسی غلطی پر وہ فرماتے بٹیا یہ حرکت تم نے کی؟ تو جی چاہتا زمین پھٹ جائے اور میں روپوش ہو جاؤں۔ محض اس شرمندگی سے بچنے کے لئے میں نے جھوٹ بولا کہ نہیں جی میں نے نہیں لکھا بچپنے میں اتنا سوچنے کی ہوش کسے تھی کہ وہ تو ہاتھ پڑھ لیتے ہیں۔ انہوں نے مارا نہ برا لفظ کہا دو تین دفعہ وقفے وقفے سے جب پوچھا کہ کیا تم نے نہیں لکھا تو محسوس ہو گیا کہ سچ بولنے کے علاوہ نجات کی کوئی صورت نہیں۔ میں نے مان لیا کہ ہماری لڑائی ہوئی تھی اور میں نے ہی لکھا ہے۔ فرمانے لگے تو جھوٹ کیوں بولا؟ آئندہ کبھی جھوٹ نہ بولنا جاؤ اور جا کر دیوار سے وہ لفظ مٹا دو۔ یہ لکھنے کا مقصد یہ ہے کہ وہ اخلاقیات کے سلسلہ میں معمولی باتوں پر بھی نظر رکھتے تھے۔ یہ آٹھ نو برس کی عمر کی بات ہو گی۔ ایک دفعہ وہ بہت دنوں کے لئے دورہ پر گئے ہوئے تھے۔ میرا دل بہت اداس تھا۔ وہ بہت ٹھنڈا پانی پیتے تھے اور گرمی کے موسم میں گھر میں زیادہ پیاس کے وقت کسی بادیے یا بڑے برتن سے پیتے تھے۔ میں نے وہی برتن اٹھایا اور اس سے اباجی کی طرح ہی منہ لگا کر پانی پیا۔ جب اباجی واپس آئے اور حسب معمول کھانا کھاتے وقت مجھے ساتھ بٹھا لیا تو میں نے کہا اباجی میرا دل آپ کے لئے بہت اداس تھا تو میں نے اس برتن سے ویسے ہی منہ لگا کر پانی پیا تھا جیسے آپ پیتے ہیں "اباجی ایہہ وی تے اک طراں دی یاد ای اے نا؟" (یہ بھی تو ایک طرح کی یاد ہی ہے نا؟) یہ بات ان کے دل کو لگی اور آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ ۱۹۴۶ء میں جب کیبنٹ مشن ہندوستان کی تقدیر کا فیصلہ کرنے دہلی آیا تو دیگر جماعتوں کی طرح احرار کے رہنما بھی اباجی سمیت مہینہ کے قریب دہلی رہے۔ ظاہر ہے میں یاد تو آتی ہوں گی۔ ڈاکٹر تاثیر مرحوم جب دہلی رہتے تھے۔ شیخ (حسام الدین) چچا جان اور اباجی کی انہوں نے دعوت کی۔ ڈاکٹر صاحب اپنی انگریز بیگم کو سامنے لے آئے۔ انہوں نے بچوں کا پوچھا۔ تفصیل بتانے کے بعد یہ قصہ ڈاکٹر صاحب کو سنایا فرمانے لگے۔ ڈاکٹر متحیر سا ہو گیا دو تین دفعہ بے اختیار اس کے منہ سے لکلا رے ارے۔ فرمانے لگے۔ ڈاکٹر کی بیوی پوچھنے لگی کہ بچے کتنے ہیں؟ میں نے کہا چار بیٹے اور ایک بیٹی وہ کہنے لگی آپ لوگ بیٹی کو حقیر سمجھتے ہیں۔ آپ نے یہ نہیں کہا کہ پانچ بچے ہیں بلکہ یوں کہا کہ چار بیٹے اور ایک بیٹی۔ میں نے کہا نہیں بابا یہ

بات نہیں مجھے تو بیٹی بیٹوں سے زیادہ پیاری ہے۔ اور حقیقت بھی یوں ہی تھی مگر وہ تو جھاڑ کا کانٹا بن کر چمٹ گئی۔ میں نے ڈاکٹر سے کہا میرا پیچھا چھڑا دو وہ مسکرا کر کہنے لگا باپ جانے اور بیٹی! میں تو دخل دیتا نہیں پھر فرمایا کہ ڈاکٹر تاثیر کہتا تھا انگریز عورتوں کو جب کوئی بیٹی کہے تو بہت خوش اور متاثر ہوتی ہیں۔ مجھ سے رہا نہ گیا میں نے کہا اباجی ہندوستان سے ایسا کون گیا ہے جس نے وہاں بیٹی بنائی ہو؟ جو گیا بیوی ہی بنا کر لایا ظاہر ہے بیٹی کہنے والے سے متاثر تو ہوں گی۔ اور اباجی تو گھر کی جمعدارنیوں تک کو امرتسر، ملتان میں بیٹی ہی کہہ کر بلاتے تھے۔ بچپن سے دیکھتے آئے کہ گھر میں آنے والی خواتین بیعت کے لئے آئیں یا ویسے کسی کام سے عمر کے مطابق اماں، بہن اور بیٹی کہہ کر مخاطب فرماتے۔ امرتسر میں ہماری جمعدارنی مسلمان تھی "خیراں" نام تھا اماں جی نے اس کو نماز یاد کرائی آدھا سپارہ اس نے پڑھا پھر اپنے کام کی مجبوری میں چھوڑ دیا۔ اس کی بھی ایک ہی بیٹی تھی کبھی کبھی وہ گھر آتی اور ہمارے ساتھ کھیلتی۔ ۴۵ء میں ہم لوگ کشمیر جانے لگے تو وہ کہنے لگی "شاہ جی! حمیدہ کہتی ہے میرے لئے کشمیر سے اخروٹ کی لکڑی کی بنی ہوئی ایک صندوقچی ضرور لائیں جس پر پھول لکڑی کو کھود کر بنائے جاتے ہیں" اباجی نے نہ صرف اس فرمائش کو یاد رکھا بلکہ خود جا کر سری نگر کی انار کلی "امیرا کدال" سے ایک خوبصورت صندوقچی خریدی اور امرتسر آ کر جمعدارنی کو دی۔ وہ مصائب میں گھبراتے نہیں تھے متوجہ الی اللہ ہو جاتے تھے۔ اپنی تکلیف کی پرواہ نہیں کرتے تھے مگر ہماری تکلیف ان سے برداشت نہیں ہوتی تھی۔ ۴۷ء سے بے خانماں ہو کر ہم لوگ چھ ماہ لاہور پڑے رہے۔ کوئی ڈھنگ کا مکان ڈھونڈنا ان دنوں جوئے شیر لانا تھا۔ گوجرانوالہ کے کوئی عقیدت مند ایک دن آئے اور کہنے لگے۔ ہمارے محلہ میں ایک مکان ہے۔ اس کا سکھ مالک چابی ان صاحب کو غالباً دے گیا تھا آپ آ کر دیکھ لیں! بادل نخواستہ گئے اور دوپہر گوجرانوالہ کاٹ کر واپس لاہور آ گئے۔ ہم لوگ ان دنوں مجلس احرار اسلام کے ترجمان روزنامہ آزاد کے دفتر کی بالائی منزل پر ایک کمرے اور چھوٹے سے صحن میں گزارا کر رہے تھے۔ ایک کمرے میں چودھری افضل حق صاحب مرحوم کے کنبے کا سامان تھا اور چھٹیاں گزارنے جاتے ہوئے وہ لوگ یہ کمرہ ہمیں دے گئے تھے!

اباجی! گوجرانوالہ سے واپسی پر اوپر تشریف لائے اور اماں جی سے کہنے لگے۔ استغفر اللہ! دوپہر کانٹوں پر گزاری ہے میں چارپائی پر لیٹا نیچے نظر پڑی تو اس سکھ کے پیاز بھی پڑے ہوئے تھے۔ میں نے سوچا میرا ان چیزوں پر کیا حق ہے؟ ہم لوگ اگست کے اواخر تک دفتر ہی کے کمرے میں پڑے رہے۔ کمرے میں دو چارپائیاں بچھتیں دوپہر کو بھائیوں اور اماں جی نے لیٹنا ہوتا تھا۔ میں دو کرسیاں آمنے سامنے بچھا کر ان پر لیٹ جاتی۔ آخر نواب زادہ نصر اللہ خاں صاحب نے اباجی کو اپنے ہاں (خان گڑھ) چلنے کی دعوت دی۔ فی الحقیقت ہمارے لئے اس وقت یہ پیش کش انتہائی قابل قدر تھی۔ نوابزادہ صاحب نے اپنی واحد حقیقی ہمشیر سے اپنا مکان فارغ کروا کر ہمیں دیا اور اپنے مردانہ بنگلہ کا آدھا حصہ ان کو رہائش کے قابل بنا دیا اور ان کے پورے خاندان نے ضروریات زندگی کے جمع کرنے میں ہر طرح سے مدد کی۔ امرتسر کے تیس پینتیس برس سے بستے گھر سے جو سامان لے آئے وہ ایک گدا، ایک لحاف، تین چار کھیس، ایک بوری برتن، مستعمل کپڑوں کے

تین چار بکس اور سلائی مشین پر مشتمل تھا۔ یہ بھی اماں جی کی ہمت سے۔ جس دن امرتسر سے نکلے ہیں انہوں نے اباجی سے کہا جہاں بھی جا کر رہیں گے کیا کیا چیز کسی سے مانگیں گے۔ دفتر میں رہائش کے دنوں میں آغا شورش کاشمیری مرحوم و مغفور اور غازی محمد حسین صاحب مرحوم سالارِ اعظم جیوش احرار اسلام نے بارہا کہا کہ ہم ٹرک لے کر امرتسر جاتے ہیں۔ رضا کاروں کو ساتھ لے کر آپ کا سامان نکال لاتے ہیں۔ مگر اباجی نے فرمایا نہیں بھائی میں یہ نہیں سننا چاہتا کہ عطاء اللہ شاہ نے اپنے سامان کے لئے لوگوں کے بچے مروا دیئے کیونکہ ہندو سکھ جب کسی مسلمان کو اپنے محلے سے گزرتا دیکھتے تھے اپنے مکانوں کی چھتوں اور کھڑکیوں سے بم گراتے تھے۔ ہمارے محلہ کے دو لڑکے اباجی اور بھائی جان سے ملنے لاہور آنے لگے تانگہ ہال بازار میں پہنچا تو کسی طرف سے دستی بم گھوڑے پر گرا وہ پچھلی سیٹ سے چھلانگیں لگا کر کودے اور پیدل بھاگتے ہوئے اسٹیشن پر پہنچے۔ خانگڑھ کا قیام شروع میں ہمارے لئے بڑا عجیب تھا۔ رشتہ دار، وطن، ہمسائے سب چھوٹ گئے تھے۔ کوئی شناسا چہرہ نظر نہ آتا سوائے اباجی کے اور کسی کو زبان بھی سمجھ نہ آتی۔ کوئی لفظ اماں جی سمجھ لیتیں کہ ملتان بہاول پور سے کبھی کوئی مرید عورت ملنے امرتسر چلی جاتی تھی۔ آب و ہوا بھی ناموافق رہی۔ ایک سال کے قیام کے دوران اکثر اوقات سب بہن بھائی اور اباجی بخار میں مبتلا رہے۔ اباجی کو کچھ افاقہ ہوا تو بھائی عطاء المحسن شدید بخار میں مبتلا ہو گیا۔ ایک دن اسے سرسام ہو گیا۔ ایسی کیفیت کبھی کسی کی نہ ہوئی تھی۔ اماں جی کے مثالی صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا۔ انہوں نے روتے ہوئے مجھے کہا اپنے اباجی کو بلاؤ میں نے دوڑ کر مردانے کی کنڈی کھٹکھٹائی۔ اباجی نقاہت کی وجہ سے بمشکل چل کر آئے خان گڑھ میں تو ان دنوں معالج نام کی کوئی چیز دستیاب نہ تھی۔ اچھرہ سے اباجی کے رفیقان جماعت جناب میاں قمرالدین، میاں محمد رفیق صاحبان مرحومین کے ایک عزیز حکیم خالق داد صاحب مرحوم آئے ہوئے تھے۔ ان کو بلایا وہ بے چارے فوراً ہی آ گئے اور ان کی تدبیروں سے گھنٹہ بھر بعد بھائی کو ہوش آیا اور آج وہ منظر میری آنکھوں کے سامنے ہے کہ جب محسن بھائی نے آنکھیں کھولیں تو اباجی اینٹوں کے فرش پر سجدہ میں گر گئے۔ اور روتے ہوئے کہنے لگے مولا! میں اس آزمائش کا متحمل نہیں ہوں!

جس دن ہم لاہور سے خان گڑھ روانہ ہوئے تانگہ میں بھائی جان نے کوئی بات کی وہ تو میں نے نہیں سنی مگر اباجی کا جواب آج بھی یاد ہے کہ "بیٹا کوئی سہارا نہیں سوائے اللہ کے اور لعنت ہے اس سہارے پر جو ما سوا اللہ کے ہو"۔ خان گڑھ میں ہم ایک برس سے کچھ دن کم ہی رہے۔ جب حضرت مولانا خیر محمد صاحب جالندھری رحمہ اللہ ملتان تشریف لے آئے اور مدرسہ کا دوبارہ اجراء ہو گیا تو انہوں نے بھائی جان کو بلوا لیا تھا اور پاکستان بننے کے بعد خیر المدارس سے جو پہلا گروپ فارغ التحصیل ہوا بھائی جان اسی میں شامل تھے۔ مگر چھوٹے بھائیوں کی تعلیم کا بندوبست نہیں ہو رہا تھا۔ اباجی اس باب میں متفکر تھے اور ملتان میں اپنے احباب کو مکان کی تلاش کا کہہ رکھا تھا۔ ۵ فروری ۴۸ء کو ہماری سب سے چھوٹی اور سب کی چہیتی بہن سیدہ سالمہ بانو دو روزہ علالت کے بعد ہمیں داغ مفارقت دے گئی۔ اباجی اور ہم سب کے لئے غربت میں بڑا شدید صدمہ تھا۔ وہ گھر بھر کی رونق تھی۔ وہ بے چاری علی الصباح فوت ہوئی۔ اس افراتفری کے زمانہ میں ملتان سے خان گڑھ

تک ایک ہی لاری سارے دن میں چلتی تھی۔ اباجی نے اپنے ایک غریب لوہار مرید سے کہا کہ لاری پر جاکر ملتان سے حافظ کو لے آؤ وہ اڈے پر آئیا تو لاری نکل چکی تھی۔ اللہ تعالیٰ اس شخص کو بہت بہت اجر مرحمت فرمائیں وہ بے چارا اپنے سائیکل پر ہی ملتان روانہ ہو گیا۔ اور سوءِ اتفاق کہ جب وہ بھائی جان سمیت روانہ ہوا تو ملتان سے بھی کوئی لاری نہ ملی اور وہ اللہ کا بندہ پھر سائیکل پر ہی بھائی جان کو لے کر خان گڑھ پہنچا تو رات کے ۹ بج چکے تھے۔ اباجی نے عصر تک انتظار کیا۔ خان گڑھ والوں نے اپنی محبت کا اظہار یوں کیا کہ پورے بازار کی دکانیں بند رہیں۔ عصر کے بعد اباجی فرمانے لگے کہ صبح سے لوگ اپنے کام کاج چھوڑ کر بیٹھے ہیں۔ کب تک یوں ہی انہیں بٹھائے رکھوں۔ حافظ کی قسمت میں منہ دیکھنا نہیں ہے۔ تدفین کر دیتے ہیں۔ اماں جی! بے چاری خاموش رہیں کہتیں بھی کیا اور اباجی اپنی لاڈلی بیٹی کو اپنے ہاتھوں پر اٹھا کر اس کی آخری آرام گاہ تک لے گئے۔ وہ بے چاری کُل پونے دو برس زندہ رہی بھائی جان معصوم بہن کو آخری بار دیکھ سکنے پر پھوٹ پھوٹ کر روئے مگر کیا ہو سکتا تھا۔ مرضیٔ مولیٰ از ہمہ اولیٰ۔ اس کی وفات کے بعد دل اور اچاٹ ہو گیا۔ کسی کا بھی خان گڑھ میں رہنے کو جی نہیں چاہتا تھا۔ تینوں بھائی چھوٹے تھے۔ تعلیم کا وہاں کچھ بندوبست نہ تھا۔ پانی پت کے جناب قاری عبدالرحمٰن صاحب رحمۃ اللہ علیہ مہاجر ہو کر وہاں آگئے تو عارضی طور پر بھائی ان سے حفظ کرنے لگے۔ اسی اثناء میں رمضان المبارک آگیا۔ بھائی جان! ملتان سے تعطیلات میں گھر آئے ہوئے تھے وہ قرآنِ کریم سنانے لگے۔ آخری عشرہ میں ایک دن ملتان سے جناب ملک عبدالغفور صاحب انوری رحمہ اللہ اور ملک عطاء اللہ صاحب یہ خوش خبری لے کر پہنچے کہ مکان ڈھونڈ لیا گیا ہے۔ آکر دیکھ لیں۔ انہیں اباجی نے فرمایا کہ عید کے بعد آکر دیکھیں گے۔ چند ہی دن رمضان کے باقی تھے۔ وہ نماز فجر پڑھ کر ملتان واپس آگئے۔ دوپہر کو سب آرام کر رہے تھے۔ ظہر کا وقت ہوا تو ہمسائے نے پردہ کرنے کی تین آوازیں دیں جو ملتان کے علاقہ کا بڑا ہی شریفانہ اور اسلامی طریقہ ہے۔ دیکھا گیا تو وہ اپنے صحن میں آم کے درخت پر چارپائی باندھ رہا ہے۔ چھوٹا موٹا سامان رکھنے کے لئے۔ پوچھنے پر اس نے کہا سائیں دریائے چناب کا بند ٹوٹ گیا ہے۔ پانی شہر کی طرف آرہا ہے۔ پریشانی میں ظہر پڑھی گئی۔ ہنڈیا چولھے پر رکھی تو لحہ بہ لحہ خبریں آنے لگیں۔ پانی شہر میں داخل ہو گیا "کُلال کی بستی" ڈوب گئی۔ پانی ہسپتال تک آپہنچا۔ اتنے میں نواب صاحب کا پیغام آیا کہ بنگلے میں تشریف لے آئیں اور چند لمحے بعد سنا کہ بنگلے کی سیڑھیاں پانی میں ڈوبی ہوئی ہیں۔ پھر ایک معتقد خواجہ عبدالرشید صاحب نے آکر کہا میرا چوبارہ ہے آپ کے لئے فارغ کر دیا ہے وہاں آجائیں اس کے منہ سے نکل گیا وہ اونچا ہے۔ اباجی نے فوراً اسے ٹوکا "یوں مت کہو۔ حضرت نوح علیہ السلام کے بیٹے نے ایسے ہی کہا تھا۔ ویسے چلے چلتے ہیں"۔ پکتی ہنڈیا چولہے سے اتاری۔ افطاری کا وقت ہونے والا تھا کھانے کے برتن باسن لے کر خواجہ صاحب کے چوبارے پر دوبارہ پناہ گزیں ہو گئے۔ اباجی اور چند معتقد گھر رہے۔ ضروری چیزیں اٹھوائیں اور جس وقت بھائی جان تراویح پڑھا کر گھر آئے تو پانی بیرونی دیواریں گرا کر صحن میں آچکا تھا۔ کسی نے کہا "ھن تاں اٹھو کیا سوچیندے پئے او؟ (اب تو اُٹھو کیا سوچ رہے ہو) تو اباجی بھی خواجہ

صاحب کے ہاں آ گئے۔ چھ روز ہم وہیں محصور رہے۔ قیامت کا سماں تھا۔ نچلی منزل میں صاحب خانہ ان کے اہل و عیال اور کنبے کے آفت زدہ افراد بھرے پڑے تھے اور اوپر ہم لوگ۔ ایک رات تو ایسی آئی کہ پانی اس بند سے بھی ٹکرانے لگا جو شہر کے بچے کھچے حصے پر باندھ کر لوگ پناہ لئے بیٹھے تھے۔ آدھی رات کے بعد لوگ گلیوں میں آوازیں دے کر آدمیوں کو اکٹھا کر رہے تھے تاکہ بند کو مضبوط بنایا جاسکے۔ ابا جی جاگ رہے تھے۔ ہم ماں بیٹی سے فرمایا اٹھو! وضو کر کے مصلے پر آجاؤ (خود تو بیٹھے ہی تھے) مرنا ہی ہے تو اللہ کا نام لیتے ہوئے مریں۔ اللہ تعالیٰ نے کرم فرمایا۔ لوگوں کی محنت بار آور ہوئی اور بند ٹوٹنے سے بچ گیا۔ ملتان اطلاع پہنچ چکی تھی اور ابا جی کے احباب مکان کا قبضہ لے کر راستے کھلنے کا انتظار کر رہے تھے۔ چھے روز بعد پانی کچھ کم ہوا تو ہم لوگ تانگوں میں مظفر گڑھ روانہ ہوئے۔ حد نگاہ تک پانی ہی پانی تھا۔ راستے میں دیکھا درخت جڑ سے نکل کر سڑک کے کنارے گرے پڑے تھے۔ دونوں تانگوں کے بم پکڑ کر چار آدمی ساتھ چل رہے تھے۔ مبادا سڑک ٹوٹی ہو اور پتہ نہ چلے! ہمارے کپڑے اور برقعے گھٹنوں تک پانی سے بھیگے ہوئے تھے۔ دو گھنٹوں میں دو میل کا سیلاب زدہ رقبہ طے ہوا اور ظہر کے قریب ہم مظفر گڑھ پہنچے۔ اللہ تعالیٰ مخلصین کو جزائے خیر عطا فرمائیں۔ ایک زنانہ سکول کھلوا کر قیام کا بندوبست کر رکھا تھا۔ رات وہاں گزاری اور دوسرے روز گاڑی میں ملتان روانہ ہوئے۔ لائن کئی جگہ پانی میں ڈوبی ہوئی تھی۔ گاڑی اس رفتار سے چل رہی تھی کہ چند بار دیکھا کچھ لوگ اترے اور پانچ منٹ بعد بھاگ کر پھر سوار ہو گئے۔ عصر کے بعد ملتان پہنچ سکے۔ اور تانگہ مدرسہ قاسم العلوم (کچہری روڈ) کے پاس پہنچا تو افطار کا وقت ہو گیا۔ سڑک ہی پر پانی سے روزے افطار کئے۔ اور پھر اس گھر میں داخل ہوئے جہاں سے ابا جی کا جنازہ ہی اٹھا! مگر اس ساری مصیبت میں ایک لفظ انکی زبان سے شکوے کا نہیں سنا۔ استغفار ہی پڑھتے رہے۔ ابا جی کبھی کسی کی برائی نہیں سوچتے تھے۔ انگریز اور مرزائی کے سوا۔۔۔۔ خاندان کا "بابو" طبقہ یوں مُلّا سمجھ کر حقارت سے دیکھتا مگر کسی مفاد کے لئے ضرورت پڑتی تو شہرت سے فائدہ اٹھانے سے گریز نہ کرتا۔ کئی تذکرہ نگاروں نے ایک بھانجے کا قصہ لکھا ہے۔ بھانجا تو کوئی تھا ہی نہیں۔ رشتہ کی پھوپھی تھیں۔ ان کا لڑکا تھا۔ گھر میں کچھ سرزنش ہوئی تو بھاگ کر جبل پور چلا گیا اور فوج میں بھرتی ہو گیا۔ ماں فوت ہو چکی تھی۔ خالہ جنہوں نے پالا تھا روتی تھیں۔ برخوردار ناز و نعم کے پلے ہوئے تھے۔ فوج کی مشقتوں نے چھٹی کا دودھ یاد دلایا تو گھر والوں کو "مولوی صاحب" یاد آئے پھر ایک پوسٹ کارڈ ابا جی کا جبل پور گیا اور ہفتہ کے اندر صاحبزادے ڈسچارج ہو کر گھر تشریف لے آئے کبھی قرابت داروں کے سلوک کا قصہ چھڑ جاتا تو زیادہ سے زیادہ پانچ منٹ خاموش رہتے۔ پھر فرماتے "خدا کے لئے اس تذکرہ بد کو ختم کر دو۔ گھر کی برکت اڑ جائے گی۔ تمہیں خدا نے کس چیز کی کمی دے رکھی ہے؟ بٹیا اپنا معاملہ خدا سے درست رکھو کبھی کسی کا برا نہ مانگو پھر دیکھو خدا کیا کرتا ہے"! ابا جی خوددار تھے۔ شکر نعمت سے انکا دل لبریز تھا۔ غرور اور تکبر ان کے پاس سے نہ گزرا تھا۔ ہمارے داداجی مرحوم کے دو چچا اور ایک پھوپھی امرتسر میں آباد ہوئے۔ ان کی اولاد تقسیم تک وہیں آباد تھی۔ ان سب گھروں میں ایک کشمیری خاتون کام کاج کیا کرتی تھی۔ ہمارے بچپن میں وہ ضعیف العمر

تھی اور امرتسر میں پورے خاندان کے خورد و کلاں کی "ماسی" ایک دن اباجی "کٹڑہ رام گڑھ" سے گزر رہے تھے سامنے سے ماسی آ گئی۔ اباجی نے سلام کیا۔ وہ وہیں گلی میں بیٹھ کر اپنا حال سنانے لگی۔ اباجی وضع داری میں وہیں اس کی بات ختم ہونے تک کھڑے رہے ماسی بہت خوش ہوئی کہ شاہ جی نے میرا حال سنا۔ گھر آ کر یہ قصہ سنایا اور فرمایا کہ جب ماسی نے روکا تو مجھے حضور صلی اللہ علیہ وسلم یاد آ گئے انہوں نے بھی ام ایمن رضی اللہ عنہا کی باتیں ایسے ہی ایک دفعہ سنی تھیں۔ کسی کی بیٹی روٹھ کر میکے بیٹھ جاتی تو انہیں بہت دکھ ہوتا تھا۔ ملتان آئے کچھ ہی عرصہ گزرا تھا کہ محلہ میں چند گھروں کے متعلق معلوم ہوا کہ انکی بیٹیاں روٹھی ہوئی ہیں۔ فریقین کو بلایا اور جب تک وہ لڑکیاں سسرال نہیں چلی گئیں انہیں چین نہیں آیا۔ ایک دو صاحب حیثیت مرید اپنی زکوٰۃ ان کی تحویل میں استعمال کے مکمل اختیار کے ساتھ دے دیتے تھے۔ اباجی نے محلہ ٹبی شیر خاں میں پانچ غریب لڑکیوں کا جہیز اس رقم سے تیار کرایا اور والدین کو بیٹیوں کی رخصتی میں مدد دی۔ ایک گھر میں نلکا لگوایا۔ محلہ کی مسجد بی بی عائشہ ٹوٹ رہی تھی اپنے احباب کی توجہ دلائی۔ خصوصاً حاجی دین محمد صاحب مرحوم کو جو مرید تو حضرت مولانا احمد علی لاہوری رحمہ اللہ کے تھے مگر اباجی سے بھی بہت محبت تھی۔ وہ لاہور سے تشریف لائے۔ اپنا پکاتے کھاتے اور پلے سے لگا کر مسجد مرمت کی مگر "بیماریٔ دل" میں مبتلا لوگوں نے ایک طرف تو کسی ملتانی پیر سے بکرے کی سری ٹونا کرا کر حاجی صاحب کی رہائش گاہ میں پھینکی اور ادھر متولی حضرات کے کانوں میں ڈالنا شروع کیا کہ شاہ جی کا ارادہ مسجد پر قبضہ کرنے کا ہے۔ حاجی صاحب اس قصہ سے بددل ہو گئے۔ حسبِ دل خواہ تو نہیں مگر بہر حال مسجد تعمیر کر کے واپس چلے گئے۔ اباجی کے کہنے پر بھائیوں نے چند بار رمضان میں وہاں قرآن پاک سنایا۔ اباجی نے مسجد کے ہمسایہ زمیندار سے تھوڑی سے زمین بھی خرید کر مسجد میں شامل کی۔ کھیتوں میں کچھ حضرات رفع حاجت کے لئے مسجد سے گزر کر جاتے تھے وہاں دیوار بنوا دی۔ کچھ لوگوں نے بڑی دل شکن باتیں کیں۔ بھائیوں کو طیش آیا تو فرمانے لگے۔ "میں نے جو کچھ کیا اللہ کے لئے کیا۔ ایک سید زادی کی بنوائی ہوئی مسجد تھی میں نے دیکھا ٹوٹ رہی ہے بنوا دی۔ تم نماز پڑھیں اور پڑھ لیا کرو جانا ہی چھوڑ دو"۔ بعض وقت سوچتی ہوں اباجی کیا تھے اور لوگوں نے کیا کہا؟ ہماری سب سے بڑی بہن پیدا ہوئی تو وہ میانوالی جیل میں تھے اسے دیکھا بھی نہیں وہ فوت ہو گئی مجھ سے بڑی بہن چار ماہ کی تھی تو وہ اپنے مشہور دورہ پر نکلے وہ سوا سال کی ہو کر رخصت ہو گئی اور اسے فوت ہوئے چند ماہ گزر چکے تھے جب اباجی دیناج پور جیل سے رہا ہو کر تشریف لائے کیا یہ سب کسی دنیوی مفاد کے لئے تھا؟ انہوں نے جدوجہد آزادی میں جان کی بازی لگا کر حصہ لیا۔ آخری بیماری میں ملتان کے مشہور معالج ڈاکٹر خان دیکھنے آئے تو کہنے لگے۔ شاہ صاحب آپ کو خدا نے سو سال تک نہ گھلنے والا جسم دیا تھا جسے آپ نے تیس برس میں ختم کر دیا۔ تارا سنگھ نے خون کی ندیاں بہانے کی بڑک ماری تو جواب انہوں نے ہی دیا فرمایا "ایسا مت کہو میں نے اپنی توانائی صحیح مقصد پر صرف کی ہے" کشمیر اور کپور تھلہ کی غیر مسلم ریاستوں کے حکمرانوں کے ظلم کے خلاف تحریک انکی جماعت نے چلائی۔ راج پال کا فتنہ انہوں نے کچلا۔ ایک واقعہ یاد آ رہا ہے ۲۱ء میں جب میانوالی جیل میں تھے کانگریس کا سربر آوردہ کارکن سردار منگل سنگھ ایم ایل اے بھی ساتھ تھا۔ اس سے دوستانہ

تعلقات تھے۔ نواکھالی یا بہار کے فسادات میں اس نے مسلمانوں کے قاتلوں کی پشت پناہی کی۔ ابا جی کو اطلاع مل گئی۔ ۱۹۴۷ء میں جب ہم لوگ دفتر احرار میں مقیم تھے تو ایک عقیدت مند فضل کریم سیٹھی صاحب چند دن کے نجی دورہ پر سرحد لے گئے۔ واپسی پر روداد سفر سناتے ہوئے فرمایا جب پشاور اسٹیشن پر اترے تو دیکھا منگل سنگھ دوڑتا ہوا آرہا ہے۔ پاس آکر معانقہ کے لئے ہاتھ بڑھائے مگر میں نے ہاتھ نیچے کر کے کہا اب نہیں! میری قوم کو مروا کر مجھ سے معانقہ کرنے آئے ہو؟ اور قوم!! ؟ امرتسر کا مکان برلب سڑک تھا بیٹھک کی کھڑکیوں پر چقیں پڑی رہتیں۔ ایک دن دیکھا دو شخص گزر رہے تھے ایک نے دوسرے سے پوچھا یہ کس کا مکان ہے؟ دوسرا اپنے دونوں ہاتھ پھیلا کر ابا جی کی جسامت کی نشان دہی کرتے ہوئے بولا۔ عطاء اللہ شاہ کا۔ شہید گنج کا پیسہ لے کر بنایا ہے! حالانکہ یہ مکان مولانا بہاء الحق قاسمی مرحوم سے ۳۴۰۰ روپے میں اماں جی کا زیور بیچ کر اور قرض لے کر خریدا گیا تھا۔ ابا جی گھر میں ہوتے تو معمولی باتوں کا بھی دھیان رکھتے کبھی کبھی ہم بہن بھائیوں کو ساتھ بٹھا کر کھانا کھلاتے "کبھی" اس لئے کہ ابھی سفر سے واپسی پر سامان رکھا جارہا ہوتا اور ملاقاتی آن موجود ہوتے تھے مگر جب موقع ملتا تو پھر سمجھاتے بھی تھے۔ لقمہ چھوٹا لو، منہ میں پھراؤ مت، ایک طرف رکھ کر چبا، دستر خوان سے سالن والا ہاتھ نہ پونچھتے رہو؟ ہڈی پاس کسی برتن میں رکھو نیچے مت گراؤ؟ پھل کھا کر چھلکا زمین پر مت پھینکو۔ وہ گھر سے رخصت ہونے سے لے کر واپسی تک کی روداد سفر ہمیں سناتے اور ہمیں یوں محسوس ہوتا کہ ہم ابا جی کے ساتھ ہی تھے! یکے بعد دیگرے بھائی قرآن حفظ کرتے رہے۔ اور جب پہلی دفعہ کوئی تراویح میں پڑھتا تو انکی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہ ہوتا۔ کئی دفعہ ختم پر دیگ پکوا کر تقسیم کی۔ اچھے شعر سناتے تھے بلکہ یاد کراتے تھے۔ ایک روز میں نے کہیں پڑھا۔

فغاں کہ مجھ غریب کو حیات کا یہ حکم ہے
سمجھ ہر ایک راز کو مگر فریب کھائے جا

ایک روز شام کے وقت کمرے میں برتن نکال رہی تھی صحن میں لے جانے کے لئے تو پھر شعر یاد آیا پڑھنے کو جی چاہا اور میں نے اپنی یہ خواہش پوری کر لی۔ برتن لے کر مڑی تو دروازے پر ابا جی کھڑے مسکرا رہے تھے۔ میں بہت نادم ہوئی ذرا اونچی آواز سے پڑھا تھا۔ فرمانے لگے کیا پڑھ رہی تھیں۔ پھر سنانا پڑا۔ فرمانے لگے بس ابا کی زندگی یہی ہے۔ بچپن میں ایک شعر سنایا تھا اب تک یاد ہے۔

غم آرزو کا حسرت سبب اور کیا بتاؤں
مری ہمتوں کی پستی مرے شوق کی بلندی

بٹیا تو مجھے ساری عمر کہا مگر جب میری پہلی بچی باتیں کرنا سیکھنے لگی تو "بٹیا جی" کہنا شروع کر دیا۔ ان کے منہ سے اپنا اتنا ادب مجھے بہت محجوب کرتا آخر ایک دن کہا کہ ابا جی اب آپ مجھے "جی" کہتے ہیں شرم آتی ہے۔ فرمانے لگے ننھی کے لئے کہتا ہوں تاکہ جی سنے اور جی کہے!

جنرل محمد ایوب خان کے زمانہ کی بات ہے۔ سکھ یاتری پہلی مرتبہ پاکستان آئے اور زندہ دلان لاہور نے یوں استقبال کیا جیسے عزیز و اقارب سفر حج سے واپس آئے ہیں۔ ابا جی نے اخبار پڑھا اس روز عصر تک

بیٹھک ہی میں بیٹھے رہے اندر نہیں آئے۔ عصر کے وقت آئے اور خاموش خاموش صحن میں ٹہلنے لگے۔ اماں جی نے چائے کا پوچھا تو فرمانے لگے "صبح سے میرا خون کھول رہا ہے۔ قوم دیوث ہو گئی ہے اب کن کا استقبال کر رہے ہیں؟ ایک لاکھ جوان کٹوائے۔ ساٹھ ہزار بیٹی ہندو سکھوں کے قبضہ میں دی۔ فاطمہ اور عائشہ نام کی لڑکیوں کے بطن سے ہر نام سنگھ اور لچھمن سنگھ پیدا ہوئے اور اب پھر انہی کو بلا کر گلے مل رہے ہیں۔ اے کاش! آج میری صحت ہوتی تو لاہور میں تقریر کرتا۔ اور پوچھتا کہ کن دامادوں کو بلایا ہے" مرض الموت حقیقت میں سکھر جیل سے شروع ہو چکا تھا۔ جہاں بارہ آنے میر کے چھیچھڑے گوشت کے نام پر پکائے جاتے۔ مسور کی دال اور گلے سڑے بینگن کھلائے جاتے۔ ایک بزرگ حج سے واپس آئے اور کہا مجھے مدینہ طیبہ میں زیارت رسول صلیٰ اللہ علیہ وسلم کا شرف حاصل ہوا انہوں نے فرمایا عطاء اللہ شاہ کو میرا پیغام دینا کہ میری نبوت پر دشمن حملہ آور ہیں تم آرام سے مت بیٹھو (ان بزرگ کی روایت کے الفاظ ہیں۔ واللہ اعلم) اس دن وہ بہت روئے اور بار بار فرمایا مجھے پیغام آیا ہے؟ پھر جب تک ان میں ذرا بھی سکت باقی رہی انہوں نے اپنی پوری توانائیاں عصمت رسول اور ختم نبوت کے بیان میں صرف کیں۔ فالج کا پہلا حملہ ہونے سے چند روز قبل دانت نکلوائے یوں تو چاول شوگر کا علم ہونے پر چھوڑ دیئے تھے مجبوری کی بناء پر ان دنوں میں دو تین دن کھچڑی کھائی۔ زندگی کے آخری برسوں میں مغرب سے عشاء تک اوراد میں مشغول رہتے تھے۔ اور عشاء پڑھ کر کھانا کھاتے تھے۔ اس روز وظیفہ پڑھ رہے تھے کہ مولوی محمد علی صاحب جالندھری مرحوم آکر بیٹھ گئے۔ عشاء کے بعد تک کسی مجلسی مسئلہ پر گفتگو کرتے رہے۔ اماں جی چولھے کے پاس بیٹھی تھک گئی تھیں۔ نماز پڑھ کر لیٹ گئیں۔ میں بیٹھی رہی۔ کھچڑی ایسا کھانا ہے کہ پکنے کے بعد تیز آنچ پر نہیں رکھا جاسکتا۔ انگاروں پر دیگچی پڑی رہی۔ مولانا اٹھ کر گئے تو اباجی اندر آئے۔ برآمدے میں پلنگ پر بیٹھ کر کھایا کرتے تھے وہیں چولھے بنے ہوئے تھے۔ میں نے کھچڑی نکال کر دی تو نیم گرم بھی کھاتے کھاتے ٹھنڈی ہو گئی۔ کھاتے ہوئے دو دفعہ فرمایا آج میرے جسم میں ایک خاص کیفیت ہے پھر کلی کی اور بیٹھک میں چلے گئے۔ میری طبعیت میں تشویش سی پیدا ہوئی میں پھر جا کر بیٹھک میں دری پر بیٹھ گئی۔ فرمانے لگے پان کھالو۔ جی نہیں چاہ رہا تھا محض ان کے کہنے کی بناء پر میں نے ایک ٹکڑا لگا کر منہ میں رکھ لیا۔ فرمانے لگے جاؤ آرام کرو۔ اگالدان صاف کر کے رکھا۔ ان کے الفاظ صحیح سمجھ نہیں آتے تھے مگر میں نے سمجھا کہ دانت نکلنے سے منہ متورم ہے اس لئے اس طرح بول رہے ہیں۔ علی الصباح وہ اٹھے تو انہیں محسوس ہو گیا کہ دایاں بازو صحیح کام نہیں کر رہا۔ مگر وضو کر کے مسجد سے باجماعت نماز پڑھ کر آئے اور مصلے پر اپنا کالا کمبل اوڑھ کر بیٹھ گئے۔ معمول یہ تھا کہ مسجد جانے سے قبل برآمدے میں آکر السلام علیکم یا اھل البیت صبحکم اللہ بالخیر

فرماتے اور بھائیوں کو نام لے لے کر آوازیں دیتے اور اٹھا جاتے اس روز اندر نہیں آئے۔ میں نماز پڑھ کر اپنے دونوں بچوں کو لے کر بیٹھک میں گئی۔ یہ بھی روز کا معمول تھا بچے اٹھتے ہی مچلتے تھے کہ نانا اباجی کے پاس چلیں۔ کپڑے پہنا کر لے جاتی۔ مصلے پر بیٹھے بیٹھے دونوں کو چومتے اور بچے سلام کر کے تھوڑی سی دیر بیٹھ کر آجاتے۔ پھر ناشتہ کے لئے اندر آتے تو ساتھ بٹھا لیتے۔ اس روز میں نے جا کر سلام کیا تو پڑھتے ہوئے اشارے

سے سلام کا جواب دیا اور میری طرف دیکھ کر بایاں ہاتھ دائیں پر پھیرا اور نفی میں سر ہلایا۔ ایک سیکنڈ میں میں سمجھ گئی وہ کیا کہہ رہے ہیں مگر میرا دل کہتا تھا اے کاش یہ نہ ہو۔ میں فوراً ہی واپس اندر گئی اور اماں جی سے رک رک کر کہا اباجی کی طبیعت خراب ہے شاید ان کے بازو کو کچھ ہو گیا ہے۔ دو منٹ کے اندر اندر ہم ماں بیٹی پھر بیٹھک میں آ گئیں انہوں نے تسبیح مکمل کر کے بتایا کہ اٹھا ہوں اور نلکا چلانے لگا تو ہاتھ کام نہیں کر رہا تھا۔ میں نے جیسے تیسے وضو کیا اور کلمہ پڑھا

لَا اِلٰہَ اِلَّا اللہ مُحَمَّدٌ رَسُوْلُ اللہ لَا نَبِیَّ بَعْدَہٗ وَلَا رَسُوْلَ بَعْدَہٗ

اور پھر بھی زندہ رہا تو مسجد چلا گیا۔ اماں جی نے عرض کیا جب آپ نے محسوس کیا کہ طبیعت ٹھیک نہیں تو ہمیں کیوں آواز نہیں دی۔ اور پھر ٹھنڈے پانی سے وضو کر لیا تو فرمایا کہ یہ سوچا جو ہونا ہے وہ تو ہونا ہی ہے پریشان کیا کروں۔ اماں جی نے فوراً ہی چائے بنائی۔ دواء لسکٹ وغیرہ کھا کے چائے پی۔ دھوپ نکلی تو صحن میں بستر بچھا کر ہم لوگ ان کو بیٹھک میں سے لے آئے جناب حکیم عطاء اللہ خان صاحب مرحوم (جو ہمارے ہاں بڑے حکیم صاحب کہلاتے تھے) کو بلایا انہوں نے آ کر غذا وغیرہ قطعاً بند کر کے ماء العسل اور دیگر ادویہ دیں۔ یہ خبر شہر بھر میں پھیل گئی کہ ان پر فالج کا حملہ ہوا ہے اور جوق در جوق لوگ عیادت کے لئے آنے لگے مجبوراً برآمدے کی چقیں گرا کر ہم اندر گئیں۔ اور ملاقاتی صحن میں ہی آ کر ملنے لگے۔ جماعت اسلامی کے باقر خان صاحب اور بابو سید نصیر احمد صاحب بھی آئے انہوں نے اپنا تعارف کرایا کہ ضلع جالندھر کے فلاں گاؤں میں آپ گئے تھے اور میں نے وہاں آپ کو دیکھا تھا۔ اتنی تکلیف میں بھی اس وقت تک لقوہ کا اثر بھی چہرے پر ظاہر ہو رہا تھا مسکرا کر فرمانے لگے "اوہ کیہڑی گلی جتھے بھابھو نیئں کھلی" اور پھر بڑے مزے سے ان کو بتایا کہ دانت نکلوانے کی وجہ سے چند دن سے کھچڑی کھا رہا تھا اور رات کچھ ٹھنڈی ہو گئی تھی اپنی طرف سے یہی کسر باقی رکھی کہ گھڑے کا پانی نہیں پیا۔

بیماری کے ایام میں ایک دن صبح فرمانے لگے کہ آج ضعف بہت ہے چلا نہیں جاتا۔ پھر ناشتہ کیا (ناشتہ ہوتا کیا تھا؟ دو انڈوں کی زردی، دو تین بسکٹ اور دو پیالی چائے۔) پھر فرمانے لگے کہ چلتا ہوں ذرا حنیف اللہ تک! (حکیم عطاء اللہ خان صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے فرزند) میں نے عرض کیا اباجی! ضعف ہے مت جائیے۔ فرمانے لگے ذرا دل بہل جاتا ہے۔ کلہاڑی ٹیکتے ہوئے دروازہ تک گئے تھوڑی دیر بعد دیکھتی ہوں تو زنانہ دروازے کے سامنے پردہ کی جو دیوار بنی تھی اس کے پاس کھڑے ہیں۔ آواز دی۔ "بٹیا" میں جی کہہ کر بھاگتی ہوئی گئی تو دیکھا کپڑے مٹی سے بھر رہے ہیں۔ فرمایا بیٹا میں گر پڑا۔ میں ان کی حالت دیکھ کر رو پڑی۔ کپڑے جھاڑے۔ عرض کیا اباجی میں نے تو کہا تھا آج نہ جائیے۔ فرمانے لگے۔ دروازہ کھولا ہی ہے کہ گر پڑا۔ پھر میرے بازو کا سہارا لے کر گھر کے برآمدے میں آ کر بیٹھ گئے۔ بار بار یہ کہتے رہے تم نے تو منع کیا تھا میں نے نہ مانا اور گر پڑا۔ میری ایک معمولی سے بات کا اتنا اثر۔ ان کی شفقت کی انتہا نہ تھی؟

لدھارام والے کیس میں گرفتار ہونے سے چند روز قبل وہ مظفر گڑھ تشریف لے گئے۔ ایک روز صبح اماں جی چولہے کے پاس بیٹھی ناشتہ بنا رہی تھیں۔ میں اور بھائی جان پاس بیٹھے تھے کہ ڈیوڑھی کے دروازے پر

دستک ہوئی اور ساتھ ہی آواز آئی "پھوپھی جی السلام علیکم" یہ بھائی عزیز الرحمن صاحب "لدھیانوی مرحوم و مغفور تھے۔ حضرت مولانا حبیب الرحمن لدھیانوی رح کے صاحب زادے وہ سب بہن بھائی اماں جی کو پھوپھی کہا کرتے تھے۔ اور پھر وہیں سے انہوں نے کہا شاہ جی گرفتار ہو گئے! اماں جی خاموش رہیں۔ انہوں نے بیٹھک میں بیٹھ کر ماموں جان اور بھائی کو تفصیلات بتائیں اور چلے گے غالباً تیسرے دن ابا جی کا مظفر گڑھ سے لکھا ہوا پوسٹ کارڈ بھی موصول ہو گیا مجھے بس اتنا یاد ہے اس میں گرفتاری کی اطلاع تھی۔ جب ابا جی گجرات منتقل ہو گئے تو بھائی جان اور ماموں جان ہر پیشی پر گجرات جایا کرتے تھے۔ ایک روز میں نے ضد کی کہ ابا جی سے ملنے جانا ہے تو اس روز نہ تو ماموں جی مانے اور نہ بھائی جان۔ ان کے جانے کے بعد میں خوب روئی۔ اماں جی نے تو کبھی بھی جیل جا کر ملاقات نہیں کی مگر میری منتوں سے ان کا دل پسیج گیا اور اس سے اگلی پیشی پر انہوں نے ماموں جی کو آمادہ کر لیا اور وہ مجھے گجرات ساتھ لے گئے۔ اس وقت تو مجھے کیا پتہ تھا کہ یہ کون سی جگہ ہے۔ ماموں جی نے مجھے ایک کھلی جگہ گھاس پر بٹھا دیا۔ برقعہ میں نے پہنا ہوا تھا۔ اتنا یاد ہے بڑا ہجوم تھا لوگوں کا۔ کافی دیر بعد کہنے لگے آؤ چلو یاد آتا ہے ایک کمرہ تھا جس میں سرخ روغن ہو رہا تھا۔ ابا جی کرسی پر بیٹھے تھے۔ میں، ماموں جی، بھائی جان اور (۱) حاجز چچا مرحوم اندر داخل ہوئے۔ میں ابا جی سے لپٹ گئی اور رونا شروع کر دیا۔ انہوں نے مجھے گود میں بٹھا لیا۔ پیار کیا اور کہا روؤ مت کمرے کی کھڑکی میں سے ایک عمارت نظر آ رہی تھی۔ کہنے لگے وہ دیکھو کیسی اچھی جگہ ہے میں وہاں رہتا ہوں۔ بھائی جان نے پہلا محراب جب پڑھا تو وہ قید ہی میں تھے۔ عید سے پہلے میں نے ایک دن اماں جی سے کہا مجھے ریشمی کپڑے بنا دیجئے۔ غالباً کسی لڑکی کے دیکھ کر یا ویسے ہی کہے۔ انہوں نے صرف یہ جواب دیا کیا تمہیں معلوم نہیں تمہارے ابا جی قید ہیں؟ پھر بھلا کیا سوجھتا تھا۔ میں نے زندگی کا سب سے پہلا خط ابا جی ہی کے نام جیل میں لکھا۔ اماں جی نے پنسل سے کچا کر دیا اور میں نے اس پر قلم پھیر دیا۔ پھر مقدمہ ہائی کورٹ میں منتقل ہو گیا جس پیشی پر فیصلہ متوقع تھا۔ اس سے تین دن قبل اماں جی ہر رات مردانے میں اور کچھ خواتین کو بلا کر زنانے میں بھی آیہ کریمہ کا ختم کرواتی رہیں۔ شہر میں ایک صاحب تھے جو احرار کے جلسوں کی منادی تانگے میں نوبت بجا کر چوک در چوک کیا کرتے تھے۔ تیسرے دن عصر کے وقت عین ہماری بیٹھک کی کھڑکیوں کے سامنے تانگہ آ کر رکا اور ان صاحب نے دھڑا دھڑ نوبت بجانی شروع کی اور فرط مسرت سے تمتماتے چہرے کے ساتھ ابا جی کی رہائی کا اعلان کیا۔ میں نوبت کی آواز سن کر کھڑکی میں جا کھڑی ہوئی تھی۔ ابا جی کی رہائی کی خوش خبری سن کر بھاگتی ہوئی اماں جی کے پاس آئی وہ صحن اور دالان میں نہیں ملیں۔ میں کوٹھڑی میں گئی تو وہ مصلے پر سر بسجود تھیں۔ یہ سجدہ شکر تھا! منادی والا مبارک دے کر چلا گیا اور ہمسائیاں مبارک باد کہنے آنے لگیں اب انتظار کی گھڑیاں ختم نہیں ہو رہی تھیں ہمارے ہمسایوں نے تو چراغاں کیا تھا خوشی میں۔ رات نو دس بجے کا وقت ہو گا ہم سب چھت پر سوئے تھے اچانک جو میری آنکھ کھلی تو ساتھ والی چارپائی پر اماں جی نہیں تھیں۔ میں نے ادھر ادھر دیکھا تو "گھ" میں سے صحن کی روشنی اوپر آ رہی تھی ہڑبڑا کر اٹھی نیچے دیکھا تو بیٹھک میں سے روشنی اور آوازیں آ رہی تھیں دو دو سیڑھیاں پھلانگتی ہوئی نیچے اتری اور بیٹھک میں پہنچ گئی۔ ابا جی، بھائی جان، ماموں جان اور ابا جی کے بچپن کے

رفیق جناب حافظ محمد سعید صاحب مرحوم و مغفور تشریف لا چکے تھے اور سامان رکھ رہے تھے۔ میں اباجی سے لپٹ گئی اور میری آنکھوں میں خوشی کے آنسو تھے۔

۵۳ء کی تحریک تحفظِ ختم نبوت میں جب اباجی قید تھے تو کئی مہینوں کی کوشش کے بعد ملاقات کی اجازت ملی۔ تینوں چھوٹے بھائی عطاء المحسن، عطاء المومن، عطاء المہیمن اور میں ابوالکفیل کے ساتھ سکھر اباجی سے ملنے گئے۔ ان کو تو جیل کے اندر جانے کی اجازت نہ دی گئی کہ "داماد اہل خانہ میں شامل نہیں" وہ باہر کھڑے رہے۔ ہم چاروں بہن بھائی جیل کے پھاٹک پر کھڑے تھے کہ سامنے ہشاش بشاش اباجی آتے دکھائی دیئے۔ ابوالکفیل تو باہر کھڑے صرف مصافحہ ہی کر سکے۔ سنتری نے تالا کھولا اور ہم اندر داخل ہو گئے۔ ڈیوڑھی میں ہی سیڑھیاں تھیں۔ اباجی ہمارے ساتھ ہی اوپر آ گئے کمرے میں ایک لمبا میز اور کرسیاں رکھی تھیں ایک پر جیلر بیٹھ گیا ایک پر اباجی اور باقی پر ہم۔ گھر کا حال احوال پوچھا بھائیوں سے تعلیم کا پوچھا۔ نصیحتیں کیں۔ اباجی نے جیلر سے پوچھا کہ داماد کو ملاقات کی اجازت کیوں نہیں وہ کہنے لگا "داماد" کیا ہوتا ہے؟ عطاء المحسن سلمہ نے کہا "سَن ان لاء" تو پھر اس نے قانونی مجبوری بیان کی۔ پون گھنٹہ کے قریب ہم بیٹھے۔ حبس تپش، خراب آب و ہوا، ناقص غذا اور اسی قسم کی دیگر ابتلاؤں کے سبب صحت بہت دگرگوں تھی۔ بالخصوص چہرہ اور سینہ پھوڑوں پھنسیوں سے بھرا ہوا تھا۔ مگر اباجی نے اپنی کسی تکلیف کا ذکر تک نہیں فرمایا۔ پھر وہ ہمارے ساتھ ہی سیڑھیاں اترے اور اتنی بات کہی کہ رات رکنا مت شاید آج ہی چاند ہو جائے۔ شعبان کی اس دن انتیس تھی نا۔ اور پھر ہم تو سلاخوں سے لگے انہیں جیل کے اندر جاتا دیکھتے رہے جب تک وہ نظروں سے اوجھل نہ ہو گئے۔ انہوں نے پلٹ کر نہیں دیکھا۔ اور رہ عشق محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے مسافر پیچھے مڑ کر دیکھا بھی کب کرتے ہیں۔

ملتان میں حکماء اور نشتر کالج کے ڈاکٹروں کا ہر حیلہ جب ناکام ہو گیا تو ان کی خواہش پر ان کو گھر لے آئے پھر ان کے ہمدم دیرینہ جناب چچا شیخ حسام الدین صاحب رحمہ اللہ کے پرزور اصرار پر بادل نخواستہ اماں جی لاہور لے جانے پر راضی ہو گئیں۔ مولوی محمد اکرم صاحب مرحوم یکے از مالکان سلطان فونڈری کے ہاں قیام رہا مگر چند دن کے عارضی افاقہ کے بعد نقاہت پہلے سے بھی بڑھ گئی تو اماں جی سب کی مخالفت کے باوجود واپس گھر لے آئیں اور یہ ان کا ہم پر احسان عظیم تھا۔ ہم بہن بھائی بیٹھے ہوئے تھے۔ کچھ لاہور کچھ ملتان۔ اس طرح ہم دم واپسیں تک ان کی خدمت میں اکٹھے حاضر رہے۔

لاہور سے واپس آنے پر طبیعت ہم سب کے اکٹھے ہونے سے بھی نسبتاً بہتر ہو گئی۔ لیکن یہ چراغ بجھنے سے پہلے لو کا اونچا ہونا تھا۔

وفات سے تقریباً بارہ تیرہ دن قبل غسل فرمایا۔ والدہ ماجدہ نے سر میں بادام روغن لگایا اور بڑے عرصے بعد اس دن سرمہ بھی لگایا۔ چہرہ اس دن ایسے روشن تھا جیسے بیمار ہیں ہی نہیں۔ غسل کے بعد نماز ظہر پڑھی۔ کچھ لیٹے پھر عصر و مغرب بھی ادا کیں مغرب کے بعد دلیہ کھایا اور عشاء کا وقت ہوتے ہی فرمایا نماز پڑھا دو۔ نماز پڑھ کر لیٹ گئے کمزوری کی وجہ سے سردی محسوس کرتے تھے۔ برآمدے میں پلنگ تھا اور برآمدے کے

درے کے سامنے صحن میں بیٹھ کر میں اور اماں جی کھانا کھانے لگی تھیں کہ عزیزی عطاء المحسن سلمہ باہر سے آئے اور آتے ہی اباجی کی طرف بڑھے اور پوچھا اماں جی آج اباجی نہائے ہیں۔ انہوں نے اثبات میں جواب دیا۔ محسن نے اباجی کا ماتھا چومنے کے لئے جیسے ہی منہ رکھا تڑپ کر بولا اباجی کو تو بخار ہے۔ ہم دونوں نے کہا کہ ابھی تو نہلایا ہے کچھ نہ تھا۔ جب آکر ماتھے کو ہاتھ لگایا تو تیز بخار سے تپ رہا تھا۔ اور یہ بخار ۲۱ اگست ۶۱ کو عصر و مغرب کے درمیان اس وقت اترا جب انہوں نے داعیٔ اجل کو لبیک کہہ دیا۔ ضعف و نقاہت کی شدت کو دیکھتے ہوئے بھی کم از کم مجھے یقین نہیں آتا تھا کہ اباجی ہمیشہ کے لئے جدا ہو رہے ہیں۔ ہفتہ ۱۹ اگست کو میں ظہر پڑھ کر پڑھنے والی بچیوں کو قرآن مجید کا سبق دینے برآمدے میں آگئی؟ اماں جی عطاء المحسن، عطاء المومن سلمہ پاس بیٹھے تھے۔ اچانک جو میں نے مڑ کر دیکھا تو بھائی اور اماں جی آنسو بہا رہے تھے۔ میں متوحش سی ہو کر بڑے کمرے میں آئی تو اماں جی کہہ رہی تھیں کہ مجھ سے آپ کی خدمت نہیں ہو سکی معاف کر دیجئے گا۔ وہ آنکھیں بند کئے خاموش لیٹے تھے۔ پھر اماں جی نے کہا میں تو آپ کے سہارے ہر دکھ بھول گئی تھی (وطن چھوٹنا، املاک کی بربادی وغیرہ) آپ مجھے کس کے سہارے چھوڑ رہے ہیں۔ انہوں نے دائیں ہاتھ کی انگشت شہادت آسمان کی طرف اٹھا دی۔ ۲۰ اگست کا دن ایسے ہی گزرا گفتگو موقوف تھی مگر آواز دینے پر پہچانتے بھی تھے اور دوا یا دودھ سوڈا جو بھی ہم دیتے تھوڑا سا پی لیتے۔ ۲۱ کو صبح "محسن" بجائے پاس بیٹھنے کے ایک طرف بیٹھ کر منزل پڑھنے لگا۔ مجھے اچھا نہ لگا۔ میں نے کہا آج اباجی کے لئے کوئی دوا نہیں لاتے کتنی طبیعت خراب ہے۔ گلوگیر آواز میں کہنے لگا "کی کرنی جے دوا" (کیا کرنی ہے دوا) قانونِ الٰہی سے آگاہ ہوتے ہوئے بھی میرا ذہن اباجی کی موت قبول کرنے پر تیار نہیں ہوتا تھا۔ میں دکھی سی ہو کر باہر آگئی۔ بھائی جان کے مدرسہ کے دس گیارہ طلباء کا کھانا پکایا گھر کے لئے سالن پکایا۔ ایک بجے کے قریب میں فارغ ہوئی تو اماں جی فرمانے لگیں آؤ! اپنے اباجی کے پاس بیٹھو اور دودھ سوڈا پلاؤ میں رات بھی نہیں سو سکی۔ تھوڑی دیر لیٹ لوں۔ میں پلنگ کے ساتھ لگی کرسی پر آ بیٹھی اور آواز دی۔ اباجی تھوڑا سا دودھ سوڈا پی لیں۔ چمچہ منہ سے لگایا۔ انہوں نے پی لیا دو تین چمچے پینے کے بعد منہ بند کر لیا پھر میں نے کہا۔ اباجی پی لیں اور تو کچھ کھانا ہی نہیں تو چند چمچے اور پی لئے۔ اماں جی اور میں ظہر پڑھنے لگیں۔ میں پڑھ چکی تو بھائی کہنے لگے۔ بڑے حکیم صاحب آئے ہیں پردہ کر لیں۔ اس وقت شدید بخار تھا ہم لوگ برف کے پانی کی پٹیاں ان کے ماتھے پر رکھ رہے تھے۔ میں اٹھ کر اندر تو آگئی پر طبیعت بے چین تھی۔ میں دراز میں سے انہیں دیکھ رہی تھی۔ بڑے حکیم صاحب کو ان کے پاؤں کی طرف جھکتے دیکھا بعد میں پتہ چلا وہ کوئی چیز پاؤں سے لگا کر دیکھ رہے تھے کہ حرکت ہے یا نہیں۔ اور اس کے بعد انہوں نے تین آوازیں دیں شاہ جی! شاہ جی! شاہ جی! اور چیخیں مار کر رونا شروع کر دیا۔ شاہ جی بخار اتر گیا شاہ جی آرام آگیا۔ شاہ جی صحت ہو گئی! تب مجھے پتہ چلا محسن کیوں کہتا تھا "دوا کی کرنی جے" اور بجلی کی طرح یہ خبر پھیلنا شروع ہو گئی مفتی محمود صاحب، عبدالغفور انوری صاحب، حضرت مولانا خیر محمد جالندھری صاحب اور یکے بعد دیگرے کئی حضرات آنے لگے۔ بڑی مشکل تھی اندر بیٹھی رہیں اور وقت آخر

بھی پاس نہ بیٹھیں۔ پھر ہم چادریں لے کر پاس بیٹھ گئیں۔ سب قرآن کریم پڑھ رہے تھے۔ اور وہ باری باری زمزم منہ میں ڈال رہے تھے۔ ایک قطرہ بھی باہر نہیں بہا وہ سکون سے پی لیتے۔ چند سانسیں باقی تھیں کہ اماں جی نے متوجہ کیا کہ دیکھ لو زبان ذکر کر رہی ہے میں نے دیکھا جس اللہ نے ان کو اقلیم خطابت کا یکتا تاجدار بنایا اور جس کی دمی ہوئی قوت کو انہوں نے اس کے حبیب صلی اللہ علیہ وسلم کی ختم نبوت کے بیان میں ختم کر دیا اسی کا نام لیتے ہوئے انہوں نے ایک دفعہ آنکھیں کھول کر چاروں طرف دیکھا اور پھر بند کر لیں۔ میرے اباجی! میرے پیارے اباجی! اس دنیا سے رخصت ہو گئے۔

انا للہ و انا الیہ راجعون

بڑے لوگ پہلے بھی ہوئے اور اللہ کو منظور ہے تو پھر بھی پیدا ہوتے رہیں گے مگر ہم نے اباجی جیسا کوئی نہیں دیکھا۔

اباجی کے ایک مرید تھے۔ جالندھر کے حاجی غلام محمد صاحب تقسیم کے وقت جائیداد کی تباہی کا دماغ پر ایسا اثر ہوا کہ حواس مختل ہو گئے۔ صبح ہوں یا دورے میں، آتے ہر روز تھے۔ ایک دن نماز فجر کے وقت ہی گلی میں چکر لگا رہے تھے اور نجانے کیا کچھ پڑھ رہے تھے اباجی نے اٹھ کر دروازہ کھولا اور بلا کر پاس بٹھا لیا۔ سمجھایا، بجھایا، چائے بنوا کر لے گئے پلائی۔ وہ چلے گئے موسم خنکی آمیز تھا۔ سنا ہوا ہے بہار میں جنون تیز ہوتا ہے۔ میرے ذہن میں ایک مصرعہ آیا۔ "جنوں میں فصل بہاری ستم ہی ڈھاتی ہے" تقریباً تیس برس بعد اگلے روز یہ مصرعہ یاد آیا اور اباجی کی یاد میں چند اشعار موزوں ہو گئے۔

جنوں میں فصل بہاری ستم ہی ڈھاتی ہے
عظیم باپ تری یاد خوں رلاتی ہے

حافظ علی بہادر خاں صاحب مرحوم و مغفور مدیر روزنامہ ہلال نو بمبئی ۱۹۴۶ء کے الیکشن میں احرار کی جانب سے بمبئی کی صوبائی اسمبلی کے امیدوار تھے اور مسلم لیگی ورکروں نے ان کو مار پیٹ کر شدید زخمی کیا تھا۔ اور ایک تو قطعی یاد ہے شاید دوسرا پرچہ بھی ان کی ہمشیرہ نے گھر میں سائکلو سٹائل مشین پر چھاپ کر شائع کیا تھا۔ پورے ہندوستان میں ہلال نو واحد روزنامہ تھا جو احرار کی حمایت کرتا تھا۔ حافظ صاحب نے نجی طور پر ڈیکلریشن حاصل کیا تھا اور وہ کل ہند احرار کے نائب صدر اور ورکنگ کمیٹی کے ممبر تھے۔ ظاہر ہے انہوں نے احرار کی انتخابی مہم چلائی تھی۔ ایک ہفت روزہ افضل سہارنپور تھا جو راؤ محمد کامل خاں صاحب اکمل کی ادارت میں شائع ہوتا تھا۔ پنجاب میں تو کوشش کے باوجود ڈیکلریشن ہی نہیں دیا گیا تھا۔

امرتسر سے بمبئی کے لئے اباجی جس دن روانہ ہونے لگے۔ اسی دن پنجاب کے انتخابی حلقوں کے دورے سے تھکے ماندے گھر آئے تھے۔ میں نے عرض کیا کہ اباجی کپڑے بدل لیجئے۔ اس روز انہوں نے جامنی اور بینگنی کے بین بین رنگ کا کرتا اور تہبند پہن رکھا تھا۔ جو کورا لٹھا رنگ کر بنایا گیا تھا۔ نوعمری تھی۔

بمبئی کو "عروس البلاد" سنا ہوا تھا جی چاہتا تھا کہ ہمارے ابا جی وہاں بہت اچھے کپڑے پہن کر جائیں! انہوں نے میری بات سن کر کپڑوں پر ایک نگاہ ڈالی اور فرمایا میرے لئے تو سب سے اچھے یہی کپڑے ہیں۔ سعید لایا ہے۔ میری بیٹی ہو کر تم بھی یہ بات کہتی ہو۔ یہ سعید تھے بزرگ محترم و مرحوم جناب حافظ محمد سعید صاحب، پٹنہ کے کوچہ خانہ باغ گلی لنگر کے رہائشی ابا جی کے بچپن کے ساتھی۔ رفیق حفظ، مخلص خیر خواہ، ابا جی کا ننھیالی مکان جو دادی جی مرحومہ کو جہیز میں ملا تھا تنہا اولاد ہونے کے سبب ابا جی ہی کی ملکیت تھا۔ وہ تو ۱۹۳۰ء کے بعد کبھی پٹنہ گئے نہیں۔ چچا سعید ہی جب تک ان کا بس چلا کرایہ داروں سے لڑ جھگڑ کر کرایہ وصول کرتے کبھی ملتا کبھی چھے ماہ تک کچھ نہ ملتا! ان کی معاشی بد حالی کے دور میں ابا جی نے ان کو اچھرہ میں جناب میاں قمر الدین صاحب مرحوم خازن کل ہند مجلس احرار کے خاندانی مدرسہ جامعہ قسمیہ میں مدرس قرآن لگوا دیا تھا۔ جس دن ابا جی سکندر حیات کے قائم کردہ کیس سے بری ہو کر گھر آئے چچا ساتھ تھے! تقسیم سے قبل گھریلو مجبوریوں کی بناء پر ملازمت چھوڑ گئے۔ خان گڑھ، (۱۹۴۸ء) ملتان تک ان کے خطوط برابر آیا کئے۔ میرے شاہ جی! اور پیارے شاہ جی حفظکم اللہ اور پتا نہیں کیا کیا دعائیں القاب لکھ کر خط شروع کرتے بڑا اچھا خط تھا سیدھی سطریں پھر حاشیہ دائیں ہاتھ چھوڑا ہوتا چند سطور ادھر پھر پشت پر۔ تقریبا بیس پچیس سطور کا خط ہوتا۔ سن یاد نہیں لیکن ابا جی کی زندگی ہی میں داعیٔ اجل کو لبیک کہہ دیا۔ ابا جی کے بچپن کے ایک اور ساتھی اور محلہ دار محمد اسماعیل بنگالی میاں نے اطلاع دی کہ آپ کے حافظ محمد سعید فوت ہو گئے ہیں۔ ابا جی نے آہ سرد بھری اور

انا للہ وانا الیہ راجعون

پڑھ کر یاد ماضی میں کتنی دیر گم رہے۔

رحمہ اللہ

ابا جی بچپن کی باتیں کرنے لگے۔ کہ شہر میں جتنے حافظ تھے ہم دونوں سب کی نقل اتارتے۔ مگر ایک حافظ اتنا بد آواز تھا کہ میں اس کی نقل نہ اتار سکا، سعید نے اتاری۔ ابا جی ہی کی طرح سر پر پٹے رکھے ہوئے تھے۔ کھدر پہنتے تھے۔ اور کسی وقت اچانک آواز پر ابا جی کی آواز کا شبہ ہو جاتا تھا۔

حافظ علی بہادر صاحب آخری دور میں ہفتہ وار دورِ جدید دہلی سے نکالتے رہے۔ اب وہ بھی وہاں جا چکے ہیں جہاں سے پلٹ کر کبھی کوئی نہ آیا۔

یادِ پدرِ مہرباں آید ہمی

جنوں میں فصلِ بہاری ستم ہی ڈھاتی ہے
عظیم باپ تری یاد خوں رلاتی ہے

تری وفات نے جینے کی آرزو کھو دی
پہ تیرے پیار کی لو حوصلہ بڑھاتی ہے

تری عطوفت و رأفت کی یادیوں، کھسَے
شعاعِ نور کہ سینے میں جھلملاتی ہے

تفکرات و حوادث نے کر دیا محزوں
تری حیات ہے قندیل، رہ دکھاتی ہے

میں تیرے چہرۂ انور کو دیکھنے کے لئے
ترس گئی ہوں مری روح بلبلاتی ہے

ترے کمالِ خطابت کا تذکرہ جب ہو
عدو بھی کہتے ہیں، تاریخ جگمگاتی ہے

بنتِ امیرِ شریعت سیدہ اُمِّ کفیل بخاری

بنت امیر شریعت سیدہ ام کفیل بخاری

ابا جی کی یادیں

محترمہ والدہ ماجدہ نے ذیل کے مضمون میں حضرت امیر شریعت رحمہ اللہ کی زندگی کے مختلف گوشوں پر قلم اٹھایا ہے۔ اس میں حضرت امیر شریعت کے سوانح بھی ہیں اور افکار بھی۔ واقعاتی زندگی کی جھلک بھی ہے اور اجتماعی زندگی کے نقوش بھی۔ والدہ ماجدہ کو اپنے "ابا جی" کی گھریلو مجالس سے استفادہ کے جتنے بھی مواقع میسر آئے وہ ان کی یادوں کی متاع عزیز ہیں۔ ذیل میں ایک سیاسی مسئلے اور اس سے متعلق شخصیات کے حوالے سے کچھ وضاحتیں ایسی آرہی ہیں کہ جن کا تعلق براہ راست حضرت امیر شریعت رحمہ اللہ کی شخصیت سے ہے۔ امیر شریعت رحمہ اللہ کی سوانح کے حوالے سے اب تک جو مواد سامنے آیا ہے اس میں مجلس احرار اسلام اور شاہ جی کی نسبت کچھ ایسی غلط فہمیاں پیدا ہو گئیں جو مولفین کی معاصرانہ چشمک کی آئینہ دار ہیں۔

اس مضمون کی خوبی یہ ہے کہ اس میں مشاہداتی حقائق ہیں۔ چونکہ والدہ ماجدہ گھر پر ہی موجود رہتی تھیں اور وہ باتیں جن کا اظہار اجتماعی مفاد کے پیش نظر حضرت امیر شریعت عام مجالس میں نہیں فرماتے تھے والدہ ماجدہ کے استفسار پر گھریلو مجالس میں کبھی کبھار ان پر اظہار خیال فرمادیتے۔

ان حقائق کی اشاعت سے کسی کی شخصی توہین مقصود نہیں بلکہ تاریخی ریکارڈ کی درستی ہمارا مطمح نظر ہے (کفیل)

کشمیر میں ہجرت کر کے آنے والے ہمارے مورث اعلیٰ سید عبدالغفار بخاری رحمہ اللہ تھے جو سلطان زین العابدین بڈشاہ کے زمانے میں قاضی القضاۃ کے عہدے پر فائز رہے منشی محمد الدین صاحب فوق مرحوم نے تاریخ اقوام کشمیر میں پوری تفصیل دی ہے پہلے انہوں نے غلط فہمی میں ہمارا سلسلہ نسب جلال پور جٹاں کے سید حبیب اور عنایت شاہ صاحبان کے ساتھ جوڑ دیا پھر ماموں جان مرحوم سید عبدالحمید شاہ صاحب نے ان کو اصل شجرہ کی نقل مہیا کی تو انہوں نے تصحیح کر دی۔ والدین ماجدین رحمہم اللہ بتایا کرتے تھے انکے شعور کی عمر تک کئی رشتے ناطے کشمیر ہی میں خاندان کی دوسری شاخ میں ہوتے رہے بعد میں یہ سلسلہ منقطع ہو گیا۔ کشمیر کا ذکر بہر حال گھر میں ہوتا تھا اور تحریک کشمیر کے حوالے سے خصوصاً ہوتا تھا۔ ابا جی کے ننھیال بھی کشمیر سے ہی ہجرت کر کے پٹنہ جا بسے تھے۔ بلکہ اس زمانے کے ہمارے بزرگوں نے ناگڑیاں میں ان کی دعوت کی تھی۔ اور تعلقات کا آغاز یہیں سے ہوا تھا۔ والدہ ماجدہ مصائب و حوادث کو مردانہ وار برداشت فرماتی

تھیں انہوں نے آن پر تو حرف نہ آنے دیا لیکن جان پر بن گئی۔ ۲۱ء میں جب اباجی پہلی بار قید ہوئے وہ تقریباً ۱۶ برس کی تھیں ۳۳ء، ۳۴ء میں انہیں ہلکا بخار رہنے لگا اور ایک آدھ بار تھوک میں خون بھی آیا۔

رگ و پے میں جب اترا زہر غم تب اور کیا ہوتا؟

امرتسر میں ہمارے خاندانی معالج جناب حکیم ظہیر الدین صہبائی کشمیری تھے۔ حاذق طبیب اور کلے ٹھلے اور بود و باش سے کسی ریاست کے نواب دکھائی دیتے۔ اباجی سے لیکر ہم بہن بھائیوں تک سب چچا کہتے تھے اباجی تو اس لئے کہتے کہ عمر میں بڑے تھے اور ان کے رشتہ کے چچا سید محمد مقیم صاحب کے کلاس فیلو بھی تھے۔ انہوں نے اماں جی کا علاج شروع کیا اور ساتھ مشورہ دیا کہ موسم گرما میں ہمشیرہ صاحبہ کو پنجاب میں نہ رکھا جائے کسی صحت افزاء مقام پر لیجایا جائے وہ ڈلہوزی دیکھنے گئے لیکن پسند نہ کیا اور کوہ مسوری کی آب و ہوا کو اماں جی کے لئے مناسب بتایا تو چار سال تک موسم گرما میں اباجی ہم سب کو مسوری لے جاتے اور ہمیں وہاں چھوڑ کو خود پنجاب کے تپتے میدانوں میں تقاریر کے پروگرام بھگتاتے رہتے۔ اور وہاں بھی چکر لگاتے رہتے۔ ہمارے پاس ماموں صاحب کو چھوڑ آتے۔ اباجی ان معنوں میں "عالم" نہ تھے کہ عورتوں کو چار دیواری میں ہی قید رکھیں۔ ہاں تماشا گاہ عالم بن کے نکلنے کی نہ دین اجازت دیتا ہے نہ ان کی غیرت کو گوارا تھا۔ اس زمانے میں اباجی نے ایکسرے بھی کروایا۔ مسوری میں چچا ظہیر صاحب کی تدبیر و علاج سے اللہ تعالیٰ نے فضل فرما دیا اور اماں جی کو ساری عمر پھر یہ شکایت نہ ہوئی چچا کافی دن ساتھ مقیم رہے میں تو بہت چھوٹی تھی اماں جی بتایا کرتی تھیں مسوری میں موسم خنک ہوا تو نسبتاً کم بلندی پر واقع قصبہ راجپورہ میں لے آئے کوئی کشتہ بھی بنا کر کھلایا پتا نہیں اب ایسے معالج کہاں پائے جاتے ہیں؟ اور اہل مسوری، ڈیرہ دون اور راجپورہ کی مہمان نوازیوں کے تذکرے اور تعریفیں آخر تک والدین فرماتے رہے اور ہمیں بتاتے رہے۔ سب پر اللہ کی رحمتیں نازل ہوں۔

لذیذ بود حکایت دراز تر گفتم "۴۵ء میں ایک دن اباجی گھر تھے یعنی ہمارے لئے عید کا دن تھا۔ اماں جی اور ہم بہن بھائی بیٹھک میں انکے پاس بیٹھے تھے کہ اماں جی کہنے لگیں۔ اب بڑوں کا وطن کشمیر ایک دفعہ دکھا دیں۔ اس وقت کچھ زیادہ بات نہیں ہوئی امرتسر میں کشمیر کے ایک نیک نہاد خاندان کے فرد جناب مولودی محمد سعید صاحب مرحوم رہتے تھے۔ وہ بچپن میں پڑھنے کے لئے امرتسر آئے پڑھتے بھی رہے محلہ کی مسجد میں امام بھی تھے بالکل نوعمر تھے کہ تحریک کشمیر احرار کی طرف سے شروع ہوئی۔ اس میں شریک ہوئے پوری استقامت سے جیل کاٹی اور اس طرح اباجی سے ناطہ جڑ گیا۔ پھر ایسا جڑا کہ اباجی کی زندگی میں ہی نہیں اپنے آخری دم تک اباجی کے بعد بھی انہوں نے ہمارا گھر نہیں چھوڑا ہر سال چھ ماہ بعد اماں جی کو سلام کرنے ملتان آتے اور چند دن رہتے ان کی آمد ہم سب کو ایک فرد خاندان کی آمد محسوس ہوتی۔ جب سفر کشمیر کا تذکرہ چھڑا تو چند دن بعد وہ اباجی سے ملنے آئے اباجی نے ان سے ذکر کیا انہوں نے زبردست تائید کی۔ بلکہ یوں کہا کہ بڑے بھائی عرصہ سے منتیں کر رہے ہیں ہمیں اپنے بچے لا کر دکھاؤ آپ اگر چلیں تو میں بھی ساتھ چلتا ہوں۔ ان کے چھوٹے بھائی اس زمانے میں ان کی طرح کسی مدرسہ غالباً مدرسہ نصرۃ الحق میں پڑھتے بھی اور کسی چھوٹی مسجد میں امام تھے مولوی محمد یوسف! مولوی صاحب نے ان کو کشمیر بھیجا جا کر پہلے کسی مکان کا بندوبست کرو۔

پٹن ایک قصبہ ہے۔ بارامولا سے ۱۷ میل آگے اور سری نگر سے ۱۷ میل ادھر بالکل درمیان میں تب بھی سڑک پختہ تھی اس سے متصل تقریباً آدھ میل کے فاصلے پر مولوی صاحب کا چھوٹا سا گاؤں "پوشوائیں" تھا۔ پٹن میں ان کے بھائی نے اپنی صوابدید کے مطابق ایک پنجابی سکھ آباد کار کے مکان کی اوپر کی منزل کرایہ پر لیکر امرتسر اطلاع بھیجی کہ مکان مل گیا ہے آجائیں۔ چند دن تیاری میں لگے۔ ماموں جی مرحوم ملازمت کی وجہ سے امرتسر ہمارے ہاں ہی رہائش رکھتے تھے۔ بلکہ اباجی نے اصرار سے ان کو رکھا ہوا تھا کہ ان کے طویل دوروں کے دوران گھر میں کوئی مرد تو ہوتا تھا۔ منصوری تو وہ ایک دو بار ساتھ گئے لیکن اس دفعہ وہ گھر رہے بھائی جان کو اباجی نے جالندھر خط لکھا تو وہ مقررہ تاریخ سے کچھ روز قبل خصوصی طور پر سالانہ امتحان دے کر (خیر المدارس سے) گھر آگئے۔ اب دن تاریخ تو یاد نہیں اسلامی مہینہ شعبان تھا۔ انگریزی شاید جولائی۔ مولوی صاحب اپنے ہاں سے بمع اہل و عیال اسٹیشن پہنچ گئے اور ہم سب اپنے ہاں سے، ماموں جان لاہور تک ہمارے ساتھ آئے۔

اباجی کے پروگرام کا ان کے احباب کو علم تھا دفتر سے کچھ کارکن انہیں ملنے آئے ہوئے تھے۔ لاہور سے گاڑی تبدیل کی اور رات کسی وقت پنڈی پہنچے۔ راجہ بازار میں صوفی عنایت محمد صاحب پسروری مرحوم احرار کے وفادار ساتھی اور جوہر وسمہ مہندی کے موجد کی رہائش گاہ پر رات بسر کی ان کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہ تھا۔ میں نے بارہا دیکھا کہ جب اباجی کسی بات کا پختہ ارادہ کر لیتے تو پھر رحمت الٰہی راستے کی ہر مشکل آسان اور ہر رکاوٹ دور کر دیتی تھی۔ کشمیر کے سفر کے سلسلہ میں کچھ روز متذبذب رہے پھر مولوی صاحب مرحوم کے کہنے سننے پر مکمل آمادہ ہو گئے۔ پنڈی پہنچ کر اباجی کا ارادہ ہوا کہ بجائے عام لاری پر سفر کرنے کے پوری لاری کرایہ پر لے لی جائے۔ صوفی صاحب مرحوم سے بھی مشورہ ہوا ہو گا۔ بہرحال صبح وہ خود لاریوں کے اڈہ پر تشریف لے گئے تو وہاں جن لوگوں سے ملاقات ہوئی ان سے بھی خاندانی تعلق نکلا۔ مری میں "سنی بینک" ہوا کرتا تھا اس کے مالک شیخ عبدالغنی عبدالعزیز صاحبان وغیرہ مرحومین تھے ان کے والد شیخ حسام الدین ہمارے گاؤں ناگڑیاں میں پٹواری رہے تھے۔ شیخ عبدالغنی اور ان کے بھائی اماں جی کی پھوپھی صاحبہ سے قرآن پاک پڑھے ہوئے تھے۔ ان کو اللہ تعالیٰ نے بہت دولت دی لیکن وہ استاد گھرانے کو بھولے نہیں ۴۶ برس کی بات بغیر کسی نوشتے کے من و عن تو یاد نہیں۔ ان بھائیوں میں سے ہی کسی کے لڑکے شیخ منظور صاحب اور غالباً عبدالقدیر صاحب ٹرانسپورٹ کمپنی کے مالک تھے۔ اباجی کو دیکھا تپاک سے ملے اباجی نے مقصد آمد بتایا تو کہنے لگے لاری حاضر ہے۔ اباجی نے کرایہ طے کرنے کو کہا اور حسب مزاج شدید اصرار فرمایا لیکن انہوں نے کرایہ لینے سے انکار کر دیا اباجی لاری لیکر صوفی صاحب کے مکان پر آئے اور ہم سب بمع مولوی سعید صاحب عازم کشمیر ہوئے راستے کے نظارے ہم سب بچوں کے لئے بہت بڑا سامان فرحت تھے۔ میں اور بھائی جان بڑے تھے باقی سب چھوٹے تھے۔ وقت تو یاد نہیں عشاء بہرحال ہو چکی تھی جب پٹن پہنچ گئے۔ مولوی صاحب کے بھائی رہائش گاہ کی تلاش صحیح نہ کر سکے دو پردہ دار کنبے اس گھر میں نہ رہ سکتے تھے۔ ایک بڑا کمرہ تھا۔ ملحق اور کیا تھا اب یاد نہیں۔ اس میں بھی سکھ مالک نے پیاز رکھے ہوئے تھے۔ ان کی بدبو اور پسوؤں کی

یلغار او نگھتے کھجلاتے رات بسر کی ناشتہ یاد ایسا آتا ہے مولوی صاحب کے بھائی گھر سے لائے تھے چائے پی کر اباجی بہتر مکان کی تلاش میں نکلے مولوی یوسف صاحب سے ایک دو دفعہ کہا سہی "اوئے ایہہ مکان لبھیا ای؟" سڑک پر کچھ دور تک چلے تو چند دکانیں تھیں جن میں سے ایک پھلوں کی دکان پر شائستہ و مہذب مالک کو دیکھ کر سلام و مصافحہ ہوا مولوی صاحب نے تعارف کرایا اور اباجی نے کرایہ کے مکان کی تلاش میں مدد کے لئے کہا۔ مالک دکان خواجہ غلام محمد صاحب جالب نے جو پھلوں کے بڑے تاجر تھے کہا کہ میرا مکان اس دکان کے اوپر خالی ہے آپ تشریف لے آئیں۔ اباجی نے کرایہ پوچھا تو کہنے لگے میں نے مکان کرایہ پر چڑھانے کے لئے نہیں بنایا آپ کو کرایہ ضرور دینا ہے تو کوئی اور ڈھونڈ لیجئے۔ اباجی نے مکان دیکھا ہماری ضروریات کے لئے بالکل کافی تھا۔ واپس آئے اور دوپہر سے پہلے پہلے ہم نے ایک اچھے ٹھکانے پر منتقل ہو کر اطمینان کا سانس لیا۔ سیڑھیاں چڑھیں تو دو کمرے آمنے سامنے درمیان میں راہداری سڑک کی طرف چھجہ۔ عقب میں کھیت اور ادھر بھی چھجہ اسی چھجہ میں بیت الخلاء کمرے سے ملحق غسلخانہ اور اس سے اوپر کی منزل پر ایک کمرہ۔ اس کمرہ میں مولوی صاحب کے بچے رہنے لگے۔ چند دن بعد وہ ددھیال چلے گئے۔ دھوپ کے وقت چھجہ پر بورے کی انگیٹھی پر کھانا پکتا اور سردی کے وقت کمرے میں۔ رمضان المبارک وہیں پٹن میں گزرا۔ ہمارے وہاں قیام کے دوران "سوپور" میں کشمیر نیشنل کانفرنس کا سالانہ اجلاس ہوا۔ مولانا آزاد رحمہ اللہ تو ویسے ہی بعد از رہائی بحالیٔ صحت کے لئے سری نگر میں مقیم تھے۔ جھیل ڈل میں کشتیوں کا جلوس نکالا گیا۔ سیاسی چپقلش کا براہو ان کی دینی عظمت کا بھی احترام نہ کیا گیا اور بہت برا سلوک کیا گیا۔ بھائی جان مولوی سعید صاحب کے ہمراہ جا کر مولانا سے بھی مل آئے اور ایک نادیدنی نظارا بھی کر آئے۔ سوپور کو راستہ پٹن سے ہی جاتا تھا۔ اور خواجہ صاحب (مالک مکان) نیشنل کانفرنس کے رکن تھے انہوں نے دکان کے سامنے استقبالی دروازہ بنایا اور ہر رہنما کا استقبال پھولوں سے کیا جو لوگ گزرے ان میں پنڈت جواہر لال نہرو عبدالغفار خان، قاضی عطاء اللہ جان سابق وزیر تعلیم سرحد۔ میاں افتخار الدین شیخ محمد عبداللہ مرزا افضل بیگ یاد ہیں۔ مولوی محمد سعید مسعودی مرحوم۔ پنڈت نہرو میاں افتخار الدین کی کار میں تھے مولوی سعید صاحب نے ہاتھ ملانے کے بعد اباجی کا نام لیا کہ وہ بھی یہاں ہیں پنڈت نہرو نے کہا اچھا شاہ صاحب یہاں ہیں مولوی صاحب اباجی کو بلا کر لے گئے۔ بڑے تپاک سے مصافحہ کے بعد کہنے لگے کہ چلئے "سوپور" اباجی نے کہا سوچ رہا ہوں جلسہ کا آخری دن تھا۔ پنڈت کہنے لگے ابھی آپ سوچ رہے ہیں؟ میاں افتخار بولے کار حاضر ہے تشریف رکھیئے اباجی نے کہا آپ کے جانے کے بعد سوچوں گا۔ بچوں میں بھائی عطاء المحسن بھی کھڑا تھا۔ پنڈت سب سے خوش دلی سے مصافحہ کر رہے تھے۔ اباجی نے بھائی کی طرف اشارہ کر کے مسکراتے ہوئے کہا یہ میری ایک یادگار ہے۔ پنڈت نے بھائی سے بھی ہاتھ ملایا اور گلے میں سے ایک ہار اتار کر بھائی کے گلے میں ڈالدیا۔

خواجہ صاحب کے گھر کے ساتھ کھیتوں کی طرف چھوٹی سی مسجد بھی تھی رمضان شروع ہوا تو ان کی حسب خواہش بھائی جان نے وہاں تراویح میں قرآن پاک سنانا شروع کیا۔ مولوی صاحب کا بڑا لڑکا حافظ محمد اسلم

مرحوم تب دس گیارہ برس کا تھا حفظ کر چکا تھا۔ بھائی جان کا استاد بھائی بھی تھا۔ حضرت قاری کریم بخش صاحب رامپوری رحمتہ اللہ علیہ کا وہ بھی شاگرد تھا اور بھائی جان بھی۔ اسلم ہی بھائی جان کا سامع بنا۔ خواجہ صاحب کہتے تھے جب سے قرآن نازل ہوا یہ پہلا رمضان ہے جس میں یہاں تراویح میں پورا قرآن پڑھا گیا۔ سادہ لوح کشمیری بھائی ذوق و شوق سے سنتے رہے ایک عجیب رواج دیکھا مرد تو مسجد چلے جاتے اور عورتیں اکٹھی ہو کر گیت گاتیں اللہ جانے نعتیں پڑھتیں یا کیا۔ کشمیری ہمیں کونسی سمجھ آتی تھی دو تین دن بعد اباجی نے قصبہ کے عمائدین خواجہ صاحب، غلام قادر صاحب، نمبردار وغیرہ کو بلا کر اس رسم کی قباحت سمجھائی اور عورتوں کو منع کرنے کے لیے کہا۔ اباجی کے سمجھانے کا خاطر خواہ اثر ہوا۔ اور پھر پورا رمضان کبھی کہیں سے عورتوں کی آواز نہیں سنی۔ سحر کے وقت گھڑی کا الارم تو بولتا ہی تھا کوئی بندۂ خدا وہاں تھا جس کو خدا نے بڑی بلند آواز عطا کی تھی وہ سڑک پر کھڑا ہو کر پوری قوت سے کہتا تھا وقت سحر جاگو! اور دور دور تک اس کی آواز سنی جاتی تھی۔

کشمیری لوگ چاول ہی دونوں وقت کھاتے تھے اور حیرت ہوتی تھی سڑک کے پار سامنے بے چارے غریب لوگوں کے گھر تھے دونوں وقت خواتین پتھر کے بڑے بڑے کونڈوں میں کھڑے ہو کر دھان چھڑتی تھیں اور جھٹ پٹ چاول نکال کر چھان پھٹک کر ابال لیتی تھیں۔ حقیقت ہے کہ غربت کے ہاتھوں مجبور گھرانے پیاز نمک مرچ کا مسالہ بھون کر اس میں پچ ڈال کر (چاولوں سے نکلی ہوئی) شوربہ بنا لیتے تھے اور اسی سے ابلے چاول کھا لیتے تھے۔ معمر لوگ کہتے تھے کوئی زمانہ تھا ہم ناشپاتیاں اور سیب کاٹ کر اپنی گائیوں کو کھلاتے تھے اور آج ہمیں خود میسر نہیں۔ ظلم کی انتہا تھی کہ چنار کا درخت خواہ کسی کی کے ذاتی مکان میں اگ آئے وہ سرکار کی ملکیت ہے۔ مالک مکان اس کی لکڑی استعمال نہیں کر سکتا تھا۔ سرکاری حکم کے مطابق۔ جو بھی درخت کاٹتا چوری چھپے کاٹتا لیکن غریب سے غریب کشمیری مہمان نوازی کو فرض سمجھتا تھا۔ دو غریب عورتیں کسی کسی دن آ جاتیں زبان انہیں آتی نہ ہمیں۔ کوئی لفظ سمجھ آ جاتا کچھ اشاروں سے سمجھا دیتیں ان کے بیٹے یا خاوند مٹر اور آلو کے ٹکڑے ڈال کر پکوڑے بنا کر بیچتے تھے وہ ایک دو دفعہ ہدیہ کے طور پر پکوڑے لے آئیں پھر اماں جی نے کہا کہ تم یہ تکلیف نہ کیا کرو۔ ان کی تواضع بھی کی اور کچھ خدمت بھی جب تک ہم پٹن میں رہے وہ آتی رہیں۔ مہر ددی اور سیب ددی۔ میرے خیال میں یہ ہندی کا بگڑا ہوا "دیدی" ہے بمعنیٰ بہن۔

رمضان میں قاضی احسان احمد صاحب مرحوم، جاں باز صاحب اور چچا جان شیخ حسام صاحب ہمارے پاس کشمیر آئے شیخ صاحب نے تو عید بھی ہمارے پاس کی باقی حضرات ایک دو دن رہ کر واپس آ گئے۔ اہل قصبہ کے اصرار پر عید اباجی نے پڑھائی ان سے پہلے مولوی سعید صاحب نے کشمیری زبان میں تقریر کر کے مسائل سمجھائے وہاں لاؤڈ اسپیکر کہاں تھا؟ لیکن قصبہ کے پانچ سات سو آدمیوں نے بغیر کسی دقت کے اباجی کی تقریر و خطبہ سنا اور نماز بھی ادا کی آواز سب سے بڑی نعمت تھی جو اباجی کو عطا کی گئی۔

عورتوں کے لئے بھی کیمپ لگایا گیا تھا۔ ہم ماں بیٹی خواجہ صاحب اور مولوی صاحب کی اہلیہ نے بھی وہاں نماز ادا کی۔ خواجہ صاحب کے ہاں سے عید پر کشمیر کا خاص سالن "گشتابہ" بطور ہدیہ بھیجا گیا۔ نمبردار غلام

قادر صاحب کے ہاں بھی دعوت کی گئی وہاں ایک دو اور گھروں میں بھی جانا ہوا۔ بڑی بڑی سینیوں میں خشکہ ہوتا اور اوپر تھوڑے تھوڑے وقفے سے پانچ سات سالن فرشی نشست اور مہمان و میزبان مل کر کھاتے۔ کیا ہی اچھا رواج تھا۔ خواجہ صاحب کے ۴ بچے تھے تین لڑکے اور ایک لڑکی کوئی تین برس کی۔ عطاء المحسن سلمہ اور عطاء المومن سلمہ کی منظور احمد منصور احمد ہلال احمد بٹ سے خوب دوستی تھی۔ محسن میاں نے تو کافی کشمیری سیکھ لی تھی گنتی یاد کر لی تھی۔

جب ۴۶ء کے الیکشن کے بعد مرحوم شورش وغیرہ نے مولوی مظہر علی صاحب کی یونینسٹ پارٹی سے پخت و پز کا بھانڈا پھوڑا تب معلوم ہوا کہ جانباز صاحب مرحوم کو بھی ایک مشن پر بھیجا گیا تھا۔ مولوی صاحب مرحوم نے الیکشن کا اعلان ہوتے ہی انتخابات میں حصہ لینے کا بحیثیت جنرل سیکرٹری اعلان کر دیا۔ پھر جناح صاحب کی ذاتی زندگی پر جلسہ عام میں حملہ کر دیا اور اباجی کے مشورہ و علم کے بغیر یونینسٹوں سے تعاون کا پیکٹ بھی کر لیا۔ مولوی ابراہیم علی چشتی جو محکمہ تعلقات عامہ کے اخبار کے ایڈیٹر بھی تھے (اخبار کا نام اسوقت یاد نہیں آرہا) دفتر احرار لاہور میں اباجی سے ملاقات کے لئے آئے وہ کشمیر تھے۔ دفتر والوں سے پارٹی کے امیدواروں کے حلقہ ہائے انتخاب میں اباجی کی تقریروں کا سوال کیا۔ پھلوں کی ٹوکری ساتھ لائے تھے وہ اصحاب دفتر نے قبول کر کے تناول فرما لی اور جانباز صاحب نے اباجی کو آمادہ کرنے کی ہامی بھر لی ان کی خدمت میں چشتی صاحب نے کشمیر کا کرایہ آمد و رفت پیش کیا۔ وہ پٹن آئے اور دو دن رہ کر چلے گئے۔ ان کی جرأت نہ ہوئی کہ اباجی سے اس مہم کا ذکر کرتے جسے سر کرنے لئے وہ بھیجے گئے تھے۔ اگر انہوں نے ہی اباجی کو صورت حال بتا دی ہوتی تو شاید الیکشن ختم ہونے پر ہی پنجاب آتے۔ شورش نے ہی اباجی کو بتایا تھا کہ یونینسٹ پارٹی سے مولوی صاحب نے جو کچھ وصول کیا اس کے حساب کتاب میں آپکے کھاتے میں پھلوں کی ایک ٹوکری لکھی ہوئی تھی اور وہ وہی تھی جو قبول کر کے جانباز صاحب کو اباجی کو آمادہ کرنے بھیجا گیا تھا۔ اور اس قصہ کا علم ہونے پر اباجی کا کیا حال ہوا تھا؟ شورش کی کتاب میں پڑھا جا سکتا ہے۔

رمضان کے بعد بھائی جان کی تعطیلات ختم ہو رہی تھیں اس لئے وہ تو مولوی سعید صاحب کے ساتھ جا کر سری نگر، ٹنگ مرگ، گلمرگ وغیرہ سے ہو آئے۔ جس لاری پر ہم کشمیر آئے تھے اس کے ڈرائیور اسلم خاں صاحب نامی تھے۔ بہت شریف انسان وہ ہمارے قیام کے دوران جب پنڈی سے کشمیر آتے اباجی سے مل کر جاتے۔ ایک دفعہ وہ آئے تو اباجی نے بتایا کہ چند دن بعد بھائی جان نے جانا ہے آپکے ساتھ سفر ہو گا تو مجھے اطمینان رہے گا۔ چنانچہ مقررہ دن اسلم خاں پٹن رکے اور بھائی جان کو پنڈی تک پہنچایا۔ پھر جب ہم لوگوں نے واپس ہونا تھا تب بھی انہی سے کہا اور اباجی نے مکمل کرایہ ادا کیا۔ بھائی جان کے جالندھر جانے کے کچھ دن بعد اباجی سری نگر گئے اور ہری سنگھ ہائی سٹریٹ میں ایک مکان کی بالائی منزل کرایہ پر حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے نچلی منزل میں ایک ہندو کنبہ رہتا تھا۔ پھر آکر ہمیں سری نگر لے گئے مختصر سامان ساتھ لیا باقی پٹن ہی پڑا رہا۔ ہم نے جو مقامات دیکھے وہ یہ تھے شاہی چشمہ، نشاط باغ، شالامار باغ، درگاہ حضرت بل، جھیل ڈل، شہر کے وسط میں ہے۔ ہاؤس بوٹ اس میں کھڑے رہتے۔ شکارے اور کشتیاں چلتیں درگارہ

حضرت بل حضور علیہ السلام کے موئے مبارک رکھنے کی جگہ ہے۔ ضعیف الاعتقاد خواتین لال پیلے نیلے پراندوں کے تاگے منتیں مان کر جالیوں سے باندھ جاتی تھیں اور جب اللہ تعالیٰ مراد پوری فرما دیتے تو حضرت بل آکر چڑھاوے چڑھاتی تھیں۔ عورتیں بھی کشتیوں میں سبزیاں رکھ کر ہاؤس بوٹ میں مقیم لوگوں کے پاس بیچتی تھیں موئے مبارک تو خاص تاریخ کو دکھایا جاتا ہوگا بس ایک نظر عمارت کو دیکھا تھا۔

راجہ ہری سنگھ کا درزی محمد شریف کہیں تحریک کشمیر کے دنوں اباجی سے بیعت ہوا تھا جب آمد کا سنا تو بااصرار آکر دعوت قبول کروا گیا۔ بے چارا بے اولاد تھا۔ کے ایچ خورشید مرحوم کے والد صاحب نے بھی اباجی کی سری نگر میں آمد سنی تو اصرار کر کے ہمارے سمیت رات کے کھانے کا کہہ گئے اور اباجی ہمیں لے گئے۔ سری نگر کے محلہ گندر پورہ میں عید گاہ کے بالکل قریب ہمارے ہم جد خاندان کے لوگ اب بھی آباد ہیں تب چار بھائی سید محمد حسن شاہ صاحب، مولوی سید محمد قاسم شاہ صاحب فاضل مدرسہ امینیہ دہلی، سید محمدامین شاہ صاحب اور غالباً چوتھے سید محمد یوسف تھے جو اباجی سے ملے اور بھی لوگ تھے۔ حسن شاہ صاحب اباجی کو امرتسر بھی کبھی کبھار خط لکھا کرتے تھے۔ ہمیشہ فارسی میں لکھتے۔ بالمشافہ ملاقات نہیں ہوئی تھی۔ جس روز وہ سری نگر سے پٹن آئے اباجی خواجہ غلام محمد صاحب کے پاس دوکان میں بیٹھے ہوئے تھے تانگہ آکر رکا اباجی کی نظر پڑی تو اباجی نے خواجہ صاحب سے کہا یہ شخص مجھے اپنے خاندان کا معلوم ہوتا ہے۔ اتنے میں وہ دوکان تک آپہنچے انہوں نے سلام کیا اباجی وعلیکم السلام کہکر بغلگیر ہو گئے اور کہا آپ سید محمد حسن شاہ صاحب ہیں نا؟ وہ حیران ہو کر بولے آپ نے کیسے پہچانا؟ فرمایا آنکھ سے۔ وہ واپس جاتے ہوئے بڑے اصرار سے گھر آنے کی دعوت دے گئے۔ چنانچہ جب ہم لوگ سری نگر گئے تو اباجی نے ان کو آمد کی اطلاع دی ان میں سے کوئی بھائی آکر گھر لے گئے رات ہمیں رکھا اور مہمان نوازی کی حد کر دی۔ خواتین میں سے صرف ایک اردو جانتی تھیں باقی صرف کشمیری بولتی تھیں۔ اردو جاننے والی بے چاری ہی ہماری ترجمان بنی رہیں۔ مولوی سعید صاحب کے بچے چند دن کے لئے آئے اور قابل دید مقامات دیکھ کر پٹن واپس چلے گئے۔ صحیح یاد نہیں کوئی مہینہ دن ہم سری نگر رہے۔ پھر پٹن واپسی ہوئی۔ مولوی صاحب مرحوم کے درویش صفت بڑے بھائیوں نے دو دفعہ ہماری بھی دعوت کی بڑی ہی تکریم سے اباجی کو ملے بار بار کہتے آپکی وجہ سے ہمارا بچھڑا بھائی ہم سے مل گیا ان کے مکان کے ساتھ اخروٹوں کا باغ تھا۔ اور دور تک مخملیں گھاس کا قطعہ مغرب کی اذان اباجی نے اس باغ میں خود دی اور نماز بھی پڑھائی وہ منظر اور وقت اب بھی یاد آتا ہے تو روح شاد کام ہو جاتی ہے۔

اکتوبر کے شروع میں ہم واپس ہوئے تھے۔ دور سے دکھائی دینے والی اونچی چوٹیوں پر برف گرنی شروع ہو گئی تھی۔ جس روز پٹن سے رخت سفر باندھا بلا مبالغہ کئی سو آدمی لاری کے گرد اکٹھے تھے اباجی نے ان کی مہمان نوازی کا شکریہ ادا کیا اور دیر تک دعا کی۔ کئی نیک دل تو رو رہے تھے۔ اسلم خاں کچھ دیر سے لاری لائے۔ سامان وغیرہ رکھتے بھی وقت لگا جب ہم "چناری" پہنچے تو رات کافی ہو گئی اباجی نے فرمایا رات یہیں

رکتے ہیں۔ صبح بقیہ سفر کریں گے۔ یاد ہے اب تک سڑک کنارے چھوٹا سا اکبر مسلم ہوٹل تھا اس کے دو کمرے لے لئے گئے ایک میں ہم عورتیں اور دوسرے میں اباجی اور مولوی صاحب وغیرہ۔ دوسرے روز دوپہر کو واپس پنڈی پہنچے اور رات صوفی صاحب ہی کے ہاں گزاری دوسرے دن گاڑی سے لاہور پہنچے۔ امرتسر کے خواجہ جمال الدین بٹ اباجی کے مرید تھے اور امرتسر سے لاہور تک ان کی لاری چلتی تھی یا تو اباجی نے پنڈی سے اطلاع کی ہو گی یا لاہور پہنچ کر کہا ہو گا۔ کیونکہ دفتر احرار سے کافی کارکن ملنے آئے ہوئے تھے اسٹیشن پر۔ بہرحال لاری سٹیشن پر موجود تھی اس میں بیٹھے۔ امرتسر پہنچ کر مولوی صاحب کے کنبہ کو کٹڑہ کرم سنگھ میں ان کی گلی کے سامنے اتارا اور ہمیں لاری نے گلوالی دروازہ مکان تک پہنچایا اور یوں بھائی میرے وہ سفر تمام ہوا جس کی روداد محض یادداشت کے بل پر تم مجھ سے لکھوا رہے ہو۔ کشمیر کا خصوصی تحفہ کچھ "کانگڑیاں" اماں جی فرمائش سے لائیں اور رشتہ دار خواتین کو تحفہ دیا۔ علاوہ ازیں پتھر کے نگینوں والے آویزے، انگوٹھیاں، ہار میں نے چند ہم سنوں کے لئے منگوائے اخروٹ اور مسالے کی بڑیاں کافی تقسیم کی گئیں۔ کشمیر کی بہترین سرخ مرچ اور کئی دوسرے مسالے ڈال کر بڑیاں بنتی تھیں اور تھوڑی سی توڑ کر ہانڈی میں ڈالنے سے سالن کا رنگ اور ذائقہ ہی اور ہو جاتا تھا۔

◆

بخاری کی عظمت

سید عطاء اللہ شاہ بخاری کو یہ عظمت حاصل ہے کہ انہوں نے تحریک پاکستان کی شدید مخالفت کرنے کے باوجود قیام پاکستان کے بعد دل کے ساتھ پاکستان کے وجود کو تسلیم کر لیا۔ انہوں نے دہلی دروازہ لاہور کے میدان میں ایک جلسہ عام سے خطاب کرتے ہوئے یہ اعتراف کیا کہ

"قیام پاکستان کے مسئلہ پر میری رائے ہار گئی اور مسٹر جناح کی رائے جیت گئی"

بخاری کی عظمت کا یہ بہت بڑا ثبوت ہے کہ اس نے ایک بہادر شخص کے طور پر اعتراف کیا۔

سید عطاء اللہ شاہ بخاری بلاشبہ بہت بڑے خطیب تھے۔ ان کی خطابت کا یہ عالم تھا کہ گھنٹوں بولتے تھے اور سامعین کی یہ خواہش ہوتی کہ وہ بولتے چلے جائیں۔ قرآن مجید کی تلاوت تو ان پر ختم تھی۔ واقعی ایسا محسوس ہوتا تھا کہ ان کی تلاوت کے سحر سے انسان ہی نہیں درختوں کی ٹہنیاں بھی جھوم رہی ہیں۔ پھر یہ کہ وہ قید و بند کی صعوبتیں برداشت کرنے والا ایک سچا عاشق رسول ﷺ تھا۔ اپنے معاصرین میں ان کا جو احترام تھا وہ میں آپ کو کیا بتاؤں کہ مولانا ابوالکلام آزاد نے کبھی گاندھی اور نہرو کا بھی اٹھ کر استقبال نہیں کیا ہو گا لیکن اگر کبھی عطاء اللہ شاہ بخاری ابوالکلام آزاد کے ہاں تشریف لے جاتے تو وہ گھر سے باہر آ کر ان کو خوش آمدید کہتے۔

اقتباس انٹرویو:۔ سید احمد سعید کرمانی۔ ہفت روزہ حرمت اسلام آباد۔ صفحہ ۹۔ ۲۹ دسمبر۔

مقامِ صحابہ

صحابہ رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین، رسالت مآب ﷺ کی دعوت پر قائم شدہ معاشرے کے ابتدائی فرد تھے۔ انہیں دعوتِ رسول ہی نے تیار نہیں کیا تھا بلکہ ان کی تربیت میں نگاہِ رسول بھی شامل تھی۔

جو لوگ ان مقدس ہستیوں پر اعتراض کرتے ہیں وہ رسالت مآب کی ہیٹی (خاکم بدہن) کرتے ہیں کہ اللہ کا آخری پیغمبر اپنے رفقاء کو بنانے اور پہچاننے سے قاصر رہا۔ اس طرح وہ لوگ حضور کی نبوت پر بالارادہ حملہ آور ہوتے ہیں۔

اگر رسالت مآب ﷺ اپنے رفقاء کے دل میں قرآن نہ اتار سکے تو پھر کون رہ جاتا ہے جس کے متعلق یہ کہنا ممکن ہے کہ اس کی بدولت فلاں عہد کے انسانوں نے اپنے تئیں اسلام کے سپرد کیا تھا۔

امیرِ شریعت

سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ

سید عطاء المحسن بخاری

بانیٔ احرار، بطل حریت، حضرت امیر شریعت
سید عطاء اللہ شاہ بخاری کی نذر

ہر روز سفر،
مگر وسائل ناپید
دھوپ، حرارت، شدت حدت
ہر لمحہ ایک صعوبت
جاڑوں کی یخ بستہ لمبی کالی راتیں
دہشت، وحشت، خوف
وارنٹ ہتھکڑیاں قید سزا اور جیل
تین سو ساٹھ دنوں میں

روز کئی تقریریں۔ آزادی کی تفسیریں
شعلہ، آگ، بگولہ، مضطر، پیچ و تاب اور سوز و ساز
گونج گرج، کڑکا دڑکا
خرمن افرنگ خاک سیاہ
واہ عطاء اللہ شاہ، زندہ باد عطاء اللہ
تیرا دشمن روئے سیاہ

امیر شریعتؒ کی یاد میں!

کہاں گیا جو بہاروں کی بات کرتا تھا
بڑے لطیف اشاروں کی بات کرتا تھا
وہ تیرے وعدے پہ تب سے تھا رہگزر کے قریں
نہ مانگتا نہ سہاروں کی بات کرتا تھا
غریبِ شہر بھی دل کی کہے گا اس سے کبھی
بڑا کریم تھا پیاروں سے بات کرتا تھا

ماضی کے جھروکے سے

ابن امیر شریعت
سید عطاء المحسن بخاری

۱۹۵۴ء میں اباجی رحمہ اللہ ایک سال جیل کاٹ کر رہا ہوئے۔ ملتان تشریف لائے تو سینکڑوں لوگوں نے انکا والہانہ استقبال کیا۔ خوش آمدید کہا۔ ملتان پلیٹ فارم نعرۂ تکبیر اور ختم نبوت زندہ باد کے خارا شگاف نعروں سے گونج اٹھا۔ اباجی گھر آگئے۔ مگر مسلم لیگی حکمرانوں کی ستم رانیوں سے ان کی صحت جاتی رہی اور وہ امراض کی پوٹ بن گئے۔ علاج معالجہ ہوا مگر صحت لوٹ کر نہ آئی۔ حتیٰ کہ نومبر ۵۴ء میں فالج نے آلیا۔ اباجی تحریکِ تحفظ ختمِ نبوت میں بعض مولویوں کے عذر خواہی اور رہائی پانے کے رویہ سے بہت دل برداشتہ تھے۔ ایک روز اپنے ایک نہایت جاں نثار کارکن مظہر نواز خان درانی صاحب اور کچھ دوسرے احباب سے رات کے گیارہ بجے تک گفتگو جاری رہی وہ لوگ اجازت لے کر اپنے گھر چل دیئے۔ اور اباجی اس کے بعد فالج کی لپیٹ میں آگئے۔ انہی دنوں خیر المدارس کا سالانہ جلسہ تقسیم اسناد بھی ہونا قرار پایا۔ مولانا احتشام الحق تھانوی مرحوم بھی جلسہ میں مدعو تھے۔ بلکہ مولانا خیر محمد جالندھری رحمہ اللہ کے مسلک کے مرکزی بزرگ تھے۔ جوں جوں جلسہ قریب آرہا تھا منتظمین جلسہ کے اوسان خطا ہوتے جا رہے تھے۔ انہیں کہیں یہ اطلاع مل چکی تھی کہ احرار ور کرز مولانا احتشام الحق مرحوم کی تقریر نہیں ہونے دیں گے۔ اور جلسہ میں بدمزگی ہو گی۔ مولانا بہ نفس نفیس حضرت امیر شریعت رحمہ اللہ کی خدمت میں آئے اور فرمایا۔ ان کو سمجھائیں یہ مدرسہ کا جلسہ ہے سیاسی جلسہ تو نہیں۔ ہماری ضروریات ہوتی ہیں اور ہم اسی ذریعہ سے پوری کرتے ہیں۔ اباجی نے فرمایا۔ حضرت آپ مطمئن رہیں جلسہ ہو گا اور ضرور ہو گا۔ مولانا مطمئن ہو کر چلے گئے۔ اس کے بعد اباجی نے احرار کارکنوں کی میٹنگ بلائی اور تمام رضاکاروں کو تلقین کی کہ جلسہ میں گڑبڑ نہ کریں۔ مستری دین محمد صاحب جو بڑے سلجھے ہوئے ساتھی تھے کہنے لگے شاہ جی! یہ آپ فرما رہے ہیں۔ آپکے علم میں ہے کہ یہ شخص خواجہ ناظم الدین کو یقین دلانے والا ہے اور مودودی کا ساتھی۔ یہ تحریک کے قاتل ہیں۔ اباجی نے فرمایا۔ میں تمہیں حکم دیتا ہوں کہ اس دن تم ملتان بھی نہ رہو۔ چنانچہ بڑی رنجیدہ کیفیت کے ساتھ احرار ورکرز خانیوال یا اس سے بھی آگے چلے گئے۔ حضرت امیر شریعت سٹیج پر بہ نفس نفیس تشریف فرما تھے۔ اور مولانا احتشام الحق مرحوم تقریر کرتے رہے۔ جلسہ ختم ہو گیا۔ ساتھی ملتان واپس آگئے۔ منہ لٹکائے ہوئے گردنیں جھکائے ہوئے سائل ہوئے کہ شاہ جی یہ آپ نے کیا کیا؟ فرمایا!

"ہمارے ہاتھوں ان کی داڑھیاں نہیں نوچی جانی چاہئیں۔ پھر ہم میں اور لیگیوں میں کیا فرق ہوا ہم ان کی حفاظت ہی کریں گے!"

۱۹۶۷ء میں ایوب خان کے پالتو بیٹے نے اپنے ڈیڈی کی حکومت کے خلاف علم بغاوت بلند کیا تو یار لوگ

جو کڑی بھول گئے۔ اور ایوب کتا ہائے ہائے کے نعرے ایوب خان مرحوم نے اپنے کانوں سے سنے۔ اس نے یہ کہہ کر استعفیٰ دے دیا کہ اب تم "پر کتا" حکومت نہیں کرے گا اور وہ گوشہ عافیت میں چلا گیا۔ بھٹو اپنے سوشلزم سمیت دندناتا رہا جن لوگوں کو بائیں بازو کے علانیہ فسق و فجور سے محبت ہے انہوں نے ایوب خان کے اس نافرجام بیٹے سے یاری گانٹھ لی بڑے قصیدے لکھے گئے یہاں تک غلو کیا گیا کہ:

مفتی بھٹو اور ولی
مل بیٹھے تو ناؤ چلی

قومی "فساد" کی تحریک کے نتیجے میں پاکستان کا ابن علقمی برسر اقتدار آیا۔ یحییٰ قزلباش نے الیکشن کرائے تو مجیب الرحمٰن کو اس کے جیتنے کی سزا ملی۔ اور وہ "اُدھر تم" کا شاہکار ٹھہرا۔ مغربی پاکستان کو نیا پاکستان کہہ کے "ادھر ہم" کا راگ اس زور سے الاپا گیا کہ پاکستانیوں کو اپنے ایک بازو کے کٹ جانے کا غم بھی بھول گئے۔ قائد اعظم کا دو قومی نظریہ دریائے برہم پتر میں ڈبو کر خود کالے ناگ کی طرح ابھرے اور ملحدین پاکستان کا ننگا ناچ شروع ہو گیا۔

ان دنوں جمعیت العلماء اسلام پیپلز پارٹی کی حلیف جماعت تھی۔ انہوں نے بھی بھٹو صاحب کی رفاقت میں بہت حلاوت محسوس کی۔ اور اس لذتیت میں ایسے محو ہوئے کہ اپنوں پرایوں کی پہچان کھو بیٹھے۔ ابھی بھٹو صاحب کا سوشلزم نئے معنی کا لباس زیب تن کر کے لوگوں کی آنکھوں میں پوری دھول نہیں جھونک پایا تھا کہ علماء کے ایک طبقہ نے سوشلزم کو کافرانہ نظام کہہ کر بیخ کنی دینے کا فیصلہ کیا علماء کے اس گروہ کو مرکزی جمعیت العلماء اسلام کہا گیا۔ (لیکن ان کی مساعی بوجوہ محدود ہو گئیں) علماء کے اس گروہ کے سرخیل مولانا احتشام الحق تھانوی مرحوم تھے۔ آپ مسلم لیگ کے حلیف علماء میں سے تھے مگر ان کی مستقل حیثیت کے پیش نظر ملتان کے چند احباب نے ان کو ملتان میں بلایا تو مولانا کو کہیں سے اس کی بو آ گئی کہ جمعیت العلماء اسلام (مفتی محمود گروپ) کے جتھہ بردار خصوصاً مدرسہ قاسم العلوم کے پٹھان طلباء و علماء انکی ٹوپی اتاریں گے۔ مولانا نے بغیر کچھ بتائے مجھے بلا لیا اور پھر اپنے ساتھ ہی رکھا۔ شاید اس لئے کہ وہ سمجھتے تھے کہ راقم حضرت امیر شریعت کا فرزند ہے اور ملتان میں ہی ان کا مرقد بھی ہے۔ ہو سکتا ہے دینی مدارس کے لوگ کچھ لحاظ کریں اور بپاس خاطر احباب کوئی بد تمیزی نہ کریں کیونکہ ماضی میں خیر المدارس کا واقعہ ان کے حافظہ میں تھا۔ اور ایسا ہونا بھی چاہیئے تھا کہ اختلاف مسائل و مشرب کے باوجود علماء اسلام کا وطیرہ یہی رہا ہے مگر صاحب ہوا یہ کہ مولانا احتشام الحق مرحوم نے شاہی عید گاہ میں سوا گھنٹہ تو کامیاب تقریر کی۔ آپ تبدیلیٔ اعضاء پر ایک مزاحیہ واقعہ سنا رہے تھے کہ اور کہہ رہے تھے کہ ایسا زمانہ آ گیا کہ کوئی کسی مرنے والے کے دروازے پر جائے تو اس کے وارث یہ سمجھیں گے کہ تعزیت مسنونہ کے لئے آیا ہے لیکن پوچھنے پر وہ کہے گا میں تو آپ کے والد ماجد کا ہاتھ یا ناک لینے آیا ہوں۔ کہ میرے ایک بھائی کو اس کی بہت سخت ضرورت ہے۔ کہ اتنے میں سانپ کی پھنکار کی آواز پیدا ہوئی۔ جتھہ بند مولویں نے سانپ سانپ کا شور مچایا اور جلسہ درہم برہم ہو گیا۔ لوگ بھاگنے لگے تو میں جو اسٹیج پر بیٹھا ہوا سارا تماشا دیکھ رہا تھا اٹھا اور مولانا احتشام الحق مرحوم کی گردن میں ہاتھ حمائل کر

کے عرض کیا مولانا اب نہیں جانا اب تو ضرور تقریر کرنا ہے پھر میں نے اپنے ساتھیوں کو پکارا اور کہا کہ:

"ساتھیو آج کا دن ہماری زندگی کا آخری دن ہے۔ ان فسادیوں کے گلے دبوچ لو۔ انہوں نے نئے یارانے پر پچھلی سنگتیں قربان کر دی ہیں انہوں نے آج اللہ کے گھر میں وہ کرتوت کیا ہے کہ ان کی اپنی زندگی بھی داؤ پر لگ گئی ہے"۔

گلۂ وفائے جفا نما جو حرم کو اہل حرم سے ہے
جو میں بت کدے میں بیاں کروں تو کہے صنم بھی ہری ہری

جلسہ ہوگا ابھی ہوگا اور مولانا تقریر فرمائیں گے میں دیکھوں گا کہ اب کون ہے جو مولانا احتشام الحق کی تقریر کو خراب کرے گا۔ پھر مولانا نے تقریر مربوط کی اور لوگ آ کے بیٹھ گئے فسادی بھاگ گئے ان بھاگنے والوں میں مدرسہ قاسم العلوم کے پشتون طلباء ڈنڈا بردار جمعیت مفتی گروپ کے کارکن موجود تھے۔

اسی زمانہ میں ایک روز مولانا محمد شریف صاحب مرحوم جو مولانا خیر محمد جالندھری رحمہ اللہ کے فرزند ارجمند اور خیر المدارس کے مہتمم تھے ہمارے گھر آئے اور مولانا احتشام الحق کی تقریر اور جمعیت کے کارکنوں کی بدتمیزی کے خطرہ کے پیش نظر مجھے فرمایا کہ تم رات کو آجانا جلسہ مدرسہ کی مسجد میں ہے چنانچہ ان کے حکم پر مدرسہ پہنچ گیا۔ اور گیٹ پر کھڑے ہوئے پیپلز پارٹی اور جمعیت مفتی گروپ کے افراد کو باہم کھسر پھسر کرتے ہوئے پایا۔ میں نے ان سے صاف کہہ دیا کہ تمہاری ہماری دوستی عید گاہ والے واقعہ کے بعد ختم ہو چکی ہے۔ آج اگر تم نے کوئی حرکت کی تو ایک نہ ایک آدمی مارا جائے گا۔ عافیت اسی میں ہے کہ مولانا کی تقریر سنو اور اپنا اختلاف قائم رکھو۔ تمہیں اس کا حق ہے۔ یہ مدرسہ کا جلسہ ہے اور یہ ہماری مادر علمی ہے۔ ہم اس کے تقدس پر تمہیں قربان کر دیں گے۔ اگرچہ مولانا کے ساتھ ہم بھی اختلاف رائے رکھتے ہیں۔ بس پھر کیا تھا الحمدللہ کسی کو گڑبڑ کی جرأت نہ ہوئی۔

ایک دفعہ حضرت مولانا خیر محمد صاحب رحمہ اللہ اور مولانا احتشام الحق تھانوی رحمہ اللہ گھر پر تشریف لائے کھانے سے فراغت کے بعد حضرت الاستاذ مولانا خیر محمد رحمہ اللہ نے برادر بزرگ حضرت مولانا سید ابو معاویہ ابوذر بخاری مدظلہ سے فرمایا کہ آج میں اس لئے آیا ہوں کہ تم مولانا کے ساتھ مل کر کام کرو مولانا بالکل تنہا ہیں۔ بہت سی باتیں ہوئیں گلے شکوے ماضی و حال پر تبصرے۔ آخر میں سید ابو معاویہ ابوذر بخاری مدظلہ نے فرمایا:

"مولانا آپ کا حکم سر آنکھوں پر لیکن اس کا کیا کیا جائے کہ حضرت مولانا تھانوی تلوار تو ہماری ہیں مگر قبضہ دولتانے کا ہے! اس میں تبدیلی کا یقین آپ دلا دیں ہم تو مولانا کے خادم ہیں۔"

مگر اس میں تبدیلی کے لئے مولانا احتشام الحق آمادہ نہ ہوئے۔ اور بات ادھوری رہ گئی۔ اور اس کا اختتام یوں ہوا کہ مولانا کے بڑے فرزند مولانا احترام الحق پیپلز پارٹی کے ہو کر رہ گئے۔ علماء کرام سیکولر سیاست کے چکر میں ایسے الجھے کہ ۱۹۵۶ء سے اب تک ہچکولے کھا رہے ہیں مگر اپنی شناخت قائم نہ رکھ سکے۔

یا حسرتی!

ماضی کے جھروکے سے جھانکنے کا مقصد صرف یہ ہے کہ حضرت امیر شریعت رحمہ اللہ نے جس طرح علماء کا احترام کیا ان کے بیٹوں نے اس روایت کو زندہ رکھا مگر جہاں اختلافِ رائے کو توہین علماء جیسے الزام سے متہم کیا جائے وہاں تاریخی ریکارڈ کی درستی از بس ضروری ہو جاتی ہے۔

تجھے نسبت خصوصی تھی نبی کے آستاں سے

کبھی پستیوں میں چمکا تو فراز آسماں سے
کبھی رفعتوں سے الجھا تو نشیب کارواں سے

جو مٹے گا دین حق پر وہی رہ سکے گا زندہ
یہ سبق ملا ہے مجھ کو تری مرگ ناگہاں سے

تھکے ہارے قافلے نے تجھے خضر وقت جانا
تو چلا ہمیشہ ہٹ کر رہ و رسم کارواں سے

گلِ سرمدی بکھیرے تیرے خامہ و زباں نے
تو خراج لے رہا ہے ابھی خامہ و زباں سے

یہ خلوص یہ عقیدت یہ حضور سے محبت
تجھے نسبت خصوصی تھی نبی کے آستاں سے

تیری آہ صبح گاہی، ترا نالۂ شبانہ
یہی یاد رہ گیا ہے شب غم کی داستاں سے

ترا ذوق حق پسندی تجھے لے گیا رسن تک
بنے خار بھی گلستاں تیرے شوقِ بیکراں سے

تری بے غرض قیادت ترا علم اور خطابت
تری داستاں کو چھیڑیں مگر اب کہاں کہاں سے

عبدالکریم ثمر

گفتگو:۔ پروفیسر حافظ محمد وکیل شاہ
ترتیب:۔ سید محمد کفیل بخاری

کچھ دیر شاہ جی کی مجلس میں

اب سے اڑتیس برس اُدھر کی بات ہے، ۱۹۵۴ء کا زمانہ اور میرا طالب علمی کا دور۔ میں ایمرسن کالج ملتان میں بی۔ اے کا طالب علم تھا۔ اور حسن اتفاق سے میرا قیام بھی تعلیم کے سلسلہ میں حضرت امیر شریعت کے ہاں تھا۔ حضرت امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاری رحمہ اللہ ان دنوں تحریک مقدس تحفظ ختم نبوت کے سلسلہ میں جیل سے رہائی پا چکے تھے۔ شاہ جی کو اس آخری قید میں مسلم لیگی حکومت نے جو اذیتیں پہنچائی تھیں ان کی وجہ سے مختلف عوارض نے انہیں آلیا تھا۔ وہ اپنی شدید بیماری کی وجہ سے تمام تبلیغی اسفار موقوف کر کے اکثر گھر پر ہی موجود رہتے۔ تحریک تحفظ ختم نبوت میں بعض "علماء" کے مشکوک کردار، جیل سے رہائی کے لئے حکومت کو معافی نامے پیش کرنے، گردو پیش کے حالات و واقعات، حوادث روز و شب، قوم کی بے حسی اور خواجہ ناظم الدین کی مسلم لیگی حکومت کی طرف سے تحریک میں بے گناہ مسلمانوں پر بے پناہ ظلم و تشدد اور اس کے نتیجے میں دس ہزار مسلمانوں کی شہادت نے حضرت شاہ جی کو بہت ہی دل شکستہ کر دیا تھا۔ انہی پے در پے صدمات نے شاہ جی جیسے مضبوط انسان کو جسمانی طور پر گھائل کر دیا تھا۔ اعصاب مضمحل ہو گئے تھے۔ اور وہ ان حوادث و سانحات پر کڑھتے رہے۔ ان دنوں مختلف طبقوں سے تعلق رکھنے والے حضرات صبح تا شام آپ سے ملاقات کے لئے حاضر ہوتے رہتے۔ شاہ جی کا زیادہ وقت اپنی بیٹھک میں ہی گزرتا۔ اس دور میں جتنی بھی نشستیں ہوئیں وہ خالصتاً علمی، ادبی، سیاسی اور تاریخی نوعیت کی تھیں۔

اپنی تعلیمی مصروفیات سے فراغت کے بعد جو وقت بھی بچتا تو میری پوری کوشش اور دلی خواہش ہوتی کہ میں اس قیمتی وقت کو حضرت امیر شریعت کی ان بیش بہا مجالس میں صرف کروں۔ اور اس دستر خوان سے علم و حکمت کے موتی چن سکوں۔ چنانچہ ان مجالس میں کچھ دیر بیٹھنے اور شاہ جی کے ملفوظات سے استفادہ کے مواقع مل جاتے۔ شاہ جی اپنے ہاں آنے والے مختلف مکاتب فکر اور مختلف علوم و فنون سے تعلق رکھنے والے احباب سے بے تکلف گفتگو فرماتے۔ اس میں دین و سیاست، شعر و سخن اور تاریخ و ادب غرض ہر موضوع پر سیر حاصل گفتگو ہوتی۔ گویا شاہ جی عام جلسوں سے کنارہ کش ہو کر اپنی بیٹھک میں ہی روزانہ جلسہ کر لیتے۔ علماء آتے تو ترجمۂ قرآن حکیم کے اسلوب اور بے شمار دینی مسائل و معارف کے باب کھل جاتے۔ فنِ تجوید و قرأت کا کوئی ماہر آجاتا تو اس سے تلاوت قرآن کریم کی فرمائش کر کے کیف و سرور حاصل کرتے۔ قرآنی علوم و معارف سے دلچسپی رکھنے والے آتے تو قرآن کریم کے مطالب و معانی اور تفسیری نکات پر گفتگو چھڑ جاتی جو گھنٹوں جاری رہتی۔ اہلِ دل آتے تو تصوف، احسان اور سلوک کے مضامین کھل جاتے۔ شاعر اور ادیب آتے تو ادب و انشاء کے در وا ہو جاتے۔ اور جدید و قدیم ادب و شاعری کا تنقیدی جائزہ لیا جانے لگتا۔

صحافی آتے تو خبر، اس کی صحت، قدیم وجدید طرزِ صحافت اور اصولِ فنِ صحافت پر طبع آزمائی ہونے لگتی۔ سیاست دان آتے تو برصغیر کی پوری دینی، سیاسی، ملی اور قومی تاریخ کا تجزیہ شروع ہو جاتا۔ اور عصر حاضر کی مفاداتی سیاست پر تیر و نشتر برسنے لگتے۔ غرض یہ مجالس علمی، دینی اور سیاسی تاریخ کا عظیم سرمایہ تھیں۔ جن سے ہر شخص بلاتکلف اپنے اپنے ظرف کے مطابق استفادہ کر سکتا تھا۔ یہ شاہ جی کا دمِ واپسیں تھا اور انہوں نے ان مجالس میں اپنے سیاسی سفر کی پوری کہانی بیان کر دی تھی۔ گفتگو کا رنگ ہی کچھ ایسا ہوتا کہ سامع اس میں کھو جاتا اور لکھنے کی طرف توجہ ہی نہ ہوتی۔ اگر کوئی نوٹس لینے کی کوشش کرتا تو آپ ڈانٹ کر فرماتے: "کون لکھ سکتا ہے میری کہانی کو، اور کیا لکھے گا کوئی، ایک طوفان تھا جو برق رفتاری سے گزر گیا۔ میری باتوں کو دماغ میں محفوظ کر سکتے ہو تو کر لو۔ جب سے حافظے کی جگہ تحریر نے لی ہے قوم تباہ ہو گئی ہے"۔

یہ تو محض ان کا عجز و انکسار تھا۔ انہوں نے تمام عمر نام و نمود کی خواہش نہ کی۔ بس ایک بلند نصب العین کو لے کر اٹھے اور برصغیر کی فضاؤں پر چھا گئے۔ آزادی کے محاذ پر ہی نہیں بلکہ ہر محاذ پر ایک سپاہی کی حیثیت سے دیوانہ وار لڑے۔ اور ہر طبقہ کے افراد کو متاثر کیا۔ اگر شاہ جی کی ان مجالس میں شریک ہونے والے احباب ہی توجہ فرما کر اپنی یادداشتیں تحریر کر دیتے تو یقیناً ایک بہت بڑا علمی اور تاریخی سرمایہ محفوظ ہو کر نئی نسل کو منتقل ہو جاتا۔ جس سے آج نہ صرف نژادِ نو اپنے شاندار ماضی سے باخبر ہوتی بلکہ اپنے تابناک مستقبل سے بھی ہم آہنگ ہو جاتی۔

حضرت امیر شریعت رحمہ اللہ کو قرآن کریم سے بے پناہ شغف اور والہانہ محبت تھی۔ قرآن کے معانی و مفاہیم میں غور و تدبر، حسین اندازِ تلاوت اور زندگی کے تمام مسائل و عنوانات پر قرآن حکیم سے استدلال ہی ان کی خطابت کا طرۂ امتیاز تھا۔ یہ سب کچھ اُن کے کلام اللہ سے والہانہ شغف کے نتیجہ میں اللہ جل شانہ، نے اُنہیں فطری طور پر ودیعت فرمایا تھا۔ وہ نجی مجلس میں سخن طراز ہوں یا انسانوں کے بحرِ بے کراں میں تیرتے ہوں۔ ہمیشہ اس حقیقت کا فخریہ اعتراف کرتے کہ میں قرآنِ کریم کا ایک طالب علم ہوں اور خواجہ حافظ شیرازی کی زبان میں فرماتے:

ما قصۂ سکندر و دارا نخواندہ ایم
از ما بجز حکایتِ مہر و وفا مپرس

آپ اکثر فرمایا کرتے

"مجھے تو قرآن کریم کے مطالعہ سے ہی فرصت نہیں اور اس ایک کتاب کے مطالعہ نے دوسری کتابوں سے بے نیاز کر دیا ہے"۔

قرآن کریم کے ترجمہ کے معاملہ میں آپ بہت حساس اور ذوقِ لطیف کے حامل تھے۔ اس کے مطالب و معانی کو عام انداز سے ہٹ کر بیان فرماتے۔ ایسے الفاظ جو معنیٰ کی وسعت اور ہمہ گیری کو اجاگر کریں انہیں بہت پسند تھے۔ علماء کی مجلس میں اس موضوع پر ان کی طبیعت کھل جاتی۔ اور جب وہ اپنے خاص انداز میں

قرآن کی بعض آیات کا ترجمہ بیان فرماتے تو ایسے خوبصورت نکات منظر عام پر لاتے کہ اہل علم بے اختیار ہو کر دادو تحسین کے ڈونگرے برساتے۔

علماء کی ایک مجلس میں

"وتوفنا مع الابرار"

کا ترجمہ پنجابی زبان میں آپ نے یوں فرمایا:

"اتے پوری پا ساڈی نال نیکاں دے"

علماء مجلس عش عش کر اٹھے۔ بالخصوص استاذ العلماء حضرت مولانا خیر محمد جالندھری رحمہ اللہ نے فرمایا۔ "شاہ جی! اللہ پاک نے قرآن فہمی کا جو ذوقِ لطیف آپ کو عطاء فرمایا ہے وہ آپ ہی کا حصہ ہے۔ مزید فرمایا کہ لغوی اعتبار سے بھی بالکل یہی ترجمہ بنتا ہے۔

حضرت شاہ عبدالقادر دہلوی رحمہ اللہ کا ترجمہ قرآن آپ کو بہت ہی محبوب تھا۔ اکثر فرمایا کرتے کہ "مجھے "اللہ الصمد" کے معنیٰ میں ہمیشہ تردّد رہا لیکن جب حضرت شاہ صاحب رحمہ اللہ کا ترجمہ جیل میں پڑھا تو بہت سکون ملا اور تشنگی دور ہو گئی"۔ حضرت شاہ صاحب نے ترجمہ یوں فرمایا ہے۔ "اللہ نرادھار ہے" یعنی وہ ذات جس کا کام کسی بن نہ اٹکے اور کسی کا کام جس بن نہ چلے۔ اسی طرح "اھدنا الصراط المستقیم" کا ترجمہ ہمیشہ یوں بیان فرماتے "چلا ہم کو راہ سیدھی" اور اس معنیٰ میں یہ کیفیت پیدا کرتے کہ ہمیں اپنی درماندگی کا اعتراف ہے۔ ہم خود نہیں چل سکتے۔ اے اللہ، تو اپنی حفاظت و طاقت سے ہمیں صراط مستقیم پر چلا۔

حضرت علامہ عبدالرشید نسیم طالوت رحمہ اللہ کا وجود اللہ پاک کی نعمتوں میں سے ایک نعمت تھا۔ آپ ایک بلند پایہ عالم دین، صاحبِ طرز ادیب اور حاضر جواب شاعر تھے۔ دینی اور علمی حلقوں میں آپ بہت ہی احترام کی نگاہ سے دیکھے جاتے۔ حضرت امیر شریعت شاعری میں ان سے مشورہ بھی فرماتے۔ اور احتراماً انہیں استاد کہتے۔ ان دنوں وہ بھی حضرت امیر شریعت کی مجالس کے حاضر باش رکن تھے۔ اور قرآن حکیم کی مختلف آیات کے تراجم و معانی کے حوالہ سے مدلل اور لطیف نکات بیان فرماتے۔ وہ مختلف آیات کا "بھاشا" میں ترجمہ شاہ جی کو سناتے اور شاہ جی بہت محظوظ ہوتے۔ ترجمہ شاہ جی کو بہت ہی لطف دیتا۔ آپ اپنی تقاریر میں ان آیات کے تراجم کو جب اپنی خاص طرز اداء سے بیان فرماتے تو سامعین کی کیفیت ہی مختلف ہو جاتی۔ شاہ جی جو لطف خود اٹھاتے اپنے سامعین کو بھی اس میں پورا پورا شریک کر لیتے۔ بعض آیات کے تراجم تو اکثر ان کے وردِ زبان رہتے۔ مثلاً

اللہ

من موہن

واشرقت الارض بنور ربھا

اور جگمگا اٹھی دھرتی اپنے پالنہار کی جوت سے

اَلْمَالُ وَ الْبَنُوْنَ زِیْنَتُ الْحَیٰوۃِ الدُّنْیا
دھن اور پوست سب سنگھار ہیں دھرتی کے
اِلٰھُکُمْ اِلٰہٌ وَّاحِد
تم سب کا ایک ہی مہا ٹھاکر ہے۔
لَا اِلٰہَ اِلاّ ھُوَا الرَّحْمٰنُ الرَّحِیم
اس داتا مہر بھرے بنا کوئی اور پر۔تم نہیں۔

انہی دنوں ایک مجلس میں حضرت علامہ طالوت مرحوم نے انکشاف کیا کہ "یہ جو ترجمہ میں آپ کو سناتا ہوں اصل میں حضرت مولانا فضل الرحمٰن گنج مراد آبادی مرحوم کا ہے۔ انہوں نے بھاشا میں مختلف آیاتِ قرآنی کا ترجمہ لکھا ہے جو میرے پاس موجود ہے۔ میں نے اسی سے دیکھ کر آپ کو سناتا ہوں"۔

حضرت شاہ جی کے مطالبہ پر حضرت علامہ طالوت وہ ترجمہ اٹھا لائے اور شاہ جی نے مجھے حکم فرمایا کہ میں اسے نقل کر دوں۔ چنانچہ میں نے بڑی محنت سے ایک کاپی پر اسے نقل کر دیا۔ حضرت امیر شریعت اکثر اوقات اس کاپی کو ساتھ رکھتے اور یہ ترجمہ ان کے زیر مطالعہ رہتا۔ (یہ ترجمہ حال ہی میں بھارت میں شائع ہو چکا ہے)

اس واقعہ کو پورے اڑتیس برس گزر گئے ہیں۔ مگر شاہ جی کی ان مجالس علمی وادبی کے نقوش اب بھی تازہ ہیں۔ وہ تو ایسی بہار آفریں شخصیت تھے کہ ان کی مجلس میں آنے والا ہر شخص اپنی اپنی استعداد کے مطابق استفادہ کرتا تھا۔ اللہ تعالیٰ ان کی خدماتِ ملی و دینی قبول فرمائے۔ (آمین)

آج دنیا ترستی ہے

میں نے اسی سالہ زندگی میں درجنوں بڑے بڑے خطیبوں کو سنا لیکن حضرت عطاء اللہ شاہ بخاری کا مثیل نہ دیکھا نہ سنا۔ وہ آیات یا اشعار پڑھتے تو فضا جھوم اٹھتی۔ وہ متبحر عالم بھی تھے اور شگفتہ مزاج ادیب بھی۔ وہ دلچسپ حکایت سے دلچسپ نتائج اخذ کرتے تھے اور علمی نکات اور لطائف کے امتزاج سے خطابت میں انتہا درجہ کی تازگی و شگفتگی بھر دیتے تھے۔ ان کی ساری زندگی لوگوں کو اللہ کی طرف بلاتے اور مرزائیوں اور انگریزوں کے خلاف جہاد میں بسر ہوئی۔ تزکیۂ نفس اور مرزائیت آپکے خاص موضوع تھے۔ آج دنیا اس سلاست، حلاوت اور فصاحت کو ترس رہی ہے جو شاہ جی دنیا میں تقسیم کیا کرتے تھے۔

(ڈاکٹر غلام جیلانی برق مرحوم۔ "میری داستان حیات")

شہداء ختم نبوت

جو لوگ تحریک تحفظ ختم نبوت میں جہاں تہاں شہید ہوئے ان کے خون کا جواب دہ میں ہوں وہ رسالت ماب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی محبت میں جانیں ہار گئے۔

اللہ تعالیٰ کو گواہ بنا کر کہتا ہوں کہ ان میں جذبۂ شہادت میں نے پھونکا تھا جو لوگ ان کے خون سے دامن بچانا چاہتے اور ہمارے ساتھ رہ کر اب کنی کترا رہے ہیں ان سے کہتا ہوں کہ میں حشر کے دن بھی ان کے خون کا ذمہ دار ہوں گا۔ وہ محبت رسول میں اسلامی سلطنت کے ہلاکو خانوں کی بھینٹ چڑھ گئے، عقیدۂ ختم نبوت کے تحفظ سے بڑھ کر کوئی چیز نہیں، سیدنا ابوبکر صدیقؓ نے سیکڑوں حفاظ قرآن صحابہ کرام ختم نبوت کے تحفظ کے لئے قربان کرا دئے تھے۔

امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاری رحمہ اللہ تعالیٰ
لاہور ۱۹۵۴ء

ترے خمیر میں تھا درد و سوز عشق رسول
ترے ضمیر نے حق کے سوا کیا نہ قبول
ترا وجود وفا و خلوص کا قبلہ
تری نمود میں رنگ ادائے پور بتولؓ
ترا کلام خدا کی شرح جمیل
ترا پیام حدیث حبیب و نطق رسول
تری زبان کی شیرینیاں متاع شکر
ترے بیان کی رنگینیاں بہار کے پھول
تری نوائے جگر دوز صور حشر صغیر
تری صدائے دل افروز برق طور عقول
تری لغات سے خارج رہے جمود و خمول
جمے جو بزم تو لطف و کرم تری عادت
ٹھنے جو عزم تو ترک طلب ترا معمول
حریف سحر و فسون و طلسم تیرا خطاب
حلیف قند و شکر تیری بات بات کا طول
گلوئے کبر پہ حاوی تھا تیرا دست جنون
اسیر حلقۂ زنجیر تیرا پائے اصول
شب سیاہ غلامی میں نور کی قندیل
پھٹی جو پو رہا تحویل قبلہ میں مشغول
خطیب ایسا یگانہ کہ بے مثال و نظیر
نصیب ایسا کہ بیگانۂ حصول و وصول
خودی کی اوٹ میں فقر غیور کا پیکر
عدو پہ چوٹ میں سنجیدگی کا اصل اصول
میسر آئیں ترے قرب کے جو کچھ لمحے
تو عمر خضر بھی ان کے عوض کروں نہ قبول
اگرچہ رشک شہ و شہریار تھا پیارے
وطن میں بھی تو غریب الدیار تھا پیارے

وقار انبالوی

سید محمد ذوالکفل بخاری

روشن ستارہ

آسمان کی کھیتی اپنی بے کراں وسعتوں میں لہلہاتی ، جھلملاتے تاروں کی فصل کے انگ انگ سے پھوٹتے ہوئے شباب نور سے حظ اٹھانے میں غلطاں تھی۔ رات کا پچھلا پہر تھا اور میں صحن میں بیٹھا آسمان کے قبائے نیلگوں سے پھوٹ پھوٹ کر آنے والے ستاروں کی روپہلی روشنی اور چاند کی کیف آور چاندنی کے سنگم سے فضا پر طاری نورانیت کے طفیل ایک روشن روشن ورق پر ' اپنے دیرینہ رفیق اپنے قلم کی رفاقت میں دل و نگاہ کی مسلمانی کے ایک آفاقی مبلغ کی یادوں بھری باتوں اور باتوں بھری یادوں کو رقم کرنے میں مصروف تھا کہ نہ معلوم کب نندیاپور کے ہرکاروں نے مجھے اغوا کرلیا۔

اچانک کسی نے میرے قریب آکر کہا بیٹا! صبح ۲۱ اگست ہے نا! آواز کی شفقت و ملائمت اور لہجے کا شکوہ ' میر رگ و پے میں عقیدت و احترام کا رس گھولتا چلا گیا میں نے پلٹ کر کہنے والے کو دیکھنا چاہا ' مگر نگاہیں اس پیکر نورانی کے جلوے کی تاب نہ لا سکیں تو ریاض خیر آبادی نے بروقت مدد کی۔

نگاہ برق نہیں ' چہرہ آفتاب نہیں — یہ آدمی ہے مگر ' دیکھنے کی تاب نہیں

میں نے جھکے ہوئے سر کو ذرا اوپر کیا اور کہا ہاں! باباجی صبح ۲۱ اگست ہی ہے مگر آپ .... میرا سوال ابھی تشنہ تکمیل تھا کہ اس نے جواب دیا کہ ہاں ہاں ' میں یہ بھی بتاؤں گا کہ ۲۱ اگست سے میرا کیا تعلق ہے ؟ پہلے یہ بتاؤ کہ صبح تم کیا کرو گے ؟ اور یہ رات گئے تک بیدار کیوں رہے ؟ میں نے عرض کی کہ حضرت! صبح میرے دیس کے ایک بطل جلیل کا یوم وفات ہے جس نے نصف صدی تک میری قوم میں حرارت ایمانی کی دولت نایاب کو بے دریغ تقسیم کیا اور جو ....! میں کچھ اور کہنا چاہ رہا تھا کہ بزرگ پھر بولے ' اچھا ' تو تم اس شخص پر مضمون لکھو گے ؟ اور کسی مجمع میں داد پانے کے لئے اپنے مضمون کو بڑے خطیبانہ ڈھنگ سے سنا ڈالو گے ؟ میرے چہرے کے تاثرات سے اثبات میں جواب پاکر اس نے کہا کہ مجھے سناؤ گے ؟ جو تم نے لکھا ہے! اور ــــ میں عہد حاضر کے ہر قلم کار کی طرح جو اپنی تخلیقات کسی نہ کسی کو سنانے کے لئے باؤلا سا پھرا کرتا ہے ' فورا راضی ہو گیا۔ پھر میں نے کہنا شروع کیا کہ "تواریخ انقلابات عالم اس بات کی عظیم الشان شاہد ہیں کہ جب بھی کسی معاشرے میں اس کی تمدنی ' تاریخی ثقافتی اور تہذیبی حقیقتوں سے کنارہ کشی کا رجحان بڑھنے لگے تو اس معاشرے کا ارتقا لازما موقوف ہو جاتا ہے اور پھر جوں جوں قوم کے اس روش پر چل نکلنے کے عمل میں تیزی آتی ہے تو اس قوم کے من حیث المجموع زوال کی وادی ظلمت کی طرف بڑھتے ہوئے قدم بھی اسی سرعت و شدت کے ساتھ اس قوم کو اس کے انجام سے ملا

دینے کے لئے رواں دواں ہو جاتے ہیں ۔ اور پھر بالاخر دھکتی آنکھیں اور سوچتے ذہن اس انجام کو حقیقت ماننے پر مجبور ہوتے ہیں مگر' ایک اضطراب کے ساتھ ! لیکن پھر وہی انجام ایک آغاز کو جنم دیتا ہے ۔ یہ آغاز دراصل اسی اضطراب کا نقش اول ہوتا ہے ۔ اور یہ سب کچھ پلک جھپکنے میں نہیں ہو جاتا کہ جسے مفکر کے فکر' مصنف کی تصنیف' مولف کی تالیف' خطیب کے خطاب' شاعر کے اشعار' مغنی کے نغمہ' مجذوب کی بڑ' فقیر کی صدا سخن ور کے تخیل یا دیب کے ادب پاروں میں سمویا یا پایا جاسکے بلکہ اس کی تفہیم و تشریح کے لئے ایک مطالعاتی و مشاہداتی سفر درکار ہوتا ہے ۔ یہ سفر جو قوموں کے خوابیدہ دل و دماغ میں انقلاب کی نیور رکھتا ہے ۔ یہ سفر صدیوں پر محیط بھی ہو سکتا ہے ۔ اور برسوں میں منتج بھی ۔ یہ سفر دلچسپ بھی ہوتا ہے اور کٹھن بھی ۔ امید و نومیدی' آس و یاس اور جانکنی و جاں نثاری اس سفر ہی کی کیفیات ہیں دوران سفر کچھ مرحلے ایسے بھی آتے ہیں کہ جب ولولے وسوسوں کی نذر ہو جاتے ہیں اور کبھی خدشات و موانعات حوصلوں کے مقابلے ہیچ نظر آنے لگتے ہیں ۔ اور پھر ایسے میں خلاق اعظم و رب کائنات کوئی روشن ستارہ انسانی پیکر کی صورت میں وہاں وارد کرتا ہے ۔ جوان میں خودی اور خود آگہی کا بیج بوتا ہے اور جو اپنے خون سے' ستائش کی تمنا اور صلے کی پروا سے بے پروا ہو کر اس بیج کی آبیاری کرتا ہے ۔ تب ۔ وہ ہمہ انتظار بن جاتا ہے ان لمحوں کے لئے جس سے یہ مژدہ جانفزا اس کے دل و دماغ کی پنہائیوں اور روح کی گہرائیوں تک میں سرشاری کی لہریں دوڑانے لگے کہ اس کی قافلہ سالاری میں بڑھنے والا قافلہ خودی اور خود آگاہی کا جوہر' اپنا زاویہ فکر و نظر اور صدائے قلب و جگر بنا چکا ہے اور آج اس قافلہ کا اپنا تشخص' اس کا ایمان اور اس کی پہچان ہے اور قافلہ والوں کو اپنی پہچان عزیز از جان ہے ۔ تو اس کی آنکھوں میں محبت و انبساط اور مسرت و اطمینان چھلکا پڑتا ہے ۔ واقعی ! بڑی خوش بختی کے غماز ہوتے ہیں وہ لمحات ! اور اگر ...... " میں کچھ اور کہنا ہی چاہ رہا تھا کہ بزرگ نے عجیب بے نیازانہ لہجے میں مصرعہ باآواز بلند دھراتے ہوئے پھر میرے سلسلہ کلام کو منقطع کر دیا ۔

گفتار کا تو غازی تو بنا ، کردار کا غازی بن نہ سکا ۔

ویسے میں جب بزرگ کو مضمون سنا رہا تھا تو بزرگ کے چہرے کی کیفیات بھی میری توجہ کا مرکز رہی تھیں ۔ اس کے چہرے پر کبھی جلال کی سرخی دوڑنے لگی تو کبھی چہرہ بالکل سپاٹ' مگر جمالیاتی شاہکار بن کر رہ جاتا کبھی پیشانی پر کوئی متفکر سی شکن نمودار ہوتی تو دوسرے ہی لمحے ایک دلنواز تبسم میں ڈھل کر اس کے ہونٹوں پر رقصاں ہو جاتی میں جو اب تک سوچنے یا سمجھنے اور کہہ لینے سے عاری' صرف بزرگ کی شخصیت میں کھو کر محسوسات کا پیکر بن کر رہ گیا تھا ۔ آخر بول اٹھا کہ

"اے بزرگ عالی مرتبت ! میں آپ سے تعارف کا خواہش مند ہوں' خدارا اس التجا کو ٹھکرایئے گا نہیں " یہ سننا تھا کہ معا اس کی کیفیت بدل گئی مجھے ایک بھرپور نگاہ سے نوازتے ہوئے اچانک اس نے

نگاہیں ہٹائیں اور ایکا ایکی قلندرانہ لے میں بولنا شروع کر دیا۔

" چوالیس برس لوگوں کو قرآن سنایا ' پہاڑوں کو سناتا تو عجب نہ تھا کہ ان کی سنگینی کے دل چھوٹ جاتے۔ غاروں سے ہم کلام ہوتا تو جھوم اٹھتے۔ چٹانوں کو جھنجھوڑتا تو چلنے لگتیں۔ سمندروں سے مخاطب ہوتا تو ہمیشہ کے لئے طوفان بکنار ہو جاتے۔ درختوں کو پکارتا تو وہ دوڑنے لگتے۔ کنکریوں سے کہتا تو وہ لبیک کہہ اٹھتیں۔ صرصر سے گویا ہوتا تو صبا ہو جاتی۔ دھرتی کو سناتا تو اس کے سینے میں بڑے بڑے شگاف پڑ جاتے۔ جنگل لہرانے لگے۔ صحرا سرسبز ہو جاتے۔ افسوس میں نے ان لوگوں میں معروفات کا بیج بویا جن کی زمینیں ہمیشہ کے لئے بنجر ہو چکی تھیں ' جن کے ضمیر قتل ہو چکے تھے جن کے ہاں دل و دماغ کا قحط تھا ' جن کی پستیاں انتہائی خطرناک تھیں ' جو برف کی طرح ٹھنڈے تھے۔ جن میں ٹھہرنا المناک اور جن سے گذر جانا طرب ناک تھا۔ جن کے سب بڑے معبود کا نام طاقت تھا جو صرف طاقت کی پوجا کرتے تھے تیرہ سو برس کی تاریخ انہی حادثوں کی کہانی ہے۔ انہی چھچھورے ' ناسمجھ اور متحرک جانوروں کو دیکھ کر زرتشت نے کہا تھا کہ " اس کا آنسوؤں اور گیتوں کی طرف میلان ہوتا ہے۔ یہاں امراء دوزخ کے کتے اور سیاستدان کھٹی قے ہیں۔ ان کے ساتھ نٹ اور ان کے پیچھے لاشیں چلتی ہیں۔ ان کی واحد خوبی یہ ہے کہ ہر نیکی اور برائی کی زبان میں جھوٹ بول لیتے ہیں " ۔ بیٹا! ڈھونڈ سکتے ہو تو ان افکار میں میری سوانح عمری کی بنیادیں اور میرا تعاف ڈھونڈ لو۔ " اور پھر اس نے ایک کربناک مسکراہٹ کے ساتھ میری طرف دیکھا اور کہا " ہاں سنو' ۲۱ اگست سے میرا تعلق! شاید تم مجھے نہیں پہچانتے۔ میں وہی ہوں جو ۲۱ اگست کو قوم سے رخصت ہوا اور تم؟ تم مضمون لکھتے اور پڑھتے رہے ...." وہ کچھ اور بھی کہتے مگر میں " شاہ جی " ! کہہ کر ان سے لپٹ گیا۔ میں نے کہا " شاہ جی " آپ نے ٹھیک ہی تو کہا تھا کہ

" ہم جنوں کی شاخ سے گرے ہوئے پتے ہیں۔ ہم موت کے انتظار میں ہیں حالانکہ ہم مر چکے ہیں۔ کیا جانتے ہو ' کہ ہم نے اس کمزوری اور ناتوانی کے باوجود کیا کیا کارنامے سرانجام دیئے ہیں۔
ہم نے لومڑیوں (بزدلوں) کا مسلک اختیار نہیں کیا۔ اور ہم نے نہ ہی گدھوں (احمقوں) کی پیروی کی ہے۔ ہم فقر کے بوریا نشین اپنی مثال آپ ہیں " لے

میری بات کو شاہ جی نے بغور سنا اور پھر جانے کے لئے اٹھ کھڑے ہوئے۔ میں نے کہا شاہ جی کوئی

لے

از شاخ جنوں فتادہ برگیم — مردیم در انتظار مرگیم
باایں ہمہ ضعف و ناتوانی — دانی! کہ چہ کارہانہ کردیم
مامسلک روبہی نہ رفتیم — باپیروی خراں نہ کردیم
برمسند فقر یگانہ فردیم

نصیحت؟ فرمایا "بیٹا! محرومیوں کے باوجود اپنی ذات پر اعتماد قائم رکھنا۔ قوموں کی زندگی ایک تسلسل کا نام ہے اس تسلسل کو قائم رکھنا" اس کے ساتھ ہی ایک جھماکہ ہوا اور میرے ساتھ محو گفتگو ہستی ایک نورانی سے ہیولے کی صورت میں اوپر کو اٹھ گئی گویا کوئی ستارہ میرے قریب سے ہو گزرا تھا۔ اتنے میں مؤذن کی صدا نے مجھے بیدار کر دیا۔ اللہ اکبر اللہ اکبر! اور میں یہ پڑھتا ہوا اٹھ بیٹھا کہ

کمان شب سے سحر کار تیر چھوڑ گیا
ستارہ ٹوٹ کے روشن لکیر چھوڑ گیا

(۲۱، اگست ۱۹۸۵ء کو ملتان میں یوم امیر شریعت کی تقریب میں پڑھا گیا۔

اعترافِ عظمت

"جن قیدیوں نے مجھے اثنائے ملازمت میں متاثر کیا ان میں عطاءاللہ شاہ بخاری نام کا ایک سیاسی قیدی بڑی ہی دلفریب شخصیت کا مالک تھا، اس کا چہرہ مہرہ چرچ کے ان مقدس راہبوں کی طرح تھا جن کی تصویریں یسوع مسیح سے مشابہ ہوتی ہیں۔ یا پھر ان مستشرقین کی طرح جنہیں یورپ میں خاص عزت کی نظر سے دیکھا جاتا ہے۔ ہم اسے عرب کے بڑے بڑے قاموسیوں سے بھی تشبیہہ دے سکتے ہیں لیکن ان کے صحیح شناسا ہمارے ہاں کتنے ہیں؟ میں اسے اپنا دوست بنانا چاہتا تھا لیکن ہمارے درمیان سب سے بڑی روک ہماری مختلف زبانیں تھیں۔ وہ ۱۸۵۷ء کے اس "اینٹی برٹش" ذہن کی باقیات میں سے تھا جنہیں ہمارے پیشروؤں نے علماء کو پھانسی دے کر پیدا کیا تھا۔"

کرنل ہاڈر
(انگریز سپرنٹنڈنٹ ڈسٹرکٹ جیل راولپنڈی۔ ۱۹۳۹)
"ہندوستان کی یادیں" مطبوعہ لندن

ایسا شخص جو اپنی ایک تقریر سے بیک وقت دو حکومتوں کے نظام کو معطل کر دیتا ہے۔

وزیر ہند
(گول میز کانفرنس لندن میں اعتراف)

یہ غیر معمولی انسان ہندوستان کی سب سے زیادہ اثر آفریں شخصیت ہونے کا نہایت قوی دعویٰ کر سکتا ہے۔

مشہور انگریز مؤرخ
"مسٹر ڈبلیو سی سمتھ"
(ماڈرن اسلام ان انڈیا)
صفحہ ۲۶۶۔ مطبوعہ لندن ۱۹۴۶ء

پاکستان کی سیاسی زندگی

اسلام کا سیاسی نظام تو ہم رائج نہ کرسکے اور غیروں کا جو نظام ہم نے اپنایا ہے اس کے ساتھ بھی انصاف نہ کیا۔ اس کی خوبیاں چھوڑدیں اور برائیوں کو شعار کرلیا۔
نتیجہ سب کے سامنے ہے

امیر شریعت
سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ
ملتان ۱۹۵۸ء

جو "میاں" صلی اللہ علیہ وسلم کا نہیں وہ اس قابل نہیں کہ اسے منہ بھی لگایا جائے

جو نام نہاد مسلمان نبوت کے ان ڈاکوؤں سے حسن سلوک کے قائل ہیں یا ان سے رواداری پر عامل ہیں وہ حرماں نصیب روز محشر شفیع امت حضور خاتم النبیین ﷺ کے سامنے کیا منہ لے کرجائیں گے جو "میاں" صلی اللہ علیہ وسلم کا نہیں وہ اس قابل نہیں کہ اسے منہ بھی لگایا جائے۔ نبی کریم ﷺ کے منصب عالیہ پرڈاکہ ڈالنے والا مسیلمہ کذاب کی طرح آج بھی واجب القتل ہے۔ ارتداد ایک ایسا جرم ہے جس کی معافی اسلام میں کہیں نہیں۔ "مرزا" اور اس کے ماننے والے دجال، کذاب، مرتد، واجب القتل اور جہنمی ہیں۔!

بانی احرار مؤسس تحریک تحفظ ختم نبوت امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاری رحمہ اللہ

اس کی آواز نے ظلمت کا جگر چاک کیا

صدف دہر میں اک گوہر یکتا تھا وہ
فرد تھا، علم و عزیمت میں یگانہ تھا وہ

لحن سے اس کے فصاحت کا چمن کھلتا تھا
حسن ابلاغ کی مہکی ہوئی دنیا تھا وہ

فصحا موجیں ہیں تقریر و تکلم کی، مگر
دیکھنے والوں کا کہنا ہے کہ دریا تھا وہ

اس کی محفل میں بلاغت بھی تھی نقش دیوار
حرف و مفہوم سماعت تھے کہ گویا تھا وہ

اس نے تخلیق کیا اپنا ہنر، اپنا دوام
وہ خود اک دور تھا، آپ اپنا زمانہ تھا وہ

اس کی آواز نے ظلمت کا جگر چاک کیا
جبر افرنگ میں جرأت کا اجالا تھا وہ

حلقہ در حلقہ کٹی جور خزاں کی زنجیر
آبِ شمشیر کا بہتا ہوا دھارا تھا وہ

وہ موحد کہ رہین غم ہستی نہ ہوا
خس و خاشاک ہوس کے لئے شعلہ تھا وہ

چشم بیدار سے تھا رنگ فشاں عہدِ بہار
اپنے امروز میں فردا کا اشارا تھا وہ

کوئی باور نہ کرے گا وہ سخن کا اعجاز
شاید اب کوئی نہ سمجھے گا کہ کیسا تھا وہ

چاہتا تھا کہ کہوں اس کو مثیل سحباں
دل نے ٹوکا کہ خطابت میں تو یکتا تھا وہ

شفقت اس کی تھی ہر عالی و عامی کو محیط
دہر میں حسنِ اخوت کا جریدہ تھا وہ

اس کے کردار میں شامل تھے جلال اور جمال
بحرِ مواج تھا، نغمات کا جھرنا تھا وہ

وہ عزیمت کہ صلابت کو پسینہ آجائے
گویا اسلاف کی عظمت کا نمونہ تھا وہ

علم و حکمت کو دیئے اس نے جنوں کے انداز
حکمتِ عشق کا بے مثل خزینہ تھا وہ

عکس در عکس تھی اس حسن تکلم کی بہار
آئینہ خانۂ کردار میں چہرہ تھا وہ!

پروفیسر اسلم انصاری (ملتان)

مولانا حفظ الرحمٰن سیوہارویؒ

یادیں باقی رہ گئیں

امیر شریعت حضرت مولانا سید عطاءاللہ شاہ بخاری اس دنیا سے رخصت ہو کر رحمت الٰہی کے آغوش میں پہنچ چکے ہیں لیکن وہ اپنی زندگی کے جو روشن نقوش اپنی صلاحیت و کمال اور اپنے مجاہدانہ ایثار و کردار کی جو یادیں باقی چھوڑ گئے ہیں، وہ نہ صرف تاریخ کے صفحات پر محفوظ رہیں گی بلکہ لاکھوں کروڑوں انسانوں کے دلوں اور دماغوں پر نقش ہو چکی ہیں۔ اور نسلاً بعد نسلاً انسانی نسلوں کو ان کی یاد بہتر زندگی اور اعلیٰ اخلاق و کردار کا سبق دیتی رہے گی۔

ان کی شخصیت اس دور کی ایک عظیم اور باکمال شخصیت تھی۔ خدا تعالیٰ نے ان کو مخصوص ممتاز صلاحیتوں سے نوازا تھا وہ انتہادرجہ سادگی پسند، قناعت گزین اور توکل شعار انسان تھے۔ ان کی طبیعت حد درجہ بے لوث و بے غرض واقع ہوئی تھی۔ اپنے رہن سہن، وضع قطع، بول چال، میل جول اور ہر ادا میں وہ سادگی کا پیکر اور "مرد مومن و مجاہد" کی زندہ تصویر تھے۔ شاہ جی بجا طور پر اس صدی کے ان علماء حق میں شمار کئے جائیں گے جنہوں نے اپنے فکرو عمل کی تمام صلاحیتیں انسانی سماج کی بے لوث و بے خوف خدمت کے لئے وقف کیں اور ان کی پوری زندگی جہاد و عمل کا ایک نمونہ بنی۔

شاہ جی کو دین و ملت سے وہ شغف تھا جو مردِ مومن کا شعار ہے۔ خدا تعالیٰ نے ان کو خطابات و بیان کی بے مثال صلاحیت عطا کی تھی اور ساتھ ہی دل بھی وہ عطا فرمایا تھا جو سعی و عمل کے جذبات اور حق پسندی و حق گوئی کی سدا بہار امنگوں سے معمور تھا۔ ان کی یہ مخصوص صلاحیتیں سرتاسر خداداد صلاحیتیں تھیں۔ جن میں کسب و تمنا کو کوئی دخل نہ تھا۔ زہے سعادت! کہ شاہ جی نے اپنی یہ تمام صلاحیتیں خدمتِ دین و ملت اور خیر خواہی وطن کی راہ میں صرف کیں اور یہی ان کی شخصیت و کردار کا نشانِ امتیاز ہے۔

ملک کی زندگی میں شاہ جی ایک سحر آفرین خطیب اور بے مثال مقرر کی حیثیت سے نمودار ہوئے اور بہت ہی جلد عوام و خواص کے دلوں پر چھا گئے۔ دنیا کی کسی بھی زبان میں اس شان کے خطیب، بہت کم ہو سکتے ہیں۔ کوئی دینی اور مذہبی عنوان ہو یا کوئی سیاسی اور سماجی موضوع، وہ جس سلاست، روانی، برجستگی اور بے تکلفی کے ساتھ گھنٹوں تقریر کرتے اور اپنے مافی الضمیر کو سامعین کے رگ و پے میں سمو دیتے تھے اس کو دیکھ کر یقین ہوتا تھا کہ وہ ایک پیدائشی اور خدا ساز مقرر اور خطیب ہیں۔

سیرت پاک اور اسوۂ رسول کریم ﷺ ان کا خاص موضوع اور ذہنی شغف تھا اور نہ صرف وعظ و تبلیغ کی حد تک۔ بلکہ شاہ جی ان خوش نصیبوں میں تھے جن کو خدا تعالیٰ نے اسوۂ رسول کی سچی لگن اور عمل کی توفیق و سعادت سے بھی نوازا تھا۔

"ختم نبوت" کی راہ میں جب قادیانیت نے رخنے پیدا کرنے چاہے اور ایک گمراہ تحریک نے سر

اٹھایا اس وقت حق پرستوں کی جو شخصیتیں اس کے مقابلہ پر سینہ سپر ہوئیں، شاہ جی ایک قائد کی حیثیت سے ان میں پیش پیش تھے اور آخر تک پیش پیش رہے۔ اس راہ میں انہیں بڑے بڑے خطرات و مصائب کا سامنا ہوا مگر محبت رسول ﷺ کا دامن ہاتھ سے نہ چھوٹا۔

پہلی جنگِ عظیم کے بعد عالمِ اسلام کا سب سے بڑا اور اہم مسئلہ "خلافت" کا تھا۔ تحریک خلافت کی ہم آہنگی نے مسلمانانِ ہند میں جو بیداری اور جرأت عمل پیدا کی وہ خود ملک کی تحریک آزادی کے لئے ایک بڑی کمک ثابت ہوئی اور اسی وقت سے آزادی کی تحریک نے اپنی ملک گیر اور مضطرب شکل اختیار کی۔ ناممکن تھا کہ شاہ جی جیسا اولوالعزم اور باعمل انسان اس تحریک کی صف قیادت سے پیچھے رہ جاتا۔

مجھے یاد ہے کہ ۱۹۲۰ء میں مولانا حسرت موہانی مرحوم نے دہلی میں ایک اہم سیاسی اجتماع بلایا تھا۔ اس اجتماع میں پہلی بار مجھے حضرت شاہ جی سے ملاقات کی مسرت حاصل ہوئی تھی۔ اس کے بعد مسلسل پچیس سال پھر اس طرح گزرے کہ فکرو عمل کا ایک میدان تھا اور ایک ہی لگن۔ تحریک آزادی شبانہ روز سرگرمیوں کا محور تھی۔ اس طویل رفاقت اور شعورو جذبات کی ہم آہنگی نے دلوں میں خلوص و تعلق کی جو گرہیں لگائیں۔ آج جب کہ شاہ جی دنیا سے رخصت ہو چکے ہیں، ان کا ذکر بھی دل پر شاق گزرتا ہے۔

نہیں آتی گر ان کی یاد تو برسوں نہیں آتی
مگر جب یاد آتے ہیں تو اکثر یاد آتے ہیں

برصغیر آزاد ہوا اور اس کے بعد برا بھلا جو کچھ ہوا وہ ہوا، مگر افسوس اس کے ساتھ ہی "اخوان الصفا" کی وہ محفلیں بھی اجڑ گئیں جو گھروں اور دیوان خانوں کی جگہ قید خانوں میں آراستہ ہوئی تھیں اور دارو گیر اور جہاد و آزمائش کا وہ عزیز دور بھی یک بارگی ختم ہو گیا جس کی لذتیں کچھ خوش نصیبوں کے حصہ میں آئیں۔

آئے عشاق، گئے، وعدۂ فردا لے کر
اب انہیں ڈھونڈ چراغِ رخ زیبا لے کر

برصغیر کی تاریخ میں یہ چوتھائی صدی سیاسی ہیجان و تلاطم کا ایک صبر آزما دور تھا۔ جس میں چالیس کروڑ محکوموں اور غلاموں کی بے سروسامانی اس عظیم الشان اور پر غرور اقتدار سے برسرپیکار رہی جس کی حدود گرفت میں سورج غروب نہیں ہوتا تھا۔

اس دور کی آزمائش اگرچہ بہت کٹھن اور ہمت شکن تھی لیکن وطن کے قدم کار مردان ہمت کا جو قافلہ ہر خوف و خطر سے بے نیاز یہاں تک کہ خود اپنی عزت و آبرو اور جان و مال سے بے فکر ہو کر اس عہد کے ساتھ اپنے گھروں سے نکلا تھا کہ

یا تن رسید بجانان یا جان زتن بر آید

اس کا عزم و ثبات بھی ناقابل تسخیر تھا۔ اور بالآخر وہی کامیاب ہوا مولانا سید عطاء اللہ شاہ بخاری اس قافلہ کے ایک سالار اور اسی مردانِ ہمت کی صفِ اول میں تھے۔

آزادیٔ وطن کی خاطر انہوں نے جس تن دہی کے ساتھ کام کیا ملک کے ایک گوشہ سے دوسرے گوشہ

تک کی خاک چھانی اور خندہ پیشانی کے ساتھ قدم قدم پر خطرات کا مقابلہ کیا۔ پامردی کے ساتھ ہر تعاقب اور قیدوبند کی صعوبتوں کو برداشت کیا۔ اور اس پورے دور میں جو قائدانہ اور مجاہدانہ کردار پیش کیا وہ تاریخ آزادیٔ وطن کا ایک سنہرا ورق ہے جو ہمیشہ قدر و اعجاب کی نگاہ سے دیکھا جائے گا اور مکمل آزادی کی فضاؤں میں سانس لینے والی آئندہ نسلیں اس احسان سے گراں بار رہیں گی۔

حق یہ ہے کہ شاہ جی کی شخصیت ان کا جوشِ عمل، ان کی قربانیاں اور سب سے بڑھ کر ان کی ساحرانہ خطابت، تحریک آزادیٔ وطن، اس کی پرورش اور ترقی کے لئے ایک بڑی مدد اور بیش قیمت اثاثہ تھی جس کے بغیر اس عظیم تحریک کی کامیابی اور اس کا نشوونما بروقت مکمل نہ ہوتا۔

مرد آزاد الگ اپنا جہاں رکھتا تھا

منفرد ذوقِ عمل، زورِ بیاں رکھتا تھا
دلِ پرسوز، زباں شعلہ فشاں رکھتا تھا

لب پہ توحید کے نغمات رواں رہتے تھے
دل میں عشقِ شہ لولاک نہاں رکھتا تھا

کوئی خواہش نہیں رکھتا تھا بجز خدمت دیں
اس تمنا کو بہرحال جواں رکھتا تھا

اٹھ گیا عظمت و تقدیس رسالت کا خطیب
سینۂ شوق میں جو برقِ تپاں رکھتا تھا

روشِ اہلِ جہاں کا وہ نہیں تھا پابند
مردِ آزاد الگ اپنا جہاں رکھتا تھا

اس کے پاؤں میں نہ آئی کبھی لغزش تائب
راہ میں گرچہ کئی سنگِ گراں رکھتا تھا

حفیظ تائبؔ

شیخ التفسیر مولانا احمد علی لاہوریؒ

مقامِ امیرِ شریعت

لوگ شاہ جی کو ایک بہت بڑا خطیب، ایک سیاستدان، ایک محب وطن اور جرأت و بے باکی کا ستون ضرور تسلیم کرتے ہیں لیکن شاہ جی کے روحانی مرتبے سے قطعی طور پر ناواقف ہیں ورنہ ان کے پاؤں دھودھو کر پیتے۔

شاہ جی ولی کامل اور اسلام کی شمشیر برہنہ ہیں لیکن انہوں نے اپنے اوپر "مزاح" کی چادر اوڑھ لی ہے اس لئے ظاہر بین لوگ ان کا روحانی مقام متعین نہیں کر سکتے۔

محشر کا دن ہوگا۔ رحمت دو عالم جلوہ افروز ہوں گے۔ صحابہ بھی ساتھ ہونگے۔ بخاری آئے گا حضور نبی کریم ﷺ معانقہ فرمائیں گے اور کہیں گے بخاری تیری ساری زندگی عقیدہ ختم نبوت کی حفاظت میں گزری اور کتاب و سنت کی نشر و اشاعت میں صرف ہوئی۔ آج میدان حشر میں تیرا شفیع میں ہوں۔ تیرے لئے کوئی باز پرس نہیں۔ جا اور اپنے ساتھیوں سمیت جنت میں داخل ہو جا۔

"حکومت کہتی ہے عطاءاللہ شاہ بخاری فساد پھیلاتا ہے ان اللہ کے بندوں کو معلوم نہیں کہ اگر عطاءاللہ شاہ فساد پر آمادہ ہو جائے تو مرزائیت کا قلعہ قائم نہیں رہ سکتا میں کہتا ہوں اگر بخاری شام کو حکم دے تو صبح ہونے سے پہلے ربوہ کی اینٹ سے اینٹ بج جائے" پھر فرمایا "حکومت کی گولیوں اور بندوقوں میں وہ طاقت نہیں جو علماء کی زبان میں ہے۔ ہمارے ایک عطاءاللہ شاہ بخاری بحمدللہ سب پر بھاری ہیں اور جب تک وہ زندہ ہیں اسلام کو کوئی خطرہ نہیں"

رضاکارانِ احرار کی مخلص، خدا پرست اور اسلام کی جاں نثار جماعت کو اللہ تعالیٰ نے رہنما بھی بے نظیر عطا فرمائے جو لبنی حق گوئی، حق پرستی، حق کی حمایت کے لئے باطل کے مقابلے میں سر دھڑ کی بازی لگانے میں شہرہ آفاق ہیں۔ حق کی حمایت میں اگر باطل پرستوں نے ہتھکڑیاں پہنائیں اور جیل کی اندھیری کوٹھڑیوں میں بند کیا تو ان تمام مصائب کو ان مجاہدین نے خندہ پیشانی سے برداشت کیا۔

میں نے شیر دل، مجاہدِ اعظم، امیر شریعت سید عطاءاللہ شاہ بخاری کے ساتھ جیل میں ان کے ساتھ رہ کر دیکھا ہے۔ اتنا ہنستے ہیں اور رفقائے جیل کو اتنا ہنساتے ہیں کہ ان کے سب غم غلط ہو جاتے ہیں۔ رضاکاران احرار کو مبارکباد دیتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں حضرت شاہ جی کے رفیق شیخ حسام الدین صاحب جیسے جلیل القدر قائد اور مقتدائے قوم عطا فرمائے ہیں اور مجلس احرار شکر کرے کہ حق گوئی، حق پرستی اور جرأت و بے باکی میں مجاہد اعظم امیر شریعت حضرت مولانا سید عطاءاللہ شاہ صاحب بخاری کا شبیہہ اور مجسم نمونہ مولانا قاضی احسان احمد صاحب کو بنا کر شامل کر دیا ہے تاکہ جب حضرت شاہ جی میدان کارزار سے دور ہوں تو قاضی موصوف کو باطل کے مقابلہ میں علم حق دیا جائے اور مجلس احرار بڑی ہی خوش نصیب ہے جسے اللہ تعالیٰ نے ایک اعلیٰ درجہ کا مدبر میدان سیاست کا شاہ سوار، شطرنجِ سیاست کا بہترین کھلاڑی، باطل پرستوں کی مکاریوں اور فریب کاریوں سے پورا آگاہ ماسٹر تاج الدین صاحب جیسا رہنما عطا فرمایا ہے

مولانا قاری محمد طیب رحمہ اللہ
سابق مہتمم دارالعلوم (دیوبند)

صاحبِ دل انسان

مولانا سید عطاء اللہ شاہ بخاری ان مشاہیر ملک میں سے تھے جن پر ملک والے ہمیشہ فخر کرتے رہیں گے اور ان کے نام سے اپنے ناموں کو اچھال سکیں گے۔ وہ حقیقتاً اسم با مسمیٰ تھے بلاشبہ وہ اللہ کی ایک عطا تھے جو ہندو پاک کے مسلمانوں پر مبذول کی گئی جس طرح نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی ذات قدسی صفات کے بارے میں ارشاد فرمایا کہ:۔

"انا رحمتہ مھداۃ"

میں ایک رحمت ہوں جو (خدا کی طرف سے بندوں کو ہدیہ دی گئی ہے)

اس طرح آل رسول ﷺ میں عطاء اللہ شاہ کی ذات تھی جو اللہ کی طرف بندوں کو عطاء کی گئی تھی تاکہ صدیوں تک اس نام سے ان کا نام اونچا رہے۔

پھر عطاء اللہ شاہ بخاری نے مبذول ہو کر ان میں بہت سی وہ خصوصیات پیدا کیں جن سے خود ان کا نام اونچا ہوا۔ ان کا مشہور زمانہ وصف جس میں وہ بے مثال تھے۔ خطابت تھا۔ ان کی خطابت جاذبیت کا ایک جادو تھی جس میں بے پناہ کشش تھی۔ ہزاروں انسانوں کا مجمع جو تاحد نظر پھیلا ہوا ہوتا تھا ان کی تقریر کی مسلسل زنجیر میں جکڑا ہوا محسوس ہوتا تھا جس میں سے کسی کا اکتا کر اٹھ جانا تو کیا معنی کوئی اپنی جگہ سے ہل بھی نہیں سکتا تھا۔ ان کی تقریر اسے جکڑ کر باندھ لیتی تھی۔ اور کیا مجال تھی کہ کوئی شخص اپنی توجہ کو بھی ان سے ہٹا سکے۔

یہ کشش محض الفاظ کی نہ تھی اور محض الفاظ میں یہ جاذبیت ہو بھی نہیں سکتی جب تک کہ الفاظ میں گہری معنویت نہ ہو اور محض معنویت بھی زنجیر کشش نہیں بن سکتی جب تک اس معنویت میں معرفت نہ ہو۔ اور محض معرفت بھی کشش کے اس مقام پر نہیں پہنچ سکتی جب تک اس میں محبت نہ ہو۔ اس لئے میں کہہ سکتا ہوں کہ سید عطاء اللہ شاہ بخاری بے مثال خطیب ہونے کے ساتھ صاحب معنویت، صاحب معرفت، اور صاحب عشق و محبت تھے۔ بالفاظ دیگر وہ محض صاحب لسان نہ تھے بلکہ صاحب دل انسان تھے۔ محبت نبوی ﷺ ان کے دل کی رگ و پے میں سمائی ہوئی تھی۔ اسی لئے ان کے جوش کا تعلق تھا۔ اور اسی سے ہوش کا۔ اور اسی سے ان کی خطابت کا چشمہ ابلتا تھا۔ جس میں دوسروں کے دلوں کی رگ و پے میں سما جانے کی خاصیت ہوتی تھی۔

آدمی صاحب دل خود سے نہیں بنتا کسی صاحب دل سے بنتا ہے۔ ارباب لسان کے بس کی بات نہیں کہ باتوں سے کسی کو صاحب دل بنا دیں۔ دل سے دل بنتا ہے دل جب کبھی دل والے سے ملتا ہے جب ہی صاحب دلی آتی ہے۔ عطاء اللہ بھی ایک صاحب دل سے وابستہ ہو کر ہی صاحب دل بنے۔ اگر رائے پور کی

خانقاہ میں ان کا گزر نہ ہوتا تو ان کا لفظی کمال معنویت کی روح اختیار نہ کرتا۔ اور اگر وہ رائے پور کے مقدس درویش حضرت اقدس مولانا شاہ عبدالقادر جی رائے پوریؒ ادام اللہ ظلالہم کے قدموں تک نہ پہنچتے تو ان کے قدم دوسروں کے سروں پر نہ ہوتے انہیں حضرت رائے پوری مدظلہ (۱) تعالیٰ کا دست مبارک ملا تو دست بدست وہاں پہنچ گئے۔ جہاں اس دستگیری کے بغیر نہیں پہنچا جاسکتا۔ یہ خدا کی دین ہے کہ پہنچے تھے مرید بن کر اور لوٹے مراد بن کر۔

ہر مرید اپنے شیخ کا اور ہر شاگرد اپنے استاد کا محب ہوتا ہے لیکن عطاء اللہ کو مقام محبوبیت یہ ملا کہ خود شیخ ہی ان کے گرویدہ ہو گئے۔ سید عطاء اللہ شاہ بخاری کی وفات کی خبر پہنچی تو شیخ بے اختیار رو پڑے اور رونے میں آوازیں تک نکل پڑیں۔ جس کا شیخ اپنے مرید پر پھوٹ پھوٹ کر روئے اس کی محبوبیت کی کیا انتہا ہو سکتی ہے؟ حقیقت یہ ہے کہ شیخ کی شیفتگی، مرید کی اعلیٰ تربیت کا نشان ہوتی ہے۔ اور قابلیت بھی قلب کی نہ کہ محض لفظوں کی۔ اس لئے ماننا پڑے گا کہ سید عطاء اللہ بے مثال صاحب لسان خطیب ہی نہ تھے بلکہ ایک بے نظیر صاحب دل عارف بھی تھے۔

شاہ جی کی پاکیزہ نورانی صورت ان کی پاکیزہ سیرت کی ترجمان تھی۔ ان کا شگفتہ چہرہ ان کے کھلے ہوئے اور کھلے دل کا آئینہ تھا۔ ان کی رسیلی آواز چمکدار آنکھوں سے انکی طباعی اور ذہانت کا پردہ فاش ہوتا تھا۔ اور ان کے بشرہ کی صفائی ان کے اخلاق کی صفائی اور طبعیت کی ستھرائی کا نشان تھی۔ جس کا ظہور ان کے مجلسی کلام اور اجتماعی بیان بلکہ انکی ایک ایک ادا ہیت کذائی سے ہوتا تھا۔

مرحوم کے چھوٹے چھوٹے فقرے طباعی اور ذہانت کے ساتھ بہت سی حقیقتیں اور دل کی صداقتیں اپنے اندر لئے ہوئے ہوتے تھے۔ جن سے فہیم انسان دور تک پہنچ جاتا تھا۔

کسی نے پوچھا کہ حضرت خدیجہؓ اور حضرت عائشہؓ (ازواج مطہرات نبی ﷺ) میں باہم کیا فرق تھا۔۔۔؟ تو برجستہ فرمایا کہ خدیجہ کا نکاح محمد ﷺ ابن عبداللہ سے ہوا تھا اور عائشہ کا نکاح محمد رسول اللہ ﷺ سے ہوا تھا۔ فرق مراتب کی یہ کس قدر بلند تعبیر ہے؟ جو عطاء اللہ ہی کا حصہ ہے۔ ایک سوال کیا گیا کہ علیؓ اور عمرؓ میں کیا فرق ہے؟ تو برجستہ بولے کہ علیؓ مرید تھے اور عمرؓ مراد تھے (یعنی علیؓ کو اسلام کی طلب تھی اور اسلام کو عمرؓ کی طلب تھی) یہ لطیف اشارہ تھا دعاء نبوی ﷺ کی طرف کہ اے اللہ "عمرین" میں سے کسی ایک کو اسلام میں داخل کر دے۔ اس دعا کی قبولیت حضرت عمرؓ کے حق میں ظاہر ہوئی۔ ایک موقع پر کہا گیا کہ گو میں علیؓ کی اولاد ہوں لیکن عمرؓ کے بارے میں عقیدہ یہ رکھتا ہوں کہ اگر عمرؓ کو درمیان سے نکال دیا جائے تو اسلام میں کچھ باقی نہیں رہتا (یعنی حضرت عمرؓ کے نہ ہونے سے بعالم اسباب اسلام کی کتنی ہی بنیادی خصوصیات چھپی رہ جاتیں) بہرحال یہ جادو کے فقرے یہ فسوں کے جملے ایک ایسی طبعیت کی نشان دہی کرتے ہیں جس میں ذکاوت

۱۔ مضمون ۱۹۶۱ء میں تحریر کیا گیا تب حضرت رائے پوری حیات تھے۔ حضرت کا انتقال ۱۹۶۲ء میں ہوا۔ (مدیر)

وذہانت کے ساتھ اسلامی ذوق اور اس ذوق کے اسلامی تاریخ پر پھیلاؤ رچا ہوا تھا اور وہ اسلامی حقائق کی واقفیت کے ساتھ ان کی تاریخی خصوصیات کے تجزیہ پر قادر تھے۔

ان کی بے نظیر خطابت جہاں اسلامی مقاصد کی ترجمان تھی۔ وہیں اسلامی مدافعت کے لئے مضبوط ترین سپر بھی تھی۔ جماعت احرار کے سلسلہ میں انہوں نے قادیانیت کو بیخ دین سے اکھاڑ دینے کی جو مساعی انجام دیں وہ اپنی مثال آپ ہی تھیں۔ جماعت احرار کی قیادت کے زمانہ میں عطاء اللہ کے ہاتھ میں چمکدار تیر، منہ میں دو دھاری زبان اور باطن میں جرار قلب تھا۔ جس نے جماعت احرار کی قیادت کرتے ہوئے پنجاب سے قادیانیت کا جنازہ نکال دیا جو پھر نہ ابھر سکی۔ قادیانیت کا ابطال درحقیت ختم نبوت کا اثبات تھا۔ اور ختم نبوت عطاء اللہ کا ایمان اور ایمان کا بھی تخم تھا۔ جس سے ایمان کو نشوو نما ملتا ہے۔ اس لئے انہیں قادیانیت کو نیچا دکھانے اور اسے زیر و زبر کرنے کا ایک خاص شغف تھا۔ باطل ازم اور بھی ہیں لیکن قادیانیت ہمیشہ ان کی تلوار کی نوک پر رہتی تھی۔ کیونکہ اس کی زد اسلام کی اصلی جڑ بنیاد (ختم نبوت) پر تھی۔

سیاسی لائن میں انگریزی قوت کو توڑنے اور ملک کو آزاد کرانے میں ان کی خدمات نہ صرف یہ کہ کسی لیڈر سے کم نہ تھیں بلکہ عام سیاسی ایجی ٹیشنوں اور مقاومت مجہول کے اقدامات میں روح کا درجہ رکھتی ہیں۔ عطاء اللہ نے اپنی جوشیلی اور ہوشیلی تقریروں سے لاکھوں کے مجمعوں کو ہلا ہلا دیا۔ اور برطانوی اقتدار کے ایوانوں میں زلزلے ڈال ڈال دیئے۔ عوام کے ٹھنڈے قلوب ان کی تقریروں سے آتشیں بن کر لوٹتے تھے۔ ان کی امروہہ والی تقریر جو جمعیتہ العلماء کے پلیٹ فارم پر ہوئی آج تک ضرب المثل کے طور پر یاد کی جاتی ہے۔ جس نے جنگ آزادی کا ایک نیا موڑ پیدا کیا۔ پھر اردو پارک دہلی کی آتش فشاں تقریریں آج تک میدان میں گونج رہی ہیں۔ جہاں مولانا ابوالکلام آزاد اور مولانا شوکت علی مرحوم آرام فرما ہیں۔ اس وقت یہ لوگ بخاری کی تقریروں سے جذباتی روح پیدا کرتے تھے۔ اور آج ان کی تقریروں کی گونج سے جو انہیں کے قیام گاہ پر ہمہ وقت موجزن ہیں عرفانی روح لے رہے ہیں۔

مولانا محمد علی مرحوم کراچی جیل میں محبوس تھے اور کراچی میں جمیعتہ العلماء کا اجلاس مولانا آزاد کی صدارت میں ہوا۔ اس وقت جمعیتہ کی مجلس مضامین میں حضرت شاہ جی کا حبلا چلبلا پن تیزی طبع کنویسنگ کے لئے ادھر ادھر اور ادھر سے ادھر قلبی جذبات کے ساتھ دوڑ دھوپ کا نقشہ گویا آج تک آنکھوں میں ہے۔ اس وقت وہ خلاف معمول "کھدر" کا پتلون پہنے ہوئے تھے۔ جو اس وقت کی لیڈرانہ فضا میں تو کھپ رہا تھا۔ مگر شاہ جی پر اوپرا معلوم ہوتا تھا۔ اور غالباً بعد میں انہیں بھی اس کا اوپرا پن محسوس ہوا تو پھر کبھی ان پر دیکھنے میں نہیں آیا۔ شاید یہ بار اس پتلون کے لئے پہلی بار ہی تھی اور آخری بار بھی۔ پھر ہمیشہ انہیں لنگی یا شلوار ہی میں دیکھا گیا اور یہی انہیں زیب بھی دیتی تھی۔

انقلاب سے پہلے جالندھر میں مدرسہ خیر المدارس کے ایک جلسہ میں میں نے ایک تقریر کرتے ہوئے قطبی کی کوئی مثال پیش کی تھی تو مجھے یاد ہے کہ شاہ جی نے قطبی سے قطبیت کے مقام کا ذکر چھیڑ کر اقطاب

امت کا تذکرہ شروع کیا اور دریا کی طرح تقریر رواں ہو گئی ان کی تقریروں میں بارہا ایسا ہوا کہ وہ عشاء کی نماز کے بعد خطابت کے اسٹیج پر کھڑے ہوئے خود بھی تقریر میں محو ہو گئے اور سامعین کو بھی از خود رفتہ کر دیا۔ یعنی عطاء اللہ تو اپنے اندر گم ہو گئے اور سامعین ان کی تقریر میں گم ہو گئے تا آنکہ اس گم گشتگی کو صبح کی اذانوں نے چونکا دیا۔ کہ رات ختم ہو چکی ہے۔ اور صبح صادق نمودار ہو گئی ہے۔ نہ سامعین کو رات کی خبر ہوئی کہ کہاں گئی نہ منتظمین جلسہ کو پتہ چلا کہ وقت کہاں سے کہاں پہنچا اور خطیب کے ہوش میں رہنے کے تو کوئی معنی ہی نہ تھے۔

حسن صوت کے ساتھ عطاء اللہ کو خدا نے حسن صوت کی دولت بھی عطا فرمائی تھی۔ وہ جب قرآن حکیم کی آیتیں تلاوت کرتے تو ان کے نغمۂ قرآنی سے قلوب کھنچ کر گویا باہر آجاتے تھے۔ آواز گونج دار ہونے کے ساتھ بلند بھی تھی۔ اس لئے لاؤڈ اسپیکر نہ ہونے کی صورت میں بھی ہجوم و اجتماع کی آخری صفیں صف اول ہی کی طرح لذت سماع سے بہرہ یاب ہوتی تھیں۔ اثناء تقریر میں موقعہ بموقعہ اشعار کا ترنم باغ و بہار ہوتا تھا۔

موزوں صورت اور موزوں صوت کے ساتھ طبیعت کے غیر موزوں ہونے کے کوئی معنی نہ تھے۔ طبیعت بھی اتنی ہی حسین تھی جتنی صورت و سیرت اور صوت ممدوح موذونیت طبع سے کبھی کبھی شاعری بھی کرتے تھے۔ بالخصوص فارسی کا کلام دلکش ہوتا تھا۔ جس کا مجموعہ شائع ہو چکا ہے۔ سید عطاء اللہ ان بے علم خطباء میں سے نہ تھے جن کی خطابت میں علم نہ ہو۔ یا محض لفاظی۔ ان کی خطابت کا مادہ ہو بلکہ باضابطہ درس[1] نظامی پر مشکوۃ شریف تک عبور حاصل کئے ہوئے تھے۔ تعلیم و تعلم کے کوچہ سے ناآشنا نہ تھے۔ قدرت کو ان سے خطابت کا اور خطابت کے راستہ سے اسلام کا کام لینا تھا۔ اگر وہ ادھر لگ جاتے تو اس میں لگ جانے کی بھی ان میں صلاحیتیں تھیں۔ مگر دین کی خدمت تعلیم و تعلم میں منحصر نہیں۔ جس راہ سے ان سے کام لیا جانا طے شدہ تھا وہ خطابت کی راہ تھی۔ تو ان کا ان میں میلان پیدا کر دیا گیا۔

ہر کسے را بہر کارے ساختند
میل او را! درویش انداختند

تاہم علمی قوتیں بھی ان میں موجود تھیں اور موجزن رہتی تھیں۔ اس لئے وہ علم کے کوچے سے نابلد نہ تھے۔ قرآن کریم کے مضامین پر بہت خاصا عبور تھا اور اس کے حقائق و انکشاف کرنے کا خاص سلیقہ اور ملکہ تھا۔ جس نے من بھر علم کو دو من کر کے دکھلا دیا تھا۔

بہر حال سید عطاء اللہ شاہ بخاری عالم، عارف، خطیب، شاعر، زعیم، قائد اور درویش صفت انسان تھے۔ جن میں قدرت نے بہت سی خوبیاں ودیعت کی تھیں۔ وہ دنیا سے کیا گئے کہ بہت سی خوبیاں رخصت ہو گئیں۔ حق تعالیٰ حضرت مرحوم کو ان کے جد اعلیٰ کے قدموں تک پہنچائے۔ اعلیٰ علیین میں درجات بلند دے پسماندگان کو صبر جمیل نصیب فرمائے اور قوم کو ان کا بدل عطا فرمائے

۱۔ پہلے مدرسہ نصرت الحق امرتسر میں تعلیم حاصل کرتے رہے۔ بعد میں قومی و سیاسی مصروفیات اور جیل کے باعث وقفہ وقفہ سے بخاری شریف تک تعلیم مکمل فرمائی (مدیر)

مولانا محمد منظور نعمانی (لکھنؤ)

اسلام اور مسلمانوں کا سچا وفادار

امیر شریعت آج ہماری اس دنیا میں نہیں ہیں۔ اور ان کو ہمارے کسی خراج عقیدت اور تحسینی تذکرے کا انتظار بھی نہیں ہے۔ جو چیز اس دوسرے عالم میں ان کی خدمت میں پیش کرنے کے لائق ہے اور جس کا پہنچنا بھی ان شاء اللہ یقینی ہے وہ اچھی ساعتوں میں ان کے لئے رحمت و مغفرت کی پرخلوص دعائیں اور اعمال خیر کے ثواب کا ہدیہ ہے اور یہی ان کی محبت کا ان کے محبین پر خاص حق ہے۔ اللہ تعالیٰ اس حق کے ادا کرنے کی توفیق دے۔

اسی کے ساتھ یقین ہے کہ ان کی بعض ایمانی خصوصیات اور ان کی زندگی کے بعض واقعات کا تذکرہ ان شاء اللہ زندوں کے لئے ضرور نافع ہوگا۔ اسی امید پر یہ سطریں ایک عزیز سے بطور املا لکھا رہا ہوں۔

عظمت رسالت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا نگہبان

جہاں تک اب یاد آتا ہے اخبارات میں سید عطاء اللہ شاہ بخاری کا نام سب سے پہلے اس ناچیز نے اس وقت پڑھا جب لاہور کے ایک دریدہ دہن آریہ سماجی نے اللہ کے آخری رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے خلاف ایک نہایت گندی اور رسوائے عالم کتاب لکھ کر شائع کی۔ اس کتاب کا نام بھی خبیث اور دل آزار تھا۔ کہ کوئی شریف آدمی خواہ وہ کسی مذہب و ملت سے تعلق رکھتا ہو دلی تکلیف کے بغیر وہ نام نہیں لے سکتا تھا۔ ہندوستان کی فرقہ وارانہ فضا شدھی اور سنگھٹن کی تحریک نے پہلے ہی سے خراب کر دی تھی۔ اس کتاب کی اشاعت نے جلتی پر تیل کا کام کیا اور مسلمانوں میں سخت ہیجان بلکہ طوفان برپا کر دیا۔

اس سلسلے میں امیر شریعت نے لاہور میں ایک تقریر کی تھی اس کا اثر یہ ہوا تھا کہ پردہ نشیں خواتین نے اپنے بچے ان کے قدموں میں ڈال دیئے تھے کہ ان کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ناموس پر قربان کر دو۔

سید عطاء اللہ شاہ بخاری اس تقریر پر گرفتار کر لئے گئے ان پر مقدمہ چلا اور بالآخر ایک سال سخت قید ہوئی۔ بہر حال جہاں تک میری یادداشت کا تعلق ہے میرے دل میں ان کی محبت کا بیج اسی واقعے کے بعد پیدا ہوا۔

قبول خواص

یہاں تک کہ ایک وقت انجمن خدام الدین لاہور کے جلسے میں (جس میں پنجاب کے علمائے حق کی ایک بڑی تعداد شریک تھی) سید صاحب امیر شریعت بنا دیئے گئے اور اپنے وقت کے سب سے بڑے عالم دین اور سب سے بڑی دینی درسگاہ دارالعلوم دیوبند کے صدر و شیخ الحدیث استاذ ناد استاذ العلماء حضرت مولانا انور

شاہ کشمیری قدس سرہ نے بھی بحیثیت امیر شریعت ان کے ہاتھ پر بیعت کی۔ اخبار میں خبر پڑھ کر قدرتاً سید صاحب کی عظمت و اہمیت میرے دل میں پہلے سے بہت زیادہ ہو گئی۔ اور دید و ملاقات کا اشتیاق بہت زیادہ بڑھ گیا۔ ان کے نام کے ساتھ بخاری اور شاہ کے دو پر عظمت ضمیمے لگے ہونے کی وجہ سے میرا تصور اس وقت ان کے بارے میں یہ تھا کہ ان کی شکل و صورت بخاری علماء کی سی اور وضع و ہیئت مشائخ طریقت کی سی ہو گی۔ لیکن اتفاق کی بات عرصہ تک ملاقات کی نوبت نہیں آئی۔ میں ۱۹۳۰ء میں امروہہ ضلع مراد آباد میں مدرس تھا۔ حسن اتفاق کہ اس سال جمعیتہ العلماء ہند کا اجلاس امروہہ میں ہونا طے ہو گیا۔ اس زمانے میں مجھے جمعیتہ العلماء اور اس کے کاموں سے خاصی دلچسپی تھی۔ یہ وہ وقت تھا کہ چند ہی مہینے پہلے آل انڈیا کانگریس نے اپنے لاہور کے اجلاس میں ۱۹۲۸ء والی اس نہرو رپورٹ کو منسوخ قرار دے کر جس کی بناء پر ۱۹۲۹ء میں جمعیتہ العلماء ہند بھی کانگریس سے علیحدہ ہو گئی تھی۔ آزادی کامل کی تجویز پیش کی تھی۔ اور پھر اس کے بعد گاندھی جی نے نمک سازی کی شکل میں انگریزی اقتدار کے خلاف سول نافرمانی کی جنگ گجرات سے شروع کر دی تھی۔ بہر حال اس ماحول میں یہ اجلاس امروہہ میں ہونے والا تھا۔

ایک اہم واقعہ

ادھر ایک بات اسی درمیان میں یہ ہو چکی تھی کہ مولانا محمد علی جوہر مرحوم اور جمعیتہ العلمائے ہند دہلی کے درمیان سخت اختلاف پیدا ہو گیا تھا اور نوبت یہاں تک پہنچی تھی کہ جمعیتہ العلماء ہند دہلی کے مقابلے میں ایک دوسری جماعت جمعیت علماء بنالی گئی تھی۔ جس کے صدر خود مولانا محمد علی مرحوم تھے۔ یہ کش مکش ناسنجیدگی میں کسی حد تک جا چکی تھی۔ اس کا اندازہ بس اسی سے کیا جا سکتا ہے کہ جمعیتہ علماء ہند دہلی کا اجلاس امروہہ میں جن تاریخوں میں ہونا طے ہوا تھا۔ انہیں تاریخوں میں امروہہ ہی میں اس دوسری جماعت کا اجلاس بھی طے کیا گیا اور ہوا۔ اور خود مولانا محمد علی مرحوم نے اس کی صدارت کی جمعیتہ کا اجلاس شروع ہونے سے ایک دن پہلے ہی قریبی مقامات سے جمعیتی رضا کاروں کے جتھے انتظام کے لئے آنا شروع ہو گئے۔

میرے وطن سنبھل کا ایک جتھا ایک دن پہلے پہنچنے والا تھا۔ اس میں سے بعض آدمی علی الصبح پہنچ گئے اور انہوں نے بتایا کہ ہمارا پروگرام یہ ہے کہ ہمارا جتھہ ایک جلوس کی شکل میں امروہہ میں داخل ہو۔ اس جلوس میں کچھ اونٹ ہوں اور ان پر نقارے ہوں اس لئے ہمارے واسطے اونٹوں اور نقاروں کا انتظام کیا جائے۔ (دراصل سنبھل پور کے رضا کار اس طرح کے حجازی جلوس نکالا کرتے تھے۔) ہم لوگ جو اس وقت امروہہ میں اجلاس کے کاموں کے ذمہ دار تھے ان کے سامنے یہ مسئلہ آیا۔ قریباً ۸-۹ بجے صبح کا وقت تھا مجلس استقبالیہ کے دفتر میں بیٹھے ہم اسی مسئلے پر مشورہ کر رہے تھے کہ اونٹوں اور نقاروں والا یہ حجازی جلوس یہاں نکالنا مناسب ہے یا نہیں میری اور اکثر کارکنوں کی رائے اس وقت کے حالات میں جلوس کے حق میں تھی۔ ہم سب کے مخدوم اور ہر حیثیت سے بزرگ حافظ عبدالرحمٰن صاحب صدر مدرس مدرسہ اسلامیہ میں امروہہ (رحمتہ اللہ علیہ) کی

رائے نہیں تھی۔ وہ اس کو ثقاہت اور سنجیدگی کے خلاف سمجھتے تھے۔ یہ مشورہ جاری تھا کہ اچانک دو حضرات دفتر میں داخل ہوئے۔ ان میں سے ایک تو مفتی محمد نعیم صاحب لدھیانوی تھے اور دوسرے صاحب کو ہم میں سے کوئی بھی نہیں پہچانتا تھا۔ جسم پر از سرتا پا کھدر کا لباس جسم پہلوانوں کا سا۔ میں سمجھا کہ یہ مفتی صاحب کے ساتھ کوئی رضا کار ہیں۔ اتنے میں خود مفتی صاحب نے بتایا کہ یہ عطاء اللہ شاہ بخاری ہیں یہ سن کر خصوصاً میری حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی۔ کیونکہ میرے تصور میں تو ان کی صورت اور وضع بخارا کے کسی مقدس شیخ خانقاہ کی سی تھی۔ مصافحہ اور ملاقات کے بعد بڑی بے تکلفی سے شاہ جی نے ہم لوگوں سے فرمایا کیا ہو رہا ہے؟ میں نے کہا کہ ہم لوگ ایک چھوٹے سے مسئلے پر غور کر رہے ہیں۔ "سنبھل" کے رضا کاروں کا جتھہ آرہا ہے۔ وہ اس طرح کا جلوس نکالنا چاہتا ہے۔ ہم میں سے کچھ کی رائے یہ ہے کہ نکلنا چاہیئے اور بعض اسے ٹھیک نہیں سمجھتے۔ شاہ جی نے اپنے خاص انداز میں فرمایا کہ اس وقت کے مفتی ہم ہیں ہم فتویٰ دیتے ہیں کہ ایسا جلوس نکالنا چاہیئے منگواؤ اونٹ اور نقارے۔ ایک اونٹ پر میں خود بیٹھوں گا۔

تقریر یا سحر

اس عاجز کی سب سے پہلی ملاقات شاہ جی سے یہی تھی اور اس کے انداز و مزاج کا یہ پہلا تجربہ تھا۔ جہاں تک یاد ہے یہ جمعہ کا دن تھا۔ جلوس کی تیاریاں فوراً شروع ہو گئیں۔ اور اسی شان سے جلوس نکلا اور پورے بازار کا اس نے گشت کیا۔ مشورہ سے یہ بھی طے کر لیا گیا تھا کہ آج بعد نماز جمعہ جامع مسجد میں شاہ جی کی تقریر ہو گی (واضح رہے کہ اجلاس بھی جامع مسجد میں ہونے والا تھا)

جلوس نے ہی شاہ جی کی تقریر کا اعلان کیا۔ اس زمانے میں شاہ جی کی اخبارات میں بہت دھوم تھی اور ان کی زندگی کے بعض واقعات نے مسلمانوں کے ایک بہت بڑے حلقہ کو ان کا نادیدہ عاشق بنا دیا تھا۔ پھر امروہہ میں بلکہ ہمارے اس علاقے میں شاہ جی کی یہ پہلی آمد تھی۔ اور اس دن امروہہ میں کوئی دوسرا بڑا جلسہ بھی نہیں تھا۔ (کیونکہ دونوں جمعیتوں کے بڑے جلسے کل سے شروع ہونے والے تھے) اس لئے شاہ جی کی تقریر سننے کے لئے آج بہت سے لوگ ایسے بھی آگئے جن کی دلچسپی دوسری جانب تھی اور جمعیت العلماء ہند کے وہ سخت مخالف تھے۔

نماز جمعہ کے بعد تقریر شروع ہوئی۔ یہ پہلی تقریر تھی جو اس ناچیز نے شاہ جی کی سنی اس میں ان شاء اللہ کوئی مبالغہ نہیں کہ پورا مجمع مسحور تھا۔ جمعیۃ العلماء کے مخالفین کی طرف سے اس وقت خاص طور پر دو باتوں کا پروپیگنڈہ کیا گیا تھا۔ ایک یہ کہ یہ لوگ کانگریس اور ہندوؤں سے مل جانے والے ہیں اور دوسرے یہ کہ دیوبندی، وہابی اور نجدیوں کے حامی ہیں۔ دشمن رسول ہیں (معاذ اللہ) اس دوسری بات کے اچھالے جانے کی خاص وجہ یہ تھی کہ دوسری جماعت کے اجلاس کا داعی اتفاق سے امروہہ کا عنصر تھا۔ جن کے نزدیک دیو بندی، وہابیوں کی تکفیر کے سوا مسلمانوں کی زندگی کا کوئی دوسرا مسئلہ قابل توجہ نہیں تھا۔ شاہ جی کے علم میں یہ صورت حال ہم لوگوں کے ذریعے آچکی تھی۔ اس لئے ساری تقریر کا محور یہی دو مسئلے رہے۔ اس تقریر نے

لوگوں کو اتنا متاثر کیا کہ پوری زندگی میں کسی کا اتنا اثر مجھے یاد نہیں۔ رسول ﷺ دشمنی والے ناپاک اتہام کے سلسلے میں کچھ کہتے ہوئے جب شاہ جی نے مولانا جامی کے دو شعر اس موقع پر پڑھے تو دو آدمی تڑپ کر بے ہوش ہو گئے جن کو بہت دیر کے بعد ہوش آیا۔ یہ تقریر ڈھائی گھنٹے تک ہوئی اور یہ واقعہ ہے کہ اس پہلی تقریر نے سینوں کو انگریز دشمنی کے جذبے سے بھر دیا اور امروہہ کی فضاء کو جمعیتہ کے حق میں اور آزادی کی جنگ میں شمول کے لئے آمادہ کر دیا۔ اس فضا میں اس تجویز کے پاس کر لینے میں سب سے زیادہ حصہ سید عطاء اللہ شاہ بخاری ہی کا تھا۔ عام خاص مجالس کی اس شخص کی تقریروں نے کایا پلٹ دی۔ معلوم ہوتا تھا کہ اللہ کا بندہ تقریر نہیں سحر کر رہا ہے۔

بعض مخصوص ذرائع سے یہ معلوم ہوا کہ شاہ جی کی گرفتاری کے احکام آگئے اور وہ اجلاس ختم ہونے کے بعد روانگی کے وقت گرفتار کر لئے جائیں گے۔ چونکہ طے شدہ پالیسی یہی تھی کہ وہ حتی الامکان اپنے آپ کو گرفتاری سے بچائیں۔ اس لئے یہ چال چلی گئی کہ آخری رات کے آخری اجلاس کے لئے ان کی تقریر کا خاص طور پر اور بار بار اعلان کیا جائے۔ اور اس طرح عوام کو مشتاق بنانے کے ساتھ پولیس کو بھی شاہ جی کے بارے میں مطمئن کر دیا جائے۔ اور ہوا یہ کہ شاہ جی ایک بڑے عجیب و غریب طریقے پر دن ہی میں امروہہ سے نکل گئے اور امروہہ کا اسٹیشن چھوڑ کر ایک دوسرے قریبی اسٹیشن سے انہوں نے سفر کیا۔ یہ سب کچھ اس طرح ہوا کہ ان کی روانگی کا انتظام کرنے والے دو چار آدمیوں کے سوا اپنوں میں بھی کسی کو خبر نہ ہوئی۔ رات کو مولانا احمد سعید دہلوی کی تقریر شروع ہوئی۔ اس دن مولانا کی تقریر بھی بڑی غیر معمولی قسم کی ہوئی۔ اس کے باوجود یہ محسوس ہوتا رہا کہ مجمع بڑی بے چینی کے ساتھ شاہ جی کی تقریر کا منتظر اور مشتاق ہے۔ مولانا نے رات کے قریباً دو بجا دیئے۔ اور ایک دفعہ کلائی کی گھڑی کو دیکھتے ہوئے فرمایا۔

"اوہو دو بجنے کے قریب ہیں۔ لو بھئی السلام علیکم۔ اب شاہ جی کی تقریر پھر کبھی سن لینا" یہ سن کر پولیس والے بھی ہکا بکا رہ گئے۔ شاہ جی نے امروہہ سے نکل کر ایک طوفانی دورہ کیا۔ وہ عرصہ تک گرفتار نہ ہو سکے۔ انہوں نے تقریباً پورے شمالی ہندوستان کا دورہ کر لیا۔ ۱۹۳۰ء کی سول نافرمانی میں جو ہزارہا مسلمان جیل گئے اس میں کوئی شبہ نہیں ہے کہ ان کی بہت بڑی تعداد تنہا شاہ جی کی ہی پرجوش اور آتشیں تقریروں کے حساب میں تھی۔

اللہ تعالیٰ نے ان کو کتنی تاثیر اور کشش دی تھی۔ اس کا اندازہ اس واقعہ سے کیا جاسکتا ہے کہ اپنے اسی دورہ میں غالباً بدایوں بھی گئے۔ مولانا عبدالقدیر صاحب بدایونی مرحوم کے مہمان ہوئے۔ معلوم ہے کہ موصوف اپنے بدایونی مسلک میں کتنے پختہ تھے۔ اور یہ بھی جانتے تھے کہ سید عطاء اللہ شاہ بخاری (بریلوی حضرات کی اصطلاح کے مطابق) ٹھیٹھ وہابی ہیں اس کے علاوہ مجھے خوب یاد ہے کہ مولانا بدایونی مرحوم امروہہ کے اجلاس میں کانگریس کی جنگ آزادی میں شریک ہونے والے ریزولیشن کے اہم مخالفین میں تھے۔ لیکن اس اختلاف (مسلک اور سیاسی رائے) کے باوجود سید عطاء اللہ شاہ بخاری کی تقریروں اور ان کے خلوص سے ان کا قلب اتنا متاثر تھا کہ کھانے کے لئے ہاتھ دھونے کے لئے خود لوٹا ہاتھ میں لے کر شاہ جی کے ہاتھ دھلاتے

تھے اور اپنے شدید اصرار سے شاہ جی کو اس معاملہ میں مجبور کر دیتے تھے۔ اللہ تعالیٰ دونوں پر اپنی رحمت فرمائے۔

یہ جملہ معترضہ کے طور پر ایک بات درمیان میں آ گئی تھی۔ ورنہ ذکر ان کے ۱۹۳۰ء کے دورے کا ہو رہا تھا۔ انہوں نے پنجاب سے بنگال تک کا دورہ کیا اور بنگال جا کر گرفتار ہوئے۔ اور گرفتار ہو کر وہیں علی پور جیل میں رہے۔

یہاں یہ بھی بات قابل لحاظ ہے کہ شاہ جی اور اسی طرح ان کے خاص رفقاء کو اپنی اس جدوجہد اور قربانی سے اس کی امید بالکل نہیں تھی کہ کانگریس اور اس کے لیڈروں کی طرف سے اس کا اعتراف بھی کیا جائے گا۔ وہ اس قربانی کے ذریعے کوئی پوزیشن حاصل کریں گے۔ بلکہ اس کے برعکس انہیں سابق تجربوں کی بناء پر پورا یقین تھا کہ کوئی ایسا مسلمان کانگریس میں کوئی پوزیشن حاصل نہیں کر سکتا جو اسلام اور مسلمانوں کا بھی پورا وفادار اور اس موضوع پر لڑ جانے والا ہو۔ اور بالکل یہی چیز سامنے آئی۔ ۱۹۳۰ء کی جنگ آزادی کے بعد دوسری گول میز کانفرنس سے پہلے گاندھی اروِن پیکٹ ہوا اور سارے سیاسی قیدی رہا کئے گئے۔ اور اس کے بعد کراچی میں آل انڈیا کانگریس کا اجلاس ہوا۔ تو پنجاب کانگریس نے سوچی سمجھی سکیم کے تحت یہ کیا کہ سید عطاء اللہ شاہ بخاری اور ان کے رفیقوں کو کانگریس کے نظام سے دور رکھا۔ یہاں تک کہ کراچی کے اجلاس میں یہ لوگ صرف شاہد کی حیثیت سے شریک ہوئے۔

بہر حال یہ واقعہ ہے کہ سید عطاء اللہ شاہ بخاری اور ان کے رفقاء کے سامنے اس جدوجہد اور قربانی کا محرک صرف یہ تھا کہ انگریز کو ہندوستان سے بے دخل کرنے کے لئے ایک لڑائی جاری رہے۔ ہمیں اس مقصد کی خاطر اس میں حصہ لینا چاہیئے۔ حضرت شیخ الہند سے لے کر سید عطاء اللہ شاہ تک اس قافلے کے تمام ہی مجاہدین نے اس کو سامنے رکھ کر قربانیاں دی تھیں۔ اور اسی بنیاد پر وہ جدوجہد اور قربانیوں کو اعلائے کلمۃ الحق کی جدوجہد اور قربانی سمجھتے ہوئے اللہ تعالیٰ سے اجر کی توقع رکھتے تھے۔

مقامِ نبوت

توحید، رسالت، قیامت اور تمام عقائد، عبادات اور معاملات اسلام کی اصل ہیں۔

میرا استدلال یہ ہے کہ:

ان تمام مسائل کی تعریف اور تعین نبوت کرتی ہے۔ اگر نبوت بدل سکتی ہے تو یہ سب کچھ بدل سکتا ہے۔ یہاں تک کہ حلال و حرام بھی بدل سکتا ہے۔

(امیرِ شریعتؒ)

استاذ العلماء حضرت مولانا خیر محمد جالندھری قدس سرہ

تنہا انجمن

مخدوم العماء و الصلحاء حضرت مولانا عطاء اللہ شاہ صاحب بخاری رحمۃ اللہ علیہ اپنی سحر بیانی اور مقبولیت خطابت اور ہمدردی و خیر خواہی عامہ کے اعتبار سے ہند و پاک میں مقبول عام و خاص تھے۔ وہ تنہا انجمن تھے۔ جہاں ہوتے تمام کی نظریں انہی کی طرف ہوتیں۔ وہ اپنے ظاہری و باطنی کمالات میں بے نظیر تھے۔

وہ ہماری تعریف و توصیف کے محتاج نہیں انکی تعریف کرنا سورج کو چراغ دکھلانے کی مثال سے زیادہ وقعت نہیں رکھتا۔ البتہ انکا مخلصانہ تعلق اور دوستانہ علاقہ جو اس احقر اور مدرسہ خیر المدارس سے تھا۔ اس کو کلیتہً معرض اخفاء میں رکھنا ایک طرح کی ناشکری ہے۔ اس لئے مختصراً عرض کیا جاتا ہے۔

کہ تخمیناً عرصہ تیس سال سے سفر و حضر میں بے شمار ملاقاتوں کی نوبت آتی رہی۔ اس عرصہ میں بعض امور میں نظریاتی یا عملی اختلافات بھی پیش آتے رہے۔ مگر حضرت شاہ جی رحمتہ اللہ علیہ کے اخلاص و تعلق اور میل جول میں رتی برابر فرق نمودار نہیں ہوا۔ مدرسہ خیر المدارس کو ہمیشہ اپنا مدرسہ سمجھتے رہے۔ اور اس کے جلسوں کو اپنے جلسے سمجھ کر ہر جلسہ میں تشریف لاتے رہے۔ کبھی مع اہل و عیال اور کبھی تنہا جلسہ کے پورے دن قیام فرماتے رہے۔ مجھے ان کے اخلاق و اخلاص کے علاوہ ان کے کمالات نے بھی عقیدت مند بنا چھوڑا تھا۔

شاہ جی کو بزرگوں کے تمام اردو ترجموں میں سب سے زیادہ عقیدت و محبت مولانا شاہ عبد القادر دہلوی کے ترجمہ قرآن سے تھی۔ خود حضرت شاہ جی پنجابی زبان کا نہایت اعلیٰ ذوق رکھتے تھے۔ قرآن کریم کی آیات کا پنجابی ترجمہ جچے تلے الفاظ میں نہایت صحیح فرماتے۔ انکا پنجابی ترجمہ مجھے اتنا پسند آیا کہ میں نے دو مرتبہ ان سے درخواست کی کہ آپ تقریروں میں تخفیف کر کے قرآن مجید کا پنجابی ترجمہ لکھ دیں۔ تاکہ اس کا نفع عام اور تام ہو۔ شاہ جی اپنے وعظ میں احادیث صحیحہ بیان کرتے اور ان کا ترجمہ نہایت معنیٰ خیز شگفتہ الفاظ میں بیان کرتے۔

ان کی مجالس اکثر مخلوط ہوتیں اور ہر طبقہ سے ان کے تعلقات وابستہ تھے۔ مگر اکابر علماء دیو بند کے عقائد و مسلک پر اس قدر مضبوط و محکم تھے کہ کوئی چیز سرِ مو ان کو اس سے ہٹا نہ سکی۔

معجز بیان، سحر اللسان

مولانا سعید احمد اکبر آبادیؒ

ابھی مولوی عبدالحق (بابائے اردو) کو دنیا سے سدھارے پورا ایک ہفتہ بھی نہیں ہوا تھا کہ مولانا سید عطاء اللہ شاہ بخاری کے ملتان میں وفات پا جانے کی خبر ملی

انا للہ وانا الیہ راجعون

شاہ جی کی ابتدائی تعلیم و تربیت پٹنہ میں ہوئی۔ جو دلی اور لکھنؤ کے بعد اردو زبان اور شعر و شاعری کا تیسرا مرکز تھا اور اسی کا اثر تھا کہ شاہ جی نسلاً پنجابی ہونے کے باوجود اردو زبان ٹکسالی بولتے اور اس کے محاورات و ضرب الامثال پر بڑی قدرت رکھتے تھے۔

نانی سے اردو بول چال کی زبان سیکھی۔ شاد عظیم آبادی کے اس خاندان سے ذاتی مراسم تھے۔ اس قرب سے شاہ جی کو بھی شاد عظیم آبادی کی صحبتوں میں بیٹھنے اور ان سے فائدہ اٹھانے کا موقع ملا۔ ذہانت و فطانت خداداد تھی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ کم عمری میں ہی پختہ ہو گئے۔ دماغ چمک اٹھا اور زبان منجھ گئی۔ پھر پٹنہ سے نکل کر مختلف علماء سے وقتاً فوقتاً تفسیر، حدیث اور فقہ کا درس لیتے رہے۔ لیکن وہ بھی بے ضابطہ اور بے قاعدہ۔

شاہ جی یوں تو علم و فضل اور سیرت و اخلاص کی بہت سی خوبیوں اور کمالات کے جامع تھے جن کی وجہ سے لوگ ان کی دل سے قدر اور عزت کرتے تھے لیکن انکاسب سے بڑا کمال جس میں کوئی ان کا ہم عصر ان کا شریک نہیں ہوسکتا تھا وہ ان کا کمال خطابت و تقریر تھا۔ گھنٹوں یکساں روانی، جوش اور فصاحت و بلاغت کے ساتھ بولتے تھے اور کیا مجال کہ ایک شخص بھی اکتا کر مجلس سے اٹھ جائے۔ یہ معلوم ہوتا تھا کہ تقریر نہیں کر رہے ہیں نشہ پلا رہے ہیں۔ سامعین تو سامعین فضا تک پر معلوم ہوتا ہے کہ سکر کا عالم طاری ہو گیا ہے۔ بڑے سے بڑا مخالف بھی ان کی تقریر سنتا اور جھومتا تھا۔ ان کے پاس اعجاز بیان اور سحر خطابت کا ایسا کارگر حربہ تھا کہ اگر وہ چاہتے تو اپنی شخصیت کی تعمیر کے لئے اس سے زیادہ کام لے سکتے تھے لیکن ان کی بے نفسی کا یہ عالم تھا کہ تحریک خلافت، مجلس احرار اسلام اور ہر میدان میں صرف ایک سپاہی بنے رہے۔ دوسروں کے تابع رہ کر کام کیا لیکن کبھی خود قائد نہیں بنے۔ ہمارے نزدیک دینی اعتبار سے شاہ جی کے لئے اس سے بڑا کوئی دوسرا شرف اور مقام نہیں ہوسکتا تھا کہ جب انہیں امیر شریعت منتخب کیا گیا تو سب سے پہلے حضرت الاستاذ مولانا محمد انور شاہ کشمیری نے جو اس زمانہ میں علم و فضل میں اللہ کے حجت تھے۔ شاہ جی کے ہاتھ پر محبت اور عقیدت کے ساتھ بیعت کی۔ یہ صرف دنیا کا ہی سب سے بڑا اعزاز نہ تھا۔ بلکہ یہ بیعت انوری اس کی بھی ضمانت تھی کہ اللہ کے ہاں اس کا حسن عمل اور دینی ولولہ و جوش مقبول ہو چکا۔ اور آج وہ دنیا میں نہیں ہیں تو امید قوی ہے

فادخلی فی عبادی وادخلی جنتی

کی دعوت قدس کے خلعت فاخرہ سے سرفراز و شاد کام ہو رہے ہوں گے۔ اللھم اغفرلہ وارحمہ رحمۃ واسعۃ (ماخوذ نظرات: "برہان" دہلی ستمبر ۱۹۶۱ء ص ۱۳۱، ۱۳۲)

شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا رحمتہ اللہ علیہ

کچا گھر — پہلی مُلاقات

امیر شریعت مولانا سید عطاء اللہ شاہ بخاری کی جب رائے پور کی آمد و رفت ہوتی یا مستقل لوگ انہیں سہارنپور بلاتے تو ہر صورت میں قیام کثیر و قلیل جتنا ہوتا میرے گھر پر ہوتا۔ سید عطاء اللہ شاہ بخاری کا مشہور مقولہ تھا کہ کچا گھر (یعنی میرا گھر) جو اس زمانے میں بالکل کچا اور اسی نام سے اب تک مشہور ہے۔ مشترک پلیٹ فارم ہے۔ ساری گاڑیاں اسی پلیٹ فارم سے گزرتی ہیں۔ کبھی کہتے کہ یہ تو جنکشن ہے۔ ساری گاڑیاں اسی اسٹیشن پر ہو کر گزرتی ہیں لیگ کی ہو یا احرار کی۔ کانگریس کی ہو یا جمیعت کی۔ شاہ جی مرحوم کی ابتدائی آمد کا بھی عجیب لطیفہ ہے۔ سب سے پہلی آمد جو ان کی اہم جلسے میں ہوئی (جس کی تاریخ میرے رجسٹر میں درج ہو گی) سہارنپور کے لوگوں نے بہت اصرار تمنائیں، درخواستیں ان کو بلانے کی کیں اور جب انہوں نے سہارنپور پہنچنے کا وعدہ کر لیا تو چونکہ وہ رئیس البغاوت تھے گورنمنٹ کی نگاہ میں بہت مخدوش۔ اب مسئلہ یہ مشکل ہوا کہ ان کا قیام کہاں ہو؟ اس لئے ان کو ٹھہرانا ہر شخص کو مخدوش معلوم ہوتا تھا۔ اور یہ ڈر تھا کہ ان کے ساتھ میں بھی گرفتار نہ ہو جاؤں۔ اس واسطے جتنے بلانے والے تھے وہ سب مل کر ایک وفد حضرت مولانا عبداللطیف صاحب ناظم مدرسہ کی خدمت میں حاضر ہوئے کہ شاہ جی چناں ہیں، چنیں ہیں ہمارے مکانات ان کی شان کے مناسب نہیں ہیں۔ مدرسے ہی ان کی شان کے مناسب ہیں۔ ناظم صاحب کی ایک خاص ادا تھی۔ وہ نہایت بے تکلفی سے بلا جھجھک کہہ دیتے تھے۔ کہ "اتنے میں شیخ الحدیث سے بات نہ کروں۔ اتنے میں کچھ نہیں کہہ سکتا"۔ لوگوں نے اصرار کیا کہ انہیں ابھی بلالیجئے۔ ناظم صاحب نے فرما دیا کہ یہ وقت ان کی مشغولی کا ہے۔ شام کو خبر لیں گے۔ ان لوگوں کے جاتے ہی حضرت ناظم صاحب تشریف لائے اور فرمایا کہ فلاں فلاں آئے تھے۔ بہت اصرار اس پر کر رہے تھے کہ شاہ جی کا قیام مدرسے میں رہے۔ میں نے عرض کر دیا کہ آپ ان سے بے تکلف کہہ دیجئے کہ مدرسے میں ان کا قیام ہرگز نہیں ہو سکتا۔ مدرسے کو ان کے قیام سے نقصان کا اندیشہ ہے۔ البتہ کچے گھر میں ہو سکتا ہے۔ اس لئے کہ یہ تو ہے ہی باغیوں کا ٹھکانہ۔ حضرت مدنی کا قیام تو ہر وقت کا تھا۔ رئیس الاحرار مولانا حبیب الرحمن لدھیانوی رحمتہ اللہ علیہ کی بھی کثرت سے آمد و رفت تھی میری شاہ جی سے اس سے پہلے کوئی ملاقات نہ تھی۔ نام طرفین کا ایک دوسرے سے سن رکھا تھا۔ میں نے ان دعوت دینے والوں کو یہ بھی کہا کہ جب تمہارا حوصلہ ٹھہرانے کا نہیں تھا تو دعوت دینے کی کیا مصیبت پڑ رہی تھی؟ شاہ جی تشریف لائے اور انکی آمد پر بڑا جلوس نکالا۔ وہ جلوس ان کو مدرسے تک لایا۔ جب مدرسے میں پہنچے تو ناظم صاحب نے ان سے شاہ جی کے سامنے ہی کہہ دیا کہ شاہ جی کا قیام تو شیخ الحدیث صاحب کے مکان پر طے ہوا تھا۔ شاہ جی میرا نام تو پہلے ہی سنے ہوئے تھے۔ اور جنہوں نے ان کو دیکھا ہے اور ان کی باتیں سنی ہیں۔ وہ خوب واقف ہیں کہ ان کو تعریف اور مذمت دونوں میں کمال درجہ حاصل تھا۔ انہوں نے (اللہ تعالیٰ ان

کو بہت بلند درجات عطا فرماوے) اس زور و شور سے میرے گھر قیام پر مسرت کا اظہار فرمایا کہ کچھ انتہا نہیں۔ ہوشیار تھے، سمجھدار تھے، دنیا کو دیکھے ہوئے تھے۔ جلوس تو ختم ہو گیا۔ وہ چند آدمیوں کے ساتھ میرے مکان پر تشریف لے آئے۔ اور میرا مکان اس زمانے میں اسم بامسمی کچا گھر تھا۔ صرف ایک کوٹھڑی تھی وہ بھی کچی۔ شاہ جی مع سامان آکر بوریئے پر بیٹھ گئے۔ اول تو انہوں نے میری تعریف میں آسمان زمین کے قلابے ملائے اس کے بعد میرے مکان کی تعریفیں شروع کیں کہ نانا اباﷺ مکان کی یاد تازہ ہو گئی۔ حضرت کیا عرض کروں؟ کتنی مسرت اس مکان کو دیکھ کر ہوئی۔ اسلاف کا دور آنکھوں میں پھر گیا۔ چناں، چنیں، یہ، وہ۔ پھر کہنے لگے حضرت یہ لوگ مجھے شوق میں بلا تو لیتے ہیں۔ مگر ٹھہراتے ہوئے ڈرتے ہیں اور اسی واسطے میں کہیں جاتے ہوئے بہت انکار کرتا ہوں۔ لیکن جب وعدہ کر لیتا ہوں تو ان بلانے والوں کو نانی یاد آجاتی ہے کہ اس باغی کو کہاں ٹھہراویں۔ لیکن یہ میری خوش قسمتی، خوش بختی، نہ معلوم کیا کیا کہا کہ جب میں دیوبند جاتا ہوں تو وہاں بھی شیخ الحدیث حضرت مولانا انور شاہ جی نور اللہ مرقدہ کا مکان میری قیام گاہ تجویز ہوتی ہے۔ اور یہاں، یہاں شیخ الحدیث کا مکان میری خوش قسمتی سے میری قیام گاہ تجویز ہوا۔ قیام تو ان کا میرے یہاں برائے نام ہی ہوا۔ اس لئے کہ تھوڑی دیر ٹھہر کر وہ کہیں کسی صاحب کے یہاں دعوت میں چلے گئے۔ وہاں سے لوگ اپنے اپنے یہاں لئے پھرے پھر جلسہ ہو گیا۔ کچھ معمولی کھانے پینے کی تواضع میں نے بھی کی۔ اس کے بعد کئی دفعہ رائے پور آتے جاتے قیام ہوا۔ (ماخوذ از "آپ بیتی")

میرے اسلاف

صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین نے سید المرسلین، خاتم النبین صلی اللہ علیہ وسلم کی شکل میں قرآن و سُنت کو عملی صورت میں دیکھا ہے۔ اُن کی عملی زندگیوں سے تابعین نے اثر قبول کیا۔ علی ھذا القیاس اسلام کی صحیح تعبیر و تشریح ان اسلاف کی وساطت سے آئمہ اربعہ تک پہنچی۔ تاآنکہ سرزمین ہند میں حضرت مجدد الف ثانی، امام انقلاب حضرت شاہ ولی اللہ، امیر المؤمنین سید احمد شہیدؒ، امیر المجاہدین، حضرت شاہ اسماعیل شہیدؒ اور حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ یہ سب حضرات اُسی سچے اور صحیح اسلام کے مبلغ و داعی بنے اور اُن کے بعد مولانا رشید احمد گنگوہیؒ، شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ، محدث العصر، حضرت علامہ انور شاہ کاشمیریؒ، حضرت شاہ عبد القادر رائے پوری قدس سرہ، اور دیگر حضرات نے اسلام کی نئی نئی تعبیر اور تشریح سے کام نہیں لیا اور اسلام کے مفہوم حقیقی کو خلط ملط کرنے کی بجائے اپنے اسلاف کی اتباع کی اور اُن حضرات کے طرزِ عمل کو مشعلِ راہ بنایا

أولئک ابائی فجئنی بمثلھم

یہ ہیں میرے اسلاف۔ تم ان جیسی کوئی مثال تو پیش کرو۔

مولانا سید محمد یوسف بنوری رحمہ اللہ

ہندوستان میں خطابت کے ائمہ اربعہ

اور

امیر شریعت کا مقام

ہندوستان کی اس سرزمین میں ایک ہی عصر میں ایسے چار خطیب جمع ہوگئے تھے جن میں سے ایک کی بھی نظیر عالم اسلام میں نہیں تھی اور ظاہر ہے کہ جب عالم اسلام میں نظیر نہ تھی تو غیر اسلامی دنیا میں کہاں سے نظیر ملے گی۔ جوہر خطابت جس انشراحِ صدر کا محتاج ہے، اللہ تعالیٰ نے یہ حصہ غیر مسلموں کو نصیب ہی نہیں فرمایا، مسلمان کے سینہ میں جو فیضانِ الٰہی ہوتا ہے کافر کے سینہ میں اس کی گنجائش نہیں، مسلمان کا دل و دماغ جس جذبے سے سرشار ہوتا ہے کافر اس نعمت سے محروم ہے، مسلمان کے دل میں عواطف و جذبات کا جو سمندر متلاطم ہوتا ہے غیر اسلامی دل اس کا تصور بھی نہیں کرسکتا۔ اسلامی روح جس منبع قدس سے سیرابی حاصل کرتی ہے۔ کافر کی روح کی تشنہ لبی کو اس سے کیا نسبت۔

پہلے خطیب مولانا ابوالکلام آزاد دوسرے خطیب مولانا احمد سعید دہلوی، تیسرے خطیب مولانا شبیر احمد عثمانی اور چوتھے خطیب مولانا سید عطاء اللہ شاہ بخاری تھے۔ میرے خیال میں یہ ایک عصر کی خطابت کے آئمہ اربعہ تھے، ایک دفعہ ضلع سورت کے ایک گاؤں میں حضرت مولانا العارف حسین احمد کے ساتھ رفاقت کی سعادت نصیب ہوئی، تنہائی میں اس موضوع کا ذکر آگیا، اتفاق کی بات ہے جو میرا خیال تھا حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے بعینہٖ اسی طرح فرمایا، بہرحال مجھے اپنی اصابت رائے پر خوشی ہوئی، پھر فرمایا کہ اب مولانا حفظ الرحمٰن صاحب بھی قریب قریب ان کے ہو رہے ہیں اب میں مزید اضافہ کرنا چاہتا ہوں کہ حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب بھی اس صف کے قریب آرہے ہیں۔ میرے ذہن میں ان چاروں خطیبوں کی خطابت کی خصوصیات ہیں جو نہایت دلچسپ ہیں اور دقیق بھی ہیں، افسوس کہ اس وقت ان کی تفصیلات کی نہ ہمت ہے نہ وقت۔ لطف تو اس وقت آتا کہ پورا موازنہ و مقارنہ واقعات نہ ہوسکتا۔ اب تو چند نامعلوم اشارے شاہ جی سے متعلق عرض کرتا ہوں۔

خطابت اور خصوصاً عوام کو مسحور کرنے کا جہاں تک تعلق ہے اس موضوع کی جتنی صلاحیتیں ہوسکتی ہیں قدرت نے بڑی فیاضی کے ساتھ حضرت شاہ جی کو عطا فرمائی تھیں۔ قدوقامت شکل و صورت، قوت و طاقت، شجاعت و جرأت، فراست و تدبر، غیرت و حمیت، ذکاوت و شدت احساس، رقت عواطف و جذبات کا تلاطم، بلندیٔ آواز و خوش گلوئی، قرآن کریم کے ساتھ قلبی تعلق اور استحضار، منتخب ترین فارسی، اردو اشعار و ہر موضوع پر عمدہ ذخیرہ کا استحضار دردناک اور فلک شگاف آواز کے ساتھ قرآن کریم کا پڑھنا، مخالفین کے مجمع پر قبضہ کرنا، عالم و جہل، مرد و عورت، مخالف و موافق، سب کا یکساں طور پر متاثر ہونا یہ ان کی وہ خصوصیات ہیں کہ ان میں کوئی ان کی ہمسری نہیں کرسکتا، مجمع کو رلانا، تڑپانا، ہنسانا ان کی خطابت کا ادنیٰ کرشمہ تھا، مجمع سے

اپنی بات منوانا، ننانوے فیصد مخالفوں کو اپنا ہم خیال بنانا ان کے بائیں ہاتھ کا کھیل تھا۔ بعض اوقات تو بولنے سے پہلے ساحرانہ نگاہ ہی سے مجمع کو مسخر کر لیتے تھے۔ نگاہ کیا تھی غضب کی نگاہ تھی، آواز تھی یا بجلی کوندتی تھی، اسٹیج پر کسی کی مٹی پلید کرنے کا ارادہ رکھتے تو اتنا کامیاب ترین خطیب نے کسی نہ دیکھا ہوگا نہ سنا ہوگا، عقلی و فکری خصوصیات کی کامیاب ترین تمثیل اور اپنے موضوع و اطوار سے جو نقشہ کھینچتے تھے دنیا کا کوئی خطیب ان کی نقالی نہیں کر سکتا تھا۔ اگر نامناسب نہ ہوتا تو میں یہ تعبیر کرتا کہ "شرعی ایکٹر" تھے۔ ہندوستان کی سرزمین میں وہ واحد خطیب تھے جس نے اپنی خداداد ساحرانہ قوت خطابت سے دنیا و سیاست کی وہ خدمت کی جو ایک پوری قوم نہیں کر سکتی، تنہا ان کی شخصیت نے وہ کام کیا جو ایک صدی میں ایک ادارے کو کرنا

چاہیئے تھا۔ یہ شخص کسی اور قوم میں ہوتا تو نہ معلوم اس کی کیا یادگاریں قائم ہوتیں لیکن مسلمان قوم اپنی زندگی ختم کر چکی ہے۔ اس ختم شدہ دور میں یہ حیرت انگیز خطیب آئے۔ ورنہ تاریخ کے کسی بہترین دور میں پیدا ہوتے تو نقشہ ہی کچھ اور ہوتا۔

مولانا انور شاہ صاحب امیر شریعت کی نظر میں

قدرت نے فوق العادت زبان کی شیریں بیان کی روانی اور فوق العادت مؤثر تعبیر کی قوت عطا فرمائی بعض اوقات ایک جملہ میں پوری پوری داستان ختم کر دیتے تھے ایک دفعہ جامع ڈابھیل تشریف لائے، اساتذہ جامعہ مروتی اسٹیشن پر استقبال کے لئے گئے۔ لاری میں آ رہے تھے میں نے کہا شاہ جی آج تو حضرت شیخ پر ایک تقریر کر دیجئے (یعنی حضرت مولانا انور شاہ صاحب پر) فوراً فرمایا۔ "بھائی یوسف کیا کہوں۔ صحابہ کا قافلہ جا رہا تھا انور شاہ صاحب پیچھے رہ گئے۔"

بے اختیار میں نے کہا حسبک اللہ یا عطاء اللہ اور رفقاء نے جملہ نہیں سنا تھا، جب سنایا سب تڑپ گئے۔

غیر مسلموں کو تبلیغ اسلام

ایک دفعہ نوساری ضلع سورت میں سکھوں اور ہندوؤں کی ایک دعوت پر ایک تقریر منظور فرمائی۔ ایک تھیٹر ہال کا انتخاب ہوا جامع ڈابھیل کے اساتذہ اور طلبہ بھی شریک تھے۔ حضرت مولانا شبیر احمد عثمانی بھی تشریف رکھتے تھے اس تقریر کی تاثیر و حلاوت فوق العادت خطابت کا کمال آج بھی آنکھوں کے سامنے ہے، اس کی شیرینی کام و دہن میں ہے، ہندوؤں اور سکھوں سے اللہ اکبر کے نعرے بلند کروائے تھے، اسلام کی حقانیت، اللہ کی عظمت اور توحید، گوشت خوری کے منافع، بت پرستی کی قباحت پر حیرت انگیز بیان تھا، حضرت شبیر احمد عثمانی زار و قطار رو رہے تھے۔ میں نے کبھی ان کو اتنا روتے ہوئے نہیں دیکھا۔ تقریر کے بعد ہمیں نے سنا فرماتے تھے، میں نے بیسیوں تقریریں مولانا عطاءاللہ شاہ بخاری کی سنی ہیں لیکن اتنی مؤثر تقریر آج تک نہیں سنی اور فرمایا کہ آج عطاءاللہ شاہ نے حق تبلیغ ادا کر دیا ہے اپنے وقت کے سب سے بڑے عالم متکلم خطیب کی یہ داد کتنی قیمتی ہے۔

شاہ صاحب مولانا انور شاہ صاحب کی نظر میں

امام العصر حضرت مولانا انور شاہ صاحب کو آپ سے بے انتہا محبت تھی اور دعا کیا کرتے تھے اور فرمایا کرتے تھے کہ ایسا خطیب کبھی نہیں دیکھا جو روتوں کو ہنساتا ہے اور ہنستوں کو رلاتا ہے اور فرماتے تھے کہ مرزا غلام قادیانی کے خلاف ان کی ایک تقریر وہ کام کرتی ہے جو ہماری پوری تصنیف نہیں کر سکتی، کسی مجلس میں انہیں دیکھتے تو باوجود اس کے متانت و وقار کا پہاڑ تھا، محظوظ ہوتے جس کی انتہا نہیں۔

لاہور کا تاریخی اجلاس جس میں آپ امیر شریعت بنائے گئے

مئی ۱۹۳۰ء کا جو تاریخی اجلاس انجمن خدام الدین لاہور کا ہو رہا تھا جس کا سماں آج بھی میری آنکھوں کے سامنے ہے اس وقت امام شیخ رحمتہ اللہ علیہ کا اسم گرامی مولانا ظفر علی خاں نے امارت کے لئے پیش کیا، حضرت شیخ نے کھڑے ہو کر تقریر فرمائی اور اپنی کمزوری کی وجہ سے معذرت پیش کی اور سید عطاء اللہ شاہ بخاری کی امارت کی نہ صرف تجویز کی بلکہ امیر بنا کر فرمایا میں بھی اس مقصد کے لئے ان کے ہاتھ پر بیعت کرتا ہوں، آپ حضرات بھی ان سے بیعت کریں اور اپنے دونوں ہاتھ مبارک سید بخاری کے ہاتھ میں دے دیئے۔ وہ منظر بھی عجیب تھا کہ مولانا عطاء اللہ شاہ بخاری رو رہے تھے اور کہتے ہیں کہ خدا کے لئے مجھے معاف فرمائیں میں اس کا اہل نہیں اور حضرت شیخ اصرار فرما رہے ہیں۔ اس وقت سب سے پہلے مولانا عبدالعزیز گوجرانوالہ نے پہلی بیعت فرمائی۔ پھر مولانا ظفر علی خاں مرحوم نے بیعت کی راقم الحروف بھی اس مجمع میں شریک تھا اور غالباً تیسرا نمبر بیعت کرنے والوں میں میرا تھا، اس وقت شاہ جی امیر شریعت بنائے گئے اور ان کی شخصیت میں مقبولیت اور جاذبیت کا دور شروع ہوا جو اس سے پہلے کبھی نہ تھا اور اس کے بعد اخلاق کے ساتھ خدمت کی

توفیق ان کو ملی۔ وہ ان کی زندگی کا تاریخی دور ہے۔

میں سمجھتا ہوں کہ حضرت سید عطاء اللہ شاہ بخاری کی یہ عام مقبولیت اور مجاہدانہ سرگرمیاں منصفانہ خدمات اور حیرت انگیز تاثیر اور بے پناہ محبوبیت حضرت مولانا انور شاہ کی کرامت تھی۔ اپنے ہاتھ مبارک جو ان کے ہاتھوں میں رکھ دیئے تھے اس کی وجہ تھی اور حضرت مولانا انور شاہ صاحب کو جو قادیانی فرقہ سے بغض و عناد تھا اس نے عطاء اللہ کی صورت اختیار کر لی تھی۔ دراصل شاہ جی کا وجود حضرت مولانا انور شاہ کشمیری کی کرامت تھا جس کی وجہ سے علماء، صلحاء، عرفاء و اتقاء وقت کے بڑے بڑے اہل فضل و کمال مولانا عطاء اللہ کے جاں نثار محب والہانہ معتقد بن گئے تھے۔

ذالک فضل اللہ یوتیہ من یشاء واللہ ذوالفضل العظیم

دلوں کو چیر گئی اس کی شوخئ گفتار

چراغ درد دلوں میں جلا کے چھوڑ گیا
وہ ساری قوم کو اپنا بنانے کے چھوڑ گیا

تمام عمر جلاتا رہا ہے شمع وفا
وہ جس کا ثانی زمانے میں دوسرا نہ ہوا

وہ ایک صبح کی خاطر تمام رات جلا
مثال شعلۂ پروانہ تا حیات جلا

رہا ہے برسرِ پیکار زور باطل سے
ہوا نہ آشنا اک بار لطف ساحل سے

تمام عمر مقدر میں قید و بند رہی
مگر یہ تلخئ دوراں اسے پسند رہی

قدم قدم پہ نیا ایک امتحان رہا
مگر وہ اپنے مقاصد کا ترجمان رہا

وطن کے باغ میں تازہ بہار چھوڑ گیا
وہ حریت کی حسیں یادگار چھوڑ گیا

خلوص و مہر کی تفسیر بن کے آیا تھا
حسین خواب کی تعبیر بن کے آیا تھا

رہا نہ ہم میں وہ سرمایۂ نظر یارو
وہ بجھ گیا ہے مگر کرگیا سحر یارو

وہ اک فسانہ تھا جس کے ہزار عنواں تھے
وہ ایک پھول تھا جس میں کئی گلستاں تھے

تھی اس کی حسن تلاوت میں بارشِ انوار
دلوں کو چیر گئی اس کی شوخئ گفتار

زباں ایسی فصاحت بھی جس پہ اترائے
وہ دے گیا ہے بلاغت کے ہم کو سرمائے

دلوں کو گرمئ احساس سے گداز کرے
وہ جس پہ فن خطابت ہزار ناز کرے

وہ ایک پیکر احساس عزم کا کہسار
ہرایک رنگ ہر اک حال صاحب کردار

رہا ہے حلقۂ یاراں میں مثل موج صبا
وہ خلوتوں کا اجالا، وہ جلوتوں کی ضیاء

وہ بزم شعر کی زینت وہ محفلوں کی بہار
وہ حسن خلق و محبت کا دلنشیں شہکار

نگاہ میں ہیں وہ پرلطف صحبتیں کیا کیا
سنی ہیں شاہ سے ہم نے حکایتیں کیا کیا

ہر ایک لفظ تھا تاریخ زندگانی کی
ہر اک کڑی تھی دلآویز اس کہانی کی

تھا اس کے فقر میں انداز کجکلاہی کا
لباس سادہ میں پنہاں تھا رعب شاہی کا

رموز عشق سرِدار کھولنے والا
صداقتوں کو ترازو میں تولنے والا

جنون و شوق کے ہم پر کھلے نئے ابواب
سکھائے اس نے ہمیں بزم و رزم کے آداب

وہ ایک نغمہ کہ اب بھی دلوں میں بستا ہے
وفور شوق کا شاداب اب بھی رستا ہے

ہر ایک دل کو دیا سوز آگہی اس نے
مرے سخن کو عطا کی ہے دل کشی اس نے

خدا کرے کہ ہو قبر اس کی مطلع انوار
وہ جس نے قوم کو بخشی ہے دولت بیدار

اسی کی یاد ہے حافظ متاعِ غم میری
خراج شاہ کو دیتی ہے چشمِ نم میری

حافظ لدھیانوی
فیصل آباد

امیر شریعت کی مجلس میں

میں جب خیر المدارس (ملتان) میں زیر تعلیم تھا۔ اپنے برادر مکرم مولانا عزیز الرحمن خورشید کی معیت میں قریب قریب ہر جمعہ کو کاشانۂ امیر شریعت پر حاضری دیتا۔ ظاہر ہے کہ وہ دور (۶۰-۱۹۵۹ء) اس عظیم انسان کے چل چلاؤ کا دور تھا۔ لیکن بذلہ سنجی، شگفتہ مزاجی اور ایک عظیم انسان کی تمام خصوصیات اس وقت بھی بدرجہ اتم موجود تھیں۔ اور ان کا جذبۂ انسانیت، تعلق مع اللہ، عشق رسالت، فرنگی اور اس کے مذہبی وسیاسی حواریوں سے برگشتگی تو عروج پر تھی۔

اپنی عمر ایسی نہ تھی کہ اس سے زیادہ کچھ اخذ کر سکتا۔ کہہ سکتا ہوں کہ پیغمبر انسانیت صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ایسا امتی تھا جس کے دل میں انسانیت کا درد و غم کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا۔ پر افسوس کہ فرنگی تہذیب کے دلدادگان نے یہاں نفرت وحقارت کی جو فضا پیدا کی اس کے پیش نظر انسان انسان کا دشمن ہو گیا۔ اور قتل و غارت گری جو کلکتہ، کوہاٹ اور نواکھلی سے چلی تھی وہ ۷۱-۱۹۷۰ء میں مشرقی پاکستان مرحوم سے ہوتے ہوئے اب مختلف حوالوں سے کراچی، حیدر آباد، کاغان، گلگت اور مختلف شہروں کو اپنی لپیٹ میں لئے ہوئے ہے۔

آسمان شملہ سے اترنے والی وحی کے بل بوتے پر ۱۹۰۶ء میں مسلم لیگ کے نام سے مفاد پرستوں کا جو ٹولہ بنا اس کے کرتوتوں کے برگ وبار سامنے آئے ہیں۔ بر عظیم کے مسلمانوں کی تقسیم در تقسیم کا مکروہ عمل برابر جاری ہے۔ اور معلوم نہیں کہ یہ کھیل کب ختم ہوگا۔

مختلف تقاریر بالخصوص دہلی تقریر کی شاہ جی کی پیشین گوئیاں حرف بہ حرف سامنے آرہی ہیں۔ اے کاش! نوائے وقت اور اس قماش کے اخبارات ورسائل اور انکے صحافی شرم وحیاء کا مظاہرہ کرتے اور بلا نوشان محبت کے اجلے کفنوں کو داغدار کرنے کی بجائے ان بزر جمہروں کی خبر لیتے جنہیں آئینی دفعات کے سہارے قیادت کے منصب پر فائز کیا گیا ہے۔

محترم سعید الرحمن علوی

مولانا مفتی جمیل احمد تھانوی مدظلہ

شاہ جی کی ایک ادا

مسبحا و محمدا و مصلیا و مسلما

یہ تو سب کو معلوم ہے کہ مولانا عطاء اللہ شاہ بخاری طرز تقریر میں سب سے نرالی شان رکھتے تھے ان کو حق تعالی نے وہ ملکہ عنایت فرمایا تھا کہ جس بات کو بیان کرنا چاہتے سننے والوں کے دل میں اتار دیتے تھے اور اس وقت تو مخالفوں کو بھی تسلیم کے سوا چارہ کار نہ رہتا تھا پھر طرز بیان وہ مزیدار کہ عشاء سے صبح ہو جائے تو کسی آنکھ میں نیند کا اثر نہ ہونے پائے۔

سامعین کی گرویدگی کا وہ عالم ہوتا تھا کہ شاہ جی کا نام آیا اور جوق در جوق مجمع آنا شروع ہو گیا پہلے کے مقررین سے اکتا کر اٹھ جانے والے لوٹ لوٹ آنے لگتے ایسے حالات میں عوام میں کس قدر مقبولیت ہو سکتی ہے پھر ایسے مقبول شخص کو کس قدر غرور و ناز ہو سکتا ہے وہ بھی کھلی بات ہے۔

جتنے طریقے اظہار کے جاری ہیں تقریر ہو یا تحریر، شاعری ہو یا تجوید، تدریس ہو یا تلقین، علاج ہو یا علالت حکوت ہو یا عزت یا پیری و اصلاح بھلائی کے ہوں یا برائی کے، مثل موسیقی وغیرہ کے ان کی مقبولیت کا یہ خاصہ ہے کہ اگر کسی سچے اور کامل پیر سے اصلاح نہ کرائے تو ہر صاحب فن میں ناز اور غرور پیدا ہو جاتا ہے پھر اس کو اگر کوئی تنقیص کرنے والا کبھی نہ ملے۔ چاروں طرف سے سوائے واہ کے اور کچھ کان میں نہ پڑے تو طبعی و نفسانی تقاضا ہے کہ پھر وہ اپنے برابر کسی کو نہیں قرار دے سکتا اور اس عیب کو کبھی عیب نہیں سمجھتا اس کے لطف میں سرشار ہو کر اپنے کو غرور و ناز کا اہل سمجھ کر ہمیشہ اسی پر نازاں رہتا ہے بلکہ آج تو اس عیب پر پردہ ڈالنے کے لئے "احساس کمتری" کے عنوان سے تحریریں اور تقریریں ہونے لگیں اور تواضع و انکساری کو خود جرم کی فہرست میں داخل کر لیا گیا اس کے نتائج جو ظہور میں آتے تھے آکر رہے کہ خود بینی عجب خود پسندی اپنی بات کو اونچا کرنا ایک ضروری مشغلہ بن گیا اور روز روز کے مسائل میں اپنی رایوں پر جمود دوسروں کی تحقیر سے اختلافات اور فتنہ و فساد کی بنیاد بڑھ گئی۔ اور آج ہر جگہ اس کا دور دورہ ہے اتفاق کی جو اصل جڑ تھی تواضع و انکساری وہ جڑ سے اکھاڑ پھینکی گئی مگر شکوہ ہر ایک کو یہی ہے کہ اختلاف اختلاف ہے کوئی صورت اتفاق کی بن نہیں پڑتی اور کیسے بن سکتی ہے جب اصل بنیاد تواضع ہی باقی نہ رہی۔

حیرت ہوگی جب کبھی آپ نے شاہ جی کی پوری تقریر سنی ہوگی کہ آخر میں علی الاعلان ببانگ دھل یہ کہہ دیا جاتا ہے کہ میں کوئی عالم نہیں ہوں میں مولانا مدنی کی ایک تقریر سن کر پانچ۔ چھ تقریریں بنا لیتا ہوں جب کسی بڑے عالم کا ذکر آیا یا ان کا کوئی عزیز یا خصوصیت والا ملا تو بر سر مجلس یہی جملہ دہرا دیا کہ ان کے طفیل میرا کام چل رہا ہے میں ان کی ایک تقریر سے کئی کئی تقریریں بنا لیتا ہوں۔

ایک دفعہ تھانہ بھون، حضرت حکیم الامت مجدد الملت کی بارگاہ میں شرف حضوری حاصل ہوا۔ تو عرض کیا کہ حضرت ایک دفعہ تو جس کام کے لئے مجمع کو اٹھانا چاہیں ہم اٹھا لیتے ہیں مگر یہ بات دیرپا نہیں ہوتی کوئی تحریک اس وقت تک صحیح معنی سے کامل نہیں رکھ سکتی جب تک اہل دل بزرگ اس کا ساتھ نہ دیں۔

آج کل کے عجیب خود رائی پسندی اور غرور و تکبر کے زمانہ میں اور ایسی سحربیانی اور مقبولیت رکھنے والے کی زبان سے یہ تواضع اور عاجزی و انکساری جیسے ان کی دین داری کی دلیل ہے ایسے ہی تمام عالم کے لئے درس عبرت ہے یہی وہ بنیاد ہے جس سے مسلمانوں میں اتحاد و اتفاق پیدا اور مستحکم ہو سکتا ہے اور جس کے بغیر سب پریشان ہیں اور الٹے الٹے علاج تجویز کر کے ہمیشہ منہ کی کھاتے ہیں اگر شاہ جی مرحوم کے اس اسلامی طرز انداز کو سب اپنالیں تو امید ہے زیادہ نتائج حاصل کر لیں اگر شاہ جی میں صرف یہی ایک خوبی ہی ہوتی تو وہ بھی اتفاق و اتحاد میں سارے عالم کے لئے راہ ہدایت بننے کے لئے کافی ہوتی لیکن شاہ جی تو بہت خوبیوں کے مالک تھے۔

تاریخ وفات غفراللہ لہ

۱۲۸۰+۶۶+۳۵=۱۳۸۱ھ

اک شیر تھا جو گونج رہا تھا کچھار میں

شاہ صاحب مرحوم کے بارے میں ضرور کچھ نہ کچھ لکھتا لیکن اپنی محرومیٔ قسمت کو کیا کروں جس نے مجھے ان کی خدمت بابرکت میں کبھی حاضر ہونے کا موقع نہ دیا۔ ایک بار البتہ ان کی بے مثال خطابت سے مستفید ہونے کی سعادت ضرور نصیب ہوئی۔ دہلی دروازے کے باہر ایک بہت بڑا جلسہ تھا اور شاہ صاحب ہی صدر اور وہی اس کے واحد مقرر تھے۔ دس بجے شب کے بعد تشریف لائے اور بیٹھ کر تقریر شروع کی کہ آغاز میں ایک جوئے نرم رو کی سی کیفیت رکھتی تھی۔ لیکن جوں جوں رات بھیگتی گئی آواز میں بلندی، کلام میں گرمی اور تخاطب میں روانی برابر بڑھتی چلی گئی یہاں تک کہ رات کے پچھلے پہر زمین و آسمان میں سناٹا تھا اور:

اک شیر تھا جو گونج رہا تھا کچھار میں

میں نے مولانا محمد علی جوہر کو بھی سنا ہے۔ مولانا ابوالکلام آزاد کی خطابت سے بھی فیضیاب ہوا ہوں۔ مولانا ظفر علی خان کے سحر گفتار میں آج بھی اسیر ہوں لیکن سید عطاء اللہ شاہ بخاری کے زور بیان اور نیرنگیٔ گفتار کا ایک اپنا مقام بلند تھا کہ آج تک جس کی مثال نایاب ہے۔ اللہ تعالیٰ ان کی تربت کو عنبریں فرمائے اور اپنے دامانِ رحمت میں جگہ دے۔

(مولانا صلاح الدین احمد، آغا شورش کے نام خط، جنوری ۱۹۶۲ء)

حضرت مولانا سید نور الحسن بخاری (رحمۃ اللہ علیہ)

عہد حاضر کا مجاہد کبیر

میں یہ فیصلہ نہیں کر سکا کہ عہد حاضر کے اس مجاہد کبیر کی حیات مقدسہ کا کون سا گوشہ قارئین کے سامنے پیش کروں اور آپ کے محاسن و کمالات میں سے کس کس کو بیان کروں۔

زفرق تا بقدم ہر کجا کہ مے نگرم
کرشمہ دامن دل مے کشد کہ جاں ایں جاست

در حقیقت حضرت امیر شریعت رحمۃ اللہ علیہ "حسن مجسم" تھے آپ کی ذات گونا گوں اور بوقلموں محاسن کا مجموعہ تھی۔ قسام ازل نے آپ کی تخلیق کے وقت بڑی فیاضی سے کام لیا۔ اور اللہ کریم نے خوبیوں کا ایک مجسمہ بنا کر ہم ناقدر شناس بندوں کو عطا فرمایا۔ جس کا نام تھا عطاء اللہ!

حضرت شاہ جی مرحوم بلا مبالغہ پیکر حسن اور جمال مجسم تھے۔ ہمارے اسلاف میں تو کئی ایسی عظیم شخصیتیں موجود ہیں جن کی ذات میں اللہ رب العزت نے مختلف اوصاف و کمالات جمع فرما دیئے تھے۔ لیکن عہد حاضر میں حضرت شاہ جی رحمۃ اللہ علیہ جیسی جامع کمالات ہستی مشکل سے نظر آئے گی۔

یوں تو حضرت رحمۃ اللہ کی ذات سراپا حسن و کمال تھی لیکن میں آپ کے چند کمالات کا تذکرہ کروں گا۔

انسان سے محبت

آپ کی ایک خاص صفت "انسان سے محبت" تھی آپ کے قلب اقدس میں انسانیت کا جو بے پایاں احترام اور پیار تھا۔ اس کا اندازہ اس ایک واقعہ سے لگایا جا سکتا ہے جو حضرت خود بیان فرمایا کرتے تھے۔

"خیر المدارس جالندھر کے سالانہ جلسہ میں حضرت شریک تھے۔ ایک نوجوان بھنگی صفائی کے لئے آیا۔ حضرت کھانا تناول فرما رہے تھے۔ اسے بلایا۔ اس کے ہاتھ دھلائے۔ اپنے ساتھ دستر خوان پر بٹھا دیا اور فرمایا میرے ساتھ کھانا کھاؤ"

وہ بے چارہ تھر تھر کانپنے لگا اور پیچھے ہٹتے ہوئے عرض کیا۔ "حضرت میں چوڑھا یعنی میں بھنگی ہوں" حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا۔ "تو کیا چوڑھا انسان نہیں ہوتا" بھائی تم بھی میری طرح انسان ہو۔ آؤ ہم مل کر کھانا کھائیں"۔

یہ فرما کر آپ نے پانی کا ایک گلاس اس بھنگی کی طرف بڑھاتے ہوئے حکم دیا "لو پیو" اس نے دو چار گھونٹ پیئے۔ حضرت رحمہ اللہ نے اس کا بچا ہوا پانی خود نوش فرما لیا۔ اب اس کا احساس کمتری کافور تھا۔ اس نے بڑھ کر حضرت کے ساتھ کھانا شروع کر دیا۔

یہ تھا حضرت رحمتہ اللہ علیہ کے درد مند دل میں انسانیت کا احترام اور پیار۔ اور اس کا منشاء محض اخلاص اور للہیت تھی۔ کوئی ریا نہ تھا نمائش نہ تھی۔ پھر جانتے ہو اس اخلاص اور پیار کا کیا نتیجہ نکلا؟

شام کو وہ نوجوان جو آیا تو ایک نوجوان عورت بھی اس کے ساتھ تھی۔ ہاتھ باندھ کر عرض کیا "حضرت! یہ میری بیوی ہے۔ اللہ کے لئے ہم دونوں کو کلمہ پڑھا کر دائرہ اسلام میں داخل فرمالیجئے"

دیکھا آپ نے حضرت کی "انسانیت سے محبت" کے معصوم جذبہ نے ایک جوڑے کو جہنم کی آگ سے بچالیا۔ رحمہ اللہ رحمۃً واسعۃً

اخلاص وللہیت

خلوص آپ کی کتاب اخلاق کا روشن ترین باب تھا۔ آپ کی پوری زندگی سراپا اخلاص تھی۔ آپ کا ہر کام للہیت پر مبنی تھا۔ آپ نے نمود و نمائش اور ریاو تصنع کو کبھی اپنے قریب بھی نہیں بھٹکنے دیا۔ آپ پر نہ تو کبھی کسی کا خوف طاری ہوا اور نہ ہی کسی لالچ نے کبھی آپکے قلب اقدس کے کسی بعید ترین گوشے تک راہ پائی۔ جلب منفعت و دفع مضرت سے یکسر نا آشنا ہو کر آپ نے جو کچھ بھی کیا۔ اللہ کے لئے کیا اور اخلاص سے کیا۔

اسی خلوص وللہیت کا ثمرہ تھا کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو وہ مقبولیت عطا فرمائی جو اس زمانے میں نہ کسی شاہ کو نصیب ہوئی نہ گدا کو۔ ہر طبقہ اور ہر مکتب فکر کے لوگ آپ کی عظمت کا اقرار اور آپ کی پرخلوص شخصیت سے پیار کرتے تھے۔ آپ کی نماز جنازہ میں کراچی سے پشاور تک کے مسلمانوں کا چند گھنٹوں میں ایک طوفان کی طرح امڈ آنا آپ کے اخلاص کا عملی اعتراف تھا۔

جہادِ مسلسل

جہاد آپ کی زندگی کا طول و عرض تھا۔ ہوش سنبھالتے ہی آپ نے فرنگی سیاست اور اجنبی اقتدار کے خلاف جو جہاد شروع کیا۔ وہ مسلسل جاری رہا۔ حتیٰ کہ انگریزی اقتدار کا جنازہ نکلا اور وطن عزیز پاکستان کا وجود معرض ظہور میں آیا۔ آپ نے اپنی پوری زندگی جہاد مسلسل میں گزاری اپنی شباب کی سینکڑوں راتیں آپ نے جیل کی تیرہ و تار کوٹھڑیوں میں گزاریں، صبر آزما مصائب و شدائد کی وادیوں سے گزرے۔ بعض دفعہ دار و رسن کی جھلک بھی نظر آنے لگی مگر جذبہ جہاد کبھی سرد نہ پڑا۔ ہر بڑی سے بڑی آزمائش کے بعد ایک نئے جوش اور نئے ولولے کے ساتھ آگے ہی بڑھتے رہے۔ اور اس مصرع کی عملی تفسیر نظر آئے۔

بڑھتا ہے ذوق جرم یہاں ہر سزا کے بعد

محبت رسول

محبت رسول ہر مومن کے ایمان کی اساس اور بنیاد ہے۔ مگر آپ کے قلب اقدس میں محبت رسول ﷺ کا جو بحر ناپیدا کنار متلاطم تھا۔ اس کی نظیر اسلاف میں تو مل سکے گی موجودہ دور میں ڈھونڈنے سے

بھی مشکل ہی سے ملے گی۔ جذبہ محبت رسول ﷺ کا دل میں اس قدر وفور تھا کہ جہاں بھی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر خیر آگیا آپ کی آنکھیں اشکبار ہو گئیں۔ اور جب بھی عزت و ناموس مصطفیٰ کو خطرہ لاحق ہوا آپ اپنے آپ کو بھول کر میدان جہاد میں اتر آئے اور بڑی سے بڑی قربانی دینے سے دریغ نہ کیا۔

مرزائیت سے آپ کو جو دلی نفرت تھی اور آپ نے اپنی ساری زندگی خصوصاً استقلال وطن کے بعد تردید مرزائیت کے لئے وقف فرما دی تھی۔ اس کے باعث اور موجب بھی یہی جذبہ محبت رسول ﷺ تھا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کسی کے دعویٰ رسالت کو آپ حضور ﷺ کی توہین سمجھتے تھے۔ اسلئے آپ نے مرزا غلام قادیانی کے دعویٰ نبوت کے خلاف ساری عمر جہاد کیا۔ کڑی سے کڑی مصیبتیں برداشت کیں۔ لم پیری میں ضعف و نقاہت اور مرض و علالت کے باوجود تحریک تحفظ ختم نبوت کی قیادت فرماتے ہوئے یل گئے اور سال بھر سے زیادہ مدت تک قید و بند کی صعوبتیں خندہ پیشانی اور صبر و ثبات سے برداشت یں۔ رحمہ اللہ رحمتہً واسعتہً

تبلیغ دین سے شغف و انہماک

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کا مقصد ابلاغ و تبلیغ دین ہے۔ حضور ﷺ سے سچی عقیدت اور ع محبت یہی ہے کہ آپکے نصب العین کی خدمت و تکمیل کے لئے ہر ممکن سعی کی جائے۔ چنانچہ اس محافظ دس رسول ﷺ کی حیات مقدسہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اس پاک مشن کی خدمت میں گزر گئی۔

آپ کو تبلیغ دین اور اشاعت اسلام سے جو شغف و انہماک تھا اور آپ کا قلب اقدس جس طرح آٹھوں پہر جذبہ تبلیغ مضطرب اور بے قرار رہتا تھا۔ اس کی نظیر تلاش و تجسس کے باوجود نہیں مل سکتی۔ فرنگی اقتدار کی مخالفت اور استخلاص وطن کے لئے بلاشبہ آپ نے زریں کارنامے انجام دیئے۔ لیکن یہ کہنا مبالغہ نہ ہو گا کہ آپ کا اوڑھنا بچھونا تبلیغ دین تھی۔ آپ فطرتاً مبلّغ تھے اور قدرت نے آپ کو پیدا ہی تبلیغ و اشاعت اسلام کے لئے کیا تھا۔

آپ کی تبلیغ کا خاص وصف یہ تھا کہ آپ کتاب اللہ پڑھتے تھے۔ آپ حافظ تھے۔ قاری تھے۔ پھر قدرت نے آپ کو لحن داؤدی عطا فرمایا تھا۔ آپ جب منبر رسول ﷺ پر بیخود ہو کر قرآن پڑھتے تھے۔ حاضرین پر وجدانی کیفیت طاری ہو جاتی تھیں۔ آپ کے مخالفین بھی آپ سے قرآن سننے کے لئے کشاں کشاں جلسوں میں آتے تھے۔ اور آپ جب اپنے مخصوص انداز میں کتاب اللہ کی تلاوت کرتے تو لوگ تڑپ اٹھتے تھے۔

آپ نے وقت کی روش اور مبلغین و واعظین کی عام عادت کے خلاف منبر رسول ﷺ پر لوگوں کو قرآن سنایا اور سمجھایا۔ اور آپ کی ساری عمر قرآن کریم کی خدمت ہی میں گزر گئی۔

آپ نے تبلیغ دین کو عام پیشہ ور مبلغین کی طرح استحصال زر کا ذریعہ نہ بنایا اگر آپ چاہتے تو آپ تبلیغ کو "پیشہ" بنا کر اپنا گھر سونے کا بنا سکتے تھے مگر آپ نے تبلیغ دین کو اس کا صحیح مقام دیا۔ اسے جہاد فی سبیل اللہ سمجھا۔

تقریر و خطابت

تقریر و خطابت میں بلاشبہ آپ اپنا ثانی نہ رکھتے تھے۔ نہ صرف یہ کہ آپ یگانہ عصر تھے بلکہ اگر یہ کہا جائے تو مبالغہ نہ ہو گا کہ۔

اردو زبان میں آپ کا سا عوامی خطیب آج تک پیدا ہوا اور نہ ہی شاید آئندہ پیدا ہو گا۔

آپ تقریر نہیں کرتے تھے سحر کرتے تھے۔ جب جوش میں آ کر خطاب فرماتے تھے تو سامعین مسحور و مدہوش ہو جاتے تھے۔ اور وہ اپنے تمام عقائد و تصورات اور ذاتی نظریات کو یکسر بھول کر اس خطیب اعظم کے ہم نوا بن جاتے تھے در حقیقت وہ خود کو بھول جاتے تھے۔

مسلسل آٹھ آٹھ گھنٹے تک بھی آپ نے دہلی جیسے شہر میں خطاب فرمایا لوگ مست و بیخود ہو کر بیٹھے سنتے رہے۔ رات بیت گئی۔ موذن نے اللہ اکبر کی صدائے دل نواز بلند کی تو حضرت شاہ جی رحمۃ اللہ علیہ نے تقریر بند کی اور لوگوں کو معلوم ہوا تو وہ پکار اٹھے کہ "اوہو یہ تو سحر ہو گئی"۔

گویا سحر ہوئی اور سحر ٹوٹا

آپ کی تقریر میں فصاحت کے چشمے ابلتے تھے، فصاحت اور نکتہ آفرینی، متانت اور سنجیدگی کے ساتھ آپ کے خطاب میں ظرافت و بذلہ سنجی کا جو حسین، معتدل امتزاج ہوتا تھا۔ وہ آپکی تقریر کو چار چاند لگا دیتا تھا۔ پھر زبان کا رس ان سب خوبیوں پر مستزاد تھا۔ قدرت نے آپ کو شیریں کلامی و شیریں زبانی کا جوہر عطا فرماتے وقت نہایت فیاضی سے کام لیا تھا۔

خود حضرت رحمۃ اللہ علیہ کو بھی قدرت کی اس نعمت اور زبان کے اس رس کا احساس تھا۔ آپ فرماتے تھے دنیا کو ہم سے کب پیار ہے۔ لوگ تو (زبان کی طرف اشارہ فرماتے ہوئے کہتے) اس سے پیار کرتے ہیں ہم سے کون پیار کرتا ہے۔

بڑے بڑے مقرر اور خطیب ماضی میں گزرے حال میں بھی ہیں اور مستقبل میں بھی آئیں گے۔ مگر حضرت رحمۃ اللہ علیہ کا سا خطیب غالباً نہ ماضی میں گزرا نہ حال میں ہے اور نہ مستقبل میں پیدا ہوتا نظر آتا ہے۔

علم دین سے قلبی وابستگی

آپ کی کتاب فضائل و مناقب کا ایک درخشاں باب ہے "علم دین سے قلبی وابستگی"۔ جہاں آج بڑے بڑے دیندار علماء کے بچے دینی علم سے بے بہرہ اور کالج کی فضاؤں میں پلتے نظر آتے ہیں۔ وہاں حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے کسی بچے کو سکول اور کالج میں نہیں جانے دیا۔ سب کو مکتب ہی میں بٹھایا۔ سب سے پہلے اللہ کا قرآن پڑھایا۔ قرآن کریم کا حافظ بنایا اور علم دین ہی پڑھایا۔ اس زمانے میں اور تہذیب و ترقی کے اس دور میں حضرت رحمۃ اللہ علیہ کا علم دین سے یہ دلی ربط وہ تعلق اور قلبی وابستگی اگر غور و تعمق سے دیکھا جائے تو بہت ہی بڑی بات۔

اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ماشاء اللہ آپ کے چاروں فرزندان گرامی قرآن کریم کے حافظ ہیں۔ دین کے عالم

ہیں خصوصاً بڑے فرزند و جانشین برادر محترم حضرت مولانا قاری حافظ سید ابومعاویہ ابوذر بخاری صاحب تو ماشاء اللہ دینی و دنیاوی علوم میں نہایت اعلیٰ استعداد کے مالک ہیں۔ خیر المدارس کے فاضل ہیں۔ اور تعلیم و تعلم کا خاص ذوق اور بے پناہ جوش رکھتے ہیں۔ عربی اور اردو کے صاحب طرز ادیب ہیں۔ عربی، فارسی، اردو کے بلند پایہ شاعر ہیں۔ اور تصنیف و تالیف میں مہارت تامہ رکھتے ہیں۔ آپ کو قدرت نے تقریر و خطابت کا بھی خاص ملکہ عطا فرمایا ہے۔ آپ بحر علم کے شناور ہیں اور مطالعہ اور تعلیم و تعلم سے قلبی شغف و انہماک ہے۔ آپ تبلیغی میدان میں اتر آئیں تو کوئی شک نہیں آپ حضرت رحمتہ اللہ علیہ کے صحیح جانشین ثابت ہو سکتے ہیں۔ کیا عجب! حضرت رحمتہ اللہ علیہ کے بعد دینی ضرورت کو آپ محسوس کرتے ہوئے تبلیغی کام کا آغاز فرمادیں۔ وہ دن بڑا ہی مبارک دن ہوگا جس دن آپ حضرت امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاری رحمتہ اللہ علیہ کی جگہ پر کھڑے ہو کر تبلیغ دین میں سرگرم عمل ہوں گے۔ اور حضرت رحمتہ اللہ علیہ کے مقام پر اگر کوئی کھڑا ہونے کا حق رکھتا ہے تو وہ برادرِ محترم حضرت مولانا حافظ قاری سید ابومعاویہ ابوذر بخاری ہی ہیں۔ [لہ]

اولاد کی تربیت

حضرت رحمہ اللہ نے اپنی اولاد کی تربیت میں کتنی دلچسپی لی اور اس میں کہاں تک کامیاب ہوئے۔ اس کا علم مجھے تو حضرت رحمہ اللہ کے وصال کے دن ہوا۔ جب دیکھا کہ اس حادثہ کبریٰ سے ہزاروں آنکھیں اشکبار ہیں۔ اور ہزاروں دل سوگوار ہیں مگر ایک ابوذر بخاری ہیں کہ صبر و ضبط کا پیکر نظر آ رہے ہیں۔ تجہیز و تکفین کی نگرانی خود کر رہے ہیں۔ حتیٰ کہ صحیح اسلامی احکام کی تعمیل میں حضرت علیہ الرحمتہ کا جنازہ بھی خود پڑھاتے ہیں۔

ایک بیٹے کے لئے اپنے باپ کی نماز جنازہ پڑھانا کوئی معمولی کام نہیں بڑے دل گردے کا کام ہے پھر نہ کوئی اضطراب ہے نہ پریشانی۔ آواز میں نہ پستی ہے نہ انحطاط۔

اللہ اکبر کی گرجدار آواز سے جب کالج کے وسیع میدان کی فضا گونج اٹھی تو میرے دل میں جہاں اپنے عزیز بھائی کے بے مثال صبر و ثابت قدمی کی قدر کے جذبات مچلتے تھے۔ وہاں حضرت رحمہ اللہ کے لئے دل سے دعا نکلتی تھی۔ جنکی تربیت نے سید ابوذر بخاری کو اس عظیم مقام پر کھڑا کیا۔

لہ الحمدُ للہ! حضرات امیرِ شریعت کے چاروں فرزند، بیٹی اور ان کی اولادیں دین کی تبلیغ، تعلیم اور تدریس میں گزشتہ تیس برسوں سے مصروف کار ہیں۔ شاہ جی کی جماعت مجلسِ احرارِ اسلام کو بہرحال زندہ رکھے ہوئے ہیں۔
(کفیل)

ابا جی اور شاہ جی

مولانا محمد ازہر شاہ قیصرؒ

مجھے بڑے لوگوں سے ان کی غائبانہ شہرت کی بناء پر عقیدت و محبت کے تعلقات قائم رکھنے کا سودائے خام کبھی نہیں ہوا اور نہ کبھی ایسا ہوا کہ میرے شہر میں کوئی بڑا لیڈر یا بڑا شاعر اور قومی کارکن آیا ہو اور میں شوق تعارف و ملاقات میں اس کی جائے قیام کے ارد گرد گھومتا رہا ہوں۔ وجہ یہ ہے کہ میرے نزدیک غائبانہ شہرت اور اس شہرت کی ہمہ گیری کسی انسان کی بڑائی اور بھلائی کا معیار نہیں۔ بڑائی صرف اخلاق کے لئے ہے اور بڑا آدمی وہ ہے جس کے اخلاق معیاری اور بلند ہوں۔

میرا تجربہ ہے کہ بعض بداخلاق اور بے کمال انسان بھی بعض وقتی حوادث سے شہرت پا لیتے ہیں۔ لیکن ان کے قریب جا کر جب ان کے کردار کے کچھ گوشوں کو ٹٹولتے ہیں تو ان میں اچھے اعمال و اخلاق کا کوئی سرمایہ نظر نہیں آتا۔ یہی وجہ ہے کہ شعراء میں جگر، احسان، روش، سیماب۔ اہل صحافت میں مولانا ظفر علی خان، سالک، حامد الانصاری غازی، محمد عثمان فارقلیط قومی رہنماؤں میں سید عطاء اللہ شاہ بخاری، مولانا حبیب الرحمن، مولانا حفظ الرحمن، ارباب علم و فضل میں مولانا شبیر احمد عثمانی، مولانا مناظر احسن گیلانی، قاری محمد طیب صاحب مولانا احمد علی وغیرہ سے زائد کسی سے میرا تعارف اور تعلق نہیں۔ بڑے آدمیوں کے تعارف و تعلق کے مجھے بہت سے مواقع ملے مگر شاید آپ اس پر اعتبار نہ کریں کہ میں نے خود ان مواقع کو کھو دیا اور کبھی ہر کس و ناکس سے رشتۂ محبت و عقیدت استوار کرنے کی مجھے ہمت نہ ہوئی۔

صف اول کے لوگوں میں گاندھی اور جواہر لعل تک میرے قریب سے گرج برس کر گزر گئے لیکن میں نے ذاتی طور پر ان سے تعلق پیدا کرنے میں خود اپنا نقصان سمجھا اور ان بزرگوں میں سید عطاء اللہ شاہ بخاری سے میرا تعلق بہت قدیم، مستحکم اور نیاز مندانہ رہا ہے۔ مجھے یاد ہے کہ جب ۱۹۳۰ء میں انجمن خدام الدین لاہور کے جلسہ میں شاہ جی کو امیر شریعت بنایا گیا تھا اور میرے والد مرحوم کی تائید کے ساتھ پانچ سو علماء کی ایک جماعت نے ان کے ہاتھ پر بیعت کی تھی۔ اس جلسہ میں میں نے شاہ جی کو دیکھا شاہ جی ان دنوں جوان تھے سرخ و سپید چہرہ، بھرے بھرے بازو، چہرے پر جلال، بدن میں چستی، نگاہوں میں چمک، سر پر شاہ جی نے سادہ کپڑے کی گول ٹوپی پہن رکھی تھی۔ گلے میں رنگین قمیض، قمیض کی آستین صرف بازوؤں تک، پاؤں میں چپل ہاتھ میں موٹا سا ڈنڈا، رات کو میں اسٹیج پر مولوی عبد الحنان صاحب کے پاس پڑا سو رہا تھا کہ کسی شخص کی دھواں دار تقریر سے میری آنکھ کھل گئی۔ یہ ہمارے شاہ جی تھے جو انجمن خدام الدین کے جلسہ میں تقریر کر رہے تھے۔ صبح ڈاکٹر عبد القوی صاحب کے یہاں ان سے تفصیلی ملاقات ہوئی مجھے اس دن بخار تھا۔ ابا جی نے منع کیا کہ صرف چائے پی لینا۔ مگر شاہ جی انڈے چھیل چھیل کر میری طرف بڑھاتے رہے اور میں کھاتا گیا۔ شاہ جی سے اس پہلی ملاقات کے بعد خلاف عادت میں بہت متاثر ہوا۔ یقین جانئے کہ کئی برس تک اس بچپن کے

عالم میں میرا یہ حال رہا کہ بالکل شاہ جی کی طرح چپل پہنتا رہا۔ ایسی ہی ٹوپی اوڑھتا ایسا ہی موٹا سا ڈنڈا۔ لئے پھرتا اور جامعہ اسلامیہ ڈابھیل کی مسجد میں سینکڑوں دفعہ طلباء کو گھیر گھار، ان کے سامنے شاہ جی کے لب ولہجہ میں اول فول تقریریں بکا کرتا۔

شاہ جی سے مجھے محبت زائد اس وجہ سے ہوئی کہ میرے والد مرحوم فطرۃً بہت خاموش، دنیاداری سے بالکل الگ ملنے ملانے سے نفور اور تعلقات میں ایک زبردست معیار کے انسان تھے۔ بڑے سے بڑے انسان کے لئے بھی یہ مشکل تھا کہ وہ اباجی کو متاثر کر سکتا اور ان سے تعریف و تحسین کے دو کلمے پالیتا۔

۳۰ء یا ۳۲ء میں گاندھی نے میرے والد مرحوم سے ملاقات کی خواہش ظاہر کی مگر انہوں نے یہ کہہ کر ٹال دیا کہ "میں گوشہ نشین فقیر لیڈروں سے ملنے کا سلیقہ نہیں رکھتا"

نظام حیدر آباد نے انہیں گھیر گھار کر اپنے یہاں بلایا۔ کہتے ہیں کہ نظام ترجمہ قرآن کے سلسلہ میں ابا جی سے کوئی علمی خدمت لینا چاہتے تھے اور اس کام کے لئے لاکھوں روپیہ خرچ کرنے کے لئے تیار تھے مگر اباجی نے کہا کہ "میں پیسہ لے کر قرآن کی کوئی خدمت کرنے کا ارادہ نہیں رکھتا۔ آپ اس کام سے مجھے معذور سمجھیں" آپ سمجھ سکتے ہیں کہ ایسے غیر ملنسار اور غیر دنیا دار آدمی کا کسی سے متاثر ہونا واقعی مشکل تھا۔ مگر ابا جی شاہ جی کے سو جان سے دیوانے تھے ہر وقت شاہ جی کا کلمہ پڑھتے ہر وقت انہی کا حال پوچھتے کتاب سے فراغت ہوئی چارپائی پر سنبھل کر بیٹھ گئے۔ سادہ چائے آئی اس کا دور چلا۔ سامنے میرے ماموں جناب حکیم سید محفوظ علی صاحب یا مولانا حفظ الرحمن، مولانا محمد ادریس صاحب، مولانا عتیق الرحمن صاحب عثمانی ہوئے اور ابا جی نے سلسلۂ کلام شروع کر دیا۔

"کیوں مولوی صاحب! ہم عطاء اللہ شاہ کو اگر سب کاموں سے ہٹا کر صرف تردید قادیانیت پر لگا دیں تو یہ کیسا رہے گا۔ مولوی صاحب! یہ صاحب واقعی مخلص ہیں بہت محنتی اور بہت زیادہ بہادر۔ انہوں نے پنجاب میں چند تقریریں کر کے قادیانیت کے خلاف ایک عام جذبہ پیدا کر دیا ہے۔ ہم سمجھتے ہیں کہ اگر انہوں نے اسی طرح محنت سے کام کیا تو قادیانیت ان شاء اللہ ختم ہو جائے گی"۔

شاید سیماب کا شعر ہے کہ۔

خاکِ پروانہ، رگِ گل، عرقِ شبنم سے
اس نے ترکیب تو سوچی تھی مگر دل نہ بنا

اور واقعہ یہ ہے کہ غیر اللہ کے لئے جاندار اور دھڑکتا ہوا دل بنا لینا بہت ہی مشکل ہے سائنس کی عجوبہ کاریاں اگر متحرک، زندہ اور جاندار دل بنا لینے میں کامیاب ہو جاتی ہیں تو تخلیق اور آفرینش سے ان کا فاصلہ کچھ دور نہیں رہتا۔ مگر جب قدرت نے خود ارادہ کیا تو اس نے پہاڑوں کی سنگینی، بجلیوں کے زور، طوفان کے شور، آندھیوں کی بلاخیزی، بادلوں کی گرج، درختوں کی بلندی، صحرا کی وسعت، صبح کی بہار آفرینی، شام کی رعنائی، راتوں کے سکون، پھولوں کی لطافت، کلیوں کی نزاکت، بادِ صبا کی شوخی، آبشاروں کے ترنم اور بہت سی متضاد چیزوں کو جمع کر کے ایک وجود بنایا اور سید عطاء اللہ شاہ بخاری اس کا نام رکھا۔

سید عطاء اللہ شاہ بخاری ۱۹۱۹ء سے لے کر ۱۹۴۷ء تک کشمیر سے لے کر راس کماری تک ہر صوبہ، ہر شہر اور ہر بستی میں چیختا اور چلاتا، روتا رلاتا، ہنستا بولتا، گرجتا برستا پھرتا رہا شاید ہی کوئی شہر ہو جس کی فضاؤں میں بخاری کی تقریروں کی روانی ایک پوشیدہ قوت بن کر جاگزیں نہ ہو۔

ہندوستان کے مسلمان بخاری کو بھول جائیں مگر یہ واقعہ ہے کہ ہندوستان میں جب کوئی ایک مسلمان کسی پریشانی سے رویا ہے تو عطاء اللہ شاہ کے آنسوؤں نے اس کا ساتھ دیا ہے جب بھی کسی مظلوم نے اسے آواز دی ہے تو وہ سینہ تان کر اس کی حمایت میں سامنے آگیا ہے۔ گجرات، ملتان، دہلی، علی پور (بنگال)، لاہور، امرتسر، راولپنڈی اور میانوالی کی جیلیں اس کی یادگار ہیں۔ آج نہ سہی ایک وقت ضرور آئے گا جب آنے والی نسلیں ان جیلوں کو بخاری کی قیام گاہ کی حیثیت سے آثار قدیمہ میں شامل کر دیں گی۔

آج تاج محل، محل آرٹ کا ایک نشان اور ہندوستان کی عظمت کا ایک باوقار نمونہ ہے۔ وقت مجبور کرے گا کہ امرتسر اور ملتان میں سید عطا اللہ شاہ بخاری کے مکانات کو اپنی تاریخ حریت کی یادگار کے طور پر محفوظ کیا جائے۔

لاہور کے ایک جلسہ میں پیغمبر برحق صلی اللہ علیہ وسلم کی توہین کرنے والے ایک مصنف کے خلاف احتجاج کیا جا رہا تھا۔ لاکھوں کے مجمع میں بخاری نے کہا کہ "وہ دیکھو سامنے! خدیجۃ الکبریٰ کھڑی شکایت کر رہی ہیں کہ میرے شوہر نامدار کی توہین کی گئی ہے اور لاکھوں مسلمانوں میں سے ایک بھی نہ بولا۔ لو وہ سنو فاطمہ زہرا فرماتی ہیں کہ میرے باوا جان کی بے عزتی کی گئی ہے اور ان کی امت نے کچھ نہ کیا۔" تو لاکھوں کے اس مجمع کی چیخیں نکل گئیں اور سینکڑوں مسلمان عورتوں نے اپنے شیر خوار بچوں کو شاہ کے سامنے پھینک دیا کہ ہم اپنے جگر گوشوں کو ناموسِ رسالت پر قربان کرتے ہیں۔ کوئی اور بھی اگر ایسا جادو بیان خطیب ہو تو مجھے بتاؤ۔

جن دنوں انجمن خدام الدین کے جلسہ میں اباجی نے شاہ جی کے ہاتھ پر بیعت کی ان دنوں شاید اخبار انقلاب لاہور میں ایک نظم چھپی تھی جسے اس زمانہ کے مشہور اخبار سیاست نے بھی خوب مزے لے لے کر چھاپا تھا اس کے پہلے چند اشعار میں تو نمک کے محصول کے سلسلہ میں اباجی کے ایک مشہور فتویٰ کا مذاق اڑایا تھا۔ اس فتویٰ کا اس زمانہ میں اس وجہ سے بہت چرچا ہو گیا تھا کہ گاندھی نے اس فتویٰ کو سامنے رکھ کر نمک سازی کی اپنی مشہور تحریک شروع کی تھی۔

اس نظم میں اباجی کی بیعت کا یوں ذکر کیا گیا تھا کہ

کی ہے اک شاگرد کی استاد نے بیعت قبول	بڑھ گیا ہے مہر سے کس درجہ رتبہ ماہ کا
انقلاب آسماں دیکھو کہ اک ادنیٰ مرید	پیر انور شاہ جیسا ہے عطا اللہ کا

اور بادی النظر میں یہ بات واقعی حیرت انگیز تھی کہ اباجی، شاہ جی کی بیعت کریں۔ مگر یہاں "میان عاشق و معشوق رمزیست" کا معاملہ تھا۔ کسی کو کچھ پتہ نہیں چلا کہ مرید نے مرشد میں کیا جوہر دیکھے اور کیوں اس

کے ہاتھ پر بیعت کی ہم تو صرف اتنا جانتے ہیں کہ شاہ جی کا نام آیا اور ابا جی کے چہرہ پر مسکراہٹ پھیل گئی کسی نے شاہ جی کی تعریف کی تو خوش ہوگئے کسی نے شاہ جی کو برا کہا تو بگڑ گئے۔

ابا جی کو اخبار پڑھنے کی کبھی عادت نہ تھی مگر صرف شاہ جی کی خبریں معلوم کرنے کے لئے اخبار پڑھنے والوں سے جب خیال آجاتا تو پوچھتے کہ بھائی شاہ جی کی خبر ہے؟ کہیں تقریر کی یا نہیں؟ کہاں ہیں؟ ادھر دیو بند کی طرف تو آنے کی خبر نہیں؟

اللہ اللہ محبت و شفقت کا کیا عالم تھا۔ ایک دفعہ اسی طرح مجھ سے پوچھ رہے تھے کہ آج اخبار میں شاہ جی کی کوئی خبر تھی کہ نہیں؟ میں نے جھنجھلا کر کہا کہ کوئی نہیں؟ فرمایا کہ الجمعیتہ بھی دیکھا تھا یا نہیں؟ میں نے کہا دیکھا تھا اس میں بھی کوئی خبر نہیں تھی ارشاد ہوا کہ اور زمیندار؟ میں اس کھود کرید سے تنگ آگیا لہک کر بولا کہ جی اس میں خبر تھی کہ شاہ جی گرفتار ہو گئے۔ میری آنکھوں کے سامنے اٹھارہ انیس سال پہلے کا یہ نقشہ جوں کا توں موجود ہے۔ اس طرح کہ گویا یہ واقعہ آج ہی ہوا ہے۔ ابا جی چارپائی پر اپنے کھردرے بستر پر لیٹے ہوئے تھے۔ یہ سنتے ہی اٹھ بیٹھے۔ گھبرا کر پوچھا کہ گرفتار ہو گئے؟ کہاں گرفتار ہو گئے؟ بھائی کیا معاملہ ہے ذرا تفصیل سے سناؤ۔ ان کے گھبرا کر اٹھ بیٹھنے اور اس طرح سوالات کرنے سے مجھ کو احساس ہوا کہ میرا یہ جھوٹ ابا جی کے لئے بدرجہ غایت تکلیف دہ ہوگا۔ یہاں تو محض دفع الوقتی کے لئے جھوٹ بولا تھا مگر اب یہ جھوٹ جان لے کر رہے گا۔ پریشان ہوا کہ آخر کیا کروں اور دل نے فوراً یہ فیصلہ کیا کہ اس شاندار جھوٹ کو واپس لے لینے ہی میں عافیت ہے۔

میں نے عرض کیا کہ میں تو ویسے ہی مذاق کر رہا تھا۔ شاہ جی کہیں گرفتار نہیں ہوئے۔ ۱۴ مئی کو دہلی میں جلسہ ہے شاہ جی اس جلسہ میں شرکت کے لئے دہلی آنے والے ہیں

بے ساختہ فرمانے لگے کہ نعوذ باللہ جھوٹ کسی ضرورت اور حاجت سے بولا جاتا ہے۔ آپ کچھ عجیب طرح کے آدمی معلوم ہوتے ہیں۔ بظاہر جھوٹ بولنے میں آپ کا کوئی نفع نہیں تھا مگر آپ نے بے ساختہ جھوٹ بولا۔ گویا آپ ضرورتاً نہیں بلکہ عادۃً جھوٹ بولتے ہیں۔ حق تعالیٰ آپ کو ہدایت فرمائے۔ آپ کو نیک عمل کی توفیق دے۔ آپ کا حال تو ہمارے نزدیک بہت افسوس ناک ہوتا جا رہا ہے۔

شاہ جی ایک دفعہ دیو بند تشریف لائے۔ مولانا حبیب الرحمن لدھیانوی ساتھ تھے۔ اور قیام ہمارے ہی مکان پر تھا۔ میں ذمہ داری کے ساتھ یہ بات کہہ سکتا ہوں کہ ہم جس مکان میں اب مقیم ہیں اس مکان میں بھی ابا جی سات سال تک ہمارے ساتھ رہے مگر اس سات سال کے عرصہ میں صرف ایک مرتبہ یہ موقع آیا کہ ابا جی گھر کے باورچی خانہ میں تشریف لائے۔ صرف ایک مرتبہ اور یہ موقع وہی تھا جب شاہ جی ہمارے مہمان تھے ابا جی نے باہر سے آتے ہی والدہ کو آواز دی۔ وہ باورچی خانہ میں تھیں۔ آواز کا جواب نہ دے سکیں۔ جلدی سے ابا جی باورچی خانہ میں تشریف لے آئے۔ اماں سے فرمانے لگے کہ ارے سنتی ہو! آج ہمارے ایک بہت۔ معزز مہمان آیا ہے۔ بہت زیادہ معزز۔ اس کی تواضع اور مہمان داری بہت اچھی طرح کرنی چاہیئے۔ ابھی کسی ہمسائے کے یہاں سے ایک دو مرغ منگواؤ۔ ان کا شوربا پکالو۔ چاول پکاؤ کوئی میٹھی چیز بھی پکا لو۔ شام کو بڑے

سلیقہ اور فراغت سے مہمان کو کھانا کھلاؤ"۔

آپ لوگوں کے نزدیک یہ کوئی بات نہ ہو گی۔ کہ ہر شخص اپنے مہمانوں کی تواضع کرتا اور انکی مدارات کے لئے مختلف اہتمام کرتا ہے مگر ابا جی کا معاملہ عام لوگوں سے الگ تھا۔ ان باتوں اور جھگڑوں سے ان کی بے تعلقی کا یہ عالم تھا کہ میں نے قرآن شریف ناظرہ سے شروع کر کے پورا حفظ کر لیا اور اس میں مجھے دو تین سال لگے۔ مگر ابا جی کو اس ساری مدت میں یہ نہ معلوم ہوا کہ ازہر کیا پڑھتا ہے۔ جس دن میں قرآن کے حفظ سے فارغ ہوا۔ اس دن مولانا سراج احمد صاحب رشیدی مرحوم نے جو ابا جی مرحوم کی مجلس علمی کے ایک ممتاز رکن اور اپنے وقت کے بڑے عالم تھے۔ انہوں نے ابا جی کو مبارک باد دی۔ فرمانے لگے "یہ تو ہماری توقع اور علم کے بغیر ایسا ہو گیا ہے۔ ہمیں اس کا کوئی علم نہیں تھا کہ ازہر حفظ کر رہا ہے اور حفظ بھی اب ختم ہو گیا ہے"۔ آپ اندازہ کیجئے کہ جس شخص کو دنیا داری سے اتنی بے تعلقی ہو شاہ جی کے حال پر اس کا یہ التفات، یہ محبت اور یہ توجہ قابل ذکر چیز ہے یا نہیں؟

شاہ جی کا تعارف ابا جی سے مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی نے کرایا تھا۔ وہی اس آزاد منش، رند پارسا کو گھیر گھار کر ابا جی کے پاس لائے اور پھر مدت العمر دونوں ان کی بارگاہ میں مقبول رہے۔

قادیانیت کے سلسلہ میں شاہ جی نے جتنا کام کیا سب ابا جی کے اشارہ و ارشاد پر شاہ جی کی تقریریں پسند کی جاتیں۔ تو ابا جی کا سیروں خون بڑھتا۔ وہ تردید قادنیت کے لئے لمبے لمبے دورے کرتے تو ابا جی کی نگاہ ان کے ہر قدم پر رہتی۔ ڈابھیل میں مسجد مدرسہ میں انکا معمول تھا کہ جمعہ کو تقریر فرمایا کرتے۔ ایسی تقریر جس میں صرف مغز مغز ہوتا تھا۔ الفاظ بالکل نہیں۔ نہ کوئی ابتداء ہوتی تھی اور نہ انتہا۔ تقریر ختم کر چکے مجمع اٹھ گیا۔ خود منبر سے اتر آئے مگر کوئی بات پھر ذہن میں آگئی تو دوبارہ پھر منبر پر جا بیٹھے اور تقریر شروع فرما دی۔ ایک دن خطبہ مسنونہ کے بعد صرف یہی مضمون بیان ہوا کہا پنجاب میں ایک صاحب ہمیں مل گئے ہیں۔ صاحب توفیق صاحب صلاحیت صاحب سواد خوب کام کرتے ہیں۔ مولویوں کی طرح نہ خواہش زر میں مبتلا ہیں اور نہ خواہش شہرت میں بس بے چارے محض اللہ کے لئے کام کئے جاتے ہیں۔ ہم نے قادنیت کے متعلق انہیں توجہ دلائی کہ یہ فتنۂ عظیم صحیح اسلام کو جڑ سمیت اکھاڑ پھینکنے کا ارادہ کر بیٹھا ہے۔ آپ کیوں نہ اس فتنہ کے خلاف کچھ کام کر گزریں۔ آپ کا وہ کام دین میں آپ کے لئے نفع رساں ہو گا۔ اور دنیا میں اس سے اہل دین کو فائدہ پہنچے گا۔ یہ کہہ کر پھر شاہ جی کا نام لیا۔ فرمایا کہ بڑوں سے جو کام نہ ہوا وہ اس غریب نے کر دکھایا (طلباء کی طرف اشارہ کر کے فرمایا) آپ تو مدرسہ کی روٹیاں کھا کر ہر وقت بحث و مباحثہ میں لگے رہتے ہیں دین کی کوئی محبت آپ حضرات کے دل میں نہیں عطاء اللہ شاہ اگر یہاں آگئے تو آپ ان سے ملئے وہ عجیب آدمی ہیں۔

میرے خیال میں ابا جی کے انہی الفاظ کو سامنے رکھ کر حفیظ جالندھری نے ایک دفعہ کہا تھا کہ دور اول کے مجاہدین اسلام کے گروہ سے ایک سپاہی راستہ بھول کر اس زمانہ میں آنکلا ہے وہی سادگی، مشقت پسندی یکسر عمل اخلاص اور للہیت جو ان میں تھی وہ عطاء اللہ شاہ میں بھی ہے۔

ڈابھیل میں فیض اللہ بنوری کے نام سے ایک طالب علم تھے اباجی کے یہاں ان کی رسائی صرف اس وجہ سے تھی کہ وہ شاہ جی کی شان میں اپنی انمل اور بے جوڑ نظمیں بڑے بے ہنگم لہجہ میں پڑھ کر سناتے تھے اباجی ہمیشہ اس طالب علم پر توجہ کرتے اسکی مدارت فرماتے اور ہر جگہ اسے یاد رکھتے۔

یہ قصہ ہے جب کا کہ آتش جواں تھا

ابھی چند دن ہوئے مولانا حبیب الرحمن لدھیانوی دہلی سے آئے شام کو مغرب کے بعد وہ ان کے دونوں صاحبزادے سعید اور محمد اور میں اباجی کے مزار پر گئے۔ میرا جی چاہتا تھا کہ اباجی اپنے گوشۂ مزار سے مولانا حبیب الرحمن کے سلام کا جواب دیں۔ قبر شق ہو جائے اور اندر سے وقار، سنجیدگی کا وہی پیکر حسین باہر آکر کھڑا ہو جائے جسے دیکھنے کے لئے دور دراز سے لوگ آتے تھے۔ وہی سبز رنگ کا عمامہ، سبز رنگ کا چوغہ، سیاہ غلافی آنکھیں اور خوبصورت چہرہ نظر آجائے۔ جسے اپنے ہاتھوں سے ان کے ہزاروں شاگردوں نے شام کی تاریکیوں میں یہاں دفن کر دیا تھا۔ فاتحہ پڑھ چکنے کے بعد میں دیر تک ان کی قبر پر ٹکٹکی باندھے کھڑا رہا۔ میرے تحت الشعور میں یہی خیال تھا کہ اباجی اب اٹھے اور اب اٹھے مگر ہائے

سچ ہوا کرتی ہیں ان خوابوں کی تعبیریں کہیں

رات بڑھتی آئی اندھیرا گھرا ہوتا چلا گیا۔ قبرستان میں اداسیاں پھیل گئیں۔ درخت زور زور سے ہلنے لگے۔ ہواؤں کی سنسناہٹ دل کو توڑے لیتی تھی۔ تاریکی اور اندھیرا سرکش جنات کی طرح سر چڑھے جاتے تھے۔ قبرستان کے کسی گوشے سے کسی طالب علم کی تلاوت کی آواز آرہی تھی۔ میں آہستہ آہستہ باہر نکلا تو عید گاہ کی دوسری طرف سے ہرٹ چلنے کی آواز خاموشی اور سکون کے سینے کو چیرتی اور رات کی تاریکیوں سے لڑتی جھگڑتی آگے بڑھ رہی تھی۔ ہرٹ کی آواز میں کیا کیفیت ہو سکتی ہے؟ نہ خوشی اور مسرت کا نغمہ اور نہ رنج و غم کی دلدوز داستان مگر میرے دل سے اٹھتے ہوئے رنج و غم کے شعلے ہرٹ کے آواز میں جذب ہو گئے۔ مجھے ایسا معلوم ہوا کہ میرے دل کو کسی نے تھام لیا۔ میرا سانس ٹوٹا جارہا تھا۔ اسے کسی نے سنبھال لیا میری روح نکلی جارہی تھی وہ اپنی جگہ تھم گئی۔

جن بزرگوں کے یہ قصے ہیں وہ بزرگ اب مدت ہوئی نظروں سے ایک جلوۂ بے قرار کی طرح اوجھل ہو گئے زمانہ بدل گیا مجلسوں کا رنگ کچھ اور ہے۔ بحث و مباحثہ اور فکر و نظر کا موضع یکسر جدید ہے۔ پچھلی باتوں میں نئے زمانہ کے لئے کوئی دلچسپی نہیں وہ بزرگ اپنے اپنے وقت پر علم و فضل کے آفتاب و مہتاب بن کر چمکے۔ مگر آج تو خاکِ مزار کے سوا ان کا کوئی نشان نہیں ملتا۔ پہلے کبھی اباجی کی مجلس میں حقائق دین کی گرہیں کھلتیں اور فکر و نظر کے نئے سانچے تیار ہوتے تھے جن پر ان کی نظر پڑ جاتی تھی۔ وہی کام کا آدمی بن جاتا تھا۔ جو قدموں میں آکر بیٹھتا تھا وہی کچھ لے کر جاتا تھا مگر آج ان کے مزار پر خاموشی اور سکون کے سوا اور کیا ہے۔

۷۱ سال کی عمر پوری کر کے شاہ جی نے ۲۱ اگست کی شام کو جان جانِ آفریں کے سپرد کی اور ۲۲ کو بعد ظہر تقریر و خطابت کے اس بادشاہ کو منوں مٹی کے نیچے دبا دیا گیا۔ شاہ کی موت پر ایک تاریخ ختم ہو گئی ایک عہد گزر گیا۔ ایک دور پورا ہو گیا۔ ایک چمن اجڑ گیا۔ ایک بہار لٹ گئی۔ تقریر و خطابت کی رونق ختم ہو گئی۔

جرأت و شجاعت کا شیرازہ بکھر گیا اور خلوص و دیانت پر افسردگی چھا گئی۔ اب نہ کبھی شاہ نظر آئیں گے نہ ان کی تقریریں سننے کا موقع ملے گا۔ لیکن جب بادل گرجے گا، بجلی چمکے گی، موسلادھار بارش ہو گی، طوفان اور سیلاب آئیں گے، جب کبھی صبح ہو گی اور جب کبھی شام آئے گی، جب کبھی پھول کھلیں گے اور کلیاں مسکرائیں گی، جب کبھی باد صبا پھولوں اور کلیوں سے چھیڑ چھاڑ کرتی چمن سے گزرے گی، جب کبھی کوئی قرآن پڑھے گا، اور جب کوئی رات کی آخری اور خشک ساعتوں میں لاکھوں اور ہزاروں کے مجمع کے سامنے تقریر کرے گا۔ جب کوئی جرم حق گوئی کی پاداش میں قید و بند کی صعوبتوں سے گزرے گا، جب کوئی مرد حق اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی عظمت کے لئے اپنے جسم و جان کا نذرانہ وقت کے کسی ظالم اور قاہر کے سامنے پیش کرے گا۔ مجھے اس وقت سید عطاء اللہ شاہ بخاری ضرور یاد آئیں گے کہ ان سب چیزوں میں مجھے عطاء اللہ شاہ بخاری کی شباہت ملے گی۔ عطاء اللہ شاہ کی کچھ ادھوری سی نقل، سید عطاء اللہ شاہ بخاری کی ۷۱ سالہ مجاہدانہ اور سحر آفریں زندگی اس کے خلوص و دیانت اس کی تقریر و شعلہ بیانی ان کی عظیم الشان شخصیت انکی طویل قومی خدمات، ان کی بے غرضی بے نفسی اور بے ریائی، اس کی حسین جوانی، اس کے پروقار بڑھاپے کو اس کے لاکھوں عقیدت مندوں کو دور افتادہ ازہر کا سلام رحمہُ اللہُ رحمتہً واسعتہً وغفرلہ اللہ مغفرۃً کاملتہً

*

چار چیزوں سے محبت

دنیا میں چار قیمتی چیزیں محبت کے قابل ہیں:

مال

جان

آبرو اور

ایمان

لیکن۔۔۔۔۔۔

جب جان پر کوئی مصیبت آئے تو مال قربان کرنا چاہیئے اور اگر آبرو پر کوئی آفت آئے تو مال اور جان دونوں کو۔ اور اگر ایمان پر کوئی ابتلاء آئے تو مال، جان، آبرو سب کو قربان کرنا چاہیئے اور

اگر ان سب کے قربان کرنے سے ایمان محفوظ رہتا ہے تو یہ سودا سستا ہے۔

(امیر شریعت)

ماتم کناں ہے عشق بخاری نہیں رہا

اک پیکر وفا و محبت چلا گیا
اک آشنائے سرّ حقیقت چلا گیا
واحسرتا! امیر شریعت چلا گیا
وہ نگہ دارِ ختمِ نبوت چلا گیا
نغمہ سرا بہ صوتِ ہزاری نہیں رہا
ماتم کناں ہے عشق بخاری نہیں رہا

وہ رندِ پاکباز و خطیبِ سخن طراز
وہ مردِ بااصول، وہ درویشِ بے نیاز
وہ غمگسارِ قوم، وہ ملت کا چارہ ساز
وہ دوستوں کا دوست، وہ مخلص، وہ دلنواز
آئینہ دارِ عظمتِ اولاد بو ترابؓ
ہر وصف بے نظیر، ہر اک بات لاجواب

غیور و خوش نہاد و خوش اسلوب و ارجمند
سردار سرفروش و سرافراز و سربلند
حق گو و حق شناس و حق اندیش و حق پسند
دائم رہا طریقِ عزیمت پر کاربند
اس کی رگوں میں عشق پیمبر تھا موجزن
اس کے لبوں پہ صدقِ ابوذرؓ تھا ضوفگن

ملت کو اس نے عزم و عمل کا دیا سبق
اس کی کتاب زیست کا روشن ہے ہر ورق
اس کی نوا تھی یا جرس کاروانِ حق
باطل کا جس سے رنگ ہوا زرد چہرہ فق
عشق نبی کی جوت جگاتا چلا گیا
طاغوتیت کا نقش مٹاتا چلا گیا

آتش نفس خطیب و پیمبر صفت زعیم
اوصاف میں حمید تو اخلاق میں عظیم
ذوق نظر بلند، مذاقِ سخن سلیم

ہیبت سے اسکی سطوت افرنگ ہے دو نیم
رشکِ شہنشہاں تھی فقیری میں اسکی ذات
ملتے کہاں ہیں دہر میں اب ایسے خوش صفات

دل کا ہر ایک زخم نمایاں کئے ہوئے
آنکھوں میں دردِ عشق فروزاں کئے ہوئے
نطقِ حسین کو حشر بداماں کئے ہوئے

حبِ نبی کو حرزِ دل و جاں کئے ہوئے
باطل کو ہر محاذ پہ ناکام کر گیا
اسلام کا جہاں میں بڑا نام کر گیا

فرشِ زمین کی بات نہیں عرش ہل گیا
محفل میں جب وہ اہلِ نظر اہلِ دل گیا
پیکِ اجل بھی موت پہ اس کی مچل گیا
"یہ رتبۂ بلند ملا جس کو مل گیا"
"ہر مدعی کے واسطے دار و رسن کہاں"
وہ گفتگو کا فن، وہ سخن وہ دہن کہاں

بدباطنوں کی ہے یہ عبث آرزوئے خام
ہوگا نہ کم دلوں میں بخاری کا احترام
اعدائے دین حق کے علی الرغم، اس کا نام
چمکے گا آفتاب کی مانند صبح و شام
مانند نکہت گل تر پھیل جائے گا
دنیا میں اس کا نام سدا جگمگائے گا

صہبائے عیش جنت رضوان بہ جامِ اُو
گنجینۂ سعادتِ دوراں بہ کامِ اُو
برتر ز اوجِ ہمتِ کیواں مقامِ اُو
ثبت است برجریدۂ گیہاں دوامِ اُو
"ہرگز نمیرد آنکہ دلش زندہ شد بہ عشق"
پائندہ باد نام بخاری بہ فیضِ عشق

سید عبدالمنان شاہدؔ

ابن الانور مولانا انظر شاہ مسعودی مدظلہ

امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ

اور

محسنِ احرار علامہ محمد انور شاہ کشمیریؒ

برصغیر کی تاریخ میں علامہ محمد انور شاہ کشمیری قدس سرہ کی شخصیت کسی تعارف کی محتاج نہیں۔ وہ بیک وقت محدث بھی تھے اور فقیہہ بھی۔ اپنے علم، تقویٰ اور اخلاص کے اعتبار سے وہ اپنے ہم عصر علماء میں منفرد و ممتاز نظر آتے ہیں۔ ان کے ہاں بے پناہ وسعت نظر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی شخصیت غیر متنازعہ بھی ہے۔ علماء تو ان کے مقام و مرتبہ کے معترف تھے ہی مگر جدید تعلیم یافتہ طبقہ بھی ان سے بے حد متاثر ہوا۔ جن میں سرفہرست علامہ محمد اقبال مرحوم ہیں جو نہ صرف آپ کی شخصیت سے متاثر ہوئے بلکہ فدائی و شیدائی تھے۔ اقبال مرحوم کے فکر و نظر اور عقائد و اعمال میں انقلاب علامہ محمد انور شاہ کشمیری کی کوششوں کا ہی نتیجہ ہے۔ خصوصاً قادیانیت کے مسئلہ میں اقبال مرحوم کی اصلاح انہی کی محنت کے نتیجہ میں ہوئی۔ علامہ انور شاہ کشمیری نابغہ عصر تھے۔ وہ کیا کرنا چاہتے تھے؟ کن لوگوں کے ذریعہ سے چاہتے تھے؟ اور اس سلسلہ میں انہوں نے کس طرح جدوجہد کی؟ ذیل میں ان کے فرزند ارجمند علامہ انظر شاہ مسعودی مدظلہ کی تحریروں کے اقتباسات درج کئے جاتے ہیں جو دراصل آپ کی تصنیف "نقش دوام" (سوانح علامہ انور شاہ کشمیری) اور پندرہ روزہ "الاحرار" لاہور میں شائع ہونے والے آپ کے ایک انٹرویو سے مرتب کئے گئے۔ (کفیل)

"والد مرحوم کی آرزو تھی کہ پنجاب میں ایک منظم عوامی تنظیم کا قیام عمل میں آئے جو قادیانیت کے محاذ پر سرفروشانہ کام کرے اور استخلاص وطن کے لئے بھی جدوجہد کرے۔ مجلس احرار اسلام انہی کے ایماء اور اشارہ پر قائم ہوئی اور انہوں نے اپنے مخلص اور فداکار شاگردوں اور عقیدت مندوں کو اس جماعت میں شامل ہونے اور تعاون کرنے کی ہدایت فرمائی تھی۔

کانگریس نے اپنی ورکنگ کمیٹی میں نمائندگی دینے کے سلسلے میں پنجاب کو بالکل نظر انداز کر دیا تو یہ مسئلہ بھی احرار کے قیام کا پس منظر بن گیا۔ انہوں نے سید عطاء اللہ شاہ بخاری اور مولانا حبیب الرحمن لدھیانوی کے متعلق یہ سمجھا کہ اگر انہیں قادیانیت کے خلاف تحفظ ختم نبوت کے محاذ پر کھڑا کر دیا گیا تو یقینی طور پر اسلام کے بہترین سپاہی اور عظیم مجاہد ثابت ہوں گے۔ انہوں نے فتنۂ قادیانیت کے استیصال اور سرکوبی کے لئے یہ مشن ان حضرات کے سپرد کر دیا۔ احرار نے جو سب سے بڑی اسلام کی خدمت کی ہے وہ عقیدۂ ختم نبوت کے تحفظ کا معاملہ ہے۔ اور یہ اتنی عظیم خدمت ہے کہ اگر احرار کے دامن میں اور کچھ بھی نہ ہو تو صرف اس محاذ پر انہوں نے جس سراپا اخلاص انداز سے جنگ لڑی وہ دوسری جماعتوں کی بہت سی خدمات پر بھاری ہے۔ خصوصاً پنجاب میں انگریز کو بہترین سپاہی اور دائمی وفادار ملتے تھے یہاں اس کے خلاف بغاوت

اور انگریز دشمنی کا جذبہ صرف احرار نے پیدا کیا۔

مجھے کئی مرتبہ شاہ جی سے ملاقات کا موقع ملا۔ وہ دیو بند تشریف لائے۔ تو مجھے وہاں بھی زیارت و ملاقات کا موقع میسر آیا پھر جب میں دہلی میں تھا تو وہاں احرار کانفرنس میں ان کا خطاب سننے اور تین دن تک ان کے ساتھ قیام کا شرف بھی حاصل ہوا۔ مسلم لیگ کا ہندوستان میں دور شباب تھا اور قوم پرور مسلمانوں کو اپنی بات کہنے اور سنانے کا موقع نہیں ملتا تھا۔ جمعیت علماء ہند اپنی تمام تر جدوجہد کے باوجود دہلی میں کوئی کامیاب جلسہ کرنے میں ناکام ہو گئی تو پھر شاہ جی کو بلایا گیا۔ یہ دہلی کے لئے ان کا آخری سفر تھا۔ اس وقت جو انہوں نے معرکہ کا خطاب کیا مجھے آج بھی یاد ہے۔

اس تقریر میں جواہر لال نہرو پٹیل اور کانگریس کی کئی اہم ترین شخصیات بھی موجود تھیں۔ شاہ جی نے اپنی جادو بیانی ہی سے دہلی والوں کو کنٹرول کیا اور جمعیت علماء ہند کو بڑے زمانہ کے بعد اس کا موقع ملا کہ شاہ جی کی خطابت کے نام پر دہلی والوں کو جمع کریں اور اپنی بات ان تک پہنچائیں۔

احرار اور جمعیت کے موقف میں بھی واضح فرق تھا۔ احرار صرف آزادیٔ وطن کے لئے کانگریس کے ساتھ تعاون کی پالیسی اختیار کئے ہوئے تھے۔ لیکن انفرادی طور پر دینی محاذ پر بھی بھرپور کام کرتے تھے۔ جمعیت علماء ہند نے کلیتہً اپنے آپ کو کانگریس سے وابستہ کر دیا تھا۔ اور ان میں کانگریس کی کسی تجویز کی مخالفت کی جرأت اور حوصلہ نہیں تھا۔ جب کہ احرار بہت سے مواقع پر کانگریس کی مذہبی و سیاسی زیادتیوں کی کھلم کھلا مخالفت کرتے تھے۔ (۱)

تصنیف و تالیف، تقریر اور قادیانیت کے مقابلہ کے لئے بعض مناسب افراد دو اشخاص کی خصوصی ترتیب کے باوجود والد مرحوم کی رائے تھی کہ اس فتنہ کی مکمل بیخ کنی کے لئے ایک ایسے مستقل ادارہ کی ضرورت ہے جو اپنی تمام توانائیاں اور قوت کار قادیانیت کی تردید میں صرف کرے۔ اس کے لئے آپ نے بار بار "جمعیت العلماء ہند" کو بھی توجہ دلائی بلکہ کلکتہ جمعیۃ العلماء کے اجلاس میں جب اس مسئلہ پر غور ہو رہا تھا کہ جمعیۃ العلماء کی رکنیت کے لئے خود اسلامی فرقوں میں سے کس کس کے لئے اجازت ہونی چاہیئے۔ آپ نے یہ سوال اٹھایا کہ پہلے قادیانیوں کے کفر و ایمان کا فیصلہ ہونا چاہیئے تاکہ ان کے لئے حق رکنیت یا عدمِ رکنیت کی بات طے ہو سکے۔ لیکن "جمعیۃ العلماء ہند" نے ہندوستان کی آزادی کی تحریک میں جس سرگرمی سے حصہ لیا، کسی دوسرے محاذ پر تندہی سے اس کے لئے کام ممکن بھی نہیں تھا۔ پھر پنجاب جو اس فتنہ کی جائے پیدائش تھی وہاں پر اس کے مقابلہ کے لئے کسی ادارہ کا قیام سب سے ضروری تھا۔ پنجاب کے لوگوں کو خدا تعالیٰ نے قوت عمل، جوش و خروش کی جن دولتوں سے نوازا ہے اس کی بنیاد پر بھی آپ کی بار بار نظر پنجاب پر ہی اٹھتی۔ انہیں وجوہ و اسباب کے پیش نظر اپنے خصوصی تلامذہ و متعلقین کو ایک ادارہ کے قیام کی طرف

۱۔ اقتباس انٹرویو مولانا محمد انظر مسعودی، فرزند علامہ محمد انور شاہ کشمیری۔ پندرہ روزہ "الاحرار"۔ لاہور جلد۔ ۱۵۔ شمارہ ۱۹۔ ۲۰ یکم تا ۳۱ جنوری ۱۹۸۶ء۔

متوجہ کیا۔ اسی زمانہ میں قوم پرور مسلمانوں کا ایک عنصر کانگریس ورکنگ کمیٹی میں مسلم پنجاب کی نمائندگی کے سوال پر ناراض ہو کر کانگریس سے ٹوٹا اور مجلس احرار کے نام سے جس ادارہ کی تشکیل کی وہ حضرت والد صاحب کی تمناؤں کے مطابق تھی۔ سید عطاء اللہ شاہ بخاری، چودھری افضل حق، مولانا حبیب الرحمن لدھیانوی، شیخ حسام الدین، مولانا داؤد غزنوی اور مولانا ظفر علی خان ان سب نے قادیانیت کے استیصال میں جو کام کیا وہ احرار کی تاریخ کا ایک جلی باب ہے۔

بخاری کی ساحرانہ خطابت نے ملک کو آتشیں فضا میں دھکیل دیا۔ شاہ صاحب نے انہیں "امیر شریعت" کے خطاب سے نواز کر قادیانیت کے مقابلہ میں لاکھڑا کیا اور پھر جاننے والے جانتے ہیں کہ عطاء اللہ شاہ کی تگ و دو سے قادیانیت کا قلعہ مسمار ہو گیا۔ ظفر علی خان کی ہنگامہ خیز شاعری نے مرزائے قادیان کی زندگی تلخ کر دی۔ اس طرح مجلس احرار کی تعمیر میں قادیانیت کی تردید کا جو تخم ڈالا گیا تھا۔ وہ احرار کی پوری زندگی میں بروئے کار رہا۔ پاکستان بن جانے کے بعد بھی قادیانیت سے ایک بھرپور مقابلہ مجلس احرار نے کیا اگرچہ (پاکستان کے پہلے وزیر خارجہ) سر ظفر اللہ قادیانی کی سازشوں کے نتیجہ میں احرار کے سینکڑوں کارکن نہ صرف قید و بند کی صعوبتوں بلکہ گولیوں کا نشانہ بن گئے۔ آج بھی احرار کے "بقیتہ السیف" "تحفظ ختم نبوت" کے نام سے قادیانیت کے استیصال کو اپنا مقصد حیات بنائے ہوئے ہیں۔ قادیانیت کے خلاف بے پناہ کام کے اجلے عنوانات اس ادارہ کا وہ کارنامہ ہے جس کی بنیاد پر ادارہ عند اللہ و عند الناس ان شاء اللہ سرخرو رہے گا۔ ہزاروں رضاکار، سینکڑوں کارکن اور سینکڑوں آتش نوا مقررین نے احرار کے پلیٹ فارم سے اٹھ کر ملک کو یہ شعور دیا کہ قادیانیت کفر کا دوسرا نام ہے۔ عوامی سطح پر اس شعور کی بالیدگی "احرار" کے بغیر ناممکن تھی اور اس میں بھی شک نہیں کہ خاص اس محاذ پر علامہ کشمیری احرار کی پرجوش قیادت فرما رہے تھے۔ اس لئے کہا جا سکتا ہے کہ موصوف نے اس مقصد کے لئے احرار ہی کو اپنا مکتبۂ فکر اور دائرہ عمل بنایا۔

کشمیر کمیٹی

۱۹۳۰ء میں مسائل کشمیر سے نمٹنے کے لئے ایک کمیٹی قائم کی گئی جس کا سربراہ خلیفۂ قادیان (مرزا بشیر الدین محمود) کو قرار دیا گیا۔ اس کمیٹی کے ایک رکن علامہ اقبال بھی تھے چونکہ کشمیر میں مسلم اکثریت ہے اور انہیں کے مطالبہ پر اس کمیٹی کا قیام عمل میں آیا تھا اس لئے مسلم حلقوں میں خلیفۂ قادیان کے تقرر سے ہیجان ہو گیا۔ اول تو اس وجہ سے کہ مسلمانوں کے تصفیہ طلب مسائل کے لئے ایک قادیانی کو مقرر کرنا اس بات کا اعلان تھا کہ قادیانی مسلمان ہیں حالانکہ تمام امت متفقہ طور پر قادیانیوں کو مرتد قرار دے چکی ہے۔ دوسرے عام قادیانیوں کے بارے میں یہ تجربہ سے ثابت ہے کہ وہ اپنے دائرہ کار میں قادیانیت کی پرجوش تبلیغ کرتے ہیں۔ سر ظفر اللہ خان کی اس سلسلہ کی کوششوں سے جو لوگ واقف ہیں وہ اس امر کی تصدیق کریں گے اس لئے یا تو بشیر الدین محمود کشمیر کے مسلم اکثریت کے ایمان کو تباہ و برباد کرتا یا اپنے تبلیغی مشن میں ناکامی کے باعث مسلمانوں کے مسائل کو کمیٹی کی سطح پر خوفناک نقصان پہنچاتا اور عجب نہیں کہ

کچھ ایسے ہی سیاسی مقاصد کے پیش نظر سوچ سمجھ کر یہ تقرر کیا گیا ہو۔ علامہ کشمیری اس صورت حال سے مضطرب ہو گئے۔ مذکورۃ الصدر خطرات و اندیشوں کے تحت آپ نے اس تقرر کے خلاف اول تو خود مہاراجہ کشمیر کو اور کشمیر کے بعض ذمہ دار اشخاص کو احتجاجی خطوط لکھے اور ساتھ ہی مجلس احرار کو ہمہ گیر احتجاج پر آمادہ و تیار کیا۔ ڈاکٹر اقبال جن سے آپ کے تعلقات پہلے سے تھے وہ اب تک قادیانیت کے مضر پہلوؤں سے تقریباً ناواقف تھے۔ اسی زمانہ میں علامہ نے موصوف کو طویل خط لکھ کر فتنۂ قادیانیت کی زہر چکانیوں سے مطلع کیا۔ ڈاکٹر اقبال نے بعد میں کشمیر کمیٹی سے استعفاء بھی دے دیا بلکہ وہ فتنۂ قادیانیت کے استیصال کے محاذ پر ایک پرجوش داعی ہو گئے۔ چنانچہ اس زمانہ میں انڈین نیشنل کانگریس کے صدر (نہرو) نے اپنے ایک مضمون میں ہندوستانی مسلمان کو قادیانیت کی تائید کا مشورہ دیا اور اس دلیل کے ساتھ کہ قادیان کا پیغمبر ہندوستانی ہے۔ اور ان کے مقدس مقامات بجائے مکہ اور مدینہ کے خود ہندوستان میں ہیں ان سے وابستگی کے نتیجہ میں وطن پروری کے جذبات پیدا ہوں گے اور ایک غیر ملکی مذہب سے دلچسپیاں کٹ کر وطن ہی میں پیدا ہونے والے مذہب سے راہ و رسم بڑھے گی۔ جس کا منطقی نتیجہ وطنیت کے جذبات سے معمور ہونا ہے۔

اس نظریہ کے آخری محرک ڈاکٹر شنکر داس مہرا تھے جو حال ہی میں سرگباش ہوئے ہیں۔ صدر کانگریس کے اس مضمون پر علامہ اقبال نے انگریزی زبان میں مسلسل کئی قسطوں میں بھرپور تنقید کی۔ کم لوگوں کو اس کا علم ہے کہ اقبال کے ان دین پرور خیالات کی تعمیر میں حضرت شاہ صاحب کا بڑا حصہ تھا۔

(نقشِ دوام (سوانح علامہ محمد انور شاہ کشمیری) (از انظر شاہ مسعودی) ص ۱۸۷ تا ۱۸۹)

❖

امیر شریعت

نے فرمایا

نوجوانو!

دوسروں کی عزت کی حفاظت کرنا اپنا فرض سمجھو، اللہ تمہاری عزت کی حفاظت کرے گا۔ اللہ کے فوجی بن جاؤ پھر دیکھو کیا ہوتا ہے؟

تمہارے لئے دن رات دعا کرتا ہوں۔ اب چمن اور اس کی شاخیں تم نوجوانوں کی باغبانی کے سپرد ہیں۔ اپنی ذات پر اعتماد قائم رکھو۔ قوموں کی زندگی ایک تسلسل کا نام ہے اس تسلسل کو زندہ رکھو۔ جب تک جیو، وضع داری سے جیو، کہ یہی ایمان کی نشانی اور حاصل زندگانی ہے۔

مرکزی دفتر: دار بنی ہاشم
مہربان کالونی ملتان

تحریک طلباء اسلام پاکستان

مولانا محبوب الٰہی رح

خانقاہ سراجیہ اور سید الاحرار رحمہ اللہ

خانقاہ سراجیہ مجددیہ کندیاں ضلع میانوالی۔ برصغیر پاک و ہند کے عظیم روحانی و علمی مراکز میں سے ایک ہے۔ اس خانقاہ کی بنیاد ۱۹۲۰ء میں امام العلماء و الصوفیاء حضرت مولانا ابواسعد احمد خان رحمہ اللہ تعالی نے رکھی۔ ۱۹۴۱ء میں آپ کی رحلت کے بعد آپ کے نامزد جانشین امام نقشبندیہ، حضرت ثانی مولانا محمد عبداللہ لدھیانوی رحمہ اللہ تعالی (فاضل دار العلوم دیوبند) نے مسند ارشاد کو زینت بخشی۔ پھر حضرت ثانی رحمہ اللہ تعالی کے وصال (۱۹۵۶ء) کے بعد حضرت الشیخ مولانا خواجہ خان محمد فیوضہم سجادہ نشین ہوئے۔

خانقاہ کے بزرگان کو شروع دن سے مجلس احرار اسلام کے اراکین و معاونین، اس کے اکابر اور خصوصاً سید الاحرار حضرت امیر شریعت رحمہ اللہ تعالی سے شفقت و محبت اور ہمدردی و تعاون پر مبنی خاص تعلق رہا ہے۔ الحمد للہ یہ تعلق آج بھی قائم و دائم ہے۔

خانقاہ کی مطبوعہ تاریخ "تحفہ سعدیہ" میں حضرت امیر شریعت اور احرار کے حوالہ سے کئی تاریخی باتیں محفوظ کردی گئی ہیں۔ ذیل میں ایسی تمام روایات کو مرتب انداز میں پیش کیا جارہا ہے۔ (کفیل)

حضرت مولانا انور شاہ کشمیری کی خانقاہ سراجیہ میں تشریف آوری۔

حضرت انور شاہ صاحب کشمیری مولانا حسین علی صاحب کی دعوت پر میانوالی تشریف لائے۔ تشریف آوری کا مقصد بعض فروعی مسائل شرعیہ پر تصفیہ و تحقیق تھا اس اجتماع میں مولانا بدر عالم، مولانا حبیب الرحمن صاحب لدھیانوی، مولانا مرتضی حسن، سید عطاء اللہ شاہ صاحب بخاری رحمھم اللہ تعالی اور دیگر اکابر علماء شریک تھے۔ حضرت مولانا احمد خان صاحب ملاقات کے لیے میانوالی تشریف لے گئے اور خانقاہ سراجیہ آنے کی دعوت دی جسے حضرت انور شاہ صاحب نے قبول فرمالیا۔ علامہ کشمیری کی موجودگی میں مولانا حسین علی صاحب نے فرمایا کہ حضرت احمد خان صاحب میرے پیر بھائی اور ہم مسلک ہیں مگر بدعات کی تردید میں شدت اختیار نہیں کرتے حالانکہ قرآن عزیز میں واغلظ علیھم کی نص قطعی موجود ہے۔ حضرت اعلی نے فرمایا کہ یہ آیہ مبارکہ جہاد سے متعلق ہے اور اس کا مصداق کفار ہیں جس پر شدت کا حکم دیا گیا ہے۔ مگر دین کی تبلیغ و اشاعت کے سلسلہ میں فقولا لہ قولا لینا کا ارشاد ہے۔ علامہ کشمیری نے اعلی حضرت کی رائے مبارک سے اتفاق فرمایا۔

حضرت سید عطاء اللہ شاہ بخاری کے لئے دعاء۔

حضرت خان محمد صاحب قبلہ سجادہ نشین خانقاہ سراجیہ نے بیان فرمایا کہ حضرت سید عطاء اللہ شاہ صاحب بخاری راولپنڈی جیل میں اسیر تھے وہاں مولانا ظہور احمد بگوی بھیروی نے ان سے ملاقات کی۔ شاہ جی نے مولانا کے ہاتھ اعلی حضرت کی خدمت میں یہ پیغام بھیجا کہ آپ زندہ ہوں اور میں جیل کی کال کوٹھڑیوں میں بند رہوں، یہ بات مناسب نظر نہیں آتی۔ مقصود رہائی کے لئے دعا کی درخواست تھی حضرت سجادہ نشین نے فرمایا کہ میں ان ایام میں

بھیرہ میں درسیات عربیہ کا طالب علم تھا۔ مولانا موصوف نے یہ پیغام مجھے پہنچایا۔ میں اعلیٰ حضرت کی خدمت میں حاضر ہوا اور شاہ جی کا پیغام دیا۔ حضرت اعلیٰ نے فرمایا اگر علالت طبعی حائل نہ ہوتی تو میں شاہ جی کو ایک دن بھی جیل میں نہ رہنے دیتا۔ اس کے بعد لدھارام والے مشہور کیس کی سماعت شروع ہوئی یہ اعلیٰ حضرت کی توجہ اور دعا کی تاثیر تھی کہ شاہ صاحب نے اس اسیری اور بھیانک سازشوں پر مبنی مقدمہ سے نجات پائی۔

اصل فتنہ کی نشان دہی۔

جن ایام میں مسجد شہید گنج کی تحریک زوروں پر تھی اور اہل اسلام میں ہر فرد ولولہ و جوش کا مرقع تھا، حضرت اعلیٰ نے مجلس احرار کو ایک گرامی نامہ تحریر فرمایا جس میں لکھا کہ مسجد شہید گنج اگر مسلمانوں کے ہاتھ سے چلی جارہی ہے تو اس کا غم نہ کریں، اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے مساجد پھر بھی تعمیر کی جاسکیں گی۔ ان کی حیثیت ہر حال میں ثانوی ہے۔ اسلام کے تحفظ و بقا کو اولین اہمیت حاصل ہے اور اصل فتنہ موجودہ دور میں مرزائیت کا ہے جو وجودِ اسلام کو مٹانا چاہتا ہے، اس کے خلاف جہاد جاری رکھنا چاہیئے اگر اسلام محفوظ رہا تو مساجد کی کمی نہ رہے گی۔ لہذا بقائے اسلام کی خاطر اپنی تمام کوشش و ہمت کو مبذول کرنا چاہیئے۔

مولانا حبیب الرحمن صاحب لدھیانوی، حضرت عطاء اللہ شاہ صاحب بخاری اور دیگر اکابر احرار فرمایا کرتے تھے کہ حضرت عبد القادر رائے پوری اور حضرت اعلیٰ مولانا احمد خان صاحب وہ مبارک ہستیاں ہیں جنھوں نے مسجد شہید گنج کے سلسلہ میں ہمیں صحیح مشورے دیئے اور ہمیشہ ہماری حوصلہ افزائی فرمائی۔

تحفظ ختم نبوت سے والہانہ لگاؤ۔

حضرت اقدس مولانا محمد عبد اللہ اسلام اور داعی اسلام علیہ الصلوۃ و السلام کی حرمت و ناموس کو عقیدۂ ختم نبوت کی اساس سمجھتے تھے۔ چنانچہ آپ اس عقیدہ کو ایمان کا موقوف علیہ تصور فرماتے ہوئے اس کے تحفظ کے سلسلہ کو حرز جان کی طرح اولین اہمیت دیتے تھے۔ ختم نبوت کے منکروں اس عقیدہ میں من گھڑت تاویلات کرنے والوں اور جعلی نبوت کے قائلین کو اسلام کا سب سے بڑا دشمن گردانتے تھے۔ ۱۹۵۳ء میں جب تحریک ختم نبوت ابھری، تو آپ نے اس کی پوری طرح پشت پناہی فرمائی۔ عقیدۂ حق کا اعلان کرنے والوں کی گرفتاریاں شروع ہوئیں اور ان پر گولیاں برسنے لگیں۔ جہاں جہاں آپ کے متوسلین تھے، انہوں نے اس تحریک میں سرگرمی سے حصہ لیا خود آپ نے مرکز میں رہ کر اس تحریک کی قیادت فرمائی، موجودہ سجادہ نشین حضرت خان محمد صاحب قبلہ کو برملا اعلانِ حق کرنے اور میانوالی اجلاس منعقد کرنے کے لئے بھیجا۔ حضرت قبلہ تعمیل ارشاد کے پیش نظر قید و بند کی صعوبتوں سے بے نیاز میانوالی تشریف لے گئے اور خود کو گرفتاری کے لیے پیش کردیا۔ پہلے میانوالی جیل میں رہے پھر بورسٹل جیل لاہور منتقل کردیے گئے بعد ازاں اس تحریک کو دبانے کے لئے اس دور کے وزیر اعظم خواجہ ناظم الدین نے حدود لاہور میں جو تحریک کا سب سے بڑا عملی مرکز تھا مارشل لاء[1] نافذ کردیا۔ مولانا غلام غوث ہزاروی

(۱) بدنام زمانہ بے دین جنرل اعظم خان کو مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر مقرر کیا جس نے پہلی مرتبہ اسلام کے نام پر حاصل کی گئی مملکت میں ناموس رسالت کے تحفظ کیلئے نکلنے والے مسلمانوں پر گولیاں برسائیں اور ہلاکو اور چنگیز کی داستان کو زندہ کیا دس ہزار مسلمان اس ظالم جرنیل کے حکم سے چلائی جانے والی گولیوں سے شہید ہوئے۔

علیہ الرحمتہ کے متعلق حکم دے دیا گیا کہ جہاں ملیں انہیں گولی مار دی جائے۔ مولانا ہزاروی حضرت اقدس کے حلقہ ارادت میں شامل تھے آپ کو ان کی حفاظت جان کی فکر ہوئی انہیں لاہور سے خانقاہ شریف خاص حکمت عملی سے لایا گیا۔ پھر کسی محفوظ و مخفی مقام پر حالات درست ہونے تک رکھا گیا۔ پھر جب لاہور میں اس تحریک کے سلسلہ میں تحقیقاتی کمیشن بیٹھا تو منکرین ختم نبوت کے خارج از اسلام ہونے اور عقیدہ ختم نبوت کو اسلام کا بنیادی عقیدہ ثابت کرنے کے لیے علماء اسلام کا بورڈ حکیم عبد المجید سیفی کے مکان بیڈن روڈ پر بیٹھا متعلقہ کتب فراہم کی گئیں۔ تحریک مرزائیت لعن اللہ بانیہا سے متعلق تمام لٹریچر جمع کیا گیا۔ علماء کرام ختم نبوت کے عظیم الشان مسئلہ کے اثبات میں کتابوں سے حوالے تلاش کر کے فراہم کرتے رہے۔ حتیٰ کہ مودودی جماعت کے افراد بھی حکیم عبد الرحیم اشرف لائلپوری (فیصل آباد) کی سرکردگی میں اس مرکز تحقیق سے اپنے لیے کار آمد مواد حاصل کر کے لے جایا کرتے تھے۔

حضرت قبلہ کی اسیری

۱۹۵۳ء میں تحریک ختم نبوت نے زور پکڑا تو امت مسلمہ کے ہر فرد و بشر نے جذب و مستی سے سرشار ہو کر اس میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ جاں نثارانِ حضرت ختمی مرتبت ﷺ، فدایان ناموس رسالت، عاشقان رحمتہ للعالمین علمبرداران پیغام آخریں دریائے خوں سے گزر کر تاریخ امت میں ایک نئے باب کا اضافہ کر رہے تھے اور اپنی جاں نثاری سے روایات عشق و محبت کو دوام بخش رہے تھے

نہ جب تک کٹ مروں میں خواجۂ یثرب کی حرمت پر
خدا شاہد ہے کہ کامل میرا ایماں ہو نہیں ہوسکتا

اس سلسلے میں علماء کرام کی گرفتاریاں شروع ہوئیں۔ حضرت قبلہ خان محمد صاحب جیسا کہ اجمالاً مذکور ہو چکا ہے حضرت ثانی کے ارشاد سے میانوالی تشریف لے گئے اور اپنے آپ کو گرفتاری کے لیے پیش کیا۔

اے عاشقان ختم نبوت بشارتے
زنداں دہد بہ صدق شما ہم شہادتے

چنانچہ آپ ۵ اپریل ۱۹۵۳ء کو سیفٹی ایکٹ کے تحت گرفتار ہونے کے بعد میانوالی جیل بھیج دیے گئے اور ۲۵ اپریل ۵۳ء کو میانوالی سے سنٹرل جیل لاہور منتقل کر دیے گئے۔ ۲۸ اپریل ۱۹۵۳ء کو بورسٹل جیل جانا پڑا۔ جہاں سے پھر ارباب بست و کشاد نے ۱۱ اگست کو سنٹرل جیل منتقل کر دیا۔ جب سنٹرل جیل کی کال کوٹھڑیوں میں آپ اسیری کے ایام بسر کر رہے تھے، آپ سے متصل احاطہ میں درج ذیل حضرات اسیر تھے۔

۱۔ امیر شریعت حضرت سید عطاء اللہ شاہ صاحب بخاری رحمہ اللہ تعالیٰ
۲۔ مولانا محمد علی جالندھری رحمہ اللہ تعالیٰ
۳۔ مولانا ابوالحسنات قادری رحمہ اللہ تعالیٰ
۴۔ مولانا ابوالحسنات کے صاحبزادے مولانا خلیل احمد صاحب مدظلہ
۵۔ مولانا عبد الحامد بدایونی صاحب

۶۔ صاحبزادہ فیض الحسن صاحب

۷۔ مولانا عبد الستار خان نیازی

۸۔ جناب سید ابو الاعلیٰ مودودی صاحب وغیرہم

اس دور کا ایک دلچسپ واقعہ خود حضرت قبلہ نے بیان فرمایا کہ ایامِ اسیری میں عید الاضحیٰ آگئی اور ہم سب حضرت شاہ جی کی زیارت کے لئے ان کے احاطہ میں چلے گئے۔ اسی اثناء میں مودودی صاحب، نصر اللہ خان عزیز اور تقی علی نقی صاحب بھی حضرت شاہ جی سے ملنے کے لیے آگئے۔ آپ انہیں باوقار انداز سے ملے اور خیر و عافیت پوچھی۔ مودودی صاحب کو پنڈلی پر پھوڑے اور پھنسیاں نکلی ہوئی تھیں۔ شاہ جی نے دیکھا تو از خود علاج تجویز فرمایا کہ فینائل پانی میں گھول کر لگائیں انشاء اللہ آرام آجائے گا۔ چند لمحوں بعد مودودی صاحب اپنے ہمراہیوں سمیت اٹھ کھڑے ہوئے اور رخصت چاہی شاہ جی اور آپ کے عقیدت مند بھی ان حضرات کی مشایعت کے لیے چل پڑے۔ شاہ جی نے مودودی صاحب سے چلتے ہوئے دریافت کیا کہ آپ کہاں جا رہے ہیں مودودی صاحب نے جواب دیا کہ میں احاطہ بم کیس جا رہا ہوں۔ وہاں دوستوں نے نمازِ عید کا اہتمام کیا ہوا ہے۔ اس پر شاہ جی نے پوچھا کیا جیل میں نمازِ عید جائز ہے؟ مودودی صاحب نے جواب دیا کہ اگر کوئی پڑھ لے تو ہو جاتی ہے، نہ پڑھے تو کچھ مضائقہ نہیں۔ شاہ جی نے فرمایا کہ یہ تو کوئی فتویٰ نہ ہوا۔ اس کے بعد مودودی صاحب نے کہا کہ میں یہاں جیل میں جمعہ نہیں پڑھتا۔ شاہ جی نے جواب دیا کہ جمعہ تو میں بھی نہیں پڑھتا۔ مگر میرا نہ پڑھنا حضرت امام اعظم علیہ الرحمۃ کی تقلید کے باعث ہے اور آپ میں رگ دوسری ہے۔ شاہ جی کے اس تبصرے پر مودودی صاحب بھنا گئے اور آگے چل دیے۔

شرافت اور بہادری

شریف کبھی بزدل نہیں ہوتا اور کمینہ کبھی بہادر نہیں ہوتا۔ کمینہ پر جب کبھی ابتلاء آتی ہے تو دشمن کے سامنے ایڑیاں رگڑتا ہے ـــــ اور شریف۔!

جب دشمن اس کے قابو میں آتا ہے تو اسے معاف کر دیتا ہے اور ماضی کے کسی واقعہ پر اسے مطعون بھی نہیں کرتا ہے۔

میاں صلی اللہ علیہ وسلم کی شرافت اور بہادری دیکھئے جب حضرت عمر نے ایمان لانے کے بعد عرض کیا: "حضور کعبہ میں کیوں نماز نہیں پڑھتے؟" تو فرمایا کہ: "تیری قوم نہیں پڑھنے دیتی" ـــــ حال آنکہ

کعبہ میں نماز پڑھنے میں ایک رکاوٹ خود حضرت عمر تھے۔ مگر یہ نہیں فرمایا کہ تم نہیں پڑھنے دیتے تھے۔ سبحان اللہ! سبحان اللہ! کیا شرافت ہے۔

(امیر شریعت)

فصیح اللسان

خواجہ عبد الحئی فاروقیؒ
(جامعہ ملیہ دہلی)

جامعہ ملیہ اسلامیہ میں جب گرمیوں کی چھٹیاں ہوئیں تو میں امرتسر آیا اور مسجد خیر الدین میں مغرب کی نماز پڑھنے کے لئے گیا تو وہاں پہلی مرتبہ حضرت مولانا سیّد عطاء اللہ شاہ بخاری سے نیاز حاصل ہوا۔ مولانا عطاء اللہ حنیف بھوجیانی نے میرا تعارف ان سے کرایا شاہ صاحب رحمتہ اللہ علیہ اس وقت بالکل نوجوان تھے۔ ایسا اندازہ ہوتا تھا کہ وہ بیس پچیس سال کے نوجوان ہیں۔ ملنے کے ساتھ ہی انہوں نے فرمایا کہ تمہاری کتاب "بصائر" نے میری آنکھیں کھول دی ہیں۔ یہ ملاقات چند لمحات سے زیادہ نہ تھی۔ میں پھر علی گڑھ واپس چلا گیا۔ جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے۔ یہ ۱۹۲۱ء کی بات ہے اور میری یہ کتاب تمام ہندوستان میں پھیل چکی تھی۔ اس میں فرعون اور بنی اسرائیل کے واقعات قرآن کریم سے جمع کئے تھے۔ اور ترتیب اس طرح دی گئی تھی کہ پڑھنے والا فوراً یہ سمجھ جاتا تھا کہ اس کا ایک ایک لفظ ہم مسلمانوں پر منطبق ہوتا ہے۔ یعنی فرعون کے فرائض انگریز ادا کر رہا ہے۔ اور ہم سب کے ساتھ وہی سلوک ہو رہا ہے جو بنی اسرائیل کے ساتھ فرعون کرتا تھا۔

اس ابتدائی ملاقات کے بعد موسم گرما اور موسم سرما کی تعطیلات میں وطن آتا جاتا رہا۔ اور کہیں نہ کہیں حضرت شاہ جی رحمتہ اللہ علیہ سے نیاز حاصل ہو جاتے گورداسپور میں مرزا بشیر الدین محمود قادیانی کے ساتھ شاہ جی مرحوم کا مقدمہ چل رہا تھا۔ جب فیصلہ کا دن آیا تو میں بھی فیصلہ سننے والوں میں موجود تھا۔ شام کو مغرب کے بعد تمام مسلمانانِ گورداس پور نے جلسہ منعقد کیا جس کی صدارت کے فرائض میں نے ادا کئے۔ حضرت مرحوم نے کئی گھنٹہ تک بڑی بصیرت افروز اور دل آویز تقریر فرمائی۔

دسمبر کی تعطیلات میں مجھے ایک مرتبہ لاہور آنے کا اتفاق ہوا۔ موچی دروازہ کے باہر حضرت شاہ جی کی تقریر کا اعلان تھا۔ میں بھی تقریر سننے کے لئے گیا۔ عشاء کے بعد حضرت شاہ جی تقریر کے لئے کھڑے ہوئے میدان میں تِل رکھنے کو جگہ نہ تھی۔ فجر کی اذان پر تقریر ختم ہوئی۔ لطف یہ تھا کہ تمام رات اس سخت سردی میں لوگ بیٹھے غور سے سنتے رہے مجھے نہیں یاد پڑتا کہ کوئی شخص بھی اٹھ کر جلسہ گاہ سے چلا گیا ہو۔

جولائی ۲۵ء میں جامعہ ملیہ اسلامیہ علی گڑھ سے دہلی منتقل ہوا۔ میں نے قرول باغ گوردوارہ روڈ میں اپنا مکان بنایا تو اس کے سب سے پہلے مکین حضرت شاہ جی رحمتہ اللہ علیہ ہی تھے وہ میرے پاس تین دن مہمان رہے۔ اس کے بعد بھی جب آپ دہلی تشریف لاتے تو میرے غریب خانہ پر ان کا پہنچنا ضروری تھا۔ ورنہ میں ان کے وعظ و ارشاد کی مجلس میں حاضر ہو جاتا۔

ایک مرتبہ میرے مکان پر ایک مجلس منعقد ہوئی جس میں حضرت شاہ جی مرحوم کے علاوہ مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی مرحوم، شیخ حسام الدین صاحب اور ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب (شیخ الجامعہ) شریک تھے۔ قریباً

مغرب کی نماز تک مختلف تعلیمی مسائل پر بحث و مذاکرہ ہوتا رہا۔

جب حضرت شاہ جی ملتان جیل میں قید تھے مجھے خط بھیجا کہ جگر مراد آبادی مرحوم کا جتنا کلام مکتبہ جامعہ شائع کر چکا ہے سب میرے پاس قیمتاً بھیج دو۔ میں نے ان کے ارشاد کے مطابق حضرت جگر کا تمام کلام ہدیتہً ان کی خدمت میں ملتان بھیج دیا۔ آپ جب رہا ہو کر دہلی پہنچے تو جامعہ کے ہال میں انہوں نے دو گھنٹہ تک بڑی بصیرت افروز تقریر فرمائی۔ اس جلسہ کی صدارت کے فرائض بھی میرے سپرد تھے۔ جلسہ گاہ میں تِل رکھنے کو جگہ نہ تھی۔ دہلی کے تمام چیدہ چیدہ حضرات موجود تھے۔

یہ غالباً میری آخری ملاقات تھی۔ میں نے شاہ جی رحمتہ اللہ علیہ جیسا بہادر جاں باز اور حق پر ثابت قدم رہنے والا کوئی نہیں دیکھا۔ انہوں نے حریت و آزادیٔ وطن کے لئے جو راہ اختیار کی مرتے دم تک اس پر ثابت قدم رہے۔ اور ایک انچ ادھر ادھر نہیں رہے۔ انکی تقریر ایسی دل آویز اور دل فریب ہوتی تھی کہ ان کا شدید ترین دشمن بھی جب جلسہ گاہ میں آجاتا تو جلسہ ختم ہوئے بغیر وہ اٹھنے کا نام نہیں لیتا تھا۔

حضرت شاہ جی رحمتہ اللہ علیہ کی ایک خصوصیت ایسی تھی جو میں نے کسی لیڈر میں نہیں دیکھی میں جب پہلی مرتبہ ان سے امرتسر میں ملا تو وہ نہایت فصیح اور بلیغ اردو میں باتیں کرتے تھے۔ میں یہ سمجھا کہ وہ دہلی یا لکھنؤ کے رہنے والے ہیں۔

پھر جب ایک مرتبہ موچی دروازہ کے باہر ان کی تقریر پنجابی زبان میں سنی تو مجھے اس بات کا یقین کرنے سے کوئی چیز روک نہ سکی کہ وہ لاہور یا امرتسر کے رہنے والے ہیں۔

ایک مرتبہ میں نے ان کو بہاریوں کے مجمع میں گفتگو کرتے دیکھا۔ تو مجھے اپنا ہی خیال بدلنا پڑا اور یہ یقین کرنے پر مجبور ہو گیا کہ وہ خالص بہاری ہیں۔ ان کے لب و لہجہ سے بالکل شبہ نہیں ہوتا تھا کہ وہ بہار کے رہنے والے نہیں۔ یہ اللہ تعالیٰ کا خاص فضل و کرم تھا جو صرف انہیں کے حصہ میں آیا تھا۔

آج وہ بلبل ہزار داستان ہم میں موجود نہیں مگر ان کی یاد ہر دل میں تازہ ہے۔ اور تازہ رہے گی۔

اللھم اغفرلہ آمین و حسرتا

مقامِ انبیاء

انبیاء۔۔۔۔

نہ آتے تو

کائنات

ایک ایسی کتاب ہوتی جس کے ابتدائی اور آخری صفات کھو گئے ہوں۔

یہ چیز انبیاء ہی کی معرفت بنی نوع انسان کو ملی ہے کہ انسان اور اس کے رب کے مابین کیا رشتہ ہے۔

امیر شریعت

مولانا محمد حنیف ندویؒ

عظیم خطیب اور عظیم مجاہد

شاہ جی کے انتقال سے ملک ایک سحر طراز خطیب اور شیوا بیان مقرر سے محروم ہوگیا ہے۔ بہ حیثیت فن کے خطابت اور تقریروں کا چونکہ ایک خاص موسم ہوتا ہے جو اپنی تمام بہار آفرینیوں کے ساتھ گزر چکا، اس لیے اگر یہ کہا جائے کہ مستقبل بعید میں بھی کسی ایسے شعلہ مقال خطیب کے پیدا ہونے کی توقع نہیں کی جا سکتی تو اس میں قطعی مبالغہ و غلو کی آمیزش پائی نہیں جاتی۔

وہ عظیم شخص جس کی مؤثر اور دلاویز تقریروں سے آج سے پچیس تیس سال پہلے پورا ہندوستان گونج رہا تھا، آہ! آج آسودہ لحد ہے۔ اب وہ بلبلِ ہزار داستان، جس کی چہک سے چمن زارِ وطن کا پتا پتا اور بُوٹا بُوٹا گویا تھا، آج ہمیشہ ہمیشہ کے لیے خاموش ہوگیا ہے۔

جن لوگوں نے شاہ جی کی تقریروں اور خطبوں سے براہ راست استفادہ نہیں کیا، ان کے سامنے ان کے خطیبانہ کمالات کا نقشہ کھینچنا مشکل ہے۔ ہاں۔! اگر دریا کی روانی کا کوئی تصور آپ کے ذہن میں پایا جاتا ہے۔ پھولوں کی نزاکت اور مہک سے آپ آشنا ہیں۔ آگ کے شعلوں کو آپ نے دیکھا ہے اور کسی ایسے فن کار کو سنا ہے جو نغموں کے ساتھ ساتھ اثر و سحر اور کیف و وجد کی کیفیات کو بھی سامعین کے دلوں میں اتار سکتا ہو، تو آپ کو شاہ جی کی جامعیت تقریر کا کچھ کچھ اندازہ ہو سکے گا۔ مگر ٹھہریے۔! ابھی نقشے کے تمام رخ آپ کے سامنے نہیں آ پائے۔ شاہ جی کی تقریروں میں شیر کی گرج، شاعر کے احساسات اور صوفی و عارف کے اخلاص و سر مستیوں کو بھی شامل کیجیے، جب کہیں جا کر ان کی خطیبانہ خصوصیات فہم و فکر کی گرفت میں آسکیں گی۔

یہ خوشی کی بات ہے کہ شاہ جی کی موت پر قریب قریب ہر حلقے نے اظہار افسوس کیا ہے، اور ان کی خدمات کے پیش نظر ایسا ہونا بھی چاہیے تھا۔ مگر افسوس ہے اس سلسلے میں ان کے سیاسی افکار و معتقدات کی ایک غلط بحث خواہ مخواہ چھڑ گئی ہے۔ دیکھنے کی چیز یہ نہیں کہ ان کا تعلق ماضی میں کس سیاسی جماعت سے رہا ہے اور اپنی معاصر سیاسی جماعتوں کے بارے میں انہوں نے کس موقف کو اپنے لیے پسند کیا ہے، اسکے برعکس دیکھنے کی چیز یہ ہے کہ شروع سے زندگی کا جو نقشہ انہوں نے تجویز کیا، کیا سر مو اس سے منحرف ہوئے؟ اور جن خیالات و تصورات کو انہوں نے اپنایا، ان کی پوری پوری قیمت ادا کی یا نہیں؟ اس سے بھی زیادہ جو چیز انکی شخصیت کو نکھارنے والی ہے، وہ ان کی بے نظیر جرأت و بے باکی ہے۔ سوال یہ ہے کہ جس جگرداری کے ساتھ انہوں نے انگریز سے ٹکر لی ہے، جس بہادری اور حوصلہ مندی کے ساتھ انہوں نے قید و بند کی سختیوں کو جھیلا ہے، اس کی کوئی مثال انکے حریفوں میں تلاش کی جاسکتی ہے؟

شاہ جی کی عظمت کا راز انکی عزیمت میں ہے، ان کے ایثار میں ہے، ان کی درویشی و فقر میں ہے، ان کے غنا اور بے نیازی میں ہے، ملک سے وفاشعاری میں ہے اور راہ و رسم دوستی کی استواریوں میں ہے۔

ان پر زبان اعتراض دراز کرنے والے اپنے گریبانوں میں جھانک کر دیکھیں کیا اس متاع گراں مایہ کے کسی حصے کو بھی ان کے دامن کردار نے سمیٹا ہے؟ ان میں یہ جتنی خوبیاں مبدأفیاض کی طرف سے جمع ہو گئی تھیں، ان میں ان کی ایک ایک خوبی ایسی ہے کہ جو کسی شخص کے کردار و سیرت کو چمکا دینے کے لیے کافی ہے۔

شاہ جی اپنی ان خداداد قابلیتوں کے بل پر اگر پیری مریدی کا کاروبار اختیار کرتے تو لاکھوں ہاتھ بیعت کے لیے آگے بڑھتے اور اگر اس محبوبیت و شخصیت سے کوئی مالی فائدہ اٹھانا چاہتے تو سیم و زر کی فراوانیاں ان کا خیر مقدم کرتیں۔ دنیا جانتی ہے کہ شاہ جی نے یہ دونوں کام نہیں کیے۔ کیا یہی ایک چیز انکی عظمت کے لیے کافی نہیں؟

ایک اور پہلو سے ان کی زندگی کا جائزہ لیجئے۔ ہم اس بات کے قائل نہیں ہیں کہ آزادی و حریت کی روشنی کسی ایک ہی دروازے سے داخل ہوتی ہے یا تخت و اورنگ کی بزم آرائیاں تنہا کسی ایک ہی شخص یا جماعت کی کوششوں کی رہین منت ہوتی ہیں۔ روشنی کئی دروازوں سے صحن تک آتی ہے اور تخت و اورنگ کی بزم آرائیوں کے پیچھے کئی تاریخی عوامل ہوتے ہیں، جو کارفرما ہوتے ہیں۔

اگر واقعات عالم و تاریخ کا یہ تجزیہ صحیح ہے تو پھر حصول پاکستان کی کامرانیوں کا انتساب ان تمام تحریکوں اور شخصیتوں کی طرف ہوگا، جنھوں نے براہ راست یا بالواسطہ انگریزی استعمار کو ختم کرنے کی کوششیں کی ہیں، یا ہندو کی اجارہ دارانہ ذہنیت پر کاری ضرب لگائی ہے۔

ترتیب اشیا کو اگر اس انداز سے دیکھئے تو حصول پاکستان کے ضمن میں سید عطاء اللہ شاہ بخاری کا حصہ کسی طرح بھی کم اہم نظر نہیں آئے گا، اس لیے کہ انہوں نے اس وقت انگریز کے قلعۂ اقتدار میں شگاف ڈالے، جب اسکے خلاف لب کشائی کی جرأت کرنا آسان نہیں تھا۔ اس وقت سلطان جابر کے سامنے آزادی و حریت کا کلمہ بلند کیا، جب اس کے صلے میں طوق و سلاسل کی گراں باریوں کو انگیز کرنا لازمی تھا۔ شاہ جی کی سیاسی خدمات کا سلسلہ بہت طویل ہے۔ انہوں نے تحریک ہجرت کا آغاز کیا، خلافت میں جان ڈالی اور ہر اس سیاسی محاذ پر داد شجاعت دی، جس سے انگریز کے پندارِ استعمار کو گزند پہنچ سکتا تھا۔

توحید کی پُرجوش اشاعت اور سنت کی ترویج میں جس والہانہ انداز سے انہوں نے حصہ لیا، اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ عشق رسول کی نزاکتوں اور توحید کے اسرار و رموز کو اس کامیابی سے بیان کرتے تھے، جو کہ صرف انہی کا حصہ تھا۔

اردو بولتے تو معلوم ہوتا تھا کہ غالب اور داغ نے شاعری کو چھوڑ کر خطابت اختیار کر لی ہے اور پنجابی میں تقریر کرتے تھے تو محسوس ہوتا تھا کہ چناب اور راوی نے اپنی روانیاں انہیں بخش دی ہیں۔

آہ! آج ہم ایسی جامع صفات شخصیت سے محروم ہو گئے ہیں۔ ("الاعتصام" لاہور ۸ ستمبر ۱۹۶۱ء)

شفیق اور غیرت مند انسان

مولانا حافظ محمد ابراہیم کمیر پوریؒ

قیام پاکستان کے بعد مجھے تین سال جھنگ شہر میں بحیثیت خطیب رہنے کا موقع ملا۔ ان دنوں میری سرگرمیاں کافی حد تک سیاسی تھیں۔ سٹی مسلم لیگ کے صدر کی حیثیت میں عوامی اور سرکاری حلقوں میں کافی حد تک پذیرائی حاصل کر چکا تھا۔ جھنگ کے دو تین سالہ قیام میں تبلیغی اور مطالعاتی لحاظ سے میرا ذوق مرزائیت سے کہیں زیادہ شیعیت کی طرف مائل ہوا۔ تاہم ۵۰-۱۹۴۹ء میں اللہ رب العزت نے دو کام کرنے کی توفیق مرحمت فرمائی۔

۱۔ "فسانۂ قادیان" میری آج سے ۴۰ سال قبل کی اس کاوش کو اس افراتفری کے دور میں (جبکہ قادیانیت کے خلاف مطبوعہ لٹریچر تقریباً نایاب تھا) غنیمت خیال کیا گیا۔

عظیم الشان تقریر

قیام جھنگ کے دوران دوسرا اہم کام جس کی سعادت مجھے میسر آئی علیہ السلام حضرت امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاری کی خواہش اور ان کی موجودگی میں محلہ شیخ لاہوری گھیانہ کے چوک (مرزائیوں کے گڑھ) میں حیات مسیح کے عنوان پر میری تین گھنٹے کی مدلل اور طویل تقریر ہے۔ تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ ۱۹۵۰ء میں گھیانہ میں مجلس احرار اسلام کی سہ روزہ عظیم الشان کانفرنس ہوئی۔ جس میں تمام اکابر احرار شامل ہوئے اور تین راتیں مرزائیت کے خلاف بڑھ چڑھ کر تقریریں ہوئیں۔ زعمائے احرار کی خطابت تو مسلم تھی لیکن ان کے خطاب کا دائرہ ختم نبوت انبیاء کے تقدس مقام صحابہ اور اہل بیت کے تحفظ مرزا اور مرزائی خلفاء کے لُوز کریکٹر، برطانوی سامراج کی کاسہ لیسی اور مملکت پاکستان میں ان کی منفی سرگرمیوں تک محدود رہتا تھا۔ "حیات مسیح" کا عنوان احرار کانفرنسوں میں کم آتا تھا۔ بہرحال کانفرنس ختم ہوئی اور مرزائیوں نے لمبے چوڑے اشتہار میں عامتہ المسلمین کو یہ تاثر دینے کی کوشش کی کہ حضرت مسیح کی حیات اور نزول ثانی کا عقیدہ اتنا بودا اور بے دلیل ہے کہ احرار اس پر کچھ کہنے سے قاصر ہیں۔ حضرت امیر شریعت کانفرنس کے بعد اپنے کسی نجی کام کے لئے گھیانہ ہی میں تھے کہ قادیانی اشتہار ان کی خدمت میں پہنچا اور ان کے خدام نے اس پر مناسب کارروائی کی ضرورت پر زور دیا۔

آخر کار قرعہ فال اس عاجز کے نام نکلا۔ امیر شریعت کا حکم ہوا کہ میں اس موضوع پر باحوالہ تقریر کروں۔ تعمیل ارشاد کے ساتھ عرض کیا کہ تقریر کے وقت حضرت بنفس نفیس اسٹیج پر رونق افروز ہو کر جلسہ کو باوقار بنائیں۔ اور اس خادم کی حوصلہ افزائی فرمائیں۔ عرض قبول ہوئی۔ جلسہ کامیاب ہوا۔ شاہ جی کی تحسین و آفرین کی برکت سے تقریر کہیں سے کہیں جا پہنچی۔ تقریر کے اختتام پر مجھے گلے لگایا اور فرط شفقت سے منہ

چوم لیا۔ انکی اس ذرہ نوازی سے مجھے بے حد حوصلہ ملا۔ اور خود اعتمادی میں بیش بہا اضافہ ہوا۔
فالله الحمد

۱۹۵۳ء کی تحریک

تحریک کے سلسلہ میں برکت علی ہال لاہور میں آل پارٹیز تحفظ ختم نبوت کنونشن ہوا۔ تو اس میں شرکت کے لئے اس عاجز کو بھی دعوت دی گئی۔ حالانکہ ان دنوں مجھے اپنی جماعت میں کوئی خاص مقام حاصل نہ تھا۔ میرا قیام ان دنوں بدوملہی میں تھا۔ مرزائیت کی تردید اور تحریک کو کامیاب بنانے کے لئے علاقہ بھر میں کام کیا۔ ڈائریکٹ ایکشن کے سلسلہ میں رضا کاروں کا جیش لے کر بدوملہی سے لاہور پہنچا۔ دفعہ ۱۴۴ کی خلاف ورزی اور پولیس سے دھکم پیل کرتے ہوئے مسجد وزیر خان جانے میں کامیاب ہوا۔ اور مسجد پر فوج کا قبضہ ہونے تک مختلف ڈیوٹیاں سرانجام دیتا رہا۔ اور اس دوران حضرت مولنا داؤد غزنوی سے پوری طرح رابطہ رکھا۔ لاہور سے واپسی کے چند دن بعد بدوملہی کے ایک عظیم جلسہ میں آل پارٹیز کے مطالبات کے حق میں ایک زوردار تقریر کی جس کی پاداش میں سیفٹی ایکٹ کا شکار ہوا۔ اور تقریباً دو ماہ سیالکوٹ ڈسٹرکٹ جیل میں نظر بند رہا۔
فالله الحمد

دو اکابر کے مابین سفارت

اس ضمن میں ایک اور سعادت بھی میرے حصے میں آئی۔ تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ مجلس عمل کے تمام ارکان تو ڈائریکٹ ایکشن سے پہلے ہی سندھ کی کسی دور دراز جیل میں پہنچا دیئے گئے تھے۔ ان حضرات کی گرفتاری کے بعد پنجاب خصوصاً لاہور کے جیالوں نے ختم نبوت کے تحفظ کی راہ میں جو دیوانہ وار قربانی دی اور جس ذوق و شوق کے عالم میں جنرل اعظم خان کے فوجی سپاہیوں کی گولیوں کے آگے سینہ سپر ہوئے۔ اور لاہور کی متعدد سڑکوں اور گلیوں کو اپنے مقدس خون سے لالہ زار کیا۔ اس سے پورا ملک ہیجان اور اضطراب کی زد میں آگیا۔ اس وقت کی وزارت داخلہ حالات کو معمول پر لانے کے لئے مذاکرات پر مجبور ہوئی۔ ہائی کمان میں سے صرف مولنا داؤد غزنوی اپنی طویل اور شدید علالت کے باعث جیل سے باہر تھے۔ ملک کے معروضی حالات کے پیش نظر (بعض) محبوس اکابر نے مولنا غزنوی سے رابطہ کیا۔ اور اپنی اس خواہش کا اظہار کیا کہ تحریک باوقار انداز میں ختم کی جائے اور حکومت کو بالائی سطح پر انکوائری پر آمادہ کیا جائے۔ تاکہ فتنہ قادیانیت کی سنگینی اور عالم اسلام خصوصاً پاکستان کے خلاف انکی سازشیں عدالتی ذرائع سے طشت از بام ہو سکیں۔

بعد میں معلوم ہوا کہ امیر شریعت اس طریق کار سے مطمئن نہ تھے۔ یہی وجہ ہے کہ رہائی کے بعد فیصل آباد اور لاہور کے جلسہ ہائے عام میں انہوں نے مولنا غزنوی پر برہمی کا اظہار کیا اور ان کی نظر بندی کے دوران ان کے رفقاء کی خواہش پر مولانا غزنوی نے جو کارروائی کی تھی اسے اپنے مخصوص انداز میں ہدف تنقید بنایا۔ لاہور کے پریس نے اسے خوب اچھالا۔ بایں ہمہ مولنا غزنوی نے بعض جماعتی اور ملی مصالح کے پیش نظر اخبارات میں جوابی بیان شائع کرنا مناسب نہ سمجھا۔ انہوں نے شاہ جی کا جوش ٹھنڈا کرنے اور انہیں اصل

حالات سے آگاہ کرنے کے لئے جیل سے ان کے ساتھیوں کے خطوط اور اسی سلسلہ کی بعض اہم دستاویزات دے کر مجھے اور محترم مولانا محمد اسحاق بھٹی کو شاہ جی کی خدمت میں بھیجا۔ امیر شریعت نے بڑی فراخ دلی سے ہماری معروضات کو سنا اور اصل حالات معلوم ہو جانے کے بعد مولانا غزنوی کی کارروائی کو حق بجانب قرار دیا۔ اس طرح ہماری یہ سفارت دو عظیم شخصیتوں کے مابین عظیم غلط فہمی دور کرنے میں کامیاب رہی۔ (۱)

---

(۱) تحریک مقدس تحفظ ختم نبوت ۱۹۵۳ء میں بعض رہنماؤں کا کردار قابل تحسین نہیں۔ خصوصاً ان کا جو معافی نامے لکھ کر جیل سے رہا ہو گئے تھے۔ حضرت شاہ جی رحمۃ اللہ علیہ ایک عالی ظرف انسان تھے۔ یقیناً انہوں نے مولانا داؤد غزنوی رحمۃ اللہ علیہ کو ہدف تنقید بنایا تھا۔ لیکن مولانا غزنوی سے سابقہ تعلق و محبت اور مجلس احرار اسلام کی رفاقت اور اصل حالات کے انکشاف نے شاہ جی کے دل میں ان کے بارے میں نرم گوشہ پیدا کر دیا۔ مگر جن لوگوں نے مولانا کو تحریک ختم کرنے کے لئے خطوط لکھے یا جو معافی نامے لکھ کر "اپنی مدد آپ" کے تحت رہا ہوئے۔ شاہ جی نے انہیں آخر دم تک معاف نہیں کیا۔ اس تکلیف دہ موضوع پر وہ غضب ناک ہو جاتے اور ان کے جذبات آتش فشاں بن جاتے۔ ۱۹۵۴ء سے ۱۹۵۸ء تک شاہ جی کی مجالس میں بیٹھنے والے حضرات خوب جانتے ہیں کہ وہ اُن بے وفاؤں پر کس طرح برستے تھے۔ اکثر فرمایا کرتے "میں نے اپنی اجتماعی زندگی میں بے شمار تحریکوں میں حصہ لیا اور انہیں پروان چڑھایا۔ ان تحریکوں کے حوالے سے تو کوئی مجھے یہ کہہ سکتا ہے کہ ان سے میرے سیاسی مقاصد بھی وابستہ تھے۔ مگر یہ میری زندگی کی واحد تحریک تھی جو خالصتاً دین کے لئے تھی۔ اس میں میری کوئی سیاسی غرض شامل نہ تھی۔ اس تحریک پر شک کرنا صریحاً ناانصافی ہو گی۔ جن لوگوں نے اس مقدس تحریک میں مجھے دھوکہ دے کر رسوا کیا۔ وہ قابلِ معافی نہیں۔ اتنی اذیت مجھے ساری زندگی نہیں پہنچی۔ اس حادثہ نے مجھے ہلا کر رکھ دیا ہے۔ میں اس کے ذمہ داروں کو معاف نہیں کروں گا۔ اپنی شرافت اور سابقہ دوستی کے حوالے سے خاموش ہوں تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ ان کے بارے میں میری رائے بدل گئی ہے۔ روزِ محشر میں ان کے گریبانوں میں ہاتھ ڈال کر سوال کروں گا کہ آخر تم نے ایسا کیوں کیا؟ (کفیل)

تجھ سے پہلے عام کہاں تھی، دار و رسن کی بات

ایک طرف توپوں کے دہانے ایک طرف تقریر
زنداں میں بھی ساتھ رہی، آزادی کی توقیر،
خوشبو بن کر پھیلی تیرے خوابوں کی تعبیر
ٹوٹ گئی زنجیر

تجھ سے پہلے عام کہاں تھی دار و رسن کی بات
چاروں جانب چھائی ہوئی تھی محکومی کی رات
اپنے بھی تھے ظلم پہ مائل بیگانوں کے ساتھ
آگے بڑھ کر تونے بدل دی ہم سب کی تقدیر
ٹوٹ گئی زنجیر

گلی گلی میں تیرے چرچے، نگر نگر کہرام
بول کے میٹھی بولی تونے کیا تھا جگ کو رام
جب تک قائم ہے یہ دنیا رہے گا تیرا نام
کون مٹا سکتا ہے تیری عظمت کی تحریر
ٹوٹ گئی زنجیر

ہنسی ہنسی میں تونے کھولے اہل ستم کے راز
مرتے دم تک تونے اٹھائے سچائی کے ناز
کہیں دبائے سے دبتی ہے شعلہ صفت آواز
چیر گئی ظلمت کا سینہ لفظوں کی شمشیر
ٹوٹ گئی زنجیر

تیرے خوشہ چین ہوئے ہیں آج بڑے دھنوان
تونے اپنی آن نہ بیچی کیسی تیری شان
بات پہ اپنی جو مٹ جائے وہی ہے بس انسان
شاہ تجھے کہتی ہے دنیا، تو تھا ایک فقیر
ٹوٹ گئی زنجیر

حبیب جالب

مولانا محمد اسحٰق صدیقی سندیلوی

حضرت شاہ جی

میری عمر اس وقت ایسی ہی کچھ سولہ سترہ سال ہو گی۔ طالب علمی کا زمانہ تھا۔ معلوم ہوا کہ حضرت مولانا سید عطاء اللہ شاہ جی الحسنی البخاری لکھنؤ تشریف لا رہے ہیں۔ اور احاطہ شیخ شوکت علی مرحوم میں ان کی تقریر ہو گی۔ یہ وسیع احاطہ میرے مکان سے زیادہ فاصلہ پر نہیں تھا۔ یہاں دارالمبلغین کی طرف سے یکم تا دس محرم وعظ کے جلسے منعقد ہوتے تھے۔ جن کا خاص موضوع شہدائے اسلام کا تذکرہ ہوتا تھا۔ لیکن تقریروں میں ہر قسم کے اسلامی مضامین بیان کئے جاتے تھے۔ اور مسلمانوں کو دینداری اور تقویٰ اختیار کرنے کی دعوت و ترغیب دی جاتی تھی۔ برصغیر کے مشاہیر علماء کو بلایا جاتا تھا۔ اور ان کے مواعظ حسنہ سے مسلمانان لکھنؤ مستفید ہوتے تھے۔ حضرت شاہ جی کو بھی اسی جلسہ میں مدعو کیا گیا تھا۔ اُن کی تقریر و خطابت کی شہرت تو لکھنؤ تک بہت پہلے پہنچ چکی تھی۔ ان کی تشریف آوری کی اطلاع پا کر پبلک ٹوٹ پڑی۔ میں بھی ذوق و شوق کے ساتھ پُہنچا۔ ذرا سویرے ہی پہنچ گیا تھا۔ اس لئے ڈائس کے قریب ہی جگہ مل گئی۔ تقریر بھی سنی اور شاہ جی کو قریب سے دیکھا بھی۔ تقریر شروع ہوئی تو مجمع پر سکتہ طاری ہو گیا۔ تقریر کیا تھی ایک سحر تھا جس نے چند گھنٹہ کے لئے کئی ہزار کے مجمع کو مدہوش کر دیا تھا۔ گرمیوں کا موسم تھا۔ رات چھوٹی ہوتی تھی۔ رات کے دس بجے تقریر شروع ہوئی۔ تقریر ختم ہوئی اور حضرت شاہ جی نے دعا کے لئے ہاتھ اٹھائے۔ دعا اس قدر رقت انگیز اور الحاح خیز تھی کہ "آمین" کی آوازوں میں بھی رقت و گریہ کا زیر و بم صاف محسوس ہو رہا تھا۔ ہم سننے والوں کا احساس یہ تھا کہ تقریر بہت جلد ختم ہو گئی۔ زیادہ سے زیادہ ایک گھنٹہ گزرا ہو گا۔ جب لوگوں نے گھڑیاں دیکھیں تو خبر ہوئی کہ دو بجکر کچھ منٹ آ چکے ہیں۔ اور کئی ہزار کا یہ مجمع چار گھنٹہ سے زیادہ ایک دوسرے عالم میں رہا۔ جہاں لے جا کر شاہ جی نے اسے زمان و مکان سے بے خبر کر دیا تھا۔

یہ پہلا موقع تھا جب میں نے شاہ جی کا نورانی چہرہ دیکھا تھا۔ اور ان کی تقریر سنی تھی۔ تقریر کی تاثیر و لذت تو قلب محسوس ہی کر رہا تھا۔ ان کے نورانی چہرے کی طرف بھی اک کشش محسوس ہوئی اور قلب کو ان کے ساتھ محبت و عقیدت کا ادراک ہوا۔ جس کا سبب غور کرنے سے یہ معلوم ہوا کہ ان کے اخلاص اور ان کے دل کی تڑپ کا دل نے اور ان کے چہرے پر ظاہر ہونے والے نور ایمان کا ادراک آنکھوں نے کر لیا تھا۔

ان واقعات کو مدت دراز گزر چکی ہے۔ مگر حضرت شاہ جی کا تذکرہ ہوتا ہے تو محبت و عقیدت میں تازگی پیدا ہو جاتی ہے۔ یہ کشش کی کیفیت میری طرح بہتوں نے محسوس کی۔ اور ہماری خوش نصیبی تھی کہ شاہ جی اس کے بعد کئی بار لکھنؤ تشریف لائے اور اہل لکھنؤ ان کی تقریر اور ان کی زیارت سے بار بار مستفید ہوئے۔

حضرت شاہ جی صرف صاحب دل نہ تھے بلکہ عالی دماغ بھی تھے۔ اور انکا صاحب بصیرت ذہن بھی ایک

امتیازی شان رکھتا تھا۔ ان کے مخالف اور دشمن بھی ان کی اعلیٰ درجہ کی ذہانت و فطانت کا اعتراف کرنے پر مجبور تھے۔ کمال خطابت کی طرح ان کی سیاسی بصیرت بھی مشہور تھی۔ وہ تقسیم ہند کے خلاف تھے۔ انہوں نے تقسیم ہند کے جن اندوہناک نتائج و اثرات کی پیشین گوئیاں کی تھیں وہ حرف بحرف سچی ثابت ہوئیں۔

شاہ جی نے پاکستان میں مسلمانوں کے باہمی جدال وقتال اور خون خرابہ کی پیشین گوئی کی تھی۔ وہ ہم سب نے اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا۔ دیکھنے والوں میں خاصی تعداد ان لوگوں کی ہو گی جنہوں نے شاہ جی کی زبان سے یہ بات سنی ہو گی۔

حضرت مولانا سید عطاء اللہ شاہ جی بخاری کا شمار ہندوستان کے صف اول کے سیاسی قائدین میں ہوتا تھا۔ ساری عمر وہ آزادی ہند کے لئے انگریزوں سے لڑتے رہے۔ لیکن ان کی سیاست خالصتہً دینی سیاست تھی۔ تحریک آزادی ہند میں حصہ لینے سے ان کا اصل مقصد یہ نہیں تھا کہ آزاد ہو کر ہندوستان بہت دولت مند ہو جائے گا یا اس کی صنعت و تجارت ترقی کر جائے۔ بلکہ انکا اصل مقصد اسلام کا فروغ، اور دینداری اور تقویٰ کو رواج دینا، دین کی حفاظت و اشاعت کرنا اور اس پر عمل کرنے میں مسلمانوں کا آزاد ہونا تھا۔ اگر تقسیم نہ ہوئی ہوتی تو حصول آزادی کے بعد وہ ملک میں اصلاح نفس اور حصول تقویٰ کے کام بھی اسی شدت کے ساتھ کرتے۔ جس شدت کے ساتھ انہوں نے آزادی حاصل کرنے کا کام کیا تھا۔ وہ ایک آزاد اور متحدہ ہندوستان بنانے کے لئے کوشاں تھے۔ اس کوشش کا اصل محرک اعلائے کلمتہ اللہ کا جذبہ تھا۔ جو دیندار سیاسی قائدین خصوصاً علماء اس وقت تقسیم ہند کے مخالف تھے۔ ان سب کو ظن غالب قرب بہ یقین تھا کہ متحدہ ہندوستان میں ہندو جوق در جوق حلقہ بگوش اسلام ہوں گے۔ ان کا یہ یقین مبنی بر دلیل تھا اور تقسیم کے بعد کے حالات نے بتا دیا کہ ان کا یہ اندازہ بالکل صحیح تھا۔ حضرت شاہ جی بھی یہی یقین رکھتے تھے۔ اور یہی ایک وجہ ہے جس کی بناء پر وہ تقسیم کے مخالف اور متحدہ آزاد ہندوستان کے خواہشمند تھے۔ حضرت شاہ جی کا ایک واقعہ سنا کر مضمون کو ختم کرنا چاہتا ہوں۔ وہ واقعہ بہت نصیحت خیز ہے۔ اس لئے اسے لکھے بغیر قلم روکنے کو جی نہیں چاہتا۔

انگریزی دور تھا۔ حکومت انگلشیہ نے قتل کا ایک جھوٹا مقدمہ شاہ جی کے خلاف چلا دیا۔ اللہ کا کرنا ایسا ہوا کہ جس گواہ کی شہادت پر ثبوت جرم کا دارومدار تھا اس نے عدالت میں پہنچ کر اپنے جھوٹے ہونے کا اقرار کر لیا۔ اور صاف صاف کہہ دیا کہ پولیس نے دباؤ ڈال کر مجھے جھوٹ بولنے پر مجبور کیا تھا۔ مگر میرے ضمیر نے مجھے ملامت کی ایسے بڑے شخص پر بہتان باندھنا بہت ہی بری بات ہے۔ اس لئے میں اقرار کرتا ہوں کہ میرا سابقہ بیان غلط تھا اور حضرت شاہ جی اس جرم سے بالکل بری ہیں۔ یہ گواہ اگرچہ ہندو (لدھارام) تھا مگر شاہ جی کی شخصیت سے متاثر ہوا۔ اور سچی بات کہہ دی۔ شاہ جی باعزت طریقے سے رہا ہو گئے۔ اور مقدمہ کا جھوٹا ہونا سارے ملک پر ظاہر ہو گیا۔ حکومت برطانیہ اور پولیس سب کی نظروں میں ذلیل ہو گئی۔ رہائی کے بعد بہت سے لوگ حضرت شاہ جی کو مبارک باد دینے کے لئے آئے۔ شاہ جی کے گھر کا خاکروب بھی مبارک باد دینے آیا۔

جو بھی آتا تھا شاہ جی اس سے گلے ملتے تھے۔ مہتر نے دور سے کھڑے ہو کر مبارک باد دی اور قریب آنے کی اسے ہمت نہیں ہوئی۔ شاہ جی نے اسے بلایا تاکہ اس کے بھی گلے ملیں۔ مگر وہ تو اس اعزاز کا تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔ ہاتھ جوڑ کر معافی مانگ کر اپنی جگہ کھڑا رہا۔ شاہ جی نے اس سے کہا کہ "میں مسلمان ہوں اور اسلام میں ذات پات کی، اونچ نیچ کوئی چیز نہیں۔ سب انسان اللہ تعالیٰ کی نظر میں یکساں ہیں۔ اونچا صرف وہ ہے جو تقویٰ میں اونچا ہو۔ خواہ کسی نسل و قوم کا ہو"

یہ کہہ کر آگے بڑھے اور اسے گلے لگا لیا۔ وہ شکر گزار ہو کر چلا گیا۔ دوسرے دن مع اہل و عیال آ کر حضرت شاہ جی کے دست حق پرست پر مسلمان ہو گیا۔ شاہ جی کے اس قسم کے واقعات اور بھی ہیں۔ جن سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت شاہ جی کا ذہن فضیلت نسب کے تصور اور نسلی غرور و پندار سے بالکل پاک تھا۔ اس کا اثر یہ ہوا کہ بہت سے لوگوں کو ایمان نصیب ہو گیا۔ بلکہ یوں کہیئے کہ انسانی برادری کی معتد بہ تعداد کو جو جہنم کے کنارے پہنچ چکی تھی اور اس میں گرنے ہی والی تھی انہوں نے ہاتھ پکڑ کر کھینچ لیا۔ اور جنت کے دروازے پر لا کھڑا کر دیا۔ اللہ تعالیٰ ان کے مراتب و درجات جنت میں بلند فرمائے۔ دین اسلام اور انسانیت دونوں کی یہ کتنی عظیم خدمت انہوں نے انجام دی ہے۔

اخلاص اور للہیت انکا مزاج تھا۔ جو کچھ کرتے تھے رضائے الہیٰ کے لئے کرتے تھے۔ اس لئے انہوں نے کبھی خواص یا عوام کسی کی بھی مخالفت کی پرواہ نہیں کی۔ ان کی بصیرت کا فیصلہ یہ تھا کہ تقسیم ہند اور پاکستان بننا مسلمانوں کے لئے مضر ہے۔ وہ آخر تک تقسیم کو روکنے کی کوشش کرتے رہے انہوں نے اس کی قطعاً پروا نہیں کی کہ عوام کی ایک بڑی تعداد بلکہ اکثریت ان سے اختلاف رکھتی ہے۔ وہ اپنے دور کے عظیم انسان تھے۔ ساری عمر انہوں نے اسلام کی خدمت و نصرت میں بسر کی۔ اللہ تعالیٰ جل شانہ ہم سب اہل سنت کی طرف سے انہیں اس کا اجر جبر نیل عطا فرمائے۔ آمین۔

ختم رسالت کا مبلغ

بچھڑے ہوئے گو تجھ سے ہوا ایک زمانہ
سینوں میں کھلے ہیں تیری یادوں کے چمن زار

تو ختم رسالت کا مبلغ ہے وہ جس پر
اس ملک کے شاہد ہیں سبھی کوچہ و بازار

گلشن کی مہک تھی تیری ہستی کی عبارت
بلبل کی چہک تھی وہ تیری خوبیٔ گفتار

کی تو نے سدا خرقۂ سالوس سے نفرت
درویش تھا رکھتا تھا شہنشاہ کے آثار

مسعود تابش

مولانا قاضی محمد شمس الدین رحمتہ اللہ علیہ (درویش)

امیر شریعت اور فرنگی خانقاہ کے درویش

حضرت مولانا محمد خان محمد صاحب مدظلہ (کندیاں شریف) جس زمانہ میں دارالعلوم عزیزیہ بھیرہ (ضلع سرگودہا) میں متعلم تھے۔ اس زمانہ میں جامع مسجد بھیرہ کی تولیت پر مولانا محمد یحییٰ بگوی اور مولانا ظہور احمد بگوی کے درمیان یار لوگوں نے تنازعہ پیدا کر دیا۔ مولانا ظہور احمد بگوی نے اپنا شرعی ثالث حضرت امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاری کو بنایا اور مولانا محمد یحییٰ صاحب نے صاحبزادہ قمر الدین صاحب سیالوی کو اپنا ثالث بنایا۔ سیالوی صاحب بوقت ضرورت خود تشریف نہ لا سکے مگر اپنی طرف سے صاحبزادہ سعد اللہ صاحب کو بھیج دیا۔ یہ صاحبزادہ سعد اللہ صاحب ضلع سرگودہا میں سرکار برطانیہ کے خاص سرکاری درباری آدمی تھے۔ اور آنریری مجسٹریٹ بھی تھے۔ جب یہ حضرات بھیرہ میں جمع ہوئے تو ان کے طعام کی خدمت پر حضرت مولانا خان محمد (مدظلہ) مقرر تھے۔ حضرت مولانا بیان فرماتے ہیں کہ صبح کی چائے کے دوران صاحبزادہ سعد اللہ صاحب نے ایک سفید کاغذ حضرت امیر شریعت کو پیش کیا۔ اور کہا کہ آپ اس کاغذ پر صرف "سید عطاء اللہ شاہ بخاری بقلم خود" تحریر فرما دیں۔ تو اس کے اوپر میں صرف ایک سطر یہ لکھ دوں گا کہ "میں آئندہ حکومت برطانیہ کی مخالفت نہیں کروں گا" اگر آپ ایسا کرنا منظور فرمائیں تو میں آپ کو بیس مربع آباد نہری زمین آج ہی دلا دیتا ہوں۔ اس سے آپ کی سات پشتیں مزے کریں گی اور آپ بھی شہر شہر پھرنے سے بچ جائیں گے۔ زندگی آرام و آسائش سے کٹے گی۔ اور آپ کی اس خدمت کے صلے میں مجھے بھی تین مربع نہری زمین مل جائے گی۔

حضرت امیر شریعت مسکرائے اور صاحبزادہ سعد اللہ کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر صرف اتنا فرمایا۔

"جی ہاں سائیں! آپ ہوئے جو فرنگی خانقاہ کے درویش!"

اور اب صاحبزادہ صاحب کا یہ حال تھا کہ بقول غالب

نہ بھاگا جائے ہے مجھ سے نہ ٹھہرا جائے ہے مجھ سے

مجھے کب تک آزماؤ گے؟

حضرت امیر شریعت کے جاں نثار ساتھی حضرت مولانا عبدالرحمٰن میانوی نے سنایا کہ حضرت شاہ جی کو جو کچھ مالی فتوحات ہوتی تھیں۔ آپ گنتے نہ تھے۔ بلکہ کرتے کے لمبے سے بغلی جیب میں ڈال لیتے تھے۔ اور یہ حضرت کا ساری عمر کا معمول تھا۔ مولانا میانوی فرماتے تھے کہ ایک دفعہ میں نے پوچھا کہ شاہ جی آپ روپے پیسے گنتے نہیں؟ فرمایا بالکل نہیں جو آتا ہے جیب میں ڈال لیتا ہوں۔ ضرورت پڑتی ہے تو حسب ضرورت نکال کر دے دیتا ہوں۔

پھر فرمایا۔ جب سے میں نے سورۂ ہمزہ کی آیت

جمع مالاً وّعدده

پڑھی ہے۔ پیسے گننے چھوڑ دیئے ہیں۔ اور نہ گننے کے باوجود اللہ تعالیٰ میری جیب خالی نہیں ہونے دیتا۔

مولانا میانوی فرماتے تھے کہ جب شاہ جی یہ فرما چکے تو جانے میرے دل میں کیا خیال آیا اور مجھے کیا سوجھی کہ میں نے ایک روز چپکے سے شاہ جی کی جیب سے چونسٹھ (۶۴) روپے نکال لئے اور شاہ جی کو پتا بھی نہ چلا۔ اب اس بات کو ایک عرصہ ہو گیا اور شاہ جی کو اس حرکت کا شائبہ تک نہیں گزرا تو مجھے سخت ندامت اور پریشانی ہونے لگی کہ اب کیا کیا جائے؟ آخر ایک روز میں نے جی کڑا کر کے حضرت سے تنہائی میں کہا کہ حضرت یہ کچھ پیسے ہیں آپ قبول فرمالیں۔ شاہ جی اچانک اس "التفات" پر حیران ہوئے اور شگفتہ انداز میں فرمایا۔ "حضرت سخی سرور صاحب یہ تو کہیئے یہ کیسے روپے ہیں؟ آج کاہے کو عنایات ہو رہی ہیں؟" میں نے کہا۔ "شاہ جی کوئی خاص بات نہیں۔ بس آپ یہ قبول فرمائیں" لیکن شاہ جی اس خلافِ معمول عمل کا پس منظر جاننے پر مصر ہوگئے۔ میرا گریز و انکار کچھ کام نہ آیا۔ فرمانے لگے صاف بتاؤ بات کیا ہے؟ لاچار میں نے عرض کی کہ شاہ جی ایک دفعہ میں نے آپ سے سنا تھا کہ آپ پیسوں کا حساب نہیں رکھتے اور میں نے یونہی ذرا آزمانے کو موقع پا کر آپ کی جیب سے چونسٹھ روپے نکال لئے۔ ایک عرصہ ہو گیا ہے کہ میں نادم بھی ہو رہا ہوں اور جرأت بھی نہیں کر پا رہا کہ آپ سے یہ ساری حقیقت کہہ ڈالوں۔ خدا کے لئے مجھے معاف فرما دیجئے۔ اور اپنے پیسے بھی لے لیجئے۔

مولانا میانوی فرماتے کہ جب میں نے شاہ جی کو پیسے لوٹانا چاہے تو شاہ جی یکبارگی متحیر سے ہوئے اور پھر کھلکھلا کر فرمایا "میانوی کب تک مجھے آزماتے رہوگے" اور یہ کہہ کر پیسے لینے سے انکار کر دیا۔ پھر مسکرا کر فرمانے لگے۔

"یہ چوری کا مال میں تو لینے سے رہا۔ اب تمہی استعمال کر لو"

یہ سنا کر مولانا میانوی اشک بار ہو جاتے۔ سبحان اللہ کیا شان ہے توکل کی اور پاک باطنی کی۔

نوجوانوں کے نام

"وہ نوجوان جو جدید تعلیم سے آراستہ ہیں اگر دین کی طرف آجائیں تو تبلیغِ دین زیادہ مؤثر اور نتیجہ خیز ہو سکتی ہے۔ ہم مولویوں نے دین کو محفوظ رکھا۔ کیا یہی کم ہے۔ اب تم لوگ اسے سنبھالو اور دُور دُور تک پہنچا دو"۔

(امیرِ شریعت)

(سید عطاء اللہ شاہ بخاری)

مولانا محمد صدیق ولی اللّٰہی
تلمیذ امام انقلاب مولانا عبید اللہ سندھی

قرآن کا پرجوش مبلغ

حضرت مولانا محمد صدیق ولی اللّٰہی، امام انقلاب مولانا عبید اللہ سندھی رحمہ اللہ کے مایہ ناز شاگردوں میں سے ہیں۔ عمر عزیز کی نوے بہاریں ان کے مشاہدہ میں ہیں۔ ضعف و ناتوانی کے باوجود بیدار مغز اور چاق و چوبند ہیں۔ فکر ولی اللّٰہی کی ترجمانی کا فریضہ نہایت بے باکی سے سرانجام دے رہے ہیں۔ بلا کا حافظہ پایا ہے۔ اپنے مرشد و استاد مولانا عبید اللہ سندھی کی عبارتیں انہیں ازبر ہیں وہ ان کی کتابوں کے کئی کئی صفحات ایک ہی سانس میں سنانے پر قادر ہیں۔
ذیل میں ان کی ایک مختصر سی تحریر ہدیہ قارئین کی جارہی ہے جو انہوں نے ایک نشست میں املاء کرائی۔ یہ تحریر دراصل حضرت امیر شریعت کی مجاہدانہ زندگی پر ان کے بھرپور تاثر کی عکاس ہے۔ (کفیل)

حضرت امیر شریعت سے میری پہلی ملاقات ۱۹۳۱ء میں دہلی میں ہوئی۔ قرآن کریم پر ان کے ایک طویل لیکچر سننے کا اتفاق ہوا۔ برصغیر کی آزادی کی جدوجہد کے حوالے سے شاہ جی کے جذبات اور نصب العین سے مستفید ہوا جو ان کی عمر کا بہترین سرمایہ تھا۔ وہ تادم مرگ انہی خیالات اور جذبات کو ملک کے کونے کونے تک پہنچاتے رہے۔ وہ ابتدائی عمر سے ہی ذکی الطبع اور سمجھ بوجھ والے جفاکش اور محنتی واقع ہوئے تھے۔ شاہ جی کی پاکیزہ اور بے داغ جوانی کا ان کی شخصیت کی تکمیل میں بڑا دخل تھا۔ ان کا تمام زمانہ طالب علمی استقامت اور اعتدال سے مزین رہا علمی مشاغل میں غایت درجہ کا انہماک اور بے پناہ محبت رکھتے تھے۔ محدث العصر علامہ محمد انور شاہ کشمیری رحمہ اللہ ان کی استقامت اخلاص اور للّٰہیت کی بناء پر ان سے مانوس تھے حضرت علامہ انور شاہ رحمہ اللہ نے ان کو تبلیغ کے میدان میں خاص طور پر مرزائیت کی تردید کی طرف توجہ دلائی اور لاہور کے ایک بڑے اجتماع میں شاہ جی کے ہاتھ پر جہاد کی بیعت کی اور انہیں امیر شریعت منتخب کیا اس کے بعد وہاں پر موجود پانچ سو علماء نے بھی بیعت کی۔ سید عطاء اللہ شاہ بخاری کو آنے والے حالات کا شدید احساس تھا۔ جو مستقبل میں ہونے والا تھا وہ ان کی چشم تصور میں واشگاف تھا۔ وہ ان امور پر گفتگو کرتے کرتے بے اختیار ہو جاتے۔ وقتی طور پر ان کے عقیدت مند ان کی باتیں ماننے کو تیار نہ ہوتے تو شاہ جی ان پر برس پڑتے کہ جو کچھ وہ دیکھ رہے ہیں تمہاری نظروں سے اوجھل ہے۔ آخر کار جب وہی نتائج لوگوں کے سامنے آتے تو وہ سب کچھ ماننے پر مجبور ہو جاتے۔ شاہ جی نے فرمایا بنگال پاکستان سے جدا ہو جائے گا قومی تعصب بڑھتا چلا جائے گا۔ اور لوگ اسلام سے دور ہوتے چلے جائیں گے۔ کشمیر کی تحریک میں شاہ جی نے

۱۹۳۱ء میں نمایاں کردار ادا کیا لاہور اور سیالکوٹ کے علاوہ پنجاب کے تمام بڑے شہروں سے احرار رضاکاروں کے قافلے کشمیر میں داخل ہوتے، میں بھی شاہ جی کی تقریر سننے کے بعد لاہور سے ایک قافلے کے ساتھ کشمیر روانہ ہوا اور مجلس احرار کی برپا کردہ تحریک آزادی کشمیر میں حصہ لیا۔ جس کے نتیجہ میں ظالم ڈوگرہ شاہی نے ہتھیار ڈال دیئے۔ قادیان میں مجلس احرار کے دفتر میں چھ ماہ قیام کیا اس وقت تاج الدین انصاری مرحوم اور مولوی عنایت اللہ چشتی آف چکڑالہ احرار کے دفتر میں رہتے تھے۔ اکتوبر ۱۹۳۴ء میں قادیان میں احرار تبلیغ کانفرنس میں شاہ جی کی گرجدار تقریر سنی۔ جس نے قادیانی ایوانوں میں زلزلہ برپا کر دیا اس کانفرنس میں پانچ لاکھ افراد کو شاہ جی نے خطاب کیا۔ یہ کانفرنس قادیان سے باہر ایک ہائی سکول کے پنڈال میں ہوئی۔ شاہ جی مجسمہ اخلاق تھے اور ان کے خلق کریم نے ان کے سیاسی حریفوں کو بھی ان کے سامنے زیر کر دیا تھا۔
بقول اقبال:

حفظ اسرار کا فطرت کو ہے سودا ایسا
راز داں پھر نہ کوئی پیدا کرے گی ایسا

مسلمانوں کے زوال اور انحطاط پر شاہ جی کا دل کڑھتا تھا اور وہ شب و روز اسی فکر میں غلطاں رہتے تھے کہ کسی طرح مسلمان اس انحطاط اور زوال سے نکلیں جس کا واحد نسخہ قرآن کی حکمت ہے جب اپنے پاس قرآن جیسا مکمل اور انقلابی پروگرام ہے تو دوسروں کی چوکھٹوں پر بھیک نہیں مانگنی چاہیئے۔ شاہ جی نے امام شاہ ولی اللہ کا قول

فک کل نظام

پیش کرتے ہوئے امام ولی اللہ کی پیشین گوئی کی طرف اشارہ کیا تھا کہ ان کی اولاد کے پہلے طبقے سے علم حدیث کو فروغ ملے گا اور دوسرے طبقے میں علم و حکمت کی اشاعت ہوگی۔ چنانچہ امام عبدالعزیز سے حدیث کا شیوع ہوا اور مولانا رفیع الدین کی "تکمیل الاذہان" اور شاہ اسماعیل شہید کی "عبقات" سے حکمت کے ایک نئے اسکول کی

طرح پڑی نیز امام ولی اللہ نے فرمایا تھا کہ ان کے بیٹوں کی اولاد سے ایسے افراد پیدا ہونگے جوان کے بیٹوں کے بعد ان کے کام کو آگے بڑھائیں گے۔ "الصدر الحمید" مولانا محمد اسحاق اور مولانا محمد یعقوب حضرت شاہ ولی اللہ کی اس پیشین گوئی کا مصداق بنے۔ شاہ ولی اللہ نے "فیوض الحرمین" میں لکھا ہے کہ خلافت کی دو قسمیں ہیں۔ خلافت باطنہ اور خلافت ظاہرہ امام ولی اللہ کی جماعتی تنظیم اور جدوجہد سے مراد باقاعدہ حکومت کی تشکیل ہے اور جس کے نتیجے میں یہ باقاعدہ حکومت بروئے کار آتی ہے۔ ہجرت سے پہلے مکہ معظمہ میں مسلمانوں کا جو دور زندگی تھا خلافت باطنہ کا نام دیا خلافت ظاہرہ کے قیام کے لئے تشدد اور محاربہ ضروری ہوتا ہے۔ حالانکہ خلافت باطنہ کا دور عموماً عدم تشدد کا ہوتا ہے اس کے بعد شاہ جی نے فرمایا مجھے انگریز سے نفرت ہے۔ قرآن سے محبت ہے۔ اس لئے میں چاہتا ہوں قرآن کی تعلیم کو عام کیا جائے۔
عقیدہ ختم نبوت سے کامل آگاہی علامہ انور شاہ کشمیری اور سید عطاء اللہ شاہ بخاری کی کوششوں کا ہی

نتیجہ ہے۔ آج مجھے نہایت خوشی ہے کہ حضرت امیر شریعت کے فرزند اور ان کی جماعت مجلس احرار قرآن کریم کی تعلیم و تبلیغ کے لئے اپنی تمام صلاحیتیں اور وسائل وقف کئے ہوئے ہیں۔ ابن امیر شریعت سید عطاء المحسن بخاری کی سرپرستی میں ملک بھر میں بارہ دینی مدارس اس مشن کی تکمیل میں مصروف ہیں۔ ایک تبلیغی سیاسی اور تحقیقی مجلہ ماہنامہ "نقیب ختم نبوت" صحافتی محاذ پر مصروف جہاد ہے۔ عصر حاضر میں دین اسلام کے خلاف پیدا ہونے والے فتنوں مرزائیت اور رافضیت و سبائیت کی تردید و مذمت میں اپنا سب کچھ قربان کئے ہوئے ہیں۔ اس جدوجہد میں وہ شخصیت پرستی کے باطل نظریہ کے سبب پیدا ہونے والے عقیدتوں کے بتوں کو پوری جرأت کے ساتھ مسمار کرتے ہوئے آگے بڑھ رہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ حضرت امیر شریعت کے فرزندوں اور ان کی جماعت مجلس احرار اسلام کی جدوجہد کو کامیابی سے ہمکنار کرے (آمین)

دو مظلوم
قرآن اور بخاری

جنوری ۱۹۴۸ء میں قاضی احسان احمد شجاع آبادی رحمتہ اللہ علیہ حضرت امیرِ شریعت رحمتہ اللہ علیہ سے ملنے خان گڑھ تشریف لے گئے۔ نوابزادہ نصر اللہ خان صاحب انہیں شاہ جی کے مکان پر لے چلے۔

مردانِ خانہ کی طرف بڑھے تو دیکھا کہ شاہ جی دھوپ میں بیٹھے قرآنِ پاک کا مطالعہ فرما رہے ہیں۔

نواب زادہ نصر اللہ خاں نے شاہ جی کو خاص کیفیت میں مصروفِ مطالعہ پا کر۔۔۔۔۔ بے اختیار کہا۔۔۔۔۔ قاضی جی!۔۔۔۔ وہ دیکھو دو مظلوم!۔۔۔۔۔

"قرآن اور بخاری"

ایک لاوارث مصحف! اور ایک معتوب روزگار انسان!

دونوں ہی انسانیت کی گمراہی پر ملول ہیں

ایک جھکا ہوا

ایک پھٹا ہوا

(روایت: ادیب الاحرار منور غوری مرحوم)

مولانا عبدالحق چوہان

جہاد آزادی کا ہیرو

استخلاص وطن کی تحریک کے عظیم مجاہد حضرت امیر شریعت رحمۃ اللہ علیہ کا سوانحی خاکہ مرتب کر کے نئی نسل کو ان کے پر عظمت کارناموں سے روشناس کرانا ایک اہم فریضہ ہے۔ خصوصاً اس دور میں تاریخ کا چہرہ مسخ کرنے کا مکروہ کام سرکاری سرپرستی میں ہو رہا ہے اور قومی ذرائع ابلاغ اور تعلیمی نصاب کے توسط سے یہ مذموم تاثر پیدا کرنے کی سعی ناتمام کی جا رہی ہے کہ جنگ آزادی کے ہیرو صرف اور صرف تین ہیں۔ سر سید احمد خان، علامہ اقبال اور محمد علی جناح جو سراسر جانب داری اور جھوٹ "پروری" کا انوکھا شاہکار ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ معرکۂ استخلاص وطن کے اعتبار سے حضرت شاہ جی کا تعلق جن مجاہدین مخلصین کے ساتھ ہے اس کے اخلاص بے نفسی کا مرکزی نکتہ یہ تھا۔

"چوں اہل ریاست و سیاست در زاویہ خمول نشستہ اند ناچار چندے از اہل فقر و مسکنت کمر ہمت بستہ ایں جماعت ضعفاء محض بنا برخدمت دین رب العالمین۔ ہرگز ہرگز از دنیا داراں جاہ طلب نیستند محض بنا برخدمت دین رب ذوالجلال برخاستہ اند، نہ بنا بر طمع و منال وقتے کہ میدان ہندوستان از بیگانگان دشمنان خالی گردیدہ و تیر سعی ایشان بر ہدف، مراد رسیدہ آئندہ مناصب ریاست و سیاست بطالبین آں مسلم آباد"

ترجمہ۔ جب حکومت و سیاست کے مرد میدان ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھ گئے اس وقت چند غریب بے سر و سامان کمر ہمت باندھ کر کھڑے ہو گئے اور محض اللہ کے دین کی خدمت کے لئے اپنے گھروں سے نکل آئے۔ یہ اللہ کے بندے ہرگز دنیا اور جاہ طلب نہیں ہیں محض اللہ کے دین کی خدمت کے لئے اٹھے ہیں مال و دولت کی ان کو ذرا بھر طمع نہیں جس وقت ہندوستان غیر ملکی دشمنوں سے خالی ہو جائے گا اور ہماری کوششوں کا تیر مراد کے نشانوں تک پہنچ جائے گا۔ حکومت کے عہدے اور منصب ان لوگوں کو ملیں گے جن کو ان کی طلب ہو گی۔

خطوط امیر المومنین حضرت سید احمد شہید۔ بحوالہ نقش حیات۔ ص ۱۳

یہ ہے ان حضرات کا دستور اساسی جن کے ساتھ شاہ جی رحمہ اللہ اپنی وابستگی کا اظہار ان الفاظ سے فرماتے تھے

"میں ان علماء حق کا پرچم لئے پھرتا ہوں جو ۱۸۵۷ء میں فرنگیوں کی تیغ بے نیام کا شکار ہوئے تھے۔ رب ذوالجلال کی قسم مجھے اس کی کچھ پرواہ نہیں کہ لوگ میرے بارے میں کیا سوچتے ہیں لوگوں نے پہلے ہی کب کسی سرفروش کے بارے میں راست بازی سے سوچا ہے وہ شروع ہی سے تماشائی ہیں اور تماشہ دیکھنے کے عادی ہیں اس سرزمین میں مجدد الف ثانی کا سپاہی ہوں۔ شاہ ولی اللہ اور ان کے خاندان کا متبع ہوں۔ سید احمد شہید کی غیرت کا نام لیوا اور شاہ اسمٰعیل شہید کی جرأت کا پانی دیوا ہوں میں ان پانچ مقدمہ ہائے سازش کے پابہ

زنجیر صلوائے امت کے لشکر کا ایک خدمت گار ہوں جنہیں حق کی پاداش میں عمر قید اور موت کی سزائیں دی گئیں۔ ہاں ہاں میں انہی کی نشانی ہوں انہی کی صدائے بازگشت ہوں میری رگوں میں خون نہیں آگ دوڑتی ہے۔ میں علی الاعلان کہتا ہوں کہ میں قاسم نانوتوی کا علم لے کر نکلا ہوں۔ میں نے شیخ الہند کے نقش قدم پر چلنے کی قسم کھا رکھی ہے۔ میں زندگی بھر اسی راہ پر چلتا رہا ہوں اور چلتا رہوں گا۔ میرا اس کے سوا کوئی موقف نہیں میرا ایک ہی نصب العین ہے اور وہ برطانوی سامراج کو کفنانا یا دفنانا!

"ہر شخص اپنا شجرہ نسب ساتھ رکھتا ہے میرا یہی شجرہ نسب ہے میں سر اونچا کر کے فخر کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ میں اس خاندان کا ایک فرد ہوں۔"

یہ جوہر خطابت محض لفاظی نہیں اور نہ ہی شعراء کی طرح محض تخیل کی پرواز بلکہ یہ حقیقت اور امر واقعی کا اظہار ہے آپ واقعی ان ذوات قدسی صفات کے مشن کو زندہ رکھنے والے اور ان کی شروع کردہ تحریک استخلاص وطن کو پایہ تکمیل تک پہنچانے والے تھے۔

آپ کے متعلق عام طور پر یہ مشہور ہے کہ آپ بے مثل خطیب تھے۔ میں اس حقیقت کا اعتراف کرتا ہوں کہ آپ واقعی اسی طرح تھے لیکن آپکا اصلی جوہر اور کارنامہ یہ نہیں تھا بلکہ آپ انقلاب پرور شخصیت کے مالک تھے اور اسلامی انقلاب لانے والی شخصیت کے لئے جن شرائط کا ہونا ضروری ہے وہ آپ کی ذات میں بطریق اتم موجود تھیں۔ اجمالی طور پر ان شرائط کا ذکر کرتا ہوں اور سب سے اہم شرط یہ ہے کہ اسلام پیغمبر اسلام اور قرآن مجید کے ساتھ اس کا تعلق محض فکر اور تصور کے لحاظ سے نہ ہو بلکہ یہ تعلق حب الہی کی بے پناہی اور درجہ کمال کو پہنچا ہو اور ایسی والہانہ محبت کہ اس راہ میں جو تکالیف اور مصائب پیش آئیں ان کو خندہ پیشانی سے برداشت کرے۔

اب اس شرط کو پیش نظر رکھ کر آپ کے لمحات حیات کا تجزیہ کریں تو آپ کی نشست و برخاست میں اس عشق کا جلوہ نمایاں طور پر نظر آئے گا۔ قرآن مجید سے محبت کے متعلق تو آپ کا مقولہ مشہور ہے کہ "مجھے ایک چیز سے محبت ہے وہ ہے قرآن"۔ اور یہ حب قرآن ہی کی کرشمہ سازی ہے کہ آپکی تلاوت قرآن مجید پر ہر شے وجد کی حالت میں نظر آتی تھی۔ اس میں صرف مسلمانوں کی خصوصیت نہ تھی بلکہ کفار اشرار پر یہ کیفیت طاری ہو جاتی تھی اور کافر بھی آپ کی تلاوت کے مشتاق رہتے تھے۔ تلاوت کی یہ تاثیر آپ کے حب قرآن مجید کی ترجمان تھی۔

محبت رسول کی حالت بھی اس طرح تھی۔ راجپال نے جس وقت اپنے خبث باطن کا اظہار کرتے ہوئے رسوائے زمانہ کتاب "رنگیلا رسول" (خاکش بدہن) شائع کی تو آپ پر ماہی بے آب جیسی حالت طاری ہو گئی آپ نے ایک احتجاجی جلسہ میں فرمایا۔

"دیکھو دیکھو سبز گنبد میں رسول اللہ تڑپ رہے ہیں خدیجہؓ و عائشہؓ پریشان ہیں امہات المومنین تم سے اپنے حق کا مطالبہ کرتی ہیں عائشہؓ پکارتی ہیں وہی عائشہؓ جنہیں رسول اللہ پیار سے حمیرا کہا کرتے ہیں جنہوں نے رسول اللہ (فداہ امی وابی) کو رحلت کے وقت مسواک چبا کر دی تھی۔ ان کے ناموس پر قربان ہو جاؤ سچے بیٹے

ماں پر کٹ مرتے ہیں۔"

آپ نے احتجاجی جلسوں میں حکومت سے سخت مطالبہ کیا کہ بانیان مذہب کے تحفظ کے لئے قانون نافذ کیا جائے امیر شریعت رحمۃ اللہ علیہ کو اپنی احتجاجی تقریر کی وجہ سے جیل جانا پڑا اور ایک سال تک پابند سلاسل رہے لیکن آپ کے ان غیرت و محبت بھرے الفاظ کا یہ اثر ہوا کہ راجپال ملعون کو غازی علم دین نے واصل جہنم کیا۔ حب قرآن اور حب رسول کا ایک واقعہ متقدمین حضرات میں شیخ ابو بکر محمد بن الفضل کے متعلق بھی اس طرح تھوڑے سے تغیر کے ساتھ کتابیہ شرح ہدایہ میں مذکور ہے ایک شخص آپکے پاس ایک فتویٰ لے کر آیا کہ کیا قرآن مجید ہم بچوں کو فارسی میں پڑھا دیا کریں؟ آپ نے سائل سے فرمایا پھر واپس آنا میں ذرا غور کر لوں۔ پھر اس کے بعد سائل کے حالات کی تحقیق فرمائی تو وہ فساد مذہب میں مشہور تھا آپ کو جب یہ معلوم ہوا کہ اس کے سوال کا مقصد تلعب بالدین ہے تو آپ کے عشق کی چنگاری بھڑک اٹھی (دین کو کھلونا سمجھ رکھا ہے)

فاعطی لواحد من خدام سکینا فقال اقتله بهذا

ترجمہ۔ اپنے ایک خادم کو چھرا دیا اور فرمایا کہ اس شخص کو اس سے قتل کر دو۔

خادم نے عرض کیا کہ اگر پولیس کے ہاتھ آجاؤں تو پھر کیا کروں اب شیخ کی جرأت ایمانی کا اندازہ کرو اور جس کو میں پیش کرنا چاہتا ہوں آپ نے فرمایا۔

ومن اخذک به فقل ان فلانا امرني به نفعل

ترجمہ۔ اگر تجھے کوئی پکڑے تو کہہ دینا فلاں شخص نے مجھے اس کا حکم دیا تھا

اس خادم نے ایسا ہی کر دیا اور قتل کا مقدمہ شیخ کے سر پر آگیا۔

فجا الشو استواطي اليه وقال ان الامير يدعوک مذهب الشيخ اليه وقال ان هذا كان يريد ان يبطل كتاب الله فخلع له الامير وجازاه بالخير

ترجمہ۔ سپاہی ان کے پاس آیا اور کہا کہ امیر المومنین نے آپ کو بلایا ہے۔ شیخ گئے اور سارا قصہ بیان کیا اور فرمایا کہ یہ شخص اللہ کی کتاب کو باطل کر دینا چاہتا ہے۔ امیر نے آپ کو خلعت اور نیک صلہ عطا کیا۔

ممکن ہے کہ کوئی شخص اس واقعہ کو فقہ کی ایک جزئی سمجھے لیکن عرض یہ ہے کہ اس فقہی جزئی میں عشق کی تجلی جلوہ نما ہے اس لئے مفتی کو یہ اختیار نہیں ہوتا کہ وہ براہ راست کسی کو قتل کرا دے۔

یہ تو ایجابی شرط سلبی شرط یہ ہے کہ اسلام کے مقابل جو نظام بھی ہو اس سے اسی عشق مفرط کے لحاظ سے حد سے زیادہ نفرت ہو، حضرت امیر شریعت رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کے اندر یہ شرط بھی بطریق اتم موجود تھی اس وقت اسلام کے مقابل فرنگی نظام موجود تھا آپ فرنگی نظام سے اپنے تنفر کا اظہار اس طرح فرماتے تھے۔

"میں ان سوروں کا ریوڑ بھی چرانے کو تیار ہوں جو برٹش امپریلزم کی کھیتی کو ویران کرنا چاہیں میں کچھ نہیں چاہتا ایک فقیر ہوں اپنے نانا کی سنت پر مرمٹنا چاہتا ہوں۔ اور اگر کچھ چاہتا ہوں تو صرف اس ملک سے

انگریز کا انخلاء دو ہی خواہشیں ہیں میری زندگی میں یہ ملک آزاد ہو جائے یا پھر میں تختہ دار پر لٹکا دیا جاؤں"

ان شرائط کے ساتھ ساتھ جرأت ایمانی بھی ضروری ہے وہ بھی آپکے اندر موجود تھی۔ ویسے تو کئی واقعات ہیں میں صرف ایک واقعہ ذکر کرتا ہوں جس کو شیخ حسام الدین رحمہ اللہ نے غبار کارواں میں نقل کیا ہے۔

امرتسر کے بندے ماترم ہال میں ایک جلسے کا اہتمام ہوا جس میں مرزا بشیر الدین محمود کو شریک ہونا تھا چنانچہ پولیس کا انتظام بھی بے حد وسیع تھا لوگ بھی بڑی تعداد میں جمع تھے۔ یہ رمضان کا مہینہ تھا لیکن مرزا بشیر الدین محمود کے لئے چائے کا انتظام تھا وہ سٹیج کی اوٹ میں چائے نوشی کا لطف اٹھانے لگے ان کی اس حرکت سے لوگوں میں بڑی سرگوشیاں ہونے لگیں بلکہ ان میں ایک نفرت سی ابھرنے لگی۔ خیر اجلاس کا آغاز ہوا۔ مرزا صاحب میر محفل بنے بیٹھے تھے۔ ایک مبلغ روشن دین نے تلاوت قرآن پاک شروع کی۔

اچانک پچھلی صفوں میں ایک ہنگامہ سا برپا ہوا۔ سید عطاء اللہ شاہ بخاری صفیں چیرتے ہوئے دیوانہ وار اسٹیج کی جانب لپک رہے تھے۔ ان کے چہرے پر جلال کی یہ کیفیت تھی کہ لوگ از خود ان کے لئے راستہ بنانے لگے جب وہ اسٹیج سے کچھ فاصلے پر تھے تو ان کی آواز کا شعلہ فضا میں لپکا اور یہ الفاظ گونجنے لگے۔

ٹھہرو! تم قرآن پاک کی غلط تلاوت کر رہے ہو۔ خدا سے ڈرو! مرزا بشیر الدین محمود کے چہرے پر ہوائیاں اڑنے لگیں۔ اتنے میں پولیس اسٹیج کے قریب آگئی اور مرزا صاحب کو گھیرے میں لے لیا لوگوں میں ایک افراتفری سی پھیل گئی نعرہ ہائے تکبیر گونجنے لگے۔ اور آن کی آن میں تمام جلسہ تتر بتر ہو گیا۔

یہ ہے آپ کی جرأت ایمانی کی تصویر۔ انقلاب کے انہی شرائط کے تحقق کی وجہ سے حجتہ الاسلام محدث العصر حضرت مولانا انور شاہ صاحب کشمیری رحمہ اللہ تعالیٰ علیہ کہ جن کا تعارف حکیم مولانا عبدالحئی صاحب نے "نزہتہ الخواطر" میں ان الفاظ سے فرمایا ہے۔

فاشتغل بتدريس سنن الترمذی وصيحح البخاری۔ وانتهت اليه رياسته تدريس الحديث فی الهند وبقی مشتغلا به مدة ثلاث عشرة سنة فی تحقيق واتقان

ترجمہ: سنن ترمذی اور صحیح بخاری پڑھاتے رہے۔ ہندوستان میں تدریس حدیث کے مدار بن گئے اور تیرا سال تک تحقیق و اتقان (کے ساتھ یہ مشغلہ جاری رکھا) اسی سید السند نے پانچ سو مشاہیر علماء کے سامنے آپکے دست حق پرست پر بیعت جہاد فرمائی اور آپ کو "امیر شریعت" کا لقب عطا کیا۔

آپ کی انقلابی جدوجہد سے ۱۹۵۳ء میں مقدس تحریک ختم نبوت چلی تو یہ آپ ہی کی محبت کا ثمرہ تھا کہ تیرہ ہزار شمع نبوت کے پروانوں نے خندہ پیشانی سے جام شہادت نوش فرمایا۔

امیر شریعت رحمہ اللہ کی زیارت کا شرف پہلی بار مجھے اپنی بستی میں حاصل ہوا۔ ۱۹۵۱ء کی بات ہے کہ بستی مولویاں ضلع رحیم یار خان میں مدرسہ شمس العلوم کا سالانہ جلسہ منعقد ہوا جس میں حضرت امیر شریعت رحمہ اللہ کی تقریر تھی میں اپنے والد مرحوم کی معیت میں آپ سے ملنے گیا۔ حسن اتفاق کہ انہیں ایام میں

حضرت خواجہ میاں عبدالرحمٰن رحمہ اللہ سجادہ نشین درگاہ عالیہ بھرچونڈی شریف ضلع سکھر بھی بستی میں تشریف لائے ہوئے تھے۔ حضرت امیر شریعت رحمہ اللہ کی جس وقت تقریر شروع ہوئی تو حضرت صاحب بھی دوران تقریر جلسہ گاہ میں تشریف لائے اور جلسہ گاہ کی آخری صف میں آ کر بیٹھ گئے۔ حضرت امیر شریعت کے شدید اصرار پر آپ سٹیج پر تشریف لائے۔ پوری تقریر میں ان کی آنکھیں اشکبار رہیں۔ اختتام جلسہ پر حضرت صاحب اپنی اقامت گاہ پر تشریف لے گئے اور حضرت امیر شریعت اپنی جگہ پر عشاء کے وقت حضرت صاحب نے مولانا صالح محمد صاحب مرحوم کے توسط سے حضرت شاہ جی سے ملاقات کے اشتیاق کا اظہار کیا اور حضرت شاہ جی نے بصد مسرت ملاقات پر آمادگی ظاہر فرمائی اور حضرت صاحب شاہ جی کی اقامت گاہ پر تشریف لے گئے اور رات کا اکثر حصہ آپ نے حضرت شاہ جی کی معیت میں گزارا۔ اس ملاقات میں کیا گفتگو ہوئی اور کیا مسائل زیر بحث آئے؟ یہ کسی کو بھی معلوم نہیں کیونکہ تیسرا کوئی شخص بھی شریک مجلس نہیں تھا۔ اور نہ ہی کسی کو شرکت کی اجازت تھی۔ اس ملاقات کے بعد یہ دیکھا گیا کہ حضرت صاحب حضر و سفر میں ایک صندوقچہ اپنے ساتھ رکھتے تھے۔ ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ احقر بھرچونڈی شریف میں مقیم تھا اور حضرت صاحب کہیں سفر پر جارہے تھے حسب معمول وہی صندوقچہ آپ کے ساتھ تھا سفری سامان کے باعث یا کسی اور سبب سے حضرت صاحب نے وہی صندوقچہ مجھے دیا کہ فی الحال اس کو کہیں رکھ دو۔ واپسی پر مجھے دے دینا۔ میں اپنی اقامت گاہ پر وہ صندوقچہ لے گیا اور وہاں جا کر اس کو کھولا وہ صندوقچہ تمام کا تمام مرزائیت کی تردید کے لٹریچر سے بھرا ہوا تھا۔ میں سمجھتا ہوں کہ مرزائیت کے متعلق حضرت صاحب کا مطالعہ حضرت امیر شریعت کی اس ملاقات کا نتیجہ تھا جو کہ بستی مولویاں میں ہوئی تھی۔ معلوم نہیں کہ حضرت امیر شریعت رحمتہ اللہ علیہ کی اس طرح کی تبلیغی محافل کے متاثرین کی کیا تعداد ہو گی؟

زمانہ طالب علمی میں میں ملتان میں پڑھتا تھا مشکوٰۃ شریف کی حدیث میں ایک اشکال ذہن میں پیدا ہو گیا میں اسی حالت میں تھا کہ قاسم العلوم کے جلسہ پر مولانا عبدالحق صاحب اکوڑہ خٹک والے تشریف لائے۔ میں اس خیال سے کہ مولانا کے سامنے اپنے اشکال کا اظہار کر کے تشفی کروں گا۔ جب میں مدرسہ پہنچا تو معلوم ہوا کہ مولانا حضرت امیر شریعت سے ملاقات کرنے تشریف لے گئے ہیں۔ میں وہاں حاضر ہوا تو شاہ جی نے دریافت فرمایا کہ اس الماری سے تدوین حدیث اٹھا دو اس شخص نے کتاب اٹھا دی تو آپ نے فرمایا یہ کتاب خرید کر لو اور اس کا بار بار مطالعہ کرو۔ ان شاء اللہ تعالیٰ اشکالات دور ہو جائیں گے میں نے اسی دن وہ کتاب خرید لی اور اس کا بار بار مطالعہ کیا۔ میرا وہ اشکال تو اس کتاب سے حل نہ ہو سکا البتہ اور کئی خدشات دور ہو گئے۔ آپ کی شفقت و محبت نے دل موہ لیا اے کاش ایسی من موہنی شخصیت اللہ کی حکمت کے ماتحت اگر آج ہم میں موجود ہوتی تو علماء کا یہ کارواں جس ڈگر پر چل نکلا ہے اسے روکا جاسکتا۔

*

جس کے بیاں سے لرزہ بجاں شوکتِ فرنگ

دیکھا ہے ہم نے دین و سیاست کا امتزاج
اس عہد میں امیر شریعت کی ذات میں
مرد فقیر، شاہ جی کہتے تھے جس کو لوگ
جس کو فقط غلامیٔ افرنگ کا تھا روگ
اس مردِ حر کا قوم نہ کیونکر منائے سوگ
"پیدا کہاں ہیں ایسے پراگندہ طبع لوگ"

سرگرم جس کی شعلہ نوائی سے شیخ و شاب
وہ آسمان فنِ خطابت کا آفتاب،
اُمت کے غم کی آگ میں دل جس کا تھا کباب
رخشندہ در عمائدِ ملت چو ماہتاب
جس کے بیاں سے لرزہ بجاں شوکت فرنگ
جس کی زباں میں کوثر و تسنیم کے تھے رنگ
اسلامیانِ ہند کی اُمید اور اُمنگ
جیتی تھی جلسہ گاہ میں جس نے ہمیشہ جنگ
ظلمت گہِ ہنود میں وہ نور کا نشاں
ہندوستاں میں ختم نبوت کا پاسباں
اُتریں فرشتے سُننے جسے وہ قرآن خواں
عشاقِ مصطفیٰ کا وہ سالارِ کارواں

رگ رگ میں اُس کی نقش، محبت میاں کی تھی
خدمت سپرد اُس کے گو ہندوستاں کی تھی
اس کی نگہ کی زد میں تو وسعت جہاں کی تھی
اب سوچتے رہو کہ وہ مٹی کہاں کی تھی
وہ جس کے دل میں ملت بیضا کا درد تھا
ہیبت سے جس کی چہرۂ طاغوت زرد تھا
اصحابِ مصطفےٰ کی جماعت کا فرد تھا
"حق مغفرت کرے، عجب آزاد مرد تھا"

پروفیسر عابد صدیق

مولانا قائم الدین رحمتہ اللہ علیہ (علی پور)

امیر شریعت۔ محسن ملت

امیر شریعت کے صحیح حالات اور ان کے حقیقی کمالات اور اوصاف حمیدہ وہی لوگ بیان کر سکتے ہیں جن کو خود ان جیسا مقام کمال حاصل ہو

قدر گوہر شاہ داند یا بداند جوہری

مجھ جیسا آدمی حضرت امیر شریعت کے علم و عمل اور کمالات ظاہری و باطنی کو کیا عرض کر سکتا ہے۔ ایک شخص جو دریا کے کنارے کھڑا ہو اور کبھی دریا کے اندر قدم نہ رکھا ہو۔ جس کو کبھی دریا کے اندر غوطہ لگانے کی نوبت نہ آئی ہو۔ اس کو کیا پتہ کہ سمندر کے عمق اور گہرائی کا کیا مقام ہے۔ ہم ایسے تجربہ کار غواص کے متعلق کیا رائے قائم کر سکتے ہیں۔ جو اپنی ساری زندگی میں سمندر کی لہروں سے کھیلا ہو جو بڑے سے بڑے طوفانوں میں جہاز کا لنگر اٹھا دینے والا ہو۔ جس نے عمر بھر خطرناک طوفانوں کا مقابلہ کیا ہو۔ جس نے ہمیشہ سمندر میں غوطہ زن رہ کر موتی نکالے ہوں۔ حضرت امیر شریعت انسانیت کا پر تو کامل، سچے محب رسول تھے۔ پروانہ توحید، اور جاں نثار صحابہ رسول تھے۔ فدائی آل رسول ﷺ تھے۔ حضرت امیر شریعت کو انسانوں سے بے حد پیار تھا۔ انسانیت کی خیر خواہی اپنا فرض سمجھتے تھے۔ آپ عزم راسخ کے مالک تھے

فَاِذَا عَزَمتَ فَتَوَکَّل عَلَیَ اللهِ

پر پورے کار بند تھے۔

حضرت سے میری پہلی ملاقات ۱۹۳۸ء شہر جتوئی ضلع مظفر گڑھ میں ہوئی۔ آپ کی ذات گرامی بے حد کشش اور جاذبیت کی مالک تھی۔ آنکھ میں جادو تھا۔ زباں میں شیرینی۔ کبیدہ خاطر لوگوں کو ایک لمحہ کے اندر گرویدہ بنانا حضرت کے لئے ادنٰی بات تھی وہ دن ہے اور آج کا دن ہم حضرت کے دیوانے اور متوالے ہیں۔

حضرت امیر شریعت کے کمالات کو مؤرخ کبھی فراموش نہیں کر سکتا آزادیٔ وطن کی جدوجہد میں حضرت کو وہ مقام حاصل ہے جس کے تذکرے کا حق ادا نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ یہ اتنی طویل داستاں ہے کہ ان حقائق کو ہم لکھنا شروع کر دیں تو بہت بڑے دفتر کی ضرورت ہے۔ نیز حضرت رحمتہ اللہ علیہ کا ملت پر یہ احسان عظیم ہے کہ انہوں نے علمائے کرام کو دین دار بنایا۔ علمائے امت کو حجروں سے نکال کر میدان جہاد میں لا کھڑا کیا۔ اعلائے کلمتہ اللہ کے لئے ہزاروں زبانیں تیار کیں۔ ملک کے چپہ چپہ میں خطیب تیار کئے۔

لاکھوں جوانوں کا لہو گرمایا۔ غرضیکہ حضرت شاہ جی رحمتہ اللہ علیہ جیسا باکمال انسان میری نظر نے کبھی نہیں دیکھا نہ آئندہ زندگی میں ایسی پر عظمت شخصیت کی زیارت نصیب ہونے کی توقع ہے۔

حضرت شاہ جی رحمہ اللہ علیہ کو اللہ تعالیٰ کے کلام پاک سے بے حد محبت تھی۔ سنت رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے بے حد متوالے تھے۔

عصمت انبیاء علیہم السلام کو جس انداز میں ملک کے اندر بیان کیا۔ اس کی مثال پیش کرنا ناممکن نہیں تو مشکل ضرور ہے۔ حضرت شاہ جی رحمتہ اللہ علیہ جیسے باکمال انسان روز روز پیدا نہیں ہوتے۔ صدیوں بعد جا کر ایسے انسان امت میں پیدا ہوا کرتے ہیں۔ پھر ایسے لوگوں کی موت بھی صدیوں خون کے آنسو رلایا کرتی ہے۔ موت کا آجانا ایک متعین امر ہے۔ موت سے مفر کی کوئی صورت نہیں۔ حضرت شاہ جی رحمتہ اللہ علیہ سے قبل بڑے بڑے باکمال اکابر موت کی وادی میں اتر چکے ہیں۔ اور وہ خلا بھی ہزاروں برس تک پر نہیں ہو سکتا۔

مگر اصل بات یہ ہے کہ حضرت امیر شریعت رحمتہ اللہ علیہ کی موت ایسے دور میں واقع ہوئی جو زمانہ قحط الرجال اور فقدانِ کمال کا دور ہے اگر ہمیں حضرت کا مثل یا قائم مقام نظر آتا تو یقیناً اتنا صدمہ اور رنج نہ ہوتا۔

افسوس کہ حضرت کا کوئی قائم مقام نظر نہیں آتا۔ قحط الرجال کے زمانے میں حضرت امیر شریعت کی موت ایک ناقابل تلافی نقصان ہے۔ عرصہ دراز تک یہ خلاء پر نہیں ہو سکتا۔ افسوس ہم نے اپنے ہاتھوں بے مثال خطیب، مجاہد اعظم، عالم باعمل اور پیکر انسانیت کو سپرد خاک کر دیا۔ سرزمین ملتان تجھ کو مبارکباد ہو تیرے اندر وہ مرد غیور اور مرد مجاہد دفن کیا گیا جسکی مثال صدیوں تک نہ مل سکے گی۔

ہر ایک تبرزن کو شکاری نہیں کہتے
ہر ایک جو پڑھ لے اسے قاری نہیں کہتے
ہر ایک فقیہ شافعی و نعمان نہیں ہوتا۔۔۔!　ہر واعظ و ناصح کو بخاری نہیں کہتے

سیاست

سارے قرآن میں "پالیٹکس" کے مفہوم میں سیاست کا لفظ نہیں۔ ہاں، میں جانتا ہوں! اس کے معنی "مکر" کے ہیں اور یہ فرنگی مقامروں کی ایجاد ہے۔ جس کا مطلب ہی فریب دہی ہے۔ سیاسین کے وعدے پورا ہونے کے لئے نہیں بلکہ ٹالنے کے لئے کئے جاتے ہیں۔ ان بد بختوں کے دل پر خدا کے سوا ہر شے کا خوف غالب ہے۔

میں نے لفظ سیاست سے زیادہ شریر لفظ نہیں دیکھا۔ یہ خدع و فریب کے ایک ایسے اجتماعی کاروبار کا نام ہے جس سے بابو لوگ اغراض کی دکان چمکاتے ہیں۔

اس دور میں سیاست کا مطلب "فتنہ خیزی"، "فتنہ پروری" اور "فتنہ انگیزی" ہے۔

(سید عطاء اللہ شاہ بخاری)

مولانا سمیع الحق
اکوڑہ خٹک

امیر شریعت سے ایک ملاقات

رو رہی ہے آج ایک ٹوٹی ہوئی مینا اسے
کل تلک گردش میں جس ساقی کے پیمانے رہے

رمضان المبارک ۱۳۷۸ کا زمانہ کتنا پر کیف اور پر لطف تھا۔ اور کتنے حسین و جمیل تھے زندگی کے وہ چند ایام جو لاہور کے بقیۃ السلف حضرت شیخ التفسیر مولانا احمد علیؒ[۱] کی صحبت میں گزرے۔ ایک طرف رمضان کا مبارک مہینہ پورے برکات سے سایہ فگن دوسری طرف صبح و شام حضرت الاستاذ کے درس میں قرآن مجید کے علوم و معارف کا ذکر و مذاکرہ روحانی فیوضات کی ہر طرف بارش پوری فضا روحانیت میں بسی ہوئی تھی اور مجھ جیسے نامہ سیاہ پراگندہ خاطر انسان کو بھی چین و سکون کی دولت نصیب تھی۔ زہے نصیب ایک مرد کامل اور شیخ کے جوار میں قیام و سکونت اور خصوصی شفقتوں کی دولت حاصل ہو رہی تھی۔

نظر میں ہے اب تک وہ رنگیں زمانہ
نشیلا نشیلا سہانا سہانا

۸ رمضان المبارک کو ایک دن حوض پر وضو کر رہا تھا عصر کی جماعت ہو چکی تھی۔ اور وضو سے فارغ ہو کر پیچھے مڑا۔ کچھ مبہوت سارہ گیا۔ حضرت امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاری علیہ الرحمۃ دو تین افراد کا سہارا لئے گرتے تھامتے کھڑے ہیں۔

برٹش سامراج کو للکارنے والے اس ضیغم اسلام کی چال میں لڑکھڑاہٹ تھی وہ مہیب اور پروقار وجیہہ چہرہ جس کے خدوخال میں کسی یورپین عیسائی افسر[۲] نے (حضرت) عیسیٰ مسیح علیہ السلام کی جھلک دیکھی تھی اور جس نے اُس وجیہاً فی الدنیا والاخرۃ پیغمبرؑ کا اسٹیچو اور تمثیل اس بارعب چہرے کو قرار دیا تھا۔ اب ایک منحنی لاغر ڈھانچہ تھا مگر پھر بھی اس کارُواں رُواں اس سکون و طمانیت، جلال و وقار میں بسا ہوا معلوم ہو رہا تھا جس کا جلوہ صرف حق تعالیٰ کے مقربین میں ہوتا ہے اذا راؤ ذکر اللہ ان کے دیکھنے سے خدا یاد آ جائے۔ (الحدیث)

حیرت، گھبراہٹ کے ملے جلے جذبات لئے آگے بڑھا۔ مصافحہ کیا۔ چند لمحے بعد پہچانا۔ فرمایا "سمیع ہو"؟ پیار سے سینے سے لگایا۔ ابھی مولانا لاہوری اپنے کمرہ میں تشریف نہیں لائے تھے اور نہ ان کو شاہ جی کی اطلاع ہوئی تھی۔ اس لئے میں شاہ جی کو اپنے کمرے میں لے گیا۔ فرمایا چٹائی پر ہی بستر بچھاؤ لیٹ گئے۔ برادر محترم مولانا شیر علی شاہ مدرس دار العلوم حقانیہ میرے رفیق سفر و قیام تھے ہم نے جلدی جلدی پاؤں اور کمر دبانا شروع کیا۔ ہم نے کہا حضرت صحت بہت گر گئی ہے۔ فرمانے لگے ہاں! آخر گرنا ہے بقا صرف اللہ تعالیٰ کو

۱۔ یہ مضمون ۱۹۶۲ء میں ہفت روزہ "پیام اسلام" لاہور کے امیر شریعت نمبر میں شائع ہوا۔ تب حضرت مولانا احمد علی لاہوری رحمہ اللہ حیات تھے۔ ۲۔ کرنل ہاورڈ۔ سپرنٹنڈنٹ راولپنڈی جیل "ہندوستان کی خوبصورت یادیں" میں حضرت شاہ جی کا تذکرہ کیا ہے۔

ہے اتنے میں مولانا لاہوری تشریف لائے۔ دونوں بزرگ جس والہانہ شوق اور محبت سے ملے۔ السعدین کے اس دلکش نظارے کا تصور اب بھی دل و دماغ کو عجیب فرحت بخشتا ہے۔ چند لمحوں کے لئے فضا ساکت اور خاموش تھی اور پھر حضرت لاہوری انہیں ساتھ ہی اپنے کمرے میں لے گئے اور میں اس خیال سے سرشار تھا کہ اس عارضی مستقر کو ایک بطل جلیل کے چند ساعات نزول کی سعادت حاصل ہوئی۔ مجھے خوب یاد تھا جب حضرت قدس سرہ العزیز دارالعلوم حقانیہ کے سالانہ جلسوں میں تشریف لایا کرتے تھے۔ تو پشاور کی قہوہ چائے کو بہت پسند فرماتے تھے۔ میں نے یہاں بھی عشاء کے بعد قہوہ تیار کرانے کی اجازت مانگی۔ بخوشی قبول فرمایا مگر ذیابیطس کی وجہ سے میٹھا نہ کرنے کی ہدایت کی۔ قہوہ چائے تیار کر کے پیش کی۔ بڑے شوق سے نوش فرمائی۔ کچھ دیر بیٹھ کر دولت خانہ تشریف لے گئے ہم نے حضرت شاہ جی کو حضرت لاہوری کے بے پناہ اشغال اور پھر ان کی صحت کے گرتے جانے کا ذکر کیا۔ فرمایا جی ہاں اس معمہ کو میں بھی حل نہیں کر سکا۔ میں اور گھر والے کئی پہروں سوچتے ہیں کہ یہ بندۂ خدا کرتا کیا کچھ ہے اور کھاتا کیا ہے۔ ہم ان کا کھانا تولتے ہیں اور پھر ان کے شب و روز کے عظیم مشاغل کو دیکھتے ہیں۔ فرمایا ہاں ان لوگوں کا معاملہ ہی اور ہے ان کی زندگی کا دم خم ان اشغال و مصروفیات سے ہے۔ یہ اگر آرام کریں تو پھر رہی سہی صحت بھی جواب دے دے۔

آپ رات گئے تک خوش طبعی، ظرافت و حکمت، عبرت و موعظت کے انمول موتی بکھیرتے رہے کہ کبھی مجلس کشت زار زعفران بن جاتی اور کبھی حاضرین درد و یاس کی گہرائیوں میں ڈوب جاتے۔ اب شاہ جی پورے جوبن میں تھے۔ اور برادر محترم صاحبزادہ مولانا عبید اللہ انور فرمارہے تھے کہ شاہ جی پھر وہی شاہ جی ہیں۔ ضعف و اضمحلال کے سارے آثار مٹ گئے اور چہرے میں سرخی اور نور کی وہی لہریں دوڑنے لگیں۔ حضرت لاہوری کی اس قیام گاہ میں چند احباب کی اس محفل میں شاہ جی نے علوم و حکم، طنز و مزاح، پیار و محبت کے وہ پھول نچھاور کیے جس سے دل و دماغ میں فرحت اور انبساط اور پھر حیرت و عبرت کی کتنی موجیں مضطرب ہوئیں اور پھر دب گئیں۔ کل تک جب وہ مجلس یاد آتی تو فرحت و ابتہاج کا باعث بنتی اور اب سوچتا ہوں تو سوہانِ روح ہے۔

اب رات ڈھل گئی اور مجلس برخاست ہوئی۔ اس سیاہ کار کو حکم ہوا سمیع اپنا بستر یہاں اٹھا لاؤ۔ بستر اٹھا لایا اور شاہ جی کی چارپائی کے ساتھ اس مسند پر بچھایا جس پر مخدوم العلماء والمسلمین حضرت مولانا لاہوری تنہائیوں میں مشغول ہوتے ہیں اور جلوتوں میں جہاں سے رشد و ہدایت کے خزانے تقسیم ہوتے ہیں۔ ابھی میری آنکھ لگی تھی کہ بڑھاپے، فالج، ذیابیطس کا شکار یہ ضعیف مجاہد دبے پاؤں اٹھا جب میری آنکھ کھلی تو یہ مردِ مومن میرے سرہانے مصلے پر بیٹھے اپنے رب کے ساتھ مصروف عجز و نیاز تھا۔ دنیا و مافیہا سے بے پرواہ عشقِ الٰہی اور سوز دروں میں مستغرق

قرة عینی فی الصلوٰة (الحدیث)

(میری آنکھوں کی ٹھنڈک نماز میں ہے)

میں نے بستر سے اٹھنا چاہا۔ سختی سے منع فرمایا سو جاؤ تمہیں سحری کے لئے بھی اٹھنا ہے۔ اور پھر دن کو درس

میں شریک ہونا ہے۔ تعمیل حکم لازمی تھی۔ لحاف میں منہ لپیٹ لیا مگر عشق رسول اور یادالٰہی سے معمور سینہ پورے زور سے

له ازیز کا زیزالقدر

(ہانڈی کے ابلنے کی آواز) کا نظارہ پیش کر رہا تھا۔ بد قسمتی ہوتی اگر اس موقعہ کو غنیمت نہ جانتا اٹھا اور دعا کے لئے درخواست پیش کر دی۔

اس رات وہ خصوصی توجہات و شفقتیں نصیب ہوئیں۔ جو مدت مدید کی تمناؤں اور آرزوؤں سے بھی شاید نصیب نہ ہوتیں۔

شاہ جی فرمانے لگے سمیع! میں تمہیں آج ایک حقیقت کا اظہار کر رہا ہوں۔ شاید ملاقات ہو یا نہ ہو کیونکہ میں تو اب جا رہا ہوں میں نے زندگی بھر کسی کی ذات کے بارے میں مال و متاع عزت و آبرو کی برائی کا تصور بھی نہیں کیا۔ الحمدللہ میں اس صفائی کا اثبات کر سکتا ہوں۔ پاؤں دبانے کے دوران میں نے کہا کہ یہ پاؤں حضرت الشیخ الامام الکبیر مولانا مدنی علیہ الرحمتہ نے دبائے تھے تو ہم یہ سعادت کیسے حاصل نہ کریں۔ فرمایا

لا حول ولا قوة۔ استغفروالله

ایسا نہ کہیں پھر سوچ میں ڈوب کر انگلی دانتوں میں دبا گئے اور آہ بھرتے ہوئے فرمایا۔ سب چلے گئے حضرت مدنی نے بھی رحلت فرمائی صرف میں اس قافلہ کا تنہا سپاہی رہ گیا ہوں۔ اللہ بھی ایک اس کا رسول بھی ایک اور آج اس پوری دنیا میں میں بھی تنہا ہوں۔

میں نے حضرت علامہ انور شاہ کشمیری کے بارے میں پوچھا کہ حضرت نے ان سے کیا حاصل کیا؟ شاہ جی فرمانے لگے میں نے ان سے بہت کچھ حاصل کیا میں نے جو کچھ پایا ان کے جوتوں کا صدقہ ہے۔ اس پورے ہندوستان میں میں نے ایسے وجیہہ و حسین چہرہ و جلال و جمال کے بزرگ نہیں دیکھے۔ ایک رات دیو بند میں تقریر کرنے کا ارادہ فرمایا۔ بھلا علم و معرفت کے اس مرکز میں ان کے سامنے تقریر کی کیا مجال تھی۔ میں نے انکار کیا تو فرمایا تمہیں تقریر کرنا پڑے گی۔ اب حکم سے سرتابی کی مجال کہاں تھی۔ تقریر عشاء کو شروع ہو کر رات تین بجے تک جاری رہی حضرت شاہ صاحب کشمیری کرسی پر تمام رات ایک ہی ہیئت میں پاؤں پر پاؤں رکھ کر بیٹھے رہے۔ پورے محو ہو کر سنتے رہے۔ اور برابر آنسو جاری تھے۔ حالانکہ تقریر بھی "وراثت" جیسے خشک موضوع پر تھی اور پھر اختتام پر بے تحاشا دعائیں دیں۔ رہا ان کا درس تو وہاں ہم جیسوں کی رسائی کہاں تھی۔ حضرت مفتی محمد حسن صاحب (رحمہ اللہ) میرے استاد ہیں بڑے معقولی اور فلسفی۔ لیکن جب شاہ صاحب کشمیری کے درس میں شریک ہوئے تو فرمانے لگے کہ جہل کا اعتراف لے کر ان کے درس میں شرکت کرنا پڑتی تو وہاں ہم جیسوں کی کیا مجال انتھی۔

دوران گفتگو انہوں نے حضرت شاہ صاحب علیہ الرحمتہ کے ان کے ہاتھ بیعت کرنے اور انہیں امیر شریعت منتخب کرنے کے واقعہ کو بھی بیان فرمایا۔ نیز اس ضمن میں فرمایا کہ میں نے زندگی میں تین افراد کو

نماز پڑھتے دیکھا۔ خشوع و خضوع میں ڈوبی ہوئی نمازیں ایسا معلوم ہوتا تھا کہ پڑھنے والے تڑپ تڑپ کر بھیک مانگ رہے ہیں۔ عاجزی اور ذلت ان کے ہر ہر جز سے نمایاں ہوتی تھی۔ ایک علامہ انور شاہ علیہ الرحمۃ کی نماز، دوسرے مولانا ابوالکلام آزاد کی نماز تیسرا نام غالباً پیر مہر علی شاہ علیہ الرحمۃ کا لیا[۳]

دوران گفتگو میں ایک مرتبہ فرمایا۔ میری مایوسی قنوط کی حد تک پہنچ گئی ہے اور میری قنوط انکشاف حقیقت ہوا کرتی ہے کہ یہ لوگ مرنے کے بعد میرے دفنانے کی اجازت بھی دے دیں گے یا نہیں۔ زندگی کے آخری ادوار کے لئے ملتان کا انتخاب۔؟ اس کے بارے میں فرمایا کہ یہ مجذوب کی دعاء کا نتیجہ معلوم ہوتا ہے۔ واقعہ یہ ہوا کہ تقسیم سے قبل ملتان کے ایک بہت بڑے اجتماع میں تقریر کر رہا تھا کہ اتنے میں مجمع سے ایک شخص اٹھ کھڑا ہوا۔ اور چیخ چیخ کر رونے لگا پھر ہاتھ اٹھا کر دعا کرنے لگا کہ۔ (شاہ! اللہ تیرا ایتھے مزار بنڑاوے) یعنی خدا یہاں تیرا مزار بنادے۔ میں نے کہا کہ (ہاں بابا جی "توں مجاور بنڑو نجیں) یعنی تم اس کے مجاور بن جانا۔ بات آئی گئی، مگر اس مجذوب کی دعا مقبول معلوم ہوتی ہے۔" عشاء کے بعد مولانا شیر علی شاہ[۴] صاحب نے کہا۔

تمتع من شمیم عواد نجد
فما بعد العیشتہ من عواد

(نجد کے گل نرگس (گاؤ چشم) کی خوشبو سے فائدہ اٹھاؤ کیونکہ شام کے بعد یہ پھول نہیں ہوگا)

فرمایا یہ تمہارا ساتھی بڑا خطرناک معلوم ہوتا ہے۔ اس نے شاعری شروع کر دی۔ پھر ایک سرد آہ کھینچی اور فرمایا۔ "ہاں شمع ہر رنگ میں جلتی ہے سحر ہونے تک"

ایک ساتھی نے جوتے اٹھانے کی کوشش کی آپ نے منع کیا اور فرمایا "اگر خواہ مخواہ اٹھانا ہے تو مجھے اٹھاؤ تب دیکھوں۔ دو چھٹانک جوتے اٹھا کر خوش ہوئے کہ شاہ جی کا احترام کیا"

بہرحال سعادت اور مسرت سے بھرپور یہ ایک سہانی رات تھی جو زندگی میں نصیب ہوئی جس کی یادیں تاحین حیات دل و دماغ پر نقش رہیں گی۔

یاس و حسرت کی فضا چھائی ہوئی ہے چار سو
برق غم سے مضطرب احساس کا خرمن ہے آج
نالۂ اندوہ ہے ہر بانگِ مرغانِ سحر
نوحۂ فریاد ہر آہنگِ جان و تن ہے آج (فانی)

۳۔ صاحب مضمون کو یہاں سہو ہوا ہے۔ تیسرا نام حضرت مولانا محمد الیاس رحمۃ اللہ (بانی تبلیغی جماعت) کا ہے ان تینوں بزرگوں کی نماز کی کیفیت بیان کرتے ہوئے حضرت امیر شریعت ایک خاص جملہ فرمایا کرتے تھے۔ "ان کی نمازوں کی کیفیت دیکھ کر محسوس ہوتا ہے کہ کوئی مہا بھکاری اپنے سب سے بڑے ان داتا کے حضور سر بسجود ہے"۔ (کفیل)

۴۔ سابق مدرس دارالعلوم حقانیہ حالاً مقیم مدینہ منورہ

اصاغر نواز شخصیت

مولانا غلام احمد (جلہ جیم میلسی)

۱۳۶۶ھ، ۱۹۴۶ء میں مجلس احرار اسلام کی طرف سے کہروڑپکا کے علاقہ "بیلاواگہ میراں پور" میں ایک عظیم الشان کانفرنس منعقد ہوئی۔ جس میں مجلس احرار اسلام کے عظیم رہنما "قاضی احسان احمد شجاع آبادی"، "مولانا عبدالرحمان میانوی"، "مولانا عبدالحی شاہ کہروڑوی" اور دیگر علماء کرام جن کو جاننے کا میں اس وقت شعور نہیں رکھتا تھا۔ حضرت امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاری رحمتہ اللہ علیہ کی قیادت میں شریک ہوئے۔ اس زمانہ میں کہروڑپکا سے مقام جلسہ تک کچی سڑک تھی۔ گرد و غبار بہت تھا۔ ہر طرف سے راستے خستہ اور ناہموار تھے۔ باوجود اس کے چونکہ مجلس احرار اسلام کا دور شباب تھا۔ احرار رضا کاروں کا ایک بڑا ہجوم اور شائقین و زائرین حضرت امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاری کا قرآن کریم سننے ہر طرف سے کھنچے چلے آرہے تھے۔ جلسہ ایک بڑی عید گاہ کے وسیع میدان میں تھا جو سامعین سے لبالب بھرا ہوا تھا۔ علماء حضرات کی شعلہ بیانیوں سے ایک بہترین سماں نظر آرہا تھا۔ علاقہ کہروڑپکا کے بااثر سرمایہ دار امراء جلسہ میں انگریزی اقتدار کے سہارے پر شریک تھے۔ قاضی احسان احمد شجاع آبادی جو اپنے مخصوص انداز میں یہ بیان کر رہے تھے کہ "امراء طوائفوں کے پاس قیام کرتے ہیں۔ وہ اپنی ہی اولاد کے ہاں ٹھہرتے ہیں۔ کیونکہ اس بازار کو امراء ہی جا کر رونق دیتے ہیں" اس پر راناواہن کے معروف رافضی زمیندار اللہ وسایا جوئیہ نامی نے جلسہ میں اپنے پالتو حامیوں کے ساتھ کھڑے ہو کر حضرت قاضی صاحب کی سخت توہین کرتے ہوئے کہا کہ "کیا چکلے میں بیٹھنے والی تمہاری بیٹیاں ہیں"؟ قاضی صاحب نے ضابطۂ خطابت کو سنبھالتے ہوئے برجستہ کہا کہ "اگر طوائف کے ہاں میں جاتا ہوں تو میری بیٹیاں ہیں۔ اور اگر تم جاتے ہو تو تمہاری اولاد ہیں"؟ اتفاق سے اس اللہ وسایا جوئیہ رافضی نے گھر میں ایک داشتہ "کنجری" رکھی ہوئی تھی۔ اور تھا بھی علاقہ کے سرمایہ داروں کا وڈیرا۔ اس نے سب کو آواز دے کر بلایا کہ "سب لوگ جلسہ گاہ سے باہر آجائیں"؟ تو اس کے اکثر متعلقین جلسہ سے باہر آگئے۔ اور سب نے صلح و مشورہ کر کے اپنی رعایا کے لوگوں کو اس طرح بلانا شروع کیا کہ "جو ہمارے بندے ہیں سب باہر آجائیں" قاضی صاحب مرحوم نے فوراً جوابی اعلان فرمایا کہ "جو لوگ اللہ کے بندے ہیں جلسہ گاہ میں بیٹھے رہیں۔ اور جو امراء کے بندے ہیں وہ بے شک چلے جائیں" چنانچہ اس اعلان پر کوئی آدمی بھی نہ اٹھا۔ اس عظیم الشان کانفرنس میں بااثر سرمایہ داروں کی بڑی رسوائی ہوئی۔ ان کے کہنے پر ان کی رعایا بھی قاضی صاحب کا خطاب چھوڑنے پر آمادہ نہ ہوئی۔ سٹیج پر علاقہ کے پولیس آفیسر موجود تھے۔ قاضی صاحب نے ان سے بھی رعایا کہ تحفظ کا اعلان کروایا۔ اس کے بعد وہ امراء جو جلسہ میں گڑبڑ کر رہے تھے انہوں نے حضرت امیر شریعت کی خدمت میں جا کر قاضی صاحب کا شکوہ کیا۔ اور اصرار سے کہنے لگے کہ "آئندہ جلسہ میں آپ آیا کریں، قاضی صاحب کو نہ لائیں"۔ اس پر حضرت امیر شریعت ان سے سخت ناراض ہوئے۔ اور ان کے ہاں

ضیافت کھانے سے انکار فرمایا۔

احرار کے رضا کاروں نے حسبِ معمول کھانے وغیرہ کا انتظام کیا۔ بات تیزی سے علاقہ میں پھیل گئی۔ ظہر کے بعد لوگ جمع ہوئے۔ حضرت شاہ جی رحمۃ اللہ علیہ سٹیج پر تشریف لائے اور اپنے مخصوص خطبۂ مسنونہ کے بعد حکومۃ الٰہیہ کی تشریح کے لئے آیت کریمہ

انا انزلنا الیک الکتاب بالحق لتحکم بین الناس بما ازک اللہ (پ۔ ۵، ع۔ ۱۵، س۔ ۴، "النساء"، ع۔ ۱۲)

تلاوت فرمائی۔ اس وقت جلسہ کے سامعین ملک بھر کے عام تاثر کے مطابق ایسا محسوس کر رہے تھے کہ جیسے قرآن کریم اب نازل ہو رہا ہے۔ حضرت امیر شریعت نے عوام سے مخاطب ہو کر اپنے وفادار قاضی احسان احمد کی شجاعت اور بہادری کی داد دی لوگوں سے آپ نے فرمایا کہ "یہاں کے مقامی لوگ مجھے کہتے ہیں کہ شاہ جی آنند آپ اکیلے آئیں۔ قاضی صاحب کو ہمراہ نہ لائیں"۔ آپ نے فرمایا۔ "بھلا یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ کہ حسین آئے اور "حی" نہ آئے" اس کے بعد حضرت شاہ جی نے مثال دے کر فرمایا "اچھے صفائی کرنے والے لوگ پہلے زمین پر پانی کا چھڑکاؤ کرتے ہیں۔ بعد میں جھاڑو دیتے ہیں۔ قاضی صاحب نے بغیر پانی کے چھڑکاؤ کے جھاڑو دینا شروع کیا تو گرد و غبار اڑا جو میری بیٹھک تک پہنچ گیا"! سبحان اللہ! حضرت شاہ جی نے شرکاء جلسہ کو اس طرح مطمئن فرمایا اور اپنے مشن کے رفیق قاضی صاحب کی ہمت افزائی کے ساتھ ان کو نصیحت فرمائی!

۱۳۶۶ھ/ ۱۹۴۷ء میں حضرت امیر شریعت رحمۃ اللہ علیہ مدرسہ "رشیدیہ" بہ مقام بستی "محبت پور" کے سہ روزہ سالانہ جلسہ میں تشریف لائے۔ اس عظیم اجتماع میں مولانا محمد علی جالندھری، قاضی احسان احمد شجاع آبادی، حافظ اللہ وسایا نابینا ڈیرہ غازی خان، مولانا لعل حسین اختر، مولانا عبدالرحمن میانوی جیسے اکابر علماء شریک ہوئے۔ یہ جلسہ دسمبر کے سرد موسم میں تھا۔ ان ایام میں مہمانوں کے سفر کے لئے ریل گاڑی کافی ہوتی تھی۔ ریلوے اسٹیشن "آرے واہن" سے مقام جلسہ کوئی تین میل کی مسافت پر تھا۔ راقم اپنے دوسرے طالب علم ساتھیوں کے ہمراہ جلسہ کے منتظمین کی ہدایت کے مطابق تین گھوڑیاں لے کر رات کے نو بجے آرے واہن اسٹیشن سے حضرت امیر شریعت کو لینے کے لئے گیا۔ چاندنی رات اور سردی زوروں پر تھی۔ گاڑی رات کے گیارہ بجے لیٹ اسٹیشن پر پہنچی۔ حضرت شاہ جی کے ہمراہ قاضی احسان احمد شجاع آبادی، مولانا عبدالرحمن میانوی اور دیگر علماء کرام جن کے مجھے اس وقت نام یاد نہیں اور چودہ پندرہ رضا کار بھی تھے۔ حضرت شاہ جی نے ہم طالب علموں کو تین گھوڑیوں کے ساتھ دیکھ کر اپنے رفقاء سے ترغیب کے لہجہ میں فرمایا "خدائے پاک نے کیسے چاند کی روشنی بنائی اور ہمیں دین کی محبت و خدمت کے لئے یہاں آنے کی سعادت نصیب فرمائی میری خواہش ہے کہ اسٹیشن سے بستی محبت پور تک پیدل چلا جائے۔ اور اللہ کا شکر ادا کریں۔ تو اس پر تمام رفقاء، علماء اور رضا کار اور قاضی احسان احمد شجاع آبادی خوشی خوشی حضرت شاہ جی کے ہمراہ چل پڑے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ زمین سکڑتی جا رہی ہے۔ ان ایام میں راستے بھی ناہموار تھے۔ کھیتوں کے موڑ طے کرنے پڑتے تھے۔ حضرت امیر شریعت خدا کے ارضی و سماوی نظام کی تعریف کرتے جاتے تھے اور چاند کی

روشنی کا بار بار تذکرہ فرما رہے تھے۔ آسمان کی طرف سر اٹھا کر ہاتھوں سے چاند کی طرف اشارہ فرماتے جاتے تھے اور "سبحان اللہ سبحان اللہ" زبان پر جاری تھا۔ ہم تین چار طالب علم اس باوقار قافلہ کے پیچھے گھوڑیوں کی لگامیں پکڑے ہوئے چل رہے تھے کہ حضرت شاہ جی مع اپنے محب رفقاء کے جن کی تعداد صحیح اندازہ نہیں پچاس ساٹھ کے قریب تھی۔ اسی حال میں دلچسپ باتیں کرتے ہوئے تین میل کا سفر طے کر کے مقام جلسہ میں پہنچ گئے۔ اس عظیم اجتماع میں انتظامیہ جلسہ کے کارکن مخلص اور سادہ رضا کار تھے۔ جن میں معروف شخصیت قاضی عبیداللہ شہید ساکن محبت پور، مولوی عاشق محمد صاحب شہید، حاجی اللہ بخش، حاجی پیر بخش مرحوم، حاجی واحد بخش مرحوم، حافظ عطاء محمد صاحب، حاجی جان محمد صاحب مرحوم ساکن رام کلی شامل تھے۔ موسم بھی دسمبر جنوری کا تھا۔ اس علاقہ میں "گوبھی" کے کھیت حضرت شاہ جی نے دیکھے تھے۔ صاحب جلسہ اور احباب کی سادگی بھی ان کے سامنے تھی۔ مہمان کثیر تعداد میں تھے۔ حضرت شاہ جی نے تمام امور کو سمجھتے ہوئے حکماً فرمایا "میں گوبھی کھاؤں گا۔ اور سب کے لئے بھی یہی پکاؤ" چنانچہ اس سہ روزہ دینی اجتماع میں شریک علماء اور کارکن سبھی نے سبزی کھائی۔ اور اس پر حضرت شاہ جی نے ان لوگوں کی حوصلہ افزائی کے لئے "سبزی" کی جلسہ عام کے اندر تعریف فرمائی۔ اور یہ بھی فرمایا کہ "میں جورات اسٹیشن سے بستی تک پیدل چل کر آیا ہوں اس سے مجھے سکون محسوس ہوا اور ان شاء اللہ آئندہ بھی اس بستی تک پیدل چل کر آؤں گا" اور واقعی ایسا ہی ہوا۔ حضرت شاہ جی کئی مرتبہ بستی محبت پور کے اس مرکزی جلسہ میں اسٹیشن سے پیدل چل کر ہی تشریف لائے۔ جلسہ والے خوشی کا اظہار کرتے۔ وہ ایسے مطمئن ہوگئے کہ آئندہ شاہ جی کا استقبال کرنے کے لئے بغیر سواریوں کے اسٹیشن پر پہنچ جاتے تھے۔ اس میں حضرت شاہ جی کا کمال دیکھیں کہ جلسہ کرانے والوں کی کیسی حوصلہ افزائی فرمائی اور ان کو دوسرے لوگوں سے جلسہ کے زائد اخراجات کے لئے سوال سے بھی بچالیا۔ وہ اپنی فراست اور آداب معاشرت سے کامل واقفیت کی بناء پر اپنے داعی میزبانوں کی حالت اور حیثیت بخوبی سمجھتے تھے۔ قاضی صاحب اور مولوی عاشق محمد صاحب شہید کی اپنی ذاتی کوئی سواری نہیں تھی۔ اور نہ ہی وہ اتنی مالی وسعت رکھتے تھے کہ جلسہ کے شریک ضیوف کی دعوت کے لئے گوشت وغیرہ کا انتظام کریں۔ اور میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ حضرت شاہ جی نے ہم طلبہ سے فرمایا کہ "چولہے پر دیگچی رکھو اور پانی گرم کرو۔ جب پانی ابل جائے تو مجھے بتانا" حضرت شاہ جی نے اپنے ہاتھوں سے پانی میں پتی ڈالی اور حسب منشاء چائے بنائی۔ اندازہ یاد آتا ہے کہ دودھ نہیں تھا۔ اس میں بھی حضرت شاہ جی نے منتظمین جلسہ کو خوامخواہ کے چائے کے خرچہ سے اور اپنی مرضی کے مطابق چائے سازی کے تکلف سے بچالیا۔ اللہ تعالیٰ حضرت شاہ جی رحمۃ اللہ علیہ کی جملہ مساعیٔ قبول فرمائیں۔ اور انکے بقیہ رفقاء و احباب کو ان کے نقش قدم پر چلنے کی توفیق عطاء فرمائیں۔ خصوصاً ان کے حضرات ابناء کرام کو اپنے عظیم باپ کا سچا جانشیں بنائیں۔ آمین۔

۱۳۷۱ھ، ۱۹۵۱ء میں جامعہ عربیہ "خیر العلوم" خیر پور ٹامے والی کا سالانہ سہ روزہ جلسہ تھا۔ ادارہ مذکورہ میں اپنی روایات کے مطابق اب بھی عظیم الشان تبلیغی اصلاحی کانفرنسیں منعقد ہوتی ہیں۔ اس قدیم ادارہ میں

پہلے بھی ملک کے اکابر ملت تشریف لاتے رہے۔ مثلاً استاذ العلماء حضرت مولانا خیر محمد جالندھری رحمتہ اللہ علیہ جو کہ مفتی غلام قادر صاحب کے مشفق استاد تھے۔ علامہ شمس الحق افغانی رحمتہ اللہ علیہ، مولانا محمد عبداللہ درخواستی، علامہ عبدالرحمن صاحب بہاولپوری، ادیب لبیب جناب علامہ محمد ارشد صاحب بہاولپوری، مولانا محمد عبداللہ صاحب رائے پوری، جالندھری شیخ الحدیث جامعہ رشیدیہ ساہیوال، مولانا فاضل حبیب اللہ رشیدی، حضرت مولانا عبدالرحمن میانوی، مولانا محمد علی جالندھری، مولانا محمد شریف جالندھری ثانی مہتمم خیر المدارس، مولانا قاضی احسان احمد شجاع آبادی، علامہ دوست محمد قریشی، مولانا سید نور الحسن شاہ بخاری مناظر اسلام مولانا لعل حسین اختر، حضرت مولانا محمد عبداللہ بہلوی، مولانا محمد شریف بہالپوری، مولانا محمد مکی، علامہ خالد محمود اور جانشین امیر شریعت سید ابو معاویہ ابو ذر بخاری وغیرہ۔

الحمد اللہ اب بھی اس مادرِ علمی میں ملک کے مقتدرِ علماء کرام بڑی توجہ اور چاہت سے تشریف لاتے ہیں۔

گرمیوں کا موسم تھا۔ سفر کا ذریعہ ان ایام میں ریل گاڑی تھی۔ جلسہ گاہ سے قریباً دو میل ریلوے اسٹیشن "خیر پور" ریگستان میں واقع تھا۔ اسی ادارہ کی سہ روزہ عظیم الشان کانفرنس میں سامعین بہت کثرت سے آئے ہوئے تھے۔ ایک روز پہلے حضرت امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاری کا انتظار تھا۔ ہر مقرر کے اعلان خطاب کے ساتھ سٹیج سیکرٹری شاہ جی کی آمد اور تشریف آوری کا اعلان کرتا تھا۔ ایک روز غالباً دن کے ایک بجے کے قریب حضرت مولانا عبدالرحمن میانوی شاہ جی کی پیروی میں اپنے مخصوص انداز اور لہجہ کے ساتھ مقام نبوت کے دلائل قرآنی آیات کی تلاوت کے ساتھ بیان کر رہے تھے اور سامعین حضرات خود داد دے رہے تھے کہ اچانک دوران تقریر میں کسی طالب علم نے اطلاع دی کہ "حضرت شاہ جی ریلوے اسٹیشن خیر پور پر تشریف لا چکے ہیں" بس یہ اعلان سننا تھا کہ سارا مجمع جلسہ سے اٹھ کر دوڑتا ہوا شاہ جی کے استقبال کے لئے ریلوے اسٹیشن خیر پور پہنچ گیا۔ بہاول پور سے بہاولنگر تک ریلوے سفر کی کوفت اور بے حد گرد و غبار کے تحفہ کو وہی حضرات سمجھ سکتے ہیں جنہوں نے کبھی یہ سفر کیا ہو۔ حضرت شاہ جی اسٹیشن پر اترے چاند جیسا خوبصورت چہرہ، گندمی رنگ کے کپڑوں میں ملبوس گرد و غبار سے اٹے ہوئے حال میں تھے۔ استقبال کرنے والے اجتماع کی حوصلہ افزائی فرماتے ہوئے سب لوگوں کے ساتھ اس شدت کی گرمی میں ریتلا سفر طے کر کے سیدھے سٹیج پر تشریف لا کر بیٹھ گئے۔ اور حضرت مولانا عبدالرحمن میانوی کے خطاب میں خوب داد دینے لگے۔ اور "واہ، واہ" فرما رہے تھے۔ لوگ حیران تھے کہ شاہ جی اتنے نازک مزاج کہ جن کی خدمت و ضیافت کو امراء اور سلاطین بھی فخر سمجھتے تھے برصغیر کے بڑے بڑے دینی رہنما اور قومی لیڈر جن کی خدمت کو سعادت سمجھتے تھے۔ وہ حضرت شاہ جی نہ منتظمین جلسہ کے مہمان خانہ میں تشریف لے گئے اور نہ اراکین جلسہ کو ڈانٹ ڈپٹ فرمائی کہ "ہائے میں مر گیا۔ اتنے سخت سفر سے آیا ہوں" بلکہ خوشی خوشی جلسہ گاہ میں پہنچ کر اپنے رفیق جماعت حضرت میانوی صاحب جو اس وقت خطاب فرما رہے تھے ان کے خطاب میں شرکت فرما کر اپنی داد

سے سامعین جلسہ پر ان کے خطاب کا سکہ بٹھا رہے تھے۔ سبحان اللہ! ایسے سچے دین کے شیدائی اور خصوصاً ختم نبوت سے دلی محبت رکھنے اور اصاغر کو نوازنے والے اب کہاں سے آئیں گے؟

اہلِ خیر پور ٹامیوالی کے ساتھ "قلبی تعلق"

ملک کے چند خاص مقامات کی طرح خیر پور کے ساتھ حضرت شاہ جی رحمتہ اللہ علیہ کو دلی محبت تھی۔ خیر پور میں قرآن کریم کی تعلیم واشاعت کا مرکز "سبز مسجد" کے نام سے ایک ادارہ قائم ہے۔ اور جامعہ خیر العلوم جو تمام اکابر علماء دیو بند کی ترجمانی کا مرکز سمجھا جاتا ہے بھی یہاں واقع ہے۔ ادھر حضرت بخاری "ہمدانی شاہ صاحبان" کے خاندان کے ساتھ گہرا تعلق رکھتے تھے۔ چند معروف شخصیات کے اسماء گرامی درج ذیل ہیں۔

۱۔ حضرت سید غلام محی الدین شاہ صاحب ہمدانی۔ ۲۔ سید محمد عباس علی شاہ صاحب ہمدانی۔ ۳۔ سید منظور الحسن شاہ صاحب ہمدانی شہید رحمتہ اللہ علیہم۔

حضرت شاہ جی عموماً خیر العلوم کے سالانہ جلسہ میں تشریف لا کر جلسہ کے بعد دو تین دن قیام فرماتے تھے۔ زیادہ دیر حضرت شاہ جی خیر پور میں محترم جناب حکیم محمد نصیر الدین قریشی کے ہاں تشریف رکھتے تھے۔ مذکورہ جلسہ کے موقع پر خیر العلوم کے منتظمین نے حضرت شاہ جی کی خدمت کے لئے دو تین طلبہ کو مقرر کیا ان میں ایک خادم بندہ راقم غلام احمد اور دوسرے مولانا غلام حسین فاضل دیو بند تھے۔ دوسرے طالب علم صاحبان کا نام مجھے یاد نہیں ہے۔ شاہ جی نے جب حکیم محمد نصیر الدین قریشی صاحب کے مکان میں قدم رکھا جو ماشاء اللہ خانقاہ نما ملحقہ مسجد کے صحن اور برآمدہ پر مشتمل تھا تو پہلا جملہ فرمایا "مجھے یہاں کسی ولی اللہ کی خوشبو آرہی ہے" حکیم نصیر الدین صاحب اور دوسرے رفقاء جو اس وقت موجود تھے۔ مفتی غلام قادر صاحب، جناب صاحب زادہ ریاض احمد رحمانی صاحب خیر پور کے معروف مذہبی ورکر محمودی صاحب، جناب سید عباس علی شاہ صاحب جیسے احباب موجود تھے۔ شاہ جی بڑے تعجب کے انداز میں بار بار فرما رہے تھے "یہاں مجھے کسی ولی اللہ کی خوشبو آرہی ہے"۔ تو محترم حکیم محمد نصیر الدین قریشی نے عرض کیا کہ "حضرت! یہاں مشہور صوفی اور شاعر خواجہ غلام فرید رحمتہ اللہ علیہ تشریف رکھتے تھے"۔ شاہ جی کی اس فراست پر تمام حضرات علماء عش عش کر اٹھے۔ ساتھ ہی شاہ جی یہ بھی فرماتے تھے کہ "میں اس لائق نہیں ہوں کہ یہاں بیٹھوں"۔ شاہ جی کا انداز تواضع اور کسر نفسی، یہ موصوف کا اپنا مقام تھا۔ جو ہر ایک کو نصیب نہیں ہوتا۔ میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا تین چار دن کی خدمت کے زمانہ میں شاہ جی نے کسی قسم کی فرمائش نہیں کی کہ "یہ لاؤ وہ لاؤ، وہ کرو، یہ کرو، میں یہ کھاؤں گا، میں اس وقت کھاؤں گا، میں نے وہاں جانا ہے" وغیرہ وغیرہ۔ منتظمین جلسہ یا میزبانوں پر موجودہ دور کے نام نہاد مبلغین کے سخت پریشان کن مطالبات جیسی کوئی مصیبت نہ ڈالتے تھے۔ جس کا نتیجہ تھا کہ جب تک شاہ جی خیر پور میں تشریف رکھتے تو لوگ زیارت کے شوق میں قیام گاہ کے ارد گرد ایک مجمع کی صورت میں نظر آتے۔ شاہ جی کو لوگوں کا ایک انبوہ اسٹیشن پر الوداع کرنے کے لئے جاتا

تھا۔ اور جب حضرت شاہ جی آنکھوں سے اوجھل ہوتے تو اکثر نیک لوگ اشک بار نظر آتے تھے۔

"حضرت امیر شریعت کی نگاہ میں علماء کا مقام"

۱۳۷۲ھ، ۱۹۵۲ء میں قصبہ قائم پور ضلع بہاولپور میں "معراج النبی" صلی اللہ علیہ وسلم کے موضوع پر احرار اسلام کے زیراہتمام ایک عظیم الشان جلسہ منعقد ہوا۔ جس کی سرپرستی اور صدارت حاصل پور اور قائم پور کی معروف شخصیت حضرت سید محمد عبداللہ شاہ صاحب فرما رہے تھے۔ سٹیج پر باوقار مذہبی رہنما اور علماء کرام اور کارکنان موجود تھے۔ حضرت شاہ جی اپنے پاکیزہ خطاب کو خطبۂ مسنونہ سے شروع فرما چکے تھے کہ سٹیج کے پیچھے مفتی غلام قادر صاحب تشریف لائے۔ شاہ جی اپنے خطاب ہی میں مفتی صاحب کو معانقہ و مصافحہ سے ملے اور قریباً پندرہ منٹ تک تمام علماء اور خصوصاً مفتی غلام قادر صاحب کی تعریف کرتے رہے۔ مفتی صاحب کے لئے فرمانے لگے کہ "دیکھو یہ مولوی مجھ سے قد میں چھوٹا ہے اور عمر میں بھی کم ہے۔ لیکن اس کا علم مجھ سے کہیں زیادہ ہے" اور کسر نفسی کی حد کرتے ہوئے فرما رہے تھے کہ "اگر میں کافی وقت تک علم کے حصول میں صرف کروں تو مفتی غلام قادر کے پایہ تک نہیں پہنچ سکتا"۔ اور ساتھ ہی مفتی غلا قادر صاحب کے لئے دعاء فرمائی۔ قدر افزائی کی یہ صفت شاہ جی رحمتہ اللہ علیہ کو اللہ تعالیٰ نے خاص طور پر ودیعت فرمائی تھی کہ جہاں شاہ جی تشریف لے جاتے وہاں کے مقامی علماء کی عزت و شان بنا کر آتے تھے۔(۱) اور یہی سنت ہے انبیاء علیہ السلام کی۔ ہر پیغمبر تشریف لا کر پہلے اپنے سے باہم زمانہ نبی کی تعریف و تصدیق کرتا۔ جیسے سیدنا موسیٰ علیہ السلام اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام اپنے اپنے زمانہ میں رحمت دو عالم حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی خوش خبری دیتے تھے اور نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے تشریف لانے کے بعد جملہ انبیاء علیہم السلام کی تصدیق فرماتے ہوئے امت کو تعلیم دی کہ ہم تمام سابقہ انبیاء علیہم السلام کو برحق سمجھتے ہیں۔ اور سب صحف و کتب سماویہ کو سچا مانتے ہیں۔ جیسے فرمایا گیا۔ آمنت باللہ وملائکتہ و کتبہ ورسلہ

مولانا محمد بخش بلوچ کی قدر افزائی

۱۳۷۴ھ، ۱۹۵۴ء راقم غلام احمد نے حضرت امیر شریعت، حضرت مولانا خیر محمد جالندھری، حضرت مولانا محمد عبداللہ صاحب درخواستی جیسے اکابر اور مفتی غلام قادر صاحب جیسے مقامی علماء کرام اور رؤساء حاجی میاں پیر بخش صاحب جلہ جیم، میاں جمال محمد صاحب ارائیں جلہ جیم، میاں سردار محمد صاحب لگری، خورد واہل جلہ جیم کے ایماء پر مدرسہ "خدام القرآن" جلہ جیم کی بنیاد رکھی۔ ابتدائی ایام میں ابھی میلسی، کہروڑ پکا، ٹبہ سلطان پور جیسے قصبات میں "دارالعلوم دیو بند" کے طرز پر کوئی منظم مدرسہ اور ادارہ نہیں تھا۔ ویسے

۲۔ بہت کم لوگوں نے اس عزت افزائی کی لاج رکھی ورنہ اکثریت نے اصاغر نوازی کا غلط فائدہ اٹھایا اور دین کی خدمت کرنے کی بجائے اپنی شخصیت سازی کے مکروہ کاروبار میں مبتلا ہوگئے۔ (مدیر)

منفرد علماء کرام آس پاس کے مقامات میں موجود تھے۔ کہروڑ پکا میں حضرت مفتی عبدالرحمن صاحب تھے۔ مجلس احرار اسلام کے بہت سے قابل ذکر ور کر اور جید کارکن حاجی نور محمد چوہان مرحوم چوک بخاری مسجد تالاب والی موجود تھے۔ "ویرسی واہن میں" مولانا شرف الدین صاحب، صوفی نور محمد مستری، "رائے واہن" میں حضرت صوفی احمد یار صاحب بزرگ تھے۔ گگری کلاں میں مولانا عبدالغفار صاحب، محبت پور میں مولانا عاشق محمد صاحب، "ملکو بستی" میں مولانا غلام نبی صاحب، بستی "چک بسی" میں مولانا عطاء محمد صاحب، میلسی شہر میں حضرت مولانا محمد بخش صاحب بلوچ جو چالیس سال سے مسجد مائی والی میں اپنے انفرادی مدرسہ میں بہت سے طلباء کو تعلیم دے رہے تھے۔ مولانا محمد بخش (مرحوم) کے مدرسہ مسجد مائی والی میں ۱۳۶۷ھ، ۱۹۴۷ء کے دوران مولانا فیض احمد صاحب مہتمم مکتبہ امدادیہ ملتان مفتی کلیم اللہ صاحب مہتمم تعلیم القرآن میلسی مولانا غلام سرور مرحوم استاذ خیر العلوم خیر پور ٹامیوالی، تعلیم حاصل کر رہے تھے۔ اس عالم با عمل مولانا محمد بخش صاحب بلوچ سے حضرت شاہ جی رحمتہ اللہ علیہ بہت محبت فرماتے تھے۔

مولانا موصوف ۱۳۵۷ھ، ۱۹۵۵ء میں بیمار ہوئے۔ ان پر فالج کا حملہ ہوا تو شاہ جی اپنی پیرانہ سالی کے باوجود خود فالج اور شوگر وغیرہ کے امراض سے سخت ضعف اور چالیس سالہ دینی و قومی خدمات سے لاحق تھکاوٹ کے باوجود حکیم حافظ محمد حنیف اللہ صاحب کو دو مرتبہ ملتان سے میلسی لائے اور سب مصارف علاج معالجہ خود برداشت کئے۔ علاقہ میلسی کے اطراف کی تمام مذہبی شخصیات نے بڑی حیرت سے یہ منظر دیکھا کہ شاہ جی ایک غریب اور سادہ، درویش منش عالم دین کی عیادت کے لئے باوجود اپنی بیماری کے تشریف لائے اور مولانا مرحوم کی سرپرستی فرمائی۔ جو مولانا محمد بخش صاحب کی سعادت تھی۔ حضرت مولانا محمد بخش صاحب رحمتہ اللہ علیہ نے راقم "غلام احمد" کو اپنی بیماری کے ایام میں مسجد مائی والی اور مدرسہ کی خدمت بحیثیت "نائب و قائم مقام" ہونے کے سپرد فرمائی۔ اور مسجد میں جمعہ کے دن بوجہ بیماری و کمزوری چارپائی پر لیٹ کر مقتدیوں کو وصیت فرمائی کہ "مولوی غلام احمد میرا روحانی بیٹا ہے۔ اور اطاعت گزار ہے۔ اس کو میں اپنی جگہ مسجد اور مدرسہ کی نیابت سپرد کر رہا ہوں۔ اس کے ساتھ تعاون کرنا"۔

انہیں ایام میں مولانا کی بیماری اور علاج کے سلسلہ میں حضرت شاہ جی کی خدمت میں مولانا مرحوم کی رفتار صحت کی اطلاع دینے کے لئے ملتان اُن کے مکان پر حاضر ہوا۔ حضرت شاہ جی نے مجھ سے مولانا محمد بخش صاحب کی صحت کے بارہ میں معلوم فرمایا۔ میں نے واقعہ کے مطابق قدرے صحت و تندرستی کی اطلاع دی۔ خیریت سنتے ہی بہت خوش ہوئے۔ والہانہ محبت کے انداز میں فرمانے لگے "معلوم نہیں کہ میرے دل کو کیا ہو گیا ہے؟ میں جو مولانا محمد بخش کے ساتھ محبت کرتا ہوں۔ وہ میرے دل سے نہیں نکلتے۔ اس لئے کہ وہ "بڑے عالم" ہیں اور میں علماء کا قدردان ہوں"! اس دوران راقم نے عرض کیا۔ "حضرت آپ کا مکان کرایہ پر ہے۔ آپ نے اپنا کوئی مکان الاٹ نہیں کرایا۔" اس پر شاہ جی نے ارشاد فرمایا۔ "بیٹا! اس کی وجہ یہ ہے کہ میں خود دار ہوں۔ سید ہوں، اکابر علماء دیوبند کا خادم ہوں۔ میں نہیں چاہتا کہ میں کسی سے سوال کروں" مزید فرمایا "بیٹا! آپ مولوی ہیں۔ میں اگر آپ کو خط لکھوں تو آخر میں لکھ سکتا ہوں "فدوی عطاء اللہ" مگر کسی ڈپٹی

کمشنر اور وزیر کو یہ لکھوں کہ "میری درخواست ہے۔ میں "فدوی عطاء اللہ ہوں "میری غیرت برداشت نہیں کر سکتی"۔ حضرت شاہ جی ایسے زاہد، عابد، مجاہد، سچے عالم دین، محافظ، ختم نبوت جن کی صفات کریمہ سے برصغیر کے تمام علماء کرام بخوبی واقف ہیں۔ میں کیا ہوں اور ان کے لئے کیا لکھ سکتا ہوں؟ اپنے آپ کو خود جانتا ہوں۔ اللہ تعالیٰ میرے حال پر رحم فرمائیں۔ (آمین) "غریب کی بے مثال ہمت افزائی" حضرت شاہ جی رحمتہ اللہ علیہ کے قدیم قریبی احباب اور بعد والے متعارفین جانتے ہیں کہ شاہ جی بڑے بڑے سرمایہ داروں کا ہدیہ قبول نہیں فرماتے تھے۔ مگر اپنے غریب اور سادہ محبین سے مختصر ہدیہ بھی بخوشی قبول فرمالیتے تھے۔ چنانچہ جلہ جیم کے ایک سادہ منش امام مسجد مولوی "محمد یعقوب" نامی جو تا حال حیات ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ "حضرت شاہ جی نے مجھ سے ایک چونی کا ہدیہ قبول فرمالیا۔ اور اس کو آنکھوں پر رکھ لیا تھا" اس طرح کے کئی واقعات حضرت امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاری کے سیرت نگاروں نے لکھے ہیں۔ اللہ تعالیٰ حضرت امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاری رحمتہ اللہ علیہ کو جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطاء فرمائیں اور ہم سب کو ان کے نقش قدم پر چلنے کی توفیق عطا فرمائیں۔ آمین۔!

زندگی

جدوجہد سے عبارت ہے۔ اسے ہم روح کا لباس بھی کہہ سکتے ہیں۔

انسان

لباس کے معاملہ میں مجاز ہے۔ اُجلا رکھے یا میلا کر دے۔

برائی بہرحال برائی ہے۔ جو انسان دوسرے کا بُرا چاہتا ہے وہ گویا اپنے یا اپنی اولاد کے لئے بدی کاشت کرتا ہے۔

سید عطاء اللہ شاہ بخاری
دفترِ احرار لاہور
دسمبر ۱۹۴۳ء

اِنِ الْحُکْمُ اِلَّا لِلّٰہ

طلباء عزیز

ہمارا اور آپ کا مستقبل یہ ہے کہ ہم اپنے والدین کی حسین امنگوں کا دلاویز شاہکار ثابت ہوں۔ ان کے خوابوں کی خوبصورت تعبیر بنیں اور انکی نیک خواہشوں کی تکمیل کریں۔ زیورِ علم سے آراستہ ہوں امتحانات میں نمایاں کامیابی حاصل کریں سامراجی تہذیب و تمدن سے جسم و روح کو بچائیں، سرمایہ پرستوں اور سوشلسٹوں کے ظلم و جبر اور کفر کے پھندوں سے بچیں۔ دنیا و آخرت کی فلاح ملک و ملت کے تحفظ اور بقا، اللہ ورسول کی خوبصورت بنیادوں پر دینی انقلاب کی جدوجہد کریں۔

ہمارا مقصد مکمل اسلامی نظام تعلیم کا نفاذ ہے۔ ہمارا نصابِ تعلیم قرآن و حدیث و فقہ و تفسیر سے آراستہ کیا جائے۔ ہماری منزل حکومت الٰھیہ کا قیام، ہماری جدوجہد دینی شعور کی بیداری

ہم چاہتے ہیں کہ (۱) مخلوط نظام تعلیم ختم کیا جائے۔ (۲) عورتوں کیلئے الگ کالج اور یونیورسٹیاں بنائی جائیں۔ (۳) لارڈمیکالے کے بنائے ہوئے نظام تعلیم کو ختم کیا جائے۔

ہماری تنظیم: توحید و ختم نبوت اور اسوۂ صحابہ کرام رضی اللہ عنھم کی روشنی میں طلباء کے اجماعی عقائد اور قومی حقوق کے تحفظ کی علمبردار ہے۔

ہمارا راستہ: اللہ کا راستہ ہے، حکومت الٰھیہ کی مقدس منزل کا راستہ ہے۔

ہمارے محاذ: دشمنِ خدا، و دشمنِ رسول و دشمنِ ازواج و اصحابِ رسول ﷺ ان کے علاوہ کسی بھی فروعی اختلاف رکھنے والے کسی فرقہ سے ہمارا کوئی اختلاف نہیں۔

آئیے اور فیصلہ کیجئے کہ آپ آج بیکار نہیں بیٹھیں گے اور ۴۷ء ۴۹ء ۶۵ء اور ۷۱ء کے شہداء کے پاکستان کو قول و قلم اور فکر و عمل کی سچی اور سچی قوتوں سے غلامان محمد ﷺ کا پاکستان بنائیں گے۔ اللہ کی حاکمیت کا بول بالا کریں گے اور حکومت الٰھیہ قائم کریں گے

ہے سربسر تباہی انسان کی حکومت
قائم کرو جہاں میں قرآن کی حکومت

تحریک طلباء اسلام پاکستان مرکزی دفتر: دارِ بنی ہاشم، مہربان کالونی ملتان

اقلیم خطابت کا شہنشاہ

تو کہ اقلیم خطابت کا شہنشاہ بھی تھا
اک قلندر کی طرح مردِ خود آگاہ بھی تھا
ایک درویش خدا مست و بہی خواہ بھی تھا
ہمرہِ تیغ زباں سید جنگاہ بھی تھا
تونے مجبور زبانوں کو نوا دی جس دم
انقلابات کے تذکار تھے گردن زدنی
جس نے آزاد فضاؤں کا کبھی نام لیا
اس پہ ہر وقت ہی تیار تھی نیزے کی انی
لوحِ تاریخ پہ کندہ تیری عظمت کے نقوش
تونے یخ بستہ عزائم کو حرارت بخشی
خال و خد ملت ترساں کے سنوارے تونے
حریت کیش رفیقوں کو جسارت بخشی
عرصۂ جُہد کو پُرکیف کیا تھا تونے
چشمۂ علم کو عرفان دیا تھا تونے
تختِ افرنگ کی زنجیر غلامی کاٹی
ملتِ پاک کا ہر چاک سیا تھا تونے

سید محمد یونس بخاری

اقبال اور بخاری

حیاتِ ملی کی تصویر کے دو رخ

باری علیگ

میری تمام عمر اسلامی علوم کے مطالعہ میں صرف ہوئی ہے۔ (اقبال)

میں جب سے میدانِ سیاست میں اترا ہوں اپنی کتابوں کی گرد تک نہیں اتار سکا۔ (بخاری)

دو سال پیشتر ملت کی اس آواز کے ذریعہ میں نے بزرگوں اور جوانوں کو علامہ اقبال کے عنوان سے ایک پیام بھجوایا، وہ پیام کسی بیرونی تاثرات کا نتیجہ نہ تھا۔ بلکہ دلی جذبات کا اظہار تھا میں نے لکھا تھا۔

اے مشرق کے مایہ ناز فرزند اے روحانیت کے پتلے اے خودداری کے مجسمے کیا تجھے بھی مینائے فرنگ کی شراب نشۂ غلامی میں سرشار رکھے گی؟ اے اقبال تیری تصانیف اطراف عالم میں پھیلیں۔ السنہ عربیہ میں ان کے تراجم ہوئے تیرا کلام دنیا کے کتب خانوں کی زینت بنا (مشرق میں) بادشاہ جمہوریت کا صدر، وزیر تعلیم، پولیس کا سپاہی فوج کا جرنیل، عسکری، دہقان مزدور سب کے سب تیری انقلاب انگیز تعلیم سے یکساں متاثر ہوئے مگر تو ان سب کو بیدار کر کے خواب ناز میں سو گیا۔ کیا یہ تیری کم شہرت تھی اگر تیرے خرمن ہوس میں چند مزید دانوں کی جگہ تھی تو ہمیں کہتا کہ تجھے اپنے ملک کا نہیں بلکہ اپنے دلوں کا بادشاہ بناتے۔۔۔۔۔۔ اقبال! پیارے اقبال بے وفا اقبال خوددار بن اٹھ مغرب پرستی کو چھوڑ، میدانِ عمل میں آ کہ تیرے ترانہ ہائے انقلاب نے نوجوانوں کے دلوں میں آگ لگا دی ہے۔ وہ موت کو غلامی کی زندگی پر ترجیح دیتے ہیں تجھے چاہیئے تھا کہ سیاہ جُبہ میں ملبوس ہو کر قریہ بہ قریہ خودداری، عمل و آزادی کے ترانے اپنی دلکش آواز سے گاتا اور پھر دیکھتا کہ زنانِ مصر کی طرح فرزندانِ ہند یوسفِ پنجاب کے حسن سے مسحور ہوئے ہیں یا نہیں۔

اقبال تو صیاد ہے تو نے نوجوانوں کو اپنے اشعار کے جال میں پھانس رکھا ہے نہ تو انہیں آزاد کرتا ہے اور نہ انہیں رشتۂ پیار کے کسی قفس میں بند کرتا ہے۔

بخاری کو رئیس الاحرار[۲] نے "ساحرِ پنجاب" کہا تھا۔ ان کی مصلحت اندیش عقل نے شمالی ہند کے سب سے بڑے مقرر کو سمجھنے میں دھوکا نہیں کھایا یقیناً بخاری ایک ساحر مصلح ہے جو حق و صداقت کی جادو بیانی سے لوگوں کے دلوں کو مسحور کر دیتا ہے وہ اپنے اقوال سے مجلس احرار اسلام کے بدترین دشمن کو اپنا دوست بنا لیتا ہے۔ وہ اپنے افعال سے منہ پھٹ اور دریدہ دہن مخالفوں کو ہمیشہ کے لئے خاموش کر سکتا ہے۔ نپولین کی ترقی کا راز اس کے اقوال تھے لیکن بخاری کی ترقی کا راز اسکے اقوال اور افعال دونوں ہیں وہ ایک ہی وقت میں امام شریعت اور عساکر اسلامیہ کا سپہ سالا ہے وہ آزادی کامل کا علمبردار ہوتے ہوئے بھی مسلم حقوق کا پاسبان ہے۔ وہ تاتاری شجاعت اور آلِ حسینؓ کی شرافت کو پہلو بہ پہلو لئے ہوئے ہے۔ وہ فکر سیاسیہ کے ساتھ ساتھ جذبہ حربیہ کی بھی پرورش کرتا ہے۔ وہ قرونِ اولیٰ کے اسلامی مجاہدین کی ایک یادگار ہے۔

۱۔ روزنامہ "زمیندار" لاہور۔ یادگار شہید نمبر ۷ ارجب ۱۳۵۰ھ مطابق ۲۸ نومبر ۱۹۳۱ء جلد ۱۸ شمارہ ۲۵۳) ۲۔ مولانا محمد علی جوہرؒ

سیاسی غلامی کا لازمی نتیجہ تمدنی، معاشری، اخلاقی اور ذہنی غلامی ہوتا ہے۔ قومیں غلام ہو کر احساس خودداری کھو بیٹھتی ہیں۔ حکمران قوم اسے مفلوج تصور کرتے ہوئے اپنے مظالم کی فہرست میں اضافہ کرتی ہے۔ جس کا ردعمل احساس زیادہ ہوتا ہے برسوں کے بعد احساس تخیل کی صورت لیتا ہے۔ آخر کار کسی مرد مجاہد کی ہمت سے تخیل کی جگہ عمل لے لیتا ہے۔ سطح ارضی پر جس قوم نے خیالی انسان اور مرد مجاہد کو پہچان لیا اور اس کا تتبع کیا وہ دنیا میں غلام نہ رہ سکی خیالی انسان اور مرد مجاہد کا ظہور اکثر ایک ہی زمانہ میں ہوتا ہے بعض دفعہ دونوں کے درمیان کچھ فاصلہ بھی ہوتا ہے۔

جب فرانس کو روسو اور نپولین، المانیہ کو گوئٹے اور بسمارک، اطالیہ کو میزینی اور گیری بالڈی، روس کو ٹراٹسکی اور لینن، ٹرکی کو خلیل اور کمال اور مصر کو محمد عبدہ اور مہدی سوڈانی نصیب ہوئے تب لوگوں نے ان کے افعال اور اقوال کی پیروی کی اور آزادی کی نعمت سے مالامال ہوگئے بد نصیب افغانستان نے جمال الدین اور امان اللہ کے اقوال و افعال ان کی گفتار و کردار کی جب پرواہ نہ کی تباہ و برباد ہوگیا۔ قدرت ہر ملک و ملت میں ایسے اصحاب پیدا کرتی ہے۔

قدرت نے اس تخیل اور عمل کی بانٹ میں پنجاب کو کیا دیا؟

اے پانچ دریاؤں کی سرزمین! ناز کر کہ تجھے اقبال اور بخاری ملے ہیں اے پنجاب کے نوجوان اپنے ذہنی ارتقاء کے لئے اقبال کا مطالعہ کر اور اپنی قوت عملیہ کو بڑھانے اور اپنے سینہ کے اندر نفس گرم پیدا کرنے کیلئے بخاری کے افعال کا تتبع کر کے اکھاڑے میں آ۔ اے پنجاب کے نوجوان! تو "بانگ درا" کا مطالعہ کر اور مجلس احرار اسلام میں شامل ہوجا۔ اقبال اور بخاری پنجاب کے دو اطبا ہیں روحانی امراض کو دور کرنے کے لئے احرار کارکن بن جا۔ اقبال کے شفاخانہ میں فکری تباہی اور سیاسی جمود کا مؤثر علاج ہے تو بخاری کے یہاں روحانی تربیت، دینی غیرت اور حریت فکر کا سبق موجود ہے۔

ازل سے فطرت احرار میں ہے دوش بدوش
قلندری و قبا پوشی و کلہ داری
(اقبال)

اک مرد صد صفت

تقدیس کے لغت میں خدا کا ولی ہے تُو — دیباچۂ حیات میں حرفِ جلی ہے تُو
گفتار میں عرب کی بلاغت لئے ہوئے — کردار میں عجم کی جلالت لئے ہوئے
سوچوں میں سوز شمع خلافت لئے ہوئے — دھڑکن میں سازِ عشقِ رسالت لئے ہوئے
اک مردِ صد صفت کہ جماعت کہیں جسے — ایسا فقیر امیرِ شریعت کہیں جسے
میرا نسب یہی ہے یہی میرا نام ہے — جو عاشقِ رسول ہے، میرا وہ امام ہے

انور جمال

شورش کاشمیری ؒ

اقبال اور سید عطاء اللہ شاہ بخاری

"اج او ہوندا، تے ایناں کرگساں نوں دسدا کہ بخاری غدار اے کہ فدا کار، میں کِنوں کواں، میرے تے ساتھی ای میرے کولوں وچھڑ گئے تے یاں پچھڑ گئے نے"

علامہ اقبال کا ذکر ہو رہا تھا۔ شاہ جی نے ایک سرد آہ بھری اور کہا "اقبال زندہ ہوتا تو پھر ان کرگسوں کو بتاتا کہ بخاری غدار ہے یا فدا کار۔ میں کسے کہوں میرے ساتھی ہی مجھ سے بچھڑ اور پچھڑ گئے ہیں۔

شاہ جی فرماتے تھے جب کبھی میں ان کے ہاں حاضر ہوتا وہ چارپائی پر گاؤ تکیہ کا سہارا لے کر بیٹھے ہوتے، حقہ سامنے ہوتا، دو چار کرسیاں بچھی ہوتیں، صدا دیتا، یا مرشد! فرماتے، آ بھئی پیرا، بہت دناں بعد آیا ایں (بہت دنوں بعد آئے ہو) علی بخش سے کہتے حقہ لے جاؤ اور کلّی کے لیے پانی لاؤ، کلّی فرماتے پھر ارشاد ہوتا، ایک رکوع سناؤ، میں پوچھتا حضرت! کوئی تازہ کلام؟ فرماتے، ہوتا ہی رہتا ہے۔ عرض کرتا، لائیے، کاپی منگواتے، پہلے رکوع سنتے، پھر وہ اشعار، جو حضور ﷺ سے وابستہ ہوتے، قرآن پاک سنتے وقت کانپنے لگتے تھے لیکن جب حضور ﷺ کا ذکر ہوتا یا ان سے متعلق کلام پڑھا جاتا تو چہرہ اشکبار ہو جاتا۔ حضور ﷺ کا ذکر ہمشہ باوضو شخص سے سنتے اور خود ان کا نام بھی باوضو ہو کر لیتے تھے۔ حضور ﷺ کے ذکر پر اس طرح روتے جس طرح ایک معصوم بچہ ماں بغیر روتا ہے۔

افراد اور اشخاص اور واقعات و حالات کے بارے میں ان کا تجزیہ حیرت انگیز طور پر درست ہوتا تھا، شاہ جی کا بیان ہے کہ مجھ سے اکثر لوگوں کے بارے میں گفتگو فرمایا کرتے اور ان کی سیرتوں کا اجمالی خاکہ پیش فرماتے، سرکار کی بیشتر باتیں انہی کی وساطت سے ہم تک پہنچتی تھیں۔ پہلے خود ہی طرح دیتے پھر احتراز فرماتے۔ بھئی دلی دروازے کے باغ میں لوگوں کو بتا دو گے؟ پھر بتا بھی دیتے، فرماتے، اپنی ذات تک محدود رکھنا، لطف یہ تھا کہ اپنے سبھی معتمدین کو بتاتے چلے جاتے اور سبھی کو یہ مشورہ دیتے کہ اپنے آپ تک محدود رکھنا اور جب بات بکھر جاتی تو فرماتے، تم لوگ راز نہیں رکھ سکتے ہو؟ عرض کی جاتی کہ آپ ہی نے تو فلاں فلاں کو بتایا ہے، پھر مسکراتے، اچھا تو عام ہو جانے دو، اس میں راز کی کونسی بات ہے؟

ایک دفعہ (بروایت شاہ جی) جلسوں کی رونق پر گفتگو کرتے رہے، کہنے لگے عامۃ المسلمین میں بڑی جان ہے۔ اس قوم کا مزاج حرارت سے بنا ہے، یہ بجھنے کے لیے پیدا نہیں کی گئی۔ ساری خرابی لیڈر شپ کی ہے۔ خواص تو خیر عضو معطل ہیں، انہیں اپنے جسم کا عیش چاہیئے۔ لیڈر گم کردہ راہ ہیں۔ لوگوں کو صحیح راستہ پر نہیں لاتے۔ عرض کیا، حضرت یہ بھی آپ نے مفروضہ قائم کر لیا ہے، قوم خود ہی صحیح راہ پر نہیں آتی؟ آپ کیلئے عامۃ المسلمین کس طرح تڑپتے ہیں لیکن آپ مجمع میں آتے ہی نہیں؟

"نہیں، پیر جی، یہ بات نہیں میرا مجمع میری کتابیں ہیں، میں ہجوم و افکار میں اس طرح کھڑا رہتا ہوں کہ بسا

اوقات فرصت کے اوقات ہی عنقا ہوجاتے ہیں" ٹھیک ہے مرشد! میں نے تو کبھی اپنی کتابوں کی گرد بھی نہیں جھاڑی ہے"
"او شاہ جی تساں تے دلاں تے دماغاں دیا مٹی جھاڑدے او" (شاہ جی آپ تو دلوں اور دماغوں کی گرد جھاڑتے ہو)

شاہ جی نے یہ بیان کیا تو ان کی آنکھوں میں آنسو آگئے فرمایا ہائے کیا انسان تھا جدید دانش اور قدیم حکمت کا نقطۂ معراج، چونکہ میاں ﷺ سے محبت کرتے تھے اس لئے اللہ نے ان پر علم ودانش اور فکر و نظر کی سبھی راہیں کھول دی تھیں۔ وہ میدان کا کھلاڑی نہیں تھا لیکن علم اس کا خانہ زاد تھا۔

آج جو پشتینی وفادار! شاہ جی نے فرمایا اس کا نام لے لے کر اس کے ہمنشینوں کی فہرست میں اپنا نام لکھوار ہے ہیں، کسی علمی مسئلے پر اقبال نے کبھی ان سے مخاطبت کی؟ کبھی ان سے کوئی دینی سوال کیا، کبھی ملی امور پر ان سے ازخود گفتگو کی، کبھی مسلمانوں کے مستقبل کا سوال ان سے زیر بحث لاتے رہے؟ ان کے ساتھ تو ان کے زیادہ سے زیادہ لاغر قسم کے مجلسی روابط تھے۔

شاہ جی نے کہا یہی وہ لوگ جو اقبال کی راہ میں ہمیشہ مزاحم ہوتے رہے انہی لوگوں نے اقبال کے خلاف مخبریاں کی تھیں اور انہیں کسی منصب پر فائز نہیں ہونے دیتے تھے۔ اقبال نے مجھ سے آنکھوں میں آنسو لاکر کہا تھا "شاہ جی! ان خاندان فروشوں کی سیاہ دلی کی حد ہوگئی، خوف خدا سے بھی عاری ہوچکے ہیں۔ میرے بارے میں ہائیکورٹ کے چیف جسٹس اور گورنر صوبہ کو عرضداشت بھجوائی ہے جس میں مجھے ایک ایسے ذوق سے متہم کیا ہے جس کا تصور بھی شرافت کو مرجھا دینے کیلئے کافی ہے"۔

شاہ جی نے بتایا یہ بیان کرتے ہی ان کا بدن کانپنے لگا کہ انسان مخالفت اور مخاصمت میں کس حد تک سنگدل، سیہ رو اور گندہ ضمیر ہوجاتا ہے۔

شاہ جی کی روایت ہے کہ فرنگ دشمنی سے ان کے خون کا قطرہ قطرہ انگاروں میں ڈھلا ہوا تھا وہ یورپی تہذیب، یورپی دانش، یورپی سیاست اور یورپی سج دھج کے سخت دشمن تھے، کہا کرتے تھے کہ ہمارا مغرب زدہ طبقہ اپنے خصائص کھوچکا ہے اس کے اندر مشرق کی روح بالکل نہیں رہی یہی وجہ ہے کہ قوم کی خودی اپنی قیمت کھو بیٹھی ہے۔ لوگ علم کی سنجیدگی سے ہاتھ اٹھا کر نٹوں کا تماشا دیکھنے میں غلطاں ہیں۔

کاسہ لیس خاندانوں کا ذکر بڑی حقارت سے کرتے یہ طنطنہ میں نے صرف انہی میں دیکھا کہ جن سے نفرت کرتے، انہیں اپنے گھر میں بھی گھسنے نہیں دیتے تھے اور اگر کوئی کسی بہانے چلا آتا تو اسے دھتکار کر نکال دیتے ورنہ منہ نہیں لگاتے تھے۔

ایک دفعہ فرمایا شاہ جی میں مطمئن ہوں کہ میرا کلام لوگوں کے رگ و پے میں اتر رہا ہے لیکن ابھی کارواں تیار ہورہا ہے، ابھی کارواں بنا نہیں سفر، راستہ اور منزل تو دور کی چیزیں ہیں جب تک مشرق، مغرب کی ذہانت کو للکارے گا نہیں، اس وقت تک مشرق کی عظمت کا سورج نہ کبھی ابھر سکتا ہے اور نہ اس کے نصف النہار پر پہنچنے کا سوال ہی زیر غور آسکتا ہے۔ شاہ جی یہ عموماً فرماتے:

"کاش اقبال آج زندہ ہوتے، ان کا دماغ ایک عظیم الشان تنہائی کا عظیم الشان کتب خانہ تھا۔ جب کبھی ان کی ہمنشینی کا موقع ملتا معلوم ہوتا تھا کہ لالہ زار کھل گیا ہے۔ مطبوعہ سالنامہ "چٹان" ۱۹۶۲ء لاہور

شاہ جی کی خطابت

رعد کی گونج، بادل کی گرج، ہوا کا فراٹا، فضا کا سناٹا، صبح کا اجالا، چاندنی کا جھالا، ریشم کی جھلملاٹ، ہوا کی سرسراہٹ، گلاب کی مہک، سبزے کی لہک، آبشار کا بہاؤ، شاخوں کا جھکاؤ، طوفان کی کڑک، سمندروں کا خروش، پہاڑوں کی سنجیدگی، صبا کی چال، اوس کا نم، چنبیلی کا پیراہن، تلوار کا لہجہ، بانسری کی دھن، عشق کا بانکپن، حسن کا اغماض اور کہکشاں کی مسجع و مقفّٰی عبارتیں انسانی آواز میں ڈھلتے ہی خطابت کی جو صورت اختیار کرتی ہیں اس کا جیتا جاگتا مرقع شاہ جی تھے۔

امیر شریعت کی یاد میں

اے امیر کارواں اے رہنمائے انقلاب
چاروں جانب ہیں مہکتے تیری چاہت کے گلاب
قوم کی حالت نے تجھ کو کر دیا تھا مضطرب
ایک اک لمحہ تیرا تھا اضطراب و اضطراب
دیدنی تھی قصر شاہی پر تیری یلغار حق
تو ہوا میدانِ رُستا خیز میں یُوں کامیاب
میرزائی ہیں جُدا اب ملت اسلام سے
اس میں شامل ہے تیری کاوش مثالِ آفتاب
تھی تیری تقریر بے شک بے مثال و بے نظیر
کون لائے گا ترے حُسنِ تلاوت کا جواب
غلغلہ تھا دشمنوں میں بھی تیرے کردار کا
تُو ہی تھی ہر دل کی دھڑکن تو ہی تھا عزت ماب
ہے حقیقت بس وہی جو تو نے کر دی تھی عیاں
اور سب کچھ وقت کی آنکھوں میں تھا مثلِ سُراب
تجھ پہ جو الزام تھا رد ہو گیا ہے وقت سے
تیرے نکتہ چیں ہوئے ہیں شرم سے اب آب آب
فقرو درویشی تیری ہے آج بھی ضرب المثل
تیری ٹھوکر میں رہا انگریز کا قہر و عتاب
گنگ لمحوں کو دیا ہے تو نے وہ درس جنوں
جوش سے پیدا ہوئے ہیں موجِ دریا پر حباب
دھر سے تھا مختلف آواز کا جادو تیرا
تیرے لب پر دیدنی تھی زینت امُ الکتاب
عزم و ہمت، حق پرستی، صدق گوئی، بانکپن
تھے سدا تیرے جہادِ زندگی میں ہمرکاب
ہے فسردہ دل جُدائی میں تیری خالد ترا
رحمت حق ہو تیری تربت پہ بے حد و حساب

پروفیسر خالد شبیر احمد

پروفیسر اسلم انصاری

خطیب عصر کمالِ خطابت کے آئینے میں

عذرِ جسارت

برصغیر سے انگریزی استعمار کا رخصت ہونا آسان کام نہیں تھا۔ اس عفریت نے سترہویں صدی میں برصغیر کے جسد میں اپنے پنجے گاڑے اور اٹھارویں صدی کے وسط تک اپنے سیاسی اور تہذیبی تسلط کو تکمیل تک پہنچا دیا۔ بیسویں صدی جو برصغیر کی سیاسی بیداری کی صدی تھی، گزشتہ صدی کی طرح مسلمانوں کے لئے بہت سی کڑی آزمائشیں لے کر آئی۔ یہ ایک طرف فکر و نظر اور فہم و فراست کی امتحان گاہ تھی، تو دوسری طرف ذوقِ عمل کی مبارز طلبی بھی تھی۔ یہ اگر ایک سطح پر آئینی حقوق کے حصول کی جنگ تھی تو دوسری سطح پر قید و بند، تعزیر و زنجیر اور طوق و سلاسل کی جھنکاروں کا سفر بھی تھا۔ اس سفر میں جن لوگوں کے چہرے حریف وقت کی تابنا کیٔ شمشیر سے گلگوں رہتے تھے ان میں خطیب عصر حضرت عطاء اللہ شاہ بخاری رحمۃ اللہ علیہ کی شخصیت اور ان کے فکر و عمل کے درخشندہ پہلو ہماری ملی تاریخ کا حصہ بن چکے ہیں۔ ان کا سفر تحریک خلافت سے شروع ہوا اور راستے میں تحریک کشمیر جیسے کئی صبر آزما اور جاں طلب پڑاؤ آئے۔ ان کی حریت پسندی کا بانکپن ہر مرحلۂ سفر میں دلآویز، عشق انگیز بلکہ جنوں خیز ثابت ہوا۔ حریت پسندی اور عشقِ رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کو انہوں نے زندگی کا بنیادی رویہ بنانے میں بہت اہم کردار ادا کیا۔ ان کی خطابت نے دلوں کے تاروں کو نہ صرف چھو لیا بلکہ تار تار کو ساز حدی خواں بنا دیا۔ ان کی وجاہت عملی اور جلالت فکر و عمل نے عوام الناس کے دلوں میں ان جانے جذبوں کے چراغ روشن کئے۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ وہ ایک ایسے فصاحت مآب خطیب بن کر اُبھرے اور دنیا کی نظروں میں سمائے جس کے آہنگ خطابت نے حرف و معنی کی ایک یکسر نئی دنیا آباد کر ڈالی۔ مجھے اپنے زمانۂ طالب علمی میں چند بار ان کی خدمت میں حاضر ہونے کی سعادت میسر آئی اور ہر بار ان کی شخصی عظمت کا نقش میرے دل میں گہرا ہوتا گیا۔ بعد کے سالوں میں مجھے ان کے فرزندان گرامی سے نیاز حاصل ہوا۔ اور "الولد سر لابیہ" کی حقیقت آشکار ہوئی۔ بالخصوص مولانا سید عطاء المحسن بخاری اور مولانا سید عطاء المومن بخاری کی انسان دوستی اور دوست نوازی نے ہمیشہ میری قدر افزائی کی۔ آج سے چند برس پیشتر سید عطاء المحسن بخاری نے شاہ صاحب علیہ الرحمہ کی یاد میں منعقد کی جانے والی ایک تقریب میں مجھے اظہارِ خیال کا حکم دیا۔ اپنی حدود کو جاننے کے باوصف میرے لئے امتثالِ امر کے سوا چارہ کار نہ تھا۔ ذیل کی یہ سطور اسی "اظہار خیال" کا حاصل ہیں جو کم ارزش ہونے کے باوجود حضرت ابنِ امیر شریعت کی محبت اور توجہ کی بدولت منضبط ہو گئیں اور محفوظ رہیں۔ اب انہیں کے ایماء پر میں نے ان پر نظرِ ثانی کی ہے۔ یہ جو کچھ ہے اسے اس بطلِ حریت اور خطیب عصر کے حضور ایک طالب علم کا نذرانۂ عقیدت خیال

کرنا چاہیئے اور اس کا مطالعہ اسی نقطۂ نظر سے کرنا چاہیئے۔ یہی میرا عذرِ جسارت ہے۔ اور عذر کے بارے میں اہلِ عرب کا قول فیصل ہے۔ "والعذر عندالکرام مقبول"

ارفعیت : ایک آہنگ

محترم سامعین!

یہ امر میرے لئے صد گونہ باعث حیرت ہے کہ میں آج کی تقریب میں کیا کہوں۔ میں مقرر بھی نہیں، خطیب بھی نہیں، خوش بیاں بھی نہیں، اہل زباں بھی نہیں، لیکن ابن امیر شریعت حضرت سید عطاء المحسن بخاری کو مجھ سے حسن ظن ہے اور اس حسنِ ظن کے نتیجے میں میں حاضر ہوا ہوں۔ لیکن مسئلہ یہ ہے کہ یہ اسٹیج مجلس احرار اسلام کا اسٹیج ہے جس کے بارے میں ارشد ملتانی صاحب نے صحیح فرمایا ہے کہ یہ شہسواران خطابت کا اسٹیج ہے۔ آج سے نہیں نصف صدی سے اور اس سے بھی پہلے سے یہ واقعی شہسوارانِ خطابت کا اسٹیج رہا ہے۔ جس کی مثال برصغیر کی علمی، ادبی، تہذیبی ثقافتی زندگی میں کم ہی ملے گی۔ پھر موضوع حضرت امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاری ہیں جن کی خطابت بے مثال ہے۔ جن کی شخصیت جامعِ کمالات ہے اور جن کی یاد آج بھی دلوں میں جاگزیں ہے۔ میں نے بہت کم دیکھا شاہ صاحب کو مگر دیکھا ہے۔ میں نے ان کے خطاب کو بہت کم سنا مگر سنا ہے۔ مجھے ان کی صحبت سے فیض اٹھانے کا بہت کم موقعہ ملا مگر ملا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آج میں جرأت کر رہا ہوں کہ چند باتیں خراجِ عقیدت کے طور پر آپ حضرات کے سامنے عرض کروں۔ جن لوگوں نے شاہ صاحب کو سنا ہے، ان سے ملے ہیں، ان سے فیض صحبت اٹھایا ہے وہ حیران ہوتے ہیں کہ ان لوگوں کو کیا بتائیں؟ جنہوں نے ان کو نہیں سنا یا جو ان سے نہیں ملے۔ کن لفظوں میں بتائیں؟ کس پہلو کو لیں؟ کس کس بات کا تذکرہ کریں؟ الفاظ میں وہ شان و شوکت، وہ عظمت، وہ طنطنہ، وہ گونج، وہ نغمگی کہاں سے لائیں جو قدرت نے جو مبدأ فیاض نے شاہ صاحب کو عطا فرمائی تھی۔

کیا معاصرین میں کوئی ایسی شخصیت ہے؟ کہ جس سے مشابہت دے کر سمجھایا جا سکے کہ شاہ صاحب ایسے تھے۔ جو لوگ شاہ صاحب سے ملے ہیں اور انہوں نے ان کو سنا ہے وہ لوگ حیران ہیں اور جن لوگوں نے نہیں دیکھا نہیں سنا ان کو دیکھ کر حیران ہوتے ہیں کہ آخر یہ کس نادرِ روزگار شخصیت کا تذکرہ ہے۔ شاہ صاحب کی شخصیت کے مختلف پہلو ہیں۔ جن کا ابھی تذکرہ ہوا۔ لیکن میں سمجھتا ہوں کہ احاطہ نہیں ہو سکتا۔ میری ایک مشکل یہ بھی ہے کہ میں بہت کم شاہ صاحب کو مل سکا، بہت کم سن سکا، بہت کم استفادہ کر سکا، ایسی یادیں بھی نہیں جن کو تفصیل کے ساتھ بیان کروں۔ لیکن ادب کا طالب علم ہونے کی حیثیت سے میرا ایک موضوع، ابلاغ بھی ہے۔ ابلاغ کا مطلب ہے اپنی بات کو دوسروں تک پہنچانا، تبلیغ اسی سے ہے۔ انگریزی میں اسے کمیونیکیشن (COMMUNICATION) کہتے ہیں۔ ایک بات دفعِ دخلِ مقدر کے طور پر کہنا چاہتا ہوں۔ یہاں علماء کرام بھی موجود ہیں۔ مشرقی علوم اور ادبیات کے فضلاء بھی یہاں تشریف فرما ہیں۔

ایک بات بطور اعتذار کے عرض کرنا چاہتا ہوں۔۔۔۔ گفتگو میں اگر کچھ اجنبیت محسوس ہو تو اسے تھوڑی دیر کے لئے گوارا فرمایئے۔ مجھے آپ کے حسنِ سماعت پر پورا یقین ہے کہ آپ میری کج مج بیانی کو بھی موضوع کے احترام میں اعتبارِ کلام بخشیں گے۔ ابلاغ کا مطلب ہے اپنی بات کو دوسروں تک پہنچانا، انگریزی میں اسے کہتے ہیں کمیونیکیشن! یہ اس زبان کا لفظ ہے جس سے شاہ صاحب بہت نفرت فرماتے تھے! اس موضوع پر بے شمار کتابیں لکھی گئی ہیں۔ اور اس کے ذیل میں بہت سی چیزیں آتی ہیں۔ بولنے والے کی نفسیات، سننے والے کی نفسیات، موضوع جس پر ہم گفتگو کر رہے ہیں، وہ پیرایۂ بیان جس کو ہم نے گفتگو کرنے کے لئے اختیار کیا، وہ خیالات جو ہم منتقل کرنا چاہتے ہیں اور پھر خطابت جس کے کئی شعبے ہیں۔ جس کی کئی شاخیں ہیں۔ فصاحت ہے، بلاغت ہے، عبارت آرائی ہے، خیال آفرینی ہے، بذلہ سنجی ہے، نکتہ آرائی اور نکتہ آفرینی ہے، کمیونیکیشن کے بہت سے شعبے ہیں اور بہت سے پہلو ہیں۔ جس سے آج کی علمی دنیا آباد ہو رہی ہے۔ ہمارے تعلیمی نصابوں میں یہ مضمون زیادہ مروّج نہیں، اس کی ایک شاخ ابلاغِ عامہ پڑھائی جاتی ہے۔ اور اسے عام طور پر صحافت سے متعلق سمجھا جاتا ہے۔ عوام الناس سے گفتگو کرنا ہو اور اپنی بات عوام الناس تک پہنچانا ہو تو کیسے پہنچائی جائے۔ ابلاغ ایک ایسی حقیقت ہے کہ جس کے بغیر انسانی زندگی کی کوئی عمارت، کوئی ڈھانچہ کھڑا نہیں ہو سکتا۔ ہماری پوری زندگی کا دارومدار، پوری زندگی کی سرگرمیوں کا انحصار الفاظ کے ذریعے ابلاغ پر ہے۔ خواہ تقریر یا گفتگو کی صورت میں ہو خواہ تحریر کی صورت میں۔ اور الفاظ کے اتنے بے شمار پہلو ہیں، اس کی اتنی نزاکتیں ہیں، اس میں حسن کے، معنی آفرینی کے، اتنے پہلو ہیں کہ یہ بذاتِ خود ایک الگ مبحث، ایک الگ موضوعِ گفتگو ہے۔

شاہ صاحب کی خطابت کو ہماری درسگاہوں کے نصابوں کا حصہ ہونا چاہیئے تھا۔ دنیا کے علماء بلاغت نے اور آج کے ائمہ علمِ خطابت نے جو معیار مقرر کئے ہیں، جو پیمانے دیئے ہیں، اظہار خیال کو جانچنے کے۔ شاہ صاحب کی خطابت صرف یہی نہیں کہ ان پر پوری اترتی ہے بلکہ ان سب پیمانوں اور معیاروں سے ماورا کچھ اور بھی ہے:

یار ما ایں دارد و آں نیز ہم

یعنی اگر شاہ صاحب کی خطابت کو سامنے رکھ کر نصاب مرتب کیا جائے ابلاغ کا، جو آج کی یونیورسٹیوں میں پڑھایا جاتا ہے تو بہت سی خصوصیات خطابت کا اضافہ کرنا پڑے گا۔ اور بہت سے نئے پہلو سامنے لانا پڑیں گے۔ اس لئے کہ شاہ صاحب ان خطیبوں میں سے نہیں جو الفاظ کو پکڑ کر زبردستی لاتے ہیں۔ اردو کے ایک شاعر کے بارے میں کہا جاتا رہا ہے کہ زبان ان کے گھر کی لونڈی ہے، محاورے ان کے غلام ہیں، اور الفاظ ان کے سامنے ہاتھ باندھے کھڑے رہتے ہیں۔ یہ بات میں نے کئی بار سنی اور ایک بار مجھ سے رہا نہ گیا اور میں نے کہا تبھی وہ الفاظ کے ساتھ وہی سلوک کرتے ہیں جو قبلِ اسلام کے زمانہ میں غلاموں، کنیزوں اور لونڈیوں کے ساتھ کیا جاتا تھا۔ آپ خطیبوں، ادیبوں، شاعروں، مقرروں کی گفتگو کو سنیں تو بعض اوقات محسوس ہوتا ہے کہ الفاظ کو مجبور کیا گیا ہے کہ "آیئے" اور منت کی گئی ہے کہ "تشریف لایئے"! عبارتوں میں، فقروں میں،

جملوں میں، الفاظ مجروح نظر آئیں گے۔ کسی کا ہاتھ ٹوٹا ہو گا، کسی کی گردن مڑی ہوئی ہو گی یا ہونگے صحیح الفاظ لیکن وہ الفاظ زندہ نہیں ہونگے۔ شاہ صاحب جس لفظ کو چھو لیتے تھے یوں لگتا تھا کہ اس میں روشنی کی کرن دوڑ گئی ہے۔ وہ بولتے تھے تو الفاظ ہمیشہ کے لئے تابندہ ہو جاتے تھے۔ جیسے مولانا ابوالکلام آزاد کا انتخاب شاعری ہمیشہ کے لئے زندہ ہو گیا ہے۔ اسی طرح حضرت امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاری رحمتہ اللہ علیہ کا ذخیرۂ الفاظ تقریروں میں زندہ ہو گیا ہے۔ کاش! ان کے خطابات عالیہ محفوظ ہوتے! یہ بہت بڑی محرومی ہے کہ شاہ صاحب کی تقریریں محفوظ نہیں ہیں۔ بہت بڑا حادثہ ہے۔ میرے محترم دوست جناب خالد شبیر صاحب فرمارہے تھے کہ وہ شاہ صاحب کی تقریریں مرتب فرما رہے ہیں۔ خدا انہیں اس کام کی توفیق عطاء فرمائے۔ لیکن وہ کیفیت، وہ جاہ و جلال، الفاظ کا وہ نزول، کہاں سے لائیں۔ شاہ صاحب کی خطابت تو سننے اور دیکھنے سے تعلق رکھتی تھی۔

خطابت میں دنیا کی دو قوموں نے عروج حاصل کیا، یونانیوں نے اور انہی کے ساتھ رومیوں نے بھی۔ تہذیبی اعتبار سے روم نے یونان سے اتنا کچھ سیکھا ہے کہ بظاہر یونان اور روم ایک ہی ہیں۔ یونان اور روم وہ ہیں جن کی دریوزہ گری سے آج بھی مغرب کو عار نہیں ہے اور ان کی بات کو سند بناتا ہے اور ان کی ہر چیز کو افضل اور اعلیٰ سمجھتا ہے، بہر حال یونانیوں اور رومیوں نے بہت امتیاز حاصل کیا۔ ڈھائی ہزار سال پہلے کی بات ہے مگر ان کی خطابت آج بھی محفوظ ہے۔ سسرو(۱) کی تقریریں محفوظ ہیں۔ ایک اور یونانی ہوا ہے ڈیماس تھنیز(۲) اسکی تقریریں محفوظ ہیں۔ ایک تو خطابت میں یونانیوں اور رومیوں نے نام حاصل کیا اور دوسرے اہل عرب نے، عربوں کی فصاحت اور ان کی بلاغت ہمیشہ سے شہرہ آفاق رہی ہے۔ حضرت گرامی! بلاغت یہ ہے کہ کم سے کم الفاظ میں زیادہ سے زیادہ مطالب کو بیان کیا جائے، عربوں ہی کا قول ہے:

۱۔ سسرو: (CICERO) ۱۰۲ تا ۴۳ قبل مسیح۔ یونان کا خطیب اور سیاستدان۔ ادب، فلسفہ، خطابت اور قانون میں تعلیم حاصل کی۔ وکالت کو بطور پیشہ اختیار کیا۔ اسے روم کا لائق ترین خطیب تصور کیا جاتا تھا۔ بالخصوص وکیل صفائی کی حیثیت سے اس کی حیثیت بے مثال تھی۔ ۵۸ ق م میں سیاسی وجوہ کی بناء پر اسے روم سے جلاوطن کر دیا گیا۔ تاہم ایک سال بعد وہ وطن واپس آگیا۔ اس کی بہت سی تاریخی تقریریں محفوظ ہیں۔ اس کے بے شمار خطوط بھی رومن ادب کا حصہ ہیں۔ اس کی تقریروں کو اثر انگیز ہونے کے ساتھ ساتھ فکر انگیز بھی تصور کیا گیا ہے۔ سسرو نے اپنی تقریروں میں مجموعی طور پر استدلال اور اثر آفرینی کے مقاصد کو سامنے رکھا۔

۲۔ ڈیماس تھینیز (DEMOSTHENES) ۳۸۴ تا ۳۲۲ قبل مسیح کے زمانے کا یونانی خطیب جسے فن خطابت اور سیاسی بصیرت کی وجہ سے ناموری حاصل ہوئی۔ کہا جاتا ہے کہ بچپن میں وہ لکنت کا شکار تھا۔ لیکن اسے مقرر بننے کا جنون کی حد تک شوق تھا۔ چنانچہ وہ اپنے منہ میں کنکریاں بھر کر (گویا زبانِ الکن کی تادیب کرتے ہوئے) سمندر کے کنارے چلا جاتا تھا اور پرشور لہروں سے خطاب کرتا تھا۔ اسی طرح وہ اسی حالت میں تقریر کرتے ہوئے پہاڑوں پر چڑھتا تھا بالآخر اسے یونان میں ایک عظیم مقرر تسلیم کر لیا گیا۔ سیاسی انتقام و خوف سے اس نے زہر کھا کر خودکشی کی۔

خیرالکلام ماقل ودل تقلیلِ کلام بلا تقصیرِ معانی، بلاغت کا اصل جوہر ہے۔ وقت کم ہو بات زیادہ ہو لیکن اس طرح سے ہو کہ کوئی چیز کم نہ ہو جائے۔ اہلِ عرب کی فصاحت و بلاغت کا کوئی جواب نہ تھا۔ اب بھی نہیں ہے بربنائے عقیدت نہیں کہتا، بلکہ حقیقت ہے کہ عربی زبان، اسکی فصاحت و بلاغت اس کے بیان کے پیرائے، اسکا ذخیرہ الفاظ سب کے سب آج بھی غیر معمولی ہیں۔ اس غیر معمولی زبان کے ذخیرے میں جو لوگ امتیاز حاصل کرتے تھے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ وہ کیا ہوں گے۔ علمی اعتبار سے بیان کی صلاحیت اصل ہے اور خطابت اس کی فرع یا ترقی یافتہ صورت ہے۔ کلام کرنے یا بیان کرنے کی صلاحیت انسان کی سب سے بڑی صفت ہے۔ جس میں تمام انسان تلامیذ الرحمٰن ہیں۔ آپ حیران تو ہوں گے لیکن حقیقت یہ ہے کہ حسنِ بیان میں تمام نوعِ انسانی ذاتِ باری تعالیٰ کی شاگرد ہے۔ شرفِ انسانیت اس وقت ظاہر ہوا جب ذاتِ باری تعالیٰ نے حضرت آدم کو جملہ اشیائے عالم کے اسماء سکھائے، اور فرشتوں کو سنوائے، گویا زبان اپنی اصل میں تسمیہ کا عمل ہے۔ اختصار کے ساتھ عرض کروں کہ زبان چیزوں کو نام دینے کا عمل ہے۔ سورۂ الرحمٰن کی پہلی آیت ہے

الرحمٰن علم القرآن

رحمٰن وہ ہے جس نے قرآن کی تعلیم دی۔ گویا بالاستعداد یا بالقویٰ سب انسانوں کو قرآن کی تعلیم دی جاچکی، یہ ان کی جبلت میں ہے۔ قرآن فہمی کسی انسان کی جبلی استعداد سے باہر نہیں پھر ارشاد ہوا کہ:

خلق الانسان علم البیان

کہ انسان کو پیدا کیا اور اس کو بیان سکھایا تو بیان کی صفت سراسر انسان کا امتیاز ہے۔ اسی لئے میری رائے میں جو گروہ، جو فرد، اس صلاحیت بیان میں خصوصی امتیاز رکھتا ہے وہ اس معاملے میں خاص طور پر منعم علیہ ہے۔

میں عرض کر رہا تھا کہ اہلِ عرب کو فصاحت و بلاغت میں اختصاص و امتیاز حاصل تھا۔ یہی ان کا سرمایۂ افتخار تھا۔ وہ خود کو گویا اور دنیا کی دوسری اقوام کو اپنے مقابلے میں گونگا تصور کرتے تھے۔ زبان آوری اور عرب ہم معنی ہو گئے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ لغت میں لفظ "عرب" کے ایک معنی فصیح البیان کے بھی ہیں۔ عربی زبان کی ساخت ایسی ہے کہ بلاغت اس کا عنصری جوہر ہے۔ خیال رہے کہ بلاغت کے اصطلاحی معنی کلام کا ہر نوع کے ابہام سے پاک ہونا ہے۔ اسی لئے قرآن کریم میں "عربی مبین" کے الفاظ آتے ہیں۔ ارشاد ہوا ہے کہ ہم نے قرآن کو عربی مبین میں نازل کیا ہے۔ اب اگر عربی مبین خود عربی زبان کی خوبی ہے تو بھی اور اگر اس سے مراد عربی کا وہ خاص اسلوب یا لہجہ ہے جس میں قرآن کریم نازل کیا گیا تو بھی، وضاحت، صراحت، بلاغت عربی کی فطری خصوصیات قرار پاتی ہیں۔ ان خصوصیات کا اظہار عربوں میں نظم اور نثر دونوں میں ہوتا تھا۔ شاعری اور خطابت ان کی گھٹی میں پڑی تھیں۔ جب اس میں توحید و رسالت کی تعلیم اور فریضۂ تبلیغ کا اضافہ ہوا تو اہلِ عرب کی فصاحت و بلاغت دو دھاری تلوار بن گئی۔ اور خطاب مفصول ایک طرح سے مسلمانوں کی تہذیبی خصوصیت قرار پائی۔ مسلمانوں نے علم بیان میں کسی دوسری قوم سے کسب فیض

نہیں کیا۔ فنونِ خطابت کی علمی تشریح میں وہ یونانیوں اور رومیوں کو پیچھے چھوڑ گئے۔ اس کے بعد اب تک دنیا کی کوئی اور قوم خطابت اور حسنِ بیان کو اعجاز کے مرتبے تک نہیں پہنچا سکی۔ غرض خطابت مسلمانوں کا تہذیبی ورثہ ہے۔ اور ابلاغ صداقت میں ان کی شمشیر بے نیام بھی! لیکن شمشیر بے نیام زیور سے زیادہ ذمہ داری ہے۔ اس لئے ہم نے ایک مدت سے "معجز بیانی" سے زیادہ "جادو بیانی" کو سینے سے لگا رکھا ہے۔ اس لئے کہ جادو بیانی لطافتِ احساس اور ذوقِ جمال کی تسکین کرتی ہے۔ اور ذوقِ عمل کو سلائے رکھتی ہے۔

حسنِ بیان کا جادو اس لئے نہیں ہے کہ لوگوں کا دل لبھایا جائے۔ ان کو سلایا جائے، ان پر نیند طاری کر دی جائے۔ ایسے بھی خطیب اور ایسے بھی ادیب ہیں، ایسے بھی جادو بیان مقرر، جادو نگار ادیب ہیں جو نیند طاری کر دیتے اور نیند طاری کرنے کو کمالِ فن سمجھتے ہیں۔ اور اسی کی انہیں داد ملتی ہے۔ کہ فلاں تو ہپناٹائز کر دیتا ہے۔ لیکن یہ فصل الخطاب نہیں فصل الخطاب نیک اور بد کا پارکھ اور حق و باطل کا فارق ہوتا ہے۔

انبیاء علیہم السلام میں یہ فضیلت حضرت داؤد علیہ السلام کو بخشی گئی کہ انہیں استحکام سلطنت اور علم و حکمت کے ساتھ ساتھ فصل الخطاب بھی عطا کیا گیا۔ سورۂ ص میں ارشاد فرمایا گیا ہے:

وشددنا ملکہ واتینہ الحکمۃ وفصل الخطاب

مفسرین نے "فصل الخطاب" سے مراد تقریر اور خطابت کے فن میں کمال لیا ہے۔ کہا گیا ہے کہ حضرت داؤد علیہ السلام کا خطاب فصاحت و بلاغت اور شوکت و سلاست کا جامع ہوا کرتا تھا۔ چونکہ فصل کے معنی الگ کرنے اور واضح طور پر الگ کر کے دکھانے کے ہیں۔ اس لئے فصل الخطاب سے مراد ایسا بیان اور تقریر ہے جو فیصلہ کن ہو اور حق و باطل میں واضح طور پر تفریق کرنے والا ہو۔ فصل الخطاب وہ بیان ہے جو فصیح اور بلیغ ہونے کے ساتھ ساتھ فیصلہ کن بھی ہو۔ ان معنوں میں کہ حسنِ بیان کے ساتھ غلط اور صحیح، حق اور باطل میں بھی تفریق کرتا چلا جائے۔ انبیاء علیہم السلام چونکہ اپنی ہر بات میں، اپنے ہر قول و فعل میں حق اور باطل میں امتیاز قائم کرتے رہے ہیں اس لئے فصل الخطاب کی خوبی ان تمام برگزیدہ ہستیوں کے کلام کا جوہر ہو گی۔ لیکن چونکہ حضرت داؤد علیہ السلام کو اس صفت میں خصوصی امتیاز حاصل تھا اس لئے قرآنِ کریم میں اس کا خاص طور پر ذکر فرمایا گیا ہے۔ ہمارے نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم عربوں کے فصیح ترین قبیلے میں پیدا ہوئے۔ آپ کی فصاحت و بلاغت کی شان یہ تھی کہ اس وصف کو آپ ﷺ نے اپنے ان فضائل میں شمار کیا جن کی بدولت آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو دوسرے انبیاء علیہم السلام پر فضیلت حاصل ہوئی۔ صحیح مسلم میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی حدیث ہے جس کے مطابق آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مجھے انبیائے پیشین پر چھ باتوں میں فضیلت دی گئی مجھے کلماتِ جامعہ عطا کئے گئے: اعطیت جوامع الکلم

مجھے نصرت بالرعب عطا کی گئی میرے لئے مالِ غنیمت حلال کیا گیا۔ روئے زمین کو میرے لئے مسجد اور سبب طہارت بنا دیا گیا۔ مجھے تمام مخلوق کے لئے رسول بنایا گیا۔ اور میری ذات پر انبیاء اور مرسلین کے سلسلے کو ختم کر دیا گیا۔ لغوی طور پر جوامع الکلم سے مراد ایسے کلمات ہیں جو جامع ہوں، لیکن خود جامع کلمات سے مراد کیا

ہے۔ اس سوال کا جواب علامہ سلمان منصور پوری کے الفاظ میں ہے: "سادہ صاف الفاظ، شستہ تراکیب، مختصر عبارت میں ایسے معانیٔ عالیہ کو بھر دینا جو عمیق بھی ہوں اور دقیق بھی۔ داخلِ کمالِ فصاحت ہے" (۱) فصاحت و بلاغت کا یہ وصف نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے متبعین و محبین کو بھی بقدر ظرف و بقدر حوصلہ عطا فرمایا گیا ہے۔ اس وصف خاص میں جتنا جس کا حصّہ ہے اتنا ہی وہ ذی شان ہے۔

مختصر بات یہ ہے کہ اگر یونانیوں اور رومیوں کو اتحاد تمدن و ثقافت کے باعث ایک قوم فرض کر لیا جائے تو یہ کہنا غلط نہ ہو گا کہ تاریخ عالم میں خطابت کے اعتبار سے دو ہی قومیں ممتاز نظر آتی ہیں۔ یونانی و رومی اور عربی و حجازی! دنیا کے دوسرے فنون کی تاریخیں لکھی گئی ہیں لیکن خطابت کی تاریخ میرے علم کے مطابق آج تک نہیں لکھی گئی۔ خطابت کے فن پر یقیناً مشرق و مغرب میں کتابیں لکھی گئی ہیں۔ لیکن تاریخ نہیں لکھی گئی۔ خطابت مسلمانوں کا تہذیبی اور دینی ورثہ ہے۔ لیکن ادھر بھی اس سلسلے میں کوئی قابلِ ذکر کام نہیں کیا گیا۔ کسی کو فرصت ہو تو دیکھے کہ ہمارے ادب میں فصاحت و بلاغت کے کیسے کیسے جوہر ریزے چشم بینا اور ذوقِ نظر کے منتظر ہیں۔ اس سلسلے میں محرومی کا ایک خاص سبب عربی زبان سے عمومی ناواقفیت ہے۔ جو ہمارے جدید اربابِ دانش کے لئے حجاب اکبر بنی ہوئی ہے۔ اگر مسلمان خطیبوں کے خطبے اور تقریریں جمع کی جائیں تو جلدیں مرتب ہو سکتی ہیں۔ ازمنۂ رفتہ کو چھوڑتے ہوئے جن مسلمان مفکروں اور رہنماؤں کا نام خطابت میں بلند ہوا ان میں سرفہرست اور سب سے اہم نام امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاری علیہ الرحمہ کا ہے۔ جن کی یاد میں آج ہم یہاں جمع ہیں۔ دین اسلام سے ان کی سچی اور گہری وابستگی اور ان کے حسنِ بیان کی حسن آفرینی اور اثر انگیزی کو دیکھتے ہوئے ظفر علی خان نے میر انیس کے مصرعہ پر کیسی برمحل اور معنی خیز تضمین کی ہے:

کانوں میں گونجتے ہیں بخاری کے زمزمے
بلبل چہک رہا ہے ریاضِ رسول میں ۲

بیسویں صدی میں قدرت نے اہلِ اسلام کو اور بھی کئی سحر بیان اور بلیغ اللسان خطیب عطا کئے ہیں۔ اور یہ بات میں ایک طالب علم کی حیثیت سے عرض کر رہا ہوں۔ اور بھی قابل احترام اور قابلِ قدر نام ہیں

۱۔ قاضی محمد سلیمان سلمان منصور پوری: رحمتہ للعالمین۔ حصہ سوئم۔ طبع لاہور۔ ص۔ ۱۸۲

۲۔ معنویت کے اعتبار سے میر انیس کا پورا بند قابلِ توجہ ہے:

یہ حسن صوت اور قراءت، یہ شد و مد حقا کہ افصح الفصحا ہے انہی کا جد
گویا ہے لحن حضرت داؤد با خرد یارب رکھ اس صدا کو زمانے میں تا ابد
شعبے صدا میں، پنکھڑیاں جیسے پھول میں
بلبل چہک رہا ہے ریاضِ رسول میں

بہادر یار جنگ ہیں (۳)، مولانا ابوالکلام آزاد ہیں (۴) یہ تو بے حد ممتاز نام ہیں اور تاریخ کا حصہ ہیں۔ ان کے علاوہ اور بھی کئی نامور لوگ ہیں۔ جن کے دوسرے کارنامے ان کے حسن تقریر پر غالب آ گئے۔ ورنہ دنیا نے

ان کی جادو بیانی کا لوہا مانا لیکن تمام معاصر شہادتیں اس بات پر متفق ہیں کہ حضرت شاہ صاحب علیہ الرحمہ کو ان سب میں امتیاز بدرجۂ اعجاز حاصل تھا۔ میں نے ذاتی طور پر نہ بہادر یار جنگ کو سنا ہے نہ مولانا آزاد علیہ الرحمہ کو، ان حضرات کی خوبیاں سنی ہیں۔ اور علم اور ادب سے تعلق رکھنے والے کچھ اور معجز بیانوں کے خطبات بھی سنے ہیں۔ اس لئے کہہ سکتا ہوں کہ خطابت کی تحسین کے لئے ایک ذوقی میلان اور ایک وجدانی اذعان ضرور رکھتا ہوں۔ اگرچہ میں نے شاہ صاحب کو اس وقت سنا جب مجھے ابھی سننے کے آداب سے بھی آگاہی نہیں تھی۔ لیکن ان لوگوں میں سے ضرور ہوں جن کا ادعا ہے کہ انہوں نے شاہ صاحب کو سنا ہے۔ بچپن ہی میں سہی تاہم میں نے شاہ صاحب کی چند تقریریں سنی ہیں۔ حافظے کی دوری پر ہی سہی۔ تاہم اس اعجاز بیان کی کچھ یادیں لوح ذہن پر نقش و مرتسم ضرور ہیں۔ مجھے وہ آواز، وہ لحن، وہ آہنگ کسی حد تک ضرور یاد ہے۔ جو سماعت اور بصارت دونوں کو یکساں متاثر کرتا تھا۔ مجھے اجازت دی جائے کہ میں کچھ ادھوری اور ناقص تمثیلوں سے کام

۳۔ افسوس کہ بہادر یار جنگ کے خطبات بھی محفوظ نہیں کئے جا سکے۔ جو کچھ ریکارڈ ہوا ہے اس کو سن کر ان کی خطابت کی تمام خوبیاں ابھر کر سامنے نہیں آتیں۔ تاہم اس سے ان کی آواز اور لب و لہجہ کا کسی حد تک اندازہ ضرور کیا جا سکتا ہے۔ ریکارڈ شدہ تقریر کے حوالے سے کہا جا سکتا ہے کہ ان کی آواز پاٹ دار اور کسی قدر تیز تھی اور وہ بہت حد تک یکساں لہجے میں تسلسل کے ساتھ تقریر کرتے تھے۔ لیکن یہ ان کی خطابت کا ایک ادھورا سا خاکہ ہے۔ جہاں تک میرا اندازہ ہے وہ لطائف و ظرائف سے بہت کم کام لیتے تھے۔ البتہ شعر (زیادہ تر اقبال کے) کثرت سے استعمال کرتے تھے۔ مجموعی طور پر ان کا لب و لہجہ ایک پرجوش اور رواں دواں تقریر کرنے والے کا سا تھا!

۴۔ مولانا ابوالکلام آزاد بھی بلاشبہ ایک عظیم خطیب تصور کئے گئے ہیں۔ ان کے بعض خطبے تحریری صورت میں ضرور محفوظ ہیں۔ لیکن ان کی کچھ تقریریں صدا بند کی جا سکیں یا نہیں اس کے بارے میں وثوق سے کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ چونکہ ان کی تحریر اور تقریر میں زیادہ فرق نہیں تھا اس لئے ان کے انداز خطابت کے بارے میں کسی حد تک ان کی تحریروں کی مدد سے ایک قیاسی تاثر ضرور قائم کیا جا سکتا ہے۔ اگر "الہلال" اور "البلاغ" کے بعض اداریوں اور خصوصی شذروں کو ان کی تقریروں کا قائم مقام فرض کر لیا جائے تو کہا جا سکتا ہے کہ اگرچہ بنیادی طور پر ان کی خطابت کا انداز عالمانہ تھا تاہم وہ ایک پرجوش اور اثر انگیز خطیب تھے۔ ان کی تقریروں میں اثر آفرینی اور جذبات میں تحریک پیدا کرنے کی صلاحیت بدرجہ اتم تھی۔ عالمانہ آہنگ میں ایک گرج، ایک گونج اور ایک شکوہ تھا جو رفعت خیال کے ساتھ ساتھ شدت جذبات کو بھی ظاہر کرتا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ وہ اپنے خطیبانہ آہنگ سے سامعین کو سحر زدہ کر دیتے تھے۔ اُن کی تحریروں میں خطابت کے بعض بہترین اجزاء اُن کے اسلوبِ خاص کا حصہ بن کر ابھرتے ہیں۔

لوں۔ آپ نے دیکھا ہوگا کہ ایک ستارہ چمکتا ہے، ٹوٹتا ہے اور اپنے پیچھے لکیر سی چھوڑ جاتا ہے۔ جتنی تیزی سے وہ لکیر ابھرتی ہے اتنی تیزی سے غائب ہوجاتی ہے۔ یہ بھی روشنی ہے۔ ایک روشنی یہ ہے کہ بجلی چمکی اور سب کچھ روشن ہوگیا ایک لمحے کے لئے، ایک ثانیے کے لے، یہ بھی ایک روشنی ہے لیکن روشنی کی ایک صورت یہ بھی ہے کہ تصور کیجئے کہ اگر یہاں ایک افق سے دوسرے افق تک بیک وقت کئی چاند زمین کے قریب آجائیں وہ کس طرح کی روشنی ہوگی۔ اس طرح کی روشنی سے ہم سب منور ہوں گے۔ سب کے چہرے چمک اٹھیں گے، سب کی آنکھوں میں روشنی ہوگی، شاہ صاحب کی خطابت ایسی ہی روشنی تھی جس سے چشم و بصیرت، فکر و نظر، قلب و جگر سب روشن ہوجاتے تھے۔ جب وہ خطاب فرماتے تھے تو فضا ان کے لحن سے، ان کے ارتعاشات سے لبریز ہوجاتی تھی۔ چھلک، چھلک جاتی تھی۔ مغرب کی تنقیدی اصطلاحات کے حوالے سے شاہ صاحب علیہ الرحمہ کی جلالت مآب خطابت کے لئے مجھے سبلائم (SUBLIME) کا لفظ موزوں ترین دکھائی دیتا ہے۔ یہ ایک رومن نقاد لانجائی نس کی اصطلاح ہے۔ اور اتفاق سے اس نے اس کا اطلاق خطابت ہی پر کیا ہے۔ اس اصطلاح کا اطلاق جمال کی ایسی انواع پر ہوتا ہے جن میں جلال اور شکوہ کا عنصر نمایاں ہو۔ ہمارے ہاں اردو میں اس اصطلاح کا ترجمہ ارفع اور جلیل کے الفاظ سے کیا گیا ہے۔ جلیل اور ارفع "سب لائم" (SUBLIME) ہے۔ جتنی عظیم الشان چیزیں ہیں وہ سب "سب لائم" ہیں۔ ارفع ہیں، صرف خوبصورت نہیں جلیل ہیں، ارفع ہیں اور جمال ان میں شامل ہے۔ جیسے آپ بادشاہی مسجد کو دیکھتے ہیں یہ جلیل ہے جلالت مآب ہے۔ اس کے سامنے پہنچ کر اپنے اندر ایک ارفعیت کا احساس ہوتا ہے۔ میں ایک بات خاص طور پر یہاں عرض کرنا چاہتا ہوں کہ کچھ عظیم چیزیں وہ ہیں کہ جب ہم ان کے سامنے جاتے ہیں تو ہم بہت حقیر ہوجاتے ہیں۔ سمندر کے کنارے ہم کھڑے ہو کر اپنے آپ کو اس بے کراں حقیقت کے مقابلے میں بہت چھوٹا محسوس کرتے ہیں۔ ایک بہت مہیب اور خوفناک خشک پہاڑ، سنگلاخ پہاڑ کے سامنے یا اس کے نیچے کھڑے ہو کر ہم اپنے آپ کو بہت چھوٹا پاتے ہیں یہ بھی ایک عظمت کا پہلو ہے۔ جلالت و عظمت کی یہ بھی ایک قسم ہے۔ لیکن جلیل وہ ہے اور ارفع وہ ہے جو اپنی جلالتہ و رفعتہ میں جمال کا پہلو نمایاں طور پر رکھتا ہے۔ اور ناظرین کو بھی اس میں شامل کرلیتا ہے۔ اس کے ناظر و شاہد بھی اپنے اندر ارفعیت کا احساس پاتے ہیں۔ یعنی جب ہم اسے دیکھتے ہیں تو ہم اپنے آپ کو اس عظمت کا شریک محسوس کرتے ہیں۔ ہم میں بھی وہ رفعت پیدا ہوتی ہے۔ وہی انبساط و انشراح پیدا ہوتا ہے۔ شاہ صاحب کی خطابت، ان کی شخصیت، اور ان کا کردار بعینہ ایسا ہی تھا جو بھی ان کے روبرو جاتا تھا محسوس کرتا تھا کہ میں بھی عظیم ہوں، میں بھی صاحبِ کردار ہوں، میرے اندر بھی کوئی استعداد موجود ہے۔ وہ ہم سب کو اپنی عظمت میں شریک کرلیتے تھے۔ اپنی بے پایاں محبت کے ذریعے، اپنے حسنِ سلوک کے ذریعے! ارفعیت (SUBLIMITY) کے ------ اولیں شارح یا بانی لان جائی نس (LONGINUS) نے اس بات پر بہت زور دیا ہے کہ شاعری ہو یا خطابت، کلام میں رفعت اور بلندی صرف اس وقت پیدا ہوسکتی ہے جب ان کا سرچشمہ رفیع اور بلند ہو جس شخصیت کے باطن سے خیالات ابھر

رہے ہیں وہ خود عظیم اور رفیع ہو۔ اس مفروضے کی صداقت کا ثبوت شاہ صاحب علیہ الرحمہ کی خطابت سے ملتا ہے۔ انکی خطابت اس لئے عظیم تھی کہ ان کی روح عظیم تھی۔ ان کا باطن رفعت خیال کا سر چشمہ تھا۔ ان کا جذبۂ حریت بے کراں تھا۔ اس لئے ان کی خطابت میں سمندروں کا خروش ہی نہیں، آبشاروں کا ترنم بھی تھا۔ دریاؤں کی روانی ہی نہیں، چشموں کی ٹھنڈی میٹھی رِل ترل بھی تھی۔ ان کے ہاں نغمۂ جبریل اور صور اسرافیل مل کر ایک ہوگئے تھے۔ سسرو ہو یا ڈیما ستھنیز، میکالے ہو یا کوئی اور مغربی خطیب، ان کے کمالِ خطابت کا انحصار زیادہ تر سفسطہ پر ہے۔ یعنی لفظی ہیر پھیر اور منطقی مغالطے جس کا مطلب تھا کہ بات چاہے غلط ہو چاہے صحیح ہو اسے آپ ثابت کر کے ہی دم لیں گے۔ سفسطے کی ایک مثال میں آپ سے عرض کرتا ہوں مثلاً میں اس طرح کا استدلال کرتا ہوں کہ میرا ہاتھ میز کو چھو رہا ہے۔ میز زمین کو چھو رہی ہے۔ اس لئے میرا ہاتھ زمین کو چھو رہا ہے۔ بظاہر میں نے اس میں استدلال کے تقاضے پورے کئے ہیں۔ صغریٰ کبریٰ اور حدّ اوسط موجود ہیں لیکن میرا استدلال صریحاً غلط اور مغالطہ آفریں ہے اس لئے کہ میں نے غلطی سے یا جان بوجھ کر اس میں ایک مغالطہ پیدا کر دیا ہے۔ وہ یہ کہ میں نے اپنے ہاتھ اور میز کو ایک دوسرے کا عین قرار دے دیا ہے۔ جو کہ بالبداہت غلط ہے۔ میرا ہاتھ میز کا عین نہیں ہے۔ نہ میز میرے ہاتھ کی عین ہے کہ ایک کا فعل دوسرے کے فعل کے عین مترادف قرار پائے۔ اس استدلال کی غلطی اتنی واضح ہے کہ فوراً سمجھ آجاتی ہے لیکن بعض استدلال دقیق اور پیچیدہ ہوتے ہیں کہ ان میں چھپے ہوئے مغالطوں تک عام طور پر آسانی سے رسائی نہیں ہوتی ایسے مغالطوں سے جان بوجھ کر کام لینے والا سوفسطائی کہلاتا ہے۔ جس کا دعویٰ ہوتا ہے کہ وہ دلائل کے زور سے ہر بات کو سچ ثابت کر سکتا ہے۔

یہ استدلال تھا ان کا جسے ہم منطقی مغالطہ کہتے ہیں۔ سسرو اور ڈیماس تھینز کی خطابت اقدارِ اعلیٰ کے لئے نہیں تھی۔ خیال فرمایئے، ان کا خطاب اقدارِ اعلیٰ کے لئے، حقیقت کے لئے، سچائی کے لئے نہیں تھا اس کے پیچھے کردار کی قوت نہیں تھی۔ اس کے پیچھے زندگی کا، کائنات کا کوئی ادراک کوئی تصور، کوئی وژن موجود نہیں تھا، کوئی نقطۂ نظر نہیں تھا، کوئی فلسفہ نہیں تھا، وہ صرف لفظی ہیر پھیر تھا۔ محض سفسطہ تھا، خیال نہیں، بلکہ فریب خیال، حقیقت نہیں، بلکہ فریب حقیقت! لیکن شاہ صاحب کی خطابت کے پیچھے ایک پوری روایت تھی۔ علوم کی بھی، تہذیب کی بھی، خطابت کی بھی اس لئے شاہ صاحب کی تقریر میں یہ اثر تھا جو آپ لوگ مجھ سے زیادہ جانتے ہیں اور جس کے شواہد تاریخ کا حصہ ہیں کہ جو بات وہ بیان فرماتے تھے وہ دل میں اترتی چلی جاتی تھی۔ وہی شعر صادق آتا ہے:

دیکھنا تقریر کی لذت کہ جو اس نے کہا
میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے

ان کی خطابت کے بارے میں میں یہاں کہوں گا کہ وہ دلوں سے "کمیونیکیٹ" کرتے تھے کہ ان کا ابلاغ دلوں تک تھا۔ جہاں وہ جذبات اور احساسات کی تاروں میں لرزش پیدا کرتے تھے، وہ عقل و دانش سے بھی خطاب فرماتے تھے۔ عقل اور عشق دونوں ان کے مخاطب بھی تھے اور دونوں مقصود بھی! تاہم مجموعی طور پر ان کا طرز

استدلال صرف طرز استدلال نہیں بلکہ حسنِ استدلال تھا۔ جسے صرف عشق انگیز کہا جاسکتا ہے۔ وہ بولتے تھے تو لفظ زندہ ہوجاتے تھے۔ جذبوں کی کہکشائیں روشن ہوجاتی تھیں۔ دلوں میں دنیائیں جگمگا اٹھتی تھیں۔

حضرات گرامی! جیسا میں نے شروع میں کہا تھا میں نہ مقرر ہوں نہ خطیب، میرے دوست ابنِ امیر شریعت حضرت مولانا عطاء المحسن بخاری کو میرے بارے میں جو حسنِ ظن ہے صرف اسی کی بناء پر میں یہاں حاضر ہوا اور چند ٹوٹے پھوٹے الفاظ نذر کئے۔ اجازت چاہتا ہوں۔ والسلام! (۲۱ اگست ۱۹۸۰ء)

استدراک

آج سے کئی سال پہلے ارتجالاً کہی ہوئی یہ چند باتیں احباب کی قدر افزائی کی بدولت ریکارڈ ہو گئی تھیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ ان بکھری بکھری باتوں کی قیمت ممدوح کی علوشان نے بڑھائی ہے۔ وگرنہ یہ گفتار پریشاں شاید اس قابل نہ ہوتی کہ اسے طباعت کے سپرد کیا جاتا۔ تقریر و تحریر کے قدرتی اور لازمی فرق کے پیش نظر سطور بالا پر نظر ثانی ناگزیر تھی۔ چنانچہ مسطورہ بالا گفتگو کو قابل مطالعہ بنانے کے لئے کسی قدر حک واضافہ کیا گیا ہے لیکن اسے اساساً تبدیل نہیں کیا گیا۔ بعض حوالوں پر حواشی کا اضافہ کیا گیا ہے تاکہ فنِ خطابت کے تاریخی تناظر کے بارے میں کچھ اشارات فراہم کئے جاسکیں۔ لیکن نظر ثانی کے ساتھ ہی اس احساس سے بھی دوچار ہونا پڑا کہ جو کچھ کہنا چاہتے تھے وہ شاید نہیں کہا جاسکا۔ شاہ صاحب علیہ الرحمہ کی تقریروں کے متون کی عدم دستیابی کی وجہ سے ایک مکمل اور بھرپور فنی جائزہ تقریباً ناممکنات میں سے ہے۔ اس لئے اس معاملے میں ہر کوشش خراج تحسین اور نذرانۂ عقیدت سے آگے نہیں بڑھ سکتی۔ شاہ صاحب کے وہ نیازمند اور عقیدت گزار جنہیں شاہ صاحب کو قریب سے دیکھنے اور ان کے حسن خطابت سے بہرہ اندوز ہونے کے مواقع زیادہ ملے اس منصب سے صحیح معنوں میں عہدہ برآ ہوسکتے ہیں۔ میرے اجمالی تاثرات جن کی اساس بچپن کی دھندلی یادوں پر ہے فنی یامعروضی رائے کے سانچے میں نہیں ڈھل سکتے۔ تاہم میرے علم کی حد تک شاہ صاحب کے کمالِ خطابت کے فنی محاسن کا علمی اور معروضی جائزہ ابھی تک نہیں لیا گیا۔ شاہ صاحب کو عام طور پر ایک عوامی خطیب کے رنگ میں پیش کیا جاتا ہے جو اپنے سامعین کی نبض احساس پر ہاتھ رکھ کر ان کے جذبات کی ترجمانی کا حق ادا کرتا تھا۔ لیکن انہیں صرف ایک عوامی خطیب کہنا ان کے محاسن سے چشم پوشی کرنے یا ان سے بے خبر رہنے کا ثبوت دینا ہے۔ شاہ صاحب کی ہر تقریر علمی اور ادبی نکات سے مملو ہوتی تھی۔ وہ اقبال اور ظفر علی خاں کی طرح پنجاب کی سرزمین کا فخر تھے۔ اور زبان و بیان پر بھی ویسی ہی قابل رشک قدرت رکھتے تھے قرآنی آیات، احادیث مبارکہ، اقوال و اشعار اور امثال و نظائر کا برمحل استعمال ان کے فن خطابت کے اولیں محاسن میں سے تھا۔ قرآنِ کریم کی تلاوت میں ان کا لحن، لحن داؤدی کے تصور کو مثال اور حقیقت بنادیتا تھا۔ اس طرح کبھی تحت اللفظ اور کبھی ترنم کے ساتھ اشعار کی ترتیل بھی ایک سماں پیدا کرتی تھی۔ ظرافت اور بذلہ سنجی میں وہ مثیل غالب تھے۔ حریف (انگریزی استعمار) پر فقرہ چست کرنے اور پھبتی کسنے میں انہیں ید طولیٰ حاصل تھا۔ محاسنِ کلام اور صنائع بدائع میں کون سی صنعت تھی جس سے وہ کام نہیں لیتے تھے۔ تشبیہ،

استعارہ، تمثیل، کنایہ، مجاز مرسل، اور سب سے بڑھ کر تعریض ان کے بیان کی رگوں میں خون کی طرح دوڑتے تھے۔ ان کا دل جذبۂ حریت سے لبریز اور ان کی ذات تمام تر عشقِ رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم سے سرشار تھی۔ پنجاب کے صوفی شعراء کے حوالوں اور بعض عوامی جملوں کے برمحل استعمال سے اثر انگیزی کے حیرت انگیز کرشمے دکھاتے تھے۔ ان کی اکثر یادگار تقاریر کا ایک "مرکزی نغمہ" (استعارۃً THEME SONG) ہوتا تھا۔ جس کی طرف وہ بار بار پلٹتے تھے۔ اور ہر بار نئی سے نئی نکتہ طرازی کرتے تھے۔ وہ سخن فہم، سخن سنج اور سخن ور تھے۔ زبان کے بے شمار اسالیب ان کے اسلوب خاص میں عناصر ترکیبی کا کام دیتے تھے۔ وہ اپنی بات کو کبھی صراحت سے، کبھی اشارت سے، کبھی مثال سے اور کبھی تمثال سے واضح کرتے تھے۔ زبان (LANGUAGE) ان کی زبان (TONGUE) پر آکر کبھی بولتی تھی کبھی گاتی تھی اور کبھی وجد میں آکر رقص کرتی تھی۔ وہ ظاہری عظمت اور ساختہ طمطراق کے باطن سے مضحک (RIDICULOUS) کو برآمد کر دکھاتے تھے اور کبھی ادنیٰ اور حقیر چیز سے عظمت کردار کا تصور وابستہ کر دکھاتے تھے۔ ان کا ایک مشہور جملہ کہ: "میں تو ان چیونٹیوں کو شکر کھلانے کے لئے تیار ہوں جو انگریز بہادر کو کاٹ کھائیں"۔ میرے اس خیال کی تائید کے لئے کافی ہے! وہ ایک وسیع المطالعہ، دقیق النظر، اور رفیع الفکر خطیب تھے۔ اردو زبان نے ان کے اندازِ خطابت میں نئے سے نئے امکانات کو دریافت کیا۔ وہ اپنی علمی جزالت اور بلندیٔ فکر کے باوجود عوام الناس کے بہت قریب رہتے تھے۔ ان کے بیشتر موضوعاتِ خطابت عوام الناس کی زندگیوں کے غائر مطالعے سے ابھرتے تھے۔ وہ ایک سچے شاعر کی طرح الفاظ سے خائف نہیں تھے۔ بلکہ الفاظ کی جوہری توانائی کو دریافت کرنے کے ماہر تھے۔ وہ خود الفاظ کو ان کی معنوی وسعتوں سے آشنا کرتے تھے۔ اور انہیں بولنا، گنگنانا اور زمزمہ پرداز ہونا سکھاتے تھے۔ وہ گلی کوچوں میں پھرنے والے عام لوگوں کے پرخلوص لہجوں کے قدردان تھے۔ محبت سے کہا ہوا کوئی بھی جملہ، خواہ کسی بھی زبان میں ہو، ان کے سمند خطابت کے لئے مہمیز بن جایا کرتا تھا۔ بعض لوگوں کو شاید اب بھی یاد ہو کہ حضرت بہاء الدین زکریا ملتانی کی درگاہ کے مشرقی چبوترے اور ملحقہ صحنوں میں منعقد ایک جلسے میں تقریر کرتے ہوئے ملتانی زبان کا ایک جملہ ("شالا چڑھی کمان ہووی") ان کی اس تقریر کا THEME SONG تھا۔ اسی طرح صوفیاء کے کلام کے معروف و مقبول اجزاء اور بعض اوقات عوامی "بولیوں" (پنجابی شاعری کی عوامی صنف) کے الفاظ پر جو بظاہر غیر ادبی، غیر فصیح یا پیش پا افتادہ دکھائی دیتے تھے وہ اپنے خطابات عالیہ کی بنیاد رکھتے تھے اور انہیں عوامی بنیادوں پر رفعت فکر، شکوہ بیان، ندرتِ خیال اور حسنِ کلام کی نادر الوقوع لفظی عمارات کھڑی کر دکھاتے تھے مغربی استعمار سے بالعموم اور فرنگی استعمار سے بالخصوص شدید نفرت کرنے والے سید عطاء اللہ شاہ بخاری کے کمال خطابت کے محاسن کا تجزیہ کرتے ہوئے دانش مغرب کی اصطلاحات اور "دانایان فرنگ" کے تصورات کا حوالہ دنیا شاید ستم ظریفی دکھائی دے۔ لیکن شاہ صاحب علیہ الرحمہ اس رسول اعظم و آخر صلی اللہ علیہ وسلم کے والہ و شیدا تھے جس نے کلمات حکمت کو مؤمن کی گمشدہ میراث قرار دے کر ہر عہد کی اقلیم دانش کو مسلمان کی قلمرو بنا دیا ہے۔

بقولِ حکیم سنائی غزنوی : زباں کز بہر حق باشد، چہ عبرانی چہ سریانی
مکاں کز بہر دیں باشد چہ جا بلقا چہ جا بلسا

✳

بروفات حضرت مولانا سید عطاء اللہ شاہ بخاری رحمۃ اللہ علیہ

قطعہ تاریخ

عطاء اللہ شاہ سید بخاری — کہ جس نے قوم کی حالت سدھاری
فسبحان الذی حسن خطابت — کہ جس کو سن کے ہوتا وجد طاری
خطیب اعظم و میر شریعت — ہیں جس کے ملک پر احسان بھاری
فرنگ و قادیاں کی دھجیوں کو — اڑایا جس نے بامر ضرب کاری
ڈرایا دار سے تو وہ ہنسا خوب — تھی اس کے دل میں ایسی جاں نثاری
وہ دشمن سے بھی ملتا مسکرا کر — ملی حق سے اسے وہ برد باری
"غریق رحمت" اب ہے "نظر خیرا" — عطا کو تھی عطا وہ دینداری
۱۹۶۱ ۱۸۹۲

نہیں اب سوائے حشر صابر
"توقع ملاقات" بخاری
۱۹۶۱

گرامی مرتبت میر شریعت — چہ گویم شرح اوصاف کمالش
بسر عرش شدہ در حق پرستی — مبارک بود قول و فعل و حالش
خطاب داد آں سرخیل علماء — بصد تمکین ربا جاہ و جلالش
کند ایں بیعت علمائے پنج صد — بصد فخر و بصد عز و جمالش
عیاں شد اہل ابناء زمانہ — صفاء باطن و صدق مقالش
بتہذیب مقالش قوم پرداخت — ہمیں بودہ ہمیشہ قیل و قالش

چنیں گفت از سر اخلاص صابر
"بدلِ وا دہ شدہ تاریخ سالش"
۱۹۶۱

مولانا عبدالکریم صابر
ڈیرہ اسماعیل خاں

ابنِ امیرِ شریعت
سید عطاء المحسن بخاری

خطابیہ

والدِ ماجد حضرت امیرِ شریعت رحمۃ اللہ علیہ کی خطابت امارتِ شرعیہ کا وہ تاج ہے جو اللہ نے ان کے سر پہ سجایا اور اس تاج پوشی میں وہ ایسے یگانۂ روزگار ہیں کہ صدیوں پر محیط ہیں۔ ماضی کے دریچوں میں جھانک کے دیکھیں تو عربوں میں بھی یہ جوہر کہیں کہیں چمکتا دمکتا دکھائی دیتا ہے۔

مستقبل کا علم اگرچہ صرف اللہ تعالیٰ کے پاس ہے لیکن ظن و تخمین سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مستقبل کی کوکھ بھی ایسے یگانۂ روزگار خطیبِ لبیب کو جنم دینے سے قاصر ہے۔ حضرت والد ماجد رحمۃ اللہ علیہ کی خطابت صرف پیامِ بہار نہ تھی بلکہ آپ کی خطابت بہاریہ خطابت تھی۔ الفاظ کلیوں کی طرح منہ سے نکلتے، غنچوں کی طرح کھلتے اور فضا اپنے دامن میں بہاریں سمیٹ لیتی۔ لوگ بادِ نسیم کے جھونکوں سے کچھ ایسا نشاطِ سرمدی محسوس کرتے کہ اپنے گردو پیش سے بھی بے خبر ہوجاتے۔ مضامین کی آمد، بیان کا تنوع، افہام کی شیرینی، قرآنِ کریم کی تلاوت و حلاوت، دینی غیرت، جوش و ولولہ اور تہور و تدبّر جب الفاظ و تراکیب اور اشعار کا حسین ملبوس اوڑھے کانوں میں نغمۂ لاہوت کا رس گھولتے تو قدوسی دعائیں مانگتے، ستارے گوش بر آواز ہوجاتے اور انسان امیرِ شریعت کے سیلِ افکار میں جھومتے عش عش کرتے بہتے چلے جاتے۔

شاذ و نادر ہی ایسا ہوتا ہے کہ کوئی شخص جامع کمالات ہو۔ حضرت امیر شریعت رحمہ اللہ صفحۂ ارضی پر اللہ کا وہ انمول عطیہ تھے جو جامع کمالات شخص تھے۔ حسنِ صورت، حسنِ سیرت اور سیرت کے اجزاء حسنہ میں شجاعت، بسالت، تواضع، مروت، حسنِ خلق اور خوش گفتاری آپ کو فطرتاً ودیعت تھے۔

صوتی اثرات مختلف ہوتے ہیں۔ کسی کی آواز پاٹ دار ہے تو رسیلی نہیں، گرجدار تو ہے مگر صولتِ آواز نہیں۔ یعنی خوفناک تو ہے مگر ایسی ہیبت نہیں جس میں عظمت کی جھلک بھی ہو کہ نگاہیں اور سر خود بخود جھکتے چلے جائیں۔ بعض آوازیں رسیلی تو ہوتی ہیں مگر بلند آہنگ نہیں ہوتیں۔ پستی کی طرف مائل ہوتی ہیں۔ ہر چند کہ ان میں ایک حسن ہوتا لیکن صوتی قوت نہیں ہوتی۔

بعض آوازیں سُروں کے سنگ صرف گلوں سے نکلتی ہیں مگر اعلاء نہیں ہوتا۔ پھیلتی اور ابھرتی نہیں، مگر حضرت امیرِ شریعت رحمۃ اللہ علیہ کو اللہ نے ایسی آواز عطا فرمائی تھی جو پاٹ دار بھی تھی اور گرجدار بھی، رسیلی بھی تھی اور بلند آہنگ بھی، جس میں سوز بھی تھا اور ہیبت بھی، عظمت بھی تھی اور رفعت بھی، ایسا صوتی اثر جو دور تک فضا کو مرتعش کرتا ہوا پھیلتا جاتا۔ سبحان اللہ! عربی زبان میں ایسے خطیبوں کو الخطیب الاشدق یا الخطیب المصعق کہتے ہیں۔ آپ جب قرآن کی تلاوت کرتے تو اس کی حلاوت سے دشمن بھی جامد و ساکت ہوجاتے اور محبت کرنے والے تو جھوم جھوم جاتے۔

ترتیب و تحقیق: سید عطاء المحسن بخاری

سیدنا حسان بن ثابت انصاریؓ سے حضرت امیر شریعت مولانا سید عطاء اللہ شاہ بخاری رحمۃ اللہ علیہ تک

زیر نظر مضمون حضرت امیر شریعت کے ایک انتہائی عقیدت مند مولانا حافظ ارشاد احمد دیوبندی نے تحریر فرمایا تھا۔ مگر اپنے موضوع کے اعتبار سے یہ ایک ابتدائی اور نامکمل خاکہ تھا۔ ابن امیر شریعت حضرت مولانا سید عطاالمحسن بخاری مدظلہ کی تحقیق و ترتیب سے اس کے علمی حُسن اور جامعیت میں زبردست اضافہ ہو گیا ہے۔ اس کا مرکزی خیال حافظ صاحب کا ہے اور باقی اضافہ و تحقیق شاہ جی کے قلم سے ہے۔ محترم حافظ صاحب شکریے کے ساتھ ہم اسے ہدیۂ قارئین کر رہے ہیں۔ (ادارہ)

ہمارے ہاں ادب کو ایک خاص مفہوم میں اور ایک محدود دائرے میں پلاننگ کے ساتھ رواج دیا جا رہا ہے۔ چونکہ ادب شروع سے ہی ابلاغ کا ایک مضبوط میڈیا رہا ہے۔ آج بھی یہی میڈیا ابلاغ کا منفرد ذریعہ ہے۔ آج کے پاکستان میں اس میڈیا پر ایک خاص نسل عجمی سازش کے، تحت قبضہ جمائے بیٹھی ہے اور اس پوتر ذریعہ کو گدلانے کی بھرپور کوشش میں مصروف ہیں۔ ادب کیا ہے؟ ادیب کون ہے۔ اس کے مفاہیم کیا ہیں۔ ان کو اس سے کچھ واسطہ نہیں ہے۔ موجودہ ادیبوں کی زندگی کو اگر ادب کے تناظر میں دیکھا پرکھا جائے تو یہ ادیب محض معاشی حیوان ہیں جو لہٰنی نفسانی، جنسی اور حیوانی بھوک کا علاج وادیٔ ادب میں تلاش کرنے نکل کھڑے ہوئے ہیں۔ ان حالات کا ہم بھی بغور جائزہ لے رہے ہیں۔ اور کچھ کر گزرنا چاہتے ہیں گو نقار خانے میں طوطی کی آواز دب کے رہ جائے گی۔ جدید ادب کے کوہ سیاہ میں قدروں اور روائیتوں کی نہر کھودنا از بس ناگزیر ہے اور اس کوہ کنی میں ہم اگر بازی نہ لے سکیں گے تو کیا ہوا نتائج کی تمنا اور صلے کی پرواہ سے بالاتر ہو کر ہم اس راہ پر چل نکلے ہیں تو اس یقین سے کہ اس عمل کی کٹھن گھاٹیوں میں سر تو دے سکیں گے۔

ادب کی تحقیق

''لسان العرب'' میں ادب سے متعلق بحث کرتے ہوئے مصنف نے بڑے واضح انداز میں لکھا ہے کہ ادب دو ہی چیزیں ہیں۔ تہذیب نفس، تعلیم شعر و نثر۔ عرب میں ابتداء سے آج تک ادب انہی دو معنوں میں مستعمل ہے۔ یہ الگ بات کہ دینی عقائد و اعمال کی طرح عرب میں تعلیم و تہذیب نفس دونوں پر ہی فترت کے عہد کی دبیز تہیں جمی ہوئی تھیں اور لوگ اس سے بھی محروم ہوتے جا رہے تھے۔

ادب کے لغوی معنی ہیں دعوت۔ یعنی ایسا کھانا جس پر لوگوں کو مدعو کیا گیا ہو۔ ایسا لٹریچر جو لوگوں کو

باادب اور مہذب ہونے کی دعوت دے۔ اعلیٰ قدروں کی بقاء اور ارتقاء کے لئے دعوت عمل دے اور روایات کے استحکام کا فریضہ سرانجام دے۔ ایسا کلام جس میں خیر کی دعوت ہو اور شر کی نفی ہو وہ ادب ہے اس مختصر تشریح کی روشنی میں موجودہ ادب کا مطالعہ کیا جائے تو یہ تمام بے ادبی ہے۔ اور موجودہ ادیب و شاعر یکسر بے ادب (الامن رحم اللہ)

اسلامی ادب

حضور خاتم الانبیاء فداہ ابی و امی صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے جس طرح عقائد، اعمال، اخلاق اور نظام ریاست تبدیل ہوئے بعینہ اسی طرح عرب کی ثقافت بھی یکسر تبدیل ہو گئی۔ پہلے شعراء جنسی دائرے بنتے، عصبیت جاهلیہ ابھارتے، نسبی تفاخر کو ہی کمال ادب گردانتے مگر اسلام کی آمد اور نزول قرآن کریم کے بعد

اصناف سخن میں ایسی تبدیلی آئی کہ شعراء مدح رسول، دعوت مبارزت، حق و باطل، توحید و رسالت، قیامت، دفاع رسول، تبلیغ و جہاد کے عنوانات پر مرصع اشعار کہتے نظر آتے ہیں قرآن کریم کے اسلوب بیان بندش و تراکیب، استعارہ و کنایہ، وضاحت و صراحت نے ان کے لب و لہجہ کو بھی تبدیل کر دیا۔ انقلاب حق کی یہی علامت ہوتی ہے کہ زندگی کا ہر شعبہ اس سے مضبوط تاثر لیتا ہے اور اس میں نمایاں تبدیلیاں پیدا ہوتی ہیں۔ قرآن کریم کے لفظی و معنوی اعجاز و ایجاز نے عرب کے شعراء کو اپنے تتبع پر مجبور کر دیا نیز یہ کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام پر آغاز اسلام میں عربوں نے جو الزام لگایا تھا کہ یہ قرآن ان کا خود ساختہ ہے الہامی کلام نہیں ہے۔ مگر جب یہ کلام بلاغت نظام شعراء کی نظر پڑا تو وہ اسکی حقانیت کا اقرار کئے بغیر نہ رہ سکے۔

مشہور ہے کہ مکہ کے نامور شعراء اپنا اپنا کلام لکھ کر دیوار کعبہ کے ساتھ لٹکا دیا کرتے تھے اور لوگ اسے پڑھتے تو وہ کلام شاعر زباں زد عوام و خواص ہو جاتا اور وہ عرب کا نامور، عبقری اور نابغہ کہلاتا۔ جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر سورۂ کوثر نازل ہوئی تو ان دنوں لبید بن ربیعہ کا کلام دیوار کعبہ سے معلق تھا۔ کسی خادم صحابی (رضی اللہ عنہ) نے سورہ کوثر لبید کے معلقہ کے مقابلہ میں دیوار کعبہ سے لٹکا دی ایک دن جناب لبید کعبہ میں آئے اور ایک نیا معلقہ دیکھا بے تابی سے آگے بڑھے اسے پڑھا۔

ان اعطینک الکوثر فصل لربک وانحر ان شانئک هوالابتر

تو روح کی گہرائیوں میں دبی ہوئی سچائی نے گواہی دینے پر مجبور کر دیا اور حضرت لبید پکار اٹھے۔

ماهذا من کلام البشر

یہ انسانی گفتگو نہیں یہ افلاک پار سے اترنے والا کلام ہے جس طرح ابراہیم علیہ السلام پر اترا کرتا تھا اور یہی سورہ مبارکہ ان کے اسلام کا ذریعہ بنی اس کے بعد لبید نے شعر کہنا ہی چھوڑ دیا۔

قرآن معجز بیان کی اتباع نے ہی اسلامی ادب جنم دیا۔ آج بھی بعض بخت کے دھنی ہیں جو اسی کمال حسن کی اتباع میں حسین و امر ہو گئے۔ قرآن کی سب سے بڑی انفرادیت یہ ہے کہ چودہ صدیاں گزرنے اور عجمی سازشوں کے پے در پے حملوں کے باوجود قرآن آج بھی ادب عالیہ کا معیار مانا جاتا ہے۔ اس کا لفظ لفظ

آج بھی عہد اول کی طرح معتبر و مستعمل ہے۔ متروک نہیں۔ آج بھی اسی کا لب و لہجہ انسانی افکار میں موثر ہے۔ اس کے اسالیب میں اتنی وسعت و عمق ہے کہ اصحاب سخن آج بھی ان سے اسی طرح فیضیاب ہیں جیسے اصحاب رسول تھے۔

عہد ماضی میں جن شعراء نے قرآنی ادب سے فیضیاب ہو کے دعوت اسلام کے دشمنوں پر عقابی حملے کئے ان میں سب سے روشن نام سیدنا حسان بن ثابت نجاری خذرجی انصاری رضی اللہ عنہ کا اسم گرامی ہے۔

سیدنا حسان

سیدنا حسان بن ثابت رضی اللہ عنہ بنی نجار کے ہاں مدینہ طیبہ میں پیدا ہوئے۔ آپ کا سلسلہ نسب بنی قحطان تک پہنچتا ہے اس نسبت سے آپ یمنی بھی ہوئے۔ آپ کی والدہ ماجدہ فریعہ بنت خالد بن قیس بنو خزرج سے تھیں۔ اپنی ننھالی نسبت سے آپ خزرجی بھی ہیں آپ کی ابتدائی زندگی سادگی میں دیہاتی ماحول میں گزری آپکی شہری زندگی بھی بدوی زندگی سے متاثر رہی۔

آپ نے عالم شباب میں غساسنہ شاہان شام اور ملوک عراق سے اپنا تعلق جوڑا خصوصاً نعمان سادس، عمرو رابع و حجر بن نعمان اور جبلہ بن ایہم آپ ان کے قلعوں میں جاتے انکی مدح کرتے وہ خوش ہو کر حسان پر انعامات کی بارش کرتے۔ جب اسلام "دین جدید" کا غلغلہ ہوا تو مکہ کے "ڈیمو کریٹس" نے اسے ناپسند کیا اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مکہ سے مدینہ ہجرت کی تو بنی نجار نے آپ کا استقبال کیا جو حسان کے ددھیال تھے۔ قبیلہ اوس و خزرج نے اسلام کی دعوت پر لبیک کہی خزرجی مسلمان ہوئے تو حسان بھی مسلمان ہو گئے۔ آپ پہلے انصاری مسلمان شاعر تھے۔ حضرت حسان اپنی جبلی افتاد کی وجہ سے اسلام کی نصرت تلوار سے تو نہ کر سکے البتہ اپنے شعروں کے تیر و نشتر سے مکہ کے "جمہوری محاذ" کے وڈیروں کو ہمیشہ منہ توڑ جواب دیا اور ان کو مبہوت کر دیا اور حسانؓ اس عمل میں منفرد تھے اور ان کا یہی عمل دین کی نصرت کا منفرد انداز ہے۔ حضور خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف جب قریش کے شاعر طعن توڑتے تو آپ حسان کو کہتے

اجب عن رسول اللہ اللھم ایدہ بروح القدس

حسان اللہ کے رسول کی طرف سے کفار کو جواب دو، اے اللہ روح القدس سے حسان کی مدد کر۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا حارث بن عبد المطلب کے فرزند سیدنا ابو سفیان مغیرہ بن حارث رضی اللہ عنہ نے زمانہ جاہلیت میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ھجو لکھی اور بہت گری ہوئی باتیں کہیں۔ آپ علیہ السلام نے حسان سے جواب دینے کو کہا اور ساتھ ہی یہ بھی فرمایا کیسے ان کی ھجو کرو گے میں بھی تو اسی قوم میں سے ہوں۔ اور تم ابو سفیان کی ھجو کیسے کہو گے جبکہ وہ میرا چچا زاد بھائی ہے[1]؟ تو حسان نے جواب میں کہا

۱۔ عام طور پر ایرانی مشرکوں نے یہی مشہور کیا ہوا ہے کہ ابو سفیان بن حرب اموی رضی اللہ عنہ نے ھجو کہی تو حسان رضی اللہ عنہ نے جواب دیا۔ حالانکہ یہ ابو سفیان مغیرہ بن حارث رضی اللہ عنہ حضور علیہ السلام کے تایا زاد بھائی اور دودھ شریک بھی تھے اور بچپن میں ایک دوسرے سے بہت محبت رکھتے تھے۔

لا سلنک منهم کما تسل الشعرة من العجين

میں آپ کو ان میں سے ایسے نکال لاؤں گا جیسے آٹے سے بال نکالا جاتا ہے۔

حضرت حسان نے جواباً کہا

الا ابلغ ابا سفیان عنی
فانت مجوف نخب ہواء
بان سیوفنا ترکتک عبداً
و عبدالدار سادتہاالاماء
هجوت محمداً فاجبت عنه
و عندالله فی ذاک الجزاء
اتهجوه ولست له بکفء
فشر کما لخیر کما الفداء
هجوت مبارکاً برّ حنیفاً
امین الله شیمة الوفاء
ومن یهجو رسول الله منکم
ویمدحه و ینصره سواء
فان ابی ووالده وعرضی
لعرض محمد منکم وقاء[۲]

ترجمہ۔ بے دل، بزدل اور کھوکھلے ابو سفیان کو میرا پیغام پہنچے کہ ہماری تلواروں نے تجھے غلام بنا دیا ہے اور بنو عبدالدار کی لونڈیاں ان کی بزرگ ہیں تو نے محمد کی ھجو کی ہے تو اس کا جواب تمہیں میں دیتا ہوں اور اس دفاع رسول کی جزاء اللہ کے ہاں ہے تو محمد رسول اللہ کی ہجو کرتا ہے جیسے تو ان کا کچھ لگتا ہی نہیں تمہارے برے تمہارے بہترین (محمد ﷺ) پر قربان تو ہجو کرتا ہے برکتوں والے صالح راست باز اور حق پژوہ کی۔ اللہ کی امانتوں کے امین اور پیکر وفا کی تم میں سے جو شخص بھی رسول اللہ کی مدح کرے مدد کرے یا قدح کرے محمد ﷺ اس سے بالا تر ہیں۔ میرے ماں باپ میری جان و مال اور میرا ناموس عظمت محمدی کے لئے تمہارے سامنے ڈھال ہیں۔

حضرت حسان کے اس جواب سے قریش بہت تلملائے اور کہنے لگے کہ یقیناً ہمارے معائب سے حسان کو ابو بکر نے مطلع کیا ہے۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے حسان کے اشعار سماعت فرمائے اور فرمایا

فکان قوله اشد علیهم من نضح النبل

مفہوم۔ اور حسان کی جوابی کارروائی ان پر تیروں کے گھاؤ سے شدید تر اور نشتر کی چبھن ہے آپ کی شاعری

۲۔ دیوان حسان ص ۷، ۸، ۹ مطبوعہ مصر

اسلام اور شرک کے مابین حد فاصل ہے۔ ابو عبیدہ کہتے ہیں۔

فضل حسان الشعراء ثبلاث كان شاعر الانصار فى الجاهلية و شاعر النبى فى النبوة و شاعراليمن كلها فى الاسلام

حضرت حسان کی فضیلت شعراء عرب پر تین حیثیتوں سے ہے۔ آپ جاہلیت کے زمانہ میں انصار کے شاعر تھے۔ آپ عہد نبوت میں شاعر رسول اللہ تھے، شاعر رسول اللہ تھے تو پورے یمن میں عہد اسلام کے منفرد اور یکتا شاعر تھے۔

اور حطیئہ کہتے ہیں

ابلغوالا نصار ان شاعر ہم اشہر العرب

حطیئہ کے مطابق آپ پورے عرب کے مشہور شاعر تھے۔

یک دفعہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا

ما يمنع القوم الذبن نصرو رسول الله بسلا حهم ان ينصروه بالسنتهم فقال حسان آنالها واخذ بطرف لسانه

جن لوگوں نے اپنے اسلحہ سے میری مدد کی ہے انہیں کس چیز نے روک رکھا ہے کہ وہ اپنی زبانوں سے میرا دفاع نہیں کرتے؟ تو حضرت حسان نے اپنی زبان پکڑ کر عرض کیا یارسول اللہ میں اس کام کے لئے حاضر ہوں تو حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا۔

والله مايسرني به القول بين بصرى و صنعاء

اللہ کی قسم بصریٰ اور صنعاء کے مابین کسی کی بات نے مجھے اتنا سکون نہیں دیا جتنا سرور حسان کی بات سن کر حاصل ہوا۔

آپ کی اسی خوبی کردار اور حسن اشعار کے عظیم کارنامہ نے حضرت حسان کو شاعر رسول اللہ بنا دیا اب رہتی دنیا تک آپ اسی لقب سے پکارے جائیں گے۔ یہ وہ عزت و عظمت ہے جو ہر کس و ناکس کے حصہ میں نہیں آتی بلکہ

یہ رتبۂ بلند ملا جس کو مل گیا

حسان و عثمان رضی اللہ عنہما

مکہ مکرمہ میں جب اشرافیہ کی حکومت کے اعوان وانصار نے ایذاء رسانی کی حدیں بھی مسمار کر دیں تو اللہ نے حضور علیہ السلام کو ہجرت کا حکم دیا۔ سیدنا عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ بحکم رسول مکہ سے حبشہ کی طرف دو مرتبہ ہجرت کر چکے تھے۔ جب انہیں ہجرت مدینہ کا علم ہوا تو آپ حبشہ سے مدینہ طیبہ کی طرف مہاجر ہوئے مدینہ طیبہ پہنچے تو مہاجرین نے سیدہ رقیہ زوجہ سیدنا عثمان کا والہانہ استقبال کیا۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے جب مہاجرین وانصار (مواخاۃ) بھائی چارہ قائم کیا تو سیدنا حسان کو سیدنا عثمان کا بھائی بنا دیا اس رشتہ مواخات پر حضرت حسان بہت مسرور و شاداں تھے۔ حضرت حسان اس مواخات کے رشتہ پر فخر کیا کرتے تھے۔

حضرت عثمان ان سے بہت محبت کرتے اور باہم کمال درجہ کا حسن سلوک رکھتے تھے۔ جب مشرکین عجم نے اپنی شکست کا بدلہ لینے کے لئے سیدنا عثمان پر الزامات لگائے اور ان کا محاصرہ کیا اور بالآخر انہیں جبر و قہر اور ظلم و ستم سے شہید کر دیا تو سیدنا حسان نے آپ کے بہت مرثیے لکھے ان میں اپنی اس بھائی بندی کا یوں ذکر کرتے ہیں

ماذا اردتم من اخی الخیر بارکت
یداللہ فی ذاک الادیم المقدد
قتلتم ولی اللہ فی جوف دارہ
وجئتم بامر جائر غیر مھتدی
فھلا رعیتم و ذمۃ اللہ و سطکم
و اوفیتم بالعھد عھد محمد

کیا ارادہ کیا ہے تم نے میرے بھلائی والے بھائی سے اللہ کی امداد ہمیشہ سے اسی کے ساتھ ہے تم نے اللہ کے دوست کو اس کے گھر میں قتل کر دیا اور تم ظلم والا کام لائے ہو جو ہدایت سے خالی ہے پس تم نے اللہ کی ذمہ داری کا پاس کیوں نہ کیا جو تم میں ہے اور تم نے محمد کے وعدے کو پورا کر دکھایا

شہادت کی خوشخبری

اترکتم غزو الدروب وجئتم
لقتال قوم عند قبر محمد
فلبئس ہدی الصالحین ہدیتم
ولبئس فعل الجاہل المتعمد

کیا تم نے میدان کارزار کا جہاد عظیم چھوڑ دیا؟ اور یہاں محمد ﷺ کی قبر کے ہاں قتال کے لئے آپہنچے مسلمانوں کا طریقہ کار کتنا برا ہے اور افسوس ناک ہے اور کتنا برا فعل ہے جان بوجھ کر جاہل بننے والے کا۔

ضحوا باشمط عنوان السجود بہ
یقطع اللیل تسبیحاً وقرآناً
لتسمعن وشیکاً فی دیار ہم
اللہ اکبر یا ثارات عثماناً
ویہا فدیً لکم امی وما ولدت
قد ینفع الصبر فی المکر وہ احیاناً

صبح کا وقت وہ سجدہ کرتے ہی گزار دیتا تھا۔ جو کہ رات تسبیح کرتے ہوئے اور قرآن پڑھتے گزارتا تھا۔ ضرور سنے گا تو، ان کا گھر میں جلد واپس آنا۔ اللہ اکبر۔ اے عثمان کے قتل کا قصد کرنے والو کتنا اچھا ہوتا کہ قربان ہو جاتی تم پر میری ماں جس نے اسے جنا انسان کبھی کبھی مکروہ چیز سے بھی نفع اٹھاتا ہے۔

۳۔ شرح دیوان حسان ابن ثابت رضی اللہ عنہ ص ۴۱۰

سیدنا حسان رضی اللہ عنہ شہادت عثمان کے بعد بہت خاموش رہتے گویا وہ غموں کے بوجھ تلے دبے ہوئے ہیں۔ اغلب یہ ہے کہ اسی حزن و اندوہ کی وجہ سے آپ کی بصارت بھی جاتی رہی۔ مشرکین عجم اشتریوں اور مختاریوں نے تاریخ شعر و ادب میں بہت گھپلا کیا ہے۔ اور چند اشعار سیدنا حسان کی طرف ایسے بھی منسوب کئے ہیں جن میں سیدنا علی اور دیگر انصار و مہاجرین رضی اللہ عنہم کے بارے میں سخت الفاظ ہیں جو ایجاد بندہ کے سوا کچھ بھی نہیں۔ یہ بات بڑی غور طلب ہے کہ نیزہ و شمشیر کے مقابلہ میں ہزیمت و ذلت اٹھانے والے سبائی و اشتری جب گوشہ عزلت میں بیٹھ گئے تو انہوں نے سب سے اہم جو کام کیا وہ قلم کی فسوں کاری ہے۔ دین کی بنیاد، دینی شخصیات اور حالات و واقعات میں ایسی دسیسہ کاری کی کہ تاریخ کا چہرہ تابناک داغوں سے اٹ گیا۔ سیدنا حسان رضی اللہ عنہ نے چونکہ بنی امیہ کی حمایت بھی کی اور سیدنا عثمان کی شہادت پر قاتلین کو لعنت ملامت خوب کی اس کار خیر کو مٹانا ان کے بس میں نہ تھا کہ یہ اشعار زبان زد عوام و خواص ہو گئے تھے۔ خصوصاً سیدنا معاویہؓ کے عہد خلافت راشدہ میں تو حضرت حسان کے مرثیوں کی بڑی دھوم مچی لوگ سنتے اور آبدیدہ ہو جاتے تھے۔ سبائیوں اشتریوں نے اس کا انتقام یوں لیا کہ اس قصیدہ میں چند اشعار ملا دیئے۔

سیدنا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت حسان رضی اللہ عنہ

حضرت حسان کا حضور علیہ السلام سے بھی ایک گہرا رشتہ تھا جس کو عجمی سازش کے تحت چھپایا گیا۔ آپ حضور علیہ السلام کے ہم زلف بھی تھے۔ آپ کی اہلیہ سیدہ سیرین حضور علیہ السلام کی زوجہ سیدہ ماریہ قبطیہ سلام اللہ علیہما کی سگی ہمشیرہ تھیں۔ ان سے حسان کے ہاں ایک لڑکا پیدا ہوا جن کا نام عبدالرحمن تھا اس طرح ابن رسول اللہ سیدنا ابراہیم اور عبدالرحمن بن حسان آپس میں خالہ زاد بھائی بھی تھے۔

وفات

سیدنا حسان کے بزرگوں نے اکثر و بیشتر ایک سو برس سے زائد عمر پائی۔ آپ کی عمر بھی ایک سو بیس برس کے لگ بھگ تھی۔ آپ ۵۴ھ میں سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ کی خلافت راشدہ کے زمانہ میں اپنے مالک حقیقی جل و علیٰ شانہ سے جا ملے۔

انا للہ وانا الیہ راجعون

صلوات اللہ وسلامہ علیٰ رسولہ والہ واصحابہ اجمعین

مجھے سیدنا حسان بن ثابت رضی اللہ عنہ اور حضرت امیر شریعت رحمۃ اللہ میں ایک مماثلت نظر آتی ہے۔ گو دونوں بزرگوں میں صدیوں کا فاصلہ ہے مگر ذوق سلیم اور فہم مستقیم زمان و مکان کی قید سے ماورا ہے۔ امیر شریعت نے بھی قرآن کے اسلوب بیان و خطاب اور لب و لہجہ کو اختیار کیا اور محمد رسول اللہ ﷺ کے دشمنوں پر اسی طرح جھپٹے جس طرح سیدنا حسان۔ مرزائیوں اور اشتریوں کو آپ نے زندگی بھر معاف نہیں کیا جب بھی ان مغضوب و مقہور طبقوں نے شارع علیہ السلام اور ان کے اصحاب پاک کے خلاف دریدہ دھنی کی آپ

بے تاب ہو گئے۔ قادیان ہو یا لکھنو دونوں امیر شریعت کی جولا نگاہ میں تھے اور ان دونوں مقامات پر کفر و اسلام اور حق و باطل کے ایسے زور دار معرکے ہوئے کہ ہندی و ایرانی کفر کے محل زمیں بوس ہو کر رہ گئے۔ اسی نسبت عالیہ کے ماتحت میں نے یہ مضمون سپرد قلم کیا ہے۔

قرآن کریم اور حضرت امیر شریعت رحمتہ اللہ

ہماری سرزمین پاک و ہند میں قرآن مجید سے شغف کے بے شمار واقعات ملتے ہیں اور ان گنت شخصیتوں نے دعوت قرآنی کے لب ولہجے اور قرآن کے اسلوب بیان و خطاب سے امت مرحومہ میں روح پھونکی لیکن ہمارے حضرت امیر شریعت رحمہ اللہ نے مجلس احرار اسلام کے پلیٹ فارم سے دعوت قرآنی کو خطابی لب ولہجہ سے جس طرح عام کیا وہ انہی کا حصہ ہے۔ حضرت امیر شریعت فرمایا کرتے تھے۔

"کوئی نبی مصنف نہیں ہوا لیکن ہر نبی و رسول خطیب تھا اور خطابت پیغمبرانہ صفت ہے"

اور خطابت کی نعمت سے وافر حصہ حضرت امیر شریعت کو اللہ نے ودیعت کیا تھا۔ اور آپ کی خطابت کا سب سے بڑا بنیادی جوہر قرآن کریم تھا۔ آپ جب قرآن کی تلاوت کرتے تو محسوس ہوتا صدائے فارانی کانوں میں رس گھول رہی ہے اور جب آپ قرآن کریم کی وجدانی تشریحات بیان کرتے تو مسلمانوں کے مردہ دل حیات نو پاتے اپنی زندگی کی ڈگر درست کرتے اور آمادہ عمل ہو جاتے جہاں مسلمان اس نغمہ لاہوت کو سنکر جھوم جھوم جاتے وہاں غیر مسلم بھی متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکتے۔ بمبئی میں آپ نے ایک ہفتہ میں ۱۴ تقریریں کیں۔

عنوان خطاب فرنگی سامراج تھا صبح درس قرآن رات کو دعوت قرآن رات کے جلسوں میں ہندو بھی ذوق و شوق سے شریک ہوتے آخری رات آپ نے سورہ مائدہ کی آیات

یا ایھا الذین امنوا لا تتخذ والایھود والنصاریٰ اولیاء بعضھم اولیاء بعض ومن تیولھم منکم فانہ منھم ان اللہ لا یھدی القوم الظالمین

اے مومنو یہودیوں اور نصرانیوں کو دوست مت بناؤ یہ آپس میں تو ایک دوسرے کے دوست ہیں (تمہارے نہیں) اور تم میں سے کسی نے اگر ان سے دوستی لگائی تو بے شک وہ انہی میں سے ہے بے شک اللہ ظالموں کو ہدایت نہیں دیتا۔

حجازی لے میں تلاوت فرمائیں کہ نغمہ زن الست نے بھی عالم لاہوت میں رباب روح کے تار چھیڑ دیئے اور ان تاروں سے وہ سریں پھوٹیں کہ عالم ناسوت کے باسی مسلم و غیر مسلم ہمہ تن گوش اور تصویر حیرت بنے بیٹھے تھے۔ آپ نے تلاوت ختم کی تو ایک کونے میں کچھ حرکت ہوئی اور آواز گونجی

رشی منی ہے رشی منی

آکاش وانی بولے ہے

یہ ایک ہندو وکیل تھا جو قرآن کی حلاوت اور تلاوت کی تاثیر کے ہاتھوں بے قابو ہو کر بول اٹھا تھا۔ یہ

قرآن کریم کا ہی اعجاز تھا کہ حضرت امیر شریعت ماحول پر چھا جاتے تھے اور مومن و کافر دوست دشمن اور اپنے بیگانے سب کے سب اعتراف حق سے گردنیں جھکا لیتے۔ آپ قرآن کریم کے ترجمہ کے لئے حضرت شاہ عبدالقادر دہلوی رحمہ اللہ کے ترجمہ کو اولیت دیتے اسی کو بیان فرماتے اسی کی تلقین کیا کرتے اور اس ترجمہ کی خوبی بیان کرتے ہوئے فرمایا کرتے تھے۔

شاہ صاحب کے ترجمہ کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ آپ مفرد کا مفرد سے اور جمع کا جمع سے اور محاورات عرب کا ہندی محاوروں سے ترجمہ فرماتے اگر قرآن ہندوستان میں اور اردو زبان میں نازل ہوتا تو کم و بیش وہی زبان ہوتی جو شاہ عبدالقادر نے لکھی ہے"

قارئین کو یہ بات بھی یاد رکھنی چاہیئے کہ حضرت شاہ عبدالقادر دہلوی ولی اللہی خاندان کے لعل جہاں تاب تھے آپ نے قرآن کریم کا ترجمہ چالیس برس میں مکمل کیا اور غالباً روزے بھی مسلسل رکھتے تھے مشہور ہے کہ دلی کی جس مسجد میں پتھر سے ٹیک لگا کر آپ ترجمہ لکھا کرتے تھے وہ پتھر بھی درمیان سے گھس گیا تھا (اللہ اکبر)

حضرت امیر شریعت کی روح آپ کا وجدان قرآن کریم میں رچ بس گیا تھا۔ بعض آیات کا ترجمہ تو ایسا بھی کرتے جو مکتوب و منقول نہ ہوتا مگر ماحول، واقعات اور طبقات کی مناسبت سے ایسا فٹ بیٹھتا کہ علماء بھی عش عش کر اٹھتے اور داد و تحسین میں بے اختیار ہو جاتے۔

ایک مجلس میں جو علماء سے کھچا کھچ بھری ہوتی تھی۔ حضرت شیخ التفسیر مولانا احمد علی لاہوری نور اللہ مرقدہ تشریف فرما تھے۔ راقم (ارشاد احمد) بھی موجود تھا گفتگو کے دوران میں اچانک حضرت شاہ صاحب نے علماء سے پوچھا کہ آپ لوگ ذی علم ہیں درس و تدریس آپ کا شغل ہے۔

وما دعاء الکفرین الا فی ضلل

اور جتنی پکار ہے کافروں کی گمراہی ہے۔

کا ترجمہ کیا کریں گے؟ تمام علما نے وہی جو مکتوب و مروج ترجمہ ہے اسی کا اشارہ کیا لیکن حضرت امیر شریعت رحمہ اللہ نے فرمایا میرے نزدیک یہاں "ما" نافیہ ہے اور ترجمہ یوں ہوگا۔

"نہیں پکار کافروں کی مگر بھونک"

حضرت لاہوری قدس سرہ نے سن کر خوب داد دی۔

غالباً سن ۱۹۵۶ء کی بات ہے کہ خیر المدارس کے سالانہ جلسہ تقسیم اسناد پر ملک بھر سے آئے ہوئے علماء حضرات مولانا عبدالحق (اکوڑہ خٹک) حضرت مولانا محمد یوسف بنوری حضرت مولانا محمد عبداللہ رائے پوری اور دیگر اکابر علماء حضرت مولانا خیر محمد صاحب رحمہم اللہ کی معیت میں حضرت امیر شریعت کی عیادت کے لئے ان کے دولت کدہ پر تشریف لائے راقم الحروف (عطاء المحسن) بھی موجود تھا۔ حضرات کی خدمت پر مامور تھا۔ چائے لایا اور ماحضر بھی چائے نوشی اور بیمار پرسی کے بعد واپسی کے لئے حضرات نے اجازت چاہی تو فرمایا "میں کیسے کہوں کہ رحمت میرے گھر سے چلی جائے آپ کا یوں تشریف لانا مجھ ناکارہ پر

اللہ کا کرم ہے اور جی تو یہ چاہتا ہے کہ آپ یونہی بیٹھے رہیں اور میں رحمتوں کی بارش میں لطف و کیف سرمدی پاتا رہوں"

حضرت مولانا عبدالحق رحمہ اللہ نے اکوڑہ خٹک واپس جانا تھا۔ انہوں نے بڑی معذرت کے ساتھ فرمایا جی تو ہمارا بھی آپ سے جدا ہونے کو نہیں چاہتا حضرت بنوری رحمہ اللہ نے بھی بڑی عذر خواہی سے رخصت چاہی تو حضرت شاہ صاحب نے فرمایا۔ دعاء فرمائیں جب دعاء ہو چکی تو آپ نے فرمایا۔

وتو فنا معا الابرار

اور ساتھ ہی ترجمہ یوں فرمادیا (پنجابی میں)

تے پوری پا ساڈی نال نیکاں دے

حضرت الاستاذ مولانا خیر محمد رحمہ اللہ نے اس ترجمہ کی اتنی داد دی کہ مجمع حیران ہو گیا۔ آپ اس قدر داد و تحسین کے عادی نہ تھے لیکن میں نے دیکھا کہ مولانا کا چہرہ تمتما اٹھا اور خوشی سے باچھیں تک کھل گئیں اور آپ بار بار فرماتے ماشاء اللہ ماشاء اللہ اور فرماتے

اس سے بہتر لفظی ترجمہ اور نہیں ہوسکتا

ماشاء اللہ یہ آپ ہی کا حصہ ہے۔ حضرت امیر شریعت نے فرمایا

کہ اس ترجمہ سے غلام احمد کی توفی کی رگ بھی کٹ جاتی ہے کہ توفی کا معنی موت نہیں یوں ہی اس نے کھینچ تان کر توفی کو مردوں پر فٹ کرنے کی کوشش کی ہے۔

اس پر پھر حضرت مولانا اور تمام علماء نے خوب داد دی اور یوں یہ محفل عشاق امید فردا پر برخاست ہوئی۔

اب انہیں ڈھونڈ چراغ رخ زیبا لیکر

حضرت امیر شریعت رحمہ اللہ کی تلاوت قرآن اور بیان و تبیان قرآن کی تعریف مرشد احرار حضرت شاہ عبدالقادر رائے پوری نور اللہ ضریحہ سے خود راقم نے یوں سنی (مفہوم)

"اجی ہمارے حضرت شاہ صاحب جیسا کون ہو گا ایسے جذبوں اور عمل والا شخص تو ہم نے دیکھا ہی کم ہے آپ آیت من آیات اللہ تھے

اگر شاہ صاحب چاہتے تو دنیا میں بادشاہی کرتے لیکن آپ نے تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع میں قرآن اور فقر اختیاری کو زینت دنیا اور تفاخر پر ہمیشہ ترجیح دی ہمارے شاہ صاحب بے مثال انسان ہیں آپ نے قرآن کی خدمت سے وہ مقام حاصل کیا جو بڑے بڑوں کے نصیب نہ ہو"

استاذالمحدثین سند الاساتذہ حضرت علامہ محمد انور شاہ صاحب قدس اللہ سرہ العزیز نے آپ کے اسی جوہر سے متاثر ہو کر آپ کو امیر شریعت کے لقب سے نوازا اور یہ آپ کی ہی توجہات کا نتیجہ تھا کہ ملت بیضاء کے ۵۰۰ علماء نے آپ کی امارت شرعیہ کو قبول کیا اور باقاعدہ بیعت کی۔ اور اپنے درس حدیث میں یوں فرمایا۔

"پنجاب میں ایک صاحب ہمیں مل گئے ہیں صاحب توفیق، صاحب صلاحیت، صاحب سواد خوب کام کرتے ہیں۔ مولویوں کی طرح نہ خواہش زر میں مبتلا ہیں اور نہ خواہش شہرت میں بس بے چارے محض اللہ کے لئے کام کئے جاتے ہیں ہم نے قادیانیت کے متعلق انہیں توجہ دلائی کہ یہ فتنۂ عظیمہ صحیح اسلام کو جڑ سے اکھاڑے پھینکنے کا ارادہ کر بیٹھا ہے۔ آپ کیوں نہ اس فتنہ کے خلاف کچھ کام کر گزریں آپ کا وہ کام دین میں آپ کے لئے نفع رساں ہو گا۔ اور دنیا میں اس سے اہل دنیا کو فائدہ پہنچے گا۔ پھر فرمایا سید عطاء اللہ شاہ صاحب نے جو کام کر دکھایا ہے وہ بڑوں سے بھی نہ ہوا۔"[۴]

حضرت الاستاد مولانا خیر محمد صاحب رحمہ اللہ علیہ نے فرمایا مجدد الملت حضرت مولانا شاہ اشرف علی تھانوی نور اللہ مرقدہ کے سامنے شاہ صاحب کا ذکر ہوا تو فرمایا۔ "بھائی عطاء اللہ شاہ صاحب کی کیا بات کرتے ہو ان کی باتیں تو عطا اللہی ہوتی ہیں"

حضرت امیر شریعت رحمہ اللہ اور احرار گل و بلبل کی طرح لازم و ملزوم ہیں شاہ جی کا ذکر خیر احرار کے ذکر کے بغیر ادھورا اور احرار کا ذکر شاہ جی کے بغیر بیکار محض ہے۔ آپ نے چونکہ اپنی ملی زندگی مجلس احرار اسلام کے پلیٹ فارم پر ہی بتا دی اور اسی پلیٹ فارم سے آپ نے دشمن دین و ایمان فرنگی سامراج، اس کے خود کاشتہ پودے مرزائیت اور فرنگی کے ٹوڈیوں کو پورے ہندوستان میں للکارا اور ان کی دنیاوی حیثیت کو لتاڑا اور بیچ چوراہے میں انہیں پچھاڑا۔ پیران تسمہ پا اور علماء سوء کے پیچ در پیچ بدرنگ عماموں کے پیچ و خم کھولے انکی قباء زُور کو تار تار کیا اور ان کی گدیوں کی چولیں ڈھیلی کر دیں آپ فرمایا کرتے تھے۔

"علماء کرام، پیران عظام میں نے قرآن کی ایک آیت پڑھی تو اس نے مجھے چین سے نہ بیٹھنے دیا میں اللہ کے سب سے بڑے دشمن سے لڑ گیا اور اپنی زندگی کے حسین گیارہ سال جیل میں گزار دئے زندگی سفر میں کٹ گئی۔ لاکھوں انسانوں کے دل سے فرنگی کا خوف دور کیا لیکن قربان جاؤں تمہارے ہاضمہ کے آپ پورا قرآن کریم اور لاکھوں احادیث ہضم کر گئے مگر ٹس سے مس نہ ہوئے"

ان زخم خوردہ لوگوں کے حاشیہ نشین شاہ صاحب کے تابڑ توڑ عوامی حملوں سے بہت مضطرب ہوئے تو ایک "کرنٹے" نے کہا عطاء اللہ شاہ کو قرآن کے سوا کیا آتا ہے تو آپ نے اس کے جواب میں فرمایا (موچی دروازہ لاہور غالباً)

"ہاں بھائی واقعی مجھے قرآن کے سوا کچھ نہیں آتا۔ الحمدللہ، الحمدللہ، ثم الحمدللہ! کہ مجھے قرآن کے سوا کچھ نہیں آتا۔ میری دعا ہے کہ قرآن کے سوا مجھے کچھ بھی نہ آئے۔ لیکن یہ صاحب جو مجھے طعنہ دیتے ہیں ان کا یہ عالم ہے کہ خود انہیں قرآن ہی نہیں آتا۔

ایک دفعہ لاہور دفتر احرار میں چند نوجوان آئے اور انہوں نے قرآن اور دیگر کتابوں کے موازنہ کی گفتگو

۴۔ "اباجی" اور "شاہ جی" از سید محمد ازہر شاہ قیصر ابن امام المحدثین رحمہم اللہ مطبوعہ ماہنامہ "نقیبِ ختمِ نبوت" ملتان امیر شریعت نمبر اگست ۱۹۸۸ء

کی تو آپ نے فرمایا۔

"میاں تم قرآن کریم کو الہامی کتاب مان کر نہ پڑھو عربی ادب عالیہ کی کتاب سمجھ کر ہی پڑھ لو تو تمہاری روح پاک ہو جائے گی"

حضرت امیر شریعت کا یہ قول بہت مشہور ہے کہ آپ نے "یونیورسٹائزڈ" طبقہ سے مخاطب ہو کر فرمایا۔

"بابو لوگو! قرآن ہماری طرح نہ سہی اقبال کی طرح پڑھ لو! دیکھو اقبال نے قرآن ڈوب کر پڑھا تو تہذیب فرنگ پر ہلہ بول دیا۔"

آپ میدان خطابت کے تو یکتائے روزگار تھے ہی اللہ نے آپ کو اتنا بلند شعری ذوق بھی عطا فرمایا تھا کہ صوفی غلام مصطفیٰ تبسم، محمد حسین عرشی، ڈاکٹر تاثیر، جگر مراد آبادی اور علامہ طالوت جیسی ہستیاں بھی آپ کے اس کمال کی معترف تھیں۔ آپ کا کلام "سواطع الالہام" کے نام سے آپ کی زندگی میں چھپ چکا ہے۔ جس میں آپ کے اکثر اشعار نعت رسول مقبول ﷺ پر مشتمل ہیں۔ ملاحظہ ہو عظمت رسول ﷺ کا انوکھا اظہار۔

مقام و مہبط قرآن و انبیاء گردید
بہ مشت خاک بنازم چہ رتبۂ خاک است
یتیم کہ محمدؐ کہ ابروئے خدا است
کسیکہ خاک رہش نیست بر سرش خاک است
چمن چمن گل و نسریں زعکس رخ ریزد
سبد سبد گل خنداں زراہ می چکدش

اور نبی کے باغیوں کو تنبیہ ملاحظہ ہو

حذرز خاک نشینے شکستۂ دل ریش
کہ صد ہزار جہنم ز آہ می چکدش

قرآن و محمد ﷺ کا لزوم اور شان و عظمت دیکھئے امیر شریعت نے کیسے بیان فرمایا جو اساتذہ کے ہاں بھی کم یاب ہے

لو لاک ذرۂ ز جہان محمد است
سبحان من یراہ چہ شان محمد است
نازد بنام پاک محمد کلام پاک
نازم باں کلام کہ جان محمد است

حضرت امیر شریعت رحمہ اللہ دور ایوبی میں ۱۹۶۱ء کی ۲۱۔ اگست کو مغرب کے قریب مالکِ حقیقی کی بارگاہ میں حاضر ہوئے سیدنا حسان صحابی رسول اور حضرت امیر شریعت رحمہ اللہ کے از خانوادہ رسولؐ دونوں

نے عمر بھر توحید و رسالت کا تحفظ کیا دونوں قرآن و رسول کے شیدائی، دونوں نے عمر بھر دشمنان رسول کے "جمہوری محاذ" میں دراڑیں ڈالیں۔ دونوں نے رسالت و پیغام رسالت پر زبان درازی کرنے والوں کو منہ توڑ جواب دیا۔ سیدنا حضرت حسان نے مشرکین مکہ کو جواب دیا اور حضرت امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ نے جب بھی منکرین عجم اشتریوں سبائیوں اور قادیانیوں کو جواب دیا تو

فبهت الذی کفر

کا نقشہ سامنے آیا۔

اے اللہ ہمیں ان اسلاف کی پیروی کی توفیق عطا فرما۔ آمین۔

*

تحریر: سید محمد کفیل بخاری

روایت: قاضی حاکم علی

آزادی کے سچے طلبگار

قاضی حاکم علی تحریک آزادی کے ایثار پیشہ کارکنوں میں سے ایک ہیں۔ اس وقت نوے برس کے ہیں۔ تحریکِ آزادی کا اخباری ریکارڈ محفوظ کرنے کا بے حد شوق تھا۔ زمیندار، انقلاب، کامریڈ، ہمدرد، آزاد، احرار اور ایسے ہی بے شمار اخبارات و رسائل انہوں نے سنبھال سنبھال کے رکھے تھے۔ خود شاعر نہیں مگر پنجابی شاعری کے رسیا۔ لاتعداد پنجابی نظمیں انہیں آج بھی ازبر ہیں۔ جوانی میں غضب کے خوش آواز تھے اور احرار کے جلسوں میں نظمیں پڑھتے تھے۔ ان کا اخباری ریکارڈ بہت سے "علم دوست" احباب عاریتاً لے گئے مگر واپس کرنا "دیانت" کے خلاف سمجھا۔ اس سے قاضی صاحب کی طبعیت پر بہت برا اثر ہوا۔ تاہم اپنی خوش مزاجی کی وجہ سے انہوں نے غم کو حرزِ جاں نہیں بنایا۔

وہ مزنگ (لاہور) کے ایک محلہ میں گمنامی کی زندگی بسر کر رہے ہیں۔ میرا ان سے کوئی تعارف نہ تھا۔ تین برس قبل وہ مسجد احرار ربوہ میں منعقدہ سیرت کانفرنس میں شرکت کے لئے لاہور کے احرار کارکنوں کے ساتھ تشریف لائے تو میرا ان سے پہلی مرتبہ تعارف ہوا۔ تب سے اب تک ان سے مسلسل ملاقاتیں ہیں۔ جب بھی ان کی خدمت میں حاضر ہوتا ہوں کوئی نہ کوئی پرانا اخبار دفتر احرار کی لائبریری کے لئے ہدیہ کر دیتے ہیں۔ اس نمبر میں شامل باری علیگ مرحوم کا مضمون "اقبال اور بخاری" انہی کی مہربانی سے ملا۔ انہوں نے زمیندار ۱۹۳۱ء کا وہ شمارہ ہدیتہً پیش کیا جس کے صفحہ اول پر یہ مضمون شائع ہوا تھا۔

دو ماہ قبل ان کی خدمت میں حاضر ہوا تو انہوں نے اپنی یادوں کے دریچے وا کئے اور تحریک آزادی کے ایمان پرور واقعات سنانے لگے۔ کتنی دیر ماضی میں کھوئے رہے اور یادوں کے ورق الٹتے پلٹتے رہے۔ اسی دوران انہوں نے حضرت امیر شریعت رحمہ اللہ کا ایک واقعہ سنایا جو ان کا چشم دید ہے۔ وہ فرما رہے تھے:۔

حضرت امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاری تقسیم ہند سے قبل لاہور تشریف لائے۔ ان دنوں ان کے دانتوں میں تکلیف تھی۔ مال روڈ پر ڈاکٹر جلال الدین (مشہور دندان ساز) کا کلینک تھا اور وہ شاہ جی کے ارادت مندوں سے تھے۔ شاہ جی علاج کے لئے ان کے ہاں کلینک پر تشریف لے گئے۔ دانتوں کے معائنہ کے بعد ڈاکٹر جلال صاحب نے کہا کہ شاہ جی! میں آپ کے دانت ٹھیک کر دوں گا مگر شرط یہ ہے کہ آپ علاج کے لئے میرے ہاں قیام فرمائیں۔ پرہیزی غذا میں خود تیار کر کے آپ کو کھلاؤں گا۔ اور علاج بھی کروں گا۔ شاہ جی مان گئے اور ڈاکٹر جلال صاحب کی کوٹھی پر قیام فرما لیا۔ دس بارہ روز ڈاکٹر صاحب نے انہیں اپنے ہاں رکھا۔ لاہور کے سبھی قابلِ ذکر احرار کارکن عصر کے بعد ڈاکٹر صاحب کی کوٹھی پر پہنچ جاتے اور ہجوم عاشقاں کے جھرمٹ میں شاہ جی جلوہ افروز ہوتے معرکہ کی مجلسیں منعقد ہوتیں۔ ہر طبقہ کے لوگ شاہ جی سے ملنے آتے۔ ایک روز چڑیا گھر کی مسجد کے امام حافظ شاہ دین (مرحوم) شاہ جی سے ملنے ادھر آنکلے۔ شاہ جی نے ان سے فرمائش کی اور فرمایا "بھائی حافظ جی ہمیں بھی چڑیا گھر دکھا دو"

چنانچہ دوسرے روز دوپہر کا پروگرام طے ہو گیا۔ اگلے دن شاہ جی کارکنوں کے ہمراہ چڑیا گھر پہنچ گئے۔ میں بھی ساتھ ہو لیا۔

شیر --- شاہ جی کی طبعی کمزوری تھا۔ گھومتے پھرتے جونہی شیر کے پنجرے کے قریب آئے تو دیر تک اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھتے رہے اور ایک گہری سوچ میں ڈوب گئے۔ پھر یکایک شیر سے مخاطب ہوئے:

"یار کچھ تو بولو، کیوں خاموش ہو؟ کوئی نعرہ، کوئی للکار --- پھر شیر کو پیار کیا۔ اچانک شیر دھاڑا اور چڑیا گھر کے تمام جانور "بادشاہ سلامت" کی آواز سن کر سہم گئے۔ فضاء پر سکوت طاری ہو گیا --- اس کے بعد فضاء میں ایک اور آواز گونجی۔ شاہ جی نے شیر کے منہ پر ہاتھ پھیرا اور اسے پیار کرتے ہوئے فرمایا:

"ہم دو ہی آزادی کے سچے طلبگار ہیں۔ ایک تم۔ اور ایک میں"

یہ کہہ کر شاہ جی لوٹ آئے اور پھر پیچھے مڑ کر قیدی شیر کو نہیں دیکھا۔ واقعی شاہ جی آزادی کے سچے طلبگار تھے۔

شاہ جی بطور شاعر

سید عطاء اللہ شاہ بخاری ندیم

حضرت علامہ طالوت مرحوم

یہ مضمون شاہ جی کے مجموعہ کلام "سواطع الالہام" کے مقدمہ کے طور پر دسمبر ۱۹۵۴ء میں لکھا گیا۔ تب شاہ جی حیات تھے

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے پہلے جبکہ عرب قبائلی زندگی بسر کرتے تھے ہر قبیلہ کا ایک شاعر اور ایک خطیب ضرور ہوتا تھا۔ جس قبیلہ میں شاعر یا خطیب نہ ہوتا وہ کم مرتبہ خیال کیا جاتا۔ جس قبیلہ کے شاعر و خطیب بلند مرتبے کے مالک ہوتے وہ دوسرے قبائل سے سربرآوردہ خیال کیا جاتا۔ اس لئے شاعر قوم کا دل خیال کیا جاتا تھا۔ خطیب قوم کی زبان متصور ہوتا تھا۔ اور قبیلے کا سردار قوم کا دماغ، اور نوجوان اس کے دست و بازو شمار کئے جاتے تھے۔ دل جہاں نہ ہو وہاں دست و بازو اور دماغ کیا کام دے سکتے ہیں۔ اور زبان نہ ہو تو دل و دماغ کی ترجمانی کیونکر ہو۔ بعض اوقات ایسا بھی ہوا کہ دل اور زبان کا کام ایک ہی شخصیت سے لیا گیا۔ اسلام آیا تو قرآن کے سامنے نہ شاعری کا زور باقی رہا اور نہ خطابت کا چراغ جل سکا۔ پھر بھی شعراء اور خطیب باقی رہے۔ مگر وہ عصبیت جاہلیہ کو بھڑکانے والے نہیں تھے بلکہ قرآن کے مبلغ اور اسلام کے مدافع تھے۔ اسلامی فوجوں میں دونوں کا وجود ثابت ہے اور یہ دونوں فوجی نظام کا ایک اہم جزو خیال کئے جاتے تھے۔ پھر جب اسلام ہر بلند و پست پر چھا گیا اور اس کی فوجیں فتح ممالک کے ساتھ ساتھ نظم ممالک کا کام بھی کرنے لگیں تو شعر و خطابت نے اپنی اپنی راہیں بدل دیں۔ شعراء نے مدح و ہجو کی راہ پر چل کر اگرچہ اپنی جیبیں بھر لیں۔ مگر اپنا وقار کم کر لیا۔ خطیبوں نے قوم کے بگڑتے ہوئے اخلاق کو سدھارنے کا کام اپنے ذمہ لے لیا۔ اور اپنی عزت اگرچہ پہلے سے زیادہ کر لی مگر:

ع "چہ خورد بامداد فرزندم"

کے مسئلہ پر پہنچ کر ششدر رہ گئے۔ پھر محض قصاص اور پیشہ ور بن گئے جن کے متعلق:

ع "چوں بخلوت میروند آں کار دیگر مے کنند"

کا فتویٰ صادر کیا گیا۔ کچھ اللہ کے بندے ایسے بھی رہے جنہوں نے کما کر کھانے اور حق کہنے کی قسم کھا رکھی تھی۔ وہ ممبروں پر بھی حق کہتے رہے اور جب ایسا وقت آیا کہ:

ع "بر دار تواں گفت بہ ممبر نتواں گفت"

تب بھی انہوں نے حق کہنے سے دریغ نہ کیا۔ جب مشرق و مغرب سے عرب قیادت کا ٹاٹ لپیٹ دیا گیا تو شاعری نے عشق بازی کی رسوائی کو طرۂ امتیاز بنا لیا اور خطابت غیروں کے کام آنے لگ گئی:

ع "ایں ہم رفت و آں ہم رفت"

ہر کلیہ میں استثناء ضرور ہوتا ہے۔ چنانچہ بعض صوفیاء اس دور میں بھی مستثنیٰ رہے۔ جنہوں نے شاعری کو رسوائی سے علیحدہ رکھا۔ اور خطابت کو قصہ گوئی سے بچا کر اغیار کی دست برد سے بھی محفوظ رکھا مگر ان کی حیثیت الشاذ کالمعدوم سے زیادہ نہ تھی۔

برعظیم پاک وہند میں اسلام گجرات کاٹھیاواڑ کے راستے سے داخل ہوا جہاں عرب اپنی تجارت کے سلسلے میں آمد ورفت رکھتے تھے۔ مگر اس کا نفوذ اس وقت جا کر پورا ہوا جب محمد بن قاسم سندھ کے راستے سے ملتان و لاہور تک فاتحانہ در آیا۔ پھر جب اسلام کے سیاسی سفیر معین الدین اجمیری نے دہلی، پنجاب اور راجپوتانہ کا دورہ کر کے شہاب الدین غوری کو بلایا تو یہ نفوذ اور بھی بڑھ گیا۔ کچھ دن اجمیری اور غوری کے جانشین مل کر کام کرتے رہے۔ مگر ایک وقت ایسا بھی آگیا کہ ان کی راہیں الگ ہو گئیں۔ پھر بھی ایک دوسرے سے اتنا بُعد نہیں تھا کہ اجنبیت کا خیال گزرتا۔ کبھی اجمیری کے جانشین دہلی تک چلے جاتے اور کبھی غوری کے جانشین خانقاہوں تک قدم رنجہ فرمالیتے۔ خانقاہوں نے تخت و تاج کی حفاظت کی اور تخت و تاج نے خانقاہوں کو جاگیریں عطاء فرمائیں۔ اور دونوں:

"من تراحاجی بگویم تو مرا ملا بگو"

کے کوچہ میں پہنچ کر اپنے اصل مقصد سے دور ہو گئے۔ خانقاہوں میں تخت و تاج کے خلاف سازشیں شروع ہو گئیں۔ اور تخت شاہی پر سے اہل خانقاہ کی ترغیب و ترہیب کے لئے منصوبے تیار ہونے لگے۔

تلک الایام نداولھابین الناس

کی صداقت نے کبھی اہل خانقاہ کا ساتھ دیا۔ اور کبھی تاج و تخت کا تا آنکہ مغل اعظم نے الحاد کے ساتھ ساز باز کر کے اہل خانقاہ کو مارکیٹ بدر کر دیا۔ مگر یہ کام اتنا آسان نہیں تھا۔ مغل اعظم کے جانشین نے سرہند میں گھٹنے ٹیک دیئے۔ اور اہل خانقاہ ہتھیاروں سے مسلح ہو کر پھر بلند و پست پر چھا گئے۔ اسی زمانہ میں مغرب کے دندان آز کی تیزی کی داستانیں بھی اس برعظیم تک پہنچنے لگ گئی تھیں۔ حکمت و طب کے چور دروازے سے گزر کر کچھ لوگوں نے اس برعظیم کی نفع بخشی کا جائزہ لیا تو اسی چور دروازے سے تجارت کی راہیں پیدا کی گئیں۔ تا آنکہ ایک وقت ایسا آیا کہ اہلِ خانقاہ تاج و تاخت سے بیزار ہو کر بالکل الگ ہو گئے۔ اور تاج و تخت بحیرۂ فرنگ کی موجوں میں ہچکولے کھانے لگ گیا۔ موجیں اگرچہ تند و تیز نہیں تھیں مگر تخت کی بوسیدگی اور ناخداؤں کی ہوا ناشناسی کی وجہ سے آخر یہ تخت ایسا غرق ہوا کہ اس کا ایک تختہ بھی کہیں ظاہر نہ ہوا۔

سرنگاپٹم کے پاس اس کا ایک کنارہ ذرا سا ظاہر ہوا بھی تو اُسے نظام دکن کی نظر کھا گئی اور:

بیک گردش چرخ نیلوفری

نہ نادر بجا ماند نے نادری

تخت و تاج سے نمٹنے کے بعد نئے حاکموں نے پہلے تو قانونِ خداوندی کو پورا کیا۔

ان الملوک اذا دخلوا قریۃً افسدوھا وجعلوا اعزۃ اھلھا اذلۃً وکذالک یفعلون
(القرآن)

بادشاہ جب (فاتحانہ) کسی ملک میں داخل ہوتے ہیں تو اسے برباد کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اور وہاں کے غالب لوگوں کو ذلیل بنا دیتے ہیں اور وہ اسی طرح کیا کرتے ہیں۔

پھر جائزہ لیا تو معلوم ہوا کہ وہ اہل خانقاہ جنھوں نے نئے ہتھیاروں سے مسلح ہو کر مغلِ اعظم کے جانشینوں کو گھٹنے ٹیکنے پر مجبور کر دیا تھا ان میں ابھی اتنی جان باقی ہے کہ وہ قوم کو پھر میدان میں لا کھڑا کر سکیں گے۔ چنانچہ عیار حکمرانوں نے نظام خانقاہی میں سے کچھ لوگوں کو ترغیب کے چھکے دے کر اپنا ہمنوا بنا لیا اور دوسری طرف وہ کام شروع کر دیا جو فرعون نے بنی اسرائیل کے ساتھ کیا تھا۔ مگر فرعون بنی اسرائیل کے بچوں کو "تلخ چھری" سے ذبح کرتا اور یہاں قوم کے بچے "میٹھی چھری" سے ذبح ہوتے اور میٹھی چھریاں بنانے کا سب سے بڑا کارخانہ اگرچہ علی گڑھ میں تھا مگر اس کی شاخیں ہر شہر اور قصبے میں موجود تھیں۔ جب بغیر بدنامی مول لئے قصاب خانوں اور مسلخوں سے زندہ لاشیں برآمد ہوئیں تو ان پر نوازشات کی بارش شروع ہو گئی۔ جسے دیکھ کر ہر شخص اپنے بچوں کو خود بخود ان مسلخوں میں داخل کرانے لگ گیا۔ اور اس طرح ان حاکموں کا کام آسان ہو گیا۔ مگر باوجود اس آسانی کے ان کا دل مطمئن نہ ہوا۔ اور خطرہ یہ تھا کہ اہل خانقاہ کا دوسرا حصہ جو ترغیب و ترہیب سے بے نیاز تھا برابر اپنے کام میں مصروف تھا۔ اور ہو سکتا تھا کہ ان زندہ لاشوں کے قلوب میں وہ ایمانی حرارت پیدا کر کے ان حکام کے خلاف انہیں استعمال کر لیں۔ اس لئے حاکموں نے تہیہ کر لیا کہ جس طرح ان لوگوں کی ظاہری کھال قصاب خانوں میں کھینچ لی گئی ہے کسی طرح ان کے قلوب میں سے ایمانی حرارت کا بھی خاتمہ کر دیا جائے اور یہ اس صورت میں ممکن تھا جب کہ الحاد کی برودت اس طرح ان کے دلوں میں داخل کر دی جائے کہ ایمان کی گنجائش ہی باقی نہ رہے۔

چنانچہ پنجاب کے ضلع گورداسپور میں ایک خاص قسم کے کھیت ایک مخصوص قطعہ زمین پر تیار کئے گئے۔ اور وہاں ایک "تجرباتی فارم" بنا کر نئے اصول کے مطابق کاشت کے نئے تجربات کئے گئے۔ حتیٰ کہ ایک "خود کاشتہ پودا" ایسا نتیجہ خیز ثابت ہوا جس کے استعمال سے حرارت ایمانی کے لئے قلوب میں کوئی گنجائش باقی نہ رہتی تھی۔ اب ملک میں ہر طرف سے اس فارم کی شاخیں کھول دی گئیں۔ اور ہر جگہ یہی پودا کاشت ہونے لگا۔ جب ملک کے اندر اس کی پیداوار کافی ہو گئی اور وہ نفع آور بھی ثابت ہوئی تو یہ مال باہر منڈیوں میں بھی بھیجا جانے لگا۔ عرب، افریقہ، اور یورپ کی منڈیوں میں خصوصیت کے ساتھ یہ "مال" بھیجا جاتا تھا۔ یورپ میں تو صرف نمائش کی خاطر کہ دیکھئے ہندوستان کا مال کس قدر خوبصورت اور نفع بخش ہے اور عرب و افریقہ کی منڈیوں میں استعمال کی خاطر تا کہ وہاں کے لوگوں کے دلوں سے بھی حرارت ایمانی کا خاتمہ کیا جا سکے۔

یہ حالات تھے جب غیرت حق کو جوش آیا اور اس نے سرزمین پاک و ہند میں عرب کے باقیات الصالحات اور عربی آقا (فداہ ابی وامی) کے نام لیواؤں کو ایک شاعر اور خطیب عطاء فرمایا۔ تا کہ شاعر اپنے سوز اور خطیب اپنے ساز سے ان کے دلوں کو گرما کر پھر ان میں حرارت ایمانی پیدا کر سکیں۔ خطیب کی جادو بیانی ساتھ

نہ ہو تو شاعر کا پیدا کیا ہوا سوز میدان میں کام نہیں دے سکتا۔ اور اگر شاعر کا سوز نہ ہو تو خطیب کی جادو بیانی اگرچہ اثر تو کرتی ہے مگر اسکا اثر دیرپا نہیں ہوتا۔ سرد لوہے کو کوٹنے سے آج تک کوئی نتیجہ برآمد نہیں ہوا۔ البتہ لوہا گرم ہو تو لوہار کے لئے کام آسان ہو جاتا ہے۔ شاعر کا کام قساوت قلبی کو اشعار کی گرمی سے نرم کرنا ہے۔ اس کے بعد خطیب کا کام شروع ہوتا ہے کہ وہ اس سے کام لے۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا تھا۔

ان من الشعر لحکمۃً وان من البیان لسحراً

"کچھ اشعار حکمت بھرے ہوتے ہیں اور کوئی خطابت جادوگری کا کام کرتی ہے"۔

اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل خاص سے جب اسلامیان پاک و ہند کی اصلاح کے لئے نظر عنایت ملتفت فرمائی تو انہیں حکمت و سحر دونوں عطاء فرمائے تاکہ پہلے حکمت زمین تیار کرے اور اس کے بعد جب یہ معلوم ہو کہ

ع یہ مٹی بہت زرخیز ہے ساقی

تو خطیب کی ساحرانہ طاقت بروئے کار آکر قوم سے کام لے۔ آپ کو معلوم ہے کہ حکمت کے علمبردار ہمارے ہاں حکیم الامت علامہ اقبال رحمہ اللہ تھے۔ جنہوں نے اپنی حکیمانہ شاعری سے الحاد زدہ سنگین قلوب کو موم کی طرح نرم کر دیا۔ اور جن کی شعلۂ نوائی نے پاک و ہند کی تاریکیوں میں قندیل کا کام دیا

ترے لئے ہے مرا شعلہ نوا قندیل

اور ان من البیان لسحراً کا مصداق پیکر خطابت خطیب الامت مولانا سید عطاء اللہ شاہ صاحب بخاری ہیں۔ جن کی جادو بیانی اپنوں بیگانوں سب کے ہاں مسلّم ہے اور جو

"لاکھ حکیم سر بجیب ایک کلیم سر بکف"

کا پورا پورا مصداق ہیں۔

علامہ اقبال رحمہ اللہ کے حلقۂ اثر میں ایسے بہت سے لوگ ہیں جنہوں نے ان کے پیغام اور ان کی حکمت کی تشریح کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنا لیا ہے۔ کیونکہ یہ کام آم کے آم گٹھلیوں کے دام کا مصداق ہے۔ ہم خرما و ہم ثواب، اچھا کام بھی کرو اور تصنیف و تالیف کے دام بھی پلے باندھ لو۔ دام نہ ملے تو شہرت تو کہیں گئی نہیں۔ مگر بخاری کی خطابت کی تشریح اور ان کے مقاصد کا بیان کچھ آسان کام نہیں ہے۔ گو ان کے حلقۂ اثر نے جادو بیان خطیب تو پیدا کئے مگر آج تک انہیں ایک بھی ایسا آدمی نہ مل سکا جو ان کی ساحری کو صفحات قرطاس پر ثبت کر کے زاد تاریخ بنا سکتا۔ جس سے آنے والی نسلیں بھی بہرہ اندوز ہو سکتیں۔ اور یہ اس لئے کہ ایک تو یہ کام آسان نہیں اور دوسرے گٹھلیوں کے دام تو الگ رہے یہاں تو آموں ک دام وصول ہونے کی بھی امید موہوم ہے۔ اور پیٹ میں روٹی یا بدرجہ آخر خرما کے دوچار دانے نہ پہنچیں تو نرے ثواب کو کوئی اوپر اوڑھے یا نیچے بچھائے۔ اور یہی وجہ ہے کہ آج تک بخاری پر کچھ زیادہ نہیں لکھا گیا۔ ورنہ ان کے محاسن برعظیم پاک و ہند کی کسی بڑی سے بڑی شخصیت سے کم نہیں۔

حضرت علامہ محمد انور شاہ صاحب قدس سرہ العزیز شیخ الحدیث دارالعلوم دیوبند کی شخصیت سے اہل

علم ناواقف نہیں ہیں۔ آج سے چار سو سال پہلے تک ان کے مرتبہ کا کوئی عالم نہیں اور نہ شاید آج سے چار سو سال بعد تک کوئی پیدا ہوا۔

انہوں نے خود علامہ اقبال رحمہ اللہ اور دوسرے اکابر کے سامنے لاہور میں آپ کو "امیر شریعت" نامزد فرمایا۔ اور آپ کے ہاتھ پر بیعت کی اور سبکو آپ کی متابعت کا حکم دیا کیا یہ کچھ کم فضیلت ہے؟

مولانا محمد علی جوہر کی شخصیت سے ارض پاک وہند کا بچہ بچہ واقف ہے۔ ان کی خطابت وقیادت دونوں مسلم الثبوت ہیں۔ مگر انہوں نے لاہور میں ایک موقع پر شاید دفتر "زمیندار" میں سب کے سامنے شاہ جی کے متعلق فرمایا کہ: "اس ظالم سے نہ پہلے تقریر کی جاسکتی ہے اور نہ بعد میں، اس کے بعد تقریر کرنے والے کا اثر جمتا نہیں، اور اس سے پہلے جو تقریر کرے اس کے اثر کو یہ آکر مٹا دیتا ہے"

مذہب وسیاست کی دو بڑی شخصیوں کی رائے کے بعد کسی تیسرے آدمی کی رائے لکھنے کی یہاں نہ گنجائش ہے اور نہ ضرورت بلکہ میرے نزدیک توان آراء کی بھی ضرورت نہیں کیونکہ:

آفتاب آمد دلیل آفتاب!

سورج جب نکل آئے تو لوگوں سے کبھی یہ نہیں کہا جاتا کہ لوجی وہ سورج نکل آیا ہے۔ بلکہ ہر شخص اسے خود بخود دیکھ لیتا ہے اور کسی شخص کو اس کے وجود سے انکار کی جرأت نہیں ہو سکتی۔ اور تو اور نابینا لوگ بھی اگرچہ دیکھ نہیں سکتے مگر اس کی حرارت کو محسوس کر کے اس کے وجود سے منکر نہیں ہوتے۔

صرف ایک روایتی جانور یا پرند کے متعلق مشہور ہے کہ وہ سورج کو دیکھنا گوارا نہیں کرتا اگرچہ اس کی سزا میں سارا دن الٹا لٹکے رہنے کو بادل نخواستہ قبول کئے رکھتا ہے مگر ایسے شپرہ چشموں کا کوئی علاج بھی تو نہیں:

گر نہ بیند بروز شپرہ چشم
چشمۂ آفتاب را چہ گناہ

"ابن الوقت" کا لفظ آپ نے سنا ہوگا۔ محاورۂ اردو میں ابن الوقت اس شخص کو کہا جاتا ہے جو "در مع الدھر کیف مادار" پر عمل پیرا ہو، اس کو ہر دیگ کا چمچہ اور ہر تھالی کا بینگن بھی کہتے ہیں۔ جو آپ کے ہاں آئے تو آپ کے ہاں میں ہاں ملائے اور آپ کے دشمنوں کے ہاں جائے تو ان کی ہاں میں ہاں ملائے۔ ابن الوقت کی ضد ایک اور لفظ ہے "ابوالوقت" جو بالکل اس کے خلاف معنی دیتا ہے۔ ابوالوقت اس شخص کو کہا جاتا ہے جو صاف صاف اپنی رائے رکھتا ہو اور دوسروں کی ہاں میں ہاں کبھی نہ ملائے۔

ابوالوقت کے معنی ہیں "وقت پر چھایا ہوا" ابن الوقت وقت اور ہوا کا رخ دیکھتا ہے۔ مگر ابوالوقت، وقت اور ہوا کو اپنے تابع بنا لیتا ہے۔ ابن الوقت پانی کے بہاؤ کے ساتھ بہتا رہتا ہے مگر ابوالوقت جدھر چاہے پانی کا رخ موڑ دیتا ہے۔ گو یہ اصطلاح عام نہیں مگر اہل علم کے ہاں غیر معروف بھی نہیں۔ ہر زمانے میں ہر علم و فن میں صرف ایک ابوالوقت ہوتا ہے اور باقی سب اس کے تابع و نقال ہوتے ہیں۔ گویا ہر زمانے میں

ابوالوقت تو ایک ہوتا ہے مگر ابن الوقت سینکڑوں ہزاروں ہوسکتے ہیں۔

زمانۂ حال میں شاعری کے ابوالوقت علامہ اقبال مرحوم تھے اور خطابت کے ابوالوقت عطاء اللہ شاہ صاحب بخاری ہیں۔ جس طرح آپ دیکھتے ہیں کہ آج ہر شاعر اپنے الفاظ میں وہ ترکیبیں اور وہ بندشیں لاتا ہے جو علامہ اقبال لایا کرتے تھے بلکہ مضامین بھی تقریباً وہی لائے جاتے ہیں اور کوشش یہ کی جاتی ہے کہ لوگ ان کے اور علامہ کے کلام میں تمیز نہ کرسکیں۔ اور خواہش یہ ہوتی ہے کہ علامہ کے کلام کی طرح ان کا کلام بھی بلند پایہ اور مقبول عام ہو جائیں۔ اسی طرح آج ہر واعظ اور خطیب کوشش کرتا ہے کہ وہ بخاری کی طرح قرآن پڑھے، بخاری کی طرح وجد آور الفاظ اور سحر آفرین ترکیبیں استعمال کرے۔ بخاری کیطرح ترنم کے ساتھ (اگر میسر ہو ورنہ بغیر ترنم ہی سہی اور اگر غلط فہمی غالب ہو تو بد آوازی کے ساتھ بھی) اساتذہ کے چیدہ چیدہ اشعار سنائے۔ بخاری کی طرح تاریخی واقعات سے استناد کرے، بخاری کی طرح شواہد کو واقعات پر چسپاں کرے۔ بخاری کی طرح قرآنی آیات و الفاظ کے نئے نئے نکات بیان کرے۔ بخاری کی طرح مجمع کو کبھی کبھی مزاح لطیف کے چھینٹوں سے جگائے۔ اور کبھی ترنم کی لوریوں سے سلائے۔ غرض آج ہر خطیب اور ہر واعظ پر بخاری کا اثر ہے اور وہ ابوالوقت، اور تو اور ان لوگوں پر بھی چھایا ہوا ہے جنہیں علمی فضیلت و کمال کی بناء پر وہ اپنے اساتذہ کے برابر درجہ دیتا ہے۔ ہم نے ایک دو نہیں ایسے کئی بزرگ دیکھے ہیں جن کا ترنم واجبی ہے، مگر بخاری بننے کے شوق میں سارے کا سارا وعظ مترنمانہ انداز میں فرما رہے ہیں۔ حالانکہ بخاری کا کمال صرف بخاری کے ترنم میں نہیں بلکہ ان کے انداز خطابت میں ہے۔ بغیر قرآن و حدیث پڑھے اور بغیر ایک شعر سنائے بھی بخاری سے کامیاب تقریر سنی جاسکتی ہے۔ مگر ابنائے وقت کو (خواہ عملی طور پر وہ آبائے علم ہی کیوں نہ ہو) یہ بات سمجھانا تو بے سود ہے کہ وہ بخاری کی تقلید نہ کریں۔ کیونکہ ابنائے وقت کا تو کام ہی تقلید ہے۔

بخاری نہ ہوتے تو زمانہ حال کے اسی فیصدی بہترین خطیبوں کو فن تقریر سے منفی کیا جاسکتا تھا۔ یہ وہ حضرات ہیں جن کی زبانوں پر الفاظ بخاری کے ہیں۔ اشعار بخاری کے انتخاب کردہ ہیں اور آیات و احادیث تک بخاری کی دی ہوئی ہیں۔ یہ وہ ہیں جنہیں لفظاً لفظاً بخاری کی تقریریں ازبر ہیں اور اپنے اپنے مقام پر وہ ایسی زناٹے کی تقریر کرسکتے ہیں کہ آپ اگر بخاری کو نہ جانتے ہوں یا ان کی تقریر نہ سنی ہو تو براہ راست ان کی خطابت پر ایمان لے آئیں۔ ان میں کچھ وہ ہیں جنہیں آپ نقل مطابق اصل کہنے سے بھی باک نہیں کریں گے۔ اور کچھ ایسے ہیں جنہیں بخاری کا پاکٹ ایڈیشن کہا جاسکتا ہے۔ ان کے علاوہ بہت سے ایسے بھی ہیں جن کی نقل راہم عقل ہاید تک بھی رسائی نہیں۔ شعر صحیح نہیں پڑھ سکتے۔ مگر بخاری بننے کے شوق میں غلط شعر ہی جھوم جھوم کر سنائے جارہے ہیں۔ یہ لوگ اپنی جگہ پر اور سب کچھ ہوسکتے تھے لیکن اگر بخاری نہ ہوتے تو یہ واعظ یا خطیب ہرگز نہ ہوسکتے۔ اور یہ نہ سمجھئے کہ یہ بخاری کے حافظ (بخاری کی تقریروں کے حافظ) سب بخاری کے ہمنوا یا ہم صفیر ہیں۔ ان میں اکثریت بخاری کے مخالفوں کی ہے۔ بخاری کے الفاظ، بخاری کے انداز اور بخاری کے منتخب اشعار، بخاری کے خلاف استعمال کرنا یہ لوگ اپنے لئے قابل فخر سمجھتے ہیں۔ اپنے حلقۂ اثر میں اپنے انداز فکر کے

مطابق وہ گویا بخاری کا جواب بننے کی کوشش کرتے ہیں۔ لیکن حق بات یہ ہے کہ بخاری نہ ہوتے تو ان کا وجود بھی موہوم ہوتا۔ آج جس طرح ہر بڑے شاعر کو داعیہ لاحق ہے کہ وہ کسی طرح علامہ اقبال سے بڑھا ہوا مانا جائے اور اس کام کے لئے ترکیبیں مضامین اور انداز بیان وہ اقبال ہی کا استعمال کرتا ہے اسی طرح ہر خطیب بخاری کو پڑھ کر (اس کی تقریریں سن کر اس کا انداز بیان چرا کر) بخاری سے بڑھنے کی کوشش میں مصروف ہے۔ نفسیات کا کوئی ماہر اگر ایسے شاعروں اور خطیبوں کے دل ٹٹولے تو یقیناً وہ کچھ ایسی دبی دبی خواہشات کو ان کے دلوں سے نکال لائے گا جن میں شاعر انقلاب، شاعر اسلام، خطیب اسلام اور خطیب الامت بننے کا شوق پنہاں ہو۔ اقبال اور بخاری کی بڑائی کی اس سے بڑی دلیل اور کیا ہو سکتی ہے؟

سخن گوئی مشکل ہو یا نہ ہو سخن فہمی انتہائی مشکل کام ہے۔ آج برعظیم پاک وہند کے کھنڈرات میں گھوم جایئے آپ کو ہر پرانی اینٹ کے نیچے سے ایک شاعر اور ایک مضمون نگار ضرور مل جائے گا، جو اپنے دعاوی کے لحاظ سے غالب کا جواب اور علامہ اقبال کی اصلاح دینے والوں میں سے ایک ہو گا۔ مگر ان میں ایک فیصدی تو کیا ایک فی ہزار بھی مشکل سے کوئی سخن فہم ہو گا۔ بقول سالک جو لوگ مسلسل دو سطریں اردو کی صحیح نہیں لکھ سکتے آج وہ سلطان القلم کہلاتے ہیں

تا بہ دیگراں چہ رسد؟

مگر اس قدر قحط الرّجال کے زمانے میں بھی آپ جب بخاری سے ملیں گے تو پہلی ہی ملاقات آپ کو یقین دلا دے گی کہ:

ابھی کچھ لوگ باقی ہیں جہاں میں

ان کی سخن فہمی اور سخن شناسی اس حد تک مسلّم ہے کہ مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا ظفر علی خان، عبدالمجید سالک اور پطرس بخاری وغیرہ بھی اس کا صرف اعتراف ہی نہیں کرتے بلکہ یہ لوگ آپ کی سخن فہمی اور بذلہ سنجی کے قدردانوں میں سے شمار ہوتے ہیں اور جب بھی موقع میسر ہوتا یا تو یہ لوگ بخاری کی محفل تک پہنچنے کی کوشش کرتے یا بخاری کو اپنے پاس لے جاتے اور پھر وہ محفل جمتی جس کی نظیر شاید سلف و خلف میں کہیں نہ مل سکے مگر:

یہ باتیں ہیں تب کی جب آتش جواں تھا

بخاری کی محفل اگرچہ اب بھی جمتی ہے اور وہ تو سدا بہار پھول ہے کہ کوئی دیکھے یا نہ دیکھے کھلا ہی رہتا ہے مگر اس کی محفل کی خوشہ چینی کرنے والے اب یا تو میرے جیسے کم سواد طالب علم رہ گئے ہیں یا عوام کالانعام کا وہ گروہ ہے جو اپنی عقیدت کے اظہار کے لئے ہر وقت شاہ جی کے گرد جمع رہتا ہے۔ گردو گرما گدا و گورستان کی سرزمین میں لاہور، امرتسر اور دہلی کی شادابیاں کہاں سے پیدا ہو جائیں:

آں قدح بشکست و آں ساقی نماند

اور آج بخاری کی شکل میں:

داغِ فراقِ صحبتِ شب کی جلی ہوئی
اک شمع رہ گئی ہے سو وہ بھی خموش ہے

ہم جملہ عقیدت مندوں کی طرح مدت العمر شاہ جی کو ایک بے مثال خطیب اور بے نظیر سخن فہم بزرگ سمجھتے رہے مگر ایک دن بیٹھے بٹھائے دفعتہً ہمیں معلوم ہوا کہ شاہ جی شاعر بھی ہیں۔ اور ندیم تخلص فرماتے ہیں۔ سچ جانئے کہ آسمان پھٹ پڑتا اور ہم اپنی آنکھوں سے فرشتوں کو زمین پر گرتا ہوا دیکھ لیتے تو ہم کو اتنا تعجب نہ ہوتا جتنا یہ سن کر تعجب ہوا کہ شاہ جی بھی شاعری فرماتے ہیں۔ یہ تعجب اس بناء پر نہیں تھا کہ شعر و سخن کوئی عالم بالا کی چیز تھی اور وہاں تک شاہ صاحب کی رسائی نہیں تھی۔ بلکہ یہ استعجاب:

ناوک نے تیرے صید نہ چھوڑا زمانے میں

کی اقسام میں سے تھا۔ یہ تو ہم پہلے بتا چکے ہیں کہ سخن گوئی سے سخن فہمی زیادہ مشکل ہے اور شاہ جی جب سخن فہموں کے بھی سردار ہیں تو سخن نجی ان کے مرتبہ سے فروتر بات ہے۔ مگر اس فروتر بات میں بھی اس قدر پختگی، بلندی اور چستی ہوگی اس کا ہمیں گمان تک بھی نہیں تھا۔ یہ ٹھیک ہے کہ انہوں نے شعر گوئی کی طرف عمداً اور ارادۃً توجہ نہیں فرمائی اور جس طرح ہمیں دفعتہً معلوم ہوا کہ وہ شاعر ہیں۔ خود انہیں بھی اچانک واردات کے ذریعہ سے معلوم ہوا کہ سخن فہمی کے ساتھ ساتھ سخن گوئی کے جراثیم بھی ان کے اندر پائے جاتے ہیں۔ مگر شکر کیجئے کہ بحیثیت فن انہوں نے اس کو اختیار نہیں فرمایا۔ ورنہ بڑے بڑوں کے نام ان کی سخن وری کے سامنے "چھوٹو رام" ہو کے رہ جاتے ان کی زندگی بازی گاہِ سیاست میں جس نہج پر گزری اس کے متعلق کبھی میں نے کہا تھا:

صبحدم ریل میں گزرتی ہے
شب کسی جیل میں گزرتی ہے
عاقبت کی خبر خدا جانے
اب تو اس کھیل میں گزرتی ہے

اور اسے تفنن نہ خیال فرمایئے بلکہ یہ واقعہ ہے کہ انہوں نے اپنی خداداد نعمت (خطابت) کے لشکر میں کراچی سے کلکتہ اور گلگت سے بمبئی تک سارے برِ عظیم پاک و ہند میں گاؤں گاؤں، شہر شہر، اور کونے کونے کا سفر کر ڈالا، اور ہر جگہ لوگوں کو آزادی و وطن خواہی اور مغربیت سے ایمان و اسلام کو بچا لینے کا درس دیا۔ یہ کام اس قدر وسیع تھا کہ انہیں اس کے سوا کسی دوسری طرف توجہ فرمائی کا موقع ہی نہ مل سکا۔

پھر تعجب بالائے تعجب اس وقت ہوا جب یہ معلوم ہوا کہ شاہ جی کے فاضل فرزند حضرت ابوذر بخاری نے موتیوں کے ان بکھرے ہوئے دانوں کو بڑے سلیقہ سے ایک سلک میں پرو کر بازار کساد و فساد میں پیش کرنے کا ارادہ فرما لیا ہے۔ اور پھر اس مشک نافہ کے لئے عطار کے فرائض مجھ ہیچمدان و ہیچ میرز کو ادا کرنے ہونگے۔ اب:

کوئی بتلاؤ کہ ہم بتلائیں کیا؟

پہلے تو یہ خیال آیا کہ تعارف میں صرف سعدی کے الفاظ لکھ دوں "مشک آنست کہ خود ببوید نہ کہ عطار بگوید" مگر پھر خیال ہوا کہ عطاروں کے بازار میں تو یہ بات کہتے ہوئے کوئی حرج نہیں اور جس بازار میں حضرت ابوذر اپنا یہ گنجینۂ زر پیش کرنے والے ہیں وہاں:

شناسا نہیں کوئی بھی اس ہنر کا

پھر اس کے ساتھ خطرہ یہ بھی ہے کہ کچھ کہنے کے ساتھ کہنے والے کا بھرم بھی کھلتا ہے۔ شاہ جی فرمائیں گے:

شعر مرا بمدرسہ کہ برد؟

اور اہل نظر کہیں گے:

سخن فہمیٔ عالم بالا معلوم شد!

بہت سوچا اصطلاحات کا سہارا لینے کو جی چاہا اور معاً غالب کا شعر دماغ میں گھومنے لگا:۔

ہر چند ہو مشاہدۂ حق کی گفتگو
بنتی نہیں ہے بادہ، ساغر کہے بغیر

دل کو ایک گونہ تسلی ہوئی اور شاہ جی کے کلام کو دیکھنے بیٹھ گیا کہ اب بادہ و ساغر کی اوٹ میں بہت کچھ لکھ لوں گا۔ ورق الٹا، نظر ڈالی تو سب سے پہلے شاہ جی کے اس شعر پر جا پڑی

گر ہو دواءِ عشق کی تلخی نصیبِ عقل
بنتی ہے پھر تو بادہ و ساغر کہے بغیر

پڑھتے ہی سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔ اصطلاحات کا سہارا ہباء منثوراً ہو گیا اور ضمیر نے کہا اب لکھو اور میں اس سوچ میں پڑھ گیا کہ غالب کے بعد غالب کی زمینوں میں پہلے تو بہت کم لکھا گیا اور تھوڑا بہت جو لکھا گیا وہ عموماً کامیاب نہیں رہا۔ ''جواب آں غزل'' کا دور غالب کے ساتھ ہی ختم ہو گیا

ایں جواب آں غزل غالب کہ صائب گفتہ است

لیکن اگر شاہ جی اس شعر کے جواب کی بجائے جواب آں غزل لکھ ڈالتے تو کیا کامیاب نہ ہوتے؟

دوسرے صفحے پر نگاہ پڑی تو فارسی کی ایک نعت سامنے آگئی جس کا مطلع ہے:

ہزار صبح بہار از نگاہ می چکدش
جنوں زبیچش زلف سیاہ می چکدش

مطلع پڑھتے ہی ایک بہت پرانا واقعہ ذہن پر چھا گیا۔ اور دل نے گواہی دی کہ یقیناً یہ نعت اس واقعہ کے بعد ہی ہوئی ہو گی۔

واقعہ یہ ہے کہ ایک بار میں نے شاہ جی کی ایک تقریر سنی یوں تو ہر تقریر خطابت کا شاہکار ہوتی ہے مگر اس تقریر کا رنگ ہی کچھ اور تھا۔ تقریر تقریباً ساری رات جاری رہی مگر ہزاروں کے مجمع میں سے ایک متنفس بھی ایسا نہ تھا جسے کوئی داعیہ تقریر میں سے اٹھا کے لے گیا ہو۔ شاہ جی کا چہرہ جلال و جمال کا مرقع بنا ہوا بجلی کی

روشنی میں آفتاب کی طرح چمک رہا تھا مجھے اس موقع پر پرانے کسی استاد کی رباعی یاد آگئی:

از سخن شہد ناب می چکدش
وز تبسم گلاب می چکدش
می تواں گفت کر کز حرارت مے

از جبیں آفتاب می چکدش

میں نے ایک لفظ کی تبدیلی سے اسے شاہ جی پر چسپاں کر دیا:

از سخن شہد ناب می چکدش
وز تبسم گلاب می چکدش
می تواں گفت کز حرارتِ وعظ
از جبیں آفتاب می چکدش

اور پاس بیٹھے ہوئے ایک دوست کو سنا دی۔ وہ تڑپ اٹھا اور بار بار رباعی کے مصرعے دہراتا اور شاہ جی کو دیکھتا۔ بعد میں یہ یاد نہیں کہ میں نے یہ رباعی خود یا اس دوست نے شاہ جی کو سنائی۔ اگرچہ آپ نے ہماری اصلاح تو قبول نہ فرمائی۔ مگر رباعی کو بہت پسند فرمایا۔ لکھ لی، اپنی عادت کے مطابق جھوم جھوم کر کئی بار سنائی۔ ہمارے لئے سب سے بڑی خوشی اس بات کی تھی کہ لو جی! ایک چیز تو ہم بھی ایسی نکال لائے جو اب تک شاہ جی کے ذخیرۂ انتخاب میں نہیں تھی۔ ورنہ عموماً یہ ہوا کہ ان کی محفل میں کوئی شعر پیش کرو تو اس کے ساتھ کے دو تین شعر اور سنا ڈالتے ہیں اور دل نے ابتہاجاً یہ کہا کہ اس رباعی کے ساتھ ساتھ اب تمہارا نام بھی شاہ جی کے دل میں محفوظ ہو گیا اتنے سے تقرب پر بھی اس قدر نشہ چھا گیا کہ بس کچھ نہ پوچھئے:

بلبل ہمیں کہ قافیۂ گل شود بس است

مگر یہ بات ہمارے وہم و گمان میں بھی نہیں تھی کہ اس رباعی کا کچھ جواب بھی ہو سکتا ہے اور وہ بھی اتنا عمدہ اور بلند پایہ۔ کسی بڑے سے بڑے سخن فہم کے سامنے یہ نعت پڑھ جایئے اور پوچھئے کہ یہ کس کا کلام ہو سکتا ہے تو جواب یہی ملے گا کہ کسی پرانے استاد کا کلام ہے۔ سبحان اللہ دیکھئے تو سہی!

چمن چمن گل و نسریں زعکسِ رخ ریزد
سبد سبد گل خنداں زراہ می چکدش

خندۂ نمکیں اور چشم سیاہ کی فتنہ انگیزیاں ملاحظہ ہوں۔ الحفیظ اولاماں!

چہ شور ہاست بجانم زخندۂ نمکیں
چہ فتنہ ہا کہ زچشم سیاہ می چکدش

صفات حق کی جلوہ نمائی کا بیان آپ نے بہت پڑھا ہو گا مگر ذات و صفات کے شاہد اور گواہ آپ نے بہت کم دیکھے ہوں گے۔

چہ گفتگو چہ تبسم شہادتے بحدوث
زنور چہرۂ قدم را گواہ می چکدش

اس نعت کے ساتھ ساتھ یہ نعت بھی ملاحظہ فرمایئے اور ہو سکے تو سخن فہموں کے ہاں اسے جامی علیہ الرحمتہ کی طرف منسوب کر کے سنا دیجئے ان شاء اللہ ان میں سے کوئی ایک بھی آپ سے یہ نہیں کہے گا کہ یہ نعت جامی کی نہیں ہو سکتی!

لولاک ذرۂ زجہان محمد است
سبحان من یراہ چہ شانِ محمد است
سیپارۂ کلامِ الہیٰ خدا گواہ
آں ہم عبارتے ز زبان محمد است
نازد بنام پاک محمد کلام پاک
نازم باں کلام کہ جانِ محمد است
توحید را کہ نقطۂ پر کار دینِ ماست
دانی؟ کہ نکتۂ زبیانِ محمد است

وہی جامی کا سوز و گداز، وہی بیان کی پختگی و شستگی، وہی انداز و طرز بیان کون سی چیز ایسی ہے جو جامی کے ہاں ہو اور یہاں نہ ہو؟ وحدت الوجود کا بیان شاہ جی کی زبانی سنئے:

وحدت بوجدو حالتِ کثرت در آمدہ
حرکت بجلوہ، جلوہ بحرکت در آمدہ
موسیٰ و طور و وادیٔ ایمن، حراء، حرم
ہر جا کہ دیدہ ایست، بحیرت در آمدہ

یہ وہ جاہلانہ وحدت الوجود نہیں جہاں عیسائیوں کی طرح "تین میں ایک اور ایک میں تین" کی بجائے "دو میں ایک اور ایک میں دو" یا "ایک میں سب اور سب میں ایک" کہا جاتا ہے۔ بلکہ یہ وہ عالمانہ وحدت الوجود ہے، نہ جس کے سمجھنے میں دقت پیش آئے نہ جسے ماننے میں کوئی امر مانع ہو۔ وحدت کو وجد آیا تو اس نے اپنی صفات کے مظاہر کو پھیلا دیا۔ ذات نے صفات کی جلوہ نمائی کی، اور جلوۂ ذات متحرک ہوا۔ دیدۂ بینا جہاں جہاں تھی وہ حیران رہ گئی۔ اردو میں وحدت الوجود کا مسئلہ آپ نے صرف ایک شعر میں بیان فرمایا ہے۔ زبان و بیان دیکھئے کس قدر صاف اور تعبیر کتنی دلکش ہے!

ذروں سے تابہ مہر ستاروں سے تا چمن
عکسِ جمال یار کی تابندگی ہے دوست!

شاہ جی کی چار پسندیدہ چیزیں ملاحظہ ہوں:

بخت اگر رسا شود، دست دہد سبوئے خویش
از نگہ سمن برے لالہ رخے نکوئے خویش
باغ و بہار ماندیم یعنے کہ جنت النعیم
روئے خوش است و خوئے خوش، بوئے خوش و گلوئے خوش

غنیمت کنجاہی نے اپنی مثنوی میں پنجاب کی تصویر کشی کی ہے۔ اور شاہ جی نے اس تصویر کا دوسرا رخ اسی زمین میں پیش کیا۔ دونوں ساتھ ساتھ ملاحظہ ہوں:

غنیمت

ندیدم کشورے غارت گر تاب
بہ خوبی ہائے حسن آباد پنجاب
چہ پنجاب انتخاب ہفت کشور
قسم خودہ بخاکش آبِ کوثر
فضائے نشۂ ہستی ہوایش
زمینے کا سمانہا خاک پایش
بنائے کعبۂ دلہا زخاکش
عروج نشۂ معنی زتاکش
غبارش آب و رنگِ چہرۂ گل
گیا ہش دلربائے زلف سنبل
بہر جا سبزہ از خاکش دمیدہ
رخ خوباں بہ پشتش خط کشیدہ
زلالش بادۂ ساز مستیٔ عشق
نسیمس روح بخش ہستیٔ عشق
گلش برخاک ہر جا سایہ انداخت
زمیں از آتش یاقوت بگداخت
بہ خاکش سایۂ پر ہائے بلبل
جو اب یک چمن خندیدن گل
شفق سرمایۂ چشم از دیدنِ گل
چمن ساماں نگہ از چیدن گل

زا شوق آں کہ تا آمد بہ پنجاب
دلِ کشمیر صدرہ می شود آب
خنک آنکس کہ در ہنگام سرما
دریں گلشن بود گرم تماشا

شاہ صاحب

ندیدم کشورے مردود و مرتاب
بشو میہائے کفر آباد پنجاب!
چہ ملکے ننگ و عار ہفت کشور
زشرق و غرب بادش خاک برسر
خمیر طینتش مردم کشیہا
زقتل مسلمش باشد خوشیہا
چہ پیرانش مریدان فرنگی
لقب کافور و ذات پاک زنگی
زنواب و رئیسانش چہ پرسی
سگ و سگ زادگان کرسی بہ کرسی
چناں فرزند نا ہموار زاید،
کہ از خر قیمتش برتر نیاید!
چکد از لالہ اش خونِ مسلماں
ازو نالاں حجاز و مصر و ایراں
جو انانش غلامان فرنگی
پناہ شان بد امان فرنگی
چہ پنجاب آں فرنگی را معسکر
معسکر را غلام احمد پیمبر
ضلالت را پیمبر ہست پنجاب
فرنگی را معسکر ہست پنجاب
فضائش کفر ریز د کفر بیز است
بائین الہیٰ در ستیز است

زمین فتنہ زائے فتنہ خیزے
کہ شیطاں پیش پالش سجدہ ریزے

دونوں رخ کس قدر صحیح اور درست ہیں۔ غنیمت نے جغرافیائی اور عمرانی رخ کا جائزہ لیا ہے اور شاہ جی نے پنجاب کے اس زمانے کا سیاسی رخ دکھایا ہے جب انگریز یہاں قابض و حاکم تھا۔ دونوں نظمیں عنقریب تاریخ کا باب بننے والی ہیں اور مستقبل کا مؤرخ بتلائے گا کہ دونوں اپنی اپنی جگہ پر کس قدر صحیح منظر کشی کرتی ہیں۔

چند نظمیں اردو میں اکبر کے رنگ کی بھی موجود ہیں جن میں مزاح اور تفنن ہے اور انہیں پڑھ کر یہ اندازہ ہوتا ہے کہ اگر شاہ جی خارزار سیاست سے دامن نہ الجھا لیتے تو موجودہ وقت میں اکبر کے صحیح جانشین ہوتے اور جب اتنا اور اس میں اضافہ ہو جائے کہ ان کی اکثر نظمیں فی البدیہہ کہی ہوئی ہیں تو اور بھی ان کی قدر بڑھ جاتی ہے۔ یہ یاد رہے کہ غالب کی طرح شاہ جی بھی یہ کہنے میں حق بجانب ہیں

کچھ شاعری ذریعۂ عزت نہیں مجھے

نہ یہ اشعار اس بناء پر انہوں نے لکھے ہیں کہ واقعی وہ شعر لکھ رہے ہیں اور نہ فن کو انہوں نے کبھی اپنا اوڑھنا بچھونا بنایا۔ ان کی حیثیت محض تبرکات اور تاریخ کے گم ہو جانے والے اوراق کے لئے صرف "یادداشت" کی ہے اور بس!

خداداد خطابت میں جو کام شاہ جی عمر بھر کرتے رہے اس کا خلاصہ دو باتوں میں پیش کیا جا سکتا ہے۔

۱۔ حضور خواجۂ دوسرا صلی اللہ علیہ وسلم کی مدح و ثناء۔
۲۔ اور حضور کے دشمنوں سے دائمی نہ ختم ہونے والا جھگڑا۔

شاہ جی کی شاعری کا سرمایہ بھی یہی دو باتیں ہیں اور یہ آفتاب کو چراغ دکھانے کا سلسلہ میں آپ کے چند نعتیہ نشتروں کو پیش کر کے ختم کرنا چاہتا ہوں۔ تاکہ آپ براہ راست نور آفتاب سے مستنیر ہو سکیں۔ چراغ تلے تو آپ کو معلوم ہے ہمیشہ اندھیرا ہی ہوتا ہے اور دیر تک اندھیرے میں بھٹکنا بھی کچھ بھلے لوگوں کا کام نہیں۔

نعت کا مطلع ملاحظہ فرمائیں

جلوہ ایست کہ آسودہ در بر خاک است
کہ ذرہ ذرہ طرب ریز د بس طربناک است

دوسرے مطلع کی بلندی دیکھئے!

بیا کہ باتو سخنہاز حرف لولاک است
بیا کہ باتو حکایت ز قدر افلاک است

نعت گو شاعروں کے ہاں حدیث لولاک لما خلقت الافلاک کا بیان عام ہے۔ اور ہر شخص حضور کی مدح و ثناء میں اس کا ذکر کرتا ہے۔ مگر کسی نے آج تک اس کی یوں تجزی نہیں کی کہ اللہ تعالیٰ نے ماخلقت الارض

نہیں فرمایا۔ بلکہ ماخلقت الافلاک فرمایا ہے اور اس میں کیا نکتہ ہے؟ اگر یہ تجزی پہلے معہود ہوتی تو یہ مطلع تھا مگر چونکہ یہ کام پہلے پہل آپ نے کیا ہے اس لئے دوسرے مطلع سے پہلے ایک شعر میں اس طرح متوجہ فرماتے ہیں کہ:۔

نگفت خالق مطلع کہ ماخلقت الارض
مقامِ فکر و تامل حدیث لولاک است

اس شعر کے بعد ذرا پھر شاہ جی کا مطلع ثانی پڑھ کر دیکھئے تاکہ آپ "قدر افلاک" کی قدر پہچان سکیں۔ بیشک افلاک کی قدر بہت بڑھی ہے۔ مگر اب زمین کی قدر کی افزائش بھی قابل غور ہے۔

مقام و منزل قرآن و انبیاء گردید!
بہ مشتِ خاک بنازم چہ رتبۂ خاک است

سبحان اللہ:

زمیں کو اس ترقی پر فلک سے داد ملتی ہے
فلک کیا عرش باری سے مبارکباد ملتی ہے!

عطاء اللہ خان عطا گنڈا پور
ایڈوکیٹ مرحوم

بروصال امیر شریعت

سید عطاء اللہ شاہ بخاری

رفت از جہاں بخاری یکتائی این زمن آں تابع کتاب و آں پیروِ سُنن
آں صاحب فراست آں صاحب فطن سرچشمۂ شرافت، افعالِ او حسن
آں نمازی و مجاہد در راہ ذو المنن آں سرفروش ملت آں زبدۂ وطن
بیاں کن فرنگی ہم مرزا شکن از ہیبِ او لرزہ در قلب برہمن
دیگر چو اِو نزاید از خاک ایں وطن سحر البیان لبانش گوہر فشاں دہن
دائم گزیدہ عزلت از دار پُر محن شد گورخانۂ او پیراہنش کفن
گل شد چراغ خانہ شمع انجمنؔ یا باغبانِ جدا شد از سبزۂ چمن
چوں کہ در روح پاکش پرواز بدن دادہ سروشِ غیبی ایں مژدہ بمن
"اللہ کردہ جائش در جنت عدن"

۱۳۸۱ ھ

پروفیسر ڈاکٹر محمد امین (ملتان)

سید عطاء اللہ شاہ بخاری کی شاعری

خطابت ایک قدیم، مفید قابل قدر اور عظیم فن ہے۔ اہل یونان اور اہل روم نے اس فن پر بڑی توجہ دی اور بڑے بڑے خطیب پیدا کئے۔ ان کے یہاں خطابت کو بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔ اسی طرح اہل عرب کو بھی اپنی خطابت پر ناز تھا۔ اہل عرب نے بھی اس فن میں بڑے کمالات دکھائے ہیں اور اس فن کی مبادیات پر بھی لکھا ہے وہ اس فن کو بڑی اہمیت دیتے تھے۔

ابتدا ہی سے یہ فن دینی علماء اور سیاسی رہنماؤں کے ساتھ مخصوص رہا ہے انہوں نے ہی اس فن کی ترویج و فروغ میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ قدیم زمانے میں عوام کے ساتھ رابطے کا موثر ذریعہ یہی تھا بلکہ اب بھی یہ ذریعہ موثر ہے، اردو فن خطابت کی تاریخ بہت مختصر ہے بلکہ ہمارے یہاں تو یہ فن رُو بہ زوال ہے دینی حلقوں میں بھی کوئی خطیب نظر نہیں آتا۔ اور سیاسی میدان میں بھی زعماء اس فن سے نابلد ہیں۔ اردو فنِ خطابت کی تاریخ میں چند ناموں میں ایک روشن نام سید شرف الدین احمد عطاء اللہ شاہ بخاری کا ہے وہ اردو کے بے مثال خطیب تھے۔ قدرت نے انہیں خطابت کی بے پناہ صلاحیت عطا کی تھی۔ ان کے معاصر اور ایک بہت بڑے خطیب محمد علی جوہر نے ان کے بارے میں لکھا ہے:

"یہ شخص جادو گر ہے۔ اسے تقریر کی اجازت نہیں دینی چاہیئے اس کا وجود بڑا خطرناک ہے۔ کیونکہ لوگ اس کی تقریر سے مسحور و مبہوت ہوجاتے ہیں۔ اگر یہ چاہے تو انہیں اچھائی کے بجائے کسی غلط کام پر بھی آسانی سے آمادہ کرسکتا ہے۔ میرا بس چلے تو میں اسے کبھی تقریر نہ کرنے دوں"

ان کے معاصر خطیبوں نے ان کی بے مثال خطابت کو سراہا ہے خطابت اور شاعری کا چولی دامن کا ساتھ ہے یہ دونوں فن ایک دوسرے سے مربوط ہیں۔ خطیب نثر میں شاعری کرتا ہے وہی نثر جب موزوں ہو جائے تو شاعری بن جاتی ہے۔ خطیب اپنی تقریر کو دلکش اور موثر بنانے کے لئے شاعرانہ ہنر سے کام لیتا ہے۔ اسلئے ایک اچھے خطیب کے اندر ایک اچھا شاعر پوشیدہ ہوتا ہے۔ مسلمانوں میں شعر فہمی اور شعر گوئی بھی علماء کی روایت رہی ہے عمر خیام جب رصد گاہ کے کام سے تھک جاتا تو رباعی کہ لیتا، ابن سینا بھی کبھی کبھی شعر کہتے تھے۔ عطاء اللہ شاہ بخاری خطیب بے مثل تھے۔ اسی ناطے سے ان میں ایک شاعرِ بے مثل پوشیدہ تھا۔ مگر انہوں نے شاعری کے فن کو اختیار نہیں کیا۔ اور نہ ہی اس پر توجہ دی، وہ اعلیٰ شعری ذوق کے مالک تھے۔ بچپن کی شعری مجالس نے اس ذوق کی تربیت کی مگر آپ نے باقاعدہ طور پر شاعری نہیں کی۔ بلکہ کہیں کہیں کسی خاص تحریک و ترغیب کے زیر اثر اشعار کہے اور ندیم تخلص اختیار کیا۔

ان کے اشعار کا ایک مجموعہ "سواطع الالہام" کے نام سے چھپ چکا ہے۔ سواطع الالہام فیضی کی تفسیر غیر منقوط کا نام ہے۔ چونکہ شاعری کو بھی الہامی سمجھا جاتا ہے۔ اور ساطعہ بجلی کی چمک کو کہتے ہیں۔ اس

رعایت سے یہ نام بہت موزوں ہے۔ جب کسی الہام کی بجلی چمکی اس کے نتیجے میں جو شعر ہوا وہ ساطعہ ہے۔ یوں اس مجموعہ میں بہت سے ساطعات جمع ہو گئے ہیں۔

اس مجموعے میں دو زبانوں میں اشعار موجود ہیں۔ یعنی فارسی اور اردو اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ شاہ جی کو ان زبانوں پر قدرت حاصل تھی۔ اس مجموعے کے فارسی اشعار میں فکری گہرائی بہت زیادہ ہے اظہار بھی موثر ہے اور اسلوب بھی سلیس ہے، ایک نعت کے چند اشعار دیکھئے

لولاک ذرہ زجہانِ محمد است
سبحان من یراہ چہ شان محمد است
سیپارۂ کلام الہی خدا گواہ
آں ہم عبارتے ز زبان محمد است
نازد بنام پاک محمد کلام پاک
نازم باں کلام کہ جان محمد است
توحید راکہ نقطۂ پرکارِ دین ماست
دانی کہ نقطۂ زبیان محمد است

چند اور اشعار ملاحظہ کیجئے:

بیا کہ با تو سخن ہا زحرفِ لولاک است
بیا کہ باتو حکایت زقدر افلاک است
یتیم مکہ محمد کہ آبروئے خدا است
کسیکہ خاک رہش نیست برسرش خاک است
ہزار لشکر طاغوتیاں زند برہم
قیامتے کہ بیا از نگاہِ بیباک است
گرہ بطرہ مازاغ و ماطغٰے بستند
ولے زسرتاجِ ماعرفناک است

عطاء اللہ شاہ بخاری کے نعتیہ اشعار سے ان کے حضور ﷺ سے محبت اور عقیدت کا بھرپور اظہار ہوتا ہے۔ اس کے ساتھ فکری گہرائی اور فنی محاسن اپنی جگہ پر ہیں۔ شاہ صاحب کی فارسی شاعری بہت خوبصورت ہے۔ جس سے ان کی قدرت بیان ظاہر ہوتی ہے۔ وحدت الوجود فارسی اور اردو کی صوفیانہ شاعری کا مقبول ترین مضمون ہے۔ شاہ صاحب نے بھی اس مضمون کو بڑی خوبصورتی سے باندھا ہے۔

وحدت بوجد و حالت کثرت در آمدہ
حرکت بجلوہ، جلوہ بحرکت در آمدہ

موسیٰ و طور و وادی ایمن حِرا حرم
ہر جا کہ دیدہ ایست بصیرت در آمدہ
چمن چمن گُل و نسرین زعکسِ رخ ریزد
سبد سبد گُل خنداں زراہ می چکدش
اب اردو میں اس مضمون کو دیکھئے
ذروں سے تا بہ مہر ستاروں سے تا چمن
عکسِ جمال یار کی تابندگی ہے دوست

تصوف کے حوالے سے فقر کا مضمون بھی شاعری کا موضوع بنا ہے، شاہ صاحب نے بھی اسی پر اشعار کہے ہیں، ملاحظہ کیجئے:

یک نانِ جویں زخوانِ شاہی خوشتر
از چنگ و رباب آہِ صبوگاہی خوشتر
یک لحظہ بزیرِ سایۂ قدِ یار
واللہ زہزار چتر شاہی خوشتر

ان کی فارسی شاعری فارسی کے روایتی تغزل سے معمور ہے۔

ہاں لالہ زغم خوں شد و از ہجر سمن زرد است
ایں دیدہ احمر ہم وایں چہرہ اصغر ہم
دردِ جگر دارد و بیمار غمت زیان
خواہد نہ مداوائے جوید نہ گھے مرہم

پارسایاں ہمہ ناز ند بہ زہد و طاعت
یک ندیم است کہ برد امن ترمی نازد

شاہ صاحب کی اردو نظمیں ہنگامی موضوعات پر ہیں۔ ہنگامی موضوعات پر ہونے کی وجہ سے یہ نظمیں ہلکی پھلکی ہیں اور بعض میں طنز و مزاح پایا جاتا ہے۔ ان نظموں میں روانی کمال کی ہے ایک نظم کا ایک بند ملاحظہ کیجئے

دن کو پوجو، رات کو پوجو
رنگ برنگی دھات کو پوجو
مٹی پتھر پات کو پوجو
ایک نہ پوجو سات کو پوجو
تم کیا جانو اے نادانو!
تم کیا سمجھو تم کیا جانو!

ان نظموں کے علاوہ شاہ صاحب کی فردیات قابل توجہ ہیں

چمن کو اس لئے مالی نے خوں سے سینچا تھا
کہ اس کی اپنی نگاہیں بہار کو ترسیں

یہ شعر وطن کے حالات کی خوب عکاسی کرتا ہے۔ شاہ صاحب نے یہ شعر ساحر لدھیانوی کو عطاء کیا تھا۔ اور اب یہ شعر ساحر لدھیانوی کی کتاب "تلخیاں" کی زینت ہے۔

چند اور فرد ملاحظہ کیجئے

وہ آنکھوں میں موجود اور چشمِ حیراں
ادھر ڈھونڈتی ہے اُدھر ڈھونڈتی ہے

گر ہو دوائے عشق کی تلخی نصیبِ عقل
بنتی ہے پھر تو بادہ و ساغر کہے بغیر

سب سے پہلے حسن کی رعنائیاں ناپی گئیں
پھر ہمارے عشق کی پہنائیاں ناپی گئیں

ان اشعار سے شاہ صاحب کی شعر گوئی کا سلیقہ ظاہر ہوتا ہے، اور یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ انہیں زبان و بیان پر کتنی قدرت حاصل تھی، اور وہ اردو کی کلاسیکی شعری روایت سے واقف بھی تھے۔ اگر شاہصاحب اس فن پر بھی کچھ توجہ صرف کرتے تو اردو کو ایک اور اچھا شاعر مل جاتا۔ مگر انہوں نے اس فن پر کیوں توجہ نہیں دی اس کی کئی وجوہات ہوسکتی ہیں، ان میں سے بعض پر قیاس آرائی ممکن ہے۔ بہرحال یہ مختصر سا مجموعہ ان کی شعر فہمی اور شعر گوئی کے اعلیٰ ذوق کی دلیل ہے۔

تاریخہائے وفات

۱۳۸۱ھ

(۱) کفن امیر شریعت۔ (۲) والاگہر شہ بخاری۔ (۳) کوہ پیکر شہ بخاری۔ (۴) آسماں مکاں شہ بخاری (۵) حسان العجم شہ بخاری۔ (۶) جزو وصال عطاء اللہ شاہ۔ (۷) زبدہ زماں عطاء اللہ شاہ بخاری۔ (۸) لحد سید عطاء اللہ شاہ بخاری۔ (۹) امیر شریعت عطاء اللہ شاہ۔ (۱۰) مزار پر انوار والاجاہ سید عطاء اللہ شاہ۔ (۱۱) مزار پر انوار بدیہ گو سید عطاء اللہ شاہ۔ (۱۲) راہ شناس آتش بیان۔ (۱۳) مرقد منورہ دیدہ مومناں سید عطاء اللہ شاہ۔ (۱۴) مرقد منورہ سیف زباں سید عطاء اللہ شاہ (۱۵) محمود جہاں خطیب جادو بیاں سید عطاء اللہ شاہ۔ (۱۶) ممدوح جہاں خطیب جادو بیاں سید عطاء اللہ شاہ۔ (۱۷) دانائے کامل خطیب جادو بیان سید عطاء اللہ شاہ۔ (۱۸) آہن گداز خطیب قوم سید عطاء اللہ شاہ (۱۹) نجم دین خطیب جادو بیان سید عطاء اللہ شاہ۔

اختر واصفی

پروفیسر ڈاکٹر عبد الغنی فاروق

فقرِ غیور کا پیکر، جاں فروش مجاہد

یہ ۱۹۲۱ء کی بات ہے۔ لدھیانہ کے کھلے میدان میں ہزاروں کا مجمع بت بنا بیٹھا ہے۔ اور ایک درویش منش انسان اسٹیج پر بیٹھا مائک اور لاؤڈ اسپیکر سے بے نیاز بلند پاٹ دار آواز میں تقریر کر رہا ہے۔ روشن فراخ چہرہ، موٹی چمکدار آنکھیں، سیاہ گھنی داڑھی اور کندھوں کو چھوتے ہوئے گیسو، دیسی کھدر میں ملبوس وجیہہ و شکیل اور بارعب شخص ہاتھ میں موٹا سا ڈنڈا تھامے، زبان و فکر کا خزانہ لٹا رہا ہے۔ انداز اتنا دلکش اور مسحور کن ہے کہ یوں لگتا ہے ساری فضا پر جادو کر دیا گیا ہے۔ لوگ کبھی روتے ہیں کبھی ہنستے اور کبھی وجد کرتے ہیں۔ اسٹیج سے ذرا ہٹ کر مقامی تھانے کا انچارج بیٹھا ہے۔ وہ جلسے کی رپورٹ لکھنے اور اگر ضرورت پڑے تو مقرر کو گرفتار کرنے آیا ہے مگر آنکھیں حیران ہیں کہ وہ بھی دیگر سامعین کی طرح مبہوت بیٹھا سر دھن رہا ہے۔ اور جونہی تقریر ختم ہوتی ہے پیٹی اتار کر اپنے ساتھیوں کے حوالے کرتا ہے۔ استعفیٰ لکھ کر نوکری پر لات مارتا اور مقرر کے قدموں میں جا بیٹھتا ہے اور پھر ساری عمر یہیں گزار دیتا ہے۔ تھانیدار کا نام چودھری افضل حق ہے۔

یہ ۱۹۳۰ء کا اواخر ہے یہی درویش صفت ڈم ڈم جیل (بنگال) میں مقید ہے ایک اعلیٰ انگریز حاکم معائنے کے لئے آتا ہے اور اس سے مخاطب ہوتا ہے۔

"کہیئے کیا حال ہے آپ کا؟"

"اللہ کا شکر ہے" بے نیازانہ جواب ملتا ہے۔

"کوئی سوال؟" بااختیار حاکم دوبارہ پوچھتا ہے۔

"میں صرف اللہ سے سوال کیا کرتا ہوں۔"

"نہیں میرا مطلب ہے کہ کوئی خدمت ہو تو بتائیں"

درویش سر اٹھاتا ہے اور پوری متانت اور سنجیدگی سے جواب دیتا ہے۔

"ہاں آپ میرا ملک چھوڑ کر تشریف لے جائیے"۔

حاکم خاموش ہو کر آگے بڑھ جاتا ہے۔

یہی عجیب و غریب شخص ایک مرتبہ بہاولپور پہنچتا ہے۔ نواب صاحب کو معلوم ہوا تو اپنے پرائیویٹ سیکرٹری کو ڈیرہ نواب صاحب سے اس کے پاس بھیجا اور ملاقات کی خواہش ظاہر کی۔ جواب ملا۔ "فقیر بادشاہوں کے دربار میں نہیں جایا کرتے" پھر ہنس کر کہا "اب تو میں یوں بھی اس ریاست میں مہمان کی حیثیت سے ٹھہرا ہوں۔ یہ معزز میزبان کا کام ہے کہ مہمان کی عزت افزائی میں پیش قدمی کرے۔" سیکرٹری واپس چلا گیا۔ اگلے دن نواب صاحب بنفس نفیس ملنے آئے اور دس ہزار روپے بطور نذرانہ پیش کئے۔ لیکن

"مہمان" نے نہایت بے نیازی سے یہ رقم قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ اس کا جواب تھا "فقیر کو اللہ کے فضل و کرم سے صبح و شام دو روٹیاں مل جاتی ہیں اس سے زیادہ کی خواہش نہیں۔"

اور یہ منظر مئی ۱۹۵۸ء کا ہے۔۔۔۔۔۔۔۔

یہی فقیر منش انسان ملتان کے ایک کچے مکان میں مقیم ہے۔ بڑھاپا بھی ہے اور افلاس بھی۔ اس عالم میں صدر پاکستان جنرل سکندر مرزا ملتان آتے ہیں۔ گیلانیوں کے ہاں دعوت ہے سکندر مرزا ایک صاحب کو اس فقیر کے پاس بھیجتے ہیں۔ پیش کش یہ ہے کہ تھوڑی دیر کے لئے آجائیں۔ منہ مانگی خواہش پوری ہو گی۔ مگر یہاں اب بھی وہی جواب ہے۔

"میرا اسکندر مرزا کے پاس جانا، علم اور فقیری کی توہین ہے اسکندر مرزا میرے جھونپڑے میں آجائیں تو انکی بھی عزت ہے اور میری بھی لیکن میں ان کے پاس جا کر اپنی عمر بھر کی کمائی غارت نہیں کرنا چاہتا۔"

ایلچی جس کا نام مظفر علی شمسی ہے خاموش لوٹ آتا ہے۔

اس درویش خدا مست اور فقیر غیور کے پیکر کا نام سید عطاء اللہ شاہ بخاری ہے جو بیسویں صدی عیسوی میں قرون اولیٰ کی لازوال اور تابندہ خصوصیات کے حامل تھے۔ بے مثال خطیب، عالم دین، شاعر، نعت گو، سیاستدان، مبلغ اور مصلح اور جانفروش مجاہد، خالق اکبر نے کتنی ہی خوبیاں بیک وقت ان میں جمع کر دی تھیں اور انہی کی بناء پر اپنے وقت کے سب سے بڑے عالم اور فقیہہ علامہ انور شاہ کاشمیری نے انہیں امیر شریعت کے معزز لقب سے آراستہ فرمایا۔ شاہ جی نے جب میدان سیاست میں قدم رکھا اس وقت انگریزی سامراج اپنے سارے غرور اور نخوت سمیت ہندوستانیوں کی غیرت سے کھیل رہا تھا۔ جب کہ پنجاب کا مسلمان سارے خطرات سے بے نیاز آنکھیں بند کئے بے حسی کی نیند سو رہا تھا۔ ہندو مسلمانوں کا معاشی استحصال بھی کر رہا تھا اور سیاسی میدان میں آگے بڑھنے کی سازشیں بھی۔ مگر پنجاب کا جاگیر دار اور مالدار طبقہ انگریز پرستی کی افیون میں مست عوام کو تھپک تھپک کر سلا رہا تھا۔ مذہب کے محاذ پر بھی گرد اڑ رہی تھی اور نہ صرف انگریزوں کی ساختہ و پرداختہ نبوت اپنے عزائم سمیت لوگوں کے دین و ایمان پر شب خون مار رہی تھی بلکہ عام مسلمانوں کی جہالت اور سادہ لوحی سے وہ لوگ بھی فائدہ اٹھا رہے تھے جو مذہب کو مادہ پرستی و دنیا داری کے حصول کا ذریعہ بنا لیتے ہیں۔ یہ اور اسی قسم کے کتنے ہی محاذ تھے جن پر شاہ جی ڈٹ گئے اور ایک ایک کر کے ساری منفی اور اسلام دشمن طاقتوں کو گھٹنے ٹیکنے پر مجبور کر دیا۔ چنانچہ یہ شاہ جی ہی تھے جنھوں نے اہل پنجاب کے دل سے انگریز کا خوف دور کیا اور انہیں آزادی کے راستے پر لگایا۔ بد قسمتی سے وہ تحریک پاکستان کی حمایت نہ کر سکے مگر اس سے ان کی عظمت میں چنداں فرق نہیں آتا کہ پاکستان کے لئے زمین ان جیسے مردان قلندر نے ہموار کی تھی اور اگر وہ سر بکف ہو کر انگریز کا مقابلہ نہ کرتے اور اس مقصد کے لئے سالہا سال تک قید و بند کی صعوبتیں نہ جھیلتے تو پاکستان کی تحریک کبھی اس شدت سے نہ اٹھتی اور بار آور بھی نہ ہوتی۔

حضرت بخاری یکم ربیع الاول ۱۳۱۰ھ (۱۸۹۲ء) کی چاند رات پٹنہ میں پیدا ہوئے۔ ننھیال والوں نے

شرف الدین احمد نام رکھا جبکہ دودھیال کی طرف سے عطاء اللہ کے نام سے موسوم ہوئے اور بعد میں اسی نام سے شہرت اور عزت پائی۔ والد کا نام سید ضیاء الدین احمد تھا جن کا سلسلہ نسب ۳۶ ویں پشت میں حضرت امام حسنؓ سے جا ملتا ہے۔ ان کے ایک بزرگ سید عبدالغفار بخاری اپنے والد کے ہمراہ بخارا سے کشمیر میں وارد ہوئے اور چونکہ اس وقت کشمیر میں مسلمانوں کی فرماں روائی تھی اس لئے اپنے علم و تدبر کی بدولت درس و قضا کے منصب سے نوازے گئے۔ انہی شاہ صاحب کی اولاد گجرات اور امرتسر میں آباد ہو گئی بعد میں کچھ لوگ بیعت و ارشاد کے سلسلے میں پٹنہ چلے گئے اور لوگوں کی عقیدت مندی کے باعث وہیں سکونت اختیار کر لی۔ سید ضیاء الدین احمد حافظ قرآن تھے اور انہوں نے اپنی کمسنی کے دوران مسجد خواجہ عنبر میں ایک ہی رکعت میں قرآن پاک کے ۲۹ پارے سنا کر مقتدیوں کو ورطۂ حیرت میں ڈال دیا تھا۔

شاہ جی کی والدہ سیدہ فاطمہ اندرابی پٹنہ کے ایک نامور حکیم اور نامور عالم دین کی صاحبزادی تھیں اور نسبت کے اعتبار سے حضرت خواجہ باقی باللہ کے خاندان سے تعلق رکھتی تھیں۔ یوں وہ ہر اعتبار سے نجیب الطرفین سید تھے اور علم و تقویٰ اور فقر و استغناء انہیں وراثت میں ملے تھے۔

شاہ جی کی عمر محض چار برس کی تھی جب ان کی والدہ ماجدہ وفات پا گئیں۔ نانی اماں نے انہیں آغوش میں لے لیا۔ انہوں نے کسی دینی مدرسے سے باقاعدہ تعلیم کا آغاز نہ کیا۔ انگریزی سکول میں داخلے کا تو سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا کہ وہ جس خاندان سے تعلق رکھتے تھے وہاں انگریزی استعمار سے نفرت جزو ایمان تھی چنانچہ موصوف ان مادر زاد عبقری شخصیتوں میں سے ہیں جن کی تربیت خود مبداء فیاض کرتا ہے گھر ہی پر عربی و فارسی کی مروجہ کتابیں پڑھیں۔ البتہ امرتسر کی سکونت اختیار کی تو وہاں مولانا نور احمد سے قرآن پاک کی تفسیر پڑھتے رہے مولانا غلام مصطفیٰ قاسمی سے فقہ اور حضرت مفتی محمد حسن سے مسلم شریف سے بخاری شریف تک کا درس لیا۔ (بعض کتب کے اسباق جیل میں حضرت مفتی محمد کفایت اللہ رحمہ اللہ سے پڑھے) قرآن پاک والد نے حفظ کرایا۔ قرأت کا فن کویت کے ایک قاری سید محمد عمر عاصم سے حاصل کیا۔ قاری صاحب سلطان ترکی خلیفہ عبدالمجید کے نواسوں کے اتالیق تھے کسی وجہ سے زیر عتاب ٹھہرے تو ہندوستان چلے آئے

اور پٹنہ میں قیام کیا۔ یہاں خواجہ عنبر کی مسجد میں قرآن پڑھانے لگے۔ غضب کے خوش الحان تھے۔ تلاوت کرتے تو مسجد کے دروازے پر مسلمانوں کے علاوہ ہندوؤں کی بھیڑ لگ جاتی۔ شاہ جی ابھی نوعمر تھے۔ ایک روز قاری صاحب کی نقل کرتے ہوئے قرآن پڑھ رہے تھے کہ ان کی نظروں میں آ گئے اور پھر قاری صاحب نے اس فن میں ان کی خصوصی تربیت کی۔ اسی کا نتیجہ تھا کہ جب شاہ جی قرآن پڑھتے تو فضا پر سحر کا عالم طاری ہو جاتا اور ہندو سکھ بھی فرمائش کر کے قرآن سننے کا تقاضا کرتے۔

۱۹۱۲ء میں جبکہ عمر بیس سال سے متجاوز تھی پٹنہ سے امرتسر آ گئے جہاں ان کے اعزاء رہتے تھے۔ یہیں کچھ دینی تعلیم حاصل کی اور مولانا غلام مصطفیٰ قاسمی کی رہنمائی میں خطابت کا فن سیکھا۔ پہلی تقریر اندرون گلوالی دروازہ بازار کمہاراں میں ہوئی۔ دوسری تقریر کے لئے ایک صاحب انہیں نواحی گاؤں سلطان ونڈ لے گئے۔ اور

یوں بہت جلد شاہ جی کی خطابت اور تلاوت قرآن کی شہرت اور خوشبو پھیلنے لگی۔ خصوصاً تلاوت قرآن کا انداز بے حد مقبول ہوا اور لوگ بڑے اشتیاق سے انہیں جلسوں میں بلانے لگے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب انگریزی استبداد پوری قہرمانیوں کے ساتھ ہندوستان پر حکمران تھا مگر خوف و ہراس کے باوجود غیرت و حمیت کی چنگاریاں بھی سلگنے لگی تھیں۔ خصوصاً علی برادران نے انگریزوں کے خلاف نفرت کی فضا پیدا کر دی تھی۔ اور دلوں میں کچھ کر گزرنے کا ولولہ کروٹیں لینے لگا تھا۔ یہی وہ ایام تھے جب پہلی عالمی جنگ جیتنے کے بعد انگریزوں کا غرور ساری اخلاقی حدود پھاند کر ہندوستانی عوام سے غیر انسانی سلوک پر تل گیا تھا۔ چنانچہ اپریل ۱۹۱۹ء میں ایک احتجاجی جلوس امرتسر میں ریلوے کے بڑے پل سے گزر رہا تھا کہ انگریز سپاہیوں نے گولی چلادی جس سے چھے مقامی باشندے ہلاک ہو گئے دوسرے روز بعض سرکردہ مقامی رہنما گرفتار کر لئے گئے جس کے نتیجے میں ۱۳ اپریل کو امرتسر کے لوگ جلیانوالہ باغ میں جمع ہوئے یہ احتجاجی جلسہ ہزاروں نفوس پر مشتمل تھا اور پرامن۔ مگر جنرل ڈائر نے اندھا دھند گولی چلوا دی۔ پانچ سو ہندو اور مسلمان ہلاک ہوئے زخمیوں کی تعداد کا کوئی اندازہ نہ تھا۔ اس وحشت ناک کارروائی نے ہندوستان بھر میں آگ لگا دی اور انگریز کے خلاف نفرت عروج پر پہنچ گئی۔

دسمبر ۱۹۱۹ء میں ہندوستان کی تینوں بڑی جماعتوں نیشنل کانگریس مسلم لیگ اور خلافت کانفرنس نے امرتسر میں سالانہ جلسے منعقد کئے۔ اسی پلیٹ فارم پر مولانا شوکت علی کی صدارت میں عطاء اللہ شاہ بخاری نے اپنی پہلی معرکتہ الآرا سیاسی تقریر کی اس تقریر کی اثر آفرینی کا یہ عالم تھا کہ تحریک خلافت کے لئے دس لاکھ روپے کی خطیر رقم جمع ہو گئی مولانا محمد علی جوہر نے اپنے اخبار میں ان کی بے حد تعریف فرمائی۔

امرتسر سے باہر پہلی مرتبہ فروری ۱۹۲۱ء میں کلکتہ میں تشریف لے گئے جہاں کانگریس کا سالانہ اجلاس ہو رہا تھا۔ وہاں مولانا ابوالکلام آزاد کی تجویز کردہ ترک موالات کی تائید میں ایک پرشکوہ تقریر کی جس سے انکی خطابت کی دھاک بیٹھ گئی اور وہ صف اول کے رہنماؤں میں شمار ہونے لگے۔

انہیں دنوں شاہ جی نے گجرات (پنجاب) میں آزاد ہائی سکول قائم کیا جس کا افتتاح مولانا آزاد نے کیا۔ ساتھ ہی ضلع بھر میں خلافت کمیٹیاں قائم کیں اور جگہ جگہ تقریریں کر کے عوام میں انگریز اور غلامی کے خلاف آگ لگا دی۔ آخر کار ۲۷ مارچ ۱۹۲۱ء کو آدھی رات کے وقت انہیں دفعہ ۱۲۴ الف کے تحت گرفتار کر لیا گیا اور ۸ اپریل کو امرتسر کے ایڈیشنل ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ نے تین سال کی قید بامشقت سنا دی اس میں تین ماہ قید تنہائی کے تھے۔ اس قید نے شاہ جی کو انگریزی حکومت کا مستقل باغی بنا دیا اور وہ ۱۳ اگست ۱۹۴۷ء تک برطانوی استعمار کے خلاف مصروف جہاد رہے۔ اس دوران تقریباً دس ہزار تقریریں کیں اور انگریزی حکومت کی بیخ کنی میں ساری صلاحیتیں صرف کر دیں۔

اسیری کی یہ مدت تھوڑا عرصہ لاہور سنٹرل جیل میں اور باقی میانوالی جیل میں گزری جو خراب آب و ہوا اور گرمی کی وجہ سے اس زمانے میں پنجاب کا "کالا پانی" کہلاتی تھی مگر شاہ جی نے اس آزمائش کا مقابلہ بڑے حوصلے اور خندہ روئی سے کیا عموماً قرآن کی تلاوت جاری رکھتے اور چونکہ بہت سے دیگر ہندو اور مسلم رہنما بھی یہیں رکھے گئے تھے اس لئے گاہے گاہے مشاعروں، قوالیوں اور علمی مباحثوں کی محفلیں بھی برپا ہوتیں۔ قید

کے دوران ہی آزاد ہائی سکول ختم ہو گیا۔ ترک موالات کا خود گاندھی نے گلا گھونٹ دیا اور خلافت کی تحریک کمال اتاترک کے تنسیخ خلافت سے دم توڑ گئی شاہ جی نے یہ ساری خبریں سنیں اور خون کے گھونٹ پی کر رہ گئے۔

۲۱ اکتوبر ۱۹۲۳ء کو رہا ہو کر گھر آئے تو وطن کا نقشہ بگڑا ہوا پایا۔ ہندو مسلم اتحاد کا دور لد چکا تھا۔ دونوں قوموں کے درمیان مناقشت اور افتراق کے جراثیم پھیل چکے تھے اور انگریزوں کی شہ پر سوامی شردھانند نے مسلمانوں کو ہندو بنانے کی تحریک شروع کر دی تھی۔ شاہ جی نے ایک طرف جہاں شدھی کے زہر کو دور کرنے اور مسلمانوں کا ایمان محفوظ رکھنے کی سعی کی وہاں دوسری جانب انگریزی سازشوں کے تار و پود بکھیرنے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی۔ زچ ہو کر انہیں جنوری ۱۹۲۵ء میں دوبارہ گرفتار کر لیا گیا۔ شاہ جی نے ضمانت دینے سے انکار کر دیا اور مقدمے کی کارروائی میں کوئی حصہ نہ لیا۔ عدالت نے چھ ماہ قید بامشقت یا پانچ سو روپے جرمانے کی سزا دی۔

جرمانے کی رقم عقیدت مندوں نے جمع کرا دی شاہ جی رہا ہو گئے مگر جرمانے کی ادائیگی پر سخت خفا تھے۔ انہیں گلہ تھا کہ لوگوں نے اپنی حلال کی کمائی فرنگی خزانے میں کیوں دی۔؟

اس مقدمے سے فارغ ہو کر شاہ جی نے خطابت کی ساری صلاحیتیں شدھی کے ازالے کے لئے صرف کر دیں اور ہزاروں مسلمانوں کو کفر کی تاریکیوں میں غرق ہونے سے بچا لیا۔ مگر افسوس اسی زمانے میں جزیرہ نمائے عرب میں سعودی اقتدار کے بعد کچھ ایسے واقعات پیش آئے جنہوں نے مثبت یا منفی طور پر سارے ہندوستانی مسلمانوں کو متاثر کیا سید بخاری سعودیوں کے حامی تھے اور ان کی کارروائیوں کو قرآن و سنت کی رو سے حق بجانب ثابت کرتے تھے۔ یہی وہ دور تھا جب پنجاب کے بہت سے سرکردہ پیران کرام نے سعودیوں کی مخالفت میں پنجاب کے انگریز گورنر سر مائیکل ایڈوائر کے اعزاز میں ایک تقریب منعقد کی اور سپاسنامہ پیش کیا جس میں انگریزوں کی ملمع و ثناء، انگریزی راج کی برکات و فیوض اور سلطنت برطانیہ کی تعریف و خوشامد میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی گئی تھی آج بھی اس سپاسنامے کی عبارت پڑھ کر سر شرم سے جھک جاتا ہے۔ شاہ جی کو خبر ملی تو ملتان تشریف لے گئے کہ پیر حضرات کی اکثریت اسی علاقے سے تعلق رکھتی تھی اور لانگے خاں کے باغ میں تین روز تک خطاب فرمایا۔ دردمندی، غیرت دینی اور خطابت کا انداز ملاحظہ ہو۔

"اگر میں ابن سعود کی حمایت کروں تو کافر اور تم ترکوں کے قتل پر دستخط کرو تو مومن؟ تم فتح بغداد پر چراغاں کرو تو مسلمان اور فرنگی سے آزادی کے لئے لڑوں تو مجرم۔ تمہارے تعویذ تمہاری دعائیں کافر کی فتح کی آرزومند ہیں اور میں سلطنت برطانیہ کی بنیادیں اکھاڑنے کے در پے ہوں۔ تم نے انسانوں سے زیادہ کتوں اور سوروں کی قدر کی اور گناہ کو ثواب کا درجہ دیا۔ تمہاری قبائیں خون مسلم سے داغدار ہیں"

اسی تقریر کے آخر میں فرمایا

"اس باغ کے گل بوٹے آگاہ رہیں کہ میں نے تین دن کی مسلسل تقریروں سے باغبان قوم و وطن کے فریب سے بنی نوع انسان کو آگاہ کر دیا ہے۔ باغ کی روش روش میری گفتگو کو اپنے مستقبل کے دامن میں محفوظ کر لے شاید قیامت کے دن میں اپنی نجات کے لئے ان سے گواہی طلب کروں۔ اے باد بہاری کے خوشگوار جھونکو! شہادت دینا کہ میں نے اہل ملتان کے سامنے حق و باطل کے درمیان دیوار کی نشاندہی کر دی ہے۔"

شاہ جی اردو زبان کے سب سے بڑے خطیب تھے۔ اللہ نے انہیں لحن داؤدی عطا کیا تھا۔ قرآن پڑھتے تو سامعین دم بخود رہ جاتے اور تقریر کرتے تو گویا گلستان کھل جاتا۔ خاص انداز اور ترنم سے برمحل شعر پڑھتے تو سامعین پھڑک جاتے۔ بسا اوقات ایسا ہوتا کہ عشاء کی نماز کے بعد تقریر شروع ہوتی اور صبح کی اذان تک جاری رہتی۔ یوں معلوم ہوتا جیسے مجمع زنجیروں سے بندھا بیٹھا ہے اکتا کر اٹھ بیٹھنا تو دور کی بات ہے کوئی اپنی جگہ سے ہل بھی نہ سکتا تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے سامعین پر مقرر نے جادو کر دیا ہے۔ اکثر ایسا ہوا مخالفین یہ ارادہ لے کر ان کے جلسوں میں آتے کہ آج ضرور گڑبڑ کریں گے مگر شاہ جی کی خطابت کا سحر انہیں دنیا و مافیہا سے ایسا بے خبر کرتا کہ جب کسی مسئلے پر ہاتھ اٹھانے کو کہتے تو یہ مخالفین بھی بے اختیار ہاتھ اٹھا دیتے۔ شاہ جی کی اس طلسم کاری کے بارے میں خان غلام محمد خاں لونڈ خوڑ کی روایت بڑی دلچسپ ہے ان کا کہنا ہے میں نے نہ تو شاہ جی کو دیکھا تھا نہ انکا معتقد تھا میرا سیاسی مسلک بھی ان سے مختلف تھا۔ ایک دفعہ عشاء کے وقت دلی دروازے کے باہر سے گزرا تو شاہ جی تقریر کر رہے تھے میں بڑے ضروری کام کے سلسلے میں جا رہا تھا مگر اس خیال سے رک گیا کہ جس مقرر کی دھوم ہے اسے پانچ منٹ سن لینا چاہیئے۔ میری عادت یہ ہے کہ میں جلسے میں ایک جگہ بیٹھ نہیں سکتا۔ خود اپنے جلسے بھی گھوم پھر کر دیکھتا اور سنتا ہوں۔ میں پانچ منٹ تک ان کی تقریر سنتا رہا پھر سوچا تھوڑی دیر اور سن لوں تقریر کا سحر تھا کہ کھڑے کھڑے بیٹھ گیا۔ بیٹھے بیٹھے تھک گیا تو لیٹ گیا اور لیٹے لیٹے ساری رات تقریر سنتا رہا۔ ایسے حواس گم ہوئے کہ اپنا کام ہی بھول گیا۔ یہاں تک کہ صبح کی اذان بلند ہوئی۔ شاہ جی نے تقریر کے خاتمے کا اعلان کیا تو خیال آیا کہ او ہو ساری رات ختم ہو گئی۔ تب پتہ چلا یہ شخص تقریر نہیں کرتا جادو کرتا ہے۔

انگریز کے بعد شاہ جی کو سب سے زیادہ نفرت قادیانیوں سے تھی۔ وہ بجا طور پر انہیں انگریزوں کا خود کاشتہ پودا سمجھتے اور اسلام کے خلاف انگریزی استعمار کی سازش قرار دیتے تھے۔ چنانچہ اس فرقہ باطلہ کے استیصال کے لئے انہوں نے تقریری محاذ پر جتنا کام کیا قادیانیت کے خلاف مزاحمت کی پوری تحریک میں اس کی کوئی مثال نہیں ملتی۔ دراصل یہ شاہ جی ہی تھے جنہوں نے قادیانی عزائم سے امت مسلمہ کو آگاہ کیا۔ اس کے بعد علامہ اقبال مرحوم و مغفور نے اس فتنے کے خلاف بھرپور آواز اٹھائی اور الیاس برنی مرحوم نے قادیانیت پر معرکتہ الآرا کتاب لکھی۔

۱۹۲۶ء کا پورا سال بہت مصروف گزرا اور بیک وقت انگریز، ہندو، قادیانی اور پنجاب کے انگریز پرست

پیروں کے خلاف انکا جہاد جاری رہا۔ ایک چو مکھی جنگ تھی جس میں وہ ہمہ تن مصروف رہے۔ شاید ہی کوئی دن گزرتا تھا کہ وہ باطل کی ان قوتوں کے خلاف نبرد آزما نہ رہے ہوں۔

یہی وہ ایام تھے جب بعض دریدہ دہن ہندو مصنفین ۔نے جناب رسالت مآب سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف نہایت سوقیانہ زبان میں الزام تراشی کی مہاشہ راج پال ایسے ہی بد بخت لوگوں میں سے تھا۔ اس نے نبی کریم کے خلاف ایک زہریلی کتاب لکھی مسلمانوں کی شکایت پر مصنف کو گرفتار کرلیا گیا۔ اس کے خلاف مقدمہ چلا۔ مگر لاہور ہائی کورٹ کے جسٹس دلیپ سنگھ نے بری کر دیا۔ مسلمانوں میں زبردست ہیجان پیدا ہوا۔ انہوں نے باغ بیرون دہلی دروازہ میں جلسہ کرنا چاہا۔ مگر لاہور کے ڈپٹی کمشنر نے دفعہ ۱۴۴ لگا دی۔ شاہ جی نے شاہ محمد غوث کے مقابل احاطہ عبدالرحیم میں جلسے کے انعقاد کا فیصلہ کیا۔ ۴ جولائی ۱۹۲۷ء کو اس عظیم الشان اور تاریخی جلسے کی صدارت چودھری افضل حق نے کی جبکہ اسٹیج پر خواجہ غازی عبدالرحمن، مفتی کفایت اللہ اور مولانا احمد سعید دہلوی بھی موجود تھے۔ شاہ جی کے درد و سوز کا عجیب عالم تھا۔ لہجے میں تڑپ بھی تھی اور للکار بھی۔

"آج آپ لوگ جناب فخر رسل محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم کے عزو ناموس کو برقرار رکھنے کے لئے جمع ہوئے ہیں آج جنس انسان کو عزت بخشنے والے کی عزت خطرے میں ہے آج اس جلیل المرتبت ہستی کا ناموس معرض خطر میں ہے جس کی دی ہوئی عزت پر تمام موجودات کو ناز ہے۔

آج مفتی کفایت اللہ اور مولانا احمد سعید دہلوی کے دروازے پر ام المومنین حضرت خدیجۃ الکبریٰ آئیں اور فرمایا ہم تمہاری مائیں ہیں تمہیں معلوم نہیں کفار نے ہمیں گالیاں دی ہیں ارے دیکھو! عائشہ صدیقہ دروازے پر تو کھڑی نہیں (یہ جملہ اس جلال و غضب اور سوز و درد سے ادا کیا کہ حاضرین کی نگاہیں بے ساختہ دروازے کی طرف اٹھ گئیں۔ ہجوم میں کہرام مچ گیا۔ سامعین دھاڑیں مار مار کر رونے لگے) تمہاری محبت کا تو یہ عالم ہے کہ عام حالتوں میں کٹ مرتے ہو لیکن تمہیں معلوم نہیں کہ آج گنبد خضریٰ میں رسول اللہ تڑپ رہے ہیں۔ آج خدیجہ اور عائشہ پریشان ہیں بتاؤ تمہارے دلوں میں امہات المومنین کے لئے کوئی جگہ ہے۔۔۔۔۔۔۔ اگر تم خدیجہ و عائشہ (رضی اللہ عنھم) کے ناموس کی خاطر جانیں دے دو تو یہ کچھ کم فخر کی بات نہ ہو گی یاد رکھو یہ موت آئے گی تو پیام حیات لے کر آئے گی۔"

اس تقریر نے سینوں میں آگ بھر دی۔ مجمع میں ایک حشر بپا تھا۔ شاہ جی کی تحریک پر لوگوں کے جتھے دیوانہ وار باغ دہلی دروازہ جلسہ گاہ کی طرف لپکے۔ پولیس نے لاٹھی چارج سے یلغار کی مگر جواں مردوں کے جوش عمل کو سرد کرنا اب ناممکن ہو گیا تھا نتیجتاً بڑی تعداد میں گرفتاریاں عمل میں آگئیں۔ شاہ جی نے عوامی جذبات کو بے قابو ہونے سے روک دیا اور فرمایا۔

"ہمارا موقف قتل و غارت گری نہیں بلکہ ہم چاہتے ہیں کہ برطانوی حکومت، تعزیرات ہند میں ایک ایسی دفعہ کا اضافہ کرے جس کی رو سے بانیان مذاہب کے خلاف تقریر و تحریر کی پابندی ہو۔ اور اس کی خلاف

ورزی کرنے والا مجرم قرار پائے۔"

اس قرار داد کے بعد جلسہ برخاست کر دیا گیا۔ سارے شہر میں جلسہ کے زیر اثر بے چینی اور غم و غصہ کی لہر دوڑ گئی۔ عوام کو پر امن کرنا انتظامیہ کے لئے چیلنج کی حیثیت اختیار کر گیا۔ اسی جلسہ میں غازی علم الدین شہید بھی موجود تھے

لاہور کے ڈپٹی کمشنر نے انتقامی کارروائی کی اور ۱۰ جولائی ۲۷ء کو شاہ جی گرفتار کر لئے گئے دفعہ ۱۰۸ کے تحت ان پر مقدمہ چلا اور حکم ہوا کہ تین ہزار روپے کی شخصی ضمانت اور تین ہزار روپے کا مچلکہ دے کر رہا ہو سکتے ہیں۔ لیکن انہوں نے یہ رعایت ٹھکرا دی اور مقدمے میں صفائی دینے سے انکار کر دیا۔ لاہور سنٹرل جیل میں مسلسل چار روز تک کارروائی جاری رہی تا آنکہ شاہ جی کو ایک سال قید بامشقت کی سزا دے کر روہتک جیل بھیج دیا گیا۔ غازی عبدالرحمن اور مولانا حبیب الرحمن لدھیانوی بھی انہیں دنوں گرفتار کر لئے گئے۔ اس موقع پر مولانا ظفر علی خاں نے کہا کہ۔

بنو غازی کی غیرت لاج رکھ لی جس نے ملت کی
عطاء اللہ کا ہیبت رہا ایمان ہو جاؤ

مسلمانوں میں ناموس رسالت کے تحفظ کے جذبے کی چنگاری کو شاہ جی نے شعلہ بے اماں بنا دیا تھا چنانچہ شاہ جی کی گرفتاری اور سزا کے بعد فرنگی اور ہندو کے خلاف نفرت کو مزید ہوا ملی اور تحریک سارے ہندوستان میں پھیل گئی۔ دہلی کے مولوی عبدالرشید (شہید) نے نامور آریہ سماج سوامی شردھانند کو قتل کر دیا۔ اس جرم میں ۱۴ نومبر ۲۷ء کو دہلی جیل میں پھانسی دے دی گئی۔ حکومت نے تحریک کو دبانے کی ہر ممکن کوشش کی مگر بری طرح ناکام رہی۔ آخر کار شاطران فرنگ اس حد تک سپر انداز ہوئے کہ تعزیرات ہند میں ترمیم کر کے دفعہ ۱۹۵ کا اضافہ کیا گیا۔ جس کی رو سے ہر ایسی تقریر و تحریر جرم قرار دیدی گئی جس سے کسی مذہب کے بزرگ یا بانی (REFORMER) کی اہانت کا پہلو نکلتا ہو۔ مگر متنازعہ فیہ کتب کو ممنوع قرار نہ دیا گیا۔ اس سے مسلمانوں کا اضطراب کسی طرح بھی کم نہ ہو سکا۔ مسلمانوں کے اسی احتجاج کے زیر اثر والی افغانستان امیر غازی امان اللہ نے حکومت کو لکھا کہ "اگر برطانوی ہند میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی عزت محفوظ نہیں رہ سکتی تو ہمیں برطانیہ کے ساتھ کئے گئے معاہدوں پر از سر نو غور کرنا پڑے گا۔"

شاہ جی کو مئی ۲۸ء کو رہائی ملی۔ دسمبر ۲۹ء تک ڈیڑھ سال کا عرصہ شاہ جی نے مجموعی اعتبار سے امرتسر میں گزارا البتہ اس عرصہ میں انہوں نے آریہ سماجی ہندوؤں اور مصنفوں کی خوب خبر لی اور مسلمان رائے عامہ کو ان کے خلاف بیدار کیا۔ کیونکہ راج پال کے بری ہونے سے ہندوؤں کے حوصلے بڑھ گئے تھے اور وہ نبی اکرم اور دین اسلام کے خلاف بد گوئی میں مصروف تھے۔ شاہ جی کی آواز صورِ اسرافیل ثابت ہوئی۔ ان کا لب و لہجہ انتہائی ولولہ انگیز اور حمیت آمیز تھا فرماتے۔

"مسلمانو! تمہاری سوئی ہوئی غیرت کو جھنجھوڑنے آیا ہوں آج کفار نے توہین پیغمبر کا فیصلہ کر لیا ہے۔ انہیں شاید یہ غلط فہمی ہوئی ہے کہ مسلمان مر چکا ہے۔ آؤ اپنی زندگی کا ثبوت دیں۔

عزیز نوجوانو! تمہارے دامن کے سارے داغ صاف ہونے کا وقت آپہنچا ہے گنبد خضرا کے مکین تمہاری راہ دیکھ رہے ہیں۔ آپ کی آبرو خطرے میں ہے۔ آپ کی عزت پر کتے بھونک رہے ہیں اگر قیامت کے دن محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی شفاعت کے طالب ہو تو پھر نبی کی توہین کرنے والی زبان نہ رہے یا سننے والے کان نہ رہیں"

شاہ جی کی انہیں تند و تیز اور غیرت آفریں تقریروں کا نتیجہ تھا کہ ہندوستان کے مختلف شہروں میں مختلف مسلمان نوجوانوں نے ان بدزبانوں کو موت کی نیند سلادیا۔ جنہوں نے محسن انسانیت صلی اللہ علیہ وسلم کی شان اقدس میں گستاخی و بدکلامی کی۔ سب سے پہلے ۶ اپریل ۱۹۲۹ء کو لاہور کے بڑھئی نوجوان غازی علم الدین (شہید) نے دوپہر کے وقت لاہور میں کتاب "رنگیلا رسول" (خاکم بدہن) کے ناشر مہاشہ راج پال کو اس کی دکان (ہسپتال روڈ) میں قتل کر دیا۔ اس مقدمہ میں شاہ جی کی خواہش پر علم الدین نے راج پال کے قتل کا مردانہ وار اقرار کر لیا تھا حالانکہ وکیلوں کی خواہش تھی کہ علم الدین ایسا نہ کرے۔ غازی علم الدین (شہید) سے قبل دو موقعوں پر دو نوجوانوں (عبدالعزیز اور عبدالرشید) نے راج پال کو قتل کرنے کی کوشش کی تھی مگر وہ اپنے مقصد میں ناکام رہے تھے۔ اور انہیں عدالتوں نے بالترتیب چودہ سال اور چھ سال قید بامشقت کی سزا سنائی تھی۔

اگرچہ غازی علم الدین کو پھانسی کی سزادی گئی پھر بھی قصور میں محمد صادق نے پالے شاہ کو، کراچی میں عبدالقیوم نے نتھو رام کو، جہلم میں غلام محمد نے اپل سنگھ کو۔ کیمبل پور میں عبدالمنان نے پیارے لال کو کیفر کردار تک پہنچا دیا۔ لاہور کے دو نوجوان محمد عبداللہ اور عبدالعزیز کلکتہ پہنچے اور وہاں ایک گستاخ رسول بھولا رام کو موت کی نیند سلادیا۔ چکوال میں ایک نوجوان نے ایک سکھ ڈاکٹر کی زبان خاموش کر ڈالی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف سب و شتم کا یہ ناپاک سلسلہ ۱۹۳۴ء تک چلتا رہا۔ شاہ جی نے اس ساری مدت میں جہاد جاری رکھا۔ شمع رسالت کے پروانے اپنی جانیں نچھاور کرتے رہے حتیٰ کہ کفر نے شکست فاش کھائی۔ پھر کسی کو ناموس رسالت پر کیچڑ اچھالنے کی جرأت نہ ہوئی۔

شاہ جی ایمان اور عمل کے اعتبار سے درجہ اول پر فائز تھے۔ ظلم خواہ چھوٹے پیمانہ پر ہوتا یا بڑے پیمانے پر اس کی مخالفت پر کمر بستہ ہو جاتے اور حق خواہ محدود سطح پر ہوتا یا وسیع شکل میں اس کی حمایت برملا کرتے۔ یہی وجہ ہے کہ امرتسر میں جب ایک مسلمان شاطر نے اپنی شخصیت کی وجاہت سے فائدہ اٹھا کر بظاہر پیری مریدی اور دراصل دنیاداری کا دھندہ رچانا چاہا تو شاہ جی نے اس کے خلاف جلسہ عام میں تقریر کر ڈالی اور وہ بمبئی بھاگ گیا اور جب یہیں کے مشہور پہلوان حیدر کو ہندوؤں نے محض مسلم دشمنی کے تحت ایک جھوٹے مقدمے میں پھنسانا چاہا تو شاہ جی اس کی حمایت میں ڈٹ گئے اور جب تک بری نہ کرا لیا چین سے نہ بیٹھے۔

۱۹۲۹ء کے وسط میں شاہ جی کو ڈیرہ غازی خان جانے کا اتفاق ہوا۔ اس علاقے کے غریب مسلمان، مسلمان تمن داروں اور ہندو ساہوکاروں کے چنگل میں بری طرح پھنسے ہوئے تھے۔ دور افتادہ ہونے کی وجہ سے شاہ جی ان حالت سے ناواقف تھے۔ ایک دردمند اور صاحب شعور مسلمان زمیندار سردار احمد خان پتافی نے شاہ

جی سے ملاقات کی اور انہیں ان حالات سے آگاہ کیا کہ کس طرح غریب مسلمان معمولی رقموں کے عوض اپنی بیٹیاں تک ہندو ساہوکاروں کو رہن میں دے دیتے ہیں۔ کس طرح مسلمان زمینداروں نے ۱۸۶۲ء کے بندوبست اراضی میں اپنے آپ کو قرآن کی بجائے رواج کا پابند لکھوایا۔ جس کے تحت وہ بیٹیوں کو جائیداد سے محروم رکھتے ہیں۔ اور کس طرح مسلمان تمن داروں نے کتے اور سؤر پال رکھے ہیں اور سؤر مار کر پلاؤ پکاتے اور کتوں کو کھلاتے ہیں۔

شاہ جی نے یہ حالات سنے تو بے اختیار رو دیئے اور عہد کیا کہ اس علاقے کے مسلمانوں کی اصلاح احوال میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھوں گا اور ساری زندگی اس کے لئے جدوجہد کروں گا۔ چنانچہ آپ جب تک زندہ رہے ہر سال جون جولائی کے دنوں میں جب کسان فصل کی کٹائی سے فارغ ہو چکے ہوتے۔ ڈیرہ غازی خان تشریف لے جاتے اور مقامی باشندوں کے مخصوص لب و لہجے اور عام فہم انداز میں گھنٹوں انہیں دین کی تبلیغ کرتے۔ گرمی کی شدت سے ان کے جسم پر پھنسیاں نکل آتیں۔ دور دراز بستیوں میں جاتے جوہڑوں کا پانی پیتے اور عام لوگوں کے ساتھ کھانے میں پیاز، اچار یا مسور کی دال کھاتے۔ آسودہ حال گھرانوں میں یہ کہہ کر کھانے سے انکار کر دیتے کہ میں جن لوگوں کو سمجھانے آیا ہوں اگر ان کے ساتھ گھل مل نہ جاؤں تو ان پر میری بات کا اثر نہیں ہو سکتا۔

شاہ جی چاہتے تو اس علاقے کے لوگوں کی بے مثال توہم پرستی سے فائدہ اٹھا کر بہت سے مادی مفادات بلکہ آمدنی کے مستقل ذرائع حاصل کر سکتے تھے۔ مگر انہوں نے نہایت صفائی، خلوص اور بے لوث طریقے سے دین کی تبلیغ کی نتیجہ یہ ہوا کہ تمن داروں نے کتوں اور سؤروں کی پرورش سے توبہ کر لی۔ زمینداروں نے شریعت کے مطابق جائیداد میں اپنی لڑکیوں کو حصہ دینا شروع کر دیا۔ اور مسلمان وڈیروں سے روپیہ لے کر غریب مسلمان لڑکیوں کو ہندو ساہوکاروں سے رہائی دلائی۔

اسی زمانے میں شاہ جی کو پتہ چلا کہ ڈیرہ غازی خان کے ایک گاؤں حاجی پورہ میں ایک عرس کے موقع پر نہایت قبیح حرکتیں ہوتی ہیں۔ وہاں جانے کا فیصلہ کر لیا مگر ڈپٹی کمشنر ڈی سی نے حکماً پابندی نافذ کر دی۔ رات کو شہر میں ان کی تقریر تھی ڈی سی مع اپنی بیگم کے آیا ہوا تھا۔ شاہ جی نے اسے مخاطب کرتے ہوئے فرمایا۔

''مسٹر ڈی سی! تم نے مجھے حاجی پورہ جانے سے روک دیا۔ میں وہاں جاتا تو لوگوں کو چرس، بھنگ وغیرہ پینے سے منع کرتا۔ اور انہیں بتاتا کہ بزرگوں کے مزار فاتحہ خوانی کے لئے ہوتے ہیں۔ اس قسم کی حرکتوں کے لئے نہیں۔

ستمبر ۱۹۲۹ء میں مرکزی اسمبلی کے ایک ہندو رکن ہربلاس شاردا نے ایک بل پیش کیا جس کے مطابق سولہ سال سے کم عمر لڑکی کا نکاح نہیں ہو سکتا تھا۔ ابتداء میں اسکا اطلاق صرف ہندوؤں پر ہونا تھا مگر بد قسمتی سے بعض مسلمان ارکان اسمبلی نے اسے ہندو مسلم سب پر منطبق کرنے کا مطالبہ کیا اور یوں یہ بل ۲۸ ستمبر ۲۹ء کو پاس ہو گیا۔ علمائے کرام نے اسے مداخلت فی الدین قرار دیا اور اس کے خلاف مجتمع ہو گئے پنجاب اور صوبہ سرحد کے علاقے شاہ جی کی تحویل میں دیئے گئے اور انہوں نے شب و روز کی تقریروں سے اس

بل کو بے اثر بنا دیا۔ مسلمانوں نے ان کی آواز پر لبیک کہا اور ہزاروں نابالغ بچوں کے نکاح پڑھوا کر اس قانون کی دھجیاں بکھیر دیں۔ [1]

اس وقت تک پنجاب کی سیاست چند ایسے خاندانوں اور شخصیتوں تک محدود تھی۔ جو پشتینی انگریز پرست تھے اور اس خدمت کے صلے میں انہیں جاگیریں اور جائیدادیں عطا ہوئی تھیں۔ پنجاب میں انگریز اور غلامی کے خلاف کوئی تحریک چلانا محال تھا۔ دوسری جانب مذہب پر ایسے حضرات کا قبضہ تھا جو عام مسلمانوں کو من گھڑت قصے کہانیوں میں مست رکھتے تھے اور قرآن سنت کی انقلابی دعوت سے خود بھی بے خبر تھے اور عوام کی بے خبری ہی میں اپنی عافیت سمجھتے تھے۔ اس پس منظر میں ضرورت اس امر کی تھی کہ مسلم اکثریت کے اس سب سے بڑے صوبہ میں کوئی ایسی سیاسی و مذہبی تنظیم موجود ہو جو عوام کو ایک طرف تو آزادی کا درس دے اور دوسری جانب مذہبی دکانداروں کے شکنجے سے نکال کر بدعات اور رسم پرستی کے بجائے دین حق کا صحیح شعور عطا کرے۔ اسی مقصد کے تحت ۲۹ دسمبر ۱۹۲۹ء کو مولانا ظفر علی خاں، مولانا داؤد غزنوی، سید عطا اللہ شاہ بخاری، چودھری افضل حق، خواجہ عبدالرحمن غازی اور مولانا حبیب الرحمن لدھیانوی نے "مجلس احرار اسلام" کی بنیاد رکھی شاہ جی پہلے صدر منتخب ہوئے اس سے پہلے پنجاب کے مسلمان رہنماؤں کی اکثریت کانگریس سے وابستہ تھی۔ احرار اسلام کا قیام عمل میں آیا تو ہندو لیڈروں اور اخبار نویسوں نے اس کے خلاف زبردست پروپیگنڈا شروع کر دیا اور اسے فرقہ وارانہ جماعت قرار دینے لگے۔ اس کا مثبت نتیجہ یہ نکلا کہ پنجابی مسلمانوں میں احرار کا وجود ایک فعال عوامی تنظیم کی صورت اختیار کر گیا اور یہ پہلا مرحلہ تھا جب مسلمانوں میں ہندوؤں سے علیحدگی کا ہمہ گیر ذہن ایک ایسی احتجاجی تحریک سے وابستہ ہوا جس نے ایک انگریز تاریخ دان جان گنتھر کے الفاظ میں "مذہب کے رستے سے عوام میں سیاسی رسوخ حاصل کیا تھا۔" اس کا یہ نتیجہ سامنے آیا کہ مسلمان ہندوؤں کی کوتاہ نظریوں اور بے انصافیوں سے تنگ آ کر علیحدہ وطن کے بارے میں سوچنے لگے۔ آغا شورش کاشمیری مرحوم کے الفاظ میں "احرار والے جو کچھ کہتے رہے وہ پاکستان کے خلاف تھا مگر جو کیا وہ پاکستان کے حق میں تھا۔"

چنانچہ تاریخ اس حقیقت کی شاہد ہے اور علامہ اقبال جیسے رہنما نے اس کی تصدیق فرمائی کہ یہ "مجلس احرار خصوصاً حضرت بخاری کا فیض تھا کہ پنجاب کے دل و دماغ انگریز کے خوف سے آزاد ہوئے اور لوگ بیرونی استعمار کی غلامی سے نجات پانے کے بارے میں سوچنے لگے۔" ورنہ وہ علاقہ جہاں کے لوگ انگریزی فوج میں بھرتی ہونے پر فخر کرتے تھے اور کعبۃ اللہ اور سیدنا عبدالقادر جیلانی کے مزار پر گولیاں چلانے اور اپنے ہی مسلمان ترک بھائیوں کے سینے گولیوں سے چھلنی کرنے پر تیار ہو جاتے تھے اور جہاں کے پیران کرام اپنے مریدوں کو کعبہ و بغداد و انقرہ پر حملہ آور ہونے کی بخوشی اجازت دیتے تھے۔ اس علاقے سے حریت و آزادی کی کسی تحریک کی توقع بیکار محض تھی۔ مگر شاہ جی نے شہر شہر قریہ قریہ تقریریں کیں۔ وہ محض اردو ہی میں گفتگو کا

۱۔ یاد رہے کہ نابالغ بچوں کے نکاح پڑھوائے گئے تھے مگر رخصتی بلوغت کی عمر میں کی گئی۔

جادو نہیں جگاتے تھے بلکہ لاہوری، ملتانی اور دور دراز کے علاقوں کی مقامی زبان اور لب و لہجہ میں روانی سے تقریر کرتے اور عوام کے عقل و شعور کے مطابق باتیں کرتے تھے یہی سبب تھا کہ پنجاب میں مسلم عوام کا شعور انگڑائی لے کر بیدار ہوا اور انگریز کے خلاف آزادی کا جذبہ سینوں میں کروٹیں لینے لگا۔

مارچ ۱۹۳۰ء میں شاہ جی کو امیر شریعت کے اعزاز سے نوازا گیا ہوا یوں کہ لاہور میں انجمن خدام الدین کا سالانہ اجلاس ہو رہا تھا۔ صدارت مشہور عالم دین اور دیوبند کے شیخ الحدیث علامہ انور شاہ کاشمیری فرما رہے تھے پانچ سو جید علماء جمع تھے کہ اچانک علامہ موصوف نے فرمایا۔

"دین کی قدریں بگڑ رہی ہیں۔ کفر چاروں طرف یلغار کر چکا ہے۔ اس وقت مسلمانوں کو اپنے لئے ایک امیر منتخب کرنا چاہیئے میں اس کے لئے سید عطاء اللہ شاہ بخاری کو منتخب کرتا ہوں وہ نیک بھی ہیں اور بہادر بھی اس وقت انہوں نے فتنہ شاتم رسول اور شاردا ایکٹ کے سلسلے میں جس جرأت اور دلیری سے دین کی خدمت کی ہے آئندہ بھی ان سے ایسی ہی توقع ہے۔"

یہ کہہ کر علامہ انور شاہ صاحب نے دونوں ہاتھ شاہ جی کی طرف بڑھا دیئے۔ شاہ جی نے دونوں ہاتھوں سے یہ ہاتھ تھام لئے اور کہا۔

"یہ نہ سمجھیں کہ حضرت نے میرے ہاتھ پر بیعت کی ہے بلکہ آپ نے مجھے اپنی غلامی میں قبول فرما لیا ہے"

یہ کہہ کر شاہ جی زار و قطار رونے لگے اور سارا جسم کانپنے لگا۔ اس کے بعد تمام علماء نے جن کی تعداد پانچ سو تھی ان کے ہاتھ پر بیعت کی اور انہیں امیر شریعت کے لقب سے ملقب کیا گیا۔ بیعت کرنے والوں میں مولانا ظفر علی خان، مولانا حبیب الرحمن لدھیانوی، اور مولانا احمد علی لاہوری بھی شامل تھے جو لوگ علامہ انور شاہ کاشمیری کے مقام اور مرتبے سے واقف ہیں وہ جانتے ہیں کہ ان کی جانب سے یہ کتنا بڑا اعزاز تھا جو شاہ جی کو مرحمت کیا گیا۔

۳ مئی ۱۹۳۰ء کو امروہہ میں جمعیت العلمائے ہند کا اجلاس تھا فیصلہ طلب امر یہ تھا کہ سول نافرمانی کی تحریک میں کیا روش اختیار کی جائے اور کانگریس کے ساتھ اس معاملہ میں کس حد تک تعاون کیا جائے

شاہ جی پہلے ہی سول نافرمانی کے حامی تھے اور پنجاب میں یہی تحریک چلا رہے تھے۔ جس کے باعث دس بارہ مقامات سے وارنٹ گرفتاری جاری ہو چکے تھے مگر وہ پولیس کو جل دے کر دوسرے شہر چلے جاتے تھے۔ چنانچہ امروہہ بھی جا دھمکے اور وہاں تین دنوں میں مجموعی طور پر ۲۰ گھنٹے تک تقریر کی اور کانگریس کے ساتھ سول نافرمانی کی تحریک میں شمولیت کے حق میں دلائل کے انبار لگا دیئے۔ انہوں نے فرمایا۔

"میں ہندو کو اپنا دوست نہیں سمجھتا لیکن اس کی دشمنی ساحل سمندر تک محدود ہے۔ جب کہ انگریز تو سمندر پار تک اسلام کا تعاقب کر رہا ہے۔ اس لئے اگر میں اپنے چھوٹے دشمن (ہندو) کے ساتھ مل کر اسلام کے بڑے دشمن (انگریز) کو شکست دے سکوں تو یہ سودا مہنگا نہیں ہے۔"

علمائے کرام! اگر میرا بس چلے تو میں انگریز کو مارنے کے لئے سوروں سے اتحاد کرنے میں گریز نہ کروں

کیونکہ اس کی زندگی سے اسلامی تہذیب و تمدن اور انسانیت کی موت واقع ہو جائے گی۔ اور اس کی موت سے اسلام اور مسلمان زندہ ہو جائیں گے۔ اسلامی ممالک میں اتحاد بڑھے گا مسلمانوں میں روح جہاد جاگ اٹھے گی۔"

شاہ جی کی انہیں تقریروں کا نتیجہ تھا کہ بالآخر سول نافرمانی کی تحریک میں شمولیت کی تجویز منظور ہو گئی۔ پولیس امروہہ میں بھی ان کے تعاقب میں رہی مگر گرفتار نہ کر سکی۔ یہاں سے وہ الہ آباد پہنچے زور دار تقریر کی اور دوسرے دن آگرہ جا نمودار ہوئے۔ یہاں شام کے بعد تقریر شروع کی تو ایک کونے سے آواز آئی۔

"تم نے اگر حکومت کے خلاف یا کانگریس کے حق میں کوئی بات کہی تو قتل کر دیئے جاؤ گے"

آواز کی طرف نظر اٹھائی تو دیکھا کہ شہر کے بہت سے قصاب ہاتھوں میں چھرے اور کلہاڑیاں اٹھائے غضب آلود انداز میں گھور رہے تھے۔ وہ دیکھتے ہی دیکھتے مجمع کو چیرتے ہوئے ان کے سامنے آکھڑے ہوئے۔ مگر شاہ جی ذرہ برابر خائف نہ ہوئے۔ مخصوص انداز میں قرآن کی تلاوت کرتے اور اس کی تشریح فرماتے رہے تا آنکہ صبح ہو گئی۔ حیرت انگیز طور پر حملہ آوروں کو کوئی گزند پہنچانے کی جرأت نہ ہوئی۔ تقریر ختم ہونے پر سب امیر شریعت کے قدموں پر گر پڑے اور گستاخی کی معافی چاہی۔

انہی ایام میں شاہ جی بمبئی جا نکلے۔ رات کو بندر روڈ پر جلسے کا اہتمام تھا۔ خطبہ مسنونہ کے بعد تقریر کی اور ابھی پہلا فقرہ ادا کر پائے تھے "غلامی سب سے بڑا گناہ ہے۔ اگر اس گناہ سے نکلنا ہے تو اس سے بہتر کوئی موقع نہیں کہ ہم انگریزوں کے خلاف پر امن لڑائی میں شامل ہو جائیں"۔ کہ تیز دھار کا ایک خنجر لہراتا ان کی طرف آیا۔ کوہاٹ کا ایک اکیس سالہ پٹھان نوجوان بچہ نور خان بجلی کی سی تیزی سی آگے بڑھا اور خنجر اپنے سینے پر روک لیا چونکہ یہ زہر میں بجھا ہوا تھا اس لئے نوجوان فوراً ہی دم توڑ گیا (۱) شاہ جی کے خلاف انگریز اور انگریز پرست بڑے ہی اوچھے ہتھکنڈوں پر اتر آئے تھے۔

ہندوستان کے تقریباً ہر ضلع سے ان کے وارنٹ گرفتاری جاری ہو چکے تھے۔ چنانچہ وہ بمبئی سے دشوار راستوں پر چلتے بنگال پہنچ گئے۔ وہاں لوگوں کو انگریزی سامراج کے خلاف منظم اور بیدار کرنے لگے۔ یہاں ۳۰ اگست ۱۹۳۰ء کو دیناج پور میں بالآخر گرفتار کر لئے گئے۔ شاہ جی نے عدالتی کارروائی کا مکمل بائیکاٹ کیا۔ ۲۰ اکتوبر ۱۹۳۰ء کو انہیں چھے ماہ قید بامشقت کی سزا ہوئی۔ قید کا یہ عرصہ ڈمڈم جیل میں گزارا اسی زمانہ اسیری میں ایک واقعہ انہوں نے خود لکھا ہے۔

"ایک شب جیل خانے میں سورۂ یوسف کی تلاوت کر رہا تھا۔ چودھویں رات کا چاند آسمان پر جگمگا رہا تھا۔ مجھے محسوس ہوا وہ قرأت کی تاثیر میں ڈوب کر ٹھہر گیا ہے۔ ایک گھنٹہ اسی تلاوت میں گزر گیا۔ اتنے میں کسی نے پیچھے سے پکارا۔ دیکھا تو سپرنٹنڈنٹ جیل پنڈت رام جی لال تھا جو رو رہا تھا اور رخسار اس کے آنسوؤں سے تر تھے کہنے لگا شاہ جی خدا کے لئے بس کرو میرا دل قابو سے باہر ہو چلا ہے۔ اب مجھ میں رونے کی طاقت

۱۔ شاہ جی فرمایا کرتے کہ بچہ نور خان کی اس قربانی نے مجھے ہلا کر رکھ دیا۔ میں نے اس کی لاش کو ہاتھوں پر اٹھا کر پھر جو تقریر کی وہ تقریر نہیں بھڑکتے ہوئے شعلے اور دہکتے ہوئے انگارے تھے۔ جن سے انگریزی تخت اقتدار جل کر خاکستر ہو رہا تھا۔ (کفیل)

نہیں"۔

اسیری کی اس مدت میں امیر شریعت ایک بنگالی سوشیل کمار سے انگریزی پڑھتے رہے اور اسے قرآن پڑھاتے رہے اور یوں مختصر قید کا یہ زمانہ خوش اسلوبی سے گزر گیا۔ جنوری ۱۹۳۱ء میں جب ایک سمجھوتے کے تحت سارے سیاسی قیدی رہا ہوگئے تو آپ بھی چھوٹے قید خانے سے پھر بڑے قید خانے میں آگئے۔

ستمبر ۱۹۳۱ء میں شاہ جی کو لاہور میں ایک چھوٹا سا معرکہ درپیش ہوا۔ میکلیگن کالج کے انگریز پرنسپل مسٹر ڈیکیر نے بھری کلاس میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر رکیک حملے کئے مسلمان طلبہ نے ہڑتال کر دی۔ اور علامہ اقبال سے ملے جنھوں نے انہیں مجلس احرار کے رہنماؤں سے ملنے کا مشورہ دیا۔ چنانچہ ایک رات موچی دروازے میں لاکھوں مسلمان جمع ہوئے شاہ جی نے رات دس بجے سے دو بجے تک تقریر کی اور پھر اس عظیم الشان اجتماع کو لے کر میکلیگن کالج جا پہنچے حکومت نے بعض رہنماؤں کو گرفتار کر لیا اور خوف وہراس پھیلانے کی کوشش کی مگر شام تک ہتھیار ڈال دیئے۔ پرنسپل نے تحریری معافی مانگی۔ خارج شدہ طلبہ کو کالج میں دوبارہ داخلہ مل گیا۔ اور گرفتار شدگان کو رہا کر دیا گیا۔ یوں شاہ جی کی ایک دن کی مہم سے زبان دراز پرنسپل کا مزاج درست ہوگیا۔ اور کسی تعلیمی ادارے میں اس قسم کی صورت حال کے اعادے کا امکان ختم ہوگیا۔

تحریک کشمیر وہ پہلا محاذ ہے جس پر مجلس احرار اسلام کو بحیثیت جماعت لڑنا پڑا اور اس نے ایثار و جانبازی کی شاندار روایات قائم کیں۔ کشمیر وہ بد نصیب خطہ ہے جو غربت و افلاس کے ساتھ ساتھ بے رحم ڈوگرہ استبداد کے شکنجے میں جکڑا ہوا تھا۔ جس سے اکثریتی مسلمان آبادی کے دینی شعائر تک پر خطرے کی تلوار لٹکتی رہتی تھی۔ ۹ اگست ۱۹۳۱ء کو بھی ایسا ہی حادثہ پیش آیا۔ جموں میں ریاستی پولیس کا ایک سپاہی اپنی بیرک میں بیٹھا قرآن پڑھ رہا تھا کہ ایک ہندو نے قرآن چھین کر زمین پر دے مارا۔ مسلمانوں میں غم وغصے کی لہر دوڑ گئی شیخ عبداللہ سامنے آئے اور اپنی پرجوش تقریروں سے عوام کو گلیوں بازاروں میں لاکھڑا کیا۔ نہتے مسلمانوں پر گولیاں چلیں اور کتنے ہی شہید ہوگئے۔

ظاہر ہے اس صورت حال سے پنجاب کے مسلمان کیسے خاموش رہ سکتے تھے۔ اس ظلم وشقاوت کے خلاف کارروائی پر غور ہونے لگا۔ مگر ستم ظریفی یہ ہوئی کہ جو کشمیر کمیٹی تشکیل دی گئی ایک سازش کے تحت اس کے صدر بشیر الدین محمود اور سیکرٹری عبدالرحمن درد بن بیٹھے۔ دونوں قادیانی تھے نمائش کی خاطر چند مسلمانوں کو بھی ارکان نامزد کیا گیا۔ علامہ اقبال بھی ان میں سے تھے۔

احرار کے رہنماؤں کو اس ڈرامے کا علم ہوا تو علامہ اقبال کو قادیانی سازش سے آگاہ کیا کہ یہ لوگ دراصل فریب سے کشمیری مسلمانوں کو اپنے دام میں پھانسنا چاہتے ہیں۔ اور دوسرے ملکوں کو قادیانی اثر ورسوخ سے آگاہ کرنا چاہتے ہیں۔ چنانچہ علامہ مرحوم و مغفور نے فوراً ہی کشمیر کمیٹی سے استعفیٰ دے دیا۔ کشمیر کمیٹی کا اجلاس ہوا اور اس کی ساری ذمہ داری مجلس احرار کو سونپ دی گئی۔ چنانچہ ۱۸ اگست کو احرار کی مجلس عاملہ نے لاہور کے اجلاس میں تحریک کشمیر کو منظم اور باضابطہ انداز میں چلانے کا فیصلہ کیا۔

اکتوبر ۱۹۳۱ء کے شروع میں احرار کا ایک وفد کشمیر گیا تا کہ مہاراجہ کشمیر سے براہ راست مذاکرات کر کے مسلمانوں کے مسائل و مشکلات کو حل کرایا جائے مگر یہ بیل منڈھے نہ چڑھی اور وفد ناکام لوٹ آیا۔ فطری طور پر شاہ جی نے کشمیری مسلمانوں کی حمایت میں انگریز اور مہاراجہ کے خلاف تقریروں کا سلسلہ تیز کر دیا اور لب و لہجہ بھی ضرورت اور حالات کے مطابق سخت اختیار کر لیا نتیجہ یہ ہوا کہ ۱۵ اکتوبر ۱۹۳۱ء کو شاہ جی دفعہ ۱۲۴ الف (بغاوت) کے تحت گرفتار کر لئے گئے اور ڈیڑھ سال قید بامشقت کی سزا پائی۔

حکومت کے رویئے سے تنگ آ کر نومبر ۱۹۳۱ء میں مجلس احرار نے کشمیری مسلمانوں کی امداد کے لئے ریاست میں رضا کاروں کے دستے بھیجنے شروع کئے۔ رضا کاروں کی یہ ٹولیاں سیالکوٹ سے ریاستی حدود میں داخل ہوتیں۔ تو انہیں گرفتار کر کے ظلم و تعذیب کا نشانہ بنایا جاتا۔ مگر مجاہدین کے حوصلے پست نہ ہوتے اور تقریباً پچاس ہزار مسلمانوں نے گرفتاریاں دیں جن میں احرار کے تمام قائدین بھی شامل تھے اسی تحریک کے نتیجے میں اول اول کشمیر میں بیداری کی لہر پیدا ہوئی ریاستی حکام کے مظالم کی رو تھم گئی اور مسلمانوں کے متعدد بنیادی حقوق بحال کر دیئے گئے۔

شاہ جی نے اسیری کا ابتدائی کچھ عرصہ بورسٹل جیل لاہور میں اور باقی مدت سنٹرل جیل ملتان میں گزاری۔ قید و بند اب ان کی زندگی کا جزو لازم تھی۔ وہ جیل کو بازیچہ اطفال سمجھتے جہاں ان کے قہقہے مزید بلند ہو جاتے اور شگفتگی و خوش طبعی سے اپنے بیگانے نئے حوصلے اور ولولے پاتے۔ ملتان جیل میں ان دنوں مشہور دہشت پسند شیر جنگ بھی مقید تھا اس نے آپ سے قرآن پاک ترجمے کے ساتھ پڑھا۔ ایک دن سوال کیا

"شاہ جی! قرآن میں یہ تو درج ہے کہ مسلمان آزاد رہ کر اس طرح زندگی بسر کریں۔ سارے قرآن میں مسلمان اور غلامی کہیں بھی اکٹھے نہیں ہیں پھر آخر مسلمان جنگ آزادی میں حصہ کیوں نہیں لیتے؟"

یہ بات شاہ جی کے دل میں اتر گئی مدتوں جلسہ ہائے عام میں مسلمانوں سے اس کا جواب پوچھتے پھرے۔

ایک اشتراکی نوجوان نے جو آپ کے ساتھ قید تھا ایک روز پوچھا۔

"شاہ جی آپ نے کبھی نماز ترک نہیں کی۔ نہ کبھی روزہ چھوڑا ہے پھر آپ کا دل عام نمازیوں کی طرح سخت کیوں نہیں؟"

شاہ جی مسکرائے فرمایا "بھائی! جو مذہب انسان کے دل کو گداز نہیں کرتا وہ مذہب نہیں سیاست ہے اور مجھے ایسی سیاست سے کوئی تعلق نہیں"

شاہ جی نے جیل میں مونج کوٹی، بان بٹا، اور گندم پیسی لیکن کوئی سی آزمائش بھی ان کے حوصلے پست نہ کر سکی۔ بے نیازانہ زندگی گزارتے اور کسی سے کوئی مطالبہ نہ کرتے۔ ان مشکلات کو راہ حق کا ضروری توشہ سمجھتے تھے۔

۲۶ اکتوبر کو ملتان جیل سے رہا ہوئے۔ تو ایک نیا معرکہ آپ کا منتظر تھا ہندو مسلم قائدین اور برطانوی

وزیر اعظم ریمزے میکڈانلڈ کے درمیان ایک سمجھوتے کے تحت پورے ملک میں مخلوط انتخابات پر اتفاق رائے ہو گیا تھا لیکن پنجاب اور بنگال کو مسلم اکثریت کے صوبے تسلیم کر لیا گیا۔

اس فیصلے سے سکھ بہت برہم تھے اور ماسٹر تارا سنگھ نے چیلنج دیا "اگر پنجاب میں مسلم راج قائم کرنے کی کوشش کی گئی تو ہم خون کی ندیاں بہا دیں گے۔ یہی نہیں سکھوں کے دوسرے چھوٹے لیڈر بھی اشتعال پھیلانے لگے۔ شاہ جی جیل سے باہر آئے رنگ دیکھا تو سکھوں کے مرکز امرتسر میں ایک جلسہ عام کا اعلان کر دیا مقررہ تاریخ پر پنجاب کے دور دراز شہروں سے بھی مسلمان آئے۔ لاکھوں کے اس مجمع میں شاہ جی نے للکار۔

"غیرت حیران ہو کر مسلمان نوجوانوں کا منہ تک رہی ہے کہ یہی اس قوم کے فرزند ہیں جن کو انگلیوں پر گنے جانے والی قوم خون کی دھمکیاں دے رہی ہے۔ جس قوم نے دجلہ و فرات کو اپنے پاؤں تلے روند ڈالا اور تلواروں کے سائے تلے کھڑے ہو کر موت کو زندگی کی دعوت دی۔

بے خبر مسلمان نوجوانو! ہوش سنبھالو اور عقل کے ناخن لو سکھوں سے کہہ دو ہمیں اپنے پایاب ندیوں سے نہ ڈرائیں ہم تو خون کے بحر بے کراں میں گھوڑے دوڑانے کے عادی ہیں۔ سکھ صاحبان کو میرا مشورہ ہے کہ وہ سوچ سمجھ کر بات کریں۔ جس ہندو قوم کے سہارے وہ یہ دھمکیاں دے رہے ہیں وہ نو سو سال تک ہمارے پاؤں تلے رہی ہے"۔

امیر شریعت نے اسی لب و لہجہ میں کئی دوسرے مقامات پر بھی تقریریں کیں نتیجہ یہ ہوا کہ سکھ پسپا ہو گئے گوردوارہ پربندھک کمیٹی لاہور کے ایک سرکردہ رکن نے وضاحت کی۔

"مسلمان دوستوں نے ہماری بات کا غلط مفہوم لیا ہے ہمارا جھگڑا تو صرف حکومت اور کانگریس سے ہے مسلمانوں سے ہماری کوئی لڑائی نہیں سکھ اپنے حقوق کے لئے صرف حکومت برطانیہ سے ٹکرائیں گے"

مئی ۱۹۳۳ء میں شاہ جی شجاع آباد میں تھے جب سید ولایت شاہ نامی ایک شخص نے آپ کو زہر والا پان کھلا دیا۔ بروقت پتہ چل جانے پر آپ نے پان تھوک دیا مگر زہر کے اثر سے چہرہ سیاہ اور حالت غیر ہو گئی تین دن کے مسلسل علاج سے آپ کی حالت سنبھل گئی ملزم گرفتار ہوا مگر شاہ جی نے اسے معاف کر دیا اور پولیس سے بھی سفارش کر کے اس کی جان بخشی کرا دی ان پر یہ تیسرا قاتلانہ حملہ تھا۔

انہیں ایام میں میرپور (کشمیر) کی انجمن اصلاح المسلمین نے سالانہ اجلاس میں شاہ جی کو مدعو کیا۔ آپ نے دعوت قبول کر لی مگر ریاستی اور برطانوی حکام نے کشمیر میں آپ کا داخلہ بند کر دیا اور اس ضمن میں سخت احکامات جاری کئے۔ شاہ جی نے بھیس بدلا، نیم آستین کے لمبے کرتے، ٹخنوں سے اونچے پاجامے قمیض پر نیم آستین کی واسکٹ پہنی، سر پر گول ٹوپی کی بجائے کھدر کی پگڑی باندھی اور خالص دیہاتی بہروپ میں کشمیر جا پہنچے اور نصف شب کے قریب انجمن کے آخری اجلاس میں جب کہ صدر جلسہ مختلف سرکاری پابندیوں کے باعث امیر شریعت کے تشریف نہ لانے پر معذرت کر رہے تھے شاہ جی اسٹیج پر نمودار ہوئے وہ پگڑی اتار کر لوگوں کے سامنے کھڑے ہو گئے سامعین حیرت و مسرت سے پاگل ہو گئے انہوں نے صبح چار بجے تک تقریر کی۔ کشمیریوں کے سینوں میں آزادی اور غیرت کی آگ بھر دی میرپور کے اکثر دیہات میں بغاوت کی

صورت پیدا ہوگئی بہت سی سرکاری املاک عمارات کو آگ لگادی گئی۔ پنجاب پولیس اور ریاستی انتظامیہ کے کئی افسر معطل ہوگئے۔

قادیانیوں کے بارے میں شاہ جی کے جو نظریات تھے ان کا مختصراً ذکر ہوچکا ہے۔ وہ خلوص اور سنجیدگی سے ان کی بیخ کنی چاہتے تھے مگر دوسری بہت سی مصروفیات اس جانب بھرپور توجہ دینے میں مانع تھیں۔ حالانکہ یہ بات بڑی تشویش ناک تھی کہ قادیانیوں نے قادیان کے قصبے میں حکومتی طرز پر اپنا نظام قائم کر رکھا تھا اور عملاً وہاں قادیانیوں کے خلیفہ مرزا بشیر الدین محمود کی حکومت تھی۔ قادیان میں غیر قادیانی خصوصاً مسلمان سخت خوف و ہراس کی فضا میں رہتے تھے اور کسی کو قادیانی احکامات کے سامنے دم مارنے کی مجال نہ تھی چنانچہ ۱۹۲۸ء میں جب مشہور قادیانی مبلغ عبدالکریم مباہلہ نے قادیانیت سے تائب ہو کر اسلام قبول کرلیا تو انہیں اہل و عیال سمیت سخت اذیتیں دی گئیں۔ ان کا مکان اور املاک جلادی گئیں۔ مجبوراً اس خاندان کو ہجرت کر کے بٹالہ میں پناہ لینی پڑی۔

قادیانی عزائم کو ناکام بنانے کے لئے مجلس احرار نے ۱۹۳۳ء میں قادیان میں اپنا دفتر قائم کرنے کا فیصلہ کیا مگر اس مقصد کے لئے کوئی مکان دینے کو تیار نہ تھا نہ مقامی افراد میں سے کارکن دستیاب تھے بالآخر مولانا عبدالکریم مباہلہ کے نیم سوختہ مکان میں دفتر قائم کیا گیا اور دو رضا کاروں کو وہاں متعین کیا گیا لیکن قادیانیوں نے ان کی خوب پٹائی کی اور رہا سہا مکان اور دفتر کا سامان بھی جلا کے راکھ کردیا۔

ان حالات میں مجلس احرار نے قادیان میں ایک تین روزہ کانفرنس منعقد کرنے کا فیصلہ کیا اور ۲۱، ۲۲، ۲۳ اکتوبر ۱۹۳۴ء کی تاریخیں مقرر کیں کانفرنس کے لئے ایک سکھ زمیندار کی زمین حاصل کی گئی مگر قادیانیوں نے اس پر قبضہ کرلیا چنانچہ قادیان سے ایک میل کے فاصلے پر ایک اسکول کے پہلو میں پنڈال بنایا گیا۔

اس کانفرنس میں احرار کے ساتھ ساتھ ہر مکتب فکر کے علماء اور عوام نے شرکت کی کوئی پچاس ہزار کا ہجوم تھا شاہ جی نے ۲۱ اکتوبر کو رات کے ساڑھے دس بجے تقریر شروع کی۔ بے مثال مقرر کی شعلہ بیانی بڑھتی چلی گئی۔ انہیں نعروں، قہقہوں اور آنسوؤں کا خراج ملتا رہا۔ یہ تقریر جاری رہی حتیٰ کہ صبح کی اذانیں ہوگئیں۔ اس تقریر میں شاہ جی نے بشیر الدین محمود کو مخاطب کر کے یہ جملے کہے۔

"تم اپنے بابا کی نبوت لے کر آؤ اور میں اپنے نانا کی نبوت لے کر آتا ہوں تم حریر و پرنیاں زیب تن کر کے آؤ اور میں اپنے نانا کی سنت کے مطابق کھدر پہن کر آؤں تم مرغ کباب کھا کر اور اپنے ابا کی سنت کے مطابق پلومر کی ٹانک وائین پی کر اور میں جو کی روکھی سوکھی کھا کر آؤں، پھر زمانہ فیصلہ کرے کہ کون سچے نبی کی اولاد ہے"

اس کانفرنس کا نتیجہ یہ ہوا کہ قادیان میں مسلمانوں کو بے سروسامانی کا احساس نہ رہا اور قادیانیوں نے ظلم و ستم کا راستہ ترک کردیا۔ اسی کانفرنس سے عوام اور پڑھے لکھے طبقے پر قادیانیوں کی صحیح صورت اور اصل عزائم آشکارا ہوئے۔ اور مختلف مصنفین نے اس فرقے کا شرح و بسط سے جائزہ لیا۔

قادیان کانفرنس سے فارغ ہوئے ہی تھے کہ اہلیہ بیمار پڑ گئیں اور ایک روز انہوں نے خون کی قے کی۔

ڈاکٹروں نے ٹی بی تشخیص کی اور کوہ مسوری جانے کا مشورہ دیا۔ حالات اور مالی وسائل اگرچہ اس کی اجازت نہ دیتے تھے۔ تاہم مجبوراً پہنچے اور چند ہفتے سکون سے گزرے تھے کہ دسمبر ۱۹۳۴ء میں قادیان کانفرنس کی تقریر کی بنیاد پر مسوری میں گرفتار کر لئے گئے تاہم دوسرے دن ڈیرہ دون میں ضمانت پر رہا ہو گئے۔

اس مقدمے کی حاضری کے لئے شاہ جی کو وقتاً فوقتاً گورداسپور جانا پڑتا تھا کارروائی کے روز دور نزدیک سے ہزاروں افراد جمع ہو جاتے اور خاص عقیدت کا اظہار کرتے۔ مقدمہ ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کی عدالت میں چار ماہ تک چلتا رہا حتیٰ کہ ۲۰ اپریل ۱۹۳۵ء کو انہیں چھ ماہ قید بامشقت کی سزا دی گئی۔ سیشن جج گورداسپور جی ڈی کھوسلہ نے اپیل منظور کر لی اور سزا میں تخفیف کر کے اسے تااختتام عدالت کی قید محض میں بدل دیا جی ڈی کھوسلہ کے فیصلے میں پہلی مرتبہ قادیانیت کو نقد و جرح کا ہدف بنایا گیا۔

اب مجلس احرار اسلام کو پنجاب کی سیاست میں کلیدی حیثیت حاصل ہو گئی تھی۔ صوبائی انتخابات کا زمانہ قریب آرہا تھا۔ لیکن اس دوران ایک ایسا واقعہ پیش آیا جس سے احرار کو سیاسی طور پر انتہائی صدمہ اٹھانا پڑا۔ بعض سیاسی حلقوں کے خیال میں یہ واقعہ دراصل ایک سازش کا نتیجہ تھا جو بعض افراد نے احرار کے خلاف ترتیب دی۔ لیکن اس واقعے کے اسباب اور محرکات پر یہاں بحث کرنا ہمارے مضمون کا موضوع نہیں۔ الزام لگایا جاتا ہے کہ ایک سرکار پرست نے پنجاب کے گورنر ایمرسن (جس نے اپنی ڈپٹی کمشنری کے دوران ملتان میں سنی شیعہ فساد کرایا تھا) اور قادیانیوں سے گٹھ جوڑ کیا اور گوردوارہ شہید گنج میں ملحق ایک مسجد کو مسمار کرا دیا یہ مسجد ایک عرصے سے سکھوں کے قبضے میں تھی۔ اور وہ اسے مسجد تسلیم کرنے پر تیار ہی نہ تھے مسجد گرائی گئی تو مسلمانوں میں اشتعال پیدا ہوا اور فطری طور پر ان کی نظریں احرار کی جانب اٹھیں مگر احرار کے رہنما لاہور سے باہر تھے۔ دوسرے ان کا موقف یہ تھا جیسا کہ شاہ جی نے شاہی مسجد میں دوران خطاب واضح کیا کہ اس معاملے میں انگریزوں اور سکھوں سے خونریز تصادم ناگزیر ہے جو اس وقت مناسب نہ سمجھا گیا۔ مخالفین کی کوشش تھی کہ احرار راستے سے ہٹ جائیں۔ حصہ لیں تو مارے جائیں، نہ لیں تو لوگوں کی نظروں سے گر جائیں چنانچہ یہ المناک منظر سامنے آیا کہ کئی انگریز پرست اور ٹوڈی مسلمان سیاست دانوں اور صحافیوں نے توپوں کے سارے دہانے سکھوں یا انگریزوں کی بجائے احرار کی جانب کھول دیئے اور جذبات کی شدید گولہ باری کر دی نتیجتہً انتخابات میں احرار کا کوئی نمائندہ کامیاب نہ ہو سکا۔

شاہ جی نے شہید گنج کے قضیے کی وضاحت کے لئے ایک طویل سفر کیا اور یو۔ پی جا پہنچے لکھنؤ میں دوران تقریر اصحاب رسول ﷺ کا ذکر آیا اور انہوں نے رضی اللہ عنہ کہا تو کسی نے بلند آواز سے پکارا۔ "شاہ جی! یہاں صحابہؓ کے نام کے ساتھ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہنا جرم ہے"۔

شاہ جی یہ سن کر ششدر رہ گئے مجمع سے تصدیق کی تو پتہ چلا کہ انگریز نے لکھنؤ میں قانون نافذ کر رکھا ہے جس کی رو سے صحابہؓ اور خصوصاً ابوبکر، عمر اور عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہم کی تعریف کرنا جرم ہے اور اس کی سزا دو سال قید بامشقت ہے شاہ جی یہ سن کر جلال میں آگئے اور صحابہؓ کی بار بار تعریف کر کے رضی اللہ عنہم کی تکرار

کرنے لگے۔ شاہ جی کو حیرت اس بات پر تھی کہ لکھنؤ میں مدح صحابہؓ قانوناً جرم ہے چنانچہ اسی تقریر میں پورے زور سے کہا۔

"گالیاں بکنا تو جرم ہو سکتا ہے مگر کسی کی تعریف کرنا کیونکر جرم قرار دیا جا سکتا ہے حکومت نے قمار بازی، شراب نوشی اور عصمت فروشی پر کوئی پابندی عائد نہیں کی لیکن خلفائے راشدینؓ کی تعریف پر پابندی عائد ہے حکومت کو چاہیئے کہ وہ اپنی پوزیشن پر غور کرے"۔

مزید فرمایا

"میرا روئے سخن حکومت کی جانب ہے شاید کل کو کچھ اور سمجھ لیا جائے اس لئے کان کھول کر سن لو میں تمام یوپی کو ایک مرکز پر جمع کر دوں گا اور اس قانون کو آئینی جدوجہد سے ختم کرا کے دم لوں گا اور اگر اس طرح کامیابی نہ ہوئی تو پھر میں بے آئینی بھی کر سکتا ہوں"۔

لیکن جب حکومت نے اس انتباہ کا کوئی نوٹس نہ لیا تو شاہ جی اور ان کے ساتھی متعدد مرتبہ لکھنؤ گئے تحریک مدحِ صحابہ چلائی۔ اور ایک مرتبہ پچیس ہزار مسلمانوں نے گرفتاری دی جس کے بعد بالآخر جولائی ۳۷ء میں اس قانون کو منسوخ کیا گیا۔

۶ دسمبر ۱۹۳۵ء کو شاہ جی مرزا بشیر الدین محمود کے اعلانِ مباہلہ کے بعد جماعتی فیصلہ کی بناء پر قادیان جا رہے تھے کہ راستے میں گرفتار کر لئے گئے۔ اور ایک ریلوے مجسٹریٹ نے انہیں تین ماہ قید بامشقت اور ایک سو روپے جرمانہ اور عدم ادائیگی جرمانہ کی صورت میں مزید ایک ماہ قید بامشقت کی سزا سنا کر گورداسپور جیل میں بھیج دیا جہاں سے ایک ہفتے کے بعد سنٹرل جیل لاہور میں منتقل ہو گئے ۱۵ اپریل ۱۹۳۶ء کو رہائی ملی۔

شاہ جی رہا ہوئے تو ملک میں انتخابات کی تیاریاں زوروں پر تھیں۔ اور تمام جماعتیں اپنے اپنے منشور لے کر میدان میں آ گئی تھیں۔ شاہ جی انتخابات میں حصہ لینے کے حق میں نہیں تھے کہتے تھے اس میں بھی انگریز کی کوئی چال ہے اور دلیل میں یہ شعر پڑھتے تھے۔

مجھ تک کب ان کی بزم میں آتا تھا دورِ جام
ساقی نے کچھ ملا نہ دیا ہو شراب میں!

مگر احباب کے اصرار کے سامنے خاموش ہو گئے۔ انتخابی سرگرمیاں پورے عروج پر تھیں کہ خبر ملی راولپنڈی میں جامع مسجد کے عین عقب میں گوردوارہ پر بندھک کمیٹی نے سینما ہال کی تعمیر شروع کر رکھی ہے اور مسلمانوں کا احتجاج و واویلا بے کار ثابت ہوا ہے۔ انتہائی مصروفیات کے باوجود راولپنڈی کے مسلمانوں کی دعوت پر وہاں تشریف لے گئے انہوں نے شہر کے ہندو سکھ اور مسلمان معززین اور مقامی حکام کو جن میں ڈپٹی سی بھی شامل تھا جامع مسجد بلایا اور وہاں مذہبی مقامات کے تقدس پر دلسوزی سے تقریر کرنے کے بعد اپیل کی کہ سکھ مسجد سے متصل سینما تعمیر نہ کریں سکھ رہنماؤں نے تقریر سے متاثر ہو کر وعدہ کر لیا کہ سینما ہال کی تعمیر روک دی جائے گی۔

یہ اجتماع رات کو ہوا صبح ہوئی تو سکھ عوام نے اس فیصلے کو قبول کرنے سے انکار کر دیا اور سینما کی تعمیر جاری رکھنے کا اعلان کیا۔ اس پر حالات بے حد کشیدہ ہو گئے دوسرے دن شاہ جی نے پھر سکھوں اور شہری حکام کو وارننگ دی لیکن جب کوئی مثبت اثر نہ ہوا تو رات کو جلسے کا اعلان کر دیا اور زندگی کی مختصر ترین تقریر کی فرمایا۔

"عزیزو! ہماری کسی سے لڑائی نہیں اگر کوئی قوم اپنی ضد پر اتر آئے تو ہمیں خوف نہیں کھانا چاہیئے۔ لہذا ایسا کام کرو کہ سانپ بھی مر جائے اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے میرے ساتھ وعدہ کرو جو کچھ کہوں گا وہی کچھ کرو گے"

سارے مجمع نے ہاتھ اٹھا دیئے۔ شاہ جی بولے۔

"دیکھو جو میں کہوں وہی کرنا ہو گا۔ اگر کسی نازیبا حرکت کی شکایت آئی تو میں ناراض ہو کر چلا جاؤں گا"۔

ہجوم نے وعدہ کیا کہ وہ نصیحت کی پابندی کریں گے تو فرمایا۔

"عزیزان من! یا تو مسجد نہ رہے اور یا سینما نہ بنے۔ میں نے مقدور بھر کوشش کی اور شہر کے ذمہ دار حکام گواہ ہیں کہ سکھ رہنما اپنے وعدے کا پاس کریں گے۔ خیر اب تم اپنا کام کرو یا مسجد کے قریب سینما نہ ہو یا سینما کے قریب مسجد نہ ہو بس۔ لیکن یہ میری درخواست ہے کہ اینٹوں کے سوا کسی بھی انسان پر ہاتھ نہ اٹھیں"۔

یہ سنتے ہی لوگ سینما کی طرف بھاگ اٹھے۔ صبح ہوئی تو وہاں سینما تو کجا کسی اینٹ کا نام و نشان نہ تھا یوں لگتا تھا جنّوں نے سارے ملبے کو اٹھا کر غائب کر دیا ہے۔ دلچسپ امر یہ ہے کہ پولیس بھی پاس ہی کھڑی تھی سکھ نوجوان بھی بپھرے ہوئے تھے مگر مسلمان کے جوش ایمانی کے سامنے سب لرزہ براندام ہو کر رہ گئے اقبال نے شاید ایسے ہی موقع کے لیے کہا تھا

کچھ ہاتھ نہیں آتا بے جرأت رندانہ

۱۹۳۹ء کے وسط میں جب یورپ میں جنگ کے امکانات واضح ہوتے جا رہے تھے۔ اور اس کے پیش نظر اسمبلی میں آرمی بل زیر بحث تھا کہ مجلس احرار نے انگریزی استعمار پر بھرپور ضرب لگانے کا فیصلہ کر لیا اور بمبئی سے لے کر پشاور تک فوج میں بھرتی کے خلاف تحریک چلا دی جونہی ۳ ستمبر ۱۹۳۹ء کو دوسری جنگ عظیم کا آغاز ہوا احرار کی ورکنگ کمیٹی نے ہندوستان کی آزادی اور افریقہ و ایشیاء سے انگریزوں کے انخلاء کا مطالبہ کر دیا اور فوجی بھرتی کی مخالفت اور عدم تعاون کا برملا اعلان بھی کر دیا نتیجہ یہ ہوا کہ احرار کے تمام قائدین گرفتار کر لئے گئے شاہ جی کے خلاف ۱۲۴ الف، ۱۲۱ الف اور ۳۰۲/۱۱۷ کے مقدمات دائر کئے گئے۔ اور ہندوستان بھر میں احرار کے آٹھ ہزار فعال کارکن حوالۂ زنداں کر دیئے گئے۔

شاہ جی جیل ہی میں تھے جب ۲۳ مارچ ۱۹۴۰ء کو لاہور میں قرارداد پاکستان منظور ہوئی۔ افسوس کہ رہا ہو کر وہ اس تحریک کی حمایت نہ کر سکے۔

قیام پاکستان کے بعد شاہ جی سیاست سے کنارہ کش ہو گئے انہوں نے احرار کو مشورہ دیا کہ وہ ہر نیک کام میں مسلم لیگ کی حکومت سے تعاون کریں اور حکومت کی جن پالیسیوں سے دین کو نقصان پہنچے اس کی بھرپور مزاحمت و مخالفت کریں۔ وہ امرتسر سے ہجرت کر کے پہلے لاہور آئے۔ وہاں سے نوابزادہ نصر اللہ خاں کے گاؤں خان گڑھ (مظفر گڑھ) گئے اور تھوڑے ہی دن قیام فرمایا تھا کہ سیلاب آ گیا اور مکان بہہ گیا۔ چند معتقدین کے اصرار پر ملتان میں مستقل مقیم ہو گئے۔ وہ امرتسر میں دو مکان چھوڑ آئے تھے مگر پاکستان میں کوئی کلیم نہ دیا احباب کوشش کرتے رہے کہ ملتان میں کوئی مکان الاٹ ہو جائے مگر شاہ جی کا کہنا تھا کہ میں نے کبھی فدوی بن کر کہیں درخواست نہیں دی اور اب بھی میرے لئے ناممکن ہے کہ کلیم داخل کروں۔ بالآخر محلہ ٹبی شیر خان میں ایک چھوٹا سا کچا مکان بارہ روپے ماہوار کرائے پر لیا گیا اور شاہ جی نے وفات تک بقیہ زندگی اسی کٹیا نما مکان میں گزار دی۔ اردو زبان کا سب سے بڑا خطیب، امت مسلمہ کے لئے جسم و جاں کی تمام تر توانائیاں وقف کر دینے والا مجاہد اور انگریزی ایوانوں میں زلزلے برپا کر دینے والا عظیم قائد اس ملک میں بے خانماں خرابی کی حالت میں زندگی بسر کرتا رہا اور اسے سر چھپانے کے لئے کوئی ڈھنگ کا مکان بھی میسر نہ آیا۔

ملتان میں شاہ جی کی اقامت کا ذکر ہوتا تو وہ ایک واقعہ تفنن اور سنجیدگی کے ملے جلے تاثر سے سنایا کرتے۔ فرمایا کرتے کہ ۱۹۳۴ء کے اواخر میں معراج النبی ﷺ کی ایک تقریب میں انہیں ملتان بلایا گیا۔ باغ لانگے خان میں حاضری بے پناہ تھی اور رات کے سناٹے میں سامعین بت بنے محویت کے عالم میں بیٹھے تھے کہ اچانک ایک مجذوب قسم کا آدمی اٹھا اور دونوں ہاتھ آسمان کی طرف اٹھا کر ملتانی میں کہنے لگا۔ "شاہ! اللہ تیڈا اتھاں مزار بڑانوے" (یعنی خدا آپ کا مزار یہیں بنائے) چنانچہ حیرت انگیز طور پر شاہ جی قیام پاکستان سے عمر کے آخری سانسوں تک ملتان میں رہے اور بالآخر اسی سرزمین میں دفن ہوئے۔ ورنہ لاہور میں ان کے قریبی احباب اور عقیدت مندوں کی کمی نہ تھی اور انہوں نے وہاں مقیم ہونے پر اصرار بھی کیا تھا۔ فیصل آباد کے احباب نے بہت تقاضا کیا کہ شاہ جی وہاں منتقل ہو جائیں اور گوجرانوالہ میں تو مکان بھی پسند کر لیا گیا مگر وہ ملتان کے ہو کر رہ گئے اور کسی دوسری جگہ جانا پسند نہ کیا۔

اگرچہ شاہ جی سیاست سے کنارہ کشی کا عہد کر چکے تھے مگر پاکستان میں اسلامی تقاضوں سے اغماض، خصوصاً قادیانیوں کے روز افزوں اثر و رسوخ پر وہ بہت پریشان تھے۔ پاکستان کا پہلا وزیر خارجہ ایک قادیانی (سر ظفر اللہ خاں) نامزد کیا گیا۔ تو وہ خون کے گھونٹ پی کر رہ گئے۔ اس سے بھی آگے بڑھ کر قادیانیوں نے پاکستان پر قبضہ کرنے کی سازشیں شروع کر دیں۔ اور ابتدائی اقدام کے طور پر بلوچستان کو قادیانی اکثریت کے صوبے میں تبدیل کرنے کے منصوبے بنانے لگے۔ ربوہ کا قادیانی خلیفہ برملا اس قسم کے بیان دینے لگا۔

"۱۹۵۲ء کو گزرنے نہ دیجئے جب تک احمدیت کا رعب دشمن اس رنگ میں محسوس نہ کرے کہ اب احمدیت مٹائی نہیں جا سکتی اور وہ مجبور ہو کر احمدیت کی آغوش میں آ گرے" (الفضل ۱۶ جنوری ۱۹۵۲)

"وقت آنے والا ہے جب یہ لوگ (مخالفین) مجرموں کی حیثیت میں ہمارے سامنے پیش ہوں گے"۔

"میں جانتا ہوں اب بلوچستان ہمارے ہاتھوں سے نکل نہیں سکتا۔ یہ ہماری شکار گاہ ہوگا۔ دنیا کی ساری قومیں مل کر بھی ہم سے یہ علاقہ چھین نہیں سکتیں"۔

شاہ جی نے اپنا فرض سمجھا کہ جس فتنے کی وہ عمر بھر سرکوبی کرتے رہے ہیں وہ اب ایک مسلم ریاست میں برگ و بار نہ لاسکے۔ یہی وہ اضطراب تھا جو ۱۹۵۳ء کی تحریک ختم نبوت کا پیش خیمہ بنا۔ انہیں کی ہدایت پر لاہور میں ۱۳ جولائی ۱۹۵۲ء کو کل جماعتی کانفرنس طلب کی گئی جس میں ہر مکتب فکر نے شرکت کی اور مندرجہ ذیل مطالبات پر مبنی قرار داد منظور کی گئی۔

۱۔ مرزائیوں کو مسلمانوں سے الگ اقلیت قرار دیا جائے۔

۲۔ چودھری سر ظفر اللہ کو وزارت خارجہ سے سبکدوش کیا جائے۔

۳۔ مرزائی افسروں کو کلیدی اسامیوں سے الگ کیا جائے۔

۴۔ ربوہ کی بقیہ اراضی پر مہاجرین کو آباد کیا جائے۔

لیکن افسوس کہ مطالبات پر ہمدردانہ غور کرنے کی بجائے متعدد رہنما گرفتار کر لئے گئے ملتان میں ایک جلوس پر وحشیانہ فائرنگ ہوئی جس سے چھ آدمی شہید اور دس زخمی ہوئے۔

مختصراً یہ کہ جب کراچی میں راست اقدام کا فیصلہ کیا گیا تو ۲۶ فروری ۱۹۵۳ء کی رات کو شاہ جی اور ان کے رفقاء گرفتار کر لئے گئے اور پنجاب کے تمام شہروں میں احرار کے رہنما اور کارکن پکڑ لئے گئے۔ ہزاروں نوجوان شہید اور بے شمار زخمی ہوئے۔ لاہور میں مارشل لگا دیا گیا۔ شاہ جی اور ان کے رفقاء کو پہلے کراچی اور پھر سکھر جیل میں رکھا گیا۔ یہاں ان کے لئے طرح طرح کی پریشانیاں پیدا کی گئیں۔ جس سے ان کی صحت تباہ ہو کر رہ گئی۔ گرفتاری کے خلاف رٹ دائر کی گئی تو جسٹس ایس اے رحمٰن نے انہیں ۸ فروری ۱۹۵۴ء کو رہا کر دیا۔ اس وقت وہ سنٹرل جیل لاہور میں تھے۔

اگرچہ شاہ جی کا دل ٹوٹ گیا تھا تاہم رہائی کے بعد انہوں نے مسلسل دورے کئے اور عوام کو مسئلہ ختم نبوت کی اہمیت اور پاکستان میں قادیانی عزائم سے آگاہ کرتے رہے۔ جس سے گھبرا کر انہیں ۱۹۵۵ء میں چھ ماہ کے لئے گھر میں نظر بند کیا گیا۔ پھر ۱۴ اپریل ۵۶ء کو گرفتار ہوئے اور چھ ماہ تک مقدمہ چلتا رہا۔ ڈاکٹر خاں صاحب وزیر اعلیٰ بنے تو انہوں نے سارے الزامات واپس لے لئے۔

۱۶ نومبر ۱۹۵۴ء کی بات ہے شاہ جی گھر میں وضو کر رہے تھے کہ جسم کے دائیں جانب فالج کا ہلکا سا حملہ ہوا۔ مگر اس کا اثر جلد ہی زائل ہو گیا۔ اواخر ۱۹۵۶ء میں جسمانی عوارض یکایک عود کر آئے اور پھر ایسے گرے کہ چار برس تک چارپائی سے لگے رہے کبھی برائے نام صحت ہو جاتی۔ ۱۶ مارچ ۱۹۶۱ء کو فالج کا شدید حملہ ہوا اور ۲۱ اگست ۱۹۶۱ء کی شام کو یہ نابغۂ روزگار اور تحریک ختم نبوت کا سپہ سالار اعظم کلمہ طیبہ کا ورد کرتا ہوا خالق حقیقی سے جا ملا تقریباً دو لاکھ انسان جنازے کے جلوس میں شریک ہوئے جو ایک میل لمبا تھا۔ بڑے فرزند سید ابوذر بخاری نے نماز جنازہ پڑھائی اور انسانی عظمتوں اور شرافتوں کا یہ پیکر باغ لانگے خاں کے نزدیک جلال

باقری کے مشہور قبرستان میں ابدی نیند سو گیا

اناَ للہ وَ اناَ الیہِ رَاجِعُون

شاہ جی کے نو بچے تھے چار لڑکے اور پانچ لڑکیاں۔ چار لڑکیاں بچپن میں وفات پا گئیں باقی بچوں کی تربیت مثالی اسلامی طریقے سے کی چاروں بیٹے حافظ قرآن اور عربی و دینیات کے عالم بنے۔ بچی کی بھی ایسی ہی تربیت کی۔ انگریزی زبان سے سخت الرجک تھے۔ اس لئے کسی بچے کو جدید تعلیم نہ دی۔ کہتے تھے اس سے بہتر ہے میں انہیں زندہ دفنا دوں۔

شاہ جی مسلکاً حنفی تھے لیکن تنگ نظری انہیں چھو کر بھی نہیں گزری تھی۔ بعض ہم عصر علماء کی مانند کسی جماعت یا عالم کے خلاف محاذ بنایا نہ مخالفت برائے مخالفت کو بنیاد بنا کر کسی کی کردار کشی کی۔ بلکہ اختلاف کے باوجود دوسروں کی خوبیوں کا کھلے دل سے اعتراف کرتے البتہ ایسے اصحاب کو خواہ وہ بظاہر رشد و قیادت کے کسی بھی درجے پر فائز ہوں ہرگز معاف نہ کرتے جو انگریز دوست ہوتے تھے یا پھر وہ ایسے آثار و مظاہر گوارا نہ کرتے جن سے شرک فی التوحید یا شرک فی النبوۃ کا پہلو نکلتا تھا۔

وہ روایتی طور پر صوفی نہ تھے۔ لیکن شیخ کی صحبت ضروری سمجھتے تھے۔ یہی سبب تھا کہ انہوں نے پہلے حضرت پیر مہر علی شاہ صاحب آف گولڑہ اور ان کی رحلت کے بعد حضرت عبدالقادر رائے پوری کے ہاتھ پر بیعت کی اور دونوں مرشد اپنے مرید پر فخر کرتے تھے۔ وہ حقیقتاً ایک سیدھے سادے راسخ العقیدہ مسلمان تھے۔ ان کے ہاں مذہب کی رعونت اور دین کا آزار بالکل نہ تھے۔ اہل اللہ کے سوا کسی سے مرعوب نہ ہوتے۔ قدرت سے بے نیاز طبیعت لے کر پیدا ہوئے تھے اور آخری سانس تک اس پر قائم رہے کوئی شخص اپنے اقتدار یا وجاہت کے بل پر ان سے کوئی مطالبہ نہیں کر سکتا تھا۔

شاہ جی نے صحیح معنوں میں درویشانہ زندگی گزاری تمام عمر موٹا جھوٹا پہنا۔ کھدر کبھی ترک نہ کیا۔ پہلے شلوار کرتا پہنتے۔ پھر تہہ بند باندھنے لگے خوراک سادہ کھاتے۔ محلوں اور جھونپڑوں میں مہمان ہوتے لیکن کسی چیز سے رغبت نہ رکھی جو دال بھات ملا کھا لیا۔ چائے البتہ اہتمام سے پیتے۔

اپنے دوستوں سے بڑی محبت تھی کبھی کسی کی غیبت نہ کی۔ دوستوں میں ہر مسلک کے لوگ شامل تھے۔ لیکن سب سے یک گونہ تعلق قائم تھا۔ برصغیر کے ہر سیاسی و مذہبی رہنما سے ان کے مراسم تھے۔ ہر ایک کے بارے میں دو ٹوک رائے رکھتے تھے۔ اگر کسی کے خلاف رائے قائم ہو گئی تو اس میں کینہ یا بغض ہرگز شامل نہ ہوتا۔ نہ کسی سے ذاتی بنیادوں پر انتقام لینے کی فکر کرتے۔

شاہ جی نے چالیس سالہ بھرپور سیاسی زندگی کے نو سال جیلوں میں گزار دیئے۔ مگر شگفتہ مزاجی اور خوش طبعی سے کبھی کنارہ کش نہ ہوئے۔ یبوست اور خشکی سے انہیں چڑ تھی لطیفہ گوئی اور برجستہ کلامی میں اتنے مشاق تھے کہ سارے برصغیر میں ان کی ٹکر کا ایک آدمی بھی نہ تھا۔ عربی، فارسی، اردو، پنجابی کے ہزاروں شعر، مقولے، حکایات اور لطائف نوک زباں پر تھے اور کارکن ان کی محفلوں میں بیٹھ کر ہر قسم کے غم بھول جایا

کرتے تھے۔ لیکن قرآن وحدیث اور سنت نبوی کا دامن کبھی ہاتھ سے نہ چھوٹا۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات اور صفات سے غایت درجے کی محبت تھی اور اسی محبت نے انہیں فارسی زبان کا بہت اچھا نعت گو بنا دیا تھا۔ وہ سنت نبوی ﷺ کا چلتا پھرتا، جیتا جاگتا نمونہ تھے۔ بہت ہمدرد ہمسائے، بہت مخلص دوست، ایثار پیشہ قائد اور صحیح معنوں میں مسلمان باپ تھے۔ ایسے لوگ صدیوں کے بعد پیدا ہوتے ہیں اور صدیوں تک فراموش نہیں ہوتے۔

نبوّت کے گواہ

صحابہ کو برا مت کہو۔ صحابہ کرام مقدمۂ نبوت کی مثل ہیں اور یہ تم جانتے ہو کہ جس مقدمے کی مثل ہی غلط ہو اور گواہ جھوٹے ہوں وہ مقدمہ خارج کر دیا جاتا ہے۔ اگر صحابہ کرام پر عدمِ اعتماد کیا گیا تو یاد رکھو! یہ نبوت پر عدم اعتماد ہو گا۔ اور صحابہ کی تغلیط نبوت کی نفی ہے۔ تمام عقائد موقوف ہیں۔ صحابہ کرام کی عدالت پر۔ خدانخواستہ اگر یہی جھوٹے ہیں تو حضور کی ختم المرسلین معرضِ خطر میں پڑ جائے گی۔ اور میرے نزدیک تو نبوت کے گواہ دو ہی ہیں۔

عمر فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ

اور

خالد سیف اللہ المسلول رضی اللہ عنہم،

ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی اس مقدمے میں سرکاری گواہ کی حیثیت تھی۔ کیونکہ وہ حضور کے پہلے ہی سے دوست تھے لیکن یہ دونوں بہادر اور سخت دشمن تھے

اور نبوت کی صداقت پر یقین کر کے شرفِ ایمان حاصل کر گئے۔

امیرِ شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاری
رحمہ اللہ تعالیٰ

نوبخت تماشائی رح

عہد آفریں بخاری

دنیا میں کچھ لوگ ایسے ہوتے ہیں جو قیادت و سیادت کے خواہاں ہوتے ہیں۔ اور اس سلسلے میں انہیں کافی جدوجہد کرنی پڑتی ہے۔ تب کہیں جا کر وہ قیادت کے کسی زینے پر قدم دھر سکتے ہیں۔ کچھ لوگ ایسے ہوتے ہیں کہ قیادت و سیادت کا سنہری چمچہ منہ میں لے کر پیدا ہوتے ہیں۔ ایسے پیدائشی قائدوں کو بھی قیادت پر قبضہ جمائے رکھنے کے لئے خاصی جدوجہد کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ تب کہیں وہ موروثی قیادت کو بحالہ قائم رکھ سکتے ہیں۔ یا اسے تھوڑا بہت آگے بڑھا سکتے ہیں۔ کچھ لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں جنہیں قیادت و سیادت کی مطلق خواہش نہیں ہوتی۔ مگر قیادت خود ان کے آگے پیچھے پھرتی ہے۔ اور سیادت کا تاج زمانہ ان کے سر پر رکھ دیتا ہے۔ لیکن پھر بھی وہ تمام عمر اپنے آپ کو نہ قائد تصور کرتے ہیں اور نہ اپنی سیادت پر کبھی ناز و تبحر کو جائز سمجھتے ہیں۔ زمانہ بھر کے عام قائدین پر عموماً اور پاک و ہند کے قائدین پر خصوصاً اگر آپ نظر ڈالیں تو ان میں اکثریت یا پہلی قسم میں شامل ہے یا دوسری قسم میں۔ تیسری قسم کے لوگ خال خال کہیں نظر آتے ہیں۔ گاندھی جی غیر منقسم ہندوستان کے بہت بڑے لیڈر تھے۔ اور انہیں لیڈری کا شوق بھی تھا۔ مگر قیادت کو حاصل کرنے کے لئے انہیں پہلے جنوبی افریقہ میں خاصی جدوجہد کرنا پڑی اور اس کے بعد ہندوستان میں انتہائی پر خطر حالات کا سامنا کرنا پڑا تب کہیں جا کر وہ اپنی قیادت کی پگڑی سنبھال سکے۔ بارہا اس سلسلے میں انہیں جان کی بازی بھی لگانا پڑی۔ مرن برت رکھنے پڑے مگر پھر بھی وہ حاصل کردہ سیادت کو آخر وقت تک قائم نہ رکھ سکے اور اپنے ہی ایک ہم قوم کے ہاتھوں سے مارے گئے۔

گاندھی جی کے بعد غیر منقسم ہندوستان میں جواہر لعل نہرو کا درجہ تھا۔ یہ دوسرے قسم کے قائدین میں سے تھے۔ ان کے والد موتی لعل نہرو بہت بڑے سرمایہ دار اور بہت بڑے قائد تھے۔ اور وہ قیادت جواہر لعل کو ورثے میں ملی مگر اس کو اپنے پاس رکھنے کے لئے انہیں جس قسم کی کوششیں کرنا پڑیں وہ کسی سے مخفی نہیں۔ پیرس و لندن کے دھلے ہوئے کپڑے پہننے والے جواہر لعل کو کھادی کا لباس عمر بھر کے لئے قبول کرنا پڑا۔ اور ہر وقت جیل جانے کے لئے اپنے آپ کو آمادہ کرنا پڑا تقسیم کے بعد گو وہ ہندوستان کے وزیر اعظم ہیں مگر اس وزارت عظمیٰ کو سنبھالنے کے لئے انہیں جس قسم کے پاپڑ بیلنے پڑے وہ بھی چشم بینا سے اوجھل نہیں۔ جواہر لعل جیسے سلیم الطبع آدمی کو مینن جیسے کج بین و کج فہم آدمی کا روپ دھارنا پڑا۔ تو صرف اسی قیادت کو سنبھالنے کے لئے۔ اور شیخ عبداللہ کو اپنی اخوت و دوستی کے باوجود جیل بھیجنا پڑا انہیں سازشوں کے جھوٹے مقدمات میں پھنسانا پڑا تو صرف اسی قیادت کو سنبھالنے کے لئے۔ وہ جواہر لعل جس کا خاندان اب تک فارسی زبان سے بے بہرہ نہیں اور جس کے گھر میں ہندی اب تک ایک نامانوس زبان ہے اسے اگر اردو زبان کی حمایت سے دست کش ہونا پڑا تو صرف اس حاصل شدہ قیادت کو سنبھالنے کی خاطر جبل پور جیسے فسادات سے صرف چشم پوشی نہیں بلکہ اس جیسے فسادات کی حمایت میں بیان دینا اور اس جیسے

فسادات بپا کرادینا صرف اسی قیادت کو سنبھالنے ہی کی خاطر ہے۔

مسلمان قائدین میں سے مولانا محمد علی، شوکت علی اور مولانا ظفر علی خان وغیرہ بہت سے اصحاب پہلی قسم کے قائدین میں شمار کئے جاسکتے ہیں۔ مولانا ابوالکلام آزاد خواجہ ناظم الدین، اور خان لیاقت علی خان دوسری قسم کے رہنماؤں میں شمار کئے جائیں گے جن میں سے مولانا آزاد کو اپنی قیادت کو قائم رکھنے کے لئے پوری قوم سے ہاتھ دھونا پڑے۔ اور اتنی قربانی دے کر یہ ماننا پڑے گا کہ وہ اپنی کشتیٔ قیادت کو پار لے گئے۔ خواجہ صاحب کو جدوجہد کے باوجود کامیابی نصیب نہ ہوئی۔ اور وہ میدان چھوڑ بھاگے۔ قائد ملت کو گاندھی جی کی طرح اپنی قوم کے ہاتھوں جام شہادت نوش کرنا پڑا۔

تیسری قسم کے قائدین میں صرف دو تین نام ہی لئے جاسکتے ہیں۔ علامہ اقبال امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاری اور چودھری افضل حق مرحوم۔ رہے قائد اعظم محمد علی جناح تو ان کی زندگی کے دو دور ہیں پہلے دور میں جب وہ کانگرس کے رہنماؤں میں شامل تھے وہ پہلی یا دوسری قسم کے قائدین میں شامل تھے اور دوسرے دور میں جب وہ تحریک پاکستان کے قائد تھے یقیناً تیسری قسم کے قائدین میں شامل ہی نہیں تھے بلکہ وہ ان قائدین کے بھی قائد تھے اور حقیقی معنوں میں اگر قائد کے لفظ کا اطلاق کسی پر کیا جاسکتا ہے تو صرف ان تیسرے قسم کے قائدین پر ہی کیا جاسکتا ہے۔ اور یہی وہ لوگ ہیں جن کی شخصیتوں کو عہد آفرین شخصیت کہا جاتا ہے۔ گویا زمانے نے انہیں نہیں بنایا بلکہ وہ زمانے کو بنانے والے ہیں اور عہد آفریں شخصیتوں کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہوتی ہے کہ اپنے پرائے دوست دشمن سب ہی ان سے متاثر ہوتے ہیں۔ اپنے محبت اور پیار کی وجہ سے ان کی خصوصیات کو اپناتے ہیں اور اعدا بر بنائے رشک و حسد ان کی خصوصیات اپنے اندر اس لئے پیدا کرنا چاہتے ہیں کہ وہ بھی انہی کی طرح محبوب و محترم خلائق بن جائیں۔

علامہ اقبال ایک پیغامی شاعر تھے۔ اور انہوں نے قوم کو خودی اور صلاحیت کا پیغام دیا۔ انہوں نے قوم کو اسلامیت اور سادگی کا سبق پڑھایا اب ان کے بعد جو شاعر بھی پیدا ہوا وہ عنوان بدل کر قوم کو کوئی نہ کوئی پیغام ضرور دیتا ہے۔ اسے بھی شاعر انقلاب، ترجمان حقیقت یا نباض فطرت کے خطابات سے یاد کیا جائے اور اگر بد قسمتی سے وہ کسی انجمن ستائش باہمی کا ممبر نہیں اور دوسرے اس کی تعریف نہیں کرتے تو وہ خود اپنی تعریف کرتا ہے۔ خود ہی اپنے آپ کو مصور حقیقت، لسان عبرت، جہان غیرت یا شاعر شباب و انقلاب کہنے لگ جاتا ہے۔ علامہ نے جس قسم کی ترکیبیں اپنی بات سمجھانے کے لئے ضرورتاً ایجاد فرمائیں یا تو وہ انہیں کو مستعار لے کر اپنی اغراض میں استعمال کرتا ہے یا اسی جیسی کچھ موضوع اور کچھ مہمل تراکیب خود ایجاد کرتا ہے تاکہ وہ بھی علاماؤں میں گنا جاسکے۔

یہی صورت ہمارے عہد آفریں بخاری کی تھی۔ نہ وہ کسی لیڈر کے گھر پیدا ہوئے نہ کسی سرمایہ دار کے گھر۔ نہ انہیں لیڈر بننے کا شوق تھا نہ قائد بننے کا۔ اپنے آپ کو ہمیشہ اسلام کا ایک ادنیٰ طالب علم اور خادم شمار کرتے رہے نہ انہیں اپنی خطابت پر ناز تھا نہ قرآن دانی پر اور سیاست کی گاڑی کا پہیہ بننا تو وہ کبھی بھی پسند نہ کرتے تھے۔ ابھی وہ طالب علم ہی تھے کہ قیادت کا تاج زبردستی ان کے سر پر رکھ دیا گیا۔ مگر یہ تاج تو الگ رہا

انہوں نے عمامہ باندھنا بھی اس لئے چھوڑ دیا کہ غلام کو عمامہ باندھنے کا کیا حق ہے عمامہ ایک آزاد و خود مختار مولاﷺ کی سنت ہے۔ اور یہ تب باندھا جاسکتا ہے جب آدمی ظاہری اور ذہنی ہر طرح کی غلامی سے آزاد ہو۔

بخاری نے جب میدان خدمت و سیاست میں قدم رکھا تو قیادت کے ہوا خواہوں نے بہت سے زینے طے کر لئے تھے۔ میں یہ نہیں کہتا کہ قیادت کے یہ ہوا خواہ سب کے سب خلوص سے عاری تھے۔ حاشا و کلا ایسا ہر گز نہیں تھا۔ ان میں بہت سے نیک نیت بھی تھے۔ مگر جہاں ان میں نیک نیتی اور نیک عملی تھی وہاں یہ انسانی کمزوری بھی کہ میدان قیادت میں لوگ ہماری امامت کو تسلیم کرلیں۔ بنا بریں ان میں سے اکثر نے اپنی اپنی قیادت کے لئے ایک ایسا حلقہ اثر بنا رکھا تھا جس میں ان کی امامت مُسلّم تھی اور وہ اس میدان کے اس سرے سے اس سرے تک کوس لمن الملک بجا رہے تھے۔

بخاری جب میدان عمل میں آئے اور کچھ ہی دنوں میں پرانے پرانے شاطروں کو پیچھے چھوڑ گئے تو کسی نے نیک نیتی سے اور کسی نے بد نیتی سے ان کا دامن پکڑ کر پیچھے کو گھسیٹنے کی کوشش کی مگر اس کھینچا تانی میں جب معلوم ہوا کہ وہ حریف مرتبہ نہیں بلکہ حریف بذلہ ہیں تو سب نے اپنی قبائے قیادت میں اس سے گل بوٹے بنوانے شروع کر دیئے۔ اور وہ باہمہ اور بے ہمہ اپنے نانا صلی اللہ علیہ وسلم

بابائنا وامهاتنا

کی سنت پر عمل کرتا ہوا آگے بڑھتا گیا۔ اسے نہ کسی ابن خلف کی پرواہ تھی نہ کسی بوالحکم کی، حتیٰ کہ جب جنگ آزادی کا سورج نصف النہار پر پہنچا تو صرف بخاری ہی ایسا آدمی تھا جس کی خطابت نے ہر شہری و ہر دیہاتی کے دل میں آزادی کی چنگاری روشن کر دی تھی۔ جس کی شعلہ بیانی نے ہر اہل زبان اور ہر بے زبان کا دل موہ لیا تھا جس کی سحر بیانی نے ہر عاقل اور ہر لایعقل کی نظر بندی کر رکھی تھی اور ہر آدمی کے دل میں صرف ایک ہی سوال باقی رہ گیا تھا۔

انگریز کب ہمارا ملک ہمارے سپرد کر کے یہاں سے جائیں گے؟

بخاری مع اپنے خداداد فن کے ہر اس انجمن کے ساتھ تھے جس کے دل میں آزادی اور توحید و سنت کے جذبات موجزن تھے۔ اور ہر اس مجلس سے الگ جو توحید و سنت سے الگ یا آزادی وطن کے جذبات سے عاری تھی۔ عمر بھر اس کا یہی نظریہ رہا اور عمر بھر اس نے اسی نہج پر اپنی وضع داری قائم رکھی۔

بخاری کے سوز دروں نے ڈھیروں قائد اور انباروں خطیب و واعظ پیدا کئے اور ہمیشہ وہ ان سب کو اچھا کہتا رہا۔ اور اپنے سے دو قدم آگے چلاتا رہا مگر ان سب کا انداز بیان صاف غمازی کرتا ہے کہ وہ بخاری کی تقلید کو اپنے لئے سرمایہ افتخار و اعزاز سمجھتے ہیں ہمارے ہاں وہ خطیب بڑا خوش قسمت سمجھا جاتا ہے اور وہ قائد بڑا خوش نصیب خیال کیا جاتا ہے جسے سامعین میسر آجائیں اور اگر سامعین کی تعداد سینکڑوں سے بڑھ کر ہزاروں تک پہنچ جائے تو لوگ خطیب اعظم کہلانے لگتے ہیں۔ مگر بخاری اس انداز کا خطیب تھا کہ اس کے مقلدین کی تعداد سینکڑوں سے گزر کر ہزاروں اور لاکھوں تک پہنچ جاتی ہے۔ اس خطیب کی خطابت کا اندازہ آپ خود کر

لیں جس کی خطابت پر ہزاروں خطیب اپنی انفرادیت قربان کر چکے ہیں۔
جیسے شاعری کے سلسلہ میں اس عہد کے علامہ اقبال کا دور کہا جائے گا تا آنکہ مادر زمانہ کوئی دوسرا اقبال پیدا کرے یا اقبال سے بڑے درجے کے کسی شاعر کو جنم دے۔ اسی طرح خطابت کے سلسلے میں بھی اس عہد کو عہد بخاری ہی کہا جائے گا تا آنکہ کوئی دوسرا بخاری پیدا نہ ہو یا اس سے بھی کوئی آگے قدم بڑھانے والا پیدا نہ ہو۔

عہد اقبال میں جس قدر شعراء ہیں خواہ وہ اقبال کے عقیدت مند ہیں یا مخالف سب کے سب شعوری یا غیر شعوری طور پر اقبال کے مقلد ہیں۔ اسی طرح عہد بخاری کے خطیب خواہ وہ اس کے ہمنوا ہیں یا "بے نوا" سب کے سب شعوری یا غیر شعوری طور پر بخاری کے ہی مقلد ہیں۔
مگر اس سلسلے میں اقبال اور بخاری دونوں مظلوم ہیں کہ ان کو سمجھنے والوں نے اسی طرح سمجھا جس طرح ایک روایتی ہاتھی کو پہچاننے والوں نے پہچانا تھا اور پھر لوگوں کو بتلایا تھا کہ ہاتھی تو چھاج ایسا ہوتا ہے دوسرے نے کہا غلط ہاتھی ایک کھمبے کی مثال ہے وغیرہ اسی طرح اقبال کے بعض مقلدین نے اقبال کی مقبولیت کو اس بات پر محمول کیا کہ ان کے کلام میں فارسی کی اچھی اچھی ترکیبیں موجود ہیں اور انہوں نے اپنی عمر اسی میں بتا دی کہ فارسی کی بہترین ترکیبیں اپنے کلام میں جمع کرتے رہے۔ بعض نے یہ خیال کیا کہ اقبال کی مقبولیت اس شوخی کی بناء پر ہے جو وہ ذات احدیت (جل جلالہ) کے سلسلے میں روا رکھتے ہیں اور ان لوگوں نے اس حد تک بارگاہ خداوندی میں شوخیاں کیں کہ وہ بجائے ہنر کے عیب معلوم ہونے لگیں۔ بعض نے یہ سمجھا کہ شیطان کی تعریف علامہ کے کلام میں موجود ہے۔ لہٰذا انہوں نے ابلیس سے ایسا یارانہ گانٹھا کہ وہ خدا کی بجائے ابلیس کے بندے معلوم ہوتے ہیں۔
بعینہٖ اسی طرح بعض لوگوں نے بخاری کی مقبولیت کا باعث ان کے حسن صوت کو قرار دیا انہوں نے گا کر دوران خطابت اشعار پڑھنے شروع کر دیئے۔ حتیٰ کہ اگر گلا ساتھ بھی نہ دے تو بھی انہیں گانا ضرور ہوتا بعض نے یہ سمجھا کہ بخاری بر محل اور با موقع نہایت اچھے اچھے شعر پڑھتے ہیں۔ اس لئے ان کی خطابت مقبول خاص و عام ہے۔ چنانچہ ان لوگوں نے اس قدر اشعار از بر کر لئے کہ ان کی تقریر پر یوسف سلیم چشتی کی شرح بانگ درا یا شرح بال جبریل کا گمان ہونے لگتا ہے۔ بعض نے سمجھا کہ بخاری تاریخی واقعات کو زمانہ حال پر اس طرح چسپاں کر دیتے ہیں کہ تاریخ اپنے آپ کو دہراتی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔ لہٰذا ان لوگوں نے واقدی اور ابوالفدا کے صفحے کے صفحے یاد کر ڈالے بلکہ نسیم حجازی کے تاریخی ناولوں کے اوراق بھی از بر کر لئے۔
بعض لوگوں کا گمان اس طرف گیا کہ بخاری کی زبان بہت شستہ و رفتہ ہے اور انہوں نے بھی باوجود **الثغ** والکن ہونے کے طلاقت لسانی کے وہ جوہر دکھانے شروع کئے کہ وہ رکیں تو آسمان بھی ان کے دیکھنے کو رک جائے۔ بعض حضرات نے خیال فرمایا کہ بخاری کی تقریر اس لئے پسند کی جاتی ہے کہ اس میں نکات قرآنی بیان ہوتے ہیں۔ اور پھر انہوں نے جو بائے بسم اللہ سے لے کر والناس کی سین تک نکات بیان کرنے شروع کئے تو اللہ بس باقی ہوس!

غرض جس جس طرح کسی نے اپنے خیال کے مطابق بخاری کو سمجھا اسی طرح ان کی تقلید کی اور اپنے آپ کو بخاری بنانا شروع کر دیا۔ مگر بخاری بننا اس قدر آسان ہوتا تو آج بخاری کا اس قدر ماتم نہ ہوتا۔

عرض کیا جا چکا ہے کہ عہد آفریں شخصیت سے صرف دوست ہی متاثر نہیں ہوتے بلکہ دشمن بھی متاثر ہوتے ہیں۔ یہ لوگ شعوری طور پر باوجود دشمنی کے بھی قدر دان ہوتے ہیں اور غیر شعوری طور پر ان میں سے کچھ وہ کام کرنے لگتے ہیں جو اس عہد آفریں شخص کے ساتھ مخصوص ہوتے ہیں۔ بخاری کے دو گروہ تو ایسے دشمن تھے کہ جن سے وہ کسی طرح بھی مصالحت کے لئے تیار نہ تھے۔ انگریز اور مرزائی اور دو گروہ ایسے تھے کہ جن سے میدان تبلیغ میں انہیں بارہا ہل من مبارز کھنا پڑا۔ شیعہ اور بریلوی۔ شیعوں اور بریلویوں میں ان کے قدر دان اب بھی موجود ہیں۔ مولانا مظہر علی اظہر، حافظ کفایت حسین، اور مظفر علی شمسی وغیرہ حضرات کو شاہ جی سے جو عقیدت تھی وہ ان حضرات کی تحریروں اور تقریروں سے واضح ہے۔ مولانا ابوالحسنات مرحوم اور صاحبزادہ فیض الحسن صاحب سے انکے تعلقات بھی کچھ پوشیدہ نہیں۔ انگریز سے شاہ جی کو جس قدر نفرت تھی اسی قدر انگریز ان کے قدر دان بھی تھے۔

انگریزوں نے جس طرح ابوالکلام آزاد کے مقابلہ میں کلکتہ میں آزاد سبحانی اور کئی دوسرے آزاد پیدا کر لئے تھے اسی طرح شاہ جی کے مقابلے میں بہت سے خوش گلو اور لچھے دار مقرر تو پیدا کئے جاسکے مگر بخاری کوئی نہ بن سکا۔

مرزائیوں میں گو شاہ جی کے لئے خوش عقیدگی کی بجائے حسد اور تعصب ہے مگر شاہ جی کی تقریر کی مقبولیت سے متاثر ہو کر وہ بھی یہی پروپیگنڈہ کرتے ہیں کہ ہمارا امام بڑا فصیح البیان مقرر ہے۔ اور تو اور بعض دوستوں کے پروپیگنڈے سے متاثر ہو کر راقم الحروف کو بھی شوق ہو گیا تھا کہ ان صاحب کی تقریر ایک بار سننی تو چاہیئے۔ قادیان پہنچا تقریر سنی اور اس سے خالی الذہن ہو کر تقریر سنی کہ وہ مرزائی ہیں یا مرزائیوں کے امام ہیں۔ مگر افسوس کہ اس سلسلے میں میرا تاثر اتنا ضعیف اور رکیک ہے کہ اسے بیان کرنا بھی شاید تعصب پر محمول کیا جائے۔ اس واسطے اس سے احتراز کرتا ہوں۔

مرزائی مبلغین اکثر چھپ چھپا کر شاہ جی کی تقریریں سنا کرتے تھے بھلا شاہ جی کی تقریر کوئی سنے اور متاثر نہ ہو یہ تو ناممکن تھا۔ چنانچہ بعض لوگوں میں اس تاثر کے کچھ نہ کچھ باقیات الصالحات اب تک بھی موجود ہیں۔ مرزائیوں میں لکھے پڑھے جاہلوں کی کثرت ہے مگر پھر بھی علم ناپید نہیں راقم الحروف کو حقیقت کے اعتراف میں کبھی ہچکچاہٹ نہیں ہوئی خواہ وہ حقیقت کتنی ہی تلخ کیوں نہ ہو۔ قادیانیوں کے رئیس المبلغین اور استاد المناظرین مولوی اللہ دتہ جالندھری کو راقم انہیں مستثنات میں سے سمجھتا ہے۔ جو اس کم مائیگی کے زمانے میں نادر الوجود ہوتے ہیں اور جہاں تک میری ذاتی رائے کا تعلق ہے۔ وہ یہ ہے کہ اگر مولوی اللہ دتہ نہ ہوتے تو شاید تفسیر صغیر وجود میں آسکتی اور نہ کبیر۔

اسی طرح یہ بھی راقم کی رائے ہے کہ اگر مولوی احمد یار نہ ہوتے تو لاہوری پارٹی کے تفسیری اور تبلیغی

کاموں کی بھی نوعیت یہ نہ ہوتی جواب ہے۔ ہو سکتا ہے کہ میری ذاتی آراء میں کچھ مذہبی تعصب کو دخل ہو یہ بھی ہو سکتا ہے کہ میری معلومات ناقص ہوں اور پس پردہ دوسرے کچھ لوگ بھی کام کرنے والے موجود ہوں۔

بہر حال تذکرہ یہ تھا کہ قادیانی گروہ میں مولوی اللہ دتہ جالندھری کا دم غنیمت ہے۔ اللہ دتہ شتر گربہ قسم کا نام ہے۔ اور اگر عربی میں اس کا ترجمہ کیا جائے تو عطاء اللہ بنتا ہے۔ مولوی صاحب کے متعلق اگر حسن ظن سے کام لیا جائے تب بھی یہ بات ان کے طرز عمل سے واضح طور پر نمایاں معلوم ہوتی ہے کہ وہ مرزائیوں کے عطاء اللہ بننا ضرور پسند کرتے ہیں مگر اللہ دتہ کو بدل کر عطاء اللہ بن جانے میں سو قباحتوں کی ایک قباحت قادیانی آمر مطلق کی ناراضی کی تھی۔ چنانچہ انہوں نے اہل علم کی سی راہ نکالی اور اللہ دتہ سے مولانا ابوالعطا جالندھری بن گئے۔ ابوالعطا میں عطاء اللہ سے دور کی نسبت سہی مگر نسبت تو ہے پھر آمر مطلق کو خوش کرنے کا آہنگ بھی اس میں موجود ہے۔ علامہ "طالوت" نے اس مضمون کو یوں ادا کیا ہے

اللہ کی طرف سے پہنچتی ہے گل عطا!!
وہ سمجھے اچھے نام پہ ہوتے ہیں گل عطا
بلبل ہمیں کہ قافیۂ گل شود بس است؟
اللہ دیئے بھی بننے لگے ہیں ابوالعطاء

مرزائیوں کے ناموں پر کبھی آپ نے غور فرمایا اکثر و بیشتر اپنے امام کی تقلید میں فاروق احمد، نصیر احمد، فقیر احمد اور داؤد احمد وغیرہ نام رکھتے ہیں۔ اور شاہ جی کے بچوں کا نام بھی آپ نے سنا ہوگا عطاء المنعم، عطاء المحسن، عطاء المومن، عطاء المہیمن اب ذرا اس بات پر غور فرمائیے کہ ذہنی طور پر اگر مولوی اللہ دتہ صاحب مرزا صاحب اور اس کی اولاد سے متاثر ہوتے تو وہ بھی اپنے بچوں کے نام انہیں کے ہم وزن رکھتے مگر وہ چونکہ ذہناً شاہ جی سے متاثر ہیں اس لئے انہوں نے اپنے بچوں کے نام شاہ جی کے بچوں کی ناموں کی تقلید میں عطاء المجیب وغیرہ رکھے۔

دنیا میں سب سے پیاری چیز اولاد ہوتی ہے اور دین میں سب سے پیاری چیز اپنا مسلک ہوتا ہے۔ کبھی آپ نے یہ نہیں سنا ہوگا کہ کسی اثنا عشری نے اپنے بچے کا نام یزید یا ابن زیاد (یا ہمچوں قسم کا کوئی نام) رکھا ہو۔ ان میں سے اکثر و بیشتر نام غلام علی، یا غلام حسین قسم کے ہوتے ہیں۔ غلام علی سے لے کر ناد علی تک اور غلام حسین سے کلب حسین تک تو نام جائز سمجھے جاتے ہیں۔ مگر یزید و زیاد ہرگز ہرگز گوارا نہیں ہوتے۔ بلکہ اس مادے کے ایسے نام بھی قابل قبول نہیں جو قرن اول میں موجود تھے۔ مثلاً زید، پھر یہ قیاس کچھ اتنا غلط نہیں کہ مولوی ابوالعطاء صاحب اگر ذہناً احمدیت سے متاثر ہوتے تو وہ اپنے بچوں کے نام مقبول احمد، منصور احمد وغیرہ رکھتے جس میں آم کے آم اور گٹھلیوں کے دام کا سا معاملہ ہوتا کہ نام کے نام اور پروپیگنڈہ کا پروپیگنڈہ مگر انہوں نے نام رکھا عطاء المجیب اور ہمچوں قسم گو یہ نام بڑا پیارا اور معنوی لحاظ سے بہت خوبصورت ہے مگر آخر عبدالرحمن اور فیروز میں معنوی لحاظ سے کیا بدصورتی ہے۔ بنابریں اگر میں یہ دعوی

کروں کہ ذہناً مولوی صاحب شاہ جی سے متاثر تھے تو یقیناً یہ بات ناقابل تردید ہے۔ ایک اور بات قابل غور ہے۔ مرزا محمود کی بیماری کی خبریں آئے دن اخباروں میں آیا کرتی تھیں۔ مگر یہ کبھی سنا آپ نے کہ مولانا محمد علی جالندھری انکی عیادت کو تشریف لے گئے ہوں۔ ادھر شاہ جی کی علالت کی خبریں مشہور ہوئیں ادھر مولوی ابوالعطاء جالندھری شاہ جی کی خدمت میں پہنچ گئے۔ ؎[1]

یہ اگر ذہنی تاثر کی شہادت نہیں تو اور کیا ہے؟

اس کے بعد انہیں اپنی چوری چھپانے کے لئے اگرچہ بہت سے پاپڑ بیلنے پڑے اور بہت سی ایسی باتیں لکھنی پڑیں جو ان کے علمی پایہ سے بہت فروتر تھیں اور مرزائیوں کی عام سطح پر اترنا پڑا۔

لیکن اگر وہ یہ کرتے تو اپنی اس خواہش کو کس طرح پورا کرتے جو ان کے دل میں شاہ جی سے آخری ملاقات کی صورت میں چٹکیاں لے رہی تھی۔ بہرحال ہمارے نزدیک جہاں یہ باتیں ان کے ذہنی تاثر کی دلیل ہیں وہاں ہم انہیں انکی مصلحت بینی اور بہ لطائف الحیل مخلصی پر بھی داد دیتے ہیں۔

بات یہ ہو رہی تھی کہ بخاری کی عہد آفریں شخصیت سے صرف دوست ہی متاثر نہیں بلکہ دشمن بھی ان سے کسی نہ کسی طرح متاثر ضرور تھے اور اگر کوئی نفسیات کا ماہر بخاری کے ہم عصر اکابر و اصاغر کی حرکات کا تجزیہ کرے خصوصاً خطیبان ملت کے اعمال کا جائزہ لے تو اس تجزیئے او رجائزے میں سے بخاری کی عہد آفرین شخصیت نصف النہار کے آفتاب کی طرح ابھر کر سامنے آجائے گی۔

پیدا کہاں ہیں ایسے پراگندہ طبع لوگ
شاید کہ تم کو میر سے صحبت نہیں رہی

۱۔ ابوالعطاء جب شاہ جی کی تیمارداری کے لئے ان کے گھر حاضر ہوا تو اس وقت شاہ جی کے جذبات دیدنی تھے۔ انہوں نے سنت پر عمل کرتے ہوئے مہمان کا پورا اکرام کیا مگر اس کے جانے کے بعد جب گھر میں اہلیہ اور بچوں کے پاس بیٹھے تو بار بار استغفراللہ پڑھتے اور اہلیہ سے مخاطب ہو کر فرمایا "بڑھیو! میں بے حد پریشان ہوں میرے ایمان میں کوئی کمزوری تو واقع نہیں ہو گئی آخر ایک مرزائی میری عیادت کو کیوں چلا آیا۔ اللہ اللہ! یہ تھا شاہ جی کا تقویٰ اور خود احتسابی۔ (مدیر)

مولانا غلام رسول مہرؒ

نادر الاوصاف شخصیت

چگو نہ مئے بہ میاں آورم دریں مجلس
کہ بادہ حوصلہ سوز است و جملہ بدمست اند

تقریباً چالیس سال پیشتر کی بات ہے کہ ترک موالات یا عدم تعاون کی تحریک کے پاک و ہند کی بوقلموں وسعتوں نے چپے چپے میں وہ کیفیت پیدا کر رکھی تھی کہ طوفانی سمندر کی سطح کو بھی شاید ہی نصیب ہوئی ہو۔ ہر ملت و قوم کی آزادی کے مختلف طبقات جوش و خروش سے تحریک میں شامل ہو رہے تھے۔ برطانوی قہرمانی بھی آخری حد تک پہنچی تھی۔ نظام دار و گیر کے تمام عناصر اپنے اختیارات انتہائی شدت سے استعمال کر رہے تھے تاکہ پوری فضا ہیبت و دہشت سے معمور ہو جائے۔ فدا کاران ملک و ملت ہزاروں کی تعداد میں جیلوں کے اندر پہنچ چکے تھے۔ پھر بھی جدھر نظر اٹھتی تھی ہر عمر، ہر صنف، ہر پیشے اور ہر درجے کے کارکن اس زور و شور سے آگے بڑھ رہے تھے جیسے فوارے سے پانی کی لہریں اٹھتی ہیں یا چشمے ابلتے ہیں۔ گویا قضا و قدر کی یادگار میں طے ہو چکا تھا کہ تمام جیل بھر جائیں گے۔ ہتھکڑیاں اور بیڑیاں ختم ہو جائیں گی۔ گرفتار کرنے والے ہاتھ تھک جائیں گے۔ سزائیں تجویز کرنے والے قلم خشک ہو جائیں گے مگر اپنے آپ کو گرفتاری کے لئے پیش کرنے والوں کے سیل کا تموج تلاطم کم نہ ہوگا۔ تیز تر ہوتا چلا جائے گا۔ یہ اپنی نوعیت کی بالکل یگانہ اور عجیب و غریب جنگ تھی۔ جس نے پہلی مرتبہ اس وسیع سرزمین میں انگریزی اقتدار کی بنیادیں جڑوں تک اس طرح ہلائیں کہ پھر انہیں جماؤ نصیب نہ ہُوا۔ یہاں تک کہ ربع صدی کے بعد اس کی بساط ہمیشہ کے لئے لپیٹی گئی۔ جس سلطنت کے لئے فخر کا سب سے بڑا سرمایہ یہ تھا کہ اس پر کبھی سورج غروب نہیں ہوتا وہ ماضی کا ایسا ہی خیالی افسانہ بن گئی ہے۔ جیسے ہزاروں افسانے اس سے پیشتر موجود تھے۔ سلطنت کیا تھی تاش کے پتوں کا ایک گھروندا تھا کہ اس میں سے ایک پتہ کھسکا تو سارا گھروندا درہم برہم ہو گیا۔

محبت و عقیدت کا پہلا نقش

میں اخبار نویسی کے میدان میں قدم رکھنے کی تیاریاں کر رہا تھا۔ اس وقت پہلی مرتبہ سید عطاء اللہ شاہ بخاری کا نام سنا۔ لوگ ان کے بیان و خطابت کی سحر انگیزی اور زور و تاثیر کی ستائش ایسے انداز میں کرتے تھے کہ خیال ہوتا تھا کہ اس میں حقیقت کی جگہ افسانے کا رنگ غالب ہے۔ میں نے ۱۹۲۲ء میں اخبار نویسی شروع کی تو اکثر بڑے بڑے لیڈر اور کارکن قید ہو چکے تھے۔ ان میں خود شاہ جی بھی شامل تھے۔ سزائے قید سنا دینے کے بعد انہیں میانوالی جیل بھیج دیا گیا۔ جو عام گزرگاہ سے ہٹا ہوا تھا۔ اور وہاں بالقصد جانے والے لوگوں کے سوا کسی کے پہنچنے کا امکان نہ تھا۔ شاہ جی کے بعض رفیق اور دوست پہلے سے وہاں موجود تھے۔ بعض بعد میں

وہاں پہنچ گئے۔ بہرحال اس وقت مجھے شاہ جی کی زیارت کا شرف حاصل نہ ہو سکا۔ سالک مرحوم ۱۹۲۱ء کے اواخر میں قید ہوئے تھے انہیں بھی میانوالی جیل میں بھیج دیا گیا تھا۔ وہ نومبر ۱۹۲۲ء میں رہا ہو کر آئے تو ان کے ساتھ اخوت و رفاقت کا وہ پیمان استوار ہوا جو عملاً زندگی بھر کا پیمان بن گیا۔ وہ اکثر اپنے رفیقانِ اسیری کے احوال و وقائع و لطائف و ظرافت سناتے رہتے۔ مثلاً مولانا احمد سعید مرحوم ناظم جمعیت العلماء صوفی اقبال احمد مرحوم پانی پتی۔ مولانا عبداللہ مرحوم دہلوی چوڑھی والے، عبدالعزیز مرحوم انصاری، مولانا سید داؤد غزنوی، مولانا لقاء اللہ عثمانی پانی پتی وغیرہم رفیقوں میں سے جس شخصیت کے ذکر پر مرحوم سالک کے انداز میں محبت و للہیت کی خاص شان پیدا ہو جاتی تھی وہ سید عطاء اللہ شاہ بخاری تھے۔ اس طرح میرے دل میں شاہ جی کے متعلق محبت و عقیدت کے مخلصانہ جذبات پیدا ہوئے۔ اور اس مشہور شعر کی حقیقت کا عملی تجربہ پہلی دفعہ ہوا۔

نہ تنہا عشق از دیدار خیزد
بسا کیں دولت از گفتار خیزد

رشتۂ ناز کی استواری

شاہ جی قید کی مدت پوری کر کے رہا ہوئے تو کئی سال تک سیاسی دائرے میں ہم نے اکٹھے کام کیا اور خاصا وقت یکجائی میں گزرتا رہا۔ میں نے ان کی وہ تقریریں تو زیادہ نہ سنیں جن کی شہرت سے پاک وہند کی فضا گونج رہی تھی اور خطابت میں انہیں قدرت کا ایک خاص عطیہ سمجھا جاتا تھا۔

تاہم یہ حقیقت ہے کہ ان کے متعلق جو کچھ ترک موالات کے آغاز سے سنتا رہا تھا۔ معلوم ہوا کہ وہ واقعیت کا محض سرسری بلکہ نامکمل جائزہ تھا۔ خطابت شاہ جی کے خداداد جوہروں میں سے صرف ایک جوہر تھا۔ اگرچہ زمانہ ان سے خطیب ہی کی حیثیت سے روشناس تھا اور اب بھی ان کا ذکر کرتے ہوئے خطابت ہی کو مرکزی وصف بنا دیا جاتا ہے۔ مجھے وہ اپنے دور کے بہت بڑے انسان نظر آئے۔ کیونکہ وہ بہت بڑے مسلمان تھے اول و آخر ظاہر و باطن مسلمان تھے۔ ان کے وجود کی مادیت و معنویت کا ذرہ ذرہ اسلامیت ہی کے مختلف پر تو تھے۔ جن کی وجہ سے وہ عمر بھر ہر حلقے میں مقبول و ہر دلعزیز رہے۔ چنانچہ مرحوم سالک کی گفتگوؤں سے شاہ جی کے متعلق محبت و عقیدت سے استفادہ کے بعد وہ "کالنقش فی الحجر" ہو گئے۔ چالیس سال کے لیل و نہار کا طویل زمانی دور گزر جانے کے بعد آج بھی وہ نقوش پہلے سے یکساں تاباں و درخشاں نظر آتے ہیں۔ حالانکہ مجبور کن حالات کی بے پناہ رفتار نے ان سے قرب و یکجائی کے مواقع یک قلم ختم کر دیئے تھے۔ بلکہ لقاء و زیارت کی دولت بھی صرف اتفاق پر موقوف رہ گئی تھی۔ سیاسی دائرے میں بارہا ان سے اختلاف کی نوبت بھی آئی۔ بعض اوقات تو اختلاف مقابلے کی صورت اختیار کر لیتا تھا۔ یعنی شاہ جی ایک فریق کے ساتھ ہوتے تو میرے فکر و نظر کا یہ تقاضا ہوتا کہ دوسرے فریق کا ساتھ دیا جائے۔ ظاہر ہے کہ ان حالات میں یکجائی کی نوبت بھی بہت کم آتی۔ لیکن پورے وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ ان کے ساتھ محبت و عقیدت میں کبھی سرمو فرق نہ

آیا۔ اور جس حد تک میرا اندازہ ہے ان کی شفقت و نوازش بھی بدستور قائم رہی۔ دراصل یہ اختلاف کبھی نہ ہوا اور منزل مقصود ہمیشہ ایک رہی جب کبھی باطمینان مل بیٹھنے کا موقعہ ملا شاہ جی کی گرمجوشیوں اور بہار آفرینیوں کے انہیں دل آویز کرشموں سے تمتع کیا جنہیں اتحاد و ہم آہنگی کے اوقات میں ایک خاص دولت سمجھتا تھا۔ شاہ جی کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ جو کچھ ان کے دل میں ہوتا ہے وہ ان کے چہرے پر منعکس رہتا ہے۔ گویا ان کا چہرہ ایک صاف و شفاف اور مجلا آئینہ ہے۔ جس میں ہم ان کے باطن کی ہر کیفیت دیکھ اور پڑھ سکتے ہیں۔

نادر شخصیت

ان کے سوانح حیات مرتب کرنے کی جرأت میں نہیں کرسکتا اس کے لئے بدرجہا بہتر نظر مراتب دقیقہ رس قوت موازنہ اور انتہائی موثر اور دلآویز اسلوب تحریر درکار ہے۔ ان کے فضائل و محامد بھی ایک سرسری مقالہ کے ظرف تنگ میں نہیں سما سکتے: ان کے لئے وسیع دائرہ بیان و نگارش کی ضرورت ہے۔ البتہ ان کی سیرت کی چند دلکش جھلکیاں دیکھنا چاہتا ہوں۔ صرف چند جھلکیاں شاید اس طرح اندازہ کیا جاسکے کہ وہ کتنی گراں قدر عالی مرتبت اور نادر الاوصاف شخصیت کے حامل تھے۔ اور اسلامیت و انسانیت کی شکل میں ہمارے وطن عزیز کی وہ کتنی بیش بہا دولت ہیں وہ میدان عمل میں مصروف مجاہدات تھے تو لوگ ان کی زیارت کو باعث صد سعادت سمجھتے تھے۔ انہوں نے ہزاروں لاکھوں کے مجمعوں کو اپنے دل آویز خطبات سے سراپا عمل و حرکت بنا دیا۔ انہوں نے اپنی زندگی کا ایک ایک لمحہ حریت و اسلامیت کے جانبازانہ جہاد میں گزار دیا۔ عمر کا خاصا بڑا جز قید و بند میں گزارا جو صلاحیتیں قدرت نے انہیں عطا کی تھیں وہ سب بے دریغ اسی راہ میں صرف کردیں۔ اپنی ذات کے لئے کچھ بھی نہ کیا۔ عمر بھر فقر ان کے لئے سرمایہ فخر رہا۔ فقر میں ان کی سب سے زیادہ قیمتی خاندانی میراث تھی اور آج بھی ان کے فقر کا طرہ آسمان بوس ہے کہ وہ عرفی کے اس شعر کی زندہ مثال ہیں

باخون صد شہید مقابل نہادہ اند
عمرے کہ ماذ آتش افسانہ سوختیم

تاہم ہمارے دور میں کتنی صاحب حال نگاہیں اور کتنے صاحب حال دل ہیں جو شاہ جی کے اس مقام کا موازنہ کرسکیں۔ خود ان کی بے نیازی اور سیر چشمی کا یہ عالم تھا کہ کامل استحقاق کے باوجود ایسی کوئی چیز ان کی زبان پر تو کیا آتی یقین ہے کہ ان کے دل میں بھی کبھی نہ آئی ہوگی۔

جہاد اسلامیت و آزادی

ہمارے گردو پیش نفسا نفسی کے جو ہنگامے اور معاوضہ خدمات کے جو محشر برپا رہے ان سے کون ناواقف ہے جو لوگ لہو لگا کر شہیدوں میں شامل ہوئے تھے انہوں نے بھی اپنے کارناموں کے دفتر تیار کرکے معاوضے میں سب کچھ حاصل کرلیا جو ان کی دسترس میں آسکتا تھا۔ حالانکہ ان کے استحقاق کا معاملہ اصولاً محل نظر تھا۔ شاہ جی کی تمام عمر اس قاہر حکومت سے لڑنے میں بسر ہوئی۔ جس نے ہماری ہر مادی اور معنوی ثروت

غصب کر کے اپنی رگوں کے لئے زندگی کا خون مہیا کیا تھا۔ پھر ان کا پورا جہاد صرف آزادی کے لئے نہ تھا بلکہ اسلامیت آزادی کے لئے تھا۔ وہ اپنے وطن کو بھی آزاد دیکھنا چاہتے تھے۔ اور مسلمانوں کو بھی آزاد تر، خود دار تر اور مخلص تر مسلمان دیکھنے کے آرزو مند تھے۔ اپنی عمر انہیں مقاصد کے لئے ایسی مصیبتوں اور دلگیریوں میں گزاری جن کا معمولی سا تصور بھی بڑے بڑے مدعیان ہمت و جرأت کو رعشہ براندام کر دینے کے لئے کافی ہے۔ مگر کیا کسی خدمت کے لئے کوئی صلہ طلب کیا؟ طلب کرنا تو رہا ایک طرف کبھی کسی خدمت کا ذکر بھولے سے بھی نہیں کیا۔ خوب سوچو، خوب غور کرو، پھر بتاؤ کہ ہمارے وطن عزیز میں ایسی بلند پایہ شخصیتیں کتنی ہیں۔

اسلامی معیار عظمت

شاہ جی بہرحال انسان تھے۔ فرشتہ نہ تھے۔ ان کے ساتھ بھی زندگی کی وہ تمام ضرورتیں وابستہ تھیں جن سے ہر انسان محصور رہتا ہے۔ لیکن صلے کی طلب میں کیوں وہ ہزاروں لاکھوں سے الگ ہو گئے۔ اس لئے کہ انہوں نے جو کچھ کیا وہ اسلامی زندگی کا ایک اہم فرض تھا اور اہل حق کے نزدیک فرض اسی لئے ہوتا ہے کہ اسے بے چون و چرا ادا کیا جائے۔ اگرچہ اس راہ میں کتنی ہی تکلیفوں، مشقتوں، صعوبتوں اور قربانیوں سے سابقہ پڑے۔ یہاں تک کہ جان بھی دے دینے کی نوبت آجائے تو ایک لمحے کے لئے ادائے فرض سے روگردانی گوارا نہ کی جائے۔ قرآن مجید میں انبیاء کرام علیہم السلام کا اسوہ حسنہ ہمیں کیا بتاتا ہے کہ یہ قوم کو دعوت ہدایت دینے کے لئے اٹھے تو فرمایا "ہم تم سے کچھ اجر نہیں مانگتے ہمارا اجر تو اللہ کے پاس ہے جس نے ہمیں پیدا کیا" جن بزرگ ہستیوں نے اس اسوہ حسنہ کی پیروی کو اپنا شعار بنایا وہ بھی ہم قوموں یا ہم رفیقوں سے کبھی کسی اجر کے روادار نہ ہوئے۔ انہوں نے جو کچھ کیا فرض سمجھ کر کیا۔ ان کا مقصد ایک تھا اور وہ یہ کہ خدا کی رضا اور خوشنودی حاصل ہو۔ اس رضا اور خوشنودی کے طلب گار اپنے کارناموں کی پاکیزہ دولت کو دنیوی صلوں کی تمنا سے آلودہ کرنے کا خیال بھی دل میں نہیں لاسکتے۔ کاش ہم لوگ سمجھ سکیں اور اندازہ کر سکیں کہ سید عطاء اللہ شاہ بخاری کا تعلق اسی حقانی گروہ سے ہے۔ یہی انسانی عظمت و برتری کی حقیقی اساس ہے۔ افسوس کہ اس مقدس گروہ کے افراد آہستہ آہستہ دنیا سے رخصت ہو گئے۔ اور ان کی جگہ لینے والے یہاں پیدا نہ ہوئے۔ شاہ جی اس وجہ سے بھی حد درجہ عزیز ہیں کہ اس گروہ سے متعلق ہیں اور اس وجہ سے بھی قابل صد احترام ہیں کہ جماعتی اور قومی معاملات کے سلسلہ میں صحیح اسلامی معیار کے آخری نمائندوں میں سے ہیں۔

دولت فقر اور سعادت اطمینان

یہی لوگ ہیں جن کے کارناموں پر نظر ڈالی جائے تو معلوم ہو گا کہ جس طرف قدم بڑھے گراں قدر عملی جواہرات کے انبار فراہم ہو گئے۔ خود ان پر نظر پڑی تو فقر و درویشی پر اس طرح مطمئن ملے کہ بااقتدار بادشاہ اپنے تخت سلطنت پر اس قدر مسرور و مطمئن نہ ہوں گے۔ سچ ہے

گر دولت ایں بود کہ بہ درویش دادہ اند
باید گریستن جم و کے رابہ تخت خویش

جو قلب مطمئن اللہ تعالیٰ نے شاہ جی کو عطا کیا تھا وہ ہر جگہ نظر نہیں آسکتا۔ اطمینان قلب، دولت اقتدار، فرمانروائی یا وسعت املاک و احوال پر منحصر نہیں۔ صرف اللہ کے ذکر اور اس کے فضل و عطاء پر موقوف ہے۔

الا بذکر اللہ تطمئن القلوب

پھر سید عطاء اللہ شاہ بخاری نے اس دور میں خدمت اسلامیت و آزادی کا بار گراں دوش ہمت پر اٹھایا تھا جب اخلاص و ایثار اتنے کم یاب نہ تھے۔ جتنے آج نظر آرہے ہیں۔ یعنی ترک موالات یا لاتعاون کے دور میں۔ اس تحریک میں جن جانبازوں نے حصہ لیا تھا ان میں خاصی بڑی اکثریت مخلص اور ایثار پرور کارکنوں کی تھی۔ اخلاص و ایثار کی ایسی مثالیں بہت کم تحریکیں پیش کر سکتی ہیں۔ شاہ جی کو اس جماعت میں ایک ممتاز درجہ حاصل تھا۔ اس سے ان کی عظمت کا اندازہ ہوسکتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں صاحب دل بنایا تھا۔ اور دل ایسی نعمت ہے کہ ہزاروں جانیں بھی اس کی قیمت نہیں بن سکتیں۔ عرفی نے بالکل درست کہا تھا۔

ہزار جان گرامی بہ نرخ جو نہ خرند
بہ عالمے کہ درد دل بہ کار می آید

آخر جان کی قدر و قیمت بھی تو دل کے ساتھ ہے۔ دل نہ ہو تو جان سے کون سا قابل ذکر کام انجام پاسکتا ہے۔ دنیا میں جتنے واجب احترام کارنامے ظہور پذیر ہوئے وہ دل ہی کی کار فرمائی کا کرشمہ تھے۔ آج کتنے افراد ہیں جو اس جنس گراں مایہ کے قدر شناس ہوں

فی ذالک فلیتنا فس المتنافسون

میں نے یہ چند سطور اس عالم میں لکھیں کہ اپنے خیالات و افکار کو اطمینان سے ترتیب دے لینے کی بھی فرصت نہ تھی۔ گویا ادھر سے ادھر چند پنکھڑیاں چن کر دامن عقیدت میں رکھ لیں کہ سید عطاء اللہ شاہ بخاری کی بارگاہ عظمت میں جاؤں تو خالی ہاتھ نہ جاؤں۔ ان کے متعلق سیر حاصل چیزیں لکھنے کے لئے زیادہ اطمینان و دل جمعی درکار ہے۔ یہ تو ایک دھندلا سا آئینہ ہے۔ یہ اس غرض سے پیش کر رہا ہوں کہ ہم سب اسے سامنے رکھ کر دیکھیں کہ خود ہمارے ادعائے خدمت کے خدوخال کیسے ہیں۔ ہماری بینائی کتنی ہی غرض آلود اور ہماری صلاحیت موازنہ ماؤف ہو۔ مگر اس آئینہ میں اپنے عمل و کردار کی حقیقی حیثیت ضرور دیکھ سکتے ہیں۔

تماشائے جمال حور و غلمانم کجا باشد
مرا آئینہ باید کہ بینم تاچہ حد زشتم

آج اس سلسلے میں شاہ جی کے آئینہ مجاہدات سے بہتر کون سا آئینہ ہوسکتا ہے۔ ان کی زندگی کا ہر دور ہمارے سامنے گزرا۔ انہوں نے اسی فضا اور اسی ماحول میں اخلاص ایثار بلند ہمتی اور سچی اسلامیت کا وہ نقشہ پیش کیا جو دلوں میں مطلوب عمل کے ولولے پیدا کرسکتا ہے۔

اہلِ نظر امیرِ شریعت کہیں جسے

احرار سر بلند ہیں، باطل کے سامنے — للکار کس کی ہے یہ جہانِ اصول میں
لرزاں ہیں سامراج کے سارے گماشتے — اِک کھلبلی مچی ہے، ظلوم و جہول میں
یہ ذی وقار مردِ قلندر ہے دوستو — مینار نور ہے شبِ ظلمت کے طول میں
اہلِ نظر امیرِ شریعت کہیں جسے — یاد اس کی زندہ ہے، میرے قلبِ ملول میں
وہ بوریا نشین جلالت مآب تھا — کام آ گیا رضائے نبی کے حصول میں
اپنے لہو سے ریگِ وطن کر کے لالہ رنگ — گم ہو گیا، وہ راہِ مدینہ کی دھول میں
ٹھکرا دیئے تھے، جس نے حریر اور پرنیاں — تسکین اس نے پائی تھی خارِ ببول میں
ہر مرحلے پہ آئیں ہزاروں رکاوٹیں — اُلجھا نہ وہ کبھی کسی بحثِ فضول میں
اونچا علَم شریعت ختم الرسل کا ہو — معیار ہے امیر کا ردّ و قبول میں
واللہ اُن کے قرب کا لمحہ کبھی نہ دوں — سارا جہاں بھی جو ملے مجھ کو مُول میں
آؤ لگائیں در پہ بخاری کے ایک صدا — ممکن ہے کچھ کمی ہو شبِ غم کے طول میں
اصحاب و اہلِ بیت کی سیرت، سے فیضیاب — بادِ نسیم آئی تھی باغِ بتول میں
پھیلی تو سب کو لذتِ ایمان دے گئی — ایسی مہک تھی گلشنِ زہرا کے پھول میں
واجدؔ حضور گوشِ دل و جان سے سنو — ظفر علی کا شعر گنواؤ نہ بھول میں
کانوں میں گونجتے ہیں بخاری کے زمزمے — بلبل چہک رہا ہے، ریاضِ رسول میں

ولی محمد واجد

ڈاکٹر سید عبداللہ

کمالات فائقہ کا پیکر

شخصیتیں توفیقات ایزدی سے پیدا ہوتی ہیں۔ انکا وجود جو قدرت کے معمولی قوانین کا کرشمہ نہیں ہوتا۔ وہ تو قدرت کے کسی غیر معمولی اور پراسرار عمل سے ظہور میں آتی ہیں۔ یوں قدرت (نیچر) کی اپنی عام کارفرمائی بھی بوقلموں کی گل کاریاں کرتی رہتی ہے اور اس کے ہاتھ کی ہمزوری کے عام عجوبے بھی کچھ کم نہیں۔ صرف پھولوں کی کائنات پر ہی غور کر لیجئے۔ آپ قلمرو گل کی وسعتوں کو دیکھ دیکھ کر محو حیرت تو لازماً ہوں گے مگر آپ بالیقین اس کی پنہائیوں، اس کی رنگا رنگیوں، کرشمہ آفرینیوں اور دلفریبیوں کے انداز ہائے بے شمار کو دیکھ کر تھک بھی تو جائیں گے اور بالآخر کہہ اٹھیں گے۔

صد جلوہ روبرو ہے جو مژگاں اٹھایئے!
طاقت کہاں کہ دید کا احساں اٹھایئے

یہ تو ہوا حال نیچر کی عام تخلیقات کا۔ اور اس کے ادراک کی کوشش کچھ کامیاب بھی ہے۔ مگر نیچر کی تخلیقات فائقہ کی کائنات کے عظیم انسان بھی اسی کا ایک حصہ ہیں۔ خدائے مصور الاجسام والارواح کا ایک بھید ہے۔ یعنی ایک جہان راز جس کا مرکز خود خدا کی ذات مجرد ہی ہے۔ جس کے انعکاسات عظیم فائق انسانوں کا روپ دھارتے رہتے ہیں۔ اور یہ وہ لوگ ہیں جن کے متعلق میر تقی نے سادہ سے الفاظ میں پتے کی بات یوں بتا دی تھی۔

مت سہل ہمیں جانو پھرتا ہے فلک برسوں
تب خاک کے پردے سے انسان نکلتا ہے

اور جب بھی میں سید عطاء اللہ شاہ بخاری کا ذکر سنتا ہوں اور ان کے کمالات فائقہ کا تصور کرتا ہوں تو میر تقی کا مندرجہ بالا شعر فوراً میری زبان پر وارد ہو جاتا ہے۔

اللھم اغفرہ وارحمۃ!

بخاری واقعی ان عظیم اشخاص میں سے تھے جن کی ہستی کی ترکیب و تعمیر میں قدرت کے غیر معمولی قوانین نے کارفرمائی کی۔ اور اگر اس ترکیب و تعمیر میں آسمان، زمان اور وقت کے تصرفات کا واقعی کچھ حصہ ہے تو یقیناً یہ آسمان کی مدتوں کی محنت نے ان کے کمال معنوی کی عمارت تیار کی ہو گی۔

میں شاہ جی رحمتہ اللہ علیہ سے براہ راست کم ملا ہوں مگر قریب سے دیکھنے کے لئے بے شمار مواقع فراہم ہوئے ہیں اور ان کی تقریریں تو بلا مبالغہ سوڈیڑھ سو مرتبہ سنی ہوں گی۔ جن میں وہ تقریریں بھی شامل ہیں جو مجمع عام کے لئے تھیں اور وہ بھی ہیں جن میں عالمانہ بحث و نظر کی ضرورت ہوتی تھی۔

شاہ جی مرحوم کو قریب سے دیکھنے کی صورت یہ تھی کہ میں مرحوم چودھری افضل حق کے نیازمندان

خاص میں شامل تھا۔ وہ بعض اوقات بغرض مشاورت میرے مکان پر تشریف بھی لے آتے تھے۔ اسی طرح دوسرے احرار اور حریت پسند رہنماؤں سے بھی میری اچھی علیک سلیک تھی۔ ان وجوہ سے دفتر احرار میں میرا آنا جانا تھا اور یہ بات اس زمانے کے احباب کو اچھی طرح معلوم ہے۔

اس طرح گویا میں مجلس احرار کا ایک بے قاعدہ رکن تھا۔ مگر سب کو یہ معلوم تھا کہ میری سر گرمیاں زیادہ تر ادبی ہیں۔ اور سیاسی بھی اگر تھیں تو احرار کی جزئیاتی اور وقتی سیاست سے میرا کوئی تعلق نہ تھا۔ مجھے تو ان کے نصب العین اور برطانوی استعمار کے متعلق جرأت مندانہ خیالات سے دلچسپی تھی!

غرض حلقہ احرار کے قرب کا مجھے موقع حاصل تھا اور میں سبھی احرار لیڈروں سے شیر و شکر تھا۔ ماسوا مرحوم سید عطاء اللہ شاہ بخاری کے کہ میں ان کے رعب و جلال اور ان کے حد درجہ کھلے انداز بلاغت کی وجہ سے اپنے اندر کچھ ایسی کمی پاتا تھا۔ کہ جس کا احساس مجھے ان کے قریب نہ ہونے دیتا تھا۔ لہذا میں برسوں شاہ جی کو قریب سے مگر دور سے دیکھتا رہا اور خوب دیکھتا رہا۔

ہر حقیقت کو بانداز تماشا دیکھا
خوب دیکھا ترے جلوؤں کو مگر کیا دیکھا

میں نے احرار کی مشاورتوں میں سید عطاء اللہ شاہ بخاری کو حکمرانی کرتے دیکھا۔ احرار میں بڑے بڑے مفکر اور حاکم اور مقرر تھے۔ اور انہیں میں چودھری افضل حق بھی تھے۔ مگر شاہ جی اس قبیلے کے وہ سردار تھے جن کی بات کو ٹال مٹول کر دینا کسی کے لئے ناممکن تھا یہ اور بات ہے کہ شاہ جی کی رواداری اور حوصلہ مندی اکثر اس بات کو روا رکھتی تھی کہ مخلص رفقاء کے استدلال کو بھی سن لیتے تھے۔ اور بسا اوقات وہ اپنے رفیقوں کے خلوص سے متاثر ہو کر اپنی رائے ترک بھی کر دیتے تھے۔ مگر پھر بھی میرے اپنے خیال میں مجلس احرار کی سیاسیات کی باگ مسلسل بیس سال تک شاہ جی کے ہاتھ میں رہی۔

شاہ جی کو اپنی جماعت میں یہ مقام کسی چیرہ دستی یا دراز دستی کی وجہ سے حاصل نہ تھا۔ اس کا اصلی سبب یہ تھا کہ شاہ جی سیاسی لیڈر ہو کر بھی سیاست کے طریقے سے نہیں چلتے تھے۔ بلکہ انکی آراء کی بنیاد سیاست کے بجائے صحیح اور مرکزی اساسی عقائد پر تھی۔ میں نے بارہا مجلسوں میں شاہ جی کو مرکزی عقائد پر اڑے دیکھا اور اسی خلوص و عقائد کی بناء پر وہ اکثر اپنے نکتۂ نظر کے منوانے میں کامیاب بھی ہو جاتے تھے۔ اگرچہ (جیسے میں نے پہلے عرض کیا) کبھی کبھی وہ بھی احباب کے خلوص کے سامنے ہتھیار ڈال دیا کرتے تھے۔

اگرچہ مجھے یہ حق حاصل نہیں کہ میں جماعت احرار کی اندرونی کاروائیوں کے متعلق کچھ لکھوں خصوصاً جبکہ میرا اس جماعت سے کوئی باقاعدہ تعلق نہ تھا اور میں قلبی طور پر ان کا ہمنوا ہونے کے باوجود "حلقہ بیرونِ در" ہی تھا۔ تاہم زمانہ گزر جانے کے بعد راز کی بات بھی راز کی بات نہیں رہتی۔ اس لحاظ سے میں عرض کرتا ہوں کہ شاہ جی دو مرتبہ اپنے رفقاء کے خلوص کے سامنے جھکے اور اپنی رائے کو قربان کر دیا۔ پہلا بڑا مرحلہ وہ تھا جس کا تعلق کانگریس کے انقطاع سے تھا۔ مجھے اچھی طرح معلوم ہے کہ شاہ جی اس اقدام سے متفق نہ تھے کیونکہ ان کا

خیال یہ تھا کہ وقتی سیاست کو انگریزی استعمار کے خلاف جہاد کے اُصولی اور مرکزی سوال پر تقدم حاصل نہ ہونا چاہیئے۔ فرقہ وار امور کی بھی اپنی جگہ اہمیت ہے مگر یہی فرقہ وار امور اصولی سوال کے سامنے رکاوٹ بھی بن جاتے ہیں۔ احرار کی یہ بحثیں دو تین مہینے تک جاری رہیں جن میں مولانا حبیب الرحمن لدھیانوی اور حضرت شاہ جی الگ رائے پر تھے۔ مگر افضل حق مرحوم کی ملائمت، نرمی، طریق استدلال، تحمل اور وقتی سیاسی جزیات کا علم آخر بخاری کو قائل کر کے رہا۔ مگر در حقیقت بخاری قائل ہوئے نہیں انہوں نے قربانی کی۔ اور بیس تیس برس گزر جانے کے بعد اب شاید بہت سے لوگوں کو یہی فیصلہ کرنا پڑے گا کہ احرار کی وقتی سیاست نے بالآخر انہیں کچھ فائدہ نہ پہنچایا۔ مسلمان قوم کا پلیٹ فارم تو بہرحال مسلم لیگ کے پاس رہا اور احراری سیاست پر وقت پرستی کا الزام لگا رہا۔

دوسرا نازک موقعہ مسجد شہید گنج کے حوادث کی صورت میں سامنے آیا۔ یہاں بھی میری معلومات کے مطابق شاہ جی کی نظر مسجد کی تقدیس پر تھی اور دوسرے رفقاء (بڑی حد تک بجا طور پر) اس کو سازش سمجھتے تھے (اور وہ سازش تھی بھی) مگر شاہ جی کا قلب سیاسی موقعہ شناسی یا مصلحت کوشی کو برداشت کر ہی نہ سکتا تھا۔ ان کی نظر بنیادی اور مرکزی عقائد میں پیوست رہتی تھی۔ اور میرا اپنا خیال یہ ہے کہ مرکزی عقائد سے ہٹ کر مجلس احرار نے بالآخر نقصان اٹھایا۔

پھر بھی شاہ جی بالعموم مجلس احرار میں اپنی اس راست روی اور مرکزیت کی وجہ سے بہت جلد غالب رائے کو اپنے حق میں ہموار کر لیتے تھے اور سب رفقاء کو معلوم ہے کہ احرار کی اصلی قوت شاہ جی ہی تھے۔

اس مختصر مضمون میں شاہ جی کے کمالات معنوی کے متعلق تفصیل سے لکھ نہیں سکتا۔ اور شاید اس موضوع پر لکھنے کے لئے ان کے قریبی احباب کا مجھ سے زیادہ حق ہے۔ تاہم ان کی گفتگو اور تقریر کے متعلق چند اشارات کرنے کی گنجائش پاتا ہوں۔

- عام خیال کے مطابق شاہ جی کا سب سے بڑا کمال ان کی خطیبانہ ساحری میں مضمر تھا۔ (اور یہ غلط بھی نہیں) میں سمجھتا ہوں کہ شاہ جی کی مجلسی گفتگو بھی ان کی خطابت کے برابر برابر جادو جگاتی تھی۔ اور جمہوریت سے قطع نظر، طبقہ علماء و زعما میں وہ اپنے انداز گفتگو کی وجہ سے ہی ایک فائق مقام کے مالک بنے ہوئے تھے۔

شاہ جی کی گفتگو ہر مجلس اور ہر مقام کے مطابق ہوتی تھی چنانچہ علماء کی محفل میں کتاب و سنت کے موضوعات پر جب وہ بات کرتے تھے تو یہ محسوس ہوتا تھا کہ یہ شخص شب و روز کتابوں کی ورق گردانی میں مصروف رہتا ہے۔ بڑے بڑے عالم ان کے سامنے دم بخود بیٹھے رہتے تھے۔ اس طرح اہل ادب کی محفل میں ان کی باتوں پر ادبی لطائف کا کچھ ایسا تسلسل ہوتا تھا کہ مخاطب اپنے آپ کو زعفران زار کے ماحول میں پاتا تھا۔ برجستہ عربی، فارسی، اردو، پنجابی کے اشعار ان کی گفتگو میں مناسب مقام پر خود بخود آپہنچتے تھے اور جب سیاستدانوں کی مجلس میں ہوتے تو ان کی سیاسی معلومات کا بھی گہرا نقش بیٹھتا تھا۔ اگرچہ وہ سب سے زیادہ اسی جماعت سے متوحش ہوتے تھے۔ خصوصاً اس زمانے کے مسلمان سیاستدانوں کی صحبت میں ان کا دم گھٹتا تھا۔ اور وہ فرمایا کرتے تھے کہ ان بدبختوں کے دل پر خدا کے سوا ہر شے کا خوف غالب ہے۔

غرض شاہ جی ہر مجلس میں مناسب موقعہ نہایت بلیغ گفتگو کیا کرتے تھے اور اس کا بڑا اثر ہوتا تھا۔ مگر شاہ جی کی گفتگو میں بلاغت کا سب سے بڑا پہلو ان کی حاضر جوابی بذلہ سنجی اور طنز کا کٹیلا پن تھا۔ اور ان کا یہ وہ ہتھیار تھا جس کا جواب کسی کے پاس نہ تھا۔ اور وہ اپنے خداداد ملکے کی بدولت ہر مجلس میں شریک غالب بھی ہوتے تھے اور راحت محفل بھی۔ مرحوم افضل حق کی یہ حالت تھی کہ سید صاحب جس طویل دورے پر باہر چلے جاتے تو فرمایا کرتے:۔

"شاہ جی دے بغیر مارّیاں کھولے (کھنڈر) معلوم ہوندے نیں"

اور کبھی کبھی کوئی صورت پیدا کر کے ان کا دورہ کٹوا بھی دیتے اور پھر اپنی محبت آمیز شرارت پر بہت خوش ہوتے۔

مختصر یہ کہ شاہ جی کو گفتگو کا غیر معمولی ملکہ حاصل تھا اور ان کے قبول عام میں اس چیز کا بھی بڑا حصہ تھا۔ تاہم یہ ماننا پڑے گا کہ شاہ جی کا سب سے بڑا کمال ان کا خطیبانہ انداز تقریر تھا۔ جس سے وہ ہزاروں بلکہ لاکھوں انسانوں کے مجمع کو کئی کئی گھنٹوں تک مسحور کئے رکھتے تھے۔ شاید پچھلی دو تین صدیوں میں ان سے بڑا شیوا بیان خطیب کوئی ظہور میں نہیں آیا ہو گا۔ اور یہ ایک ایسی حقیقت ہے جو واضح اور مسلّم ہونے کی وجہ سے محتاج ثبوت نہیں۔ شاہ جی کی خطابت کے خصائص کا ادبی و فنی تجزیہ اگر کیا جائے تو لامحالہ ان کی ORATORY کو دنیا کے بڑے بڑے آریٹرز کے پہلو بہ پہلو رکھ کر دیکھنا ہو گا۔ یونانیوں اور رومنوں کی خطابت کا فن اپنے اسلوب کے اعتبار سے دو مختلف لہروں کی نمائندگی کرتا ہے۔ یونانی خطابت اپنے کمال کے لئے ایسی شخصیتوں کی طلب گار تھی جس کا سب سے بڑا جوہر دانش ہوتا تھا۔ رومنوں کی خطابت اپنی بلوغ کے لئے ایسے وجود کی طلب گار تھی جس کا سب سے بڑا جوہر تدبر اور رعب سلطنت داری تھا۔ یہ تو ظاہر ہے کہ خطابت کا ایک اہم پہلو مخاطبوں کے جذبات اور تعصبات کا ادراک اور شعور ہوتا ہے مگر خطابت ہر قوم اور ہر ملک کے مطابق جدا جدا خصوصیات بھی رکھتی ہے۔ مثلاً انگریزوں کی خطابت میں سب سے زیادہ اپیل کرنے والی چیز جمہوری احساس اور معاشرے کی مادی بہبود اور اس سے مطابقت رکھنے والا جذبات آمیز عقلی استدلال ہوتا ہے۔ قدیم عربوں کی خطابت میں بدویانہ آزادی قبیلے کا فخر و غرور جس کو شاعرانہ نثریا اجزاء میں ڈھال کر پیش کرنا ہی سب سے بڑا کمال تھا۔

افسوس ہے کہ مسلمانان ہندوستان کی خطابت کی کوئی تاریخ موجود نہیں تاہم تاریخوں میں کچھ کچھ اشارے ضرور مل جاتے ہیں لیکن اکثر اس کا ذکر ذاکرین اور واعظین کی فہرستوں میں پایا جاتا ہے مغلوں سے پہلے کے چند بڑے آدمی فخر مدبر اور ابواب الجنان کے مصنف ملا قزوینی وغیرہ کی خطابت کی کچھ روداد مرتب ہو سکتی ہے۔

آخری دور مغلیہ میں بڑے بڑے خطیب پیدا ہوئے اور ولی اللّٰہی تحریک میں شاہ اسمٰعیل شہید وغیرہ نے بڑا نام پیدا کیا۔ یوں شاہ عبدالعزیز اور شاہ عبدالرحیم بھی اچھے مقرر تھے۔ اور ہمارے زمانے میں سابقاً مولانا محمد قاسم نانوتوی، مولانا اشرف علی تھانوی اور بعد میں بہت ہی ممتاز نام مولانا ابوالکلام آزاد کا ہے۔ یہ نامکمل

فہرست خطیب علماء کی ہے اس میں مولانا محمد علی اور مولانا ظفر علی خاں کو شامل نہیں کیا گیا۔ کیونکہ ان لوگوں کی خطابت کا رنگ جدا ہے۔

حضرت شاہ جی مرحوم کی خطابت دراصل ایک قدیم عظیم روایت سے تعلق رکھتی ہے۔ شاہ جی سے پہلے قریبی زمانہ میں نامور ترین بزرگ "مولانا اشرف علی" تھانوی تھے شاہ جی کی خطابت کا تعلق ایک خاص حد تک انہی سے قائم کیا جاسکتا ہے

حضرت تھانوی کی خطابت کا اہم خاصہ وقت کی طوالت اور اس کے باوجود دلچسپی کا قائم رکھنا تھا۔ حضرت شاہ جی کے یہاں بھی یہی خصوصیت کار فرما تھی اور اگرچہ حضرت تھانوی کی تقریر میں بھی ادب شعر اور بذلہ وظرافت کا ایک خاص رنگ تھا مگر آواز کی گرج اور شخصیت کا جو جلال حضرت شاہ جی کو میسر آیا وہ انہی سے مخصوص تھا۔ اس کے علاوہ حضرت تھانوی کے موضوعات عموماً ٹھنڈے ٹھنڈے ہوتے تھے۔ ان میں کہانی کا سا لطف ہوتا تھا۔ مگر حضرت شاہ جی کی تقریروں کا موضوع جوش انگیز ہوتا تھا۔ اور اس میں رجز کی سی کیفیت پیدا ہو جاتی تھی۔

اسی لئے میں حضرت تھانوی کو واعظ کہوں گا۔ اور حضرت شاہ جی کو کامیاب بلکہ غیر معمولی خطیب قرار دوں گا۔ حضرت تھانوی کی تقریر صرف ان کے معتقد سنتے تھے مگر شاہ جی کو ایسے اجتماعات سے واسطہ پڑتا تھا جس میں اختلاف رکھنے والوں کی موجودگی ایک یقینی بات تھی۔ اس لئے شاہ جی کی خطابت کو زیادہ سخت آزمائشوں سے گزرنا پڑتا تھا۔

یہ تفصیل میں نے اس لئے بیان کی ہے کہ ہر چند کہ حضرت شاہ جی ہندوستان کی ایک قدیم روایت خطابت کے وارث تھے مگر دراصل ان کی خطابت ادوار اور قرنوں کی حدوں سے بلند تر اور ارفع تر تھی۔ اور اس میں تاثیر تفریح اور تلقین کی ایسی صورتیں موجود تھیں جن کے لئے صرف حضرت شاہ جی کی شخصیت کو قدرت نے موزوں سمجھ کر منتخب کیا تھا اور بعض اوقات تو ایسا محسوس ہوتا تھا کہ شاہ جی کی خطابت کے سب عناصر جمع ہو گئے ہیں۔ اگرچہ ان کی خطابت کو انگریزی خطابت سے کوئی قریبی تعلق نہ تھا اس معاملے میں انہی کے زمانے میں ایک دوسرا یکتا خطیب ابوالکلام آزاد حضرت شاہ جی کے مقابلہ میں ارفع کمالات کا مالک نظر آتا ہے کیونکہ اس کی تقریر میں دانش، رعب داب، عربی حریت اور فرانسیسی انگریزی انداز استدلال کے سب عناصر جمع ہوتے تھے۔

حاصل کلام، یہ تھے حضرت شاہ جی جن کی شخصیت اور کمال کے چند نمایاں نقوش میں نے یہاں مرتب کر دیئے ہیں۔

صُوفی تبسم مرحوم

دو دوست

❊

بخاری اور سالک

بخاری اور سالک پرانے دوست تھے، دونوں میں اشتراکِ ذوق تھا، دونوں ایک دوسرے کے ہمنوا تھے اور سب سے بڑی بات یہ تھی کہ دونوں کے دل خلوص سے لبریز تھے،
مطمحِ نظر ایک تھا۔ زندگی کے کاروبار میں ایک دوسرے کو سمجھتے اور بھانپتے تھے، میدان عمل میں مدتوں ایک دوسرے کا ساتھ رہا تھا، انگریزی عملداری میں اجنبی سیاست کے ہاتھوں ملک وملت کی خاطر قید و بند کی صعوبتیں بھی جھیلیں تھیں، رفیقانِ کار و یارانِ طریقت کی محفلوں میں بیٹھ کر جسمانی تکان و ذہنی کوفت دور کرنے کے لئے باہم مل کر قہقہے بھی لگاتے تھے اور بقول حافظ

بفراغِ دل زمانی نظرے بماہ روی

کبھی کبھی یہ دو یاران یک دل ایک ساتھ بیٹھ کر دل کی اشتیاق انگیزیوں میں گرم گرم آنسو بھی بہاتے اور گدازِ قلب و رقتِ دل سوزی کے مزے بھی اٹھاتے تھے لیکن انسانی قدم کبھی کبھی ڈگمگا بھی جاتے ہیں اور دلوں کی یگانگت کے باوجود نگاہیں مختلف سمتوں پر پڑتی ہیں۔ موڑ ہو نہ ہو دوراہے کہیں نہ کہیں نکل ہی آتے ہیں۔

اے کہ ہمراہ موافق زجہاں می طلبی
آں قدر باش کہ عنقاز سفر باز آید

بخاری اور سالک میں کسی بات پر اختلاف ہوا اور باوجود انتہائی الفت قلبی، یگانگت اور باہمی موانست ایک دوسرے سے بچھڑ گئے۔
لیکن قدم کتنے ہی الگ کیوں نہ ہوں، دلوں کی وابستگی ہمیشہ اپنا اثر دکھاتی ہے۔ خلوص شرط ہے ایک بار دو ملے ہوئے دل جدا ہو کر بھی دیرینہ پیوستگی کی کسک غیر شعوری طور پر گلہ وشکایت سے گزر کر تلخ گوئیوں کی صورت اختیار کر لیتی ہے۔ لیکن یہ تمام باتیں ملاپ کی ایک دبی ہوئی امنگ کا پتہ دیتی ہیں اور دو دلوں کے خفیہ جذبات کسی غیر مخلصانہ سعی و کوشش کا سہارا ڈھونڈتے نظر آتے ہیں۔ یہی حال بخاری و سالک کا تھا۔ وہ جب کبھی دوستوں میں بیٹھتے تو ایک دوسرے کو ضرور یاد کرتے۔ اس یاد میں تلخی بھی ہوتی۔ مگر اس تلخی میں ہمیشہ اخلاص مندانہ دوستی کی شیرینی بھی ہوتی۔

بخاری اور پطرس

حصول آزادی کے بعد پروفیسر پطرس ریڈیو چھوڑ کر لاہور آئے اور گورنمنٹ کالج کے انتظامی امور کی باگ ڈور سنبھالی۔ علم و ادب کے اجتماعوں کے ساتھ ساتھ دوستوں کی محفلیں گرم ہوتیں۔ سالک صاحب سے

تو روز کا ملنا تھا۔ لیکن جب کبھی بیٹھے کوئی دوست کوئی گرم گرم تڑپتا ہوا شعر سناتا اور اس شعر کی جذباتی کسک دلوں کو گدگدانے لگتی اور احساسات کی والہانہ کیفیت سرور و سوز اور سوز و ساز کی ایک دنیا بسا دیتی تو یک لخت اس کے کسی نہ کسی گوشے میں ایک خلاء سا محسوس ہونے لگتا۔ اور شاہ جی یاد آجاتے۔ اور پھر ان کے یاد آتے ہی احباب ایک اور ہی فضا میں کھو جاتے اور پھر جب ہوش میں آتے تو پطرس میری طرف گھور کر دیکھتے گویا اس خلاء کا میں ہی پیدا کرنے والا تھا۔

ایک دن تنہائی میں میں نے سارا قصہ بیان کیا۔ انہوں نے کہا ابھی امرتسر جاؤ اور شاہ جی کو ہمراہ لے آؤ۔ آج سہ پہر کو یہ اجتماع ہو کے رہے گا۔ حسب معمول دوستوں کو ٹیلی فون پر اطلاع کر دی گئی۔ میں نے شاہ جی کی خدمت میں حاضر ہو کر کہا۔ آج زندہ دلانِ پنجاب یعنی احباب کی تیسویں سالگرہ ہے۔ تین بجے سہ پہر کو شاہ جی پطرس کی کوٹھی کے فراخ صحن میں بیٹھے احباب کا انتظار کر رہے تھے۔ سالگرہ کی تقریب کا وقت قریب آرہا تھا۔ پطرس اور میں چپکے سے سالک صاحب کے مکان پر گئے اور انہیں کار میں سوار کیا اور چل پڑے۔

موٹر کی رفتار دھیمی تھی اور پطرس اس روز معمول سے زیادہ باتیں کر رہے تھے۔ نثر سے زیادہ شعر میں گفتگو ہو رہی تھی۔ وہ بار بار حافظ کا یہ شعر دہراتے اور خود ہی واہ واہ کہتے چلے جا رہے تھے۔

ما ہر چہ خواندہ ایم فراموش کردہ ایم
الاّ حدیث یار کہ تکرار می کنیم

اچانک پطرس نے کہا "سالک صاحب! ولایت کے کسی صاحب ذوق ستم ظریف پبلشر نے اپنے ملک کے مختلف برگزیدہ مصنفوں سے "میرا عقیدہ" کے موضوع پر مضامین لکھوائے ہیں۔ واللہ لوگوں نے کیا کیا مزے کی باتیں کی ہیں۔ بار بار انہیں پڑھنے کو جی چاہتا ہے، کہتا ہے کہ:۔

"اگر کبھی مجھے دو چیزوں میں سے ایک کو انتخاب کرنا پڑے (ملک و دوست) تو اللہ سے دعا ہے مجھے اتنی ہمت دے کہ دوست کا ساتھ نہ چھوڑوں"

بات ہے تو کافرانہ اور مجرمانہ لیکن ظالم نے کیا بات کہہ دی ہے۔ ہم شعر چھوڑ کر اسی فقرے میں کھو گئے۔

تھوڑی دیر بعد موٹر کوٹھی میں داخل ہوئی۔ عطاء اللہ شاہ بخاری کوٹھی کے باہر ایک وسیع صحن کے گوشے میں دوستوں میں بیٹھے مصروف گفتگو تھے۔ سالک نے زمین پر قدم رکھا۔ بخاری چند لوگوں میں کیا ہزاروں میں چھپ نہ سکتے تھے۔ سالک نے ایک نظر میں انہیں دیکھ لیا اور بے ساختہ بول اٹھے۔

"اچھا یہ بات ہے"

اب وہ ہم سے بہت آگے تیز تیز چل رہے تھے شاہ جی کا رخ دوسری طرف تھا۔ وہاں پہنچتے ہی انہوں نے شاہ جی کے کندھوں پر ہاتھ رکھا، انہوں نے گھبرا کر پیچھے کی طرف دیکھا، سالک کھڑے تھے، بولے: "سبحان اللہ!

چوں او آمد در آمد از در آتش

دونوں ایک دوسرے سے لپٹ گئے۔ نہ جانے کتنی آہیں تھیں جو سینوں کی اتھاہ گہرائیوں سے ابھریں، کتنے آنسو تھے جو بہہ گئے، آخر پطرس آگے بڑھے اور دونوں کو بٹھا دیا۔ سالک نے کہا بخاری! شعر تو روز پڑھتے ہیں۔ مدت ہوئی کوئی اچھا شعر نہیں سنا، سناؤ۔۔۔۔۔ ابھی بات ختم نہیں ہوئی تھی کہ میں نے یہ شعر پڑھا۔

دو دوست قدر شناسند عہد صحبت را
کہ مدتے ببریدند و باز پیوستند

بخاری نے پوچھا نظیری ہے۔ میں نے کہا نہیں سعدی، اس پر انہوں نے نظیری کی یہ غزل چھیڑی

چہ خوش است از دو یک دل سرِ حرف باز کردن
سخنِ گزشتہ گفتن گلہ را دراز کردن

اور جب وہ اس شعر پر پہنچے

تو اگر بجور سوزی جفاء زمن نیاید
بجز از دعاء جانت زسر نیاز کردن

دونوں کی نظریں ایک بار پھر ملیں، دونوں کی آنکھوں سے آنسوؤں کا سیلاب امڈ آیا، اللہ جانے یہ آنسو کب کے رکے ہوئے تھے۔ وہ انہیں مسرت کی ہنسی میں چھپانے کی کوشش کرتے رہے لیکن نہ چھپا سکے۔

محفل پر خاموشی طاری تھی، دفعتاً شاہ جی نے ایک گہری آہ کھینچی اور مسکرا دیئے سبحان اللہ یہ تیسویں سالگرہ ہے، اللہ کرے ایسی سالگرہ روز ہو اور میں اور سالک مل بیٹھیں۔

کتنا پر خلوص تھا یہ دل جہاں سے یہ آواز نکلتی تھی۔

تاریخ ہائے وفات

۱۹۶۱ء

(۱) مفتاح شریعت عطاء اللہ شاہ۔ (۲) والا رتبہ سید عطاء اللہ شاہ فوت شد۔ (۳) رفتن امیر شریعت۔ (۴) مخزن علوم شہ بخاری۔ (۵) شام غم علامہ روزگار۔ (۶) مقبول دوران سید عطاء شاہ خلد آشیاں۔ (۷) عطار نطق سید عطاء اللہ شاہ خلد آشیاں۔ (۸) سید عطاء اللہ شاہ بخاری نور علیٰ نور۔ (۹) علامہ روزگار امیر شریعت عطاء اللہ جا۔ (۱۰) علم دین امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ۔ (۱۱) جلال علما میر شریعت سید عطاء اللہ شاہ۔ (۱۲) نگہ واپسین امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ۔ (۱۳) لوح مزار نیکو قلب امیر شریعت سید عطاء اللہ۔ (۱۴) مزار پر انوار سید قوم سید عطاء اللہ بخاری۔ (۱۵) مرقد منورہ ابرِ عطا سید عطاء اللہ بخاری۔ (۱۶) مرقد منورہ عالم بعمل سید عطاء اللہ شاہ بخاری۔ (۱۷) مرقد منورہ پاک باطن امیر شریعت۔ (۱۸) مرقد منورہ باب عطا امیر شریعت۔ (۱۹) مرقد منورہ کان جادو امیر شریعت۔ (۲۰) شستہ زباں خطیب شہیر۔ (۲۱) روشن خیال آتش بیان۔ (۲۲) ہفتِ زباں جادو بیاں سید عطاء اللہ شاہ بخاری۔ (۲۳) مہر منیر جادو بیاں سید عطاء اللہ شاہ بخاری۔

اختر واصفی

پروفیسر افضال احمد انور (فیصل آباد)

تھی تجھے میرِ اُحد سے خاص نسبت شاہ جی

تونے کی اسلام کی بے لوث خدمت شاہ جی
باغ حق کو تونے دی اک تازہ رنگت شاہ جی

تو تھا وہ درویش جس کے دم سے طاری ہی رہی
کاخ انگلستان پہ لرزہ خیز ہیبت شاہ جی

گولڑہ کے پیر(۱) کامل کی دعا کا ہے صلہ
تیری پُر تاثیر جوشیلی خطابت شاہ جی

ساحران فن پہ تھا جادو تری تقریر کا
تجھ پہ نازاں تھی بلاغت کی کرامت شاہ جی

پیکر اخلاص تھی کذب و ریا سے پاک تھی
تیری سیرت شاہ جی، تیری بصیرت شاہ جی

قید و بند روح فرساء اختلاف سخت سے
بے نیاز غم رہی تیری سیاست شاہ جی

جور افرنگی رہا نے ہند کے سرمایہ دار
رہ گئی قائم تری دل پر حکومت شاہ جی

تھا ترا ہر سانس پیغام جہادِ راہ دیں،
تھی تجھے میرِ احد سے خاص نسبت شاہ جی

حضرت پیر مہر علی شاہ قدس سرہ- شاہ جی کے مرشدِ اول

اللہ اللہ حفظِ ناموسِ نبی کی بخششیں
بن گیا اک گلبدن فولاد سیرت شاہ جی

باغیٔ ختم نبوت محو سازش پھر ہوا
پھر مسلمانوں کو ہے تیری ضرورت شاہ جی

اے عطائے کبریا، عشق نبی سے تو ہوا
مردِ حر، پیرِ صفا، میرِ شریعت، شاہ جی

اس کی عظمت، اس کی رفعت، اس کی شوکت کو سلام
جس کو انور کہہ رہی ہے ساری ملت شاہ جی

مجاہدینِ آزادی

جن کے عزم و عمل نے سیاسی گزر گاہوں میں اسلام کی عظمت کے چراغ روشن کر کے قوم کو آزادی کی منزل تک پہنچایا۔

بالآخر وہی لوگ قوم کے قہر و غضب کا شکار ہو گئے۔ ان پر ہر وہ جھوٹ بولا اور ہر وہ افترا باندھا گیا جسے سن کر

مہر و وفا کانپے زمین لرزی فلک تھرا گیا

ان کی قربانیاں چتا کی راکھ ہو گئیں
ان کی استقامت پر تبرئی تولا گیا
ان کی عظمت کو داغدار کرنے کی کوششیں کی گئیں
ان کی ہڈیوں کو سوکھی لکڑی کی طرح جلا دیا گیا

دجل و دروغ کی سیاست گاہ میں ان کی آواز اس صدا کی طرح ہو گئی جو صحراؤں میں بلند ہو کر ریت کے تودوں میں اتر جاتی ہے۔ وہ لوگ احساسات کی قبر میں لیٹ گئے اور ان کی جگہ ایسے افراد نے لے لی جنہوں نے شہیدوں اور مجاہدوں کے خون کو غازہ اور ہڈیوں کو سہرے کا پھول بنا لیا جہاں تک کہ مجاہدین آزادی کے وجود کا چراغ گل ہو گیا اور ان کی جگہ سیاسی مجاور آ گئے جو آج بھی غلامی کا کاسہ گدائی لئے پھرتے ہیں۔

قائد احرار، جانشین امیر شریعت سید ابو معاویہ ابو ذر بخاری

ڈاکٹر محمد عبداللہ چغتائی

سیاسی زندگی کا آغاز

تمام مشرق میں یہ امر بالصراحت مطالعہ میں آئے گا کہ ہمیشہ جو بھی تحریک خواہ کسی رنگ میں ہوئی اسے زیادہ تر شخصی حیثیت ہی حاصل رہی برعکس اس کے مغرب میں عام طور پر جماعتیں بذات خود تحریک ہوتی ہیں۔ اور مشرق میں اس شخص کا ایک حلقۂ احباب بن جاتا ہے اور بعض اوقات وہ جماعت اس شخص سے ہی منسوب ہوجاتی ہے۔ پھر اس جماعت یا شخصیت کو ایسے ایسے نشیب و فراز سے واسطہ پڑتا ہے۔ اور اس کی زندگی میں ایسے ایسے واقعات پیش آتے ہیں کہ وہ آخر اس ملک کی تاریخ کا اہم باب بن جاتے ہیں۔ اگر ہم مرحوم عطاء اللہ شاہ بخاری کی زندگی پر ذرا ٹھنڈے دل سے غور کریں۔ بالخصوص ۱۹۲۰ء سے لیکر ۱۹۶۱ء تک تو اس عظیم الشان شخصیت کی ایک نمایاں حیثیت سامنے آجائے گی۔ جب سے آپ نے سیاست میں حصہ لینا شروع کیا تھا۔ تو یہی جذبہ اور عمل تادم واپسیں قائم رہے۔

میں اپنی ملازمت کے ضمن میں لدھیانہ میں ۱۹۱۵ء سے لے کر ۱۹۲۲ء تک مقیم رہا۔ ان چند سالوں میں ملک کے ان سیاسی حالات کا تجربہ اور مشاہدہ کیا کہ عقل حیران ہوتی ہے جو خاص کر جنگ عظیم اول کے زمانہ ۱۹۱۴ء سے ۱۹۱۸ء کے بعد رونما ہوئے یہی زمانہ تھا جب کہ مسلم لیگ نے زور پکڑا یہی ایام تھے جب کہ خلافت تحریک کا آغاز ہوا۔ یہی زمانہ تھا جب کہ رولٹ ایکٹ کی مخالفت ہوئی جس کی وجہ سے امرتسر میں جلیانوالہ باغ کے واقعات ظہور میں آئے اور کانگریس نے اسی وجہ سے اپنا ہنگامہ خیز اجلاس دسمبر ۱۹۱۹ء امرتسر میں ہی منعقد کیا۔

اور پھر لاہور اور امرتسر میں مارشل لاء کے واقعات ان سب سے بڑھ کر اسی زمانہ میں مہاتما گاندھی کی تحریک ترک موالات شروع ہوئی۔ جس نے ملک بھر میں ایک کونے سے لے کر دوسرے کونے تک آگ کی ایک خاص لہر دوڑا دی تھی۔ ہم نے اسی زمانہ میں ان تمام سیاسی تحریکوں کا ایک فوری اثر عوام میں یہ دیکھا کہ مسلم ہندو اتحاد و اتفاق ایسا زور دار ہوا کہ نہ اس سے قبل ایسا سنا تھا نہ اس کے بعد پھر ہوا۔ اور اسی اتحاد کی برکت سے ہم نے اپنی آنکھوں سے بادشاہی مسجد میں رولٹ ایکٹ کے خلاف ہندوؤں کو تقریریں کرتے دیکھا۔ اور وہیں مسلمان خفیہ پولیس افسر ہندو مسلم نوجوانوں سے پٹتے بھی دیکھا۔ غرضیکہ یہ ایک طویل داستان اس سیاسی پس منظر کی ہے جس کا مرکز زیادہ امرتسر بن چکا تھا۔ اور یہ ہی زمانہ ۱۹۱۹ء، ۱۹۲۰ء کا تھا جبکہ حضرت شاہ صاحب مرحوم حالات کی تاب نہ لا کر امرتسر سے ہی جہاں ان کی مستقل قیام گاہ تھی۔ منصۂ شہود پر آئے اور سیاست میں قدم رکھا۔ یہ وہ زمانہ تھا جبکہ آزادی وطن کے بیج بوئے گئے۔ مگر افسوس اس امر کا ہے کہ وہ لوگ جنہوں نے یہ بیج اپنے ہاتھوں سے بوئے تھے۔ آج ہم میں موجود نہیں ہیں۔ مگر مؤرخ کو چاہیئے کہ ان کے کارناموں کو صفحۂ تاریخ پر نہایت دیانت داری سے ثبت کرے۔ بعض احباب ابھی تک ایسے موجود ہیں جنہوں نے اس دور کی سیاسیات میں عملی حیثیت سے نہیں بلکہ ایک مبصر،

ایک منصف مزاج اخبار نویس کی حیثیت سے حصہ لیا ہے۔

چنانچہ ۱۹۱۹ء کی امرتسر کانگرس کے بعد ملک میں ایسے ایسے سیاسی واقعات ظہور پذیر ہوئے کہ ہر نوجوان خود اپنے محور سے ہٹا ہوا دکھائی دیتا تھا۔ اس کی بڑی وجہ ہندو مسلم اتحاد بھی تھا اور پھر امرتسر تو انگریز کے ظلم و ستم کا خاص نشانہ بن چکا تھا۔ میں سمجھتا ہوں یہی وہ اسباب تھے جو سید عطاء اللہ شاہ بخاری کو میدان سیاست میں لے آئے۔ ہر بڑے شہر میں روزانہ کسی نہ کسی تحریک کے تحت جلسے اور جلوس منعقد ہوتے تھے۔ ہندو مسلم اتحاد کی بدولت ہر تحریک میں حصہ لینے والے بھی دونوں ہندو اور مسلمان ہوتے تھے، اور وہی ان تحریکوں کے والنٹیر بھی ہوتے تھے۔ لدھیانہ اس زمانہ میں خاص اہمیت حاصل کرچکا تھا۔ اور یہاں کافی سیاسی راہنما موجود تھے۔ جگراؤں تحصیل لدھیانہ تو لالہ راجپت رائے کا گھر تھا۔ انہیں ایام میں ایک روز اس نے بھی غلہ منڈی میں تقریر کی تھی۔ لوگ ابھی تک گاندھی کی تحریک عدم تعاون سے تذبذب کی حالت میں تھے۔ کہ اتنے میں تحریک خلافت نے زور پکڑ لیا۔ مارچ ۱۹۲۰ء کا زمانہ تھا تعلیمی ادارے موسم بہار کی چھٹیوں کی وجہ سے بند ہورہے تھے۔ اور میں لاہور گھر آنے کی تیاری کررہا تھا کہ شہر میں اعلان ہوگیا کہ ۱۹ مارچ جمعہ کے دن تمام ہند میں "یوم خلافت" منایا جائے گا اور سارے ہندوستان میں ہڑتال ہوگی۔ چنانچہ یہ ہڑتال ہوئی اور خوب ہوئی اس روز لدھیانہ میں بعد دوپہر ایک عظیم الشان جلسہ ہوا جس کی صدارت ایک ہندو وکیل گنپت رائے نے کی۔ مولوی حبیب الرحمن اور میاں عبد الحئی نے تقریریں کیں۔ ریزولیوشن پاس کئے۔ ایک ہنگامہ بھی ہوا۔ تجویز میں کچھ الفاظ زائد کرنے کے مسئلے پر اختلاف ہوگیا۔ جس کی بنا پر ایک اور صدر کا انتخاب ہوا اور از سر نو جلسہ ہوا۔ مجھے خوب یاد ہے کہ جلسے میں وکیل مولوی کریم بخش مرحوم نے حالی کی دعاء

اے خاصۂ خاصان رسل وقت دعا ہے

نہایت رقت کے ساتھ کھڑے ہوکر پڑھی اور جلسہ اختتام کو پہنچا۔

اس جلسے کے بعد لاہور آنے کا ارادہ کرہی رہا تھا کہ اتنے میں شہر میں پھر اعلان ہوگیا کہ ۲۴ مارچ کی شب کو ایک بہت بڑا جلسہ ہوگا۔ بعض لوگ یہ بھی افواہ پھیلارہے تھے کہ گاندھی جی آئیں گے اور یہ جلسہ عدم تعاون سے متعلق ہوگا۔ ہم سب احباب مل کر گلچین گلی سبحان منزل سے جلسہ میں گئے۔ اس زمانہ میں ایسے جلسوں میں کمبل ساتھ لے جایا کرتے تھے۔ کیوں کہ رات بھر جلسے ہوتے تھے اس رات ہم انتظار کرتے رہے دیر تک کوئی بھی نہ آیا۔ مگر لوگ برابر آتے جارہے تھے اور متمنی تھے کہ عدم تعاون سے متعلق کچھ سنیں کہ یہ ہے کیا۔ کیونکہ اس کے متعلق وہاں یہ پہلا جلسہ تھا۔ اگرچہ اخبارات میں کافی شور ہوچکا تھا کسی نے کہا ٹرین لیٹ ہے مقررین حضرات ضرور آئیں گے آپ انتظار کریں۔ اس زمانہ میں دو ٹرینیں لاہور سے رات کے وقت آتی تھیں ایک رات ۹ بجے کے قریب ہردوار کے لئے اور نصف شب کے قریب بمبئی میل آتی تھی چنانچہ شور ہوا کہ جلسہ میں تقریر کرنے والے لوگ آگئے ہیں تھوڑی دیر کے بعد ہم نے دیکھا کہ کچھ لوگوں کے ہمراہ جو منتظمین تھے۔ تین اور حضرات بھی سٹیج پر آئے۔ معلوم ہوا کہ ان میں ایک تو سید عطاء اللہ شاہ بخاری دوسرے مولانا سید داؤد غزنوی اور ملک لال خان صاحب شامل ہیں جیسا کہ میری کاپی میں اس شب کی یادداشت میں لکھا ہوا ہے جلسے میں ان تینوں حضرات کا مع ان کے کارناموں سے تعارف کرایا گیا۔ سید عطاء اللہ شاہ بخاری کے متعلق کہا گیا کہ ایک دو روز ہوئے آپ کی شادی ہوئی

ہے اس وقت کو آج بھی میری آنکھیں دیکھ رہی ہیں کہ سید صاحب ایک بند گلے کا کوٹ یا شیروانی سفید شلوار اور سر پر ایک مشہدی لنگی باندھے ہوئے تھے۔ نہایت خوب صورت نوجوان، داڑھی تھی جس کو ابھی تک قینچی نے بھی نہیں چھوا تھا۔ لدھیانہ کے لوگ آپ سے بالکل ناآشنا تھے۔ کیونکہ میرا خیال ہے کہ ابھی چند روز سے ہی آپ نے سیاسیات میں قدم رکھا تھا۔ میری کاپی میں جلسہ میں سامعین کی تعداد دس ہزار لکھی ہے مجھے یاد ہے کہ سب سے آخر میں آپ نے تقریر کی۔ جس کا خلاصہ میری کاپی میں درج ہے جو ہدیہ قارئین کرام کرتا ہوں۔ آپ نے ابتدا میں نہایت خوش الحانی سے تلاوت کلام پاک کی۔ جس نے حاضرین جلسہ کو بہت محظوظ کیا اور ایک سکتہ سا چھا گیا۔ آپ نے تقریر میں فرمایا "ہمیں زمانہ کے تقاضوں کے تحت آج (برٹش) گورنمنٹ کے خلاف عمل کرنا چاہیئے۔ یعنی انکم ٹیکس ادا نہیں کرنا چاہیئے۔ زمینوں کا مالیہ ادا نہ کریں۔ غیر ملکی اشیاء کی خرید و فروخت سے احتراز کرنا چاہیئے۔ مادر وطن کی بنی ہوئی چیزیں استعمال کریں۔ اور ان کو فروغ دیں۔ ہر شخص جو اپنے مذہب کی واضح ہدایت کے خلاف جابر گورنمنٹ کی ملازمت ترک کردے اور ہمارے سوراج حاصل کرنے کے یہ واضح ذرائع ہیں۔ اور ملک بھی اس طرح جلد ترقی کرے گا"

آپ تقریر کے دوران میں اشعار کو خوب عمدگی سے پڑھتے تھے۔ اور اکثر یہ شعر ضرور پڑھتے تھے

جو عدو باغ ہو برباد ہو
چاہے وہ گلچیں ہو یا صیاد ہو

اور کبھی یہ شعر بھی جھوم کر پڑھتے تھے

دل صد چاک سے بگڑی تو نہ اچھا ہوگا
زلف سے کہدو کہ پیچ کرلے شانہ سے

یہ جلسہ نصف شب کے بعد تک جاری رہا غرضیکہ میرے نزدیک سید عطاء اللہ شاہ بخاری کا یہ تھا آغاز۔ پھر اس کے بعد آج تک انہوں نے ہر طرح نہایت مستقل طور پر مجلس احرار سے وابستگی رکھی وہ عیاں ہے۔ جو بعد میں ظہور میں آئی اور آپ ہی کی مساعی جمیلہ کا نتیجہ تھا۔ اس کے بعد میں نے اکثر اوقات آپ کو دیکھا اور ملاقاتیں بھی ہوئیں تبادلہ خیالات بھی ہوا لاہور میں جب "رنگیلا رسول" کے ضمن میں ہنگامے ہوئے۔ اور مسلمانوں نے ذرا منظم طریق پر اس کی مخالفت میں جلسے شروع کئے تو آپ آگے آگے تھے۔ اور اس میں مولوی عرفان بھی شامل تھے۔ ایک رو میرا خیال ہے اسی موضوع پر مسجد وزیر خان میں نماز جمعہ کے بعد اجتماع تھا۔ اور شاہ صاحب کی تقریر تھی اس زمانہ میں اس مسجد میں مولوی سید دیدار علی شاہ صاحب خطیب تھے مگر موضوع ان کے لئے ایسا ہی تھا اور حسن اتفاق سے اس مجمع میں مولانا محمد علی صاحب اور مولوی عرفان مرحوم بھی شمولیت کے لئے آگئے تھے۔ شاہ صاحب بیان فرما رہے تھے۔ اور میں اس وقت قریب ہی بیٹھا تھا۔ تقریر نے جب زور پکڑا تو میں نے مولوی محمد علی مرحوم کو مولوی عرفان کے کان میں آپ کی تقریر سے محظوظ ہو کر عالم رقت میں کہتے سنا

ان من البیان لسحرا (حدیث)

اس خاکسار کے مراسم مولوی عرفان سے بھی تھے وہ مسکرائے اور زیادہ متوجہ ہو کر تقریر سننے لگے رنگیلا رسول

کے ایجیٹیشن نے یہاں تک زور پکڑا کہ لوگ قید ہونے لگے۔ اور یہ جلسے لاہور میں دہلی دروازہ کے باہر ایک طویلہ میں زمیندار اخبار کے دفتر کے پیچھے ہوتے تھے۔ ایک روز شاہ صاحب شام کو تقریر کر چکے تھے اور ہم منتظر تھے کہ اب آپ کو قید کیا جائیگا۔ اور اس زمانہ میں لاہور میں ایک ڈی ایس پی سید نور حسین پتلے دبلے شخص ہوتے تھے۔ ہم علامہ کے مکان پر بعد دوپہر تقریباً ۲، ۳ بجے موجود تھے یہ بھی وہاں آئے ہم سب نے سمجھا کہ شاہ صاحب کا وارنٹ گرفتاری لیکر آئے ہیں۔ جو واقعی تھا مگر انہوں نے ڈاکٹر صاحب کو باتوں میں ٹالنا چاہا غرضیکہ وہ شاہ صاحب کے بعد گرفتار ہوئے۔ اور اسی شب ایک اور شخص شیخ عبد الرشید بھی اسی جرم میں گرفتار ہوئے اس کے بعد مولوی خدا بخش (کشمیر) بھی گرفتار ہوئے غرضیکہ کافی لوگ گرفتار ہوئے۔

مجھے خوب یاد ہے کہ میں ایک مرتبہ ستمبر ۱۹۳۸ء میں جب میں دوسری مرتبہ یورپ سے واپس آچکا تھا اپنے ایک دوست سید میر احمد حسین کے ہمراہ شملہ سے چل کر بہاولپور پہنچا جو دہلی میں موجود تھے اور شاہ صاحب کے شملہ کے میزبان ہوتے تھے۔ اور ہم وہاں عشاء کی نماز کے بعد شہر میں گھومنے پھرنے کیلئے نکلے تو معلوم ہوا کہ شاہ صاحب وہاں کہیں شہر میں تقریر کر رہے ہیں تو ہم بھی پہنچے جلسہ کے اختتام پر ملاقات ہوئی معلوم ہوا کہ آپ کی طبعیت لگاتار سفر میں اور تقاریر اور کھانے کا خاطر خواہ انتظام نہ ہونے کی وجہ سے ٹھیک نہیں ہے۔ اسی طرح میں ایک مرتبہ پونہ سے (۱۹۴۰ء، ۱۹۴۷ء) بمبئی آیا تو میرے مرحوم بچپن کے دوست پروفیسر ابراہیم ڈار امرتسری نے فرمایا کہ اس مرتبہ شاہ صاحب نے بمبئی میں وہ تقریریں کی ہیں کہ اس کی مثال نہیں اور لوگ بہت محظوظ ہوئے ہیں ہم نے یہ دیکھا کہ حضرت علامہ انور شاہ مرحوم نے جو اپنے زمانہ میں علوم دینی میں امام مانے گئے تھے آپ کو امیر شریعت کے لقب سے نوازا تھا اور بیعت کی تھی۔ آپ پر یہ حدیث ان من الشعر لحکمہ وان من البیان لسحرا یعنی شعر میں حکمت ہے اور بیان میں ایک جادو ہے غرضیکہ یہ ہر دو صفات آپ پر صادق آتی تھیں آپ جب قرآن کریم پڑھتے اور اشعار پڑھتے تو ہر انسان ایک مرتبہ تو ضرور جھوم جاتا۔

کاش اس وقت ٹیپ ریکارڈ ہوتا تو آج ہمارے پاس ان کی وہ تقریریں محفوظ ہوتیں جو کئی کئی گھنٹے تک دہلی دروازہ کے باہر ہوتیں تھیں۔ اللہ تعالی مرحوم کو غریق رحمت کرے وہ واقعی آزاد مرد تھا۔

تحریک آزادی کا مقدمتہ الجیش

ماہر القادریؒ

میری جوانی کا زیادہ تر حصہ حیدر آباد دکن میں گزرا ہے۔ یو پی، پنجاب، بہار اور دوسرے صوبوں کے مشاہیر کے حالات اور خبریں دکن ہی میں دوسروں کی زبانی سنا کرتا تھا۔ مولانا سید عطاء اللہ شاہ بخاری کی تقریر و خطابت کی شہرت میں نے وہیں سنی اور تواتر کے ساتھ اہل علم کی زبانی سنی۔ اخبارات میں بھی الکاذکر آتا تھا۔ دل چاہتا تھا کہ شاہ صاحب (مرحوم) سے ملوں۔ بات چیت کروں اور ان کی تقریر سنوں۔ مگر شاید تمنا خام تھی۔ اس لئے مشیت کا ایماء تھا۔

اپنے سینے میں اسے اور ذرا تھام ابھی

میں حیدر آباد دکن سے اپنے وطن سال کے سال آیا کرتا تھا۔ ایک بار اپنے ایک عزیز کے یہاں علی گڑھ میں آکر ٹھہرا تو ایک صاحب کی زبانی معلوم ہوا کہ پرسوں مسلم یونیورسٹی میں مولانا عطاء اللہ شاہ بخاری کی تقریر تھی۔ یہ خبر سن کر اپنی محرومی پر افسوس ہوا کہ میں آج کی بجائے دو دن پہلے آجاتا تو شاہ صاحب کی تقریر سننے کا ارمان پورا ہو جاتا۔ یہ میں بائیس برس پہلے کی بات بیان کر رہا ہوں۔

ان صاحب نے بتایا کہ شاہ صاحب کی خطابت نے سننے والوں پر جادو سا کر دیا۔ خاصی طویل تقریر فرمائی۔ مگر سامعین نے ذرا سی بھی اکتاہٹ محسوس نہیں کی۔ شاہ صاحب نے فرمایا!

"سیفٹی ریزر سے گالوں کو کھرچنے اسے جوانی ظاہر نہیں ہوتی۔ جوانی تو وہ ہے جو رخساروں کے بال بال سے پھوٹ نکلے۔۔۔۔"

طلباء اور پروفیسروں کی غالب اکثریت "ڈاڑھی منڈوں" کی تھی۔ شاہ صاحب کے یہ جملے سن کر وہ نادم سے ہو گئے اور کسی کے تو سنا ہے ماتھے پر پسینہ آگیا۔

قائد ملت نواب بہادر یار جنگ مرحوم جو خطابت میں اپنی نظیر آپ تھے۔ مولانا ابو الکلام آزاد، مولانا سید عطاء اللہ شاہ بخاری کی تقریر سننے کا اشتیاق رکھتے تھے۔ ایک بار انہوں نے مجھ سے فرمایا کہ مولانا آزاد سے ٹرین میں ملاقات ہو گئی کئی گھنٹہ ان کا ساتھ رہا۔ میں نے ان سے "اجتہاد" کے بارے میں دریافت کیا۔ بولے۔ "نواب صاحب!

اگر دین میں اجتہاد کا دروازہ بند کر دیا گیا تو اس کے معنیٰ ہیں کہ "سعادت و فلاح" کی راہ میں دیواریں کھڑی کر دی گئیں۔۔۔۔۔"

نواب صاحب مرحوم نے فرمایا کہ مولانا آزاد کی بات چیت ہی میں "تقریر و خطابت" کا لطف آگیا۔ مگر نواب بہادر یار جنگ مرحوم کی شاہ صاحب سے ملاقات نہ ہو سکی۔ خود شاہ صاحب بھی نواب صاحب سے ملنے کی تمنا رکھتے تھے۔

بعض ارباب ذوق شاہ صاحب مرحوم کے جملوں کی نقل انہیں کے لہجہ میں کرتے ہیں۔ ایسی باتوں

نے میری آتش شوق کو اور تیز کر دیا۔ ایک صاحب نے بیان کیا کہ گونڈے میں شاہ صاحب نے عشاء کے بعد تقریر شروع کی ہے تو فجر کے وقت یہ شعر

محفل خموش صبح کے آثار جلوہ گر
اب حکم ہو تو ختم کروں داستاں کو میں

اپنے مخصوص دل کش ترنم میں پڑھا اور تقریر جب ختم کی ہے تو سپیدہ سحر نمودار ہو رہا تھا۔ اور لوگ محسوس کر رہے تھے کہ ان کا سامعہ سچ مچ رات بھر "کوثر و تسنیم" میں ہلکورے لیتا رہا ہے۔۔۔ "خطابت شاہ صاحب کی کرامت تھی۔"

(غالباً) ۱۹۴۴ء کا واقعہ ہے کہ لائل پور کاٹن ملز کے مشاعرے میں میرا لائل پور جانا ہوا۔ اور وہاں جا کر یہ مژدہ ملا کہ مولانا سید عطاء اللہ شاہ بخاری ان دنوں یہاں آئے ہوئے ہیں! جناب انور صابری پہلے سے لائل پور میں براجمان تھے۔ وہ شاہ صاحب سے مل بھی چکے تھے۔ میں نے شاہ صاحب کا ذکر چھیڑا تو بولے۔ میں تمہیں لے کر ابھی ابھی شاہ صاحب کی قیام گاہ پر چلوں گا۔ وہ بھی تم سے ملنے کا اشتیاق رکھتے ہیں۔

شاہ صاحب مرحوم کے یہاں جو پہنچنا ہوا تو دیکھتے ہی کھڑے ہو گئے اور خوب بھینچ بھینچ کر بغل گیر ہوئے انکی اس پذیرائی، غیر معمولی شفقت اور خورد نوازی کو دیکھ کر میں "فرش پا انداز" ہوا جاتا تھا۔ بیٹھتے ہی بولے:۔

"تمہارے شعروں سے میں کیا کام لیتا ہوں یہ میری تقریروں سے معلوم ہو گا"

پھر ان کے ایماء پر شعر خوانی ہوئی ایک غزل سنا چکتا تو دوسری کیلئے فرمائش کرتے۔ داد دینے کا انداز والہانہ تھا۔ میں نے زندگی میں بہت ہی کم لوگوں کو اتنی صحیح اور معقول داد دیتے ہوئے دیکھا ہے

دوسرے دن شام کو شاہ صاحب کی تقریر تھی۔ انکی تقریر سننے کا اشتیاق کشاں کشاں مجھے جلسہ گاہ میں لے گیا۔ شاہ صاحب نے تقریر کے آغاز ہی میں فرمایا

"دو آدمیوں کی دو تمنائیں تھیں۔ ایک تمنا پوری ہو گئی یعنی میں نے ماہر القادری کا کلام ان کی زبان سے سن لیا۔ ماہر القادری میری تقریر سننے کی تمنا رکھتے ہیں مگر میں اتنے بہت سے پنجابی بولنے والوں کو نظر انداز کر کے صرف ان کے لئے "اردو" میں تقریر کیسے کروں؟ مگر پھر بھی میں اپنی تقریر میں ماہر القادری کے ذوق و تمنا کی رعایت ملحوظ رکھوں گا۔"

حضرت شاہ صاحب نے ملی جلی اردو اور پنجابی میں تقریر کی یہ غالباً ان کا پہلا تجربہ تھا۔ زبان کی اس دو رنگی اور دو عملی نے تقریر میں خاصہ تکلف پیدا کر دیا۔ اتنے میں ایک صاحب کار لے کر مجھے لینے آ گئے۔ ڈپٹی کمشنر کے یہاں شاعروں کا ایٹ ہوم تھا۔

اس واقعہ کے دو ڈھائی سال بعد دلی میں شاہ صاحب کی تقریر کا اعلان ایک پوسٹر میں نظر سے گزرا میں رات کو ٹھیک وقت پر جلسہ گاہ میں پہنچا۔ ہزاروں کا مجمع پہلے سے موجود تھا۔ اور لوگ آئے چلے جا رہے تھے۔

شاہ صاحب نے کلام پاک کی تلاوت کے بعد میر کے اس شعر سے اپنی تقریر کا آغاز کیا

اک موج ہوا پیچاں اے میر نظر آئی
شاید کہ بہار آئی، زنجیر نظر آئی

یہ وہ زمانہ تھا جب وہ مسلم لیگ کے شدید مخالف تھے شاہ جی نے اپنی تقریر میں فرمایا۔

"اتنا بڑا مجمع کہ یہاں سے تھالی اُچھال دوں تو شاید ایک فرلانگ تک وہ تھالی سروں ہی پر اُچھلتی اور تیرتی رہے مگر میں سننے والوں کی اس بھیڑ سے کچھ خوش نہیں ہوں۔ تم لوگ کانوں کے عیاش ہو۔ تم تقریر کے چٹخاروں کیلئے یہاں آئے ہو۔ دوسرے کیمپ والوں کا جلسہ ہوتا ہے تو وہاں بھی تم اسی ذوق و شوق کے ساتھ جاتے ہو"

شاہ جی نے جب تقریر ختم کی تو تین گھنٹے ہو چکے تھے۔ مگر محسوس یہ ہو رہا تھا کہ تقریر شروع ہوئے زیادہ دیر نہیں ہوئی۔ شاہ جی کی شگفتہ بیانی نے وقت کی طوالت کا احساس ہی نہیں ہونے دیا۔ ورنہ ڈیڑھ دو گھنٹہ کے بعد بڑے سے بڑے خطیب اور مقرر کی تقریر کھلنے لگتی ہے۔

اس کے بعد ۱۹۴۸ء میں انہیں ملتان کے بسوں کے اڈے پر اس حالت میں کھڑے دیکھا کہ ملگجے کپڑے پہنے تھے۔ اور ہاتھ میں خاصا لمبا لٹھ تھا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب وہ خان گڑھ ضلع مظفر گڑھ میں قیام پذیر تھے۔ اور مشہور یہ تھا کہ سیاست سے علیحدہ ہو چکے ہیں۔ اور خاموش زندگی بسر کر رہے ہیں۔ پھر شاہ جی نے ملتان کو اپنی اقامت گاہ بنا لیا۔ محلہ ٹبی شیر خان کے ایک معمولی سے کچے مکان میں رہتے تھے۔ میں دو بار ان کی خدمت میں حاضر ہوا۔ بڑے مزے کی چائے پلائی "چائے کے ساتھ کچھ لوازمات بھی تھے۔ اور ان سب سے بڑھ کر ان کے لطیفے اور چٹکلے (چائے کی پیالی میں ان کے تبسم کی شکر گھل جانے سے لطف دوبالا ہو گیا) پہلی بار کی حاضری میں مجھ سے کہا اپنا "سلام" سناؤ۔ میں نے عرض کیا آپ تو کئی بار سن چکے ہیں۔ فرمایا "بھئی کچھ پردے میں رہنے والے بھی آپ کا "سلام" سننا چاہتے ہیں"

خاصی دیر تک شعر خوانی رہی۔ میرے اصرار پر اپنی فارسی نعتیہ غزلیں بھی سنائیں۔ شاہ جی کے بوریئے پر بیٹھ کر شعر سننے اور سنانے کا جو لطف آیا وہ لطف قیمتی صوفوں اور بیش قیمت قالینوں پر بھی میسر نہیں آیا۔ یہی وہ شانِ فقر ہے جس کے آگے سطوت شاہی دبتی اور مجرموں کی طرح شرماتی نظر آتی ہے۔

کراچی میں "تحفظ ختم نبوت" کا دفتر میرے مکان سے قریب ہی تھا۔ جب بھی شاہ جی کراچی تشریف لاتے۔ ان کی خدمت میں ضرور حاضر ہوتا۔ ایک بار ان کا ملتان سے آنا ہوا۔ مجھ سے پہلی ملاقات میں فرمایا۔

"آپ کا لکھا ہوا افسانہ ابوذر (شاہ جی کے سب سے بڑے فرزند) نے مجھے راستے میں سنایا تھا۔ افسانہ خوب تھا مگر افسانہ پھر افسانہ ہے اس میں جھوٹ ہی تو ہوتا ہے"

تقریباً ڈیڑھ سال ادھر کی بات ہے کہ مظفر گڑھ کے مشاعرے میں جانا نکل آیا۔ وہاں آتے جاتے جناب صابر دہلوی کے یہاں ملتان ٹھہرنا ہوا۔ پتہ لگا کہ شاہ جی بیمار ہیں۔ میں عاصی کرنالی صاحب کو ساتھ لے کر محلہ ٹبی شیر خان پہنچا وہاں جا کر پتہ لگا کہ شاہ جی لاہور تشریف لے گئے ہیں۔ ان سے نہ ملنے کا اس وقت بھی

افسوس رہا اور اب جب کہ وہ اس دنیا میں نہیں رہے یہ افسوس رنج وملال میں بدل گیا۔۔۔۔۔ میرا ہی شعر ہے۔

کیا کام اسے معرکۂ تیغ و سناں سے
واعظ تو فقط زینت منبر کے لئے ہے

مگر شاہ جی ایسے واعظ تھے جو منبر کی زینت بھی تھے اور معرکۂ تیغ و سناں میں بھی کسی سے پیچھے نہ تھے۔ انگریز کے مستبد دور میں حق گوئی کی بدولت جوانی کا آخری زمانہ اور اس کے بعد کے چند سال قید و بند کی مصیبت میں بسر کئے۔ چھوٹتے اور پھر گرفتار کر کے بند کر دیئے جاتے۔ یہ سلسلہ ایک دو نہیں اٹھارہ سال تک چلتا رہا۔ توپ، بندوق اور بم کے گولے تو گاندھی جی اور جواہر لعل نہرو نے بھی نہیں چھوڑے۔ انگریز کی مخالفت اور اس کی پاداش میں جیل خانہ تمام آزادی پسند لیڈروں کا یہی حال رہا ہے۔ عطاء اللہ شاہ بخاری مرحوم قربانی اور آزادی کی جدوجہد کی منزل میں "مقدمۃ الجیش" سے بھی آگے نظر آتے ہیں۔

محبت رسول ﷺ ان کی سیرت و کردار کا سب سے بڑا نمایاں وصف ہے۔ حضور خاتم النبیین ﷺ کی محبت ان کے مزاج و طبیعت میں رچی ہوئی تھی۔ قادیان کی جھوٹی نبوت کے خلاف انہوں نے "لسانی جہاد" کیا ہے بس یہی عمل خیر ان کی مغفرت کے لئے کافی ہے (ان شاء اللہ العزیز)

شاہ جی کو جو غیر معمولی شہرت ملی اور قبول عام حاصل ہوا اس کا سبب ان کی خطابت تھی جس نے ان کی شخصیت کو ابھارا وہ بڑے حسین وجیہہ اور خوش شکل انسان تھے۔ سرخ و سپید رنگ، خوبصورت ناک نقشہ، آواز میں درد اور لہجہ میں شیرینی، تقریر کرنے کے لئے اسٹیج پر آتے تو ان کی صورت دیکھتے ہی لوگوں کے دل کھنچنے لگتے۔ سننے والوں کی دلچسپی کے لئے ہر چیز ان کے پاس تھی۔ شکل و صورت، آواز، لہجہ، طرز ادا، شیرینی، نغمگی، طنز، لطیفے، چٹکلے، کلامِ پاک کی تلاوت میں کس قیامت کا سوز اور درد تھا۔

وہ پڑھیں اور سنا کرے کوئی

شعر پڑھنے کا انداز زیادہ دلنشین تھا۔ تقریر کرتے کرتے موضوع سے دور چلے جاتے تو انکی خطابت کا زور اور بیان کی دل نشینی اس کا احساس بھی نہ ہونے دیتی۔ وہ اپنی ذات سے سچ مچ انجمن واقع ہوئے تھے۔ ان کی زندگی جفاکشی اور مجاہدہ کی زندگی تھی۔

آدابِ شریعت کی وہ نگہداشت نہ کرتے تو اور کون کرتا۔ وہ "امیر شریعت" تھے۔ حضرت شاہ جی اپنی ذات سے صلح اور خیر پسند تھے۔ اللہ تعالیٰ شاہ جی اعلی اللہ مقامہ کی قبر کو خنک اور روشن رکھے۔ (برد اللہ مضجعہ، نور اللہ مرقدہ) (ماہنامہ "فاران" نومبر ۱۹۶۱ء)

تحریر۔ سید ضمیر جعفری
روایت: ظفر اقبال سلیم

امیر شریعت کا ایک سفارشی خط

بعض لوگوں کی گفتگو اتنی رس بھری ہوتی ہے کہ اگر وہ عین مین اپنا کہا ہوا لکھ دیں تو ایک دلچسپ مطالعہ مرتب ہو جائے ہمارے دوست ظفر اقبال سلیم کو قدرت نے یہ جوہر بڑی فیاضی سے عطا کیا ہے ایک مرتبہ انہوں نے ہمیں امیر شریعت حضرت سید عطاء اللہ شاہ بخاری مرحوم کے ایک سفارشی خط کی روداد سنائی جو تقریباً انہی کے الفاظ میں ملاحظہ ہو۔

میں ایم اے پاس کر کے اپنے آبائی شہر سانگلے چلا گیا۔ کراچی سے ایک دوست نے جو میری طرح تازہ تازہ ایم۔ اے پاس کر کے ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھا تھا۔ خط لکھا کہ یہاں کراچی کے ایک کالج میں لیکچرار کی آسامی خالی ہے۔ پرنسپل صاحب تقرر کے مجاز ہیں۔ سنا ہے کہ پرنسپل صاحب سید عطاء اللہ شاہ بخاری سے ارادت رکھتے ہیں تم یوں کرو کہ ان سے ایک سفارشی خط لیکر بھیج دو۔

میں شاہ صاحب کو ان کے قائدانہ مرتبے اور خطابت کی شہرت سے تو جانتا تھا لیکن مجھے یہ معلوم نہ تھا کہ وہ جیل کے اندر ہیں یا جیل کے باہر۔ حمید نظامی صاحب سے میرے مراسم تھے۔ ان سے اتا پتا دریافت کیا معلوم ہوا کہ شاہ صاحب ملتان میں قیام پذیر ہیں۔

سانگلے کی ریل گاڑی تڑکے تڑکے ملتان پہنچتی تھی۔ میں اس شہر سے قطعاً واقف نہ تھا۔ اسٹیشن سے نکلتے ہی ایک صاحب سے جنہوں نے جون کے مہینے میں مغربی سوٹ بوٹ ڈانٹ رکھا تھا شاہ صاحب کے بارے میں پوچھا۔ انہوں نے نہ صرف لاعلمی ظاہر کی بلکہ کانوں پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

''اے نوجوان! ہم سرکاری ملازم ہیں ہم تو ادھر سے گزرتے ہی نہیں جہاں سے شاہ صاحب کا گزر ہو'' (جیسے کہہ رہا ہوں کہ ہم بہو بیٹیاں یہ کیا جانیں) مگر دوسرے ہی آدمی نے جو عوام الناس کے مانند کٹا پھٹا تھا شاہ صاحب کے ٹھکانے کی نشاندہی کر دی۔ اگرچہ موصوف صرف اتنا ہی بتا سکے کہ شاہ صاحب حسین آگاہی کی کسی مسجد میں درس دیتے ہیں۔ (۱)

ملتان خدا کے فضل سے مساجد کا شہر ٹھہرا۔ حسین آگاہی میں دو مسجدیں جھانکنے کے بعد تیسری میں جا کر امید بر آئی۔ وہ بھی بقدر نصف۔ مسجد میں بچے قرآن پاک تو پڑھ رہے تھے مگر شاہ صاحب کی بجائے کوئی (۲) اور مولوی صاحب درس دے رہے تھے۔ معلوم ہوا کہ شاہ صاحب گھر پر ہیں کیونکہ ان کی طبیعت چند روز سے ناساز ہے۔ میں نے مولوی صاحب سے کہا۔ ''مولانا! میں بڑی دور سے آیا ہوں۔ حاضری ضروری ہے براہ کرم

۱۔ ان صاحب کو سہو ہوا۔ شاہ جی اُس مسجد میں درس نہیں دیتے تھے۔

۲۔ حضرت مولانا قاری رحیم بخش صاحب پانی پتی رحمہ اللہ جو حضرت شاہ جی کے تین بیٹوں کے استاد تھے اور مسجد سراجاں حسین آگاہی میں بچوں کو قرآن کریم حفظ کراتے تھے۔ (کفیل)

کوئی شاگرد رہنمائی کے لئے میرے ساتھ کر دیجئے" مولوی صاحب قدرے ہچکچائے کچھ دیر مجھے سر سے پاؤں تک دیکھتے رہے۔ انکار کرنا چاہتے تھے مگر نہ کر سکے کہ۔

مروت حسن عالمگیر ہے مردان غازی کا

آخر ایک شاگرد میرے ساتھ کر دیا مگر اس شرط کے ساتھ کہ وہ دور سے آستانہ دکھا کر واپس آجائے گا۔

آستانہ مسجد سے خاصا دور تھا۔ ہم وہاں تک تانگے پر گئے۔ شاگرد نے استاد کے حکم کی حرف بہ حرف تعمیل کی دور سے شاہ صاحب کے آستانے کی نشاندہی کر کے لوٹ گیا۔

دل کو پہلا دھچکا مکان کو دیکھ کر لگا۔ ہمارے ملک میں ایک بطل جلیل اور اتنے معمولی سے مکان میں رہائش پذیر۔ دروازے پر دستک دی تو ایک مولوی صاحب نکلے وہ مجھے اندر لے گئے۔ شاہ صاحب پہلے ہی کمرے میں تشریف رکھتے تھے۔ جو خاصا کشادہ تھا۔ چٹائی بچھی تھی۔ برصغیر پاک و ہند کا شعلہ نوا خطیب اور جنگ آزادی کا عظیم مجاہد ایک دیوار کے قریب ایک پرانے سے تکیے سے ٹیک لگائے بیٹھا تھا۔ چند کاغذات سامنے بکھرے پڑے تھے۔ ایک پلندہ تکیے کے نیچے دبا رکھا تھا۔ میں نے سلام کیا۔ آپ نے سلام کا جواب دیکر جس میں تپاک کی گرمی تھی پھر اپنے کاغذات پر جھک گئے۔ چند کاغذات تکیے سے نکالے۔ چند تکیے میں رکھے۔ پھر خاکسار کو ایک نگاہ بندہ نواز سے نوازا اور گویا ہوئے۔ "عزیزم! آپ کہاں سے تشریف لائے ہیں؟ کہو فقیر کے پاس کیسے آنا ہوا؟

اس سے پیشتر کہ میں کچھ عرض کرتا۔ فرمایا! "ماشاء اللہ! آپ ابھی نوجوان ہیں۔انگریزی آپ کے چہرے پر لکھی ہے ابھی عملی زندگی کی دہلیز پر کھڑے ہیں کیا آپ کو کسی نے فقیر کے ہاں آنے سے روکا نہیں؟

میں بات نہ سمجھ سکا اور بولا "حضور کوئی مجھے کیوں روکتا۔

شاہ صاحب کا چہرہ مسکراہٹ سے کھل اٹھا فرمایا۔ "ہمارے دروازے پر سی آئی ڈی کی نگرانی رہتی ہے کہیں آپ کا نام بھی گروہ وفا ستان کی فہرست میں نہ لکھ لیا جائے لینے کے دینے نہ پڑ جائیں۔"

میں دل میں قدرے ہراساں تو ہوا کہ دوست کو نوکری دلواتے دلواتے کہیں اپنی ملازمت ہی سے ہاتھ نہ دھو بیٹھوں۔ بہر حال دل گردے پر ہاتھ رکھ کر ذرا کراری سی آواز میں اپنا مدعا بیان کیا اور حضرت کی خدمت میں باریابی کے متعلق اپنے اشتیاق اور جگر داری کا جذبہ حفیظ جالندھری کے ایک مصرع میں اس طرح ظاہر کیا کہ۔

دونوں جہاں ہیں آج مرے اختیار میں

عرض مطلب سننے کے بعد شاہ صاحب کی پیشانی پر ایک لحظے کے لئے ایک متفکر سی شکن نمودار ہوئی جو دوسرے ہی لحظے ایک دل نواز تبسم میں ڈھل گئی۔

"صاحبزادے! آپ نے جن پرنسپل صاحب کا نام لیا ہے میں تو ان سے واقف نہیں وہ شاید مجھے

جانتے ہوں، خیر!"

کمرے کے گوشے میں شاہ صاحب کی نشست کے نزدیک پانی کی ایک صراحی اور ٹین کا ایک ڈبہ رکھا تھا۔ آپ نے صراحی سے پانی اور ڈبے سے کچھ دیسی شکر نکالی۔ اور ایک کلاسیکی کٹورے میں شربت گھولنے لگے۔ باتیں بھی ہو رہی تھیں شربت بھی تیار ہو رہا تھا۔ ادھر میرا دل ڈوبا جا رہا تھا۔ کہیں یہ مشروب میری ہی تواضع کے لیے نہ بن رہا ہو۔ میں نے دیسی شکر کا شربت کبھی پیا نہ تھا۔ برف بھی نہ تھی۔ حالانکہ جون کا مہینہ تھا۔ لیکن جب شاہ صاحب نے شربت میری طرف بڑھایا تو میں پورا کٹورا غٹاغٹ ایک سانس میں پی گیا۔ شاہ صاحب غالباً میرے چہرے کا اڑتا ہوا رنگ بھانپ گئے تھے۔ فرمایا "فقیر کے ہاں تو یہی کچھ حاضر ہے۔"

وہ زبان سے کچھ بھی نہ کہتے تو میرے لئے ان کی ایک نگاہ ہی کافی تھی۔ میں سمجھتا ہوں کہ دیسی شکر کے اس ایک کٹورے نے زندگی سے میرے ربط کا زاویہ ہی بدل کر رکھ دیا۔

"میں ان صاحب کو جانتا تو نہیں" شاہ صاحب کہہ رہے تھے۔ "بہرحال" اگر میرے چند لفظوں سے کسی کا کام سنور جاتا ہے تو اس سے میرے دل کو بھی آسودگی ملے گی۔ ہم کرسی پر تو نہیں۔ تاہم بعض لوگ ہماری بات سن بھی لیتے ہیں" یہ کہہ کر آپ نے یہ مصرع پڑھا۔

ابھی کچھ لوگ باقی ہیں جہاں میں

اب آپ نے تکیے کے نیچے سے کورا کاغذ نکالا اور رواں دواں چند سطور لکھ دیں۔ زندگی میں اب تک ہم نے ہزاروں سفارشی خط دیکھے ہیں۔ لیکن اتنی غیر سفارشی سفارش ہماری نظر سے نہیں گزری۔ لکھا تھا کہ "ہر چند فقیر کو آپ سے کوئی سابقہ نیاز تو حاصل نہیں لیکن ایک نوجوان کی ضرورت کے احساس سے یہ سطور لکھ رہا ہوں"۔ یہاں تک تو سفارش ٹھیک چل رہی تھی لیکن آگے آپ نے صاف صاف یہ لکھ دیا کہ "اگر یہ کام آپ کے ہاتھوں ہو گیا تو گویا یہ کام آپ نہیں کریں گے بلکہ خدا کرے گا۔ اور اگر خدا کو منظور نہ ہوا تو ظاہر ہے یہ کام آپ نہیں کر سکتے"۔

شاہ صاحب نے کچھ غلط بات نہیں لکھی تھی مگر آج کے زمانے میں اتنی درست بات کون سنتا ہے؟ سفارش کی زبان پر خود ہمارے دل میں کھد بد ہو رہی تھی۔ ہمارا کمزور ایمان ڈگمگا رہا تھا کہ ایسی سفارش پر جس میں آدمی کے پاس کوئی اختیار ہی نہ رہنے دیا گیا ہو بھلا کوئی آدمی کیوں دھیان دے مگر صاحب! ہمارے دوست کو وہ آسامی مل گئی۔ سچ ہے کہ خدا اتنا ہی نہیں ہے جتنا آدمی کو نظر آتا ہے۔

میں سفارشی خط جیب میں رکھ کر الفاظ سپاس ہی سوچ رہا تھا کہ ناگاہ حضرت نے ایک سوال پوچھ لیا۔

"ہم نے ایک خبر پڑھی ہے کہ انٹرنس کے امتحان میں موسیقی، نصاب میں ایک مضمون کی حیثیت سے شامل کی جا رہی ہے

لَا حَولَ وَلَا قُوۃَ الا باللہ

یہ کیا فتنہ کلاہ برپا ہو رہا ہے؟ آپ کو تو کچھ خبر ہو گی کہ آپ تازہ واردان بساط نو میں سے ہیں۔ کچھ اس نئے

فشار گیسو وچاک قبا کا حال تو بتائیں۔"

واقعہ یہ تھا کہ مجھے نصاب تعلیم میں اس تبدیلی کی قطعاً کوئی خبر نہ تھی ہم اپنی تعلیم ختم کر چکے تھے اس کے بعد درس اور مدارس میں

اپنی بلا سے بُوم بسے یا ہُما رہے

مجھے چاہیئے تھا کہ میں سیدھے سیدھے دو چار لفظوں میں اپنی پوزیشن واضح کر دیتا کہ حضور میں اس خبر کی صحت یا عدم صحت کے بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتا مگر شاید شاہ صاحب کی نغز گفتاری نے میرے اندر چھپا ہوا کالج یونین کا سابق جنرل سیکرٹری بیدار کر دیا۔ میرے منہ سے نکل گیا۔

"حضرت! یہ تو مجھے معلوم نہیں کہ موسیقی انٹرنس کے نصاب میں شامل کی جا رہی ہے یا نہیں مگر حضور کسی انگریز مفکر کا قول ہے کہ موسیقی روح کی گرد کو دھو ڈالتی ہے"

شاہ صاحب نے اس پر ایک زبردست قہقہہ لگاتے ہوئے فرمایا۔ "مجھے ڈر ہے موسیقی گرد کے علاوہ کہیں پوری روح ہی کو نہ دھو ڈالے"

دو ایک جملے تو انہوں نے شگفتہ شگفتہ طنز میں ادا فرمائے جن میں مجھے مخاطب کر کے اقبال کا یہ مصرع بھی سنایا کہ

ترا علاج نظر کے سوا کچھ اور نہیں

لیکن دو چار جملوں کے بعد وہ جلال میں آ گئے۔ خطابت کا دریا چڑھاؤ پر آ گیا۔ وہ باقاعدہ تقریر کرنے لگے۔ جیسے ان کے سامنے میں اکیلا نہ بیٹھا تھا بلکہ حاضرین کا سمندر ٹھاٹھیں مار رہا تھا۔

کیا نظام تعلیم پر تیر برس رہے تھے۔ "یہ کیا نظام تعلیم ہے جو بے چینی کے سوا کچھ نہیں دے سکتا؟ جو دختران ملت کو نچوانے پر تلا ہوا ہے"

حکومت کے پرزے اڑ رہے تھے۔ "تعلیم کم ہے تحریص زیادہ ہے پبلسٹی پر زور ہے قلندری نے خواجگی کی قبا اوڑھ لی ہے"

کچھ مخلوط اقوال تھے مثلاً۔ "شہزادے تب بگڑتے ہیں جب وہ علماء سے منہ موڑ لیتے ہیں۔

تعلیم کی غایت کو اسلام کے نظام عدل و معاش سے مربوط کرتے ہوئے فرمایا۔ "اسلام اپنی ایک نئی دنیا پیدا کرتا ہے۔ اسلام اپنی علیحدہ پہچان رکھتا ہے۔ اسلامی معاشرے میں آدمی کا سماجی مرتبہ۔ رنگ، نسل، دولت وغیرہ سے متعین نہیں ہوتا اعمال سے متعین ہوتا ہے۔"

ایک ذاتی سی فہمائش جو مجھے ہمیشہ یاد رہے گی یہ فرمائی "بیٹا! محرومیوں کے باوجود اپنی ذات پر اعتماد قائم رکھنا۔ قوموں کی زندگی ایک تسلسل کا نام ہے۔ اس تسلسل کو زندہ رکھنا"

شاہ صاحب کے ایک ایک لفظ سے اضطراب و جلال کا دریا چھلک رہا تھا۔ ان کی آواز دور دور تک جا رہی تھی۔ لگتا تھا جیسے کوئی زخمی شیر دھاڑ رہا ہو۔

میں بلکہ سارا ماحول اس وقت شاہ صاحب کے سحر خطابت میں جھوم رہا تھا۔ حقائق دل میں ترازو ہو

رہے تھے۔ ادب کا سرچشمہ ابل رہا تھا۔ وہاں سے اٹھنے کو جی تو کیا چاہتا مگر ساتھ ہی ڈر لگ رہا تھا کہ اگر سی آئی ڈی نے پہلے چشم پوشی سے کام لیا بھی تو اب ضرور دھر لے گی۔ چنانچہ ایک مقام پر جیسے ہی ان کا آشوب دل ذرا دھیما ہوا ہم اجازت لے کر آستانے سے باہر نکل آئے مگر بہت دور تک قدم اور دل بوجھل بوجھل رہے۔ یہ ملال کا بوجھ تھا کہ دیکھو جو شخص اس ملک کی آزادی کے لئے اپنے خون جگر سے چراغ روشن کرتا رہا اس کے حجرے میں بتی نہ دیا ہے!

(بشکریہ اردو ڈائجسٹ دسمبر ۱۹۸۳)

خطیبانِ عصر کے نام

مقرر کے لئے خوش گفتار اور خوش خلق ہونا لازم ہے۔ قرآن مجید کی دعوت سراسر خوش خلقی پر مبنی ہے۔ ایک شخص مبلغ بھی ہو اور بد خلق بھی تو وہ نہ صرف اپنے علم اور دعوت کا دشمن ہے بلکہ لوگوں میں بُرے اثرات پیدا کرتا ہے۔ انسان کے بہت سے روگ اس کی زبان سے پیدا ہوتے ہیں۔ جس انسان کی زبان قابو میں نہیں وہ اپنا دشمن ساتھ رکھتا ہے۔ اگر تم مخلوق خدا کے دلوں پر قبضہ کرنا چاہتے ہو تو اپنے اندر خوش خلقی کی صفات پیدا کرو۔ خوش گفتاری اگر گفتگو یا تقریر کا جوہر ہے تو خوش خلقی انسان کا زیور۔ خطابت انبیاء کی میراث ہے۔ ہر نبی بنیادی طور پر خطیب ہی ہوتا ہے۔ مصنف نہیں۔ انبیاء کرام نے خطابت کے ذریعہ ہی اللہ کا پیغام لوگوں تک پہنچایا ہے۔ اللہ نے موسیٰ اور ہارون علیہم السلام کو فرعون سے ہم کلامی کے لئے نصیحت فرمائی۔ وقولالہ قولا لینا لعلہ یتذکرا ویخشی کہ آپ دونوں فرعون سے نرم و گداز گفتگو فرمائیں۔ ہو سکتا ہے وہ نصیحت حاصل کرے اور قرآنِ کریم نے حسنِ مخاطبت کی تذکیر عام یوں فرمائی۔

"وقولوا للناس حسنا" بات وہ کرو جو حُسن بکھیرے۔

امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاری

اس پیکر علم و عمل کو جانتے ہو؟

وہی جس کے ہاتھ پر حجت الاسلام علامہ محمد انور شاہ کشمیری رحمہ اللہ نے سب سے اول بیعت کی۔
وہی جس کے ہاتھ میں پانچ سو علماء نے مجمع عام میں ہاتھ دے دیئے۔
وہی جو چالیس برس کی عمر میں پانچ دفعہ حکومت کے عتاب کا شکار ہو چکا ہے۔
وہی جو برسوں جیل کی کالی کوٹھڑیوں میں زندگی کی بہاریں لٹا چکا ہے۔
ہندوستان کی چالیس کروڑ کی آبادی میں
جس کی ٹکر کا ایک آدمی نہیں۔
اس جیسا خوش بیاں نہیں۔
اس جیسا جادو بیاں نہیں۔
جس کے ایک ایک لفظ پر ہر مجمع میں ہزاروں آدمی آمادہ عمل ہو جاتے ہیں۔
یہ ہیں امیر شریعت سید عطاء اللہ بخاری

مفکر احرار
چودھری افضل حق رحمہ اللہ

اقتباس اداریہ روزنامہ "مجاھد" لاہور
۱۲ ستمبر: ۱۹۳۵ء

سید رئیس احمد جعفری مرحوم

سید عطاء اللہ شاہ بخاری - کچھ یادیں

سید رئیس احمد جعفری-------- مرحوم ہندوستان کے لیگی نہاد لکھاریوں میں امام الائمہ کے درجہ پر فائز تھے۔ عالم دین، مصنف، مترجم، صحافی، اردو، عربی، فارسی اور انگریزی میں طاق---- لیکن افسوس تعصبات کے مسموم ماحول میں یوں کھو کر رہ گئے کہ قوم کو کوئی فکری سرمایہ منتقل نہ کرسکے۔ ان کا سرمایہ افتخار محمد علی جوہر اور محمد علی جناح کی "امامت معصومہ" کا منادو مفسر ہونا تھا اور بس! اس اعتبار سے دیکھا جائے تو زیر نظر مضمون کی اہمیت بہت بڑھ جاتی ہے۔ تاریخ کا تجزیہ کرنے والے اور تاریخ کی تذلیل کرنے والے دونوں کو اس مضمون کے بین السطور جھانکنے کی دعوت عام ہے!

ماخوذ "ٹام راج سے رام راج تک" صفحہ ۲۴۰ تا ۲۴۵ (ذوالکفل)

معجزہ اہل فکر فلسفۂ پیچ پیچ
معجزہ اہل ذکر موسیٰ و فرعون و طور

مولانا عطاء اللہ شاہ بخاری بھی اس دنیا سے رخصت ہوگئے---ہا!

جو بادہ کش تھے پرانے وہ اٹھتے جاتے ہیں
کہیں سے آب بقائے دوام لا ساقی!

لیکن یہ آب بقائے دوام کس کو ملا جو بخاری کو مل جاتا؟ جب احمد مرسل ﷺ نہ رہے کون رہے گا؟

مولانا بخاری بہت بڑے عالم نہیں تھے نہ مفسر نہ محدث، نہ فقیہ، نہ متکلم لیکن وہ بڑے انسان ضرور تھے، ان میں قلندرانہ صفات تھیں درویشانہ ادائیں اور فقیرانہ جلال!

مولانا سیاست کے میدان میں ایک سیاست داں کی طرح نہیں آئے تھے نہ انہیں ہندوستان کے آئندہ دستور سے دلچسپی تھی، نہ تحفظ حقوق مسلمین کے لیے وہ کانگریس سے لڑنے پر آمادہ تھے، نہ ہندو مسلم کشمکش سے انہیں کچھ زیادہ سروکار تھا وہ صرف یہ چاہتے تھے کہ ہر قیمت پر انگریز اس ملک سے نکل جائیں انگریزوں سے انگریزی سامراج سے، انگریزوں کی ہر چیز سے انہیں نفرت تھی۔ وہ کانگریس کی مسلم آزاری کو بھی اس لیے برداشت کرتے اور اس سے آمادہ تعاون ہوجاتے تھے کہ ان کے نزدیک وہ انگریزوں کو نکالنے کی جدوجہد کر رہی تھی، ان کا خیال تھا کہ جب تک انگریز اس دیس سے نہیں نکالے جاتے اس وقت تک نہ عالم اسلام آزاد ہوسکتا ہے، نہ یہ ملک۔ یہی وجہ ہے کہ ہمیشہ غیر مشروط طور پر ہر مخالف برطانیہ تحریک میں پورے خلوص اور نیک نیتی کے ساتھ شریک ہوئے۔ علی برادران جب تک کانگریس کے ساتھ تھے مولانا ان کے نیاز مند رفیق اور ہم قدم بنے رہے جب معلوم و معروف وجوہ سے انہوں نے کانگریس سے کنارہ کشی کی تو مولانا ان سے الگ ہوگئے، لیکن اس علیحدگی کا مطلب یہ نہ تھا کہ محمد

ملی اور شوکت علی کے خلوص، حب وطن اور جذبہ ملی کے قائل نہ تھے، ضرور قائل تھے لیکن انہوں نے اپنے لیے جو راہ متعین کی تھی وہ دوسری تھی اور وہ اپنا سوچا سمجھا راستہ بدلنے کو تیار نہیں تھے۔

گول میز کانفرنس ۱۹۳۰ء میں جب اپنی ولولہ انگیز، حریت آفریں اور روح پرور مگر آخری تقریر کرنے کے بعد مولانا محمد علی اس دنیا سے رخصت ہوگئے تو دلی کی جامع مسجد میں ایک مرتبہ نماز جمعہ کے بعد مولانا نے رو رو کر تقریر کی۔ آنسو ان کی آنکھوں سے جاری تھے۔ آواز بھرائی ہوئی تھی گریہ گلو گیر ہورہا تھا اور وہ تقریر کررہے تھے مجھے اچھی طرح یاد ہے اس تقریر میں مولانا نے بڑے درد اور سوز کے ساتھ فرمایا تھا "محمد علی کا سا سپوت صدیوں میں کوئی ماں جنتی ہے" یہ الفاظ میرے کانوں میں گونج رہے ہیں اور میں دعویٰ کرسکتا ہوں کہ مولانا کے بالکل یہی الفاظ تھے۔

مولانا کے یہ الفاظ ان کے خلوص اور سچائی کا آئینہ ہیں، حقیقت یہ ہے کہ وفات سے کچھ عرصہ پہلے مولانا محمد علی کے تعلقات مولانا بخاری سے اور نہ صرف مولانا بخاری سے، بلکہ جمعیت علماء ہند کے تمام اکابر سے کیونکہ سب کا مسلک یہی تھا۔ انتہائی تلخ اور کشیدہ ہوچکے تھے، تقریروں اور تحریروں میں نہایت سختی اور شدت کے ساتھ ایک دوسرے کے افکار و نظریات کا احتساب کیاجاتا تھا اور اس سختی اور شدت میں تلخی اور بدمزگی نمایاں طور پر جھلکتی تھی، مولانا محمد علی بھی کچھ کم نہ تھے، جس سے مخالفت ہوجاتی اس کی تحلیل اور تجزیہ میں وہ کوئی کسر نہ اٹھا رکھتے چنانچہ انہوں نے "بخاری اور مسلم" موضوع پر جو کچھ کہا اور لکھا وہ تاریخ سیاست ہند کا نہایت دلچسپ باب ہے۔ لیکن اس شدید تلخی اور سخت اختلاف کے باوجود محمد علی مولانا بخاری کے خصائص امتیازات اور صفات کے قائل تھے اور اعتراف میں ذرا بھی بخل روا نہ رکھتے تھے مولانا بخاری ایک شعلہ بیاں اور آتش فشاں اور سحر طراز واعظ تھے وہ تقریر شروع کرتے تو بڑے سے بڑا مجمع خواہ مخالفوں کا کیوں نہ ہو دم بخود ہوجاتا، ان کی تقریر میں وہ روانی، وہ شگفتگی، وہ حلاوت اور وہ تاثیر تھی کہ جو لوگ مخالفت کا ارادہ کرکے جاتے وہ اس وقت چونکتے جب تقریر ختم ہوچکتی اور یہ تقریر مختصر نہ ہوتی۔ اگر اسے تقریر شبینہ کے نام سے یاد کیا جائے تو ذرا مبالغہ نہ ہوگا وہ عشاء کے بعد تقریر شروع کرتے اور فجر کے وقت ختم کرتے۔ آندھی آئے، پانی برسے، قیامت تک کیوں نہ گزر جائے لیکن مولانا کے سامعین اپنی جگہ سے جنبش تک نہ کرتے، کسی کی آنکھ میں جادو تیرے بیان میں ہے، اور واقعہ یہ ہے کہ انکی جادو بیانی ایک مسلمہ حقیقت ہے۔

لاہور کے ایک متعصب اور گندہ ذہن آریہ سماجی راجپال نے ایک انتہائی اشتعال انگیز کتاب "رنگیلا رسول" (نعوذ باللہ) لکھی اس کتاب نے سارے پنجاب میں تہلکہ مچادیا خاص طور پر لاہور تو میدان قیامت بن گیا۔ مزید ستم یہ ہوا کہ مقدمہ عدالت عالیہ میں گیا اور جسٹس دلیپ سنگھ نے راجپال کو بری کردیا۔ اس فیصلہ نے اور زیادہ قیامت برپا کردی "زمیندار" اور بعض دوسرے اخبارات نے "دلیپ سنگھ مستعفی ہوجاؤ" عنوان سے کئی مقالات لکھے نتیجہ یہ ہوا کہ ملت کے دو نام میں یہ لوگ ماخوذ اور سزا یاب ہوئے۔

مولانا محمد علی نے ہمدرد میں ایک مقالہ افتتاحیہ لکھا جسکا عنوان تھا، قصور قاضی کا نہیں تھا قانون کا ہے، انہوں نے لکھا تھا کہ تعزیرات ہند میں ایسی کوئی مؤثر دفعہ موجود نہیں ہے جس کی رو سے راجپال جیسے مجرموں کو کیفر کردار

تک پہنچایا جائے، دلیپ سنگھ نے اگر سزا دے بھی دی ہوتی تو کوئی اور جج اسے رہا کر دیتا لہذا کوشش یہ ہونی چاہیے کہ تعزیرات ہند میں ایک دفعہ کا اضافہ کیا جائے جسکی رو سے بزرگان دین کی توہین کرنے والے کو مستوجب سزا قرار دیا جائے۔

محمد علی کے اس مضمون نے اور زیادہ آگ لگادی ان پر الزام لگایا گیا کہ چونکہ آکسفورڈ یونیورسٹی میں دلیپ سنگھ ان کے ہم درس رہے ہیں لہذا وہ ان کا ساتھ دے رہے ہیں یہ بات بالکل غلط تھی محمد علی ان لوگوں میں تھے کہ خود بقول انکے اگر شوکت بھی حق کے خلاف قدم اٹھائیں تو میں پستول میں دو گولیاں بھروں گا ایک سے شوکت کا کام تمام کروں گا دوسری اپنے مار لوں گا۔ کیونکہ ان کے بعد زندہ رہنا میرے لیے بیکار ہے، بھلا ایسا شخص اتنے بڑے اور اہم معاملہ میں انتہائی مذہبی، بلکہ مذہبی مجنوں ہونے کے باوجود کس طرح دلیپ سنگھ کا ساتھ دے سکتا تھا؟ بات وہی ٹھیک تھی جو انہوں نے لکھی تھی چنانچہ بعد میں تعزیرات ہند میں ایک ایسی دفعہ کا اضافہ بھی کیا گیا۔ غرض سارا لاہور محمد علی کے خلاف بھرا ہوا تھا اسی حالت میں وہ لاہور گئے اور ایک جلسہ عام میں تقریر کی اور اپنا نقطۂ نظر پیش کیا۔ **محمد علی کا یہ مستقل عقیدہ تھا کہ قائد کو رائے عامہ کے بہاؤ میں نہیں بہنا چاہیے، بلکہ اسکی تشکیل کرنی چاہیے اور اپنی ہر دلعزیزی کی بھینٹ دے کر وہ اسی پر عمل پیرا بھی ہوتے تھے اور بالآخر کامیاب بھی ہوتے تھے۔**

اس مرتبہ بھی ایسا ہی ہوا، جو لوگ محمد علی کو قتل کرنے آئے تھے وہ محمد علی زندہ باد کے نعرے لگاتے واپس گئے۔

اس جلسہ میں مولانا عطاء اللہ شاہ بخاری نے ایک بڑی اثر انگیز اور معرکہ آرا تقریر کی (جادہ بیانی اور سحر طرازی کی پوری شان کے ساتھ) مولانا محمد علی نے انہیں گلے لگالیا، اور کہا "تمہاری یہ سحر بیانی اللہ کی دین ہے لیکن یہ یاد رکھو، یہ دو دھاری تلوار ہے جس طرح یہ حق کے لیے چل سکتی ہے اسی طرح باطل کے لیے بھی چل سکتی ہے اور ہزاروں لوگ جو تم سے متاثر ہونگے، تمہارا ساتھ دیں گے ان کی ذمہ داری صرف تم پر ہوگی خبردار اس جوہر کا غلط استعمال کبھی نہ کرنا"

مولانا اپنے راستہ پر چلتے رہے، پورے خلوص اور نیک نیتی کے ساتھ ان کے قدم آگے کی طرف بڑھتے رہے۔ انہیں نہ محمد علی سے غرض تھی، نہ مجلس خلافت سے، نہ وہ قائد اعظم سے واسطہ رکھتے تھے نہ مسلم لیگ اور اسکے اغراض و مقاصد اور منزل مقصود سے وہ جب ضرورت دیکھتے ان سب سے الجھ بھی پڑتے، وہ اپنی دھن میں مست تھے وہ انگریزوں کے اخراج سے پہلے کچھ سوچنا نہیں چاہتے تھے۔

لیکن جب انگریز اس دیس سے نکلے تو مولانا کو بھی اپنے وطن سے نکلنا پڑا، وہ اپنے وطن میں نہ رہ سکے، جہاں کی فضائیں ان کی شعلہ مقالی سے لرزتی رہتی تھیں، جہاں کے در و دیوار ان کی آتش نوائی سے گونجا کرتے تھے جہاں کے بام و ایوان ان کے زور سخن سے کانپا کرتے، جہاں انہوں نے دکھ جھیلے تھے، تکلیفیں اٹھائی تھیں، اذیتیں برداشت کی تھیں، سجن و زنداں کو لبیک کہا تھا، اور دار و رسن کے لیے آمادگی کا اظہار کیا تھا۔ وہی سرزمین، وہی فضائیں، وہی در و دیوار، اور وہی بام و ایوان ان سے چیخ چیخ کر کہہ رہے تھے اب یہ تمہارا وطن نہیں ہے اب یہ تمہاری سرزمین

نہیں ہے اب تم یہاں اجنبی ہو، اب تم یہاں بدیسی ہو، چلے جاؤ، نکل جاؤ، بھاگ جاؤ، ورنہ تمہارے جسم و جان کا رشتہ منقطع کردیا جائیگا۔

مولانا کے پاس کیا تھا؟ قلندر جز دو حرف لاالہ کچھ بھی نہیں رکھتا۔ لکڑی ہاتھ میں لی، پوٹلی بغل میں دابی، اور بے وطن ہو کر لاہور آگئے، پھر ملتان چلے گئے اور اب وہاں کے سفر پر روانہ ہوئے جہاں سے کوئی واپس نہیں آتا۔

مولانا بہرحال ہمارے تھے، اختلاف فکر و نظر کے باوجود ہمارے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے انتقال پر ہر مسلمان رویا اور ان رونے والوں میں بہت بڑی اکثریت انکی تھی جو ان سے نظریاتی اختلاف رکھتے تھے۔ لیکن کتنے تعجب، کتنی حیرت اور کتنے افسوس کا مقام ہے کہ ہندوستان کی لوک سبھا نے رنج و افسوس کا ایک لفظ بھی نہ کہا۔ کیا پنڈت نہرو مولانا کو بھول گئے؟ کیا کانگریس نے مولانا کو فراموش کردیا؟ اس قدر جلد؟ جبکہ انکی حریت ماب اور سامراج شکن تقریروں کی صدائے دل پذیر اب بھی ہندوستان کی ہر گلی اور ہر کوچہ میں گونج رہی ہے۔

تفو بر تو اے چرخ گرداں تفو

قارئین متوجہ ہوں

بخاری اکیڈمی کی فخریہ پیشکش "مولانا محمد گل شیر شہید سوانح و خدمات" کے بعد اسی مؤلف کے قلم سے دو اہم تاریخی دستاویزات عنقریب منظر عام پر آرہی ہیں۔

۱۔ تحریک فوجی بھرتی بائیکاٹ (۱۹۳۹ء)

۲۔ تحریک کشمیر (۱۹۳۱ء)

جملہ کارکنانِ احرار و قارئین نقیب سے گزارش ہے کہ:

(۱) جن احباب کے پاس ان دو موضوعات کے متعلق مواد موجود ہو،

(۲) یا اپنی یادداشتوں میں تحریکات کے بارے میں حالات و واقعات کا ذخیرہ رکھتے ہوں،

(۳) کسی شاعر کی کوئی نظم،

(۴) یا متعلقہ تصاویر و مضامین موجود ہوں اولین فرصت میں ارسال فرمائیں انہیں شکریہ کے ساتھ شائع کیا جائے گا۔

دستاویزات اصل حالت میں بھیج دیں یا ان کی فوٹوسٹیٹ کاپی روانہ کریں۔ تصاویر اصل بھیجیں ان شاء اللہ استفادہ کے بعد مکمل حفاظت کے ساتھ واپس کی جائیں گی۔

رابطہ

ناظم گل شیر شہید اکیڈمی۔ فاروق دواخانہ مین بازار تلہ گنگ، ضلع چکوال

نسیم حجازی

کوہ پیکر انسان
نقیب آزادی و حریت

اگر ہم ماضی کی طرف دیکھیں تو ہماری آزادی کی شاہراہ ربع صدی قبل کے ان تنگ و تاریک اور ناہموار راستوں سے جاملتی ہے جہاں چند اولوالعزم انسان درماندہ مسافروں کو آوازیں دے رہے ہیں۔ کبھی ان کی شعلہ نوائی سے مردہ زندگی کی رگوں میں خون دوڑنے لگتا ہے اور اپنے حال سے پریشان اور مستقبل سے مایوس مسافر ایک نئے حوصلوں اور ولولوں سے سرشار ہو کر ان کے پیچھے دوڑنے لگتے ہیں اور کبھی کڑی آزمائشوں کے دور میں ان کے پیچھے چلنے والے قافلوں کی ہمت جواب دے جاتی ہے لیکن ان کوہ پیکر انسانوں کے عزم و ثبات میں کوئی فرق نہیں آتا۔ آزادی کی تمنا کرنے کے جرم کی پاداش میں ان کے لئے قید خانوں کے دروازے کھول دیئے جاتے ہیں۔ لیکن ہر مصیبت ہر ناکامی اور ہر آزمائش ان کے سینے میں امیدوں کے نئے چراغ روشن کرتی ہے۔

سید عطاء اللہ شاہ بخاری نے فرنگی استبداد کے خلاف اس وقت علم بغاوت بلند کیا تھا جب سلطنت برطانیہ پر سورج غروب نہیں ہوتا تھا اور آزادی کی خواہش ایک دیوانے کا خواب سمجھی جاتی تھی۔ مرحوم برصغیر کے وہ بے مثال خطیب تھے جن کی شعلہ نوائی نے کروڑوں انسانوں کے دلوں میں آزادی کا ولولہ پیدا کیا تھا ان کی عظمت کا اندازہ صرف اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ وہ رات جس میں انہوں نے سفر کا آغاز کیا تھا کس قدر تاریک تھی اور ایمان و یقین محکم کی وہ قندیل جو انہوں نے بلند کی تھی کس قدر تابناک تھی اگر ان کے راستے میں آلام و مصائب کے پہاڑ کھڑے تھے تو انہوں نے کس قدر جرأت اور پامردی کے ساتھ ان کا مقابلہ کیا تھا۔

سید عطاء اللہ شاہ بخاری کی زندگی کا مقصد کروڑوں انسانوں کو آزادی کی تڑپ عطا کرنا تھا اگر ہم آزادی کے ایک نڈر مبلغ کی حیثیت سے ان کے حالات پر غور کریں تو ہمیں اس حقیقت کا اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ وہ ایک عظیم انسان تھے ہمیں ان کے طریق کار سے اختلاف ہوسکتا ہے۔ لیکن کوئی بھی ان کی عظمت سے انکار نہیں کرسکتا آنے والی نسلیں جب برصغیر پاک و ہند کی آزادی کی تاریخ کے بکھرے ہوئے اوراق اکٹھا کریں گی تو اس وقت سید عطاء اللہ شاہ بخاری کو فراموش نہیں کرسکیں گی۔ جنہوں نے اپنی زندگی کے بہترین سال قید و بند کی صعوبتوں میں گذارے تھے۔ میں اپنی ذاتی معلومات کی بناء پر اس حقیقت کو واضح کرنا چاہتا ہوں کہ مرحوم پاکستان کے لئے جدوجہد کے "آخری مراحل میں" اگر تحریک پاکستان کے ساتھ نہیں تھے۔ تو پاکستان کے مخالفین سے بھی الگ تھلگ ہوگئے تھے۔ میں نے ۱۹۴۶ء کے انتخابات میں بلوچستان اور سندھ کے ضلع جیکب آباد میں اپنی مصروفیات سے چند ہفتے نکال کر پنجاب میں اپنے آبائی علاقے گورداسپور کا بھی دورہ کیا تھا اور مجھے ایک ایک دن میں متعدد مقامات پر تقریریں کرنا پڑتی تھیں، ان ہی ایام میں محترم سید صاحب بھی اس علاقے کا دورہ کر رہے تھے تو مجھے یہ الجھن محسوس ہوتی تھی کہ کانگریسی علماء کے خلاف میں جس طرح بولا کرتا تھا، کہیں عطاء اللہ شاہ صاحب کی موجودگی میں وہی لب و لہجہ مجھے نہ

اختیار کرنا پڑے، جب مجھے یہ اطلاع ملی کہ شاہ جی نے کانگریس کے کسی جلسے میں تقریر کرنے سے انکار کر دیا تھا (اسکے باوجود کہ کانگریس کے صوبائی صدر مولانا داؤد غزنوی وہاں مزدوروں کے حلقے سے کھڑے ہوئے تھے) تو مجھے یہ محسوس ہوا کہ ان سے ایسی بات غیر متوقع نہ تھی بعض لوگ جو ان کی نجی محفلوں میں بیٹھا کرتے تھے تو وہ مجھے ایسی خبریں دیا کرتے تھے کہ شاہ جی اس دور میں تحریک پاکستان کی مخالفت سخت ناپسند کرتے تھے۔

شاہ جی کی سیاسی زندگی کا انتہائی درخشاں پہلو انگریز سے نفرت تھی اور اگر ہم حقیقت پسندی سے برصغیر کی تاریخ کا مطالعہ کریں اور لارڈ کلائیو سے لے کر لارڈ ماؤنٹ بیٹن تک کے دور کے سامراجی مظالم کا تجزیہ کریں تو یہ معاملہ سمجھ میں آجائے گا کہ شاہ جی کی انگریز کے خلاف یہ آواز، ایک مرد مومن کے دل کی گہرائیوں سے نکلتی تھی۔ جب میں گزشتہ صدی پر نظر دوڑاتا ہوں تو مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے کہ آزادی کا قافلہ (جس کے قدموں کے نشان صدیوں کے گرد و غبار میں روپوش ہو چکے ہیں) اس وقت نئے حوصلوں اور تازہ ولولوں کے ساتھ تنگ و تاریک اور ناہموار راستوں پر نمودار ہو رہا تھا، جب انگریز کی سلطنت کا سورج غروب نہیں ہوتا تھا، جب اسکولوں کے بچے اپنی درسی کتابیں اٹھایا کرتے تھے، ان میں جو موضوع خاص طور پر لکھا جاتا تھا اس کا عنوان "حکومت برطانیہ کی برکتیں" ہوتا تھا، جب خان صاحب اور خان بہادر قسم کے لوگ کسی انگریز سے مصافحہ کر لینے کے بعد ایسا محسوس کرتے تھے کہ مریخ سیارے کو ہاتھ لگا کر آئے ہیں تب سید عطاء اللہ شاہ بخاری کا دل و دماغ روحِ آزادی کا امین تھا۔

اس دور میں قافلۂ آزادی و حریت کے جو نقیب میدان میں اترے تھے وہ ہمارے شاندار ماضی کا قابل فخر سرمایہ ہیں۔ مثلاً مولانا ظفر علی خان، مولانا محمد علی جوہر، مولانا شوکت علی، مولانا حسرت موہانی، جنہوں نے "زندگی کے قبرستان" میں سونے والی قوم کو آوازیں دی تھیں، اور زندگی کی تڑپ عطا کی تھی وہ سب بالآخر اس عظیم ملی قافلے کے یمین و یسار بن گئے تھے، جسے قائد اعظم محمد علی جناح اور حضرت علامہ اقبال نے منزل پاکستان کا راستہ دکھایا تھا۔

جو لوگ میرے زمانے میں لاہور میں زیر تعلیم تھے (خصوصاً اسلامیہ کالج میں) اور پھر کاروانِ پاکستان کے نقیب بن گئے تھے، کالج کے علاوہ ان کی دوسری بڑی درسگاہ موچی دروازہ تھا، جہاں ان بزرگوں کی تقریریں اس دور کے نوجوانوں میں تڑپ کو حوصلے میں بدل دیا کرتی تھیں اور میں آج بھی کوئی ساٹھ برس بعد جب اس ماضی کے متعلق سوچتا ہوں، جیسے ان بزرگوں نے آزادی کی تڑپ کا تحفہ دیا تھا، تو مجھے ایسا محسوس ہوتا تھا کہ آدھی رات سے زیادہ گزر چکی ہے "زندہ دلان لاہور" کا ایک انبوہ کثیر ساکت و جامد سٹیج کے گرد بیٹھا ہوا ہے اور وہ مرد قلندر سٹیج پر کھڑا کبھی قرآن پڑھتا ہے تو سننے والے محسوس کرتے ہیں کہ قدرت نے اسے لحن داودی عطا کر دیا ہے، جب وہ رومی کے اشعار پڑھتا ہے تو فارسی زبان نہ سمجھے والے بھی اس کے انداز بیان سے مسحور ہو جاتے ہیں، اسی طرح جب وہ بذلہ سنجی اور لطیفہ گوئی پر آتے ہیں تو رات کی خاموشی سے قہقہوں کا سیلاب امنڈ پڑتا ہے اور پھر دو تین گھنٹے بولنا ان کے لئے عام بات تھی اور سننے والوں کی کیا مجال کہ وہ تھک کر پہلو تک بدلنے کی کوشش بھی کریں۔

مجھے زندگی میں ایک بار شاہ جی کے ساتھ سفر کرنے اور بے تکلفی سے باتیں کرنے کا بھی اتفاق ہوا، میں بڑا

ہو کر بھی اپنے آپ کو ان کے سامنے بچہ سمجھتا تھا لیکن یہ ان کا کمال تھا کہ وہ ہر شخص کے ساتھ خواہ وہ پڑھا لکھا ہو یا ان پڑھ اس کی عمر اور سمجھ کے مطابق بات کیا کرتے تھے۔

میں پورے وثوق سے کہتا ہوں کہ جب کہیں آزادی کے درس کی تشریح کی جائیگی تو سید عطاء اللہ شاہ بخاری کا وہاں ذکر ضرور آئے گا۔ ایک سپاہی کی کامیابی اس کی فتوحات سے دیکھی جاسکتی ہے ایک معمار کی عظمت کا اندازہ اسکی عمارت کے حسن و جمال سے لگایا جاتا ہے لیکن جو لوگ آزادی کے قافلوں کے مقتدا اور پیشوا ہوتے ہیں ان کے متعلق صرف یہ لکھا جاسکتا ہے کہ جس رات میں انہوں نے اپنے سوئے ہوئے قافلوں کو آوازیں دی تھیں وہ کتنی تاریک اور بھیانک تھی اور کس پامردی اور حوصلہ مندی کے ساتھ انہوں نے وقت کی آندھیوں اور طوفانوں کے سامنے عزم و یقین کی مشعلوں کو روشن کئے رکھا تھا۔

احمد ندیم قاسمی

اس خلوص کی قسم

سید عطاء اللہ شاہ بخاری کے انتقال کے ساتھ بر صغیر پاک و ہند کی تحریک آزادی کا وہ زندگی افروز اور دلاویز باب ختم ہوگیا۔ جس میں آزادی کی خاطر جسمانی اور روحانی صعوبتیں سہنا عبادت کا درجہ اختیار کر گیا تھا۔

سید عطاء اللہ شاہ بخاری کا وجودِ گرامی اس مقدس جدوجہد کا مجسم نشان تھا۔ ان کے سیاسی مخالفین کو بھی ہمیشہ اس حقیقت کا اعتراف رہا کہ شاہ جی ہر قسم کی مصلحت اور نوعی مفاد سے قطعی طور پر بلند تھے ان کا خلوص اتنا بے داغ اور اتنا بے لوث تھا کہ ان کے انتقال کے صدیوں بعد بھی اس خلوص اور اس نیک نیتی کی قسم کھائی جاتی رہے گی تحریک آزادی کو شاہ جی کی شخصیت سے الگ کر کے دیکھا جائے تو اس میں اس دبدبے اور اس طنطنے اس حسن اظہار اور اس جمالِ مدعا کی شدید کمی پیدا ہوجاتی ہے جو شاہ جی مرحوم کی شخصیت کے نمایاں عنصر تھے۔

امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاری مرحوم و مغفور مسلمانوں کی تحریک آزادی اور ان کے دینی شعور کی تاریخ کے ایک ایسے عظیم کردار تھے کہ محض بطور مثال اگر اس ایک کردار سے صرف نظر کرلیا جائے تو پوری تاریخ کی عمارت ڈولنے لگتی ہے۔ در اصل ہم عجیب و غریب ذاتی اور گروہی تعصبات میں مبتلا لوگ ہیں چنانچہ اپنی تاریخ ساز شخصیتوں کو بھی انہی تعصبات کے محدود دائروں میں رکھ کر پرکھتے ہیں اور اثبات کی بجائے نفی سے بہت محظوظ ہوتے ہیں۔ ہماری یہ ذہنیت ہمارا بہت بڑا المیہ ہے۔ شاہ جی کی ہمہ گیر شخصیت کے ساتھ بھی ہم نے کچھ ایسا ہی رویہ روا رکھا ہے۔ ورنہ اپنے ہم وطنوں، خصوصاً مسلمان ہم وطنوں کے ذہنوں میں انہوں نے برطانوی استعمار و استبداد کے خلاف جو غیر مشروط نفرت پیدا کی اور مسلمانوں کے دلوں میں اسلام کی حریت پسندانہ روایت کی جو مشعلیں انہوں نے روشن کیں وہ ہماری سیاست اور ہمارے دین و دانش کی وہ اقدار ہیں جنہوں نے ہماری شخصیتیں تعمیر کی ہیں اور ہمارے جذبوں اور امنگوں کی تربیت اور تہذیب کی ہے۔

تحریک پاکستان کا ساتھ نہ دینے والوں میں سے شاہ جی واحد شخصیت تھے جنہوں نے قیام پاکستان کے فوراً بعد اپنی رائے کی شکست کا واشگاف الفاظ میں اعتراف کرلیا۔ حق بات یہ ہے کہ اس طرح کے تاریخی اعترافات عظیم لوگ ہی کرسکتے ہیں۔ ورنہ دوسرے حضرات تو اپنے سابقہ طرز عمل کی تاویلیں ہی کرتے رہ جاتے ہیں اور نظریہ پاکستان کے دور حاضر کے ٹھیکیداروں کا طریق کار اب تک یہی ہے کہ تاویل کرتے ہیں اور تاویل نہ کرسکیں تو اپنی کتابوں سے پاکستان کی مخالفت میں لکھے گئے جملے حذف فرما دیتے ہیں۔

میری حیثیت ان کے ایک ادنیٰ عقیدت مند کی ہے۔ ۱۹۳۳ء کے آس پاس کا ذکر ہے میں بہاول پور کے کالج میں طالب علم تھا۔ خبر گرم ہوئی کہ امیرِ شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاری نماز عشاء کے بعد مسجد جامع میں تقریر فرمائیں گے۔ طلبہ نے شاہ جی کی ساحرانہ خطابت کے قصے سن رکھے تھے چنانچہ ہم لوگ مسجد جامع پہنچے اور زندگی میں پہلی بار شاہ جی کی خطابت کے اعجازِ سے متعارف ہوئے میں نے اس عمر میں ایسی مؤثر تقریر تو کیا سنی ہوگی، ایسی مؤثر

تحریر بھی نہیں پڑھی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ الفاظ کا ایک لشکر ان کے سامنے دست بستہ حاضر ہے اور وہ ہر دلیل، ہر نکتے، ہر جذبے کے لئے ایسے مناسب الفاظ استعمال فرما رہے ہیں کہ بلاغت کے اصولوں کے مطابق اس سے زیادہ مناسب الفاظ کا تصور تک محال ہے۔ اس پر مستزاد ان کا انتخاب اشعار تھا کہ معلوم ہوتا تھا یہ شعر خاص اسی صورت حال کے لئے شاعر کے دل پر وارد ہوا تھا۔ آیات قرآنی کی قرأت کا انداز بھی منفرد تھا اور اشعار بھی وہ ایسے لحن سے ادا فرماتے تھے کہ خود شاعر بھی اپنا شعر شاہ جی کی لحن میں سنتا تو پکار اٹھتا کہ میرے شعر کو تخلیق کے بعد آج فن کی معراج نصیب ہوئی۔ شاہ جی کی یہ تقریر نصف شب کے بعد تک جاری رہی۔ پھر اچانک انہوں نے گھڑی دیکھی اور ہاتھ دعا کے لئے اٹھا دیئے یہ دعا بجائے خود فصاحت و بلاغت کا ایک شاہکار تھی۔ دوران دعا کسی نے عرض کیا کہ بارش کی بھی دعا فرمائیے۔ شاہ جی نے موسلادھار بارش کی دعا مانگی اور ابھی بارش کی یہ دعا ختم نہیں کر پائے تھے کہ مجمع میں سے کسی کی آواز آئی "قبلہ شاہ جی، ہمیں اتنی زیادہ بارش نہیں چاہئیے، ہم غریبوں کے گھر کچے ہیں" شاہ جی نے یہ سنا تو دعا کے لئے اٹھے ہوئے ہاتھ گرا دیئے اور اسلام میں اعتدال اور میانہ روی کے موضوع پر نئی تقریر کا سلسلہ شروع ہوا جو نماز فجر کی اذان تک جاری رہا اور اس تمام عرصے میں لوگ جوق در جوق آتے تو رہے لیکن اٹھ کر گیا ایک بھی نہیں اور جاتے بھی کیسے سب شاہ جی کی تقریر کی ساحرانہ گرفت میں تھے۔

اس کے بعد مجھے لاہور میں بیرون دلی دروازہ شاہ جی کی متعدد تقریریں سننے کا شرف حاصل ہوا اور جو بھی تقریر سنی، سابقہ تقریروں کے مقابلے میں بالکل نئی اور زیادہ مؤثر محسوس ہوئی۔ آج ان تقریروں کو یاد کرتا ہوں تو اپنا ہی ایک شعر میرے ذہن میں گونجنے لگتا ہے۔

جب بھی دیکھا ہے تجھے، عالم نو دیکھا ہے
مرحلہ طے نہ ہوا تیری شناسائی کا

میں نے بالمشافہ شناسائی کا یہ مرحلہ بھی طے کرنا چاہا اور ایک بار ملتان میں ان کی خدمت میں حاضر بھی ہوا مگر جس شفقت سے شاہ جی نے میری پذیرائی فرمائی اور جس محبت سے انہوں نے مجھے سینے سے لگایا اور پھر جس عالی ظرفی سے انہوں نے مجھے خود میرے ہی اشعار سنانے شروع کئے کہ آبدیدہ بھی ہو جاتے تھے، داد بھی دیتے جاتے تھے اور میرے حق میں دعا بھی فرماتے جاتے تھے، تو مجھے محسوس ہوا کہ شاہ جی تو مجھ سے مدتوں سے متعارف ہیں اور اپنے فن کے بارے میں خود مجھے اتنی معلومات حاصل نہیں جتنی ہماری تاریخ کی اس عظیم شخصیت کو حاصل ہیں دراصل یہ بالواسطہ اظہار تھا اس حقیقت کا کہ ہمارے بڑے جب اپنے سے بہت چھوٹوں کو بھی بڑا بنا کر پیش کرتے ہیں تو یہ ان بڑوں کی فراخ دلی اور وسیع النظری بھی ہوتی ہے اور جوہر قابل کی حوصلہ افزائی بھی کہ یہ سلسلہ رک نہ جائے، آگے بڑھتا جائے۔ میں نے اپنے ارباب سیاست اور زعمائے دین میں شاہ جی سے بڑا شعر شناس کبھی نہیں دیکھا۔

ذاتی طور پر مجھے ان کی ہمہ جہت شخصیت کے اس ایک پہلو سے بے پناہ عقیدت تھی یہ پہلو ان کی تقریروں کی روانی اور ان کے بیان کی لطافت کی صورت میں نمایاں ضرور ہوتا ہے۔ جبکہ شاہ جی سیاسیات سے ہٹ کر صرف

شعر و سخن کی طرف متوجہ ہوتے تھے اگر ایک بہت بڑا شاعر ہونا بہت بڑی سعادت ہے تو میں سمجھتا ہوں کہ ایک بہت بڑا شعر شناس ہونا بھی کم سعادت نہیں ہے اور شاہ جی اتنے بڑے شعر شناس تھے کہ شاعر کی نفسیات کی گہرائیوں میں اتر جاتے تھے اور شعر کی داد ہمیشہ اس پہلو سے دیتے تھے جو خود شاعر کی نظر میں اس کی متاع عزیز ہوتا تھا۔ اچھا شعر ان کے دل میں ترازو ہو جاتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ جہاں وہ سعدی و حافظ اور غالب و اقبال کے اشعار کو اپنی معجزہ کار تقریروں کی زینت بناتے تھے، وہیں ہم لوگوں کے اشعار کو یہ عزت بخشنے سے گریز نہیں فرماتے تھے۔ حالانکہ جب ہمیں یہ عزت دی گئی، تب ہماری حیثیت نومشق نوجوانوں سے زیادہ نہیں تھی۔ یہ شاہ جی کی بھرپور اور ہمہ اثر شخصیت کا ایک ایسا پہلو ہے جو انہیں ہماری دینی اور سیاسی تحریکوں کے علاوہ ہماری تہذیبی نشاۃ الثانیہ کا بھی ایک حامل کردار ثابت کرتا ہے۔

یوں ان کے انتقال سے صرف سیاست کی دنیا ہی نہیں لٹی بلکہ شعر و سخن کی دنیا بھی اجڑ گئی وہ دلاویز حکایت یکایک ختم ہو گئی جو عرفی، غالب اور اقبال نے قائم کی تھی وہ رشتہ اچانک ٹوٹ گیا جس کے دم سے ہم ٹیپو سلطان شہید اور سید احمد شہید کی روحوں کو اپنا نگران سمجھتے تھے۔ خدا ہمیں شاہ جی کی عالی حوصلگی، جرأت مندی، صداقت پسندی اور بے باکی کے ساتھ ان کے حسن ذوق کی پیروی کرنے کی توفیق بخشے۔

ڈاکٹر عبد السلام خورشید ؒ

مرد درویش

جناب ڈاکٹر عبد السلام خورشید ملک کے نامور صحافی ہیں ان کے والد عبد المجید سالک کسی زمانہ میں شاہ جی کے قریبی دوستوں میں سے تھے ابن سالک ہونے کے ناطے سے۔ ذیل میں ان کی کتاب "وے صورتیں الہٰی" سے ایک باب نقل کیا جارہا ہے۔ (مرتب)

مولانا سید عطاء اللہ شاہ بخاری کی سیاست سے ہزار اختلاف ہو لیکن ان کی خطابت سے کون کافر انکار کرسکتا ہے؟ سبحان اللہ کیا جاہ و جلال تھا ان کی خطابت کا الفاظ تھے کہ اُمڈے چلے آتے تھے اشعار تھے کہ شاید ٹکسال سے نکلتے چلے آتے تھے بولتے بولتے زلفوں کو جھٹکاتے تو یوں محسوس ہوتا جیسے آسمان سے کوئی فرشتہ نازل ہوا ہے پاکستان بننے سے چھ سال پہلے خضر تمیمی مرحوم کی معیت میں ملتان کے قریب کھروڑ پکا پہنچا تو وہاں یک مسجد میں تقریر سنی موضوع تھا "سیرت رسول" کچھ نہ پوچھیئے کہ وجد کا کیا عالم تھا اور ہم دو تین گھنٹوں میں کیسے کیسے مرحلوں سے گذر گئے کبھی روتے تھے کبھی ہنستے تھے کبھی دم بخود ہوجاتے تھے جلسہ ختم ہوا تو مسجد کے دروازے پر ان سے تعارف کرایا گیا کہ یہ ابن سالک ہے سالک سے سالہا سال کے انقطاع تعلق اور سیاسی اختلاف کے باوجود اس مرد درویش نے نہ صرف محبت و شفقت کا بے پناہ مظاہرہ کیا بلکہ والد مرحوم کے بارے میں یوں رطب اللسان ہوئے ایک اچھی خاصی تقریر کر ڈالی اس کے بعد ہمیں قیام گاہ پر لے گئے وہاں خوب محفل جمی باتوں باتوں میں فرمایا دو کتابیں ہمیشہ میرے پاس رہتی ہیں۔ قرآن حکیم اور دیوان غالب لیکن اوپر قرآن حکیم رہتا ہے اور نیچے دیوان غالب میں بے ساختہ پکار اٹھا ہاں

مسجد کے زیر سایہ خرابات چاہیئے

ہنس پڑے کہنے لگے کیسے چھپے رہے آخر ابن سالک ہو اسکے بعد لاہور میں عبد اللہ بٹ مرحوم کے ساتھ میں دو مرتبہ ان کی خدمت میں حاضر ہوا ایک ملاقات میں کہنے لگے مجھے تمہاری آنکھوں میں سالک کی شوخی نظر آتی ہے۔ پاکستان بننے کے بعد سید احمد شاہ بخاری (پطرس) نے سالک اور بخاری کو اچانک یکجا کردیا بچھڑے ہوئے دوست بغلگیر ہوئے نہ بخاری کو یاد رہا کہ سالک نے ان پر بخار اللہ شاہ عطائی کی پھبتی کسی تھی اور نہ سالک کو یاد رہا کہ بخاری نے انہیں بالک سٹالوی کہا تھا دونوں تحریک خلافت کے دوران جیل میں اکٹھے رہے اور جیل کی دوستی پر حادثات کبھی اثر انداز نہیں ہوتے۔ مولانا سید عطاء اللہ شاہ بخاری کی سیاسی زندگی کا آغاز تحریک خلاف سے ہوا۔ تین سال قید بامشقت پائی۔ ۱۹۲۷ء میں شاتم رسول راجپال کے خلاف تحریک میں ایک سال اسیر فرنگ رہے کانگریس نے ۱۹۳۰ء میں سول نافرمانی کی تحریک چلائی تو بخاری ایک ہندوستان گیر طوفانی دورے کے بعد چھ مہینے کے لئے اسیر ہوگئے اس کے بعد پرانے خلافتی کارکنوں کے ہمراہ مجلس احرار اسلام بنائی اور آخر دم تک اس سے وابستہ رہے مجلس

احرار کا دماغ چودھری افضل حق تھے اور بخاری اسکے دل کی حیثیت رکھتے تھے تحریک کشمیر چلی تو دو سال کے لئے جیل میں بند کر دیئے گئے اسکے بعد اینٹی احمدیہ ایجی ٹیشن میں کئی بار گرفتار ہوئے۔ زندگی کے کم و بیش نو سال جیل میں گذار دیئے۔ شورش کاشمیری نے ان سے یہ بیان منسوب کیا ہے۔

"زندگی ہی کیا ہے؟ تین چوتھائی ریل میں ایک چوتھائی جیل میں، جتنے دل باہر رہا لوگ گلے کا ہار بنتے گئے آج کلکتہ کل ڈھاکہ، ڈھاکہ سے لکھنؤ لکھنؤ سے بمبئی پھر آگرہ، آگرہ سے دھلی اور دھلی سے لاہور، لاہور سے پشاور، پشاور سے کراچی۔ ذرا ہندوستان کے دیہات اور قصبات کا اندازہ کرلو۔ ہر کہیں گھوما پھرا ہوں سال کے تین سو پینسٹھ دنوں میں تین سو چھیاسٹھ تقریریں کی ہوں گی۔

دن کہیں رات کہیں، صبح کہیں شام کہیں

میں نے تقریر کی لوگوں نے کہا واہ شاہ جی واہ قید ہو گیا لوگوں نے کہا آہ شاہ جی آہ اور واہ اور آہ میں ہم ہو گئے تباہ"۔

قطعہ تاریخِ وفات

کھویا نہ وقت شاہ نے کارِ فضول میں
کوشاں رہا خدا کی رضا کے حصول میں

جس کے اثر سے شاہ بخاری تھا شعلہ دم
وہ کیفیت ہے بادۂ عشقِ رسول میں

تبلیغ دیں کے واسطے سید تھا سر بکف
خوئے رسول ہوتی ہے آلِ رسول میں

اس دم "وہ شاہ خلد میں محوِ خرام ہے" (۱۹۶۱)
آواز آرہی ہے یہ گوشِ قبول میں

"وہ شمع ضوفگن ہے" (۱۳۸۰ھ) بہشتِ بریں میں اب
اجلاس ہو رہے ہیں وہاں عرض و طول میں

سن کر ظفر علی نے کلام اس کا "یہ کہا
"بلبل چہک رہا ہے ریاضِ رسول میں"

۱۹۶۱ء

ذکر حبیب باعث تسکیں ہے اے حکیم
ہر چند اضطراب ہو قلب ملول میں

غلام نبی حکیم

ملک غلام نبیؒ (لاہور)

دل بھر آیا جو تری مہر ووفا یاد آئی

جناب ملک غلام نبی امر تسری، تحریک پاکستان کے بہت نمایاں کارکنوں میں سے ہیں۔ قیام پاکستان کے بعد وہ بائیں بازو کی سیاست اپنانے اور وزارت کو جالینے میں کامیاب رہے! ذیل کی تحریر دراصل ان کے اخباری مضامین کے مجموعہ "داغوں کی بہار" سے ماخوذ اقتباسات کی مرتب شکل ہے۔ (ذوالکفل بخاری)

۱۹۳۵ء میں "بال جبریل" کا شائع ہونا تھا کہ نوجوان طبقہ نے اسے اپنے لئے مشعل راہ سمجھا۔ کالجوں میں، ہوسٹلوں میں، ہوٹلوں میں، ریستورانوں میں ہر جگہ اسی کا تذکرہ ہوا کرتا تھا اور خودی کے ایک نئے تصور پر بھی بحثیں ہوا کرتی تھیں۔ کسی کو کوئی رباعی پسند تھی کوئی کسی شعر کو بار بار الاپ رہا تھا۔ عجیب کیفیت تھی۔

انہی دنوں مجلس احرار اسلام کا طوطی بول رہا تھا۔ سید عطاء اللہ شاہ بخاری (مرحوم) کی تقریریں جو نماز عشاء کے بعد سے نماز فجر تک جاری رہتی تھیں مجمع پر ایک وجد کی سی کیفیت طاری کر دیتی تھیں۔ ان تقریروں میں بال جبریل کے کئی اشعار کا ترنم سے پڑھنا سونے پر سہاگے کا کام کر دیتا تھا مجھے یاد ہے کہ شاہ جی نے ایک دفعہ فرمایا تھا کہ اگر انگریز اقبال کو سمجھ جاتا تو اسے تختہ دار پر لٹکا دیتا اور اگر قوم سمجھ جاتی تو وہ فرنگی کے خلاف ایسا انقلاب برپا کر دیتی کہ دنیا کے بڑے بڑے انقلابوں میں اسکا نام ہوتا۔

شاہ جی کی آواز میں اس بلا کا جادو تھا کہ میں نے اپنی ساری زندگی میں ان جیسا خطابت کا شہسوار نہیں دیکھا۔ اور سچی بات یہ ہے کہ میں نے جو کچھ سیکھا ہے میرے اللہ نے جو زبان اور قلم کی تھوڑی سی دولت مجھے عطا فرمائی ہے اور اپنے مافی الضمیر کو بیان کرنے کی جو قدرت دی ہے یہ سب انہی کی صحبتوں کا فیض ہے۔

۱۹۳۷ء میں جب سارے ہندوستان میں گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ ۱۹۳۵ء کے مطابق الیکشن کروائے جا رہے تھے تو مسلم لیگ نے بھی اپنے امیدوار کھڑے کئے تھے یوپی میں کانگریس اور مسلم لیگ نے کئی نشستوں پر سمجھوتہ کیا ہوا تھا۔ اسی طرح پنجاب میں بھی کئی حلقوں میں صورتحال واضح نہیں تھی۔ ایک تذبذب کی سی کیفیت پائی جاتی تھی۔ امرتسر شہر کی ایک نشست کے لئے تین امیدوار کھڑے تھے۔ ڈاکٹر سیف الدین کچلو، شیخ محمد صادق بیرسٹر اور شیخ حسام الدین! ڈاکٹر کچلو بطور آزاد امیدوار کے حصہ لے رہے تھے۔ شیخ حسام الدین مجلس احرار کے امیدوار تھے اور شیخ محمد صادق مسلم لیگ میں تھے۔

شیخ حسام الدین سیاسی میدان کے شہسوار تھے ایک تڑپ اور آزادی کا جذبہ رکھتے تھے۔ انہوں نے مصیبتیں بھی اٹھائی تھیں اور جیلیں بھی کاٹی تھیں اور اب تو مجلس احرار اسلام کی پوری حمایت بھی انہیں حاصل تھی گو مسجد شہید گنج کی تحریک کی وجہ سے احرار کی تحریک کافی دب چکی تھی لیکن پھر بھی جس سٹیج پر سید عطاء اللہ شاہ بخاری تقریر

کر رہے ہوتے تھے وہاں لوگوں کے ٹھٹھ کے ٹھٹھ لگ جانا معمولی بات تھی۔

بظاہر تینوں امیدواروں کے جیتنے کے آثار ایک جیسے نظر آرہے تھے کوئی بھی کسی سے کم دکھائی نہیں دیتا تھا لیکن جلیانوالہ باغ اور ڈاکٹر سیف الدین کچلو ایک ایسی داستان اور ایک ایسا قصہ بن چکے تھے کہ لوگ ڈاکٹر صاحب کو ہیرو تصور کرتے تھے چنانچہ ڈاکٹر صاحب کو چھ ہزار سے زیادہ ووٹ ملے۔ شیخ محمد صادق کو پانچ ہزار کے قریب اور شیخ حسام الدین کو چار ہزار! شیخ محمد صادق نے عذر داری اس بناء پر داخل کردی کہ الیکشن میں دھاندلی اور غیر قانونی حرکتیں ہوئی تھیں۔ اس لئے الیکشن کالعدم قرار دیا جانا چاہیئے اس انتخابی عذر داری کا فیصلہ دوبارہ الیکشن ہونا قرار پایا۔ تینوں امیدوار پھر سے میدان میں موجود تھے لیکن اس دفعہ مسلم لیگ کا ٹکٹ شیخ صادق حسین کو ملا۔ دوبارہ الیکشن ہوئے۔ شیخ صادق حسین کو کوئی سات ہزار ووٹ ملے ڈاکٹر کچلو کو اڑھائی ہزار اور شیخ حسام الدین کو وہی چار ہزار۔

مجلس احرار اسلام یقیناً دل و جان سے ہندوستان کی آزادی چاہتی تھی۔ اس کے لئے اس نے بے شمار قربانیاں بھی دی تھیں۔ اس کے پاس بڑے بڑے ایثار پیشہ لوگ موجود تھے جنہوں نے قید و بند کی صعوبتوں کو خندہ پیشانی سے برداشت کیا تھا جان پر کھیلنے والے کارکنوں کی اس کے ہاں کمی نہیں تھی۔ احرار کا حلقہ اثر پنجاب تک محدود تھا اور یہ بڑی شان سے ابھری تھی اور پنجاب میں بہت مقبول ہوچکی تھی۔ یہ بھی درست ہے کہ اگر مسجد شہید گنج کا پیچیدہ مسئلہ پیدا نہ ہوتا تو یہ باور کیا جاسکتا تھا کہ ۱۹۳۷ء کے صوبائی الیکشنوں میں مجلس احرار کا کوفی نشستیں مل جاتیں مگر وہ ایسی پوزیشن میں ہرگز نہیں ہوسکتی تھی کہ پنجاب میں حکومت بنالیتی جبکہ دوسری طرف ہندو، سکھ اور پنجاب کے جاگیردار اور زمیندار اپنی پوری طاقت اور لاؤ لشکر کے ساتھ تیار بیٹھے تھے۔ انکو گرانا کوئی آسان کام نہیں تھا اور پھر یہ سارے عناصر کامیاب ہو کر کبھی بھی احرار کے ساتھ تعاون کرنے کے لئے تیار نہ ہوتے خیر یہ بھی کئی حادثات کی طرح ایک حادثہ ہی تھا جو پیش آیا اور گذر گیا۔

سیاست تو ایک گورکھ دھندہ ہے۔ یہ مختلف جگہوں میں انسانیت کو پھنسائے رکھتا ہے۔ مجلس احرار اسلام نے اسلام کی بے پناہ خدمت کی تھی اور آپ مجھ سے اتفاق کریں گے کہ عطاء اللہ شاہ بخاری کی ایک تقریر ہماری ساری کتابوں سے کہیں بھاری اور وزنی ہوتی تھی۔ انہوں نے پاکستان کی مخالفت میں ایڑی چوٹی کا زور لگادیا تھا لیکن شکست کھاجانے کے بعد شاہ جی نے جس عظمت کردار کا ثبوت دیا تھا وہ انہی کا حق ہے۔ خدا انہیں کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے اور باعظمت انسانوں کو عظیم کردار کے مالک انسانوں کی پیروی کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔

مولوی محمد سعید مرحوم
سابق ایڈیٹر پاکستان ٹائمز لاہور

ترتیب و تلخیص
محمد عمر فاروق

شاہ جی اور قافلہ احرار

مولوی محمد سعید مرحوم پاکستان کی انگریزی صحافت کے معمار بزرگوں میں سے تھے۔ ڈان، پاکستان ٹائمز، ٹائمز آف کراچی اور سول اینڈ ملٹری گزٹ میں کام کیا۔ پاکستان ٹیلی ویژن سے بھی منسلک رہے۔ بڑی بات تو یہ ہے کہ مرحوم اردو کے صاحب اسلوب نثر نگار تھے۔ ۱۹۹۱ء میں بعمر اسّی سال وفات پائی۔ ان کی ذاتی یادداشتوں پر مشتمل کتاب "آہنگ بازگشت" سے مرتب کیا گیا مضمون ذیل میں دیا جا رہا ہے۔

انگریز جب آزادی مذہب کی آڑ میں غیر جانبدار ہو گیا تو گھٹیا قسم کے چند ہندو مصنفوں اور ریفارمروں نے پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر نجاست اچھالنے کو پیشہ بنا لیا۔ بہر کیف دلی میں عبدالرشید کے ہاتھوں شردہانند کیفر کردار کو پہنچا۔ لاہور میں علم الدین کے ہاتھوں راجپال اور کراچی میں عبدالقیوم کے ہاتھوں شاتمان رسول ﷺ کے اس انجام نے اس تحریک کا خاتمہ کر دیا۔

مسلمان قوم نے اپنے غیظ و غضب کے اظہار میں کسی مداہنت کو روا نہیں رکھا۔ سید عطاء اللہ شاہ بخاری نے ایک جلسہ میں برملا کہہ دیا۔ "اللہ سے گستاخی کرنے والوں سے تو وہ خود نپٹ لے گا۔ لیکن رسول ﷺ کی طرف اٹھنے والی انگلی کو ہی نہیں، شانے سے بازو تک کو کاٹ دیا جائے گا"

یہ محض حادثہ نہیں تھا کہ خلافت ایجی ٹیشن کا اتحاد و اتفاق ہندو مسلم فسادات کے خونیں سلسلے کی نذر ہو گیا۔ اور آزادی کی قرارداد پاس ہوتے ہی شاتمان رسول کی ایک کھیپ پیدا ہو گئی۔ صاف عیاں ہو چکا تھا کہ یا آزادی کا خواب پریشان کیا جا رہا ہے یا آنے والے دور کی ایک دھندلی سی تصویر دکھائی جا رہی ہے۔

بہر کیف کچھ عوامل ضرور ایسے کار فرما تھے۔ خواہ وہ نفسیاتی ہوں یا سیاسی۔ جو قوموں کے اتحاد کے درمیان متواتر حائل ہو رہے تھے۔

ہندو ڈوگروں کے غرور کی انتہا بالآخر قرآن پاک کی توہین کی صورت میں ظاہر ہوئی، کشمیری کہ جنھوں نے بے چارگی میں برسوں اپنے بچوں کے گلگوں چہروں پر طمانچے پڑتے دیکھے تھے اس سانحہ پر ان کے ہاتھ سے بھی دامن صبر چھوٹ گیا۔ وہ اٹھے اور ۱۳ جولائی ۱۹۳۱ء کے روز اپنے جابر حکمران کے ساتھ ٹکرا گئے۔ یہ تاریخی تصادم امیرا کدل پر ہوا۔ حوصلے اتنے بلند ہو چکے تھے کہ کشمیریوں نے ڈوگرے سپاہیوں سے بندوقیں چھین چھین کر دریا میں پھینک دیں۔ پشاور کے بعد سری نگر شمالی ہندوستان کا دوسرا شہر تھا جو ان دنوں مسلمانوں کے خون سے رنگین ہو رہا تھا۔

وادیٔ کشمیر میں جو جنگ ڈوگروں کے خلاف جاری ہو چکی تھی۔ اس کی بازگشت پہاڑوں کے دامن میں

پھیلے ہوئے پنجاب کے ہر قریہ اور ہر شہر میں ہوئی۔ احرار کے ابتدائی ایام تھے۔ احرار کی بے پناہ خطابت کے لئے اس سے بڑھ کر اور کوئی موضوع مناسب نہ تھا۔ چنانچہ انہوں نے پنجاب کے طول و عرض میں اپنی شعلہ بیانی سے آگ لگا دی۔ سرخپوش ابھی تک قصہ خوانی کے معرکۂ خونیں سے پوری طرح نہ ابھر سکے تھے۔ خاکسار تحریک کے خطوط ابھی تک غیر مرئی تھے۔ لیگ اپنی مجبوریوں اور کانگرس اپنی مصلحتوں کی بناء پر اس تحریک میں الجھنا نہیں چاہتی تھی۔ کشمیر ایجی ٹیشن کی قیادت چنانچہ احرار کے ہاتھ میں آ گئی۔ اور وہ اس کے لئے موزوں تھے۔ مسئلہ مسلمانوں کی آزادی اور ان کے مذہبی تحفظ کا تھا۔ انہیں دو اجزاء سے احرار کی حکمت عملی نے ترکیب پائی تھی۔ قید و بند سے وہ خائف نہیں تھے۔ ان کی قیادت نے اگست ۱۹۳۱ء میں تیس ہزار آدمیوں کو ڈوگروں کی جیلوں اور کیمپوں میں بھیج دیا۔ سیالکوٹ شہر کا کوئی جوان ایسا نہ ہو گا جس نے سچیت گڑھ کے کیمپ کے خار دار تاروں کے پیچھے چند دن نہ گزارے ہوں۔ قافلے جب ظفر علی خان کا نغمہ "کشمیر چلو کشمیر چلو" گاتے ہوئے نکلتے تو منظر دیدنی ہوتا۔ بیویاں خاوندوں کو اور مائیں بچوں کو بڑی دعاؤں اور ولولوں کے ساتھ رخصت کرتیں۔

پنجاب کے ہندو پریس نے حسب معمول اس مسئلے کو اسی نگاہ سے دیکھا جس سے وہ ہر مسئلے کو دیکھنے کا عادی تھا۔ انہوں نے یہ نہ دیکھا کہ ایک خطے کے لوگ وہاں کے جابر حکمرانوں کے پنجۂ استبداد کی گرفت سے نکلنا چاہتے ہیں۔ انہوں نے مہاراجے کے نام کی رعایت سے اسے بھی ہندو مسلم مسئلہ بنا دیا۔ چنانچہ آریہ سماجی پرچارک جگہ جگہ پھیل گئے۔ مسلمان والیان ریاست کے ظلم و جور کے ایسے افسانے گھڑے گئے کہ تاریخ انگشت بدنداں رہ گئی۔

ان دنوں احرار کا ستارہ بڑے عروج پر تھا۔ پورا پنجاب انکی مٹھی میں تھا۔ عوام سے اتنا رابطہ یونینسٹ پارٹی اور اس کے ارباب بندوبست کے لئے سوہان روح ثابت ہو رہا تھا۔ اس لئے کہ اگلے چند برسوں میں یونینسٹ پنجاب کی سرزمین پر سر فضل حسین کی قیادت میں بلا شرکت غیرے اپنا پھریرا لہرانا چاہتے تھے۔ احرار تو ان کے نزدیک خیر کسی شمار قطار میں نہیں تھے۔ وہ لیگ تک کو اپنی قلمرو میں نہیں آنے دینا چاہتے تھے۔ مجلس احرار وہ پہلی جماعت تھی جو پنجاب کے جاگیرداروں اور سرکار پرستوں کے لئے بے اطمینانی کا باعث تھی اور جس کا رابطہ براہ راست عامۃ الناس سے تھا بہر کیف دونوں ابھرتی ہوئی قوتوں میں ٹھن گئی۔ احرار کہ جو مستر د راجواڑے کو سرنگوں کر چکے تھے۔ اور یونینسٹ کہ جن کی پشت پر انگریز کا دبدبہ اور سر فضل حسین کی زیر کی تھی۔ تحریک کشمیر کے دوران ہی اس تناؤ کے آثار ہویدا ہو چکے تھے۔ ہری سنگھ ڈوگرے کی تذلیل کے بعد انہوں نے اپنا رخ سر فضل حسین کی جانب کر لیا۔

لائلپور کے دھوبی گھاٹ میں ان کا اجتماع ایسا فقید المثال تھا کہ چاروں طرف احرار کی قوت کی دھوم مچ گئی۔ احرار نے لائلپور سے فارغ ہو کر پسرور میں ڈیرے ڈال دیئے۔ ریلوے اسٹیشن کے قریب اینٹوں کے ایک ویران بھٹے کے پاس کھلے میدان میں ان کا پنڈال نصب ہوا۔ آبادی کے لحاظ سے پسرور کا جلسہ بھی کچھ کم

کامیاب نہیں تھا۔ جلسے کے دوران مجھے ایک دوست چودھری علی محمد باجوہ نے جو لاہور سے آئے تھے۔ بتایا کہ مسجد شہید گنج کا تنازعہ بڑی خطرناک صورت اختیار کر گیا ہے۔ اور لاہوری مسلمانوں کی یورش محلہ دارا شکوہ پر برابر ہو رہی ہے۔

۹ جولائی ۱۹۳۵ء کا دن شہید گنج کے پرستاروں کے لئے قیامت کا دن تھا۔ لاہور کے دلی دروازہ کے باہر محلہ دارا شکوہ پر مسلمانوں کی یورش ہو رہی تھی۔ ناکہ خار دار تاروں سے بند تھا۔ کوتوالی کی برجیوں پر گورا فوج ہتھیار نصب کئے بیٹھی تھی۔ جوانان!! بزر چھاتیاں کھولے موجوں کی صورت میں آگے بڑھتے جاتے اور موت کے گھاٹ اترتے جاتے۔ یہ خبر مجھے احرار کے جلسہ میں ملی۔ چنانچہ دوپہر کے کھانے کے وقت میں سید عطاء اللہ شاہ بخاری اور مولانا حبیب الرحمن لدھیانوی کی خدمت میں حاضر ہوا۔ پسرور کی سرکلر روڈ پر کاشانہ میں ان کا قیام تھا۔ کھانے سے فارغ ہوئے ہی تھے کہ میں نے سلام عرض کیا۔ میں نے جاتے ہی پوچھا۔

"لاہور میں جو گولی چل رہی ہے اسکی ذمہ داری کس پر ہے؟" سید جی کچھ کہہ نہیں پائے تھے کہ مولانا لدھیانوی نے گرج کر کہا۔ "جاؤ کرم آباد، ظفر علی خان سے پوچھو" پیشتر اس سے کہ میں کچھ اور عرض کرنے کی جسارت کرتا شاہ صاحب نے مجھے اپنے ساتھ چارپائی پر بٹھالیا۔ بڑی شفقت سے خیر و عافیت پوچھی۔ میرے جذبے کو سراہا اور پھر کسی قدر جوش میں آکے پوچھا۔ "اگر پنجاب میں خانہ جنگی چھڑ گئی تو تیار ہو؟"

میں خاموش رہا۔ پھر خود ہی کہنے لگے "آج ہی لاہور جا کے عورتوں کے برقعے اتروا سکتا ہوں لیکن اگر پنجاب میں خون کی ندیاں بہہ نکلیں تو کون ذمہ دار ہوگا؟"

پچھلے پہر مولانا حبیب الرحمن کو جلسہ میں تقریر کرنا تھی۔ تقریر کے دوران انہوں نے احرار کو الجھانے کے جو منصوبے بن رہے تھے انکا ذکر کیا اور کہا کہ۔

"میں ایسا نااہل جرنیل نہیں ہوں کہ جو فوج کو دو محاذوں پر ٹکرا کر فنا کر دے"

شہید گنج کا قضیہ طول کھینچ گیا۔ اور مسجد تھوڑے سے رد و بدل کے بعد گوردوارے میں بدل دی گئی۔ واقعات کی رواروی میں نہ صرف احرار ہی کچلے گئے بلکہ مولانا ظفر علی خان بھی نہ ابھر سکے۔ ظفر علی خان اور احرار کے درمیان بڑے بڑے قلمی اور زبانی مجادلے ہوئے۔ اسی زمانے میں ایک دوسرے کے مجمعوں کو منتشر کرنے کی ایسی ترکیبیں سوجی جاتیں کہ لوگ عش عش کر اٹھتے۔ سیالکوٹ میں مولا بخش کے تالاب کو خشک کر کے وہاں احرار نے اپنا کنونشن جمایا۔ سیالکوٹ احرار کا ناقابل تسخیر حصار سمجھا جاتا تھا۔ اس لئے یہ کنونشن اپنے رکھ رکھاؤ اور تزک و احتشام کے اعتبار سے بڑے بر تن کی بڑی کھرچن ثابت ہوا۔

مولانا حبیب الرحمن لدھیانوی تقریر کر رہے تھے کہ جلسہ گاہ کے ایک کونے سے ظفر علی خان زندہ باد کا نعرہ بلند ہوا۔ دو چار آوازیں اور شامل ہو گئیں۔ مولانا جلال میں آگئے اور پکارے۔ "والینٹئرز نکال دو ان مرزائیوں کو۔ ظفر علی خان بہادر ہے ہم اس کے وارث ہیں۔ ہم بہادر ہیں، ظفر علی خان ہمارا وارث ہے، بہادروں کی محفل میں ان بزدلوں کا کیا کام؟" نعرہ باز ہاتھوں ہاتھ دروازے تک اور پھر سڑک تک پہنچا دیئے گئے

اور جلسہ جاری رہا۔

جلسے کے ایک اجتماع کی صدارت سید عطاء اللہ شاہ بخاری نے کی۔ تلاوت قرآن پاک ہو رہی تھی۔ کہ مولانا حبیب الرحمٰن اپنے خیمے سے برآمد ہو کر جلسہ گاہ کی جانب روانہ ہوئے۔ ان کے آگے آگے بینڈ مارچنگ کی دھن بجا رہے تھے۔ اور نعرے لگ رہے تھے۔ آوازیں ہمیں جلسہ گاہ سے برابر آ رہی تھیں۔

مولانا مظہر علی اظہر کی تقریر بڑی معرکہ آرا تھی۔ ایک مقام پر انہوں نے انگریز حکمرانوں کو خطاب کرتے ہوئے کہا "مسلمانوں کے جذبات سے مزید کھیلنا بغاوت کو دعوت دینا ہے" اس جملے پر شاہ جی کرسیٔ صدارت سے اٹھ کر فرط جوش سے اسٹیج پر ٹہلنے لگے۔

مولا بخش کے تالاب کا جلسہ احرار کا دم واپیس تھا۔

جس شخص کو لاہور کا وہ دور دیکھنا نصیب ہوا ہے وہ جانتا ہے کہ جو قوم دو پشتوں سے عافیت کوش اور مصلحت اندیش ہو چکی تھی اس کی اگلی نسل کی تربیت کہاں ہو رہی تھی۔ ان شکستہ دیواروں سے عطاء اللہ شاہ بخاری کی للکاریں ٹکرا چکی ہیں۔ موچی دروازے نے اقبال کا جواب شکوہ سنا۔ دلی دروازے نے ظفر علی خان کے نغمے اور نعتیں سنیں ہیں۔

جلسے جس اہتمام سے جمائے جاتے اسی اہتمام سے برہم بھی کئے جاتے۔ اس دور میں تو گولی اور بم نے جلسوں کے اجڑنے کا سارا لطف غارت کر دیا ہے۔ ان دنوں جمے جمائے جلسے محض پھبپھڑوں کے زور سے ہوا میں اڑا دیئے جاتے۔ شروع شروع میں تو جلسہ گاہ کے گوشوں پر بڑے نیچے سروں میں پھبتیوں، ضلع جگتوں، طعنوں اور نعروں کی گونج سنائی دیتی کچھ دیر تک تو زخمہ ور کی تیز دستی انہیں دبائے رکھتی۔ پھر آواز اسٹیج کی جانب قدم بہ قدم بڑھتی سنائی دیتی تا آنکہ والنٹیئر جاتے کود جانے اور پھر یک لخت دست بدستے دگرے کا سماں پیدا ہو جاتا۔ گھڑی دو گھڑی بعد کوئی ٹوٹی ہوئی طناب یا کسی نقش پا کی شوخی کہے دیتی کہ ابھی کوئی اس راہ سے گزرا ہے۔

لاہوریوں کو ایک مرتبہ ایسے ہی موڈ میں پا کر سید عطاء اللہ شاہ بخاری نے للکار کر کہا۔ "وہی دلی دروازہ ہے۔ وہی پیپل کا پیڑ۔ برس دن کے بعد لوٹ کے آیا ہوں۔ پھر برسا لو پتھر۔ خدا کی قسم تمہیں کچھ نہیں کہوں گا۔ اس لئے کہ عبداللہ کے یتیم بیٹے ﷺ نے مجھے یہی سکھایا ہے"

مجھے یاد ہے کہ آخری جملے نے پوری محفل کو بیخود کر دیا تھا۔ میرے قریب گھاس پر ہی (مرزائیوں) لاہوری جماعت کے مولوی صدر الدین بیٹھے تھے وہ ہڑبڑا کے پاؤں کے بل بیٹھ گئے اور ان کے منہ سے اللہ اللہ اس طرح بے ساختہ نکلا کہ جیسے بجلی کی کڑک نے انہیں نیند سے بیدار کر دیا ہو۔

آج جب کبھی دلی دروازے سے گزرتا ہوں اور اس اداس اور کہنہ سال پیپل کو دیکھتا ہوں تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جیسے کہہ رہا ہو۔

سنگ در دیوار ہا از شوخیٔ طفلاں نماند
شہر گر ویراں شود، خود رالبصرا امیکشم

(بچوں کی شوخیوں نے کوئی پتھر دیواروں میں نہیں چھوڑا اور اگر شہر یوں ویران ہو گیا تو میں صحرا کو چل دوں گا)

علی گڑھ کی مرکزی حیثیت کا اندازہ اس ایک جملے سے ہوتا ہے جو سید عطاء اللہ شاہ بخاری نے ایک مرتبہ یونین ہال میں تقریر شروع کرنے سے قبل کہا۔ کہ جب لاہور سے چلا تو احباب نے کہا کہ اگر علی گڑھ کے مسلمانوں سے خطاب کرنا ہے تو شہر کی جامع مسجد میں تقریر کرنا اور اگر پورے ہندوستان کے مسلمانوں سے کچھ کہنا ہے تو یونیورسٹی میں تقریر کرنا۔

علی گڑھ نفسوں کے اندر تغیر لانے کا اہتمام تھا۔ علی گڑھ نے اگرچہ ابتداء ہی سے بڑے سیاسی معرکے دیکھے تھے۔ اور خود اس کا اپنا وجود ایک سیاسی اقدام تھا۔ لیکن جس دور میں سے یہ اس صدی کے چوتھے عرشے میں گزر رہا تھا۔ وہ بڑا فیصلہ کن تھا۔

اس عرصے میں علی گڑھ میں چار عظیم ہستیاں آئیں۔ حکمرانوں کے جذبات کے ترجمان لارڈ لو تھین کہ جن کے بارے میں عام تاثر تھا کہ وہ وائسرائے بنکر آرہے ہیں۔ کانگرس کے ذہن کی ترجمان مسز سروجنی نائیڈو، مسلمان وطن پرستوں کے نمائندہ سید عطاء اللہ شاہ بخاری اور مسلمانوں کے ابھرتے ہوئے سواد اعظم کے نمائندہ قائد اعظم محمد علی جناح۔ یہ مشاہیر اپنے اپنے رنگ میں فقید المثال تھے۔

سروجنی نائیڈو شاعرہ تھیں۔ اپنے ہم عصر لوگوں میں وہ قائد کی بے حد مداح تھیں۔ ثقافت انہیں مسلمانوں کی مرغوب تھی۔ اور سیاست گاندھی جی کی۔ بہادر یار جنگ کی خطابت کی دلدادہ تھیں اور خود بھی سحر بیان مقررہ تھیں۔

قائد اعظم مسلمانوں کی نشاۃ ثانیہ کا سمبل بنکر ابھرے منطق ان کی یخ بستہ ہوتی اور خطابت شعلہ فشاں، دلائل پر جائیے تو مفر نہیں تھا۔ خطابت پر جائیے تو رکنا محال ہوتا۔

عطاء اللہ شاہ بخاری خوبرو، خوش گلو، خطابت کی ہر رمز کے شناسا اسٹیج پر آتے تو آنکھوں کو بھلے لگتے بولتے تو فردوس گوش اور تقریر جیسے جیسے ابھرتی دماغ دل کے حق میں دست بردار ہو جاتا اور دل شاہ جی کی انگلیوں میں ہوتا۔ شاہ جی نے یونین ہال میں ایک معرکہ آراء تقریر میں

الیوم اکملت لکم دینکم

کی تفسیر بیان کی۔ یونین کے صدر کو گمان گزرا کہ تقریر شائد فرقہ وارانہ ہو جائے گی۔ چنانچہ انہوں نے شاہ جی کی خدمت میں عرض کی کہ فرقہ وارانہ تقریر یونین کے قواعد کی رو سے ممنوع ہیں۔ شاہ جی نے اطمینان دلایا کہ یونین کی ہر روایت کی پاسداری کی جائے گی۔

تقریر شروع ہوئی۔ اس حال میں کہ اسٹیج پر دیگر حضرات کے علاوہ رشید احمد صدیقی جیسے بذلہ سنج اور شستہ مذاق اور ہادی حسن جیسے سحر بیان بیٹھے ہوئے تھے۔ شاہ جی جب ظرافت پر آتے تو رشید احمد ہنسی ضبط نہ کر سکتے۔ اور جب خطابت کی بلندیوں کو چھوتے تو ہادی حسن جھوم جھوم جاتے۔ ان کی تقریر کا نقطہ عروج وہ

سین تھا جب انہوں نے اپنے رومال کی جھولی بنا کر آگے بیٹھے ہوئے بچوں سے کہا کہ آؤ بچو مٹھائی لیتے جاؤ۔ ایک ایک بچہ آگے بڑھتا، شاہ جی اس کی جھولی میں کچھ نہ کچھ ڈال دیتے۔ جب آخری بچہ آیا تو اس کی جھولی میں سب کچھ الٹ دیا اور جب اس کے بعد بھی ایک بچہ اچانک اٹھ بیٹھا تو شاہ جی نے اپنا خالی رومال ہوا میں لہرا کر وجد آفرین قرأت میں الیوم اکملت لکم دینکم
کا اعلان کر دیا۔ یہ آیت اس سوز اور حتمیت سے پڑھی کہ پورا ہال تحسین کے نعروں سے گونج اٹھا۔ اقبال کے مصرعہ "داد مارا آخریں جامے کہ داشت" کو یوں حقیقت کے سانچے میں ڈھلتے ہوئے آنکھوں نے اس روز دیکھا۔ شاہ جی کو زبان پر جو عبور حاصل تھا۔ اس پر انہوں نے اپنے فرکادنی اور لکھنؤ والوں کو خطاب کر کے اظہار یہ کہہ کر کیا" برس دن کے بعد اردو میں تقریر کر رہا ہوں کہیں زبان کی غلطی کر جاؤں تو ٹوک دینا"

میں تقریر سن رہا تھا اور میرے ذہن میں شاہ جی کی ایک اور ہی تصویر ابھر رہی تھی۔ جھنڈے کا دیہاتی اسٹیج ہے، ان پڑھ لوگوں کا ہجوم ہے، شاہ جی پنجابی میں تقریر کر رہے ہیں اور ان سادہ ورق لوگوں کے دلوں کو گرماتے جا رہے ہیں۔ یا پھر گلو شاہ کے میلے میں منبر بچھا ہوا ہے۔ اور وہ جمعہ کا خطبہ ارشاد فرما رہے ہیں۔ اور لوگ سر دھن رہے ہیں۔ اسٹیج علی گڑھ کا ہو یا موچی دروازے کا، منبر جامع مسجد دہلی کا ہو یا گلو شاہ کا۔ شاہ جی کا جادو یکساں ایمان افروز ہوتا۔

قافلہ احرار جو گزشتہ پندرہ برسوں میں بڑے جانگداز نشیب و فراز دیکھ چکا تھا اب اس مقام پر پہنچ گیا کہ کانگریس ان کے اپنے نزدیک اب ایک فاشسٹ جماعت ہو چکی تھی۔ چنانچہ نوابزادہ نصر اللہ خان نے کہ جو ان دنوں احرار کے قافلہ سالار تھے۔ ایک بیان جاری کیا کہ چونکہ کانگریس کے ہاتھوں ملک کا امن تباہ و برباد ہو گیا ہے۔ اس لئے ضروری ہے کہ اپنی سیاسی سمت پر نگاہ ثانی کی جائے اور اب وہ پالیسی اختیار کی جائے جو مسلمانوں کی امنگوں کی ترجمان ہو" احرار نے بہار اور نواکھلی کے فسادات کی مذمت کی اور اپنی سعی کو کاملاً "ہندی مسلمانوں کی رستگاری" کے لئے وقف کر دیا۔

احرار کی سیاست اگرچہ بڑے نشیب و فراز سے گزرتی رہی تھی۔ تاہم وہ ایک بات میں بڑے ثابت قدم رہے اور وہ ان کی قادیان دشمنی تھی۔ انہیں جس شہر اور جس اسٹیج سے موقعہ ملا انہوں نے اس دشمنی کا اظہار بھرپور انداز میں کیا۔

ایک روز (ڈان کے) دفتر میں آکے بیٹھا ہی تھا کہ معلوم ہوا سید عطاء اللہ شاہ بخاری آرام باغ (کراچی) میں تقریر کرنے والے ہیں۔ اخبار کو گھنٹے ڈیڑھ گھنٹے کے لئے دوسروں کے سپرد کر کے آرام باغ چلا گیا۔ شاہ جی کو سنے ہوئے مدت ہوئی تھی اور پاکستان بننے کے بعد سے انہیں دیکھا بھی نہیں تھا۔ تقریر شروع ہوئی تو وہی اعتماد، وہی خوش الحانی اور خوش گفتاری۔ تقریر ہر اس خوبی سے مزین تھی جو کسی بڑے خطاب کا طرۂ امتیاز ہوتی ہے۔ تقریر کا معتدبہ حصہ مرزائیت کے خلاف تھا۔ میں تقریر کے دوران ہی دفتر چلا آیا۔ اور اس کے ساتھ ہی وہ ربع صدی اختتام کو پہنچی جس میں نطق کی سحر کاری کو ہزار جلوؤں میں دیکھا۔

عبدالمجید قریشی مرحوم

کاروانِ خطابت کا آخری نقیب

یہ منزلت بھی غنیمت ہے اہلِ دنیا کی
ملا کے خاک میں ذکرِ کمال کرتے ہیں

بچپن کی سنی ہوئی کہانیوں میں سے ایک کہانی یوں شروع ہوتی تھی کہ کسی زمانے میں ایک بادشاہ تھا جس کی ایک بیٹی تھی۔ نہایت حسین و خوش جمال۔ شہزادی کے حسن کا یہ عالم تھا کہ ہنستی تھی تو پھول برستے تھے۔ اور روتی تھی تو موتی جھڑتے تھے۔ امیر شریعت مولانا سید عطاء اللہ شاہ بخاری رحمتہ اللہ علیہ کی تقریروں میں آگے چل کر مجھے کچھ ایسے ہی حسین و جمیل مناظر دیکھنے کے مواقع میسر آئے۔ ان کی تقریریں سن کر ایسا معلوم ہوتا تھا کہ شاعر نے یہ شعر شاید ان ہی کی سحر بیانی اور طلاقت لسانی سے متاثر ہو کر کہا تھا۔

شبنم کہیں گرائی، کہیں گُل کھلا دیا
رویا کہیں کوئی تو کسی کو ہنسا دیا

انگریزی زبان میں مقرر کے لئے عام طور پر لیکچرر اور سپیکر کے الفاظ استعمال کئے جاتے ہیں لیکن جہاں حضرت شاہ جی مرحوم و مغفور کی خطابت کا ذکر مقصود ہو گا وہاں ہمیں ان کے لئے انگریزی لغت سے لفظ (ORATOR) کا انتخاب کرنا پڑے گا۔ ان کی تقریریں بلاشبہ فصاحت و بلاغت کا ایک نادر اور بے مثال مرقع ہوتی تھیں۔ وہ جو مرزا غالب نے فرمایا۔

زباں پہ بارِ خدایا یہ کس کا نام آیا!
کہ میرے نطق نے بوسے میری زباں کے لئے

تو خدا ہی جانے کن کے لئے فرمایا تھا لیکن یہ حقیقت ہے کہ جب شاہ جی تقریر کرنے کے لئے کھڑے ہوتے تھے تو سلاست و روانی اور برجستگی بے اختیار ان کی زبان کے بوسے لیتی ہوئی نظر آتی تھی۔

سید عطاء اللہ شاہ بخاری اس قومی کاروانِ خطابت کے آخری نقیب تھے جس کے سالارِ اول نواب محسن الملک مرحوم تھے۔ نواب صاحبؒ کا شمار اپنے دور کے بہترین مقررین میں ہوتا تھا۔ ان کے متعلق مشہور ہے کہ انہیں اپنے سامعین پر اتنا ہی اختیار ہوتا تھا جتنا اختیار ایک کمہار کو مٹی پر ہوتا ہے۔ یہ کمہار کی مرضی پر منحصر ہے کہ وہ گندھی ہوئی مٹی کو جس شکل میں چاہے تبدیل کر دے۔ اسی دور کے ایک بلند پایہ خطیب شمس العلماء ڈپٹی مولوی نذیر احمد دہلوی بھی تھے۔ نواب صاحب کے ساتھ ساتھ ان کے کارناموں کی بھی دنیائے خطابت میں دھوم مچی ہوئی تھی۔ آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس علی گڑھ کے اجتماعات ہوں یا انجمن حمایت اسلام لاہور کے جلسے ڈپٹی صاحب خصوصی طور پر ان میں مدعو کئے جاتے۔ ان کے بغیر قوم کی ان محفلوں کا رنگ نہ نکھرتا اور لوگ جب تک ان کو سن نہ لیتے بے کیفی سی محسوس کرتے رہتے۔

شمس العلماء ڈپٹی مولوی نذیر احمد دہلوی کی وفات (۱۹۱۲ء) کے وقت برصغیر کے سیاسی مسائل میں دور رس تبدیلیاں رونما ہو چکی تھیں۔ سیاسی جماعتیں اور ان کے رہنما جو ابھی کل تک حکومت وقت سے وفاداری بشرط استواری کی پالیسی پر گامزن تھے۔ رفتہ رفتہ اب اس راہ سے ہٹتے چلے جا رہے تھے۔ اور حکمرانوں کو آنکھیں دکھانے لگے تھے۔ بلکہ مولانا حسرت موہانی تو اب سے کوئی چار پانچ سال قبل ہی اپنے ماہنامے "اردوئے معلیٰ" میں شائع کردہ ایک مضمون کی بناء پر بہ جرم بغاوت حوالۂ زنداں کئے جا چکے تھے۔ برصغیر کے عوام اب بادۂ حریت سے سرشار ہو چکے تھے۔ اور اس نشے کا اتارنا کسی ترشی کے بس کی بات نہ رہی تھی۔ اس وقت گلستان خطابت میں جیسے فصلِ بہار آگئی تھی۔ مسلمانوں کے نوجوان طبقے میں مولانا محمد علی جوہر، مولانا ابوالکلام آزاد اور مولانا ظفر علی خان میدانِ خطابت میں ابھرے اور بڑی شان کے ساتھ ابھرے۔ ان کے ذرا بعد آنے والوں میں مولانا احمد سعید دہلوی، مولانا شبیر احمد عثمانی، مولانا حسین احمد مدنی، نواب بہادر یار جنگ، ڈاکٹر کے ایم اشرف، مولانا محمد داؤد غزنوی اور سید عطاء اللہ شاہ بخاری بھی شامل تھے۔ ان حضرات کے میدان ہائے عمل مختلف تھے مگر مطمح نظر ایک ہی تھا۔ اور وہ تھا حصول آزادیٔ وطن۔ حضرت شاہ جی کا اسم گرامی میں "ترکش مارا خدنگ آخریں" کے طور پر آخر میں لے رہا ہوں ورنہ جہاں تک ان کی شخصیت اور فن کا تعلق ہے۔ وہ ہمیں ہر جگہ ممتاز، یکتا اور منفرد نظر آتے ہیں۔ حقیقت میں وہ فن خطابت کے امام تھے۔ جن لوگوں کو "الف لیلہ" پڑھنے یا سننے کا اتفاق ہوا ہے وہ بخوبی واقف ہیں کہ اس کتاب میں کس طرح ایک کہانی سے دوسری کہانی جنم لیتی جاتی ہے۔ کچھ ایسا ہی انداز شاہ جی مرحوم کی خطابت کا تھا گو وہ اپنی تقریر کے بہاؤ میں نفس مضمون سے کوسوں دور نکل جاتے تھے لیکن ان کی تقریر کی دلکشی و دلربائی کی یہ کیفیت ہوتی کہ بعض دفعہ عشاء سے فجر ہو جاتی تھی نہ کوئی اکتاتا اور نہ کسی آنکھ میں نیند آتی۔ قرآن کریم کی تلاوت کا ان کا اپنا لب و لہجہ تھا۔ یہ فریضہ وہ بڑے سوز و گداز کے ساتھ انجام دیتے۔ ایک ہندو دوست نے کیا ہی خوب کہا کہ قرآن کو معجزے کے طور پر دیکھنا ہو تو سید عطاء اللہ شاہ کو آیات قرآنی کی تلاوت کرتے ہوئے دیکھو!

شاہ جی کی تقریر میں نے پہلی مرتبہ ۱۹۳۸ء میں قیام دلی کے دوران میں سنی۔ پہاڑ گنج میں تانگوں کے اڈے کے برابر ایک بڑا سا گول میدان ہوا کرتا تھا۔ جسے گول چکر کہا جاتا تھا۔ یہ جگہ ہمیشہ جلسہ گاہ کے طور پر استعمال ہوتی تھی۔ مجھے شاہ جی کو دیکھنے اور ان کی تقریر سننے کا پہلے پہل یہیں اتفاق ہوا تھا۔ وہ منظر اب بھی میری نگاہوں کے سامنے ہے۔

ان دنوں برسات کا موسم تھا۔ گیارہ بجے شب کے قریب جب حضرت شاہ جی تقریر کے لئے کھڑے ہوئے تو آسمان پر دور دور تک سیاہ بادل چھائے ہوئے تھے۔ تقریر کے ساتھ ہی ہلکی ہلکی پھوار پڑنے لگی۔ پانچ سات منٹ بعد یہ پھوار ننھی منی بوندوں میں تبدیل ہو گئی۔ موسم کا یہ رنگ ڈھنگ دیکھ کر سامعین کچھ کسمسائے لیکن اٹھے نہیں۔ اور شاہ جی کی تقریر جاری رہی۔ گو بوندیں ان کے اوپر بھی گر رہی تھیں۔ لیکن وہ تقریر کے ساتھ ساتھ حاضرین کی ذہنی کشمکش کا لطف اٹھانے پر تلے ہوئے تھے۔ بارش ہلکے پھلکے انداز میں

جاری تھی کہ دو آدمی اٹھنے لگے۔ انہیں اٹھتا ہوا دیکھ کر شاہ جی جوش میں آ گئے فرمانے لگے! "دلی والو! بس اتنے ہی مرد ہو کہ ذرا سی بوندوں سے گھبرا گئے۔ اس برتے پر تم عطاء اللہ شاہ بخاری کی تقریر سننے کے لئے آئے تھے؟ ارے بخاری کی تقریروں میں تو تمہیں انگریزوں کی رائفلوں کی گولیاں بھی کھانی پڑیں گی اور تم ہو کہ ان دو چار بوندوں ہی سے ڈر کر بھاگنے لگے۔ یاد رکھنا اگر بھاگ گئے تو پھر کبھی پہاڑ گنج کا منہ نہ دیکھوں گا۔ ہاں یاد آیا۔ تم بھی سچے ہو۔ جیب میں رکھے ہوئے نوٹوں کا خیال آ گیا ہو گا" ان الفاظ کا شاہ جی کے منہ سے نکلنا تھا کہ لوگ دبک کر بیٹھ گئے۔ جلسے کا رنگ جم گیا۔ حتیٰ کہ چند لمحات کے بعد بارش بھی تھم گئی۔

حضرت شاہ جی کے ایک دوسرے جلسے کا ایک دلچسپ اور پرلطف واقعہ انہیں دنوں مجھے اپنے والد صاحب مرحوم کی زبانی سننے کا اتفاق ہوا۔ پاکستان کے قیام سے پہلے انبالہ (مشرقی پنجاب) میں "انجمن تبلیغ اسلام" کے نام سے ایک انجمن ہوتی تھی۔ جس کے صدر میر غلام بیگ نیرنگ مرحوم تھے۔ میر صاحب اپنے زمانے کے ایک اچھے شاعر اور معتدل مزاج سیاست دان بھی تھے۔ وہ ایک طویل عرصے تک مرکزی اسمبلی میں انبالہ ڈویژن کے مسلمانوں کی بلامقابلہ نمائندگی بھی فرماتے رہے۔ انجمن تبلیغ اسلام کا مقصد جیسا کہ اس کے نام سے ظاہر ہے محض تبلیغ دین تھا۔ سیاسیات سے غالباً اس کا کوئی تعلق نہ تھا۔ ایک مرتبہ انجمن کا سالانہ جلسہ انبالے میں منعقد ہونا قرار پایا۔ میر صاحب نے ہندوستان کے جن مشاہیر علماء کرام کو اس موقع پر مدعو کیا ان میں حضرت شاہ جی بھی تھے۔ میر صاحب نے شاہ جی سے وعدہ لے لیا تھا کہ ان کی تقریر محض تبلیغی ہو گی۔ اور سیاست سے انہیں بہرصورت دامن بچانا ہو گا۔ لیکن شاہ جی بھلا کہاں چوکنے والے تھے۔ پھر پھرا کر آخر سیاست پر آ ہی گئے اور اپنی تقریر کا رخ فرنگی استعمار کے خلاف پھیر دیا۔ میر صاحب نے جو یہ رنگ دیکھا تو کیا کہتے بس چپکے سے کرسیٔ صدارت چھوڑ کر غائب ہو گئے۔ دوران تقریر اب جو شاہ جی نے مڑ کر پیچھے دیکھا تو کرسیٔ صدارت سے میر صاحب قبلہ غائب! شاہ جی مسکرائے اور فرمانے لگے "اچھا بھاگ گئے۔ اب تم صدارت کرو میرے بھائی" یہ کہہ کر اپنا موٹا سا لکڑی کا ڈنڈا کرسیٔ صدارت پر رکھ دیا۔ جس کا سامعین نے قہقہوں سے استقبال کیا۔

ملتان کا ذکر ہے مدرسہ قاسم العلوم کا سالانہ جلسہ تھا۔ جمعہ کا دن تھا۔ حاضرین کی کثرت سے باغ لانگے خان جہاں یہ جلسہ منعقد ہو رہا تھا پٹا پڑا تھا۔ جلسے کے مقررین میں حضرت شاہ جی کا اسم گرامی بھی شامل تھا۔ جلسے کی کارروائی شروع ہو چکی تھی۔ اور تقاریر کا سلسلہ جاری تھا۔ لیکن شاہ جی ابھی تک تشریف نہ لائے تھے۔ اور لوگ بے چینی سے ان کا انتظار کر رہے تھے۔ خدا خدا کر کے شاہ جی کی صورت نظر پڑی اور لوگوں کی جان میں جان آئی۔ تھوڑی دیر میں شاہ جی مائیکروفون کے سامنے تشریف لائے۔ اور فرمانے لگے "ملتان والو! آج میں اپنی تقریر کا وقت ایک اور صاحب کو دے رہا ہوں جو ماشاء اللہ بہت ہی دلکش پیرائے میں تقریر فرمائیں گے" لوگوں نے یہ سنا تو چلانے لگے "نہیں شاہ جی آپ تقریر فرمائیں۔ ہم آپ کو سننا چاہتے ہیں" شاہ جی بڑے متین لہجے میں فرمانے لگے "اللہ کے بندو! اللہ کی سرزمین ابھی اس کے نیک بندوں سے خالی نہیں ہوئی عطاء

اللہ شاہ بخاری کے علاوہ بھی کچھ لوگ اس دنیا میں موجود ہیں۔ جنہیں خدائے بزرگ و برتر نے قوت گویائی سے مالا مال فرمایا ہے۔ "نہیں شاہ جی آپ! پھر کچھ لوگ چلائے "نہیں نہیں" شاہ جی کے لہجے میں اب قدرے تلخی تھی۔ "آیئے حافظ صاحب تشریف لایئے"

لوگوں کے دیکھتے ہی دیکھتے اسٹیج سے ایک نابینا بزرگ اٹھے اور مائیکرو فون کی جانب بڑھنے لگے۔ شاہ جی نے ان کا ہاتھ پکڑ کر انہیں مائیکرو فون کے سامنے کھڑا کر دیا۔ یہ بزرگ ڈیرہ غازی خان کے حافظ اللہ وسایا صاحب تھے۔ حافظ صاحب نے خطبہ مسنونہ کے بعد قرآن حکیم کا ایک رکوع اس فصاحت و بلاغت کے ساتھ تلاوت فرمایا کہ لوگ مسحور ہو گئے۔ واقعی شاہ جی نے درست فرمایا تھا۔ تلاوت کے بعد حافظ صاحب نے فضائل حدیث پر ملتانی زبان میں تقریر کا آغاز کیا۔ عجب مٹھاس، حلاوت اور شیرینی تھی انکی تقریر میں کہ مقامی مہاجر سبھی جھوم رہے تھے۔ مجھے اس روز محسوس ہوتا کہ لسانی تعصب کس قدر غیر ضروری اور بے معنی ساجذبہ ہے۔ کسی زبان کی اہمیت و عظمت کا اندازہ ہمیں اس وقت ہوا ہے جب ہم اس زبان کو کسی اہل زبان کی زبانی سنتے ہیں۔ زبان کوئی بھی ہو از خود بری نہیں بلکہ ہماری عصبیت اور کوتاہ نظری اسے ہمارے دل و دماغ کے سامنے بری شکل میں پیش کر دیتی ہے۔

۱۹۵۷ء کی ابتداء میں ملتان ہی کے ایک جلسے میں شاہ جی اپنی تقریر میں اس جنگ اقتدار پر تبصرہ فرما رہے تھے جو پاکستان میں وزیر اعظم خان لیاقت علی خان کی شہادت کے بعد لڑی جا رہی تھی۔ جب چندریگر مرحوم کا ذکر آیا تو انہوں نے ایک چھوٹا سا فقرہ کہا جسے سن کر لوگ پھڑک اٹھے۔ فرمایا "ایک چلہ وہ بھی کاٹ گئے" یہاں یہ حقیقت ذہن میں رہے کہ چندریگر صاحب کی وزارت عظمیٰ کی عمر قریب قریب چالیس دن ہی تھی۔

حضرت شاہ جی کا ایک یادگار واقعہ مجھے مولانا حکیم محمد عبداللہ صاحب مرحوم مالک دوا خانہ سلیمانی جہانیاں نے بھی سنایا تھا۔ حکیم صاحب نے فرمایا کہ پاکستان کے قیام کو ابھی چند ماہ گزرے تھے کہ ان دنوں واہگہ کی سرحد پر دونوں ملکوں کے شہریوں میں تبادلے کا سلسلہ چل رہا تھا۔ اور سکھ تاجر من جملہ اور اشیاء کے نادر و نایاب اسلامی کتابیں کوڑیوں کے مول فروخت کر جاتے تھے۔ یہ گرانمایہ کتابیں مشرقی پنجاب کے اسلامی کتب خانوں کی متاع بے بہا تھیں۔ مشرقی پنجاب کے خونیں ہنگاموں میں ہزارہا کتابیں نذر آتش کر دی گئیں۔ کتنی ہی کتابوں کو دریا برد کر دیا گیا۔ قرآن کریم اور احادیث رسول ﷺ کے اوراق بازاروں میں روندے گئے۔ بہر حال جو کتابیں محفوظ رہ گئیں وہ اس طرح فروخت کی جا رہی تھی۔ ان بیچنے والوں کو کیا معلوم کہ یہ کس کان کے جواہر یکتا ہیں۔ اور ان کے خریدنے اور جمع کرنے والوں نے خدا جانے کس کس طرح خریدا اور جمع کیا تھا۔ انہی ایام میں ایک صاحب نے میرے لئے دو کتابیں خریدیں جن میں سے ایک مولانا اشرف علی تھانوی کی مشہور تفسیر "بیان القرآن" تھی۔ جس کی بارہ جلدیں یکجا مجلد تھیں۔ اس کتاب کو صرف پانچ روپے میں خرید اگیا تھا حالانکہ اس زمانے میں یہ بالکل نایاب تھی۔ اور سو سوا سو روپے سے کم نہیں ملتی تھی۔

دوسری کتاب "مفردات امام راغب" تھی۔ اس کتاب کا شمار بھی نہایت کمیاب کتابوں میں ہوتا تھا۔ اور یہ صرف دو روپے کے عوض حاصل کی گئی تھی۔ اس کتاب کے سرورق پر یہ الفاظ لکھے ہوئے تھے۔ "پیش کش من جانب محمد گل شیر بخدمت گرامی مولانا سید عطاء اللہ شاہ بخاری" اس کا مطلب یہ ہوا کہ اس کتاب کو مولانا محمد گل شیر شہید نے حضرت شاہ جی کی خدمت میں بطور ہدیہ پیش کیا تھا۔ اور جب فسادات امرتسر میں دوسرے کتب خانوں کے ساتھ ساتھ شاہ جی کا کتب خانہ بھی لٹا تو کتابیں بکھر بکھر کر فروخت ہونے کے لئے واہگہ کی سرحد پر آ گئیں۔ مجھے جب اس کتاب کا تعلق شاہ جی کی ذات گرامی سے معلوم ہوا تو میں بے چین ہو گیا اور اگلی مرتبہ جب لاہور جانا ہوا تو اسے اپنے ساتھ لیتا گیا۔ تاکہ اسے شاہ جی کے حوالے کر دوں۔ میں اس مقصد کے لئے سب سے پہلے مجلس احرار کے دفتر پہنچا جہاں ان دنوں شاہ جی تشریف فرما تھے۔ چونکہ شاہ جی اس وقت کہیں باہر تشریف لے گئے تھے۔ اس لئے ان سے ملاقات نہ ہو سکی۔ تاہم کتاب کو میں نے دفتر کے ایک صاحب کے سپرد کر دیا اور تاکید کی کہ اسے شاہ جی کی خدمت میں میری جانب سے پیش کر دیا جائے۔ شاہ جی کو جب کتاب ملی تو سنا ہے کہ شدت غم سے ان کی آنکھوں میں آنسو چھلک اٹھے۔ ملاقات ہوئی تو بڑی ممنونیت کا اظہار فرمایا اور پھر اس واقعے کا ذکر مختلف محفلوں اور متعدد تقریروں میں بطور خاص کیا۔

اس واقعے کا تحیر کن اور ناقابل فراموش پہلو یہ ہے کہ پہلی کتاب یعنی تفسیر بیان القرآن بھی حضرت شاہ صاحب ہی کی ملکیت تھی۔ یہ تفسیر آج بھی ہمارے کتب خانے میں موجود ہے۔ اور اس کے مختلف مقامات دیکھنے کا مجھے متعدد بار موقع ملا لیکن اس حقیقت کا پتہ مجھے شاہ جی کی حیات میں نہ چلا بلکہ ان کی وفات کے کچھ عرصے بعد یہ بات معلوم ہوئی اور وہ یوں کہ جس مقام پر بیان القرآن کی چوتھی جلد ختم ہوتی ہے وہاں ایک گوشے میں شاہ جی نے اپنے دست مبارک سے

"احقر عباداللہ السید شرف الدین احمد المعروف بہ سید عطاء اللہ البخاری العظیم آبادی غفرلہ الباری"

تحریر فرمایا ہوا تھا۔ مجھے شاہ جی کے یہ الفاظ دیکھ کر نہایت افسوس ہوا لیکن میں کیا کر سکتا تھا۔ شاید اللہ تعالیٰ کو یہی منظور تھا کہ ان کی یہ علمی نشانی میرے پاس ہی رہے۔

حضرت شاہ جی حقیقی معنوں میں درویش تھے۔ ان کے فقر و غنا کا یہ عالم تھا کہ جب وہ امرتسر میں دو مکان چھوڑ کر آئے تھے لیکن انہوں نے اس جائیداد کا کوئی کلیم کسی عدالت میں پیش نہیں کیا۔ کہ جب اس جائیداد کے بدلے یہاں جائیداد مل گئی تو ہجرت کا ثواب ہی جاتا رہے گا۔ شاہ جی کا یہی کردار ایک دوسرے واقعے سے بھی اجاگر ہو جاتا ہے۔

دیر کی بات ہے۔ شاہ جی ان دنوں بہاول پور میں تشریف فرما تھے۔ نواب صاحب بہاول پور کو معلوم ہوا تو انہوں نے اپنے پرائیویٹ سیکرٹری کو ڈیرہ نواب صاحب سے شاہ جی کی خدمت میں بھیجا اور ملاقات کی درخواست کی۔ سیکرٹری صاحب نواب صاحب کا پیغام لے کر شاہ جی کے پاس پہنچے شاہ جی نے سنا تو فرمایا کہ

فقیر بادشاہوں کے دربار میں نہیں جایا کرتے۔ پھر ہنسے اور فرمانے لگے کہ اب تو میں ویسے بھی ان کی ریاست میں بحیثیت مہمان مقیم ہوں۔ اب یہ معزز میزبان کا کام ہے کہ وہ میزبان کی عزت و توقیر میں پیش قدمی فرمائیں۔ چنانچہ سیکرٹری صاحب واپس چلے گئے۔ اگلے دن نواب صاحب بہاول پور بہ نفس نفیس شاہ جی سے ملنے آئے اور دس ہزار روپے بطور نذرانہ پیش کیا۔ شاہ جی نے اس خطیر رقم کو قبول کرنے سے معذوری کا اظہار فرمایا اور کہا کہ "فقیر کو اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے صبح و شام دو روٹیاں مل جاتی ہیں۔ بس اس سے زیادہ کی خواہش نہیں۔ نواب صاحب نے اصرار کیا تو ان کی تالیف قلب کے لئے دس ہزار روپوں میں سے صرف دس روپے اٹھا لئے۔

ایسا جاں باز مسلمان کہاں ڈھونڈیں گے؟

ایسا غم خوار مسلمان کہاں ڈھونڈیں گے ۔۔۔ کھو گیا واقفِ قرآن کہاں ڈھونڈیں گے

"بے خطر آتش نمرود میں" جو "کود پڑے" ۔۔۔ ایسا ملت کا نگہبان کہاں ڈھونڈیں گے

فیصلے دل کے نگاہوں سے کئے ہوں جس نے ۔۔۔ ایسا درویش مسلمان کہاں ڈھونڈیں گے

جس کی للکار سے لرزاں تھے سگانِ باطل ۔۔۔ ختم مرسل کا وہ دربان کہاں ڈھونڈیں گے

کل ہمیں سنت یوسف کی ضرورت ہو گی ۔۔۔ ہائے وہ واقف زندان کہاں ڈھونڈیں گے

جذبۂ موت بھی ہے دار و رسن بھی لیکن ۔۔۔ جان منصور کی پہچان کہاں ڈھونڈیں گے

سطوت شاہ سے مرعوب نہ ہونے والا ۔۔۔ کتنا بے باک تھا انسان کہاں ڈھونڈیں گے

پاسباں ملک کا اور شریعت کا امیر
ایسا جانباز مسلمان کہاں ڈھونڈیں گے

جانباز مرزا مرحوم

محمد اسحق بھٹی

شاہ جی!

اپنی طرز و اداء کے واحد انسان

فیروز پور مشرقی پنجاب کا ایک مشہور شہر ہے۔ لاہور میں اس کے نام پر ایک بڑی شاہراہ ہے جو فیروز پور روڈ کہلاتی ہے اور سیدھی فیروز پور جاتی ہے۔ لاہور سے بجانب مشرق یہ شہر پچاس میل کی اور قصور سے پندرہ میل کی مسافت پر دریائے ستلج کے ہیڈ حسینی والا سے چار میل آگے ہے۔ اس شہر کی بنیاد فیروز شاہ سوم کے عہدِ حکومت میں رکھی گئی تھی۔

آزادی سے قبل اس شہر میں کئی سیاسی اور مذہبی جماعتیں قائم تھیں جو اپنی صوابدید کے مطابق خدمات سرانجام دے رہی تھیں، ان میں سے ایک مجلس احرار اسلام تھی۔ فیروز پور شہر اور ضلع میں مجلس احرار سے باقاعدہ تعلق رکنیت رکھنے والے حضرات اگرچہ تعداد میں کم تھے مگر اپنی اپنی جگہ خاص اثر و رسوخ کے مالک اور معاشرتی اعتبار سے باوقار رتبے کے حامل تھے۔ شہر کی مجلس احرار میں مولانا عبید اللہ احرار، خان عبدالعظیم خان، شیخ غلام حیدر ایڈووکیٹ، حکیم احمد علی، مہر محمد علی اور حاجی نظام الدین کے نام خصوصیت سے قابل ذکر ہیں۔ مجلس احرار سے میرا کبھی سیاسی تعلق نہیں رہا لیکن ان سب حضرات سے مراسم تھے۔ پاکستان آنے کے بعد یہ مختلف مقامات میں بکھر گئے۔ عبدالعظیم خاں خانیوال میں، حاجی نظام الدین گوجرانوالہ میں، شیخ غلام حیدر ایڈووکیٹ لاہور میں، حکیم احمد علی کھڈیاں خاص (ضلع قصور) میں اور مولانا عبید اللہ احرار (جو بعد میں پاکستان کی مجلس احرار کے صدرِ منتخب کیے گئے) فیصل آباد میں آباد ہو گئے تھے۔ اب یہ تمام بزرگ اللہ کو پیارے ہو چکے ہیں، فقط ان کی یاد باقی رہ گئی ہے جو روح کو تڑپاتی اور دل کو غمگسار کرتی ہے۔

جب تک یہ زندہ رہے، ان سے ملاقات کا سلسلہ جاری رہا۔ بعض کے جنازوں میں بھی بچشم اشکبار شرکت کی اور اس وقت ان کی یادوں نے قلب و ذہن کو شدید جھٹکے دیے ان میں سے بعض کے بیٹوں سے سلسلۂ روابط قائم ہے، جب کسی سے کہیں ملاقات کا موقع ملتا ہے، بہت احترام سے پیش آتے ہیں اور بات شروع ہو جائے تو حافظے کی تہوں میں دبے ہوئے بے تحاشا واقعات اُچھل اُچھل کر نظر و بصر کے زاویوں میں آجاتے ہیں اور پھر زبان انکے اظہار و بیان کے لیے بیقرار ہو جاتی ہے۔

وہ ہم نشین اور یارانِ محفل بے شک اس دنیا سے رخت سفر باندھ گئے ہیں اور ہمیشہ کے لیے نگاہوں سے اوجھل ہو گئے ہیں، مگر دل کی دنیا میں بدستور آباد ہیں فیضی کا یہ شعر اس صورت حال کی پوری عکاسی کرتا ہے۔

ای ہم نفسان محفل ما اے
رفتید، و لے نہ از دلِ ما

کتنی ہی ایسی ہستیاں اس جہانِ ہست و بود سے یکے بعد دیگرے کوچ کر گئیں جن سے شب و روز کا تعلق

تھا اور ان کی زندگی میں کبھی جدائی کا احساس تک نہیں ہوا تھا خیال یہی تھا کہ ہمیشہ اسی طرح رہیں گے اور ہنسی خوشی سے وقت گزرتا رہے گا۔ اب وہ لوگ سفر آخرت پر روانہ ہوگئے ہیں تو آنکھیں کھلی ہیں۔ بعض اوقات تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اس بھری پڑی اور ہنستی بستی دنیا میں تنہا رہ گیا ہوں اور زندگی کا لطف ختم ہوگیا ہے۔

زرفتن تو من از عمر بے نصیب شوم
سفر تو کردی و من در وطن غریب شوم

فیروز پور کی مجلس احرار کے یہ چند افراد اس شہر کی جان تھے اور وہاں کی سیاسی اور سماجی رونقیں ان کے دم قدم سے پورے جوبن پر تھیں۔

شہر سے چودہ میل کے فاصلے پر سوئے مغرب ایک گاؤں، جو تحصیل فیروز پور میں واقع تھا، "لکھو کے" کے نام سے موسوم تھا۔ اس گاؤں میں کئی پشتوں سے علم کا دریا رواں تھا اور درس و تدریس کے سلسلے جاری تھے۔ اس میں ایک بزرگ مولانا محمد علی لکھوی فروکش تھے جو حضرت حافظ محمد لکھوی (صاحب تصانیف کثیرہ) کے پوتے اور مولانا محی الدین عبدالرحمن لکھوی کے فرزند ارجمند تھے۔ مجاہدانہ فطرت کے مالک اور انگریزی حکومت کے شدید مخالف تھے۔ سرحد پار کی جماعت مجاہدین سے انکے قریبی مراسم تھے۔ کئی مرتبہ خود بھی مرکز مجاہدین میں گئے، جہاد کے لیے بھی بہت سے لوگوں کو وہاں بھیجا، مجاہدین کی مالی امداد بھی کرتے رہے۔ وہ مولانا محی الدین لکھوی اور مرکزی جمعیت اہل حدیث کے امیر مولانا معین الدین لکھوی کے والد گرامی قدر تھے لیکن علم و ادراک کی وسیع وادیوں میں جو رسائی انہیں حاصل تھی وہ انکے لائق احترام صاحبزادوں کے حصے میں نہ آئی

مولانا محمد علی لکھوی جلیل القدر عالم اور ایک فعال متحرک شخصیت تھے۔ انہوں نے ہندوستان کی انگریزی حکومت کی مخالفت کے لیے ۱۹۲۲ء کے پس و پیش اپنی زرعی زمین میں ایک باقاعدہ تربیت گاہ قائم کی تھی جس میں تعلیم کا انتظام بھی تھا اور جہاد کی مشق و تمرین کا سلسلہ بھی جاری تھا۔ اس کا نام انہوں نے "دارالسلام" رکھا تھا یہ تربیت گاہ نہر سے دوسری طرف انکے گاؤں کے قریب تھی۔ بعد ازاں ۱۹۲۶ء کے لگ بھگ یہی کام لکھو کے سے ڈھائی میل کے فاصلے پر شروع کیا گیا۔ اس کے لیے دو مربعے زمین وقف کی گئی تھی اور اسے "مرکز الاسلام" کے نام سے موسوم کیا گیا تھا۔ مولانا محمد علی کا مجلس احرار سے باقاعدہ تعلق رکنیت تو نہ تھا، البتہ اس کے جلسوں میں شریک ہوتے اور اس کے اکابر و عمائد سے گہرے روابط رکھتے تھے۔ اصل بات یہ ہے کہ وہ ہر اس جماعت کے ساتھ ہوجاتے تھے جو برصغیر کو انگریزوں کی غلامی سے نجات دلانے کا اعلان کرتی تھی۔ انکا بہت بڑا حلقہ ارادت اور دائرہ متاثرین تھا۔

انہیں اس غلام ملک میں رہنا پسند نہ آیا تو ۱۹۳۰ء میں ہجرت کر کے مدینہ منورہ چلے گئے اور مسجد نبوی میں درس و تدریس میں مشغول ہوگئے تھے۔ پانچ چھے سال بعد ۱۹۳۶ء میں وطن واپس آئے۔ دو سال یہاں رہے، ۱۹۳۸ء میں پھر مدینہ منورہ تشریف لے گئے۔ اس سے نو سال بعد نومبر ۱۹۴۷ء میں اوکاڑہ آئے، جہاں قیام پاکستان کے زمانے میں ان کے اہل و عیال اور اعزہ و اقارب قیام پذیر ہوگئے تھے۔ اس عالم اجل نے

اکتوبر ۱۹۴۷ء کو وفات پائی اور مدینہ منورہ میں مدفون ہوئے۔

۱۹۳۸ء میں مولانا کے مدینہ طیبہ جانے کے بعد مرکز الاسلام کی درسگاہ اور تربیت گاہ کی انتظامی ذمے داریاں ان کے صاحبزادوں مولانا محی الدین لکھوی اور مولانا معین الدین لکھوی نے سنبھال لی تھیں۔ اب وہاں مجاہدین کی تیاری و تربیت کا سلسلہ تو ختم ہو گیا تھا، البتہ مدرسہ باقاعدہ قائم رہا، جس میں قدیم علوم کی تعلیم بھی دی جاتی تھی اور جدید علوم سے بھی طلبہ کو بہرہ مند کیا جاتا تھا۔ میں وہاں یکم جنوری ۱۹۳۷ء سے آخر سال تک طالب علم کی حیثیت سے۔ مارچ ۱۹۴۳ء سے جون ۱۹۴۷ء تک معلم کی حیثیت سے مقیم رہا۔

۱۹۳۷ء میں مولانا محمد علی لکھوی مرکزالاسلام میں تشریف فرما تھے۔ اس سال کی مئی کے پہلے ہفتے میں فیروز پور کی مجلس احرار کے تین رہنما۔ مولانا عبید اللہ احرار، خان عبدالعظیم خان اور حکیم احمد علی، مولانا محمد علی کی خدمت میں آئے اور کہا کہ اب سے پانچ مہینے بعد اکتوبر ۱۹۳۷ء میں ہم فیروز پور میں مجلس احرار کا جلسہ منعقد کرنا چاہتے ہیں، آپ سے درخواست ہے کہ اس میں ہماری رہنمائی فرمائیں اور ضلع فیروز پور کے قصبات و دیہات میں جلسے کی تشہیر کا اہتمام کریں۔

مولانا نے ان کی بات سنی اور درخواست منظور فرمائی۔ ان کے بڑے صاحبزادے مولانا محی الدین لکھوی پنجابی کے اچھے شاعر ہیں، انہیں جلسے کی تشہیر کے لیے دو تین پنجابی نظمیں لکھنے کا حکم دیا اور طلبہ کی دو ٹولیاں بنا دی گئیں ایک کا قائد محی الدین کو اور ایک کا معین الدین کو مقرر کیا گیا۔ سب کے لیے لال رنگ کی ایک ایک قمیض سلائی گئی۔

مئی کا مہینہ، سخت گرمی کا موسم، ہم نے لال رنگ کی قمیضیں پہنیں اور احرار کے جلسے کی تشہیر کے لیے چل کھڑے ہوئے۔ گاؤں گاؤں پیدل جاتے، اچھی سی آواز والا کوئی لڑکا نظم کا ایک شعر پڑھتا اور پھر سب لڑکے اس کے پیچھے پیچھے اس شعر کو دہراتے۔ اس طرح ہم ہر گاؤں کی گلی گلی گھومتے، عورتیں گھر کے دروازے میں کھڑی ہو کر اور مرد باہر نکل کر ہمیں دیکھتے اور بچے ہمارے ساتھ چل پڑتے۔ جس گاؤں میں دوپہر ہو جاتی، وہاں کی مسجد میں چلے جاتے، لوگ گھروں سے روٹیاں لا کر ہمیں کھلاتے اور لسی پانی پلاتے، ظہر کی نماز کے بعد اگلے گاؤں کا قصد کر لیا جاتا، جس گاؤں میں رات پڑتی، وہاں کی مسجد میں ڈیرے ڈال دیتے۔ روٹی پانی کا انتظام اس گاؤں کے لوگ کرتے، عشاء کے بعد مجمع اکٹھا ہو جاتا تو پہلے پنجابی نظم پڑھی جاتی، پھر ہمارا قائد تقریر کرتا صبح کو لسی پانی کے بعد پھر سلسلہ سفر شروع ہو جاتا۔

نظموں اور تقریروں میں انگریزی حکومت کے مظالم بیان کیے جاتے، انگریز دشمنی کی پاداش میں مجلس احرار سے تعلق رکھنے والوں کو جن اذیتوں میں مبتلا کیا گیا یا مبتلا کیا جا رہا تھا، انکی وضاحت کی جاتی۔ اس طرح کچھ عرصہ ہم نے مجلس احرار اور اس کے قائدین و زعما کے فضائل و مناقب کی تفصیلات بیان کرنے میں صرف کیا اور اپنی ہمت کے مطابق لوگوں کو اس کے جلسے میں زیادہ سے زیادہ تعداد میں شریک ہونے کی تلقین کی۔

مولانا محی الدین اور معین الدین پنجاب کے مشہور علمی اور روحانی خاندان کے فرزند اور بڑے باپ کے

بیٹے تھے، جن کا خاندانی اور ذاتی اعتبار سے اس علاقے میں بہت اثر تھا، اس لیے وہ جس گاؤں میں جاتے، لوگ عزت و احترام سے پیش آتے، ساتھ ہمارا بھی داؤ لگ جاتا اور ہمیں بھی "مستحق تکریم" گردانا جاتا۔ یعنی ان کے طفیل، ہم طفیلی موج میں رہتے۔ یہاں طفیل اور طفیلی کو انہی معنوں میں لیا جائے، جن میں یہ استعمال ہوئے ہیں۔ طفیلی کو طفیل کی مؤنث اور طفیل کو طفیلی کا مذکر نہ سمجھا جائے۔

اس وقت میری عمر بارہ تیرہ سال کی تھی۔ اب اس عمر میں وہ حالات یاد آتے ہیں تو خیال کرتا ہوں کہ ہمیں اپنے مقصد میں بہت کامیابی ہوئی تھی۔ ہم جہاں جاتے لوگ ہم سے تعاون کرتے اور غور سے ہماری بات سنتے اور متاثر ہوتے، جلسے میں شرکت کا یقین دلاتے۔

پندرہ بیس روز کے بعد ہم مرکز الاسلام واپس آئے اور اپنی کار کردگی کی رپورٹ مولانا محمد علی لکھوی کو پیش کی تو وہ نہایت خوش ہوئے اور ہماری حوصلہ افزائی کی۔ وہ زندہ دل اور خوش مزاج عالم دین تھے۔ ہر لڑکے سے الگ الگ اس کی کار کردگی کے بارے میں پوچھا اور اپنے خاص انداز سے اس کو شاباش دی۔

پیدا کہاں ہیں ایسے پراگندہ طبع لوگ
افسوس تم کو میر سے صحبت نہیں رہی

اکتوبر ۱۹۳ء کو جلسے سے ایک دن پہلے مولانا محمد علی لکھوی کی قیادت میں احرار رضاکاروں کی طرح سرخ قمیصنیں پہنے ایک بڑے جلوس کی شکل میں ہم فیروز پور پہنچے اور نعرے لگاتے ہوئے جلسے کے میدان میں داخل ہوئے۔ مولانا محمد علی اسی لباس میں تھے جو وہ ہمیشہ پہنتے تھے، یعنی سفید کھدر کی قمیض، کھدر کا سفید عمامہ اور کھدر کا تہبند ہر ضلع کے لیے الگ الگ کیمپ لگائے گئے تھے، ہمارا بھی ایک کیمپ تھا۔

احرار رضاکار سرخ قمیض کے ساتھ ایک صاف ستھری چمکتی دمکتی کلہاڑی ہاتھ میں رکھتے تھے، لیکن ہمارے پاس کلہاڑیاں نہیں تھیں۔ مجلس احرار کے بعض اکابر بھی سرخ قمیض پہنتے اور ہاتھ میں کلہاڑی رکھتے تھے۔

عشاء کی نماز کے بعد جلسہ شروع ہونے کا پروگرام بنایا گیا تھا۔ اسی دن جلسے کے میدان میں نماز عصر کے بعد مجھے پہلی مرتبہ حضرت سید عطاء اللہ شاہ بخاری کی زیارت کا شرف حاصل ہوا۔ کسی نے آواز دی، وہ دیکھو شاہ جی گھوم رہے ہیں، میں دوڑ کر گیا اور انتہائی شوق اور مسرت کے ساتھ شاہ جی کو دیکھا۔ پورا قد، گٹھا ہوا جسم، سرخ و سفید رنگ، موٹی موٹی چمکدار آنکھیں، سیاہ اور سفید بالوں پر مشتمل داڑھی جو نہایت خوبصورتی سے چہرے پر پھیلی ہوئی تھی۔ کھدر کی سرخ رنگ کی قمیض، سر پر قدرے اونچی دیوار کی قراقلی ٹوپی جس سے ان کے پٹے باہر جھانک رہے تھے، پاؤں میں پشاوری چپل۔ ہاتھ میں کلہاڑی، جس کا دستہ انکی کمر کے برابر تھا اور خاکی رنگ کی ٹخنوں سے ذرا اونچی شلوار! وہ چل پھر کر جلسہ گاہ کا جائزہ لے رہے تھے مولانا محمد علی لکھوی بھی ادھر آ نکلے۔ وہ مصافحے کے لیے شاہ جی کی طرف بڑھے شاہ جی بھی تیزی سے ان کی جانب آئے اور دونوں بزرگ بغلگیر ہو گئے۔ پھر گرمجوشی سے دونوں ہاتھوں سے مصافحہ کیا اور ایک دوسرے سے خیر خیریت

پوچھی۔ اس موقع پر مولانا مظہر علی اظہر، قاضی احسان احمد شجاع آبادی، شیخ حسام الدین اور چند اور لوگ ان کے ساتھ تھے۔ وہ بھی احترام اور تپاک سے مولانا لکھوی سے ملے۔ اسکے بعد یہ حضرات بعض مقامی اصحاب کی رفاقت میں پنڈال میں داخل ہوگئے اور گھوم پھر کر انتظامات کا جائزہ لینے لگے۔

یہ اولین موقع تھا کہ میں شاہ جی کے دیدار سے بہرہ مند ہوا۔ وہ سر سے پاؤں تک مردانہ حسن کے اوصاف سے متصف تھے اور اپنے اندر بڑی کشش رکھتے تھے۔ نظیری کا یہ شعر ان پر حرف بحرف صادق آتا ہے۔

زفرقِ تابقدم ہر کُجا کہ می نگرم
کرشمہ دامنِ دل می کشد کہ جا اینجاست

آج جبکہ یہ سطور لکھی جارہی ہیں، اس واقعہ پر باون برس کا طویل عرصہ بیت چکا ہے، مگر وہ منظر اب بھی آنکھوں کے سامنے ہے اور لیل و نہار کی بہت سی خوش گوار اور ناخوشگوار کروٹوں کے باوجود حافظے نے ان کے اس وقت کے حلیے اور ہیئت کذائی کا کوئی گوشہ فراموش نہیں کیا۔ ہر چیز کو نہایت احتیاط سے محفوظ کر رکھا ہے۔

بہرِ تسکیں دل نے رکھ لی ہے غنیمت جان کر
وہ جو وقتِ نازکی جُنبش ترے ابرو میں تھی

مجلس احرار کے فیروز پور کے اس جلسے میں ہزاروں افراد کا مجمع تھا۔ شہر اور ضلع کے قصبات و دیہات سے کثیر تعداد میں لوگ احرار مقرروں کی تقریریں سننے آئے تھے۔ شہر سے جانب مغرب چار میل کے فاصلے پر دریائے ستلج کا حسینی والا ہیڈ عبور کرتے ہی لاہور کا ضلع شروع ہو جاتا تھا جو اب ضلع قصور کہلاتا ہے، اس نواح کے بہت سے لوگ شریک جلسہ ہوئے تھے اور وسیع پنڈال میں ہر طرف انسانوں کے سر ہی سر دکھائی دیتے تھے۔

بڑے چھوٹے تمام احراری شاہ جی کی زندگی میں بھی "شاہ جی" کہتے تھے، اب بھی شاہ جی کہتے ہیں نہ کوئی شاہ صاحب "کہتا تھا اور نہ فرطِ احترام سے ان کا نام لیتا تھا۔ جب کوئی احراری "شاہ جی" کہے تو سمجھ لیجئے، اس سے سید عطاء اللہ شاہ بخاری مراد ہیں۔

یہاں یہ یاد رہے کہ میرے مسلک کی رو سے "تقلید" جائز نہیں، لیکن میں اس سلسلے میں "مقلد" ہوں عجیب بات یہ ہے کہ مقلد کسی امام فقہ کا نہیں، احراریوں کا۔! جن کے نقطۂ نظر سے مجھے کبھی اتفاق نہیں ہوا۔ مگر شاہ جی کا ذکر کرنے لگا ہوں تو مجبور ہوں کہ ان کی "تقلید کا قلادہ" اگر اپنے فکر و خیال کے دامن سے وابستہ نہیں کر سکتا اور اپنی گردن میں نہیں ڈال سکتا تو قلم کی "گردن" میں ضرور ڈال دوں چنانچہ ان کی تقلید کرتے ہوئے میں نے ہر جگہ سید عطاء اللہ شاہ بخاری یا شاہ صاحب کے بجائے شاہ جی لکھا ہے۔

عشاء کی نماز سے کم و بیش ڈیڑھ گھنٹے بعد ایک اچھے خاصے مجمع کے ساتھ شاہ جی جلسہ گاہ میں داخل ہوئے۔ امیر شریعت زندہ باد، مجلس احرار زندہ باد اور نعرہ تکبیر سے فضا گونجنے لگی۔ سٹیج پر بیٹھے ہوئے تمام

اکابر ایکدم کھڑے ہوگئے۔ سٹیج اتنا اونچا تھا کہ پانچ چھ سیڑھیاں چڑھ کر اس کے اوپر جانا پڑتا تھا۔ شاہ جی نے سٹیج پر کھڑے ہو کر چاروں طرف نگاہ ڈالی اور پھر ایک کرسی پر جو خاص طور پر ان کے لیے رکھی گئی تھی، تشریف فرما ہوئے۔

سیرے خیال میں رات کے گیارہ بجے کے لگ بھگ وہ تقریر کے لیے مائک پر آئے اور پھر نعرے بلند ہونے لگے۔ ہاتھ کے اشارے سے انہوں نے نعروں کا سلسلہ بند کرایا اور ایک انداز خاص سے دائیں بائیں دیکھ کر مائک کو ذرا اپنے قریب کیا اور خطبۂ مسنونہ کے الفاظ سامعین کے پردہ سماع سے ٹکرانے لگے۔ نہایت دل کش اور رسیلی آواز خطبے کے مضمون سے جب آواز کا زیرو بم ہم آہنگ ہوتا تھا تو لوگ جھوم جھوم جاتے تھے۔ پھر جب درود شریف پڑھنا شروع کیا اور

اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰى مُحَمَّدٍ وَعَلٰى اٰلِ مُحَمَّدٍ

کے الفاظ ان کی زبان سے اداء ہوئے تو اس میں کچھ اور ہی لطف پنہاں تھا۔ اس وقت عقیدت و انکسار کے تمام لوازم انکی ذات اور زبان میں جمع ہوگئے تھے۔ اس کے بعد جب آیات قرآن کی تلاوت کا آغاز ہوا تو ساکت و صامت فضا میں ایسا معلوم ہوتا تھا کہ یہ آیات براہ راست آسمان سے نازل ہو رہی ہیں سبحان اللہ! ان اوصاف کا حامل شخص اب کہاں پیدا ہوگا۔

انکی تقریر متعدد مسائل پر مشتمل تھی۔ وہ انگریزی حکومت کے خلاف خوب برسے، مرزائیت کی تردید میں ان کا اپنا ایک اسلوب تھا جس کا نہایت مؤثر طریقے سے اظہار کیا، مسئلۂ توحید کی وضاحت کی، اقسام شرک کو موضوعِ بحث ٹھہرایا اور قرآن کی بہت سی آیات تلاوت کیں اور ان کا ترجمہ سنایا۔ اس زمانے میں مجلس احرار نے حکومت الٰہیہ کا نعرہ بلند کیا تھا شاہ جی نے اسے بھی منقح کیا۔ کئی گھنٹے تقریر جاری رہی۔ ادھر مؤذن نے فجر کی اذان شروع کی اور اللہ اکبر کہا، ادھر مقرر نے خاموشی اختیار کرلی اور تقریر ختم ہوگئی۔

اس سے تقریباً تیرہ مہینے بعد ۱۹۳۸ء کے آخر میں دلی میں شاہ جی کی تقریر سننے کا شرف حاصل ہوا۔ جن حضرات کو دلی جانے اور اس شہر کو دیکھنے کا موقع ملا ہے، اور وہاں کی جامع مسجد بھی دیکھی ہے، میں یہاں ان کو جلسے کا محل وقوع بتانے کی کوشش کروں گا۔

دلی کی جامع مسجد (جسے شاہ جہانی مسجد بھی کہا جاتا ہے) کے بڑے دروازے کے سامنے بہت بڑا میدان ہے، اسی میدان میں ہرے بھرے کا مزار ہے، یہیں سرمد کی قبر، مولانا شوکت علی کا مدفن اور مولانا ابوالکلام آزاد کی آخری آرام گاہ ہے۔ میدان کے اختتام پر لال قلعے کا دروازہ ہے اور یہ وہی قلعہ ہے جو مغل شہنشاہ شہاب الدین محمد شاہ جہان نے تعمیر کرایا تھا۔ قلعے کی فصیل کے ساتھ ایک خاصی چوڑی سڑک ہے جس پر بے شمار گاڑیاں چلتی ہیں جو لوگوں کو مختلف مقامات پر پہنچاتی ہیں۔

جامع مسجد کے جنوب میں اردو بازار ہے۔ میں دلی میں شاہ جی کے جس جلسے کا ذکر کرنا چاہتا ہوں، اس کا سٹیج اردو بازار کے قریب تھا اور بازار مقرر کی پشت کی جانب تھا۔ ان کے بائیں جانب جامع مسجد اور دائیں جانب لال قلعہ تھا۔ ان کے سامنے وسیع میدان میں لوگوں کا بہت بڑا مجمع تھا۔ یہ جلسہ جمیعت علمائے ہند کے

زیر اہتمام منعقد ہوا تھا۔ شاہ جی کی تقریر عشاء کی نماز کے بعد شروع ہوئی تھی۔ تقریر میں سیاسیات بھی تھیں اور مذہبیات بھی۔!

لوگ اس طرح خاموش اور ہمہ تن گوش بیٹھے تھے کہ

كَأَنَّ عَلىٰ رُؤُسِهِمُ الطيور

جیسے انکے سروں پر پرندے بیٹھے ہیں، جونہی سر ہلا، پرندے اڑے۔۔۔ شاہ جی کہہ رہے تھے، آزادی کا مطالبہ کرنا اور اپنے ملک کو ظالم کے پنجے سے چھڑانے کے لیے عمل و حرکت کے میدان میں اترنا مسلمان کا مذہبی فریضہ ہے۔ مطالبۂ آزادی کے مقابلے میں یہ پکڑ دھکڑ، یہ قید و بند یہ سزائیں، یہ پھانسیاں میرے نزدیک کوئی اہمیت نہیں رکھتیں مجھے آزادی سب چیزوں سے عزیز ہے دلی والو۔! جس صورت میں آزادی ملے اور جن مشکلات سے گزر کر ملے، اسے حاصل کرنے کی جدوجہد کرنا میری زندگی کا نصب العین ہے۔۔۔ اس کے بعد جب انہوں نے دونوں ہاتھ ملا کر اور ہتھیلیاں اس انداز سے حاضرین کی طرف بڑھا کر جیسے پانی سے گزرنے کا راستہ بنا رہے ہوں، پنجابی کا یہ شعر پڑھا۔

جے ہیر سمندروں پار ہووے
ٹکاں نال سمندر نوں چھٹ سٹاں

تو مجمع کے سکوت کا بند ٹوٹ گیا۔ بیٹھے ہوئے لوگ داد و تحسین کے انداز میں اچھلنے لگے، جبّہ و دستار میں ملبوس علمائے کرام تڑپ اٹھے، واہ واہ کی صدائیں بلند ہونے لگیں اور "امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاری زندہ باد" کے نعرے پنڈال میں لہرانے لگے۔

ظاہر ہے دلی کے سامعین میں سے بہت کم لوگوں نے پنجابی کے اس شعر کے معنی سمجھے ہوں گے مگر شاہ جی نے جس اسلوب، جس ہیئت اور جس جذبے سے شعر پڑھا اور جس طرح دونوں ہاتھوں کو باہم ملا کر اسے عملی شکل میں ڈھالا۔ اس نے شعر کے ایک ایک لفظ کے مطلب کو نکھار دیا تھا۔

سامعین کی زبانوں سے "واہ واہ" کا لفظ سن کر شاہ جی نے کہا، میں تقریر کرتا ہوں تو کہتے ہیں، واہ شاہ جی واہ۔! جیل میں بند کر دیا جاتا ہوں تو کہتے ہیں، آہ شاہ جی آہ۔! میں واہ اور آہ کے درمیان پھنسا ہوا ہوں۔

ستمبر ۱۹۳۹ء کو یورپ میں دوسری جنگ عظیم شروع ہوئی جو ستمبر ۱۹۴۵ء تک چھ سال جاری رہی۔ انگریز کی مخالفت کی پاداش میں ہندوستان کی سیاسی جماعتوں کے زعما و قائدین کو گرفتار کر کے حکومت نے ملک کے مختلف جیل خانوں اور قلعوں میں بند کر دیا تھا۔ لڑائی ختم ہونے کے بعد انہیں رہا کیا گیا تو برطانیہ کی توپ و تفنگ کی جنگ جیتنے والی حکمران جماعت کنزرویٹو پارٹی اپنے ملک میں ووٹ کی جنگ ہار چکی تھی اور اس کی جگہ لیبر پارٹی برسر اقتدار آ گئی تھی جس کے وزیر اعظم مسٹر اٹیلی تھے۔ انہوں نے مارچ ۱۹۴۶ء میں ہندوستان کی آزادی کے سلسلے میں ملک کے سیاسی رہنماؤں سے گفتگو کے لیے برطانوی کابینہ کا ایک سہ رکنی وفد ہندوستان بھیجا جو اے وی الیگزینڈر، سٹیفورڈ کرپس اور لارڈ پیتھک لارنس پر مشتمل تھا، اسے کیبنٹ مشن کہا جاتا تھا۔

یہاں اس سلسلے کی تفصیل میں جانا مقصود نہیں، اختصار کے ساتھ صرف یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ ملک کے سیاسی لیڈروں سے گفت و شنید کے بعد حکومت ہند نے ملک میں عام انتخابات کے انعقاد کا اعلان کر دیا تھا۔ میں اس وقت مرکز الاسلام (ضلع فیروز پور) میں خدمت تدریس انجام دیتا تھا اور عمر کی بیسویں منزل میں داخل ہو چکا تھا۔ ایک دن اخبار میں پڑھا کہ کل رات امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاری قصور تشریف لا رہے ہیں جہاں وہ جلسۂ عام میں تقریر کریں گے میں نے اور مولانا معین الدین لکھوی نے قصور جانے اور شاہ جی کی تقریر سننے کا پروگرام بنایا۔ یہ ۱۹۴۶ء کی بات ہے۔

ہم قصور پہنچے تو فیروز پور اور دیگر مقامات کے بہت سے لوگ مل گئے جو شاہ جی کی تقریر سننے آئے تھے (طویل عرصے کے بعد شاہ جی اس نواح میں تشریف لائے تھے۔ شب کو نو بجے کے بعد ان کی تقریر شروع ہوئی اور چار گھنٹے جاری رہی۔ شدید سردی کا موسم تھا اور ہم نے کمبل اوڑھ رکھے تھے۔ وہ ملک میں انتخابات کے ہنگاموں کے دن تھے اور مسلم لیگ کی طرف سے وہاں کے دیہاتی حلقے میں میاں افتخار الدین انتخاب لڑ رہے تھے جو کچھ عرصہ پہلے کانگریس چھوڑ کر مسلم لیگ میں شامل ہوئے تھے۔ شاہ جی نے انگریزی حکومت کی نہایت سخت لب و لہجے میں مخالفت کی اور عالم اسلام اور ہندوستان پر اس کے مظالم تفصیل سے بیان کیے مسلم لیگ کو بھی ہدف تنقید ٹھہرایا اور اس کے سیاسی نقطۂ نظر کا تجزیہ کیا۔ ایسے معلوم ہوتا تھا کہ دور تک پھیلا ہوا انسانوں کا یہ ہجوم شاہ جی کی مٹھی میں ہے اور ان کی پرجوش خطابت نے ان کو پوری طرح مسحور کر دیا ہے۔ انہوں نے بعض جماعتوں کے قائدین کی حکمت عملی کو بھی موضوع بحث بنایا اور اسلام سے متعلق ان کے قول و فعل کے تضادات کا جائزہ لیا۔ پھر اسلامی تعلیمات کی خصوصیات کا ذکر کیا۔

میں نے دیکھا کہ تقریر کے دوران شاہ جی ننگے سر تھے۔ نہ سر پہ ٹوپی تھی نہ کپڑا۔ ان کے سفید گھنگھریالے بال عجب بہار دکھا رہے تھے۔ سنا ہے شاہ جی نے اسوقت سے ٹوپی اتار دی تھی، جب انہیں پتا چلا تھا کہ جالندھر ریلوے اسٹیشن پر مولانا حسین احمد مدنی کی پگڑی اچھالی گئی ہے۔

یہ حادثہ اس وقت پیش آیا تھا جب مولانا حسین احمد مدنی صوبہ سرحد اور پنجاب کے دورے سے بذریعہ ٹرین دیوبند جا رہے تھے۔ ٹرین جالندھر اسٹیشن پر پہنچی تو چند مسلم لیگی نوجوان اپنے ایک ساتھی شمس الحق کی معیت میں وہاں آئے۔ مولانا کو برا بھلا کہا، ان کی پگڑی اتار لی، طمانچہ مارا اور گالیاں دیں۔ اس حادثے کے بعد شاہ جی پہلی مرتبہ امرتسر کے ایک جلسے میں ننگے سر آئے تھے۔ فرمایا، جب سے میری قوم نے حسین احمد کی پگڑی اتاری ہے، میں نے عہد کیا ہے، آئندہ سر پر ٹوپی نہیں رکھوں گا۔

شورش کاشمیری نے اس حادثے کے متعلق اپنی کتاب "بوئے گل، نالۂ دل، دودِ چراغ محفل" (مطبوعہ لاہور ۱۹۷۲ء) کے صفحہ ۲۷۶ کے حاشیے میں لکھا ہے:

"ہمارے ایک دوست ڈاکٹر اکرام الحق قریشی جالندھر میں لیگ کے پر جوش کارکن تھے حمید نظامی مرحوم کے کلاس فیلو رہے۔ ان کا بیان تھا کہ شمس الحق اپنے اس کارنامے کا کروفر لے کر مولانا عظامی کے ہاں

پہنچا- وہ ان دنوں مقامی لیگ کے نائب صدر تھے- مولانا عظامی واقعہ سن کر کانپنے لگے- بار بار پوچھتے واقعی تم نے یہی کیا ہے؟ کہنے لگے- میاں! جس نے حسین احمد کے ساتھ یہ کیا ہے اس کی تو نعش بھی نہیں ملے گی- سب کو معلوم ہے کہ شمس الحق پاکستان آ کر قتل ہو گیا، اسکی نعش تک نہ ملی، بلکہ معمہ ہی رہی- اس کا دوسرا ساتھی مہاجرت کے وقت دریائے بیاس میں ڈوب گیا"-

اس حادثے کی تفصیل بعض عینی شاہدوں کے حوالے سے پاکستان کے ممتاز و مشہور عالم اور خطاط جناب سید انور حسین صاحب (نفیس رقم) نے چارسدہ (پشاور) کے ایک ماہانہ رسالے "النصیحہ" کے مئی ۱۹۸۶ء کے شمارے میں تحریر فرمائی ہے جو نہایت دردناک اور دل ہلا دینے والی ہے- جن لوگوں نے جالندھر ریلوے اسٹیشن پر مولانا مدنی کی اہانت کا ارتکاب کیا تھا، بقول محترم مضمون نگار کے "اس مجمع کے سرغنہ شمس الحق عرف شمسی، فضل محمد اور فتح محمد تھے-" ان کا جو انجام ہوا اور جن اذیت ناک حالات سے وہ گزرے ان کے تمام پہلو بدرجہ غایت عبرت ناک ہیں- ان کو پڑھ کر کلیجہ منہ کو آتا ہے اور پتا چلتا ہے کہ اللہ کی گرفت بڑی شدید ہے جس سے محفوظ رہنے کی ہر وقت دعا کرنی چاہیے- سید انور حسین (نفیس رقم) کے اس مضمون کا عنوان ہے "شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد مدنی کے آخری سفر پنجاب کی روح فرسا روداد- عبرت انگیز نتائج- ثقہ راویوں کی زبانی"-

شاہ جی جیسا بے خوف مسلسل کئی کئی گھنٹے بولنے والا، اپنے نقطۂ فکر کے اظہار میں مخلص اور زور دار خطیب برصغیر نے پیدا نہیں کیا- وہ ایک خاص طرز و اداء کے واحد مقرر تھے جو اپنی تمام خوبیاں اپنے ساتھ ہی لے گئے- ان کی خطیبانہ اداؤں کو بعض لوگوں نے اپنانے کی کوشش کی لیکن کامیاب نہ ہو سکے-

یہ رتبۂ بلند ملا جس کو مل گیا
ہر مدعی کے واسطے دار و رسن کہاں

۱۹۴۶ء میں جب کیبنٹ مشن ہندوستان آیا تھا، شاہ جی دلی گئے اور ایک رات جامع مسجد کے سامنے والے میدان میں بہت بڑے اجتماع کو خطاب کیا- ان کی تقریر ہو رہی تھی کہ پنڈت جواہر لال نہرو، کیبنٹ مشن کے ایک رکن مسٹر سٹیفورڈ کرپس کو وہاں لے گئے کرپس چند منٹ جلسہ گاہ کے ایک کونے میں کھڑا انکی تقریر سنتا رہا- وہ کچھ سمجھ نہیں سکتا تھا، لیکن مقرر کی حرکات و سکنات اور جوش و جذبہ و حاضرین کی تاثر پذیری کا اندازہ کر کے اس نے جواہر لال نہرو سے کہا کہ جو ملک اس قسم کے سیاسی مقرر اور خطیب رکھتا ہو، وہ آخر کب تک غلام رہ سکتا ہے پھر اس نے کہا: یہ شخص شکل و صورت کے اعتبار سے "فادر" معلوم ہوتا ہے-

اگست ۱۹۴۷ء میں ملک آزاد ہو گیا اور پاکستان نقشۂ عالم پر ابھر آیا- ہم لوگ اپنے آبائی وطن کوٹ کپورہ (ریاست فرید کوٹ) کی سکونت ترک کر کے چک نمبر ۵۳ گ ب تحصیل جڑانوالہ ضلع لائل پور (حال فیصل آباد) آ گئے ٹھیک سے یاد نہیں رہا، اسی سال کے آخر یا ۱۹۴۸ء میں لائلپور میں مجلس احرار کا جلسہ ہوا- اس جلسے کا اہتمام مولانا عبیداللہ احرار نے (جو فیروز پور سے لائل پور جا بسے تھے) مولانا تاج محمود اور دیگر احرار

دوستوں نے کیا تھا۔ میرے گاؤں کے بہت سے لوگ جلسہ سننے گئے۔ میں بھی گیا۔ رات کو اس جلسے میں شاہ جی نے بھی تقریر کی اور شورش کاشمیری نے بھی۔!

شورش نے اس زمانے میں ہفت روزہ "چٹان" جاری کر رکھا تھا اور وہ مجلس احرار سے الگ ہونے کی تیاریاں کر رہے تھے۔ انکے علاوہ دوسرے زعمائے احرار نے بھی تقریریں کیں، لیکن سب کی تقریریں ڈھیلی تھیں اور لہجے مرجھائے ہوئے تھے۔ وہ جذبہ، وہ جوش، وہ تند و تیز اسلوب جو احرار مقرروں کا خاصا تھا، مفقود تھا۔

کوئی زمانہ تھا کہ لاہور میں یا کسی اور جگہ اعلان ہوتا کہ شاہ جی رات کو دس بجے تقریر کریں گے تو لوگ پانچ بجے ہی رات کا کھانا اور پانی لے کر جلسہ گاہ میں پہنچ جاتے اور فجر کی اذان تک ان کی تقریر سے محظوظ ہوتے رہتے۔ مگر لائل پور کے اس جلسے میں ہم نے دیکھا کہ شاہ جی کی تقریر سامعین کے دلوں میں گرمی نہ پیدا کر سکی۔

۱۹۵۲ء کے آخر میں مرزائیوں کو اقلیت قرار دینے کی تحریک شروع ہوئی۔ اس کے لیے ایک مجلس عمل (ایکشن کمیٹی) بنائی گئی تھی جس کے صدر مولانا سید ابوالحسنات قادری اور ناظم اعلیٰ مولانا سید داؤد غزنوی کو منتخب کیا گیا تھا۔ ۱۹۵۳ء کے شروع میں مجلس عمل کے تمام ارکان (مولانا داؤد غزنوی کے سوا) گرفتار کر لیے گئے تھے اور لاہور میں مارشل لاء لگا دیا گیا تھا۔ اس کا ایڈمنسٹریٹر جنرل اعظم خان کو مقرر کیا گیا تھا۔ یہ پہلا مارشل لاء تھا جس سے پاکستان کے لوگ آشنا ہوئے۔ اس کے بعد مارشل لاؤں کی قطاریں لگ گئیں۔ اس اعتبار سے لاہور کے مارشل لاء کو آئندہ مارشل لاؤں کی ریہرسل بھی قرار دیا جاسکتا ہے اور تمہید بھی۔!

میں ان دنوں جماعت اہل حدیث کے ترجمان ہفت روزہ "الاعتصام" کا ایڈیٹر تھا اور مولانا داؤد غزنوی مرکزی جمعیت اہل حدیث کے صدر تھے۔ مجلس عمل کی چند میٹنگیں مرکزی جمعیت اہل حدیث کے دفتر (شیش محل روڈ) میں بھی ہوئیں جن میں مجھے شرکت کا موقع ملا اور میں نے ان سب حضرات کو قریب سے دیکھا اور سنا۔ فیصلہ کیا گیا تھا کہ گرفتاریوں تک نوبت پہنچے تو مولانا داؤد غزنوی گرفتاری سے بچنے کی کوشش کریں تاکہ تحریک کی رفتار بند نہ ہو اور کسی نہ کسی شکل میں عمل و حرکت کا سلسلہ جاری رہے۔

جن حضرات کو حکومت نے ابتداء ہی میں گرفتار کر لیا تھا ان میں شاہ جی بھی شامل تھے۔ ان لوگوں کو کراچی میں گرفتار کیا گیا تھا اور پھر سکھر جیل میں لایا گیا تھا۔ اس سے کچھ عرصہ بعد جسٹس محمد منیر اور جسٹس ایم۔ آر کیانی کی عدالت میں انکوائری شروع ہوئی، تو انہیں سنٹرل جیل لاہور منتقل کر دیا گیا تھا۔ کئی سال ہوئے سنٹرل جیل کو منہدم کر دیا گیا ہے۔ اب یہ لاہور کا شاندار اور فیشن ایبل علاقہ ہے جسے شادمان کالونی کہا جاتا ہے۔

۱۹۵۳ء کے مارچ کے پہلے ہفتے کی کوئی تاریخ تھی کہ مولانا داؤد غزنوی نے ان حضرات سے جیل میں ملاقات کا پروگرام بنایا، مجھے بھی ساتھ لے گئے، مزنگ چونگی سے گلبرگ کو جاتے ہوئے شادمان چوک پہنچے تو بائیں جانب نکڑ پر ایک مسجد ہے جو پہلے چھوٹی سی مسجد تھی، اب خاصی وسیع ہو چکی ہے۔ اس کے بالکل سامنے سڑک سے دوسری طرف سنٹرل جیل کی ڈیوڑھی تھی جس میں انگریزی عہد کی ہیبت کے تمام عناصر خوف ناک

صورت میں نمایاں تھے قاعدے کے مطابق سنتری بندوق کندھوں پر رکھے ہر آن وہاں کھڑا رہتا تھا۔ مولانا داؤد غزنوی کی آخری سیاسی قید کے تین سال (۹ اگست ۱۹۴۲ء سے ستمبر ۱۹۴۵ء تک) اسی جیل میں گزرے تھے۔ مولانا نے اپنا ملاقاتی کارڈ جیل کے ایک ملازم کے ہاتھ سپرنٹنڈنٹ جیل کو بھیجا۔ وہ باہر آئے۔ مولانا کو نہایت ادب سے جھک کر سلام کیا اور اپنے دفتر لے گئے۔ میں بھی ان کے ساتھ تھا مولانا کے کہنے پر سپرنٹنڈنٹ صاحب نے مولانا ابوالحسنات، شیخ حسام الدین اور شاہ جی کو وہیں بلالیا اور گفتگو کے لیے دفتر کا ایک کمرہ دے دیا گیا۔ مولانا نے ان حضرات کو جیل سے باہر کی صورت حال سے آگاہ کیا اور جس رفتار سے تحریک چل رہی تھی اور گرفتاریاں ہو رہی تھیں، اس کی تفصیل بتائی۔

اب شاہ جی بوڑھے ہو چکے تھے اور جسمانی کمزوری کے آثار ان کے چہرے پر ابھر آئے تھے مگر ان کا دل جوان تھا، جذبات کی دنیا پوری طرح آباد تھی اور کلمۂ حق کہنے کا داعیہ جوبن پر تھا۔ انہوں نے مولانا سے فرمایا، آپ ہماری فکر نہ کریں، ہم بالکل ٹھیک ہیں۔ جیل کی یہ کوٹھڑیاں ہمارے لیے نئی نہیں ہیں، عمر کا بہت بڑا حصہ انہی کوٹھڑیوں میں گزرا ہے۔ ہمیں یہاں کامل اطمینان اور سکون حاصل ہے۔ آپ ہمیں اپنی حالت پر چھوڑ دیجئے اور تحریک جاری رکھیے۔ خود ایسا قدم نہ اٹھائیے کہ گرفتاری تک نوبت پہنچ جائے۔ اگر ایسا ہوا تو تحریک کو نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہے۔ تقریباً ایک گھنٹے تک ان سے ملاقات رہی اور ہم واپس آگئے۔

جب تک تحریک تحفظ ختم نبوت میں گرفتار ہونے والے حضرات لاہور سنٹرل جیل میں محبوس رہے، مولانا داؤد غزنوی کئی مرتبہ ان سے ملاقات کے لیے گئے میں ان کے ساتھ صرف دو مرتبہ گیا۔

تحریک میں حصہ لینے والوں پر حکومت نے بے پناہ سختیاں کی تھیں اور بے شمار لوگوں کو گرفتار کر لیا گیا تھا۔ اخبارات پر سنسر لگا دیا تھا اور مجلس احرار خلاف قانون قرار دے دی گئی تھی۔ پھر ایک تحقیقاتی عدالت قائم کر دی گئی تھی جو جسٹس محمد منیر اور جسٹس ایم۔ آر کیانی پر مشتمل تھی۔ عدالت لاہور ہائی کورٹ میں قائم کی گئی تھی اور تحریک تحفظ ختم نبوت کے بہت سے رہنماؤں کے بیانات قلم بند کیے گئے تھے۔ جنہیں جیل سے پولیس کی تحویل میں لایا جاتا تھا۔ تحریک کی طرف سے مولانا داؤد غزنوی وکیل تھے۔ کمرۂ عدالت لوگوں سے بھر جاتا تھا اور سپریم کورٹ اور ہائی کورٹ کے اکثر وکلاء کارروائی سننے کے لیے آتے تھے۔

مرزائیوں کی طرف سے بھی وکیل مقرر تھے۔شاہ جی کو بیان دینے کے لیے جس دن عدالت میں طلب کیا گیا تھا، لوگوں کا بہت بڑا ہجوم وہاں جمع تھا اور تمام اخباروں کے نمائندے موجود تھے۔ تحقیقاتی عدالت کی پوری کارروائی سنسر کی وجہ سے اخباروں میں نہیں آسکتی تھی، صرف اتنی خبر چھپتی تھی جتنی حکومت دینا مناسب سمجھتی تھی۔

شاہ جی کو جب ہائی کورٹ میں لایا گیا، انکے آگے پیچھے پولیس کے اہلکار تھے، وہ کمرۂ عدالت میں آئے تو شلوار قمیض میں ملبوس تھے اور سر ننگا تھا۔ پہلے بتا چکا ہوں کہ جب سے انہیں پتا چلا تھا کہ جالندھر ریلوے اسٹیشن پر مولانا حسین احمد مدنی کی پگڑی اتار دی گئی ہے، انہوں نے سر سے ٹوپی اتار دی تھی۔ شاہ جی

نے اپنے بیان میں مرزائیت کے پس منظر کی وضاحت کی اور پھر تفصیل سے بتایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خاتم النبیین ہیں اور آپ ﷺ کے بعد نبوت کا سلسلہ ختم ہو چکا ہے۔ جو شخص نبوت کا دعویٰ کرے۔ وہ شریعت اسلامی کی رو سے دائرہ اسلام سے خارج ہے۔ جو لوگ اسکو نبی مانیں اور اس کے لیے ظلی یا بروزی کی اصطلاحیں استعمال کریں یا اس کی مدافعت کریں یا حامیاں تحفظ ختم نبوت کو صرف اس وجہ سے اذیت میں مبتلا کریں کہ وہ مرزا غلام احمد اور اس کے ماننے والوں کو کافر قرار دیتے ہیں، میں صاف لفظوں میں اعلان کرتا ہوں کہ میرے نزدیک وہ مسلمان نہیں ہیں۔

شاہ جی نے نہایت جرأت مندانہ انداز میں کہا، جبتک میں زندہ ہوں، یہ اعلان کرتا رہوں گا اور یہ اعلان کرنا اور اس پر قائم رہنا میری زندگی کا نصب العین ہے، جس سے دنیا کی کوئی طاقت مجھے روک نہیں سکتی۔ جو شخص مجھے اس سے روکنے کی کوشش کرے گا، میں اسے مسلمان نہیں سمجھتا، میں اس کی بات ماننے سے انکار کرتا ہوں۔

شاہ جی کا بیان خاصی دیر تک جاری رہا۔ درمیان میں بعض لوگوں نے نعرے لگائے تو عدالت نے نعرے لگانے سے روک دیا۔ خود شاہ جی نے بھی لوگوں سے کہا کہ نعرہ بازی بند کر دیں۔ اگرچہ یہ باقاعدہ عدالت نہیں ہے تحقیقاتی عدالت ہے، تاہم عدالت کا احترام ضروری ہے چاہے وہ کسی بھی نوعیت کی ہو۔ بیان کے بعد عدالت نے حکم دیا کہ جب تک تحریک کے رہنماؤں کے بیانات اور تحقیقات کا سلسلہ جاری ہے، شاہ جی کو لاہور سنٹرل جیل میں رکھا جائے، ممکن ہے کہ کسی موقع پر عدالت کو انہیں دوبارہ بلانا پڑے۔ (۱)

۲۵، ۲۶ فروری ۱۹۵۶ء کو لاہور میں دلی دروازے کے باہر تحفظ ختم نبوت کانفرنس ہوئی۔ کانفرنس کے آخری اجلاس میں دوپہر کے بعد شاہ جی نے تقریر کی جیل سے رہائی کے بعد لاہور میں ان کی یہ پہلی تقریر تھی جو تین گھنٹے جاری رہی۔ بہت بڑے مجمع کو خطاب کرتے ہوئے انہوں نے عقیدہ ختم نبوت اور تحریک تحفظ ختم نبوت کی وضاحت کی۔ لیکن اب ضعف و نقاہت نے ان کو چاروں طرف سے گھیر لیا تھا۔ وہ مسلسل چالیس بیالیس برس تک لوگوں کے جذبات و احساسات کو الفاظ و حروف کے قالب میں ڈھالتے رہے تھے، مگر اب ان میں وہ کس بل نہ رہے تھے۔ نہ اب برطانوی حکومت ان کی حریف تھی جس کی ستم گری کے بوقلموں واقعات سے ان کو پر تاثیر جملوں اور نوع بنوع فقروں کا ذخیرہ میسر آتا تھا، نہ کوئی سیاسی طاقت ان کے مدمقابل رہی تھی، جس پر تنقید کرتے ہوئے وہ نئے سے نئے اسلوب کلام اور مؤثر ترین انداز بیان سے حاضرین کو تڑپاتے

۱۔ شاہ جی نے اپنے رفقاء کو اس تحقیقاتی عدالت کے بائیکاٹ کا مشورہ دیا تھا مگر دوستوں کے فیصلے پر عدالت میں مجبوراً بیان دینے چلے آئے۔ وہ شروع دن سے اس موقف پر قائم تھے کہ یہ عدالت اسلام اور مسلمانوں کو ذلیل و رسوا کرنے کے لئے قائم کی گئی ہے۔ پھر تاریخ شاہد ہے کہ پاکستان کی عدالتی تاریخ میں جانبداری اور بددیانتی کی بنیاد جسٹس منیر نے رکھی۔ اور وہ فیصل بننے کی بجائے قادیانیوں کے وکیل صفائی بن گئے۔ اسلام اور علماء کو ذلیل و رسوا کرنے میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی۔ جسٹس کیانی بھی ان کے شریک تھے۔ انہوں نے تحریک تحفظ ختم نبوت کو سیاسی رنگ دے کر "احرار احمدی نزاع" کا نام دیا مگر محمد مصطفیٰ ﷺ کے ناموس کی شرم نہ کی تحقیقاتی عدالت کی رپورٹ خود اس پر شاہد عدل ہے (مدیر)

اور گرماتے تھے۔ اگرچہ ان کا لہجہ پژمردہ ہو چکا تھا اور زور خطابت ماند پڑ گیا تھا، تاہم جذبات و جوش میں تلاطم بدستور موجود تھا۔

اس تقریر میں شاہ جی نے مولانا داؤد غزنوی کے بارے میں بعض ایسی باتیں ارشاد فرمائیں جو ہمارے جیسے ادنیٰ عقیدت مندوں کے نزدیک ان کی شان پروقار سے ہم آہنگ نہ تھیں۔ لیکن یہ کسی خاص تاثر کی بناء پر ایک بڑے آدمی کا ایک بڑے آدمی اور پرانے ساتھی کے متعلق اظہار خیال تھا، جس سے ان لوگوں کو کوئی خاص تعلق نہ تھا، جو دونوں بزرگوں کو ہر صورت میں لائق تکریم گردانتے تھے۔

جلسہ گاہ میں میں نے دیکھا کہ چند نوجوان چار پانچ کتابچے تقسیم کر رہے ہیں۔ ان میں ایک نوجوان میرے پاس آیا اور کتابچے دے کر آگے نکل گیا۔ میں نے دیکھے تو وہ کتابچے میرے ہی دو اداریوں پر مشتمل تھے جو میں نے "الاعتصام" میں لکھے تھے۔ سولہ سولہ صفحات کے یہ کتابچے میرے نام سے چھپے تھے اور تحفظ ختم نبوت ملتان نے شائع کیے تھے۔

اس کی مناسب تفصیل تو ان شاء اللہ اس مضمون میں بیان کی جائے گی جو میں کسی وقت سید ابوالاعلیٰ مودودی پر لکھنا چاہتا ہوں لیکن یہاں مختصر الفاظ میں عرض کروں گا کہ ۱۵ مئی ۱۹۵۵ء کو مولانا مودودی مرحوم نے برکت علی ہال (لاہور) میں جمعیت حدیث کے موضوع پر تقریر کرتے ہوئے صحیح بخاری کے بارے میں ایسے الفاظ ارشاد فرمائے تھے جو اہل سنت کے نقطۂ نظر سے مطابقت نہیں رکھتے تھے۔ میں نے "الاعتصام" میں (جس کا میں اس زمانے میں ایڈیٹر تھا) اس کا نوٹس لیا تو جماعت اسلامی کے حلقوں میں شدید ردعمل ہوا اور اس کے تمام رسائل و جرائد میدان میں نکل آئے۔ طرفین میں ایک "صحافتی جنگ" شروع ہو گئی اور پھر یہ جنگ اسی ایک محاذ میں محدود نہ رہی بلکہ اپنی فطرت کے مطابق بہت سے محاذوں میں پھیل گئی اور متعدد حضرات نے اس میں حصہ لیا۔ ۱۷ جون ۱۹۵۵ء کو مولانا مودودی نے سرگودھا میں تقریر کی تو اس میں بھی بعض عجیب و غریب باتیں ارشاد فرمائیں۔ میں نے اس سے "الاعتصام" کی دو اشاعتوں ---- ۱۵ جولائی اور ۲۲ جولائی ۱۹۵۵ء ---- میں اظہار اختلاف کیا۔ عنوان تھا "لاہور کے بعد سرگودھا ---- راہ اعتدال یا راہ اعتزال" تحفظ ختم نبوت ملتان نے ایک کتابچے کی صورت میں اسے "راہ اعتدال یا راہ اعتزال" کے نام سے شائع کیا۔

مولانا مودودی نے سورۃ المومنون کی ابتدائی آیات کی تفسیر کرتے ہوئے (ترجمان القرآن اگست ۱۹۵۵ء میں) بعض تعجب انگیز باتیں تحریر فرمائی تھیں۔ میں نے "الاعتصام" کے ۴ نومبر اور ۱۱ نومبر ۱۹۵۵ء کے اداریوں میں "متعہ کے جواز پر ڈرامائی استدلال" کے عنوان سے اس کے بارے میں لکھا۔ اسے بھی کتابچے کی شکل میں تحفظ ختم نبوت ملتان نے شائع کیا ان دونوں کی اشاعت کا علم مجھے اسی جلسے میں ہوا جو ۲۵، ۲۶ فروری ۱۹۵۶ء کو دلی دروازے کے باہر لاہور میں ہوا تھا اور جس کے آخری اجلاس میں شاہ جی نے تقریر کی تھی۔

۱۹۵۶ء کے مارچ کی ابتدائی تاریخوں میں شاہ جی لاہور میں تھے اور مجلس احرار کے دفتر (بیرون دلی دروازہ) میں قیام فرما تھے۔ ایک دن دس بجے کے قریب مولانا مجاہد الحسینی دفتر "الاعتصام" میں تشریف لائے اور مولانا داؤد غزنوی سے ملے۔ میں اس وقت مولانا کی خدمت میں حاضر تھا۔ اس زمانے میں بعض معاملات سے

متعلق کچھ لوگوں نے شاہ جی اور مولانا غزنوی کے درمیان کچھ غلط فہمیاں پیدا کر دی تھیں، جن کا شاہ جی نے چند روز پیشتر ۲۶ فروری کی تقریر میں اپنے انداز خاص میں ذکر کیا تھا۔ مولانا اپنے پرانے ساتھی سے اس کی امید نہیں رکھتے تھے، اس لیے انہیں شاہ جی سے اس ضمن میں دوستانہ شکوہ تھا۔ مولانا مجاہد الحسینی چاہتے تھے کہ مولانا تکلیف فرمائیں اور شاہ جی کے پاس تشریف لے جائیں تاکہ باہمی گفتگو سے غلط فہمیاں دور ہو جائیں، مگر مولانا اس پر آمادہ نہ تھے۔ وہ فرماتے تھے، پہل شاہ جی کی طرف سے ہوئی ہے، ازراہِ کرم وہ تشریف لائیں اور اپنا نقطۂ نظر واضح فرمائیں۔ میں بھی انہیں اپنا موٗقف بتاؤں گا۔ اگر میری غلطی ہوئی تو معافی مانگ لوں گا۔

خاصی دیر تک گفتگو ہوتی رہی، بالآخر مولانا نے فرمایا کہ میں اپنے ایڈیٹر (یعنی اس راقم عاجز) کو اپنا نمائندہ بنا کر آپکے ساتھ شاہ جی کی خدمت میں بھیجتا ہوں۔ یہ ان سے میرے موٗقف کی وضاحت کریں گے اور پھر اگر ضرورت ہوئی تو میں خود ان کی خدمت میں حاضر ہو جاؤں گا۔

مولانا مجاہد الحسینی نے یہ تجویز منظور فرمائی اور میں مولانا کی نمائندگی کے لیے انکے ساتھ روانہ ہو گیا۔ مجھے احساس تھا کہ میں مولانا کی نمائندگی کا حق ادا نہیں کر سکوں گا اور شاہ جی کے حضور کھل کر بات کرنا میرے لیے مشکل ہو گا، لیکن اس کے باوجود میں چل پڑا۔

اس دن ہلکی ہلکی سی بارش ہو رہی تھی۔ مجلس احرار کا دفتر دلی دروازے کے باہر سرکلر روڈ پر شاہ محمد غوث کے مزار کے سامنے کی بلڈنگ کی دوسری اور تیسری منزل میں تھا۔ بارش کی وجہ سے سڑک پر گارے کی موٹی موٹی تہیں جمی ہوئیں تھیں۔ اسی بلڈنگ میں احرار کے ترجمان روزنامہ "آزاد" کا دفتر تھا، جس کے ایڈیٹر ان دنوں مولانا مجاہد الحسینی تھے۔ ہم دوسری منزل میں گئے تو ایک بڑے کمرے میں موٹے بان کی چھوٹی سی چارپائی پر برصغیر کا شہنشاہ خطابت آلتی پالتی مارے بیٹھا تھا۔ فرش پر ایک بڑی سی دری بچھی ہوئی تھی جو کئی جگہ سے پھٹی ہوئی تھی اور اس کے بڑے بڑے سوراخ اس کی بوسیدگی اور کہنگی کا اعلان کر رہے تھے اور بتا رہے تھے کہ یہ عمر کی بہت سی منزلیں طے کر چکی ہے اور اس پر بے شمار کاروانِ احرار گزر چکے ہیں۔

دری پر سات آٹھ آدمی چپ چاپ بیٹھے تھے اور شاہ جی نظر کی عینک لگائے اور ہڈیوں کا ڈھانچہ بنے مجلس احرار کے لیٹر پیڈ پر کچھ لکھ رہے تھے اور نگاہیں کاغذ پر جمی ہوئی تھیں۔ ہم دونوں ان کے انہماک کو دیکھ کر "سرہانے میر کے آہستہ بولو" کی عملی تصویر بنے ہوئے تھوڑا سا آگے بڑھے۔ جوتے اتار کر اور بزبانِ خفی السلام علیکم کہہ کر، نہایت ادب سے دوزانو ہو کر دری پر بیٹھ گئے کچھ دیر بعد شاہ جی نے کاغذ پر سے نگاہ اٹھائی تو میں نے اپنی جگہ سے اٹھ کر مؤدبانہ اور نیاز مندانہ سلام عرض کیا اور گردن جھکا کر دونوں ہاتھ ان کے بابرکت ہاتھوں میں دے دیئے۔ مولانا مجاہد الحسینی نے کھڑے ہو کر میرا ان سے تعارف کرایا۔

ان پاک طینت لوگوں کو ہمیشہ کیلئے دھرتی نگل گئی ہے اور اس کینڈے کے لوگ اب کبھی سطحِ ارض پر نمودار نہیں ہوں گے۔ افسوس ہے

زمیں کھا گئی آسماں کیسے کیسے

میرا نام (جو ان جیسے نامور حضرات کے ذکر کے مقابلے میں کسی شمار قطار میں آنے کے لائق نہیں) سنتے ہی بیسویں صدی کے برصغیر کا خطیب اعظم چارپائی سے اٹھا اور مجھے اپنی بغل میں لے لیا۔ مولانا مجاہد الحسینی سے کہا تم خاموشی سے آ کر بیٹھ گئے، آتے ہی کیوں نہیں بتایا میں اپنے عزیز کو لینے کے لیے دروازے پر جاتا۔ یہ الفاظ مجھ فقیر کے لیے بہت بڑا اعزاز تھے۔ پھر اس سے بڑا اعزاز یہ کہ مجھے اپنے برابر چارپائی پر بٹھایا عجیب تر بات یہ کہ اصرار کر کے سرہانے کی طرف بٹھایا اور جو بڑا سا تکیہ چارپائی پر پڑا تھا، ٹیک لگانے کے لیے عنایت فرمایا۔ میں اس پیکر شفقت کی پر خلوص باتیں سن کر اور کیفیت انکسار دیکھ کر مارے شرم کے پانی پانی ہو گیا۔ ایک آدھ منٹ تو کسی نہ کسی طرح سرہانے کی طرف بیٹھا، پھر یہ عرض کر کے پائنتی میں آ گیا کہ اب تعمیلِ ارشاد ہو گئی اور

الامر فوق الادب

پر عمل کر لیا گیا ہے۔

شاہ جی نے لطف و کرم کا اظہار کرتے ہوئے فرمایا: میں آپ کے اخبار "الاعتصام" کا باقاعدہ مطالعہ کرتا ہوں، آپکے اداریے پڑھتا ہوں اور خوش ہو کر آپ کو دعا دیتا ہوں۔ آپکے دو اداریے تو میں نے مجلس تحفظِ ختم نبوت[1] ملتان کی طرف سے کتابی صورت میں شائع بھی کرائے ہیں جن میں سے ایک کا عنوان "راہ اعتدال یا راہ اعتزال" اور ایک کا "متعہ کے جواز پر ڈرامائی استدلال" ہے پھر یہ دونوں کتابچے مجھے عنایت فرمائے۔

اس کے بعد انہیں مولانا داؤد غزنوی کا سلام پہنچایا گیا۔ مولانا مجاہد الحسینی نے کہا۔ مولانا سے بہت سی باتیں ہوئی ہیں، وہ کسی وجہ سے خود تشریف نہیں لا سکے، میرے متعلق بتایا کہ یہ ان کے نمائندے کی حیثیت سے آپ سے بات کریں گے۔

تقریباً ڈیڑھ گھنٹے تک مجھے شاہ جی کی خدمت میں حاضر رہنے اور ان کے ارشادات سے مستفید ہونے کا شرف حاصل رہا۔ تمام گفتگو میں انہوں نے یا تو مجھے "اسحاق صاحب" کہہ کر خطاب فرمایا یا "میرے عزیز" کہہ کر۔۔۔ ! جمال و انکسار میں ڈوبے ہوئے لہجے میں انہوں نے کہا: میں فقیر آدمی ہوں، مولانا داؤد غزنوی سے خفا ہونے اور ان سے گلے شکوے کا تصور بھی نہیں کر سکتا، میں امرتسر کی ایک مسجد میں بیٹھا زندگی کے دن گزار رہا تھا اور اپنے تھوڑے سے علم کے مطابق وعظ و نصیحت کی خدمات انجام دے رہا تھا کہ ۱۹۱۹ء میں تحریک خلافت شروع ہو گئی۔ داؤد غزنوی مجھے جانتے تھے اور میرے طریق وعظ کا انہیں علم تھا۔ میں نہایت سادگی سے رہتا اور کھدر کا نیلے رنگ کا تہبند باندھتا تھا۔ اُن کا گھرانہ فضل و کمال اور تصوف و طریقت کا گھرانہ تھا جس کے فیوض و برکات کا دائرہ سارے پنجاب پر محیط تھا۔ ان سے ملاقات ہوتی تو نہایت مہربانی کا اظہار کرتے، میں بھی جھک کر سلام کرتا، ان کی جوانی کا زمانہ تھا، میں بھی جوان تھا، لیکن ان کا شمار اس دور کی مجلس خلافت

۱۔ ان دنوں مجلس احرار اسلام خلاف قانون تھی اور احرار کارکن شاہ جی کی قیادت میں احرار کے شعبۂ تبلیغ "مجلس تحفظ ختم نبوت" کے نام سے اپنی سرگرمیاں جاری رکھے ہوئے تھے۔ بعد میں مولانا محمد علی جالندھری رحمہ اللہ نے اسے مستقل جماعت بنا کر احرار سے علیحدگی اختیار کر لی۔ (مدیر)

کے قائدین میں ہوتا تھا اور میں گوشہ نشین امام مسجد تھا۔ ایکدن انہوں نے مجھ سے کہا: کیوں مسجد میں بیٹھے اپنی صلاحتیں صائع کر رہے ہو، اٹھو میدان عمل میں نکلو، ملک اور قوم کو تمہاری ضرورت ہے۔ میں ان کے کہنے سے مسجد کی چار دیواری سے باہر نکلا اور تحریک خلافت میں حصہ لینا شروع کر دیا۔ میانوالی جیل میں ہم دونوں اکٹھے رہے اور بارہا جیل اور ریل میں ہماری رفاقت رہی۔ تحریک خلافت میں جمعیت علمائے ہند (جس کے بانیوں میں خود داؤد غزنوی کا نام بھی شامل ہے) مجلس احرار میں اور بعض دوسری سیاسی جماعتوں میں ہم نے ایک ساتھ کام کیا، ایک سٹیج پر تقریریں کیں اور بے شمار مواقع پر ہمسفر رہے۔

شاہ جی نے فرمایا، میں سیاست میں ان کو اپنا استاد سمجھتا ہوں اور استاد کا گلہ کرنا اس فقیر کا شیوہ نہیں۔ میری جوانی گزر گئی، کھولت کا زمانہ بیت گیا، اب بڑھاپے کی منزل میں داخل اور قبر میں پاؤں لٹکائے بیٹھا ہوں، میں ہر گز اس سید زادے سے خفا نہیں۔ یہ میرا اللہ اللہ کرنے کا وقت ہے، گلے شکوے کی کتاب کھول کر بیٹھنے کا نہیں، اسحاق صاحب! میرا انہیں نیاز مندانہ سلام پہنچایئے اور میری طرف سے عرض کیجئے کہ وہ میرے بہت پرانے ساتھی ہیں، مجھ گنہگار کے لیے دعا کریں، میں بھی انکے لیے دعا گو ہوں، میں ان کا شکر گزار ہوں کہ انہوں نے آپ کو میرے پاس بھیجا۔ آپ کا بھی شکریہ ادا کرتا ہوں کہ آپ نے اس فقیر کے پاس آنے کی زحمت گوارا کی۔

شاہ جی نے اس قسم کی اور بھی بہت سی باتیں کیں۔ ان کا لہجہ انتہائی نرم اور طرز کلام بدرجہ غایت میٹھا اور پیارا تھا۔ اثنائے گفتگو میں کئی دفعہ ان کی آنکھوں میں آنسو آئے اور زبان کے طرز اداء نے ان کی کیفیت قلب کا پتا دیا۔

زندگی میں میری ان سے یہ پہلی اور آخری گفتگو تھی، جو بہت سی گفتگوؤں پر بھاری تھی۔ اس میں شاہ جی نے اپنے دل کا صاف و شفاف آئینہ میرے سامنے رکھ دیا تھا۔

واقعہ یہ ہے کہ یہ گفتگو تاثر پذیری کے بے شمار نقوش میری لوح قلب پر مرتسم کر گئی۔ میں نے واپس آ کر مولانا کو باتیں تفصیل سے سنائیں اور شاہ جی نے ان کے بارے میں جن جذبات کا اظہار کیا تھا، ان کی وضاحت کی۔ ظاہر ہے خود مولانا بھی اپنے متعلق شاہ جی کے تاثرات معلوم کرنے کے لیے بے تاب تھے اور میرا انتظار کر رہے تھے۔ انہوں نے یہ باتیں غور اور توجہ سے سنیں اور دوران سماعت کئی مرتبہ اشکبار ہوئے۔ میں نے مولانا سے عرض کیا کہ بات چیت سے شاہ کی افسردگی کا اندازہ ہوتا تھا اور سننے والے بھی افسردہ تھے کیفیت یہ تھی کہ ع۔

افسردہ دل، افسردہ کند انجمنے را

شاہ جی کی جسمانی حالت اور نرمی کلام کو دیکھ کر داغ کا یہ شعر ذہن میں گھوم رہا تھا۔

ہوش و حواس و تاب و تواں داغ جا چکے
اب ہم بھی جانے والے ہیں، ساماں تو گیا

شاہ جی برصغیر کے بے مثال خطیب اور عظیم مجاہد تھے بقول کسے "قرآن مجید پڑھتے تو معلوم ہوتا کہ قرأت و تجوید کے تمام لوازم کے ساتھ لحن داؤدی سے سرفراز کر دیے گئے ہیں۔

وہ غلامی کے دور میں پیدا ہوئے اور غلامی کے شر میں خیر کا پہلو یہ پنہاں تھا کہ اس خطہ ارض نے بڑے بڑے لوگوں کو جنم دیا، جن میں شہرہ آفاق سیاستدان بھی تھے اور اونچے درجے کے مقرر و خطیب بھی منجھے ہوئے اصحاب درس و تدریس بھی تھے اور عالی مرتبے کے مصنف و مؤلف بھی پاکیزہ وش صوفیا و اتقیا بھی تھے اور اہل تحقیق مناظر و ناقد بھی یہ حضرات ایک خاص فضا اور ماحول کی پیداوار تھے۔ اب ان اوصاف کے حامل لوگ کبھی پیدا نہیں ہوں گے۔ وہ سانچے مدت ہوئی ٹوٹ گئے جن میں یہ حضرات ڈھلے تھے اور وہ دور عرصہ ہوا ختم ہو گیا جس میں یہ بزرگ عالم وجود میں آئے تھے۔

شاہ جی اپنے گوناگوں کمالات کی وجہ سے ان لوگوں میں اپنا خاص مقام رکھتے تھے، بلکہ کہنا چاہیے کہ صف اول میں جگہ پاتے تھے۔ ان کی تقریر میں شیر کی گرج، خطابت میں دریا کی روانی اور تنقید میں تلوار کی کاٹ تھی۔ لیکن اس کے ساتھ ہی ان میں ایک اور خصوصیت بھی تھی۔ ان کی زبان کی جنبش میں پھولوں کی مہک اور گلاب کی خوشبو بھی رچی ہوئی تھی۔

وہ انتہائی نرم گفتار بھی تھے اور بدرجہ غایت تیز کلام بھی۔ انگریزی حکومت کے خلاف لب کشائی کرتے تو زبان آگ اگلنے لگتی، اور توحید و سنت کے موضوع پر وعظ کہتے تو لہجہ بدل جاتا اور نرمی اور ملائمت کا پیکرِ شیریں بن جاتے۔ وہ سحر طراز خطیب اور شیوہ بیان مقرر تھے۔ جو بات کرتے، اخلاص میں ڈوب کر کرتے اور وہ بات سامعین کے دل کی گہرائیوں میں اترتی اور اپنی جگہ بناتی چلی جاتی۔ جس مسئلے کو موضوع بحث ٹھہراتے، اس کے متعلقات کی اس اسلوب میں وضاحت کرتے کہ حاضرین پر جادو کی سی کیفیت طاری ہو جاتی۔ وہ چھے چھے سات سات گھنٹے بے تکان بولتے اور دریا کی سی روانی سے بولتے۔ جب تک تقریر کا سلسلہ جاری رہتا، ایسے محسوس ہوتا کہ فضا پر نور کی چادر تنی ہوئی ہے۔ وعظ و تقریر میں ایسے ایسے لطائف و ظرافت اور واقعات و حکایات بیان کرتے کہ کبھی محفل کشف زعفران بن جاتی اور کبھی آہ و بکا کی صدائیں بلند ہونے لگتیں۔ مجمع پوری طرح ان کی گرفت میں ہوتا، وہ ہنساتے بھی تھے اور رلاتے بھی تھے۔ اردو فارسی اور پنجابی کے بے شمار اشعار انہیں یاد تھے۔ موقع و محل کی مناسبت سے اس انداز میں شعر پڑھتے کہ معلوم ہوتا شاعر نے اسی مقام کے لیے شعر کہا تھا۔

انہوں نے جگر داری کے ساتھ انگریز سے ٹکر لی، بہادری اور حوصلے کے ساتھ قید و بند کی سختیوں کو جھیلا اور جرأت و بے باکی سے حریف طاقتوں کا مقابلہ کیا۔ ان کی عزیمت ان کی عظمت کا پتا دیتی ہے، ان کا ایثار ان کی بلندی کی نشاندہی کرتا ہے اور ان کی درویشی ان کی رفعت کو اُجاگر کرتی ہے۔

اگر وہ اپنی خداداد قابلیتوں کی بناء پر پیری مریدی کی راہ اپناتے تو لاکھوں ہاتھ انکی بیعت کے لیے آگے بڑھتے اور انسانوں کے گروہ کے گروہ قدم بوسی کے لیے ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کی کوشش

کرتے۔ اگر دنیوی مال و منال کی طرف عنان توجہ مبذول کرتے تو اپنی جاذبِ قلب و نظر شخصیت کی بناء پر عوامی محبوبیت کا مرکز قرار پاتے اور سیم وزر کے اونچے اونچے ڈھیر ان کے سامنے ہوتے۔

انہوں نے آرام و راحت کے بجائے تکلیف و اذیت کی راہ اپنائی اور اس وقت انگریز کے قلعہ اقتدار میں شگاف ڈالنے کے لیے میدان میں اترے، جب اس کے خلاف زبان سے کوئی لفظ نکالنا اپنے آپ کو بے پناہ مصائب کے سپرد کر دینے کے مترادف تھا، انہوں نے اس دور میں سلطان جائر کے سامنے آزادی و حریت کا کلمۂ حق بلند کیا، جب اس کے صلے میں طوق و سلاسل کی گراں باریوں کو انگیز کرنا لازمی قرار پایا تھا۔ انہوں نے تحریک ہجرت میں حصہ لیا، تحریک خلافت میں قربانیاں دیں اور پھر اس محاذ پر دادِ شجاعت دی جس سے انگریز کے پندارِ استعمار کو گزند پہنچ سکتا تھا۔ بلاشبہ انکی سیاسی خدمات کا سلسلہ بہت طویل اور انتہائی درد ناک ابواب پر مشتمل ہے۔

مجلس احرار کے قیام کے بعد، جس کے بانیوں میں خود شاہ جی بھی تھے، وہ زندگی کے آخری لمحوں تک مجلس احرار سے وابستہ رہے۔ اس میں یا تو درمیانے درجے کے لوگ شامل تھے یا غریب و نادار۔! میرے خیال میں اس جماعت میں صرف ایک چودھری، ایک نواب زادہ اور ایک صاحب زادہ تھے۔ جب کہ بعض دوسری سیاسی جماعتوں میں نوابوں اور نواب زادوں اور صاحب زادوں اور چودھریوں اور سیٹھوں اور خان بہادروں اور سرکاری خطاب یافتوں کی لائنیں لگی ہوئی تھیں۔

احرار کے نواب زادہ اور صاحب زادہ (نواب زادہ نصر اللہ خاں اور صاحب زادہ فیض الحسن) کو میں نے مجلس احرار کے مرکزی دفتر لاہور میں پہلی مرتبہ ۱۹۴۷ء میں اس وقت دیکھا تھا، جب صوبہ بہار میں فسادات کا زور تھا۔ اور ہندوؤں کے ہاتھوں مسلمانوں کا قتل عام ہو رہا تھا۔ اور غریب مجلس احرار کے قائم کردہ جہاد فنڈ میں غریب لوگ چندہ جمع کراتے تھے۔ میں بھی اپنے وطن کوٹ کپورہ (ریاست فرید کوٹ۔ مشرقی پنجاب) کے غریب مسلمانوں کی طرف سے تین سو ساٹھ روپے کی غریبانہ رقم جمع کرانے کے لیے مجلس احرار کے دفتر (لاہور) آیا تھا۔ مجھے یاد ہے اس رقم کی رسید ثناء اللہ بھٹہ نے دی تھی اور انہی کے اس پر دستخط تھے۔

یہ بھی عجیب اتفاق ہے کہ مجلس احرار کے چودھری (افضل حق) جو بے چارے فقط نام کے چودھری تھے ۱۹۴۲ء میں وفات پا گئے اور آزادی کے فوراً بعد نواب زادہ (۱) اور صاحبزادہ دونوں اس جماعت سے الگ ہو گئے، اور یہ جماعت بدستور قلندروں اور ملنگوں (۲) کی جماعت رہی۔ لیکن مجلس احرار کے یہ قلندر اور ملنگ اور درمیانے درجے کے لوگ ایثار اور قربانی کا مجسمہ تھے۔ آزادی وطن کے لیے عمل و حرکت کو عبادت قرار دیتے تھے اور اس سلسلے میں قید و بند کے لیے ہر وقت آمادہ و تیار رہتے تھے۔

ستمبر ۱۹۳۹ء سے دوسری جنگ عظیم شروع ہوئی تو احرار سینہ تان کر میدان میں آ گئے۔ ملک کی

۱۔ نوابزادہ ۱۹۵۶ء میں اور صاحبزادہ ۱۹۵۳ء میں احرار سے علیحدہ ہوئے۔ (مدیر)

۲۔ یوں کہنا چاہیے کہ مجلس احرار فقیروں اور درویش خدا مستوں کی جماعت تھی۔ "قلندری" اور "ملنگی" تو مستقل مذہب ہے جو ایرانی سبائیوں اور رافضیوں کی ایجاد ہے۔ (مدیر)

انگریزی حکومت کی مخالفت میں اٹھ کھڑے ہوئے اور گرفتار کر لیے گئے۔ ۸ اگست ۱۹۴۲ء کو جب کانگریس نے بمبئی میں "ہندوستان خالی کرو" ریزولیوشن پاس کیا تو اس کے نتیجے میں رہنماؤں اور بہت سے کارکنوں کو گرفتار کر کے جیلوں میں بند کر دیا گیا تھا۔ لیکن مجلس احرار کے قائدین وارکان اس وقت جنگ کے بعد دوسری مرتبہ گرفتاریاں پیش کر رہے تھے۔ مجھے یاد ہے اس صورت حال کے متعلق سبھاش چندر بوس نے کانگریس پر طنز و طعن کے انداز میں ایک بیان میں کہا تھا کہ "مجلس احرار کے ارکان کانگریسی نیتاؤں سے قربانی میں کہیں آگے ہیں جو آزادیٔ وطن کے لیے تین سال کے عرصے میں حکومت برطانیہ کے خلاف سول نافرمانی کر کے دوسری مرتبہ جیلوں میں جا رہے ہیں"۔

مجلس احرار سے تعلق رکھنے والوں کو شاید جیل جانے کا "مرض" لاحق ہو گیا تھا۔ جیل سے باہر کھلی فضا میں رہنا ان کو راس نہیں آتا تھا۔ دو ڈھائی مہینے باہر رہتے تو انہیں کھجلی سی ہونے لگی، اس کا علاج ان کے نزدیک جیل جانا تھا۔

اس موقعے پر مجھے مشہور صحافی دیوان سنگھ مفتون کی آزادی سے پہلے کی ایک بات یاد آ رہی ہے۔ انکا اخبار ہفت روزہ "ریاست" تھا جو ملک کے بعض حلقوں میں دلچسپی سے پڑھا جاتا تھا۔ اس کا ایک کالم سوال و جواب تھا۔ کسی نے ان سے ملک کی مختلف سیاسی جماعتوں اور ان کے عمائد و ارکان کی خصوصیات کے بارے میں سوال کیا، جن میں مجلس احرار بھی شامل تھی۔ انہوں نے تمام جماعتوں کے بارے میں جواب دیا اور ان کا دلچسپ اسلوب میں تجزیہ کیا۔ مجلس احرار کے ارکان کے بارے میں ان کا جواب تھا کہ یہ ملک کی وہ سیاسی جماعت ہے، دھواں دھار تقریریں کرنا جس کے لیڈروں کا پیشہ ہے۔ وہ انگریزی حکومت کے بھی خلاف ہیں، ہندوؤں کے مخالف ہیں، کانگریس سے بھی ان کا تصادم ہے اور مسلم لیگ سے بھی چپقلش ہے۔ یہ لوگ سادہ زندگی بسر کرتے ہیں، جلسوں میں جائیں تو معمولی ہوٹل یا تنور سے دال روٹی کھا کر گزارہ کرتے ہیں۔ جیل سے باہر رہنا ان کے لیے ناممکن ہے۔ کوئی نہ کوئی ایسا سلسلہ شروع کیے رکھتے ہیں، جن کے باعث جیل جانا ضروری ہو جائے۔

برصغیر کو انگریزی استعمار سے نجات دلانے کے لیے شاہ جی نے جو جدوجہد کی وہ آبِ زر سے لکھنے کے لائق ہے۔ آزادی کی ہر تحریک کا طویل پس منظر ہوتا ہے، جس میں بہت سے عوامل کارفرما ہوتے ہیں، ہر دور میں متعدد جماعتیں اپنے اپنے انداز سے حصول آزادی کے لیے کوشاں رہتی ہیں اور مختلف عناصر اس کے لیے تگ و دو کرتے ہیں۔ پھر ان سب کی مخلصانہ کوششوں سے آزادی کی نعمت میسر آتی ہے۔

شمع حریت کبھی کسی ایک ہی سمت سے صحن ملک میں داخل نہیں ہوتی۔ مختلف اوقات و حالات میں مختلف سمتوں اور مختلف دروازوں اور ذریعوں سے آتی اور چمن زار وطن کو روشنی بخشتی ہے۔ اگر بعض عناصر اس چند لفظی تجزیے کو اپنی سیاسی عصبیت کی بھینٹ نہ چڑھا دیں تو ہم عرض کریں گے کہ آزادیٔ وطن اور قیام پاکستان میں مجلس احرار کی قربانیوں اور شاہ جی کی تگ و تاز مجاہدانہ کو بہت بڑی اہمیت حاصل ہے۔ انہی

جماعتوں کے اربابِ قیادت کی سعی مسلسل سے ہم نے انگریز کی غلامی سے چھٹکارا پایا اور انہی کی قربانیوں کی بدولت ہم حریت و آزادی کے مسرت آمیز دور میں داخل ہوئے۔

بعض حضرات نے طعن و تنقید کو اپنا مشن قرار دے رکھا ہے اور اسی پر انکا گزارہ ہے تنقید بہت آسان کام ہے، ذمے داریوں سے بچنے اور اصل کام سے دور رہنے کے لیے تنقید سے بہتر کوئی ذریعہ نہیں۔ شاہ جی اور ان کی جماعت کو بھی وہ ہدف تنقید ٹھہراتے ہیں اور یہ ان کے نزدیک ملک و ملت کی بہت بڑی خدمت ہے۔

شاہ جی اور چھوٹے بڑے تمام قائدین احرار میں یہ خوبی تھی کہ ہر آن اور ہر حال میں خوش و خرم رہتے تھے لطیفے بازی اور ہنسی مذاق ان کی زندگی کا لازمی جزو تھا۔ اس پر ان کی مخالف سیاسی جماعتوں کے بعض لوگ طعنہ زن بھی ہوئے، مگر انہوں نے اسکی پروا نہیں کی۔

یہ حقیقت ذہن میں رکھنی چاہیے کہ احرار ہمیشہ برصغیر کی انگریزی حکومت کے معتوب رہے اور بعض سیاسی جماعتوں نے بھی انہیں پریشانیوں میں مبتلا کیے رکھا اور ان پر کئی قسم کے الزام عائد کیے۔ پھر انکے مادی وسائل بھی بہت محدود تھے اور بعض افراد تو مفلسی کی حالت میں تھے۔ اگر ان میں لطیفے بازی کی حس نہ ہوتی اور یہ لوگ ہنسی مذاق سے آشنا نہ ہوتے، ہر وقت ماتھے پر تیور چڑھائے اور اپنے آپ پر سنجیدگی طاری کیے رکھتے تو اُن کا زندہ رہنا مشکل ہوجاتا۔ انہوں نے ہمیشہ ہنسی مذاق اور لطائف و ظرائف میں غم غلط کرنے کی کوشش کی، اور ان حالات میں ان کے لیے یہ ضروری بھی تھا تکلیفوں اور مصیبتوں کے احساس کو کسی نہ کسی حد تک دور کرنے کے لیے اس قسم کا اسلوب اختیار کرنے کو میرے خیال میں نامناسب نہیں قرار دیا جاسکتا، بلکہ اسے مارشل لاء کی قانونی بولی میں "نظریۂ ضرورت" سے تعبیر کرنا چاہیے یا ہماری عام زبان میں "امر مجبوری" کہہ لیجئے۔

شاہ جی نہایت حاضر جواب تھے۔ ایک دفعہ وہ کہیں تقریر کر رہے تھے کہ کسی نے ان سے سوال کیا: آپ کے نزدیک حضرت علی رضی اللہ عنہ کا درجہ بلند ہے یا حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا۔۔؟ جواب دیا: حضرت علیؓ میرے آقا حضرت مصطفیٰ ﷺ کے مرید ہیں، اور حضرت عمرؓ آپ ﷺ کی مراد۔! مجھے میرے نانا کے مرید اور مراد دونوں سے محبت ہے اور ان سے اظہارِ محبت کرنا میرا جزوِ ایمان ہے"۔

ایک مرتبہ رمضان المبارک سے ایک دن پہلے ایک نوجوان نے ان سے کہا: شاہ جی۔! شدید گرمیوں کا موسم ہے اور کل سے روزے شروع ہو رہے ہیں۔ کوئی ایسا مسئلہ بتائیے کہ کھایا پیا بھی جائے اور روزہ بھی نہ ٹوٹے۔

فرمایا: کل روزہ رکھ کر میرے پاس آجانا میں تمہیں جوتے ماروں گا، تم جوتے کھاتے جانا اور آنسو پیتے جانا۔ کھاتے پیتے بھی رہو گے اور روزہ بھی نہیں ٹوٹے گا۔

شاہ جی نے اور ان کی جماعت مجلس احرار نے تحریک پاکستان سے اختلاف کیا تھا لیکن جب پاکستان

قائم ہو گیا تو وہ اس کے زبردست حامی تھے۔ انہوں نے صاف لفظوں میں اعلان کیا کہ میں نے اور میری جماعت نے قیام پاکستان کی مخالفت کی تھی اور ہم ایک ہندوستان کے حامی تھے۔ اب پاکستان بن گیا ہے، ہم اپنے موقف میں ہار گئے ہیں، ہمارے مخالف جیت گئے ہیں، پاکستان ہمارا ملک ہے اور ہمارا مستقبل اسی سے وابستہ ہے، ہم یہیں رہیں گے اور یہیں مریں گے۔ اب جو شخص پاکستان کی مخالفت کرے گا، ہم اس کے خلاف جنگ کریں گے۔

یہ ان کی اخلاقی جرأت تھی اور قیام پاکستان سے اختلاف کی بناء پر سیاسی شکست کا اعتراف تھا۔ اس قسم کا اعلان کوئی بڑا آدمی ہی کر سکتا ہے اور بلاشبہ شاہ جی بڑے آدمی تھے۔ قیام پاکستان کے بعد اگر کوئی شخص پاکستان یا اس کے قائدین کے خلاف کسی قسم کی بات کرتا تو شاہ جی برداشت نہ کر سکتے اور اس کو ڈانٹ دیتے۔

قیام پاکستان کے بعد انہوں نے اپنے آپ کو مرزائیت کی تردید اور ملک میں اسلامی نظام کی کوشش کے لیے وقف کر دیا تھا۔ مرزائیت کے سلسلے میں تو انہیں کامیابی ہوئی لیکن اسلامی نظام کی منزل ابھی دکھائی نہیں دیتی۔

آزادی کے بعد وہ ملتان میں سکونت پذیر ہو گئے تھے۔ انہوں نے اپنے لیے کوئی چھوٹا بڑا مکان الاٹ نہیں کرایا اور نہ حکومت کے کسی اہل کار سے ملنے کی کوشش کی۔ وہ کرائے کے مکان میں رہتے تھے، اسی مکان میں وفات پائی اور اسی سے انکا جنازہ اٹھا۔

شاہ جی کا سلسلہ نسب چھتیس واسطوں سے حضرت حسن رضی اللہ عنہ سے ملتا ہے وہ یکم ربیع الاول ۱۳۱۰ھ (۱۸۹۲ء) کو ہندوستان کے صوبہ بہار کے دارالحکومت پٹنہ میں پیدا ہوئے۔ جب فہم و شعور نے انگڑائی لی اور عقل و خرد نے کچھ منزلیں طے کیں تو امرتسر آ گئے۔ وہاں کی ایک مسجد میں ۱۹۱۶ء/ ۱۹۱۴ء کو وعظ و خطابت کا سلسلہ شروع کیا۔ سیاسی زندگی کا آغاز مولانا داؤد غزنوی کے کہنے سے ۱۹۱۹ء میں ہوا، جب کہ تحریک خلافت شباب پر تھی۔ بارہا جیلوں میں گئے اور طویل قیدیں کاٹیں۔

عمل و حرکت کے اعتبار سے بھرپور زندگی بسر کی۔ وہ ایسا بے تاب اور مضطرب دل لے کر آئے تھے جو اسلام اور مسلمانوں کی ہر مصیبت کے وقت بے قرار ہو جاتا تھا۔ انکی آواز اتنی پر درد اور پر سوز تھی کہ برصغیر اور عالم اسلام کے ہر سانحہ میں بے ساختہ بلند ہو جاتی تھی۔ ظلم کے خلاف ان کی صدا اس درجے مؤثر تھی کہ ایک آن میں صور اسرافیل بن جاتی تھی۔ ان کی آنکھیں اسلام اور اہل اسلام کی ہر اذیت پر اشک بار ہو جاتی تھیں۔ مسلمانوں کی ہلکی سے ہلکی تکلیف بھی نہ وہ خود برداشت کر سکتے تھے اور نہ یہ گوارا کرتے تھے کہ کوئی برداشت کرے۔ ناممکن تھا کہ وہ مظلوم کو ظلم و ستم کے شکنجے میں جکڑا ہوا دیکھیں اور خاموش رہیں۔ وہ ملک و قوم کی مصیبت کے وقت خود روتے اور دوسروں کو رلاتے تھے۔

انہوں نے غلام آباد ہندوستان میں انگریز کے خلاف زبردست ٹکر لی اور اس کی حکومت کو اپنا سب سے

بڑا حریف گردانا۔ ایران، عراق، ترکی، حجاز، نجد، مصر، شام، بیت المقدس غرض ہر خطۂ ارض کے مسلمانوں کی مظلومیت کے خلاف صدائے احتجاج بلند کی اور ان کے مصائب پر نوحہ خواں ہوئے۔

وہ مردِ مجاہد اپنے دور کی تمام حریف طاقتوں سے عمر بھر پنجہ آزمارہا، کبھی کسی سے مات نہ کھائی اور کسی کے سامنے ایک لمحے کے لیے سرنگوں نہ ہوا۔ لیکن عزرائیل کے مقابلے میں شکست کھا گیا اور فرشتہ اجل نے موت کا پیغام دیا تو سر جھکا دیا۔

موت کی تمہید بھی بڑی طولانی تھی جو فالج، لقوہ اور یرقان کے انتہائی الجھے ہوئے عنوانات پر سات سال تک پھیلتی چلی گئی۔ بالاخر قمری حساب سے اکہتر اور شمسی حساب سے عمر کی تقریباً ستر منزلیں طے کر کے ۹ ربیع الاول ۱۳۸۱ھ (۲۱ اگست ۱۹۶۱ء) کی شام کو چھ بجکر پچپن منٹ پر اس عالی مرتبت شخص کی کتابِ حیات کا آخری ورق ختم ہو گیا اور اللہ ذوالجلال کی بارگاہ اعلیٰ و ارفع سے مسرت انگیز ندا آئی:

یاایتھا النفس المطمئنۃ ارجعی الی ربک راضیتہ مرضیتہ فادخلی فی عبادی وا دخلی جنتی۔

اخوت کا پیکر، لگن کا ضمیر

امیر شریعت، قلندر، فقیر، اخوت کا پیکر، لگن کا ضمیر
خطابت کی اقلیم کا شہریار ندیم محبت، نقیبِ بہار
سخن جس طرح آبِ کوثر کی دھار چلن جس طرح لعبۂ آبشار
طبیعت میں موجِ صبا کا خرام ارادوں میں خیریت صبح و شام
مشیت کی مشاطگی کا جمال ہمہ کیف و برکت، ہمہ کیف و حال
ہدایات سادہ کا دلکش نصاب علوم درخشاں کا بہتا چناب
تبسم سے نخچیر کرتا ہوا! نگاہوں سے تسخیر کرتا ہوا
حقیقی مربی، حقیقی رفیق ملے گا کہاں ایسا مرد خلیق
ادا کر کے قرض اپنی خدمات کا سحر دم، وہ جاگا ہوا رات کا

ابد کے نگر کو روانہ ہوا
مکمل سفر کا فسانہ ہوا

سید عبدالحمید عدمؔ

کھوئے ہوؤں کی جستجو

پرفیسر شہرت بخاری
اخذ و ترتیب: ذوالکفل بخاری

سوچتا ہوں تو یوں معلوم ہوتا ہے جیسے میری پیدائش کسی ایسے جلسے یا مجلس میں ہوئی ہو گی جس میں کوئی سیاسی یا مذہبی رنما یا عالم اپنی شعلہ بیانی سے سامعین کے دلوں میں بھٹیاں دہکا رہا ہو گا۔ اور وہ نعروں یا آہ و بکا سے زمین کا دل ہلا رہے ہوں گے۔ شاید ہی کوئی ایسی سیاسی یا مذہبی شخصیت ہو گی جس کی آواز سے میرے کان مانوس نہ ہوں۔ ہندو بھی اور مسلمان بھی۔ مگر کسی ہندو لیڈر کی ایسی تقریر میں اب تک نہ سن سکا تھا جس نے جلسے کے بعد چند منٹ کے لئے بھی اپنی گونج میرے دماغ میں چھوڑی ہے۔ ان میں گاندھی بھی تھے، پنڈت جواہر لال نہرو بھی۔ اسی لئے ابا عموماً ایسے جلسوں میں شریک نہیں ہوتے تھے جن میں یا تو صرف ہندو مقرر ہوتے یا کوئی ٹکسال باہر مسلمان خطیب۔ یہی کیفیت میری ہو گئی تھی۔ میرے نزدیک اچھا مقرر تو گھنٹوں بولتا تھا۔ اور سید عطاء اللہ شاہ بخاری تو فجر کی اذان سے مجبور ہو کر اکثر ذوق کے اس شعر پر بولنا بند کرتے تھے۔

مؤذن مرحبا بر وقت بولا
تری آواز مکے اور مدینے

ابا کو سیاست سے دلچسپی تھی مگر صرف حسن خطابت تک۔ جو سیاسی یا مذہبی رہنما اچھا خطیب ہوتا تھا وہ ابا کا ہیرو ہوتا تھا۔ انہیں ان کے سیاسی نظریات اور مذہبی معتقدات سے کوئی سروکار نہ ہوتا تھا۔ مولانا ابو الکلام آزاد، مولانا محمد علی جوہر اور مولانا ظفر علی خان کے نام بڑی محبت سے لیتے تھے۔ سید عطاء اللہ شاہ بخاری کے تو عاشق تھے۔ شاہ جی کی تقریر عشاء کی نماز کے بعد شروع ہوتی تھی اور فجر کی اذان کے ساتھ ختم ہوتی تھی۔ ابا رات بھر بیٹھے رہتے تھے شاہ جی تلاوت کلام پاک بے مثال خوش الحانی سے کرتے تھے۔ ابا نہایت خشوع و خضوع سے سنتے اور زار و قطار روتے تھے۔

لاہور میں ایبک روڈ پر ایک ہندو تاجر کتب تھا۔ راج پال اس کا نام تھا۔ اسکے نام سے یا خود اس نے ایک کتاب لکھ کر شائع کی جس کا نام نعوذ باللہ نعوذ باللہ ثم نعوذ باللہ "رنگیلا رسول" تھا۔ میں نے یہ کتاب دیکھی نہیں مگر سنا ہے کہ اس میں حضور سرور کونین صلی اللہ علیہ وسلم (میرے ماں باپ اور میری اولاد ان کے اسم گرامی پر قربان ہوں) کی ذات مطہر پر شدید لپر قسم کے حملے کئے گئے۔ پورے ملک میں بے اطمینانی اور غم و غصہ کی آگ بھڑک اٹھی تھی۔ لاہور کے مسلمانوں کو اس مکروہ کتاب کی ذمہ داری اپنے کاندھوں پر محسوس ہو رہی تھی۔ ان پر نیندیں حرام ہو گئی تھیں۔ عورتیں مرد بچے بوڑھے سب کے سب خود کو زندگی کے سب سے بڑے عذاب میں گھرا ہوا محسوس کر رہے تھے۔ وہ اپنے آپ کو شدید بے بسی میں پا رہے تھے۔ ایک قیامت تھی کہ لاہور کے مسلمانوں کے سروں پر ٹوٹی ہوئی تھی۔ مسلمانوں کی مذہبی اور سیاسی جماعتیں بڑے

بڑے جلسے کر رہی تھیں۔ جلوس نکال رہی تھیں۔ مگر سب بے اثر۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ مسلمانوں کا اضطراب بڑھتا جا رہا تھا کوئی حل سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ ایک رات دلی دروازے کے باغ میں بہت بڑا جلسہ منعقد ہوا۔ کہا جاتا ہے سید عطاء اللہ شاہ بخاری نے اپنی زندگی کی سب سے مؤثر تقریر کی۔ عشاء کی نماز سے فجر کی اذان تک ہزاروں کا مجمع جذباتی اعتبار سے رفتہ رفتہ اس مقام پر آ چکا تھا کہ انہیں اپنی زندگیاں حرام معلوم ہونے لگیں۔ شاید ہی کوئی گھر ہو گا جس تک اس تقریر کا اثر نہ پہنچا ہو۔ جو جلسے میں موجود نہیں تھے وہ بھی اپنے اپنے گھروں میں انگاروں پر لوٹ رہے تھے۔ شاہ جی کے الفاظ نے مسلمانوں کو بے ساختہ گریہ و بکا پر مجبور کر دیا۔

ابھی دن کا ایک پہر ہی گزرا تھا کہ یہ خبر شہر کے گلی کوچوں میں گھر گھر جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئی کہ بازار سریاں والا (اس محلے کا اصل نام بازار سرفروشاں ہے مگر عرف عام میں سریاں والا ہی مشہور ہے) کے ایک ان پڑھے نجار زادے نے اس ملعون کو کیفر کردار کو پہنچا دیا جس نے ملت اسلامیہ کو اتنی اذیت پہنچائی تھی کہ اس کی مثال اس شہر کی تاریخ میں نہیں ملتی۔

یہ علم الدین تھا۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ اچانک وہ "غازی علم الدین" ہو گیا۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ شاہ جی کے جلسے سے اٹھ کر اس نے کسی مسجد میں فجر کی نماز پڑھی اور سیدھا ایبک روڈ پہنچا جیب سے بڑا سا چاقو نکالا اور لالہ راج پال کے دل میں ترازو کر دیا۔ پھر بڑے سکون سے دکان سے نکلا اور لوہاری دروازے کے تھانے میں گیا اور مقدمہ درج کرا دیا اسے گرفتار کر لیا گیا بڑے بڑے وکیل مقدمہ لڑنے کو جمع ہوئے قائد اعظم بمبئی سے تشریف لائے۔ سنا ہے قائد اعظم اُسے جیل میں ملے اور اصرار کیا کہ "صرف ایک بار عدالت میں کہہ دو کہ میں نے قتل نہیں کیا پھر میرا کام ہے اور میں دیکھوں گا کہ کیسے تمہیں سزا دی جاتی ہے" مگر اس غازی نے جو پراسرار بندوں میں شمار ہوتا تھا صاف صاف کہہ دیا "میں اس سے انکار نہیں کروں گا۔۔۔۔۔۔ میری زندگی کی یہی تو ایک کمائی ہے۔ میں اسے کسی قیمت پر ضائع نہیں کروں گا"۔

غازی علم الدین "غازی علم الدین شہید" بن گیا۔ ایسا فقید المثال جنازہ لاہور کے بازاروں نے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ یہ پہلا جلوس تھا جس میں ابا نے شمولیت کی تھی۔

دہلی دروازے کے باہر ایک مسجد ہے۔ مسلمان اسے "مسجد شہید گنج" کہتے ہیں اور سکھ "گوردوارہ شہید گنج" ۱۹۳۵ء میں اچانک سکھوں نے اسے مسمار کر کے گوردوارہ تعمیر کرنے کا فیصلہ کیا۔ اس خبر نے لاہور کے مسلمانوں میں ہیجان پیدا کر دیا۔ پہلے گلی محلوں میں چھوٹی چھوٹی ٹکڑیوں میں اس موضوع پر تبادلۂ خیال ہوتا رہا۔ پھر باقاعدہ احتجاجی جلسے منعقد ہونے لگے۔۔۔۔ ہوتے رہے ہوتے رہے۔ قراردادیں منظور ہوتی رہیں۔ ادھر ایک صبح اس خبر نے لاہور میں آگ لگا دی کہ "مسجد کو شہید کر دیا گیا"۔ مسلمان بپھرے ہوئے شیروں کی طرح گھروں سے نکل آئے۔ دکانیں بند ہو گئیں۔ سکھوں اور مسلمانوں میں کھچاؤ پیدا ہو گیا۔ سیاسی رہنماؤں کو ایک اور موقعہ ہاتھ لگا تا کہ وہ اپنا کاروبار چمکا سکیں۔۔۔۔۔ مولانا ظفر علی خان اس موقع پر آخری مرتبہ اپنی سیاسی زندگی کے عروج پر آ گئے۔ مولانا بڑے جوشیلے مقرر تھے ان کی تقریروں نے جلتی پر تیل کا کام کیا۔۔۔۔ ایک جمعہ کو

ایک عظیم جلوس بادشاہی مسجد سے نکلا اور غیض و غضب کی حالت میں شہید گنج کی طرف روانہ ہوا۔ دہلی دروازہ کے باہر گورا فوج صف باندھے کھڑی تھی۔ سرکلر روڈ کے چوک میں کوتوالی کے سامنے خاردار تاروں کی باڑھ لگا دی گئی تھی۔ ہزاروں کا جلوس وہاں آ کر رک گیا۔ چند جاں بازوں نے تاریں ایک طرف ہٹا دیں اور نعرے لگاتے ہوئے آگے بڑھ گئے۔ فوج اس صورتحال کی منتظر تھی۔ یک لخت گولیوں کی بوچھاڑ کر دی۔ بے شمار

مسلمان پلک جھپکنے میں ڈھیر ہو گئے گولیاں برس رہی تھیں۔ لوگ گر رہے تھے مگر عجب تھا کہ پسپا ہونے والا کوئی نہ تھا۔ لوگ لاالہ الااللہ کہہ کہہ کر موت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر خود کو شہادت کا حق دار ثابت کرنے کی کوشش میں ایک دوسرے پر سبقت لے جا رہے تھے۔

اس طرح بے دھڑک جان دینے کا منظر میں نے اس کے بعد بس ایک مرتبہ اور دیکھا (فرق صرف یہ تھا کہ اس وقت گولی چلانے والے انگریزی فوجی سپاہی تھے اور اس وقت مسلمان اور آزاد مملکت پاکستان کے) سن ترپین (۱۹۵۳ء) میں جب لاہور میں جب قادیانیت کے خلاف تحریک چلی اور جنرل اعظم خان کا مارشل لاء نافذ ہوا تو ایک صبح انتظار حسین اور میں کافی ہاؤس چلے گئے۔ ہم اوپر گیلری میں جا بیٹھے۔ اور کھڑکی کے شیشوں سے باہر مال روڈ پر جھانکنے لگے۔ تھوڑی دیر میں چالیس پچاس نوعمر لڑکے نعرے لگاتے ہوئے پہنچ گئے۔ کافی ہاؤس کے سامنے فوج نے رکاوٹ کھڑی کی ہوئی تھی۔ یہ نوجوان وہاں پہنچے تو ان کے جوش و خروش میں کئی ہزار گنا اضافہ ہو گیا۔ فوج نے متنبہ کیا۔ جب کوئی اثر نہ ہوا اور جلوس فوج کے بالکل قریب آ گیا۔ گولی چلانے کا حکم دیا گیا اور پلک جھپکتے میں نصف وہیں ڈھیر ہو گئے۔ ایک لڑکا اگرچہ سب سے آگے تھا مگر اسے گولی نہ لگی وہ سخت بے قرار تھا۔ اور پوری قوت سے کلمہ پڑھ پڑھ کر سینہ ننگا کئے رکاوٹ کے اس طرف آ گیا۔ ایک گولی نے اسے بھی ڈھیر کر دیا۔۔۔۔

شہید گنج کا واقعہ چند دن جاری رہا۔ شہر میں خاموشی چھا گئی۔ پھر جیسا کہ مسلمانوں کی تاریخ ہے۔ آپس میں لڑ پڑے اور ایک دوسرے کو سکھوں اور انگریزوں کے ہاتھوں بکنے کا طعنہ دینے لگے۔ جوش و خروش ٹھنڈا ہوتا چلا گیا اور یوں رفتہ رفتہ یہ خونیں تحریک دم توڑ گئی۔

یہ مسجد اب بھی قائم ہے۔ مگر شہید گنج کی مسجد کی خاطر جو جوان خون بے دریغ بہایا گیا میں اس کا عینی گواہ ہوں۔ اور ہر اعتماد سے کہہ سکتا ہوں کہ برصغیر کی تحریکوں میں ایسا حادثہ کم ہی ہوا ہے۔ المیہ اس کا یہ ہے کہ اس کا ثمر بس اتنا ملا کہ سکھ اس جگہ گوردوارہ تعمیر نہ کر سکے صرف چار دیواری کھڑی کی گئی۔ جو اب بھی ہے۔ فرق ہے تو اتنا کہ ۱۴ اگست ۴۷ء تک پولیس کا سکھ سپاہی پہرا دیتا تھا اب مسلمان سپاہی اس کے دروازے پر پاسبانی کرتا ہے۔ بعض اوقات سیاسی مصلحتیں بھی کیسا کیسا دردناک منظر دکھاتی ہیں۔

سنا ہے لاہور میں مسجد کا ایک حادثہ اس سے پہلے بھی ہوا تھا وہی مسجد جو ایک رات میں تعمیر ہوئی تھی اور جس پر اقبال نے یہ شعر کہا تھا

مسجد تو بنا لی شب بھر میں ایماں کی حرارت والوں نے
من اپنا پرانا پاپی ہے برسوں میں نمازی بن سکا

اقبال جس کے نام کے ساتھ اہل لاہور کے دل دھڑکتے تھے اور میرا دل کہتا ہے بالکل یہی صورت حال پورے برصغیر کے مسلمانوں کی ہو گی۔ قوم پرست مسلمانوں میں شاید ایک مجلس احرار اسلام تھی جو نظریاتی اختلاف رکھنے کے باوجود اقبال کی مخالفت نہ کرتی تھی اور یہ بات میں اس خیال سے بھی کہہ رہا ہوں کہ میں نے اکثر احرار کے جلسوں میں اقبال کے شعر سنے تھے۔

مسجد شہید گنج کے دردناک حادثے نے مجلس احرار اسلام کی کمر توڑ دی تھی حتیٰ کہ سید عطاء اللہ شاہ بخاری حسن خطابت و قرأت کلام پاک میں یکتائے روزگار ہونے کے باوجود اس کی ساکھ دوبارہ قائم کرنے میں ناکام ہوتے جا رہے تھے۔ اگرچہ شاہ جی کی تقریر سننے والوں سے دلی دروازے کا باغ اب بھی پر ہو جایا کرتا تھا مگر سامعین میں وہ جوش و خروش ٹھنڈا پڑتا جا رہا تھا جو شاہ جی کی تقریر سے مخصوص تھا خود انہیں اس بات کا احساس ہو چلا تھا۔ چنانچہ مجھے یاد ہے کہ ایک رات انہوں نے اپنی تقریر کے اختتام کے قریب پہنچتے پہنچتے اپنے مخصوص طنزیہ انداز میں کہا تھا مجھے معلوم ہے لاہور والو! تم جو یہاں جمع ہوئے تو صرف میری تقریر سے لطف حاصل کرنے کی غرض سے ورنہ دل تمہارے یہاں نہیں ہوتے۔۔۔۔ اس کے باوجود میں اس صورت حال سے بے نیاز ہوں اس لئے کہ سننے والا سن رہا ہے اور جاننے والا جانتا ہے کہ

انہیں کے مطلب کی کہہ رہا ہوں زبان میری ہے بات انکی
انہیں کی محفل سجا رہا ہوں چراغ میرا ہے رات ان کی

معلوم نہیں یہ اس شعر کی تاثیر تھی جس کے خالق کا پتہ مجھے آج تک نہیں چل سکا یا شاہ جی کے احساس شکست کے اعتراف کا کرب تھا کہ کسی نے مجھے اندر سے جھنجھوڑ دیا۔ اور مجھے ایک سنگین دیوار میں رخنے پڑتے محسوس ہونے لگے۔ تقریر ختم ہوئی مگر میرے دل کی بہت سی کھڑکیاں کھل گئیں۔ آندھیاں تیز ہوتی جا رہی تھیں۔ میرے سینے میں سجی ہوئی ہر چیز فرش پر گر رہی تھی۔ پھر مجھے محسوس ہونے لگا کہ سورج غروب ہو رہا ہے جھٹ پٹا پھیلتا جا رہا ہے۔ اور میں جلسہ گاہ سے اٹھ کر معلوم نہیں کیسے گھر آیا۔ تھوڑی دیر میں صبح ہو گئی۔ صبح کی پہلی کرن ہر قسم کے ظاہری اور باطنی اندھیرے کی شدت کو کم کر دیتی ہے۔ میں جو کسی نامعلوم اداسی تلے دبا جا رہا تھا۔ پھر زندگی کی بھیڑ میں گم ہوتا گیا۔ مگر شاہ جی نے جس بجھے ہوئے لہجے میں یہ شعر پڑھا وہ میری رگوں میں یوں اتر گیا تھا کہ آج تک نکل نہیں سکا۔ کئی دن وقفے وقفے سے یہ شعر میری زبان پر بے ارادہ جاری ہوتا رہا۔ کبھی تحت اللفظ اور کبھی ترنم سے۔

انہیں کے مطلب کی بات کہہ رہا ہوں زبان میری ہے بات انکی
انہیں کی محفل سجا رہا ہوں چراغ میرا ہے رات ان کی

وہ مرتے دم تک احرار میں شامل رہے

نصر اللہ خان

عالم با عمل، درویش خدا مست، بے باک، نڈر، ادائیں قلندرانہ، جلال سکندرانہ، بارعب چہرہ، رنگ سپید سرخی مائل، آنکھوں میں جلال، چہرے پر جمال، لانبا قد، دہرا بدن، سر پر پٹے، گھنی داڑھی، بالوں پر (کسی زمانہ میں) مہندی لگاتے تھے۔ ان کی آواز میں بجلی کی کڑک اور بادلوں کی گرج تھی۔ لمبا کھدر کا کرتا، پاؤں میں چپل ------ یہ تھے عطا اللہ شاہ بخاری جن کے بارے میں مولانا ظفر علی خان نے یہ شعر کہا تھا۔

کانوں میں گونجتے ہیں بخاری کے زمزمے
بلبل چہک رہا ہے ریاض رسول میں

آدھی عمر جیل میں گزار دی۔ فرنگی حکومت ان کے نام سے کانپ جاتی۔ جس شہر میں جاتے نوبت پر چوٹ پڑتی۔ اور نقارچی یہ اعلان کرتا کہ آج فلاں مسجد یا فلاں باغ میں امیر شریعت حضرت مولانا سید عطاء اللہ شاہ بخاری تقریر کریں گے تو لوگ جوق در جوق جلسہ گاہ میں اس طرح پہنچتے جیسے عید کی نماز پڑھنے جا رہے ہیں۔ کیا بچے کیا جوان، کیا بوڑھے اور کیا عورتیں تاحد نظر مخلوق خدا نظر آتی۔ شاہ جی نماز عشاء کے بعد اپنی تقریر شروع کرتے۔ لاؤڈ سپیکر اور مائیکروفون کا رواج نہیں تھا۔ اس زمانے میں مقرروں کے گلے میں لاؤڈ سپیکر ہوتا تھا۔ ان کی آواز ایک محلے سے دوسرے محلے میں پہنچتی تھی۔ اور شاہ جی کی آواز تو میلوں پہنچتی۔ شاہ جی نہ جانے کیا سحر کرتے کہ جب وہ بولتے تو لوگوں کو سانپ سونگھ جاتا۔ کسی کو پہلو بدلنے کا موقع نہ ملتا۔ لب بند ہو جاتے۔ ہنسانے پر آتے تو مجمع کشت زعفران بن جاتا۔ اور رلانے پر آتے تو خود بھی روتے اور دوسروں کو بھی رلاتے۔ گریبان آنسوؤں سے بھیگ جاتے اور جب صبح کی اذان ہوتی تو لوگوں کو معلوم ہوتا کہ وقت کہاں سے کہاں پہنچ گیا ہے۔

شاہ جی نے اگرچہ ساری زندگی پنجاب میں گزاری تھی۔ لیکن جب وہ تقریر کرتے تو ان کی زبان سے یہ معلوم نہیں ہوتا تھا کہ وہ کہاں کے ہیں۔ البتہ جب وہ تقریر کرتے کرتے پنجابی بولنے لگتے تو یہ معلوم ہوتا کہ وہ پنجابی ہیں۔ تلاوت اس طرح کرتے کہ جسم کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے۔ یوں لگتا کہ جیسے خود قرآن بول رہا ہے۔ جب مثنوی مولوی ترنم سے پڑھتے تو لوگوں کو وجد آجاتا۔ بات یہ ہے کہ ہر بات ان کے دل کی گہرائی سے نکلتی تھی۔ تقریر کے دوران کبھی کبھی لطیفے بھی سناتے شاہ جی کا ہاتھ مجمع کی نبض پر رہتا جب وہ یہ دیکھتے کہ بات ذرا لمبی ہو رہی ہے تو وہ ہنسانے لگتے اور پھر اپنی بات پر آجاتے۔ فن خطابت تو شاہ جی پر ختم ہو گیا۔ ان کا حافظہ ایسا تھا کہ اردو فارسی، اور عربی کے ہزاروں اشعار انہیں یاد تھے۔ وہ اپنی تقریروں میں سیاست کے ایسے نکتے اور ایسے پہلو نکالتے کہ لوگ حیران رہ جاتے۔

اس زمانے میں بھی سیاست دانوں نے بہت کھایا کمایا تھا۔ لیکن شاہ جی کی حالت تھی کہ کپڑوں کو

ایک جوڑا دھوتے اور دوسرا پہنتے۔ وہ اپنے سارے کام اپنے ہاتھ سے کرتے۔ سردی کے موسم میں میں نے انہیں اپنی گدڑی سیتے دیکھا ہے۔ وہ بڑے دیانت دار تھے وہ جو کہتے کر دکھاتے۔ ان لوگوں کے پاس نہ پستول تھا اور نہ بندوق تھی۔ ان کے ہتھیار ان کی سچائی تھی۔ ان کا کردار تھا۔ اور ان کی پرتاثیر زبان تھی۔ وہ اپنی تقریروں سے توپوں کے منہ کیل دیتے۔ ساری زندگی جیل میں کاٹی مسجد شہید گنج کے انہدام سے شاہ جی اور مولانا ظفر علی خان میں اَن بَن ہو گئی تھی۔ دونوں ایک دوسرے پر حملے کرتے لیکن ایک دوسرے کا احترام بھی کرتے۔ شاہ جی کے بارے میں جہاں مولانا ظفر علی خان نے یہ کہا تھا کہ

کانوں میں گونجتے ہیں بخاری کے زمزمے
بلبل چہک رہا ہے ریاض رسول میں!

تو جب شہید گنج کا مسئلہ کھڑا ہوا اور مولانا احرار کے خلاف ہو گئے تو مولانا نے شاہ جی کے بارے میں یہ بھی فرمایا۔

اک طفل پری رو کی شریعت فگنی نے
کل رات نکالا مرے تقویٰ کا دوالا

ایک مرتبہ میرے گھر کے سامنے شاہ جی تقریر کرنے کی غرض سے آئے۔ جلسے کے منتظمین نے مجھ سے کہا کہ شاہ جی تقریر کرنے سے پہلے تمہارے یہاں آکر بیٹھیں گے۔ میں نے کہا کہ شاید اس بات پر مولانا ظفر علی خان صاحب مجھ سے خفا ہو جائیں۔ لوگوں نے یہ بات شاہ جی کو بتائی تو وہ ہنس کر خاموش ہو گئے لیکن جب اس بات کا علم مولانا ظفر علی خان کو ہوا تو وہ بہت خفا ہوئے اور کہا کہ شاہ جی تمہارے لئے قابل احترام ہیں۔ ویسے میں بھی ان کا احترام کرتا ہوں۔ اب تم جاؤ اور شاہ جی سے معافی مانگو اور جب میں شاہ جی کی خدمت میں حاضر ہوا اور ان سے معافی مانگنے لگا تو میری آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔ شاہ جی نے میرے سر پر ہاتھ رکھا۔ اور میرے لئے دعا کی۔ اور فرمایا میں تم سے خفا نہیں ہوں ایسی باتیں تو ہوتی ہی رہتی ہیں۔

شاہ جی کی من موہنی شخصیت جب بھی یاد آتی ہے تو اس کے ساتھ ساتھ جوش کا یہ شعر بھی یاد آجاتا ہے۔

ابھرے تو آندھی بپھرے تو طوفان
چٹکے تو غنچہ، لرزے تو شبنم

میں شاہ جی کا نیاز مند تھا۔ اکثر ان کی صحبت میں اٹھنے بیٹھنے کا موقع ملتا۔ اور ان کی بذلہ سنجی اور حاضر جوابی سے لطف اندوز ہوتا اور پھر جب کبھی ہمارے یہاں شب دیگ کا اہتمام ہوتا تو میں شاہ جی کو اپنے ساتھ لے آتا۔ کبھی کبھی شاہ جی بھی ہمیں بلوا لیتے۔ شاہ جی بہت خوش خوراک تھے۔

شاہ جی کی آدھی سے زیادہ زندگی جیلوں میں کٹی۔ وہ جس تحریک میں شامل ہو جاتے تو بڑی دلجمعی سے اس کے لئے کام کرتے۔ وہ پارٹیاں نہیں بدلا کرتے تھے۔ بلکہ اپنی پارٹی کو ڈھب پر لے آتے تھے۔ احراری

ہونے کی وجہ سے ان کی بڑی مخالفت ہوئی لیکن شاہ جی مرتے دم تک احرار میں شامل رہے۔ شاہ جی میں استقلال بھی تھا اور استقامت بھی۔ وہ مصلحتوں کے آدمی نہیں تھے۔ وہ بڑے صاف سچے اور کھرے انسان تھے۔ اور ایمان کی بات یہ ہے کہ وہ مسلمانوں کے دل کی دھڑکن بھی تھے۔ اور آڑے وقت میں انکا سب سے مضبوط اور قابل اعتماد سہارا بھی تھے۔ وہ خطیب تھے۔ ادیب نہیں تھے۔ لیکن جب وہ تقریر کرتے تو یوں لگتا کہ جیسے ادب اور شاعری انکی شخصیت اور خطابت میں گھل مل گئی ہے۔ دم تقریر بڑے بڑے ادیب اور شاعر ان کا منہ دیکھتے رہ جاتے۔

اللہ تعالیٰ شاہ جی کی روح پر اپنی رحمتیں نازل فرمائے۔ (آمین) ہم بھی کیسے بد نصیب اور احسان فراموش ہیں کہ اتنے بڑے جادو بیان اور سرفروش خطیب کو بھلا بیٹھے جس کی ساری زندگی قوم کی خاطر بڑی سے بڑی قربانی دینے میں کٹ گئی۔ مولانا ظفر علی خان اور شاہ جی کا آخری زمانہ قابلِ عبرت ہے۔ مولانا تو مفلوج ہو گئے تھے لیکن شاہ جی کو گردو پیش کے حالات اور قوم کی بے حسی نے مفلوج کر دیا تھا۔

جیسے خورشید کوئی اس کے گریبان میں ہے

جس کے ایمان کی گرمی مرے ایمان میں ہے
اس کو اللہ سلامت رکھے ملتان میں ہے

دیکھ کر اس کا خلوص اس کی محبت اے دوست
تو کہے ہاں ابھی انسانیت انسان میں ہے

اس کی آنکھوں سے ٹپکتا ہے حمیت کا خمار
اس کا دل ڈوبا ہوا نشۂ عرفان میں ہے

کتنی تاریک فضاؤں کو اجالے بخشے
جیسے خورشید کوئی اس کے گریبان میں ہے

اس کو باطل کے مقابل میں ہمیشہ دیکھا
پرچمِ حق کو سنبھالے ہوئے میدان میں ہے

میرا دعویٰ ہے کہ اس دور میں اس جیسا خطیب
نہ عرب میں ہے نہ ترکی میں نہ ایران میں ہے

وہ کھویا ہوا لاچار آج ضعیفی کے سبب
ورنہ پھر کشتیٔ قوم اک نئے طوفان میں ہے

کم نظر کو نظر آسکتا نہیں اس کا مقام
دیدہ ور کہتے ہیں کہ وہ منزل ایقان میں ہے

امین گیلانی

کی اشاعت یقیناً "احرار" کی بقاء کی زندہ علامت ہے

آئیے : حضرت امیرِ شریعتؒ کے مشن کی تکمیل کے لئے

دشمنانِ خدا، دشمنانِ رسول اور دشمنانِ ازواج واصحابِ رسول

کے خلاف اپنی جدوجہد تیز کریں۔

—: اور :—

مجلسِ احرارِ اسلام میں شامل ہو کر اِس

خالص دینی محاذ کو مضبوط کریں۔

میاں محمد اویس : صدر مجلسِ احرارِ اسلام، لاہور

تحریر: ملک نصر اللہ خان عزیز

بطلِ حریت

۱۹۲۵ء سے لیکر ۱۹۴۵ء تک میرا اور شاہ جی کا سیاسی مسلک ایک ہی تھا میں نے ان کے ساتھ سفر بھی کیا ہے حضر میں بھی شامل رہا ہوں ان کی تقریریں بھی سنی ہیں۔ ان کی کشت زعفران محفلوں میں بھی بیٹھا ہوں ان سے مسائل میں اتفاق بھی کیا ہے اور اختلاف بھی کانفرنسوں میں ان کی خطابت کے جوہر بھی دیکھے ہیں اور نجی مجلسوں میں ان سے معاملات پر گفتگو بھی ہوئی اس لحاظ سے مجھے حق پہنچتا ہے کہ میں ان کے متعلق اپنی معلومات احاطۂ تحریر میں لاؤں

پھر التفات دل دوستاں رہے نہ رہے

میں نے شاہ صاحب کو پہلی مرتبہ اس وقت دیکھا جبکہ ۱۹۲۵ء میں ترک موالات کرکے میں لائلپور سے گجرات آزاد مسلم ہائی سکول میں سیکنڈ ماسٹر بن کر گیا حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن کے انتقال کی خبر سے ہندوستان کے اسلامی حلقوں پر غم و اندوہ کی تاریک گھٹا چھائی ہوئی تھی اور دعائے مغفرت کے لئے آزاد مسلم ہائی سکول کی عمارت کے قریب ایک پرانی ویران مسجد میں ایک اجتماع منعقد ہو رہا تھا میں شاہ صاحب سے متعارف نہیں تھا میں نے دیکھا کہ جب لوگ قرآن مجید کی تلاوت کر چکے تو ایک مولوی صاحب جن کے سر پر کھدر کی کلپاک تھی جو اس زمانے میں مرحوم علی برادران وضع کی تقلید میں عام طور پر خلافتی کارکن پہنتے تھے موٹے کھدر کے کپڑے کندھے پر شربتی رنگ کی چادر چھوٹی سی داڑھی، عمر ہوگی کوئی تیس برس کی منبر پر چڑھے اور نہایت پرسوز لہجے میں خطبہ مسنونہ پڑھ کر ایک انداز خاص سے قرآن مجید کی تلاوت کرکے حضرت شیخ الہند کے فضائل و خدمات اسلامی کا تذکرہ کیا اور ایصال ثواب کی یہ مجلس برخواست ہوگئی۔ میں نے دریافت کیا یہ کون صاحب ہیں؟

جواب ملا سید عطاء اللہ شاہ بخاری ہیں۔

میں نے شاہ صاحب کا نام اس سے پیشتر سن رکھا تھا کیونکہ انہیں کی کوششوں سے آزاد مسلم ہائی سکول قائم ہوا تھا۔ انہوں نے اپنی آتش نفس خطابت سے زندہ دلان گجرات کے دلوں میں ایثار و عمل کی آگ لگادی تھی۔ طلباء سکولوں سے نکل نکل کر آگئے تھے اور عورتوں نے اپنی بالیاں کانوں سے اتار اتار کر دے دی تھیں اور اس طرح ہائی سکول قائم ہوگیا تھا۔ ان کی تقریروں کی بڑی دھوم تھی، اس کے بعد گجرات میں شاہ صاحب کی تقریروں کو سننے کا بارہا اتفاق ہوا۔ یہاں تک کہ کچھ دنوں کے بعد ان کی گرفتاری عمل میں آئی اور وہ غالباً تین برس کے لئے جیل بھیج دیئے گئے۔ گجرات میں ان کی خطابت کی اتنی تاثیر تھی کہ ضلع گجرات کے حکام ان کو گرفتار کرنے کی ذمہ داری لینے کے لئے تیار نہ ہوئے۔ اور وہ ایک دوسرے ضلع کی تقریر پر گرفتار کرلئے گئے، جب وہ جیل سے نکلے تو ہوا کا رخ پلٹ چکا تھا۔ آزادئ حریت کی تحریک کی ندی اتر چکی تھی۔ ہندوؤں مسلمانوں کے فسادات شروع ہوچکے تھے۔ انگریز کے اقبال کا سحر اپنا کام کرچکا تھا اور طائران قفس اپنے جال کے حلقے خود بن رہے تھے۔ اس عالم میں بڑوں بڑوں کے قدم ڈگمگا گئے تھے۔ ہندوؤں میں کتنے ہی لیڈر ایسے تھے جن کو انگریزی غلامی سے زیادہ مسلمانوں کے غلبے کا غم کھانے لگا تھا

اور مسلمانوں میں کتنے ہی رہنما تھے جو ملک کی آزادی سے زیادہ ضروری مساجد کے سامنے باجہ بجانے سے روکنے کو ترجیح دیتے تھے۔ انگریزی حکومت مطمئن ہوچکی تھی عالم اسلام کی مصیبت پر آنسو بہانے کا دور ختم ہوچکا تھا مگر سید عطاء اللہ شاہ بخاری صاحب ان مردانِ عزیمت میں سے تھے جن کے پائے استقلال کو لغزش نہیں ہوتی تھی ان کی توجہ اب بھی انگریزی اقتدار کی طرف تھی۔ لیکن اس توجہ میں بعض ضمنی ملی مسائل بھی شامل ہوگئے تھے۔ میں ۱۹۲۴ء میں پنجاب سے نکل کر اخبار مدینہ بجنور کی ادارت سے وابستہ ہوکر یو۔ پی چلا گیا۔ اور شاہ صاحب کی تقریروں کو سننے کا موقع ایک مدت تک نہ ملا۔ یہاں تک کہ ایک روز میں نے سنا کہ شاہ صاحب نگینہ تقریر کے لئے تشریف لائے ہیں۔ بجنور کے دوستوں نے فرمائش کی کہ شاہ صاحب کو بجنور لایا جائے۔ ان کو دعوت دینے کی ذمہ داری مجھ پر ڈالی گئی۔ شاہ صاحب خوشی سے اس زحمت کو گوارا کرنے کے لئے تیار ہوگئے اور ہم نے ایک مدت کے بعد پھر ان کی خطابت کے جوہر دیکھے۔

اس کے علاوہ شاہ صاحب سے ان کانفرنسوں میں ملاقات ہوتی رہی جو دہلی، لکھنو وغیرہ میں ہوتی رہتی تھیں ان مواقع پر کم ہی بولتے تھے۔

شاہ صاحب ان لوگوں میں سے ہیں جو اپنی حدود کو خوب سمجھتے تھے۔ اور ہر مسئلہ میں گفتگو کرنے کو شانِ قیادت کا لازمہ۔ مگر شاہ صاحب اس قسم کی غلط فہمی میں کبھی مبتلا نہیں ہوئے۔

وہ اپنا ایک اصولی مسلک طے کرلیتے اور طے کردہ مسلک پر اعتماد کرتے ہوئے اس پر عمل پیرا ہوجاتے۔

اپنی خداداد خطابت کو اس کی پیش رفت میں استعمال کرتے۔ ان کا مقام تبلیغ اور دعوت عمل کا ہے۔

غور فکر اور فیصلہ کرنا ان کے رفقاء کا کام ہے۔ جن کو ان کے نزدیک خدا نے اسکی صلاحیت بخشی ہے۔ جب ان کی جماعت کسی مسئلہ کا فیصلہ کرلیتی ہے تو پھر وہ اس کی تبلیغ کے لئے خود کو ہمہ تن وقف کردیتے اور اس معاملہ میں اس کے دریا کے طبع کی روانی کو نہ کوئی خطرہ روک سکتا اور نہ مصائب تکلیف کی چٹانیں اس راہ پر حائل ہوسکتی تھیں ہمیشہ جہاد کی صف اول میں رہتے تھے۔ اور تحریک کی پہلی زد کو اپنے سینے پر سہتے تھے چنانچہ ملک کی کوئی ایسی قومی، ملکی، ملی تحریک نہیں اٹھی جس میں انہوں نے قید و بند کو لبیک نہ کہا ہو۔

مذہب

جو مذہب انسان کے دل کو گداز نہیں کرتا وہ مذہب نہیں سیاست ہے۔ اور مجھے ایسی سیاست سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ

سید عطاء اللہ شاہ بخاری اور میں

شریف کنجاہی

یہ غالباً ۱۹۳۵ء کی بات ہے۔ کنجاہ کی ایک اس دور کی علاقے کے حوالے سے معروف دینی، سیاسی اور سماجی شخصیت مولوی محمد عبد اللہ سلیمانی صاحب نے کنجاہ میں انجمن اسلامیہ کے زیر اہتمام ایک دو روزہ اجتماع کا اہتمام کیا تھا۔ اجتماع کے دو مقاصد تھے۔ ایک یہ کہ اس کے ذریعے گرد و نواح کے لوگوں کو انجمن کے تعلیمی اور دینی نصب العین سے آگاہ کیا جائے جس نے کنجاہ میں ڈسٹرکٹ بورڈ مڈل سکول کے بند ہو جانے پر اس عمارت کو ننانوے سال کے لئے پٹے پر لے کر اس میں اسلامیہ سکول کا آغاز کر دیا تھا اور دوسرے یہ کہ اس سکول کے اخراجات پورے کرنے کے لئے علاقے کے صاحب ثروت لوگوں کو بالخصوص اور عام مسلمانوں کو بالعموم اس ادارے کی مالی امداد کے لئے آمادہ کیا جائے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب شاہ جی مرحوم بلاشبہ پنجاب کی مقبول ترین سیاسی، سماجی اور مذہبی شخصیت کے طور پر اُبھر چکے تھے اور جہاں بھی جاتے ان کی شیریں بیانی اور اثر آفرینی مردوں عورتوں کو ایک دوسرے سے بڑھ کر مالی ایثار پر اکساتی رہتی تھی۔ کنجاہ میں شاہ جی کو اس نیک مقصد کے لئے بلایا گیا تھا۔ اور یوں میرے مقدروں میں ان کی زیارت ہی نہیں تھی ان سے وابستگی بھی تھی کہ ایسے اجتماعوں میں مقامی نوخیز و تک بازوں کو ہی موقعہ دیا جاتا تھا اور ان میں ہی ایک میں بھی تھا۔

شاہ جی اگرچہ مولوی صاحب ہی کے مہمان تھے لیکن گجرات کے ایک اس سکول کے ٹیچر سید غلام عباس جیلانی کی خواہش پر شاہ جی نے ان کے پاس ٹھہرنا قبول کر لیا۔ عباس صاحب سے میرے مراسم تھے اور یوں وہ دونوں دن میں نے بھی شاہ جی کے قریب گزارے۔ اور انہوں نے مجھے مشورہ دیا کہ کسی سے اصلاح لیا کروں۔ بلکہ خود ہی حفیظ جالندھری صاحب کی طرف تعارفی رقعہ لکھ دیا جس کا حفیظ صاحب نے پورا پورا احترام کیا۔

اس مختصر سے قیام کنجاہ میں بعض باتوں نے مجھے خاص طور پر متاثر کیا۔ ان کا عباس صاحب کے سادہ سے ڈیرے میں قیام پر آمادہ ہو جانا ان کے عوام دوست ہونے کا مظہر تھا۔ اور ان کا کہنا تھا کہ اسلام کی حقیقی روح یہی ہے کہ عالموں سیاست دانوں اور معاشرتی اصلاح کرنے والوں کے درمیان وہ دیوار یا پردہ حائل نہ ہو جس سے دونوں میں دوری کا امکان ہو۔ میں نے شاہ جی کو اس پر عمل کرتے ہوئے دیکھا۔ انہوں نے عباس صاحب کو کسی قسم کے پُر تکلف کھانے کے اہتمام سے منع کر دیا تھا۔ ان کا لباس بھی اس قدر سادہ تھا جس قدر ان کا مزاج۔ ان میں شگفتہ مزاجی بھی تھی اور ان کی محفل میں آدمی بور نہیں ہوتا تھا۔

شاہ جی کا شعری ذوق بھی خوب تھا۔ اور فارسی سے میری دلچسپی کا اندازہ لگا کر مجھے ابھی تک یاد ہے کہ انہوں نے مجھے یہ دو شعر اپنے مخصوص انداز میں سنائے بھی اور سمجھائے بھی۔

حلالم باد مستی ہا مبارک سینہ چاکی ہا
قدح بیمودہ و گل در گریباں کردہ می آید
حزیں امشب نگاہی رہزنی می خانہ پردازش
زمستی تکیہ بر جانب بسر گان کردہ می آید

اسی طرح انہوں نے فرمایا کہ مجھے غالب کا یہ شعر بہت پسند ہے۔

حیف کہ من بخوں تپم وزتو سخن رود کہ تو
اشک بدیدہ بشری نالہ بسینہ بنگری

اور مجھے یاد ہے کہ میں نے شاہ جی کو اسی وزن و بحر میں ایک غزل ارسال کی تھی جو کچھ یوں تھی۔

اے کہ تری نگاہ سے ذرے بھی مہر خاوری
لغزش پائے شوق ہے برق کی نور گستری
جب کہ تری تجلیاں ساقی بزم طور ہوں
رند کولن ترانیاں درس حدیث می خوری

ان دنوں میں فارسی میں بھی طبع آزمائی کرنے لگا تھا اور جب ایک فارسی غزل شاہ جی کو ارسال کی تو انہوں نے مجھے مشورہ دیا کہ میں ایک ہی زبان کو ذریعہ اظہار بناؤں۔ لیکن ایسے مشورے عمر کے ایک حصے میں شعری رجحان رکھنے والوں کو بعض اوقات "راس نہیں آتے" حالانکہ وہ صائب اور مفید ہوتے ہیں۔

میں کئی بار شاہ جی کے پاس امرتسر گیا۔ اور ان کے رہن سہن کو وہاں بھی اسی قدر سادہ پایا جس قدر میں نے کنجاہ میں پایا تھا۔ اور جب ان کی مجلس احرار، شہید گنج کے ملبے تلے دب گئی اور شاہ جی بھی اس سے بچ نہ سکے اس وقت میں نے ان سے دو ایک بار ملنے کا شرف حاصل کیا۔ اب وہ رب اھد قومی انہ لا یعلمون (۱) کی تصویر خاموش تھے۔ اور پھر جلد ہی برصغیر کی تقسیم ہو گئی۔ شاہ جی واہگہ پار کر کے آ گئے اور جاننے والے جانتے ہیں کہ انہوں نے کیا کھویا اور کیا پایا۔ ان کی اولاد کا ماضی و حال سب کے سامنے ہے۔ اور ان خواہر زادوں کا بھی جو گجرات میں مقیم ہیں۔ انہوں نے نہ ان کے اخلاف نے سودا بازی کی۔ اور یہ وہ روایت تھی۔ جو پاکستان بننے سے پہلے لیڈروں کا طرہ امتیاز ہوتی تھی۔ اس دور کے کسی لیڈر پر زراندوزی کا الزام نہیں لگایا جا سکتا کہ ان کی زندگیاں لوگوں کے سامنے ہیں۔ ان کا رہن سہن لوگوں کے سامنے تھا۔ وہ اپنے عقائد میں پکے ہوتے تھے۔ صرف ایک لیڈر نے پارٹی بدلی تھی اور اسے "لوٹا" کہا جانے لگا تھا۔ (۲) کاش آج ایسے صاحب کردار لوگوں کے اختلاف فکری پر ناک چڑھانے والے بلکہ ان کو غدار تک کہہ جانے والے ان کی زندگی کے اس مرکزی رویے سے بھی کچھ سیکھیں۔ کہ وہ لوگ کتنے لاطمع تھے۔

مت سہل ہمیں جانو پھرتا ہے فلک برسوں
تب خاک کے پردے سے انسان نکلتا ہے

---

(۱) اے اللہ میری قوم کو ہدایت دے کہ وہ نہیں جانتے (میں کون ہوں) نبی کریم علیہ السلام نے طائف کے جاگیرداروں کے مظالم کے موقع پر یہ دعاء ارشاد فرمائی۔

(۲) ڈاکٹر محمد عالم جو پارٹیاں بدلنے میں اپنا ثانی نہیں رکھتے تھے۔

کون انکار کر سکتا ہے؟

"احرار کی یادیں" پروفیسر محمد سلیم میر

صحافتی حلقوں میں پروفیسر صاحب کا نام محتاج تعارف نہیں۔ وہ "نوائے وقت" میں ادارتی شذرات اور "سرراہے" لکھتے ہیں۔
پروفیسر صاحب ضلع گجرات کے قصبے جلال پور جٹاں میں ۱۹۲۵ء میں پیدا ہوئے۔ جہاں ان کے بزرگ کشمیر سے مہاجر ہو کر آن بسے تھے۔ قیام پاکستان کے وقت ان کی عمر ۲۵ سال تھی۔ یوں آزادی کے سفر کی بہت سی یادیں ان کے حافظے کا حصہ ہو گئیں۔ ہفت روزہ "زندگی" لاہور (۲۴ تا ۳۰ نومبر ۹۰ء) میں جناب خالد ہمایوں نے انکی بہت سی یادیں محفوظ کر دی تھیں۔ ان کی گفتگو کا ایک اہم اقتباس پیش خدمت ہے۔ (ذوالکفل)

اس وقت مسلمانوں میں سیاسی شعور برائے نام تھا۔ یہاں کوئی منظم تحریک نہ تھی۔ البتہ مجلس احرار اسلام مسلمانوں کے درمیانے طبقے کی ایک جماعت تھی۔ اسے ایثار پیشہ کارکن میسر تھے۔

تحریک کشمیر (۱۹۳۱ء) میں مجلس احرار اسلام کا کردار ہماری تاریخ آزادی کا نہایت روشن باب ہے۔ ہمارے قصبے میں تحریک کشمیر کا بہت بڑا کیمپ تھا۔ سیالکوٹ کیطرح یہاں سے بھی مسلمانوں کے جتھے گرفتاریاں دینے کے لئے کشمیر کی طرف جاتے تھے۔ پنجابی شاعروں کی گرما دینے والی شاعری نے سینوں میں جہاد کا جذبہ بیدار کر دیا تھا۔ گلی گلی میں یہ گیت گونجتا تھا "چلو بھائیو کشمیر، جنت ملدی اے" ہمارے ایک مقامی شاعر محمد شریف شعلہ واقعی شعلہ بیان تھے۔ ان کی نظموں میں یہ تاثیر تھی۔ وہ سٹیج پر نمودار ہوتے توسامعین کے چہرے تمتما اٹھتے۔

احرار کے سربراہ حضرت سید عطاء اللہ شاہ بخاری بھی گجرات کے رہنے والے تھے۔ ادھر ان کے ددھیال تھے۔ وہ اکثر جلال پور آتے تھے۔ اس دور میں مجھے ان کی پرجوش تقریریں سننے کا بارہا اتفاق ہوا۔ شاہ جی واقعی برصغیر کے بے مثل خطیب تھے۔ ایک دفعہ مجھے ان کے ساتھ سفر کرنے کا بھی اتفاق ہوا۔ یہ ۱۹۴۳ء کی بات ہے۔ میں فوج میں بھرتی ہونے کے لئے ایبٹ آباد جارہا تھا۔ گجرات سے ریل کے انٹر کلاس ڈبے میں سوار ہوا تو کیا دیکھتا ہوں کہ شاہ جی ہجوم عاشقاں میں گھرے بیٹھے ہیں۔ ہندو، سکھ اور مسلمان تینوں قوموں کے لوگ ان کے ارد گرد جمع تھے اور بات چیت ہو رہی تھی۔ میرا بھی ان سے تعارف ہوا۔ فرمانے لگے "میرا بھی آبائی علاقہ گجرات ہے"۔ شاہ جی ایبٹ آباد جارہے تھے۔ وہاں احرار کی کانفرنس ہو رہی تھی۔ گاڑی کا ڈبہ سواریوں سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ شاہ جی پان سے شغل فرما رہے تھے۔ ان کا سرخ و سپید پرجلال چہرہ آج بھی اسی طرح میری نگاہوں کے سامنے ہے۔ ایبٹ آباد جانے کے لئے حویلیاں اترنا پڑتا تھا۔ میرے ساتھ اس وقت میرے شہر کے ایک دوست صوبیدار غلام حسین بھی تھے۔ شاہ جی نے ہمیں کانفرنس میں شمولیت کی دعوت دی لیکن وقت کی تنگی کے باعث ہم کانفرنس میں شرکت نہ کر سکے۔ لاہور کے دہلی دروازے کے باہر بھی میں نے شاہ جی کے خطابتی معرکے دیکھے ہیں۔ شاہ جی اور ان کی جماعت مسلم لیگ کے ہمنوا نہ بن سکے۔ لیکن آزادی کے لئے ان کی خدمات سے کون انکار کر سکتا ہے؟

خطابت

شبِ برات کا موقعہ تھا کسی نے پوچھا شاہ جی خطابت کیا ہے؟ جواب دیا۔ آتش بازی، احباب کِھلکھلا کے ہنسنے لگے۔

فرمایا:

ہنستے کیوں ہو۔ خطابت آتش بازی نہیں تو اور کیا ہے؟ اس میں پٹاخے، ہوائیاں، مہتابیاں، انار، پھلجھڑیاں سب شامل ہیں۔

خطابت اپنا کوئی موضوع نہیں رکھتی۔ لیکن ہر موضوع کے ابلاغ کا نام ہے۔ خطیب وہی کامیاب ہوتا ہے جو عوام کو ان کی سطح سے اٹھا کر اپنی سطح پر لے آئے۔ خطابت فنونِ لطیفہ کی غیر مرئی آواز کے اجتماعی حسن کا نام ہے۔ چہروں کا حسن آنکھیں چُنتی ہیں۔ آواز کا حسن کانوں سے چُنا جاتا ہے۔

چہروں کا حسن شخصاً متاثر کرتا ہے اور مضطرب رکھتا ہے۔ آواز کا حسن اجتماعاً مسحور و مستعد کرتا ہے۔

فرمایا:۔

تقریر کے لئے اوّل چیز زبان ہے جس میں کلام کرتے ہو۔ اس پر کتنی قدرت حاصل ہے۔ رہا لہجہ تو زبان کے لئے سونے پر سہاگے کی طرح ہے۔

روانی، تقریر کے لئے صیقل ہے اور ذہانت تلوار کی کاٹ ہے۔ ظرافت اس میں اتنی ہو جتنا حسین چہرہ پر تل ہوتا ہے۔ حرکات و سکنات خطیب کی وجاہت کے نشان ہیں۔ ان سے خطابت واضح ہوتی ہے۔

انفرادیت سے متعلق فرمایا:

وہ خطابت کا طُرّہ ہے۔ قدرت ہر خطیب کو ایک بانکپن بخشتی ہے جو اخلاص و محنت سے پروان چڑھتا ہے۔ باقی موضوع، مضمون، دعوت یا پیام کے بغیر تقریر اس کے سوا کچھ نہیں کہ الفاظ کا نحرہ ہے۔

بعض سوالوں کے جواب میں فرمایا:۔

خطابت ابلاغ کی معراج کا نام ہے۔ جس سے دماغوں میں افکار کو راہ ملتی ہے۔ اور دلوں میں تحریک پیدا ہوتی ہے۔ تقریر الفاظ و مطالب کی مینا کاری ہے۔ وعظ عقیدہ کی آبیاری ہے۔

پارلیمانی تقریر افہام و تفہیم کی نمائش ہے۔ مذاکرے یا مباحثے افکار و اذہان کی شطرنج ہیں۔

پبلک سپیکنگ کے متعلق فرمایا:۔

کہ شعلہ و شبنم کا امیختہ ہے اور اس میں وہی لوگ کامیاب ہوتے ہیں جو لوگوں تک پہنچ سکتے ہیں۔ انسانوں کے سر اکٹھے کر کے ان کے قدم ملا دینا خطابت کا منتہا ہے۔

امیرِ شریعت

احمد بشیر مرحوم
ترجمہ: محمد عمر فاروق

من موھنا

میری ۱۹۵۱ء کی لائل پور (فیصل آباد) سے وابستہ یادیں ناقابل فراموش ہیں یہ اس وقت دوبارہ عود کر آئیں جب میں نے لاہور میں سید عطاء اللہ شاہ بخاری کی سالانہ برسی کی ایک تقریب میں شرکت کی، میں روزنامہ امروز کے نوخیز رپورٹر کی حیثیت سے (اس وقت کی) معاصر سیاست کو سمجھتا تھا۔ اور نہ ہی اب سمجھتا ہوں جبکہ میں ایک کہنہ مشق لکھاری بن چکا ہوں۔ لیکن ۱۹۵۱ء میرا یقین و اعتقاد کا دور تھا اور میں پنجاب کے صوبائی انتخابات کے سلسلہ میں مجلس احرار کی ریلی کی رپورٹنگ کیلئے گیا تھا۔

سید عطاء اللہ شاہ بخاری جنہیں پیار سے شاہ جی کہا جاتا ہے نے اپنے رضا کاروں سے خطاب کیا اور انہیں جو نصیحتیں کرنا چاہتے تھے کیں۔ شام کے وقت ہم سب میر عبد القیوم کی رہائش گاہ پر فرش پر بچھی ہوئی چٹائیوں پر کھانا کھانے کے لئے بیٹھے، آلو گوشت اور پلاؤ کے بعد حلوہ سے بھری ہوئی پلیٹیں آئیں اور میرے لئے یہ بات حیران کن تھی کہ جنہیں شاہ جی نے چھوا تک نہیں۔

جب انہوں نے اپنی حلوہ کی ڈش کو چھونے سے انکار کردیا تو میں نے کہا کیونکہ میں اس وقت نابختہ اور ناتجربہ کار رپورٹر تھا "شاہ جی! آپ سید ہیں، مولوی ہیں اور امیر شریعت ہیں اس کے باوجود آپ نے حلوہ سے انکار کیوں کیا ہے" انہوں نے آرام سے جواب دیا کہ "یہ درست ہے میں مولوی ہوں اور سید ہوں لیکن میں اب تمہیں امیر شریعت کا عہدہ تفویض کرتا ہوں، تو اب یہ حلوہ تم کھاؤ"

میں نے کہا "لیکن میں ایک پابند فرائض انسان نہیں ہوں میں بمشکل ہی کبھی نماز پڑھتا ہوں یا روزہ رکھتا ہوں۔ میں امیر شریعت کیسے ہوسکتا ہوں۔ جبکہ امیر شریعت ہر لحاظ سے شریعت کی ہمہ پہلو بالادستی کیلئے کام کرنے کا پابند ہے" شاہ جی کہنے لگے "میں یہ بھی جانتا ہوں کہ تم (BALSHEVIK) بالشیویک ہو"

میں نے قطع کلامی کرتے ہوئے کہا "نہیں شاہ جی! ہر گز نہیں میں اتنا بے نفس نہیں ہوسکتا اور نہ ہی اتنی قربانی کرسکتا ہوں" شاہ جی! نے کہا کہ سماجی نظام کی اصطلاح میں تم وہی چاہتے ہو جو ابوذر غفاری چاہتے تھے۔ اور تمہیں کلمہ پڑھنے پر بھی اعتراض نہیں"۔ "نہیں مجھے کوئی اعتراض نہیں" "اس کا مطلب ہے کہ کافر نہیں بلکہ مسلمان ہو۔ جسے اقرار باللسان کی سعادت نصیب ہے۔ اگر تم بالشیویک (BALSHEVIK) ہو تو مشرک نہیں ہوسکتے۔ جس کا ہم تمام مولوی اور سید شکار ہوسکتے ہیں "حلوہ اٹھاؤ اور میرے امیر شریعت بن جاؤ" میں نے اسے ہنسی سے ٹال دیا۔ اس دوران رضا کار کھانا کھا چکے تھے۔ لیکن ابھی کچھ کھانے میں مصروف تھے۔ بہت کچھ بچ گیا تھا۔ رضا کاروں نے پلیٹیں سمیٹنا شروع کردیں اب شاہ جی! نے زیر لب فرمایا کہ "تمام بچا کھچا ایک پلیٹ میں ڈال دو" جب یہ سب کچھ کیا جاچکا تو شاہ جی نے گرجدار آواز میں کہا کہ "تمام بچا کھچا لے آؤ میں اسے کھاؤں گا۔ میں ایک مولوی ہوں اور یہ نوجوان

بالشیویک (BALSHEVIK) اب امیر شریعت بننے کیلئے تیار نہیں۔ اس لئے میں یہ عہدہ اپنے پاس رکھتا ہوں تم ایک سید کے سامنے سے یہ پلیٹ اٹھانے کی جرأت کیسے کرسکتے ہو۔ جو ایک مولوی بھی ہے۔

ایک دن پھر دہلی دروازہ کے مقابل مجلس احرار کے مرکزی دفتر میں انہیں ملنے گیا یہ ایک سرد ترین رات تھی۔ شاہ جی رضائی میں لپٹے ہوئے ایک چٹائی پر براجمان تھے ان کے مرید اور جانثار تھوڑے فاصلے پر مؤدب بیٹھے تھے۔ جونہی شاہ جی کی نظر مجھ پر پڑی مجھے نزدیک آنے اور اپنے ایک طرف بیٹھنے کے لیے کہا۔ میں ہچکچایا کیونکہ میری جرابیں ناقابل برداشت بدبُو دے رہی تھیں۔ لیکن شاہ جی نے اصرار کیا تو بالآخر مجھے اپنا عذر بتانا پڑا شاہ جی نے جذبات سے مملو ہو کر فرمایا

"تم نوجوان ہو، اور پاکستان کا مستقبل ہو۔ کاش میں تمہارے پاؤں کے پسینہ میں سے اپنی داڑھی تر کرسکتا" آپ کے مریدوں میں رواج تھا کہ وہ تو آپکی عزت کے طور پر آپ کے پاؤں چھوتے تھے۔ اب آپ نے ان سب کو اپنے پاؤں چھونے کے بجائے میرے پاؤں چھونے کا حکم دیا کہ میرا نصب العین معاشرتی انصاف، مساوات اور غیر طبقاتی معاشرہ تھا جو کہ ایک سامراج دشمن آزاد پاکستان میں امیر شریعت کا بھی مقصد حیات تھا۔

شاہ جی ایک عظیم رہنما تھے۔ انہوں نے جوانی کے عالم میں جلیانوالہ باغ کا قتل عام دیکھا تھا۔ اور تحریک خلافت میں سرگرمی سے حصہ لیا تھا۔ مولانا محمد علی جوہر، مولانا ابوالکلام آزاد اور حکیم اجمل خان اور بعد کے سالوں میں مولانا سید داؤد غزنوی، چودھری افضل حق، مولانا احمد علی لاہوری، مولانا ظفر علی خان اور مولانا سید انور شاہ کشمیری کے ساتھ مل کر کام کیا۔ مؤخر الذکر نے انہیں "امیر شریعت" کا خطاب دیا۔ جس کے بعد ہند کے پانچ سو علماء نے ان کی بیعت کی اور غازی علم الدین شہید نے شاہ جی سے ہی متاثر ہو کر رسوائے زمانہ کتاب "رنگیلا رسول" کے ناشر (راجپال) کو جہنم رسید کیا۔ لیکن یہ سب باتیں شاہ جی کے کارناموں کا مکمل احاطہ نہیں کرتیں۔

وہ شہنشاہ خطابت تھے۔ جن کے بارے میں ان کی زندگی میں ہی داستانیں وضع ہوگئیں تھیں۔ لیکن لوگوں کو (ان کے پاس جانے سے) ڈر نہیں لگتا تھا۔ ان کی تعریف میں دشمن بھی رطب اللسان تھے اس کے ساتھ ہی وہ انتہائی وجیہہ شخصیت تھے جو لوگوں سے آنکھیں ملا کر دیکھتے تھے۔ مجلس احرار نے قیام پاکستان سے قبل پاکستان کی مخالفت کی لیکن اب انہوں نےاسے دل و جان سے قبول کرلیا تھا اور اپنی شکست کا کھلم کھلا اعتراف کیا۔ لیکن اب مسلم لیگ کے ہاتھوں جو کچھ ہو رہا تھا اس کے بارے میں وہ متفکر تھے بھانت بھانت کی بولیاں بولی جارہی تھیں۔ کسی نے شاہ جی سے پوچھا "کیا ہوگا اگر بالشیویک (BALSHEVIK) اچانک حملہ کرکے پاکستان پر قبضہ کرلیں۔ کیا آپ کے خیال میں ایسا خطرہ موجود ہے تو شاہ جی نے مدبرانہ جواب دیا کہ

"سوہنیا! بالشیویک باہر سے نہیں آتے بلکہ گندے کپڑے اپنی جوئیں خود پیدا کرتے ہیں"

پھر ملتان میں شاہ جی سے ملاقات ہوئی وہ زندگی سے دستبردار ہوچکے تھے۔ تحریک تحفظ ختم نبوت (بظاہر) ناکام ہوچکی تھی۔ اور قوم نے پہلی مرتبہ مارشل لا کا مزہ چکھا۔

شاہ جی ایک بغلی گلی میں ایک کچے مکان میں رہتے تھے اور ایک چھوٹی سی مسجد میں نماز پڑھتے تھے۔ اخیر کے

دنوں میں بیٹھک میں زیادہ وقت ان سے باتیں کرنے میں صرف ہوتا تھا جو ان سے ملاقات کیلئے آتے تھے۔ وہ اپنے بیٹوں سے بھی نہایت محبت کرتے تھے۔ انہوں نے برطانیہ کی کسی بھی چیز کو قبول کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ وقت بے طرح تبدیل ہو چکا تھا۔ انگریز جا چکے تھے دشمن بظاہر سامنے نہیں تھا۔ انہیں کوئی شرمندگی نہیں تھی۔ وہ اپنی ناکامیوں کے باوجود سر اٹھا کر چلنے والے آدمی تھے مگر زخم خوردہ تھے۔

میں بہادر ہوں مگر ہارے ہوئے لشکر میں ہوں

پھر میں کراچی منتقل ہو گیا اور ان کے ساتھ رابطہ نہ رہ سکا اس طرح کئی برس بیت گئے۔ پھر میں نے سنا کہ شاہ جی کو فالج ہو گیا ہے اور وہ بغیر علاج کے پڑے ہیں میں نے جنرل ایوب خان کو جو اس وقت حکمران تھے ایک سخت خط لکھا۔ (اور انہیں بتایا کہ وہ اگر ملک کے بادشاہ ہیں تو اس لئے کہ سید عطاء اللہ شاہ بخاری جیسے لوگوں نے انگریز کو ہندوستان سے نکلنے پر مجبور کر دیا تھا)

مجھے کسی اثر کی توقع نہ تھی۔ مگر دو ایک دنوں میں ہی صدر ایوب خان کی طرف سے مجھے ایک شائستہ خط ملا شاہ جی نشتر ہسپتال منتقل کر دیئے گئے ہیں۔ اور سرکاری خرچ پر ان کا اعلیٰ سطح پر مناسب علاج ہو رہا ہے[1]

میں جب وہاں گیا تو انہیں بستر مرگ پر دیکھا جب انہوں نے مجھے دیکھا تو ان کی آنکھیں چمک اٹھیں۔ لیکن وہ بول نہیں سکتے تھے۔ جسم تصور سے دیکھئے کہ ایک ایسا آدمی جو پشاور سے مدراس تک سالہا سال تک گرجتا رہا۔ اور جسے طاقتور برطانوی سلطنت بھی خاموش نہ کر سکی۔ اب ایک لفظ تک ادا کرنے سے قاصر تھا۔ آنسو اس کے رخساروں سے ڈھلکے اور داڑھی میں گم ہو گئے۔ غالباً یہی وقت تھا جب اس نے اپنے آپ کو اتنا بے بس محسوس کیا۔

مجھے سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ کیا کروں میں نے احمقانہ باتیں شروع کر دیں مثلاً شاہ جی! ان شاء اللہ آپ بہت جلد ٹھیک ہو جائیں گے۔ شاہ جی ہمیں آپ سے بہت محبت ہے۔ شاہ جی میں ہمیشہ آپ کے بارے میں سوچتا رہتا ہوں وغیرہ۔ وہ اچانک پرسکون ہوئے اور منہ ہی منہ میں ایک لفظ کہا۔ جو مجھے سمجھ نہ آیا کچھ دیر بعد ایک لمحے کیلئے

ان کی آنکھوں میں شرارت آمیز مسکراہٹ نمودار ہوئی ان کے فرزند (حضرت مولانا سید) عطاء المنعم (بخاری مدظلہ) جو ان کے ایک طرف بیٹھے تھے انہوں نے کہا کہ شاہ جی فرما رہے ہیں "جا جھوٹے" آپ میں سے جو لوگ مزاح کا ذوق رکھتے ہیں۔ وہ شاہ جی کے مزاح کا اعلیٰ ظرف کا لطف اٹھا سکتے ہیں۔ وہ ایسی شخصیت تھے جو موت کے منہ میں بھی مسکرا سکتے تھے۔ میں نے انہیں پھر کبھی نہیں دیکھا۔

جب میں شاہ جی کے بارے میں سوچتا ہوں تو سی، آئی، ڈی کے رپورٹر لدھا رام کو بھول نہیں سکتا جو آپ کی نگرانی پر مامور تھا۔ وہ شاہ جی کی تقریر کے نوٹس لیا کرتا تھا اور اس کی رپورٹ متعلقہ ایجنسی کو کارروائی کیلئے بھیجتا تھا یہی بات یہ ہے کہ میں اس واقعہ کے بارے میں زیادہ نہیں جانتا۔ اور مجھے متعلقہ تاریخیں بھی یاد نہیں ہیں لیکن میں جانتا ہوں کہ لدھا رام کو حکم دیا گیا تھا کہ وہ نوٹس میں اس طرح تبدیلی کرے کہ حکومت شاہ جی پر بغاوت کا مقدمہ چلا سکے۔

---

[1] یہ صریحاً جھوٹ ہے شاہ جی نے سرکاری خرچ پر علاج کی پیشکش ٹھکرا دی تھی۔ البتہ جن غیر ملکی دواؤں کے فوری مہیا ہونے میں دشواری پیش آ رہی تھی انہیں شاہ جی کے دوستوں نے سرکاری ذرائع بطور سفارش استعمال کر کے خریدا لیا۔

اور جس کی ممکنہ سزا سزائے موت ہو۔ لدھا رام رضامند ہو گیا۔ لیکن دوسرے دن جب وہ عدالت میں پیش ہوا تو اچانک اپنے بیان سے منحرف ہو گیا اور کہا کہ حقیقت میں اس کا بیان حکم حاکم تھا۔ اور شاہ جی نے وہ کچھ نہیں کہا جس کی رپورٹ اس سے دلوائی گئی تھی سرکاری وکیل انگریز تھا وہ چلایا "لدھا رام تم جانتے ہو کہ کیا کر رہے ہو" لدھا رام نے سکون سے جواب دیا "میں جانتا ہوں"

انگریز وکیل نے کہا "تمہیں اعتماد کو ٹھیس پہنچانے کی سزا ہو سکتی ہے۔ تم اپنی ملازمت گنوا دو گے اور تم جیل بھیج دیئے جاؤ گے۔ تو لدھا رام نے جواب دیا کہ میں یہ بھی جانتا ہوں میں احکامات کی تعمیل کا پورا ارادہ رکھتا تھا۔ لیکن جب میں نے اس شخص کو کٹہرے میں دیکھا تو وہ مجھے رشی لگا۔ ایک ایسا مقدس انسان جس کے چہرے سے شعاعیں پھوٹ رہی تھیں میں اس کے خلاف ایسے گناہ کا مرتکب نہیں ہو سکتا "لدھا رام کو چار سال قید بامشقت کی سزا دی گئی۔

یہ تھا شاہ جی کی ذات کا جادو اور اصول پرستی--------- اور دیانت داری سی، آئی، ڈی کے آدمیوں کی۔

سیّدِ آتش نوا

اک شخص تھا کہ مثلِ خرام صبا ہوا
جیسے چمن میں بلبلِ رنگیں نوا ہوا
اسکی زباں پہ وحدت باری کی گفتگو
اور قلب میں تھا عشق پیمبر رچا ہوا
اقبال نے کہا جسے شمشیر بے نیام
انگریز جس کے خوف سے لرزیدہ پا ہوا
جوہر نے اس کو ساحر اعظم لقب دیا
اس عہد میں جو صاحب صدق و صفا ہوا
"بلبل چہک رہا ہے ریاضِ رسول میں"
ہے خود ظفر علی کی زباں سے ادا ہوا
سنتا ہوں اس کے زور خطابت کی دھوم دھام
اس دیس میں وہ سید آتش نوا ہوا
یونس مرے وطن سے مکینوں کی ہے صدا
سوگند رب کعبہ وہ شیر وفا ہوا

سید محمد یونس بخاری

ایثار راعی

امیر شریعت کی زبانی

ڈیڑھ برس پہلے کی بات ہے مجھ سے امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاری پر ایک مصور فیچر تیار کرنے کو کہا گیا میں رفیق اللہ فوٹو گرافر کو لے کر محلہ ٹبی شیر خاں پہونچا شاہ جی کا پتہ معلوم کیا۔ مسجد کے عقب میں گلی میں ایک کچا سا مکان تھا باہر لیٹر بکس لگا ہوا تھا۔ گلی کی طرف کھلنے والے کمرہ میں شاہ جی موجود تھے۔ وہ ان دنوں بیمار تھے خیر و عافیت پوچھ چکا تو اپنا مدعا بیان کیا۔ شاہ جی بات ٹال گئے، کہا کہ اب زندگی کے آخری سانس گن رہا ہوں اب تو آرام کرنے دو اخبار کے کالم بھرنے کے لئے میرے ماضی کے بخیئے کیوں ادھیڑتے ہو، چند لمحے خاموش رہے پھر کہا ایک بات پوچھوں میں نے کہا ضرور ارشاد فرمایئے کہنے لگے "یہ جو جلّی ہے اس کا بادشاہ شیخ جلی ہوگا" ان دنوں جلّی کی تباہی کے متعلق اخبارات میں خبریں آرہی تھیں۔ شاہ جی نے صبح کا اخبار پڑھا تھا ان کے ذہن میں یہ بات رہ گئی تھی۔ خبروں کی بات چل نکلی تو سمٹ کانفرنس کی ناکامی پر اظہار افسوس کیا کہنے لگے ان کم بختوں سے کوئی کہے کہ زندگی کا علاج کرو تم موت کا سامان لئے پھرتے ہو ان کا اشارہ روس اور امریکہ کی طاقت کی طرف تھا۔ میں نے محسوس کیا کہ شاہ جی میرے پلے کچھ ڈالنے کو تیار نہیں میں نے ایک بار پھر اپنے ڈھب کی بات کہہ دی۔ شاہ جی آپ کب سے اس کرائے کے مکان میں رہ رہے ہیں، فرمانے لگے کہ ۱۹۴۸ء میں یہاں آگیا تھا اب تک یہیں پڑا ہوں، "آپ نے کوئی مکان الاٹ نہیں کرایا آپ کا کلیم تو ہے" انہیں غالباً یاد آگیا۔

مکان اور قبر

آپ مکان الاٹ منٹ کی بات کرتے ہیں خدا جانے قبر کے لئے چند گز زمین بھی ملے گی یا نہیں۔ ایک دفعہ ایک مرکزی وزیر صاحب مجھے ملنے ملتان تشریف لائے انہوں نے بھی فرمایا تھا کہ اگر میں انہیں کہوں تو وہ مجھے مکان الاٹ کروادیں گے ساتھ ہی یہ بھی ارشاد فرما گئے کہ فلاں تاریخ کو فلاں صاحب ملتان سے گذر رہے ہیں ان سے مل لینا میں نے پوچھا پھر شاہ جی آپ نے ان سے ملاقات کی کہا نہیں، میں نے وجہ پوچھی تو فرمایا میرے پاس کالی اچکن اور قراقلی ٹوپی نہیں تھی۔

شاہ جی آپ کو ذیابیطس کی شکایت کب سے ہے؟ جواب دیا یہ مرض جیل میں میرے ساتھ آلگا تھا! ابھی تک سنگت نبھا رہا ہے۔ ان دنوں جب کہ آپ اس قدر بیمار ہیں اور پبلک لائف سے بھی ریٹائر ہو چکے ہیں کبھی دیرینہ رفقاء میں سے کوئی ملنے آیا ہے؟ جواب میں مسکرادیئے، کہا بیٹا جب تک یہ (زبان) بولتی تھی، سارا برصغیر ہندو پاک ارادت مند تھا۔ اس نے بولنا چھوڑ دیا ہے تو کسی کو پتہ ہی نہیں رہا کہ میں کہاں ہوں، ہاں دیرینہ میں سے ایک آدھ کو چھوڑ باقی میرے ہاں آہی جاتے ہیں، پچھلے دنوں ایبٹ آباد سے ایک دیرینہ ملنے والے صاحب تشریف لائے انہوں نے ایبٹ آباد جانے پر اصرار کیا میں نے انکار کر دیا۔ راقم الحروف نے شاہ جی سے کہا آپ

ان کے ہاں چلے جاتے، ایبٹ آباد اچھا صحت افزا مقام ہے ملتان کی گرمی میں آپ کیوں تڑپ رہے ہیں، جواب دیا اب میں عمر کی اس سطح پر آ گیا ہوں کہ دیکھنا چاہتا ہوں کہ کتنے لوگ میرے ہاں آتے ہیں ساری عمر لوگوں کی مہمانی میں گزری ہے۔ اب میزبان بن کر بھی دیکھنا ضروری ہے۔ دیکھا کہ اب شاہ جی کھلنے لگے ہیں چنانچہ میں نے کاغذ پنسل سنبھالی تاکہ یادداشت کے لئے کچھ لکھ لوں شاہ جی نے میری تیاری دیکھی تو خاموش ہو گئے بات روک لی میں نے ایک اور سوال کر دیا جواب میں کہا کہ اخبار والوں سے ڈر لگتا ہے آپ لوگ اکثر واقعات کو مسخ کر دیتے ہیں یا پھر غلط بیان دوسرے سے منسوب کر لیتے ہیں۔ اس ضمن میں مولانا عبدالمجید سالک مرحوم کا ایک واقعہ بھی سنایا، ایک دفعہ سالک مرحوم نے یو۔ پی کے ایک جلسہ کی تقریر میرے نام منسوب کر کے "انقلاب" میں چھاپ دی حالانکہ میں نے یو۔ پی میں کوئی ایسی تقریر نہیں کی تھی، ان سے شکایت کی تو انہوں نے خاطر خواہ جواب نہ دیا۔ میں نے ۲۵ سال تک سالک مرحوم سے بات نہیں کی۔ ایک دن صوفی تبسم مجھے پطرس بخاری مرحوم کے ہاں دعوت پر لے گئے پطرس نے مجھے مدعو کیا تھا اس دعوت میں سالک مرحوم بھی شریک تھے۔ وہاں ہم دونوں کی صلح کرائی گئی۔ سالک نے میری پیٹھ پر ہاتھ مار کر کہا آپ نے میرے یہ پچیس برس تباہ کر کے رکھ دیئے، یہ واقعہ بیان کرتے ہوئے شاہ جی کے چہرے پر غم کی پرچھائیں پھیل گئیں ایک لمبی سانس لی پھر کہا سب یار کہنہ بچھڑتے جاتے ہیں ایک دن میں ان سے جا ملوں گا۔ فرمانے لگے، پطرس کے مکان پر ہم چاروں ساتھی ماضی کے فسانے بیٹھے سناتے رہے نماز کا وقت ہو گیا میں نے پطرس سے کہا آپ سید ہیں۔ قرآن پاک آپ کے گھر میں اترا ہے آپ بھی نماز نہ پڑھیں تو کتنی بری بات ہے پطرس نے یہ سنکر سالک مرحوم کو آواز دی، سالک اٹھو، شاہ جی ہمیں زبردستی جنت میں لے جائیں گے۔

شاہ جی نے سالک مرحوم کا ایک اور واقعہ سنایا۔ فرمانے لگے کہ میں حاجی مولانا بخش سمرو کے مکان پر تھا نماز مغرب کے بعد ورد میں مصروف تھا سالک اور مجید لاہوری وہاں پہنچے۔ سالک نے مجھے وظیفہ پڑھتے دیکھ کر یہ شعر پڑھا

بر زبان تسبیح در دل گاؤ خر
ایں چنیں تسبیح کے دارد اثر

جب ورد سے فارغ ہوا تو کہا میں یقیناً تم دونوں کے خیال میں تھا۔
دن کے گیارہ بج چکے تھے شاہ جی بیٹھے بیٹھے تھک گئے تھے اٹھے اور یہ شعر پڑھا

پرانی صحبتیں یاد آ رہی ہیں
چراغوں کا دھواں دیکھا نہ جائے

اور پھر اندر چلے گئے اس ملاقات کے بعد مجھے شاہ جی سے باتیں کرنے کا چسکا پڑ گیا اب میں تقریباً ہفتے میں ایک آدھ بار ضرور شاہ جی سے ملنے کے لئے ان کی خدمت میں حاضر ہوتا۔ ہر ملاقات میں شاہ جی سے میں نے اخبار کے رپورٹر کی حیثیت سے سوال پوچھے دو چار ملاقاتوں کے بعد میں نے ایک مختصر فیچر لکھ مارا۔ جب وہ فیچر چھپا تو کچھ مخالفوں نے اسے مسخ کر کے نقل کیا۔ اس فیچر میں راقم نے اپنے ان جذبات کا اظہار کیا تھا کہ جس مجاہد اور خطیب

اعظم نے ملک کی آزادی کے لئے اتنی لمبی عمر انگریز کے خلاف جنگ لڑی ہے اور ساتھ ساتھ دین کی خدمت بھی کی ہے وہ کرائے کے مکان میں رہ رہا ہے۔ حکومت اور سوسائٹی نے ان کی خدمات کی قدر نہیں کی۔ شاہ جی ناراض ہوگئے، بہرکیف ان کی ناراضی عارضی تھی ایک دن فرمانے لگے بیٹا میں اپنوں سے ناراض ہوتا ہوں تمہاری نیت پر شک نہیں کرتا، تم نے میرے حق میں اچھا نہیں کیا میں نے دیکھا کہ شاہ جی نے معاف کردیا ہے تو ملاقاتوں کا سلسلہ پھر شروع کردیا ان کے متعلق خود ان کی زبانی اور ان کے ساتھیوں کی زبانی بہت سے واقعات سنے۔

دہلی جیل

ایک دفعہ دہلی جیل میں مولانا ابوالکلام آزاد، شاہ جی، ڈاکٹر آصف اور ڈاکٹر انصاری اکھٹے ہوگئے مولانا ابوالکلام چائے کے بڑے رسیا تھے۔ ایک صبح بڑے اہتمام سے چائے تیار کرکے شاہ جی کو پلائی، شاہ جی چائے پی چکے تو مولانا نے داد طلب نظروں سے شاہ جی سے پوچھا چائے کیسی بنی میرے بھائی! شاہ جی نے کہا ایک کمی رہ گئی۔ مولانا ایسے جھنجھنائے جیسے دماغ پر بجلی گری ہو۔ پوچھا وہ کیا میرے بھائی! شاہ جی نے جواب دیا اس میں دو پتی زعفران بھی ہونی چاہیئے تھی۔ ہاں میرے بھائی آپ تو اضافات کی بات کرتے ہیں اچھا میرے بھائی کل آپ کو مذعفر پلاؤں گا چنانچہ دوسرے روز مولانا نے جیل کے ایک ملازم کو پانچ روپے دے کر زعفران منگوایا اور شاہ جی کو مذعفر پلائی۔

ایک دفعہ شاہ جی مولانا حبیب الرحمن کے ہمراہ مولانا آزاد سے ملنے گئے استفادہ کے لئے چند آیات تفسیر کے لئے پیش کیں۔ مولانا نے اپنے انداز میں ان کی تفسیر بیان کی شاہ جی بہت متاثر ہوئے۔ کہا مولانا خدا آپ کو بہت عمر نصیب کرے۔ مولانا نے کہا نہیں میرے بھائی تھوڑی ہو مگر قرینے کی ہو۔

شاہ جی کے گلے میں ایک عجیب و غریب قسم کا رس تھا جس کا حسن و جذب عام طور پر اس وقت ظاہر ہوتا جب آپ اپنی تقریروں سے پہلے تلاوت قرآن کرتے تھے۔

ایک دفعہ میرٹھ کے جلسہ میں تقریر کر رہے تھے۔ پرشوتم داس صدر کانگریس بھی جلسہ میں موجود تھے۔ انہوں نے کہا شاہ جی تلاوت قرآن پاک کریں وہی آتما پر لنگ ہوتی ہے شاہ جی نے اس جلسہ میں ساڑھے آٹھ گھنٹے تقریر کی صبح قریب آگئی، اور وہ یہ شعر پڑھ کر سٹیج سے اتر آئے۔

اب وصال بہت کم ہے آسماں سے کہو
کہ جوڑ دے کوئی ٹکڑا شب جدائی کا

ایک دفعہ لاہور موچی دروازے کے باہر تقریر کرتے ہوئے کہا میں حکومت سے کہتا ہوں کہ وہ مفلسی اور بیکاری کے مسئلہ کو حل کرے جو حکومتیں اس مسئلہ کو حل نہیں کرتیں۔ یہ مسئلہ ان حکومتوں کو حل کردیتا ہے اس تقریر میں کہا کہ استبداد کی چکی کا دستہ گورے کے ہاتھ میں ہو یا کالے کے ہاتھ میں چکی وہی رہتی اور ہم اس چکی کو توڑ دینا چاہتے ہیں۔ شاہ جی نے جس مسئلہ پر بھی تقریر کی سننے والوں نے اس سے گہرا اثر قبول کیا۔ ۱۹۳۱ء میں مسئلہ میراث پر انہوں نے ملک بھر میں تقریریں کیں۔ جن کا رد عمل یہ ہوا کہ ایک دفعہ آریہ سماج وچھو والی شاہ عالم لاہور میں ہندوؤں کے ایک جلسہ میں کمار یہ وجیہ وتی نے کھڑے ہو کر وراثت کا مطالبہ کردیا۔ ڈی۔ اے۔ وی کالج کے پرنسپل

چھبیل داس جلسہ کے صدر تھے۔ کماریہ وجیہ وتی نے کہا اگر آپ بہنوں کو وراثت میں حصہ نہیں دیں گے تو ہم مسلمان ہوجائیں گی چھبیل داس نے کہا ہمارے لئے مشکل ہے کیونکہ ہم دور دور شادیاں کرتے ہیں۔ کماری وجیہ وتی نے کہا آپ جگر گوشہ کو بیاہ کر دور بھیج دیتے ہیں لیکن زمین کے ٹکڑے انہیں منتقل نہیں کرسکتے۔

۱۹۳۱ء ۱۹۳۲ء میں تحریک کشمیر کے سلسلہ میں شاہ جی نے جس موثر انداز میں کام کیا اس کے بارے میں گول میز کانفرنس میں وزیر ہند نے کہا تھا کہ ہندوستان میں ایک ایسی سحر بیان شخصیت موجود ہے جو بیک وقت دو حکومتوں کو معطل کر کے رکھ دیتی ہے۔

غرضیکہ اس قسم کے متعدد واقعات شاہ جی کی دینی اور سیاسی زندگی کے متعلق سننے میں آئے وہ خود کہا کرتے تھے ایک زمانہ تھا جب میری تقریر سننے عورتیں رات کا کھانا اپنے کنبہ کو کھلا کر اپنا کھانا پنڈال میں ساتھ لاتی تھیں اور پھر صبح واپس ناشتہ تیار کرنے کرنے کیلئے گھروں کو لوٹیں لیکن افسوس اس بات کا ہے کہ شاہ جی کی قدر و منزلت کو ہم نے نہیں پہچانا۔

حافظ لدھیانوی

یادوں کے انمول خزانے

لدھیانہ میں مشنری آباد تھے جو بھنگیوں کے محلے میں جا کر عسائیت کی تبلیغ کرتے۔ ان مشنریوں کو حکومت برطانیہ وافر امداد دیتی تھی۔ تبلیغ کے لئے ان کے پاس خطیر رقم موجود رہتی تھی۔ وہ بے دریغ خرچ کر سکتے تھے۔ مگر ایسا کوئی ادارہ مسلمانوں میں نہ تھا جو اس طرح تبلیغ کا حق ادا کرتا۔

رئیس الاحرار مولانا حبیب الرحمن لدھیانوی کی رہائش عیسائیوں کی آبادی کے سرے پر تھی۔ وہ صاحب بصیرت تھے اور مشنریوں کے انداز تبلیغ اور سرگرمیوں سے واقف تھے اسی سلسلے میں انہوں نے ایک عظیم الشان جلسے کا اہتمام کیا۔ جلسہ یونٹنگ کرسچن ہائی سکول کے کھلے میدان میں ہوا۔ یہ کھیلوں کا وسیع میدان تھا۔ خطیب اعظم امیر شریعت سید عطا اللہ شاہ بخاری کو جلسے سے خطاب کرنے کی دعوت دی گئی۔ شاہ جی کے نام کا اعلان سنتے ہی دور دراز سے لوگ شاہ جی کی تقریر سننے کے لئے آئے۔ حد نظر تک انسانوں کا جم غفیر تھا۔ اس جلسے میں ارد گرد کی آبادی کے عیسائی بھی شامل تھے۔ سکول کے دونوں پرنسپل جی بی لیڈر اور یونٹنگ سٹیج پر موجود تھے۔ یہ دونوں انگریز شستہ اردو بولتے تھے۔ ان کے تلفظ اور لب ولہجہ اور انداز گفتگو سے غیر ملکی ہونے کا اندازہ لگانا مشکل تھا۔ یہ ۱۹۳۸ء کی بات ہے کہ شاہ جی کی جوانی کا زمانہ تھا۔ ان کا زور خطابت بے مثل، ان کا انداز بیان منفرد، انکا موضوع کو حسین پیرائے میں بیان کرنے کا ڈھنگ ہر مقرر سے مختلف تھا۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں زبان و بیان پر قدرت کاملہ عطا فرمائی تھی۔ ہزاروں کے مجمع میں شاہ جی کی آواز کے سوا دوسری آواز سنائی نہ دیتی تھی۔ شاہ جی سٹیج پر تشریف لائے۔ مشتاق نگاہوں نے شاہ جی کا استقبال کیا۔ عطاء اللہ شاہ بخاری زندہ باد کے فلک شگاف نعروں سے فضا گونج اٹھی۔ شاہ جی نے خطبہ مسنونہ شروع کیا۔ سارا مجمع قرآن پاک کی تلاوت اور حسن لحن میں کھو گیا۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں سوز اور آواز کا سحر عطا فرمایا تھا۔ ہر شخص شاہ جی کی تلاوت سے محظوظ ہو رہا تھا۔ خطبۂ مسنونہ کے بعد شاہ جی نے تقریر کا آغاز کیا۔ شاہ جی کی خطابت دلوں کو مسحور اور ذہنوں کو متاثر کر رہی تھی۔ سارا مجمع خاموش تھا۔ سانس تک کی آواز نہ آتی تھی۔ عجیب محویت کا عالم تھا۔ پرنسپل صاحبان حیرت سے شاہ جی کو تک رہے تھے۔ ان کی نظریں شاہ جی کے چہرے پر مرکوز تھیں۔ ان کی خاموش نگاہوں نے تحسین کی صورت اختیار کر لی تھی۔ رات ڈھل رہی تھی۔ شاہ جی کی تقریر جوبن پر آ رہی تھی۔ عیسائی جھوم رہے تھے۔ شاہ جی نے عیسائیت کے اثرات اور اس کے اسباب پر سیر حاصل تبصرہ کیا اور انکی کامیابی کو مسلمانوں کی کمزوری قرار دیا۔ کوئی منظم جماعت نہ تھی۔ جو عیسائیت کی اشاعت اور تبلیغ کے مقابلے میں مؤثر کردار ادا کرتی۔ شاہ جی کی خطابت غیر مسلموں سے بھی داد وصول کر رہی تھی۔ خطابت جب نقطۂ عروج پر پہنچی اور شاہ جی نے ذہنوں کو فکر کی دولت بخشی تو عیسائیوں سے دریافت کیا کہ تم اپنے دلوں کو ٹٹول کر سچی بات کہو۔ کہ تم نے عیسائی مذہب کیوں اختیار کیا۔ فاقہ کشی، غربت اور بیکاری نے تمہیں

عیسائیت قبول کرنے پر مجبور تو نہیں کیا۔ سینکڑوں ہاتھ اٹھ گئے۔ نجانے شاہ جی کی خطابت میں کون سا جادو تھا کہ عیسائی اپنی کمزوری کا کھلم کھلا اعتراف کر رہے تھے۔ عیسائی مبلغین کی برسوں کی ریاضت اور محنت کا طلسم چند لمحوں میں ٹوٹ گیا۔ ہمارے پرنسپل صاحبان کو اس وقت ہوش آیا کہ جس شخص کے حسن خطابت کی ہم داد دے رہے تھے اس نے ہم پر کیسا مہلک وار کیا۔ موقع کی نزاکت کو محسوس کرتے ہوئے جلسے کے اختتام پر انہوں نے شاہ جی سے گرمجوشی کے ساتھ ہاتھ ملایا اور جلسہ گاہ سے رخصت ہو گئے۔

مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی مجلس احرار اسلام ہند کے صدر تھے۔ ان کا مکان ہمارے گھر کے قریب ہی تھا۔ جب کسی بزرگ یا کسی معروف ہستی کی آمد کی خبر ملتی تو میں مولانا کے مکان پر اس کی صحبت سے فیض یاب ہونے کے لئے چلا جاتا یہ محفلیں، یہ مجلسیں زندگی کے حسین ترین لمحات کی یادگاریں ہیں۔ حافظ قرآن ہونے کی وجہ سے مجھے ان کا قرب نصیب ہوا۔ انکی محبت نے مجھے بے تکلف بنا دیا تھا۔ میں کالج سے لوٹا، کتابیں گھر پر رکھیں مولانا موصوف کے دولت کدے پر پہنچ گیا۔ سید عطاء اللہ شاہ بخاری کی آمد کی اطلاع مل چکی تھی۔ ان کے زور خطابت کے قصے سن چکا تھا۔ ان کی صحبت سے فائدہ اٹھانے، ان کو قریب سے دیکھنے کا موقع میسر آیا۔ دن کے چار بجے ہوں گے۔ چائے کا دور چل رہا تھا۔ سید عطاء اللہ شاہ بخاری رحمتہ اللہ علیہ کی جوانی کا زمانہ تھا۔ علمائے کرام میں اللہ تعالیٰ نے امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاری کو جمال کا پیکر، حسین خد و خال کا وجیہہ و شکیل پیکر بنایا تھا۔ آواز میں داؤدی نغمہ تھا جب کلام پاک کی تلاوت کرتے تو غیر مسلم بھی متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکتے تھے۔ ان کی تلاوت روحوں کو سیراب کرتی اور دلوں پر انوار کی بارش کرتی ہوئی معلوم ہوتی۔ میں نے بے تکلفی سے مولانا حبیب الرحمٰن صاحب کے آگے سے چائے کی پیالی اٹھالی۔ شاہ جی نے مجلس کے آداب کے پیش نظر مجھے جلال سے دیکھا۔ میں لرز گیا۔ اتنے میں مولانا نے مسکرا کر میری طرف دیکھا۔ شاہ جی کا جلال یک دم جمال میں بدل گیا۔ قہر آلود نگاہوں میں یک لخت شفقت کی لہر دوڑ گئی۔ سمجھ گئے کہ یہ مولانا کا چہیتا ہے۔ امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاری نور اللہ مرقدہ سے یہ میری پہلی ملاقات تھی۔ یہ ملاقات زندگی بھر کے نیاز مندانہ تعلقات کا پیش خیمہ ثابت ہوئی۔ بارہا شاہ جی کی صحبتوں سے مستفیض ہوا۔ انکی خطابت کے انداز دیکھے۔ ان کی محبت و شفقت کے مختلف زاویئے نظر سے گزرے۔ انکی مجلسی زندگی میرے لئے ادب کا درس تھی۔ شعری ذوق بھی وہیں نکھرا۔

ایک دفعہ شاہ جی تقریر فرما رہے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کو قوت استدلال کا انوکھا انداز عطا فرمایا تھا۔ بات ہندوؤں کی ہو رہی تھی۔ شاہ جی ہندوؤں کی ذہنیت کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار فرما رہے تھے کہ جب ان کو تکلیف پہنچتی ہے تو مسلمانوں کے ہمدرد بن جاتے ہیں۔ انہوں نے فرمایا کہ بچہ جب گود میں ہوتا ہے تو ڈاڑھی کی طرف ہاتھ بڑھاتا ہے۔ میرے بچے نے بھی ڈاڑھی کو زور سے پکڑا اگر جھٹکا دے کر ڈاڑھی چھڑواتا تو بالوں کے ٹوٹ جانے کا خطرہ تھا۔ میں نے ایک ترکیب سوچی میں آہستہ آہستہ اس کے سر کے بال کھینچنے لگا۔ جونہی میں بال کھینچتا جاتا تھا اس کی گرفت ڈھیلی ہوتی جا رہی تھی۔ آخر اس نے ڈاڑھی چھوڑ

دی۔ بالکل اس طرح ہی ہندوؤں کا معاملہ ہے جتنی زور سے آپ انکی بودی کھینچیں گے وہ آپ کی ڈاڑھی چھوڑتا جائے گا ورنہ وہ آپکی ڈاڑھی کا ایک ایک بال کردے گا۔ بات ساری قوت کی ہے۔

تقسیم ہند و پاک کے بعد بھی دہلی دروازہ میں سید عطاء اللہ شاہ بخاری کو تقریر کا جادو جگاتے دیکھا۔ راقم الحروف بھی اس جلسے میں موجود تھا۔ شاہ جی نے واشگاف الفاظ میں کہا ہمارا ایک سیاسی نظریہ تھا قوم نے قبول نہیں کیا۔ پاکستان معرض وجود میں آگیا۔ اب ہم سب کا ملک ہے ہم سب کا وطن ہے۔

آ ملے ہیں سینہ چاکانِ چمن سے سینہ چاک

اس کا دشمن سے دفاع ہمارے ذمہ ہے۔ شاہ جی نے یہ ثابت کردکھایا۔ جب لیاقت علی خان نے دشمن کو مکہ دکھایا تو شاہ جی نے ملکی دفاع کے سلسلے میں کئی تقریریں کیں۔ حب الوطنی کا ثبوت دیا۔ اب ان کے سامنے کوئی سیاسی نظریہ نہ تھا۔ انکا واحد مطمح نظر ردِ قادیانیت تھا۔ تحفظ ناموس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تھا۔

اسکے لئے شاہ جی نے اپنی زندگی وقف کردی۔ اور آخری سانس تک اس دینی محاذ پر ڈٹے رہے۔ اللہ تعالیٰ نے شاہ جی اور ان کے رفقائے کار کی قربانیوں کو قبول کیا اور قادیانیوں کو خارج از اسلام قرار دیا گیا۔

ملتان سے یوں تو بہت سی یادیں وابستہ ہیں مگر وہ یاد جو سرمایہ حیات ہے جس کے نقوش کبھی مدھم نہ ہوں گے، وہ سید عطاء اللہ شاہ بخاری رحمتہ اللہ علیہ کی علمی، ادبی، مذہبی صحبتیں ہیں، پروفیسر بشیر الرحمن ملک ان دنوں ایمرسن کالج میں پروفیسر تھے، ان سے میری دوستی لاہور کے قیام میں ہوئی جب وہ گورنمنٹ کالج لاہور میں لیکچرار تھے، بہت ستھرا شعری ذوق تھا، خوبصورت گفتگو کرتے تھے، مہمان نواز، خلیق دوستوں کو زندگی کا سرمایہ سمجھنے والے تھے۔ پروفیسر بشیر الرحمن ملک کبھی، کبھی میرے ساتھ شاہ جی کی خدمت میں حاضر ہوتے، شاہ جی جس موضوع پر بھی گفتگو کرتے ان کا اپنا انداز، اپنا نقطہ نظر اپنا انداز فکر ہوتا، وہ تقلید جامد کے تو قائل ہی نہ تھے، اللہ تعالیٰ نے انہیں خصوصی صلاحیتوں سے نواز تھا، میں نے اپنی ادبی زندگی میں شاہ جی سے بڑا شعر فہم نہیں دیکھا، وہ شعر کی روح کو سمجھتے تھے شعر کے بارے میں ان کا فیصلہ سند کی حیثیت رکھتا تھا۔ خوبصورت شعر حسن قرأت شاہ جی کی روح کی غذا تھی، شاہ جی کو آپ شعر سنا رہے ہوں ان کے ہونٹوں کی بناوٹ اور آنکھوں کی سجاوٹ شعر کا حسن بتاتی تھی، معیار سے گرا ہوا شعر شاہ جی کی محفل میں بار نہ پاسکتا تھا، ان کو فارسی اور اردو شعراء کے بے شمار اشعار از بر تھے وہ اپنی تقریروں میں ان اشعار کو نگینوں کی طرح جڑ دیتے تھے۔ معلوم ہوتا تھا کہ شاعر نے شعر اسی موقع کے لئے کہا ہے شاہ جی کے شعر پڑھنے کا انداز کوئی نہ اپنا سکا، آواز کی زیر و بم سے اشعار کے معانی واضح ہوتے جاتے تھے، مزید تشریح کی ضرورت نہ رہتی، شعر تقریر کے موضوع کی وضاحت کردیتا۔

میں چھٹی کے روز یا دفتری اوقات کے بعد شاہ جی کی خدمت میں حاضر ہو جاتا، ان کی عالمانہ گفتگو سے میرا دامن علم وادب کے موتیوں سے بھر جاتا،

شعر کی سمجھ، دین کا فہم، گفتگو کا انداز، اخلاق کی تعلیم، محبت کے قرینے، دلداری کے طریقے ان صحبتوں،

کے حاصل ہیں، ایک شخص کو اللہ تعالیٰ نے مجموعہ کمالات و اوصاف بنا دیا تھا، بقول ابوالکلام آزاد ان کے ذہن میں کن کن متضاد علوم نے آشیانہ بنا رکھا تھا۔ ہر ملاقاتی اس چشمہ زلال سے سیراب ہو کر جاتا، ان ملاقاتیوں میں ہر طبقہ، ہر مکتبہ فکر کے لوگ ہوتے، نوجوان طبقہ تو شاہ جی کا عاشق تھا، ان کی شگفتہ مزاجی نے انہیں شاہ جی کے قریب کر دیا تھا کالج کے طلبہ علم وادب کے خزانے سمیٹنے آتے، علماء دینی شغف پورا کرتے، سیاسی لوگوں کو نیازاویہ فکر مل جاتا۔

شاہ جی کی تبلیغ کا انداز دوسرے علمائے کرام سے یکسر مختلف تھا، وہ کفر کے فتوے صادر نہ کرتے وہ حسین انداز سے دینی مسائل سمجھاتے اور تبلیغ کا حق ادا کر دیتے اس ضمن میں ایک دو واقعات ان کی دور بینی، شگفتہ مزاجی کی تصدیق کریں گے۔

اسی طرح ایک دن شاہ جی سے کسی نے تصویر کھنچوانے کے بارے میں سوال کیا شاہ جی نے فرمایا ازروئے شریعت تصویر کھنچوانا جائز نہیں۔ اس نے جواب میں کہا کہ آپ کی تصاویر اخبارات میں شائع ہوتی ہیں اس کا کیا جواز ہے شاہ جی نے اپنی مدافعت میں کوئی بات نہیں کی، شاہ جی اپنی صفائی میں بہت کچھ کہہ سکتے تھے مگر وہی شگفتہ مزاجی کے انداز میں فرمایا تم مجھ سے مسئلہ دریافت کرنے آئے تھے کہ میرے گناہوں کی فہرست تیار کرنے آئے تھے، وہ اس جواب سے بہت نادم ہوا۔

ایک دن قاضی احسان احمد شجاع آبادی میری موجودگی میں شاہ جی سے ملنے آئے، مسلسل بیماری اور نقاہت کی وجہ سے شاہ جی کا حافظہ کافی حد تک متاثر ہو چکا تھا۔ بات یاد نہ رہتی تھی، پریشان ہو جاتے تھے، قاضی صاحب سے مخاطب ہو کر کہنے لگے تمہیں کوئی بات کہنا تھی اب حافظے سے نکل گئی ہے۔ قاضی صاحب نے کہا جو بات کسی کو کہنا ہو وہ ایک ڈائری میں لکھ لیا کریں۔ شاہ جی کی شگفتہ مزاجی عود کر آئی مجھے مخاطب ہو کر کہنے لگے قاضی کو خدا جانے کب سمجھ آئے گی پھر قاضی صاحب کی طرف رخ کر کے کہنے لگے قاضی ڈائری میں لکھنے کے لئے بھی یادداشت کی ضرورت ہے۔

مجھے اساتذہ کے اشعار ازبر تھے۔ جب میں حاضر ہوتا تو مجھ سے متقدمین شعرا کا انتخاب سنتے عموماً شعر پسند فرماتے اگر کوئی شعر بہت پسند ہوتا تو ایک کاپی میں لکھوا لیتے، ایک دن میں نے حیدر دہلوی کا شعر سنایا۔

چمن والوں سے مجھ صحرا نشیں کی بودوباش اچھی
بہار آکر چلی جاتی ہے ویرانی نہیں جاتی

شاہ جی درویش صفت انسان تھے، سادہ زندگی بسر کی، ان کے دل میں ثروت و دولت کی کبھی ہوس پیدا نہیں ہوئی، ہندوستان کا خطیب اعظم کرائے کے مکان میں رہا جس میں برسوں سے قلعی نہیں ہوئی تھی دیواروں سے مٹی گرتی رہتی تھی اس مکان کا فرش اکھڑا ہوا تھا، بیٹھک میں صوفے اور قالین نہ تھے، مگر اس مرد مجاہد، اس متوکل انسان کے لب پر کبھی حرف شکایت نہ آیا۔ شاہ جی مذکورہ بالا شعر مزے لے لے کر پڑھتے اور مصرع ثانی بار بار پڑھتے۔

بہار آ کر چلی جاتی ہے ویرانی نہیں جاتی شاہ جی کا گھر قرون اولیٰ کے بزرگوں کی یاد تازہ کرتا تھا، اس گھر سے تقویٰ کی خوشبو، علم کی مہک فقر کا انداز قناعت کا رنگ اور بے نیازی کی شان نظر آتی تھی۔ بے نیازی کے سلسلے میں ایک واقعہ یاد آ گیا۔

صدر پاکستان سکندر مرزا ملتان آئے، شاہ جی کو پیغام بھیجا کہ انتہائی ممنون ہوں گا اگر آپ ملاقات کے لئے تشریف لائیں، قاصد نے سکندر مرزا کا پیغام دیا، کوئی اور ہوتا تو اپنے لئے اعزاز سمجھتا کہ صدر پاکستان ملاقات کے خواہش مند ہیں مگر شاہ جی کی شان درویشی نے اسے قبول نہ کیا۔ قاصد سے کہا کہ مجھے تو یاد نہیں پڑتا کہ سکندر مرزا سے مجھے کوئی کام ہے وہ اگر ملنا چاہتے ہوں تو فقیر کے دروازے کھلے ہیں علامہ اقبال نے ایسے ہی مرد قلندر کے بارے میں شعر کہا ہوگا۔

نہ تخت وتاج میں نے لشکر وسپاہ میں ہے
جو بات مرد قلندر کی بارگاہ میں ہے

شاہ جی کو دنیا کی ہوس نہ تھی وہ اگر چاہتے تو ہر تقریر میں ہزاروں روپے جمع کر سکتے تھے ٹھاٹھ باٹھ سے زندگی گزار سکتے تھے۔ مگر شاہ جی کو تو ایک ہی لگن تھی کہ ختمی مرتبت صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات گرامی لوگوں تک پہنچائیں عاقبت کے لئے سرمایہ اکٹھا کریں جو دنیا کے زوال پذیر سرمائے سے کہیں ارفع واعلیٰ جو ہمیشہ رہنے والا ہے شاہ جی نے کاذب نبی کی جھوٹی نبوت کے دعوے کے تار وپود بکھیر دیئے، ہزاروں سادہ لوح مسلمانوں کو مرتد ہونے سے بچا لیا اس مشن کے لئے ناموس رسالت کے تحفظ کے لئے ساری زندگی وقف کر دی بڑھاپے تک اس محاذ پر لڑے اللہ تعالیٰ نے مخلصانہ سعی مشکور فرمائی اور اس دجال فریبی اور گستاخ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے فرقے کو خارج از اسلام قرار دے کر شاہ جی کی قبر کو منور کر دیا۔

شاہ جی کی تقریر جلال وجمال کا حسین امتزاج ہوتی شاہ جی کے الفاظ میں شبنم کی لطافت شاخ گل کی لچک ستاروں کی چمک، بلبل کا نغمہ اور بہاروں کا حسن ہوتا تھا۔ اگر شاہ جی کی زبان پر خدا اور اس کے محبوب ﷺ کے باغیوں کی بات ہوتی تو شاہ جی کی تقریر میں بادل کی گرج بجلی کی کڑک سمندر کا خروش شاہوں کا جلال اور مرد مجاہد کی شان ہوتی۔

اس محفل آراء شخص کی زندگی کے آخری ایام عزلت وتنہائی میں گزرے جس کی زندگی جید علماء نامور سیاسی شخصیات ممتاز شعراء مشہور صحافیوں کے درمیان گزری ہو وہ ان صحبتوں سے یک دم محروم ہو جائے تو اس کے دل پر کیا گزرتی ہوگی۔ شاہ جی کی بیماری ان کی تنہائی تھی ایک دن فرمایا کہ میں اس محلے میں زندگی کے دن پورے کر رہا ہوں جہاں مجھے اخبار پڑھ کر سنانے والا بھی کوئی نہیں۔ شاہ جی کے انٹرویو کے لئے صحافیوں کی ایک جماعت آئی خدا جانے اس جماعت کے اصحاب کیا کیا سوالات سوچ کر آئے ہوں گے اور ان کو کیسے کیسے جوابات کی توقع ہوگی ان کا خیال تھا کہ یہ انٹرویو کئی روز جاری رہے گا یہ تاریخ کا ایک اہم انٹرویو ہوگا جس

میں شاہ جی کی سیاسی زندگی مذہبی مجلسی زندگی کے واقعات تحریر کرنے کو ملیں گے۔ ان کو معلوم تھا کہ شاہ جی کا پیکر تو ہزار داستانوں کا مرقع ہے، خطابت کے انہوں نے سینکڑوں معرکے سر کئے، قید و بند کے بے شمار واقعات اس ذات گرامی سے وابستہ ہیں، خدا جانے کیا کیا خیالی تصویریں، تصوراتی دنیا کا نقشہ لے کر آئے ہوں گے شاہ جی سے انٹرویو کے لیے کہا شاہ جی اگر چاہتے تو سینکڑوں اوراق میں زندگی کے حالات قلم بند کرا دیتے جو ان کی سیاسی جدوجہد، تبلیغی مساعی اور ادبی و علمی زندگی کے آئینہ دار ہوتے۔ تین مختصر سے جملوں میں لمبی ساری زندگی کا خلاصہ بیان کر دیا۔ فرمایا ایک تہائی ریل میں کٹ گئی ایک تہائی جیل میں کٹ گئی ایک تہائی جلسہ جلوسوں میں بسر ہو گئی، عطاء اللہ شاہ بخاری ختم ہو گیا، میر کا شعر یاد آ گیا۔

وہ لوگ تو نے ایک ہی شوخی میں کھو دیئے
پیدا کئے تھے چرخ نے جو خاک چھان کے

⁂ ⁂ ⁂

الطاف پرواز مرحوم
سابق ایڈیٹر روزنامہ آزاد لاہور

شاہ جی سے وابستہ کچھ یادیں

حضرت امیرِ شریعت کے صد سالہ یومِ ولادت ۱۹۹۲ء کے موقع پر

محترم الطاف پرواز مرحوم سے میں پہلی اور آخری مرتبہ ستمبر ۱۹۹۲ء میں اسلام آباد میں ان کے گھر پر ملا۔ وہ بہت ہی محبت کرنے والے انسان تھے۔ ذیل کا مضمون انہوں نے میری فرمائش پر تحریر فرمایا مگر اس کی اشاعت سے پہلے آخرت کو سدھار گئے۔ اللہ تعالیٰ اُن کی مغفرت فرمائے (آمین) (کفیل)

کچھ روز پہلے میں بستر پر پڑا "پاکستانیت" کے موضوع پر سوچ رہا تھا۔ اصل میں میرا مقصد یہ ثابت کرنا تھا کہ جو شخص پاکستان کا ہو کر بھی خود کو پٹھان، پنجابی، سندھی، بلوچی اور مقامی یا مہاجر ظاہر کرتا ہے وہ پاکستان کا وفادار نہیں اور یقیناً نہیں ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ پاکستان ایک ملی وحدت کی بناء پر حاصل ہوا۔ اور یہی وحدت لسانی و علاقائی یکجہتی کے ساتھ آئندہ بھی قائم رہ سکتی ہے۔

میں سوچ ہی رہا تھا کہ ٹیلی فون کی گھنٹی بجی ریسیور اٹھایا دوسری جانب ایک عالم دین کی آواز تھی۔ یہ جواں سال عالم دین اور مبلغ اسلام حضرت امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاری رحمتہ اللہ علیہ کے نواسے سید محمد کفیل بخاری کی آواز تھی۔ انہوں نے ناچیز سے ملاقات کی خواہش کی اور میں نے اسے غنیمت جانا کہ ایک طویل مدت کے بعد اس لہو کی خوشبو کو اپنے قریب پاؤں گا جس نے کفر زار ہندوستان میں تحفظ ناموس دین و مذہب کے چراغ روشن رکھے۔ معلوم ہوا کفیل بخاری اور ان کے جلیل القدر خانوادے کے لوگ مجھے اس ناطے سے جانتے ہیں کہ میں نے حضرت امیر شریعت کا قرب پایا اور ان کی باتیں سنی ہیں۔

سید محمد کفیل بخاری نے شاہ جی کی یاد میں یک دینی علمی اور ادبی ماہانہ "نقیب ختم نبوت" کے زیر عنوان ملتان سے جاری کیا ہوا ہے۔ انہوں نے بتایا کہ "نقیب ختم نبوت" کا "بخاری نمبر" ان کے سو سالہ یوم ولادت کے موقع پر زیر ترتیب ہے۔ اور فرمایا کہ میں اپنی یادوں کے حوالے سے کچھ لکھوں تا کہ وہ اس نمبر میں شامل ہو سکے۔

میں بنیادی طور پر ایک صحافی ہوں میں نے اپنے نظریہ دین و سیاست پر قائم رہتے ہوئے ہر اخبار میں مزدوری کی ہے۔ ہمارا زمانہ اصل میں قلم مزدوروں کا زمانہ تھا جن میں ایسے لوگ بھی شامل تھے جو صحافت کی راہ میں بکھرے کانٹے چنتے ہوئے اپنے قدموں سے بہتے لہو کے نشان چھوڑتے گئے۔ آج صحافت ایک صنعت ہے جس میں قدم رکھنے کے لئے بے بہا دولت کی ضرورت ہے کہ یہ دولت کن کن ذرائع سے حاصل ہوتی ہے؟

اس سے کبھی کسی کو کوئی غرض نہیں رہی۔ یعنی کانٹے ہم نے چنے پھول اور پھل سے جھولیاں ہمارے بعد آنے والوں نے بھریں۔ نظریہ دین وسیاست پر قائم رہتے ہوئے ہندو کانگریس اور سناتن دھرمی اخباروں تک میں مجھے کام کرنا پڑا۔

ایسے ہی حالات میں مجھے شورش کاشمیری (مرحوم) کی علالت کے باعث مرحوم شیخ حسام الدین نے سہ روزہ آزاد اخبار میں کام کرنے کی دعوت دی۔ میں اس وقت پنجاب کے وزیر اعلیٰ ملک خضر حیات خاں کے اخبار شہباز میں ابو سعید بزمی مرحوم کے ساتھ نائب مدیر کے طور پر کام کرتا تھا۔ ملک مظفر احسانی یونینسٹ پارٹی کی طرف سے پالیسی کے نگران تھے۔

خضر حیات نے گھٹنے ٹیکے تو پنجاب کی قسمت بدل گئی۔ نہ صرف یہ بلکہ سارے ہندوستان کے مسلمانوں کی تقدیر جاگ اٹھی۔

سب سے پہلے "مجلس احرار اسلام" کے ساتھ رشتۂ مودّت بہم ہوا۔

وہ کچھ ایسے ہی دن تھے جب میں نے دلی دروازہ لاہور کے باہر ایک چوبارے پر مجلس احرار کے ترجمان سہ روزہ "آزاد" کے حلقہ ادارت میں قدم رکھا۔ مجھ سے پہلے وہاں مفکر احرار چودھری افضل حق مرحوم کے بھتیجے چودھری ظہور الحق موجود تھے جو پالیسی کے مطابق اخبار کو دیکھ سکتے تھے۔ ایڈووکیٹ تھے قانونی احتیاطوں کا بھی ملکہ رکھتے تھے۔ لیکن کارکن صحافی نہ تھے۔ اسی لئے مجھے طلب کیا گیا۔ یہاں سب سے پہلے مجھے جس شخص نے کھلے دل کے ساتھ ہنس کر خوش آمدید کہا وہ تھے ماسٹر تاج الدین انصاری

ماسٹر تاج الدین انصاری سے زیادہ مخلص اور بے غرض انسان میں نے آج تک نہیں دیکھا۔ وہ درویشی سے بھی کچھ آگے مقام رکھتے تھے۔ دفتر مجلس احرار ہو یا دفتر اخبار آزاد اس کے تمام انتظامات ماسٹر جی نے لے رکھے تھے۔ جب کوئی مہمان آتا یا کسی دوسرے علاقے سے مجلس کا کوئی کارکن آتا تو اس کی خاطر تواضع کرنا بھی ماسٹر جی ہی کے ذمہ ہوتا۔ تھے تو وہ آفس سیکرٹری لیکن جس طرح وہ مہمانوں کے ساتھ سلوک کرتے ان کی دیکھ بھال کرتے معلوم ہوتا جیسے کوئی ماں اپنے بچوں کا خیال رکھ رہی ہے۔ اسی لئے ہم نے ازراہ تفنن ان کا نام تاج خالہ رکھ دیا تھا۔ وہ اس نام پر برا منانے کی بجائے خوش ہوتے۔

حضرت امیر شریعت نے جب پاکستان کو بحیثیت اپنا وطن تسلیم کرنے کا اعلان کیا تو اگرچہ یہ محض مجلس احرار کا اعلان تھا لیکن برصغیر ہندوستان کے تمام نیشنلسٹ مسلمانوں اور علماء کی صفوں میں کھلبلی مچ گئی۔

مجلس احرار کے مسلم لیگ کے ساتھ تعلقات استوار ہونے کے بعد نہ صرف نیشنلسٹ مسلمان بلکہ تمام دیوبندی علماء بھی پاکستان کی مخالفت سے باز آ گئے تھے۔ اور یہ صرف حضرت امیر شریعت کے جرأت مندانہ اقدام کا نتیجہ تھا۔ بے شک اس میں مجلس احرار کے مربی و محسن رہنما شیخ حسام الدین، قاضی احسان احمد شجاع آبادی، غازی عبدالرحمن اور ماسٹر تاج الدین کے مشورے بھی شامل تھے لیکن اختیار تمام تر حضرت شاہ جی کو

دیا گیا تھا۔ اس کے بعد ہندو اخبارات اور ہندو سیاست پر بھی سناٹا چھا گیا تھا۔

مجلس احرار کے جس اجلاس میں قبلہ بخاری صاحب نے مسلم لیگ سے ہر قسم کے اختلافات ختم کرنے اور پاکستان کو بطور وطن عزیز قبول کرنے کا اعلان کیا اس میں ڈاکٹر ایم ڈی تاثیر بھی شریک ہوئے انہوں نے سٹیج پر ہی مجھے خبردار کیا کہ تیار ہو جاؤ حضرت امیر شریعت کی باری آنے والی ہے۔ انہوں نے فرمایا ہے کہ میری تقریر سے پہلے الطاف پرواز نظم پڑھیں گے۔ یہ خبر میرے اوسان پر بجلی بن کر گری میں اب تک دلی دروازہ، موچی دروازہ اور شہر کے دوسرے دروازوں میں ہونے والے مسلم لیگ کے جلسوں میں نظمیں پڑھتا آرہا تھا یہ پہلا موقع تھا میں نے سوچا ٹال جاؤں اور سٹیج سے اٹھ کر کھسکنے ہی کو تھا کہ قبلہ شاہ جی کی نظر پڑ گئی۔ آپ نے بہ آواز بلند میرا نام پکار کر کہا ٹھہرو اور میں رک گیا۔ پھر انہوں نے جلسے کی کارروائی کے دوران ہی اعلان فرما دیا کہ حضرات! آج اس اجلاس میں میری تقریر سے پہلے پاکستان کے ممتاز شاعر الطاف پرواز اپنی تازہ نظم سنائیں گے۔ مجھ سے ایک قدم بھی آگے بڑھانے کی جرأت نہ ہوئی۔

میں اس اجلاس میں نظم پڑھنے کی غرض سے نہیں آیا تھا۔ بلکہ نائب مدیر آزاد کی حیثیت سے جلسے کی کارروائی نوٹ کرنے آیا تھا۔ اس لئے خالی ہاتھ تھا۔ لیکن اب تو خود ایک جلیل القدر ہستی نے مجھے حکم دیا تھا۔ ناچار ایک طرف ہو گیا ڈاکٹر تاثیر سے عرض کیا میں کیا لکھوں؟۔۔۔ وہ ہنس دیئے اور کہا اب بھگتو! بہرحال مجھے یاد ہے کہ میں نے وہیں بیٹھ کر ایک طویل نظم "ہمیں پکارو!" کے عنوان سے کہی جو شاہ جی کے خطاب سے پہلے پڑھی بھی۔ اور داد بھی لی۔ (تلاش کرنے کے بعد یہ نظم مل گئی تو "نقیب ختم نبوت" کو بھیج دوں گا) میری یہ نظم جلسے میں بہت پسند کی گئی۔

میری اس نظم کے بعد شاہ جی نے اپنے خطاب میں میری نظم کے کئی مصرعے اور شعر دوہرائے بھی یہ انکے حافظے کا کرشمہ تھا۔ آپ کا ہر خطاب بے تحریر ہوتا ان کی تقریر شہد کی آبشار ہوتی جو سنتا سکتے میں آجاتا۔ ان کا خطاب ساحرانہ ہوتا میری نظم کا یہ مصرعہ تو آپ نے کئی بار پڑھا:

سپہر ہستی کے چاند تارو اگر زیاں کا خطر ہے تم کو! ہمیں پکارو

میں نے اس اجلاس میں نوٹ کیا اس سے پہلے حضرت کو سننے کے لئے ہندو سکھ بھی گھروں کی چھتوں پر بتیاں جلا کر رات رات بھر جاگ کر گزار دیتے تھے۔ لیکن ان میں سے اب بہت ساری چھتوں کی بتیاں بجھ چکی تھیں۔

حضرت امیر شریعت خطابت کے بادشاہ تھے۔ گھنٹوں تقریر کرتے مگر مجال ہے کہ کہیں ایک لفظ پر بھی کبھی ٹھٹکے ہوں آپ اردو پنجابی اور سرائیکی میں نہایت، مرصع تقریر کرتے اور اکثر برمحل شعروں سے اپنے خطاب کو سجاتے۔ آپ اپنے احرار رضا کاروں سے بہت پیار کرتے تھے۔ میں نے جو نظم پڑھی اسے پسند کرنے کا صلہ مجھے یہ ملا کہ آپ نے جلسہ عام میں اٹھ کر مجھے گلے سے لگایا اور میری پیشانی چوم لی۔ اور اگلے روز مجلس احرار اسلام کے "خازن" ماسٹر تاج الدین نے مجھے دس روپے کا ایک نوٹ دیا اور کہا حضرت شاہ جی کی

طرف سے رات کی برمحل نظم کا انعام ہے۔ ان دنوں یہ دس روپے بہت بڑے انعام کے مترادف تھے۔ میں نے انہیں بڑی مدت تک فریم میں لگائے رکھا۔ پھر یہ فریم میری کتابوں اور دوسرے سامان کے ساتھ کہیں کھو گیا۔ اور یہی نہیں میرا تو بہت کچھ کھو گیا نہ ماسٹر تاج الدین انصاری رہے نہ شیخ حسام الدین نہ قاضی احسان احمد شجاع آبادی نہ عبدالرحمٰن غازی اور نہ متاع جلیل حضرت مرشدی سید عطاء اللہ شاہ بخاری اور کتنی ہی درخشندہ یادیں بھی امتدادِ زمانہ کی نذر ہو گئیں۔

لاہور کے شاہی قلعہ کے نئے دروازے کی سیڑھیوں پر بیٹھ کر پاکستان کا پہلا یوم آزادی ہم نے منایا اور پاک فوج کے دستوں نے پرچم ستارہ و ہلال کو سلامی دی۔ پھر اس کے بعد آج تک ہم ایک دوسرے سے نہ مل سکے۔

وقت جاتا ہے تو پھر لوٹ کے کب آتا ہے؟

واقف اسرار شریعت

اور کچھ پھیل گیا حزن والم کا سایا
اور اک دیپ بجھا اور اندھیرا چھایا

دل پہ بجلی سی گری ضبط کا دامن چھوٹا
فلک علم کا تابندہ ستارا ٹوٹا

اور اک عالم دیں بزم جہاں سے اٹھا
اور اک شیریں بیاں اہل بیاں سے اٹھا

اور اک "واقف اسرار شریعت" نہ رہا
اور اک ماہر ارباب سیاست نہ رہا

اک کڑی ٹوٹ گئی جہد کے افسانے کی
اور کچھ تاب گئی زہد کے کاشانے کی

وعظ و تقریر کا بازار بھی اب سرد ہوا
تیرے اٹھنے سے زمانے کا سکوں فرو ہوا

کفیل الرحمٰن نشاط
دیوبند

شاہ جی
یادوں کے آئینے میں

تحریر: عاصی کرنالی

اپنے ملتان آنے سے پہلے میں نے شاہ جی کی زیارت نہیں کی تھی لیکن تشکیلِ پاکستان سے قبل ایک بار کرنال میں شاہ جی کی آمد آمد کا شہرہ ہوا۔ جس علاقے میں انہیں خطاب کرنا تھا وہاں کے ہندو سرِ شام ہی اپنی دکانیں اور کاروباری مراکز بند کر کے اپنے اپنے گھروں میں جا چھپے۔ شاہ جی کی شخصیت کا جلال ان کے دلوں پر طاری تھا۔ نیز یہ خوف کہ وہ آئیں گے اور ہمیں مٹا ڈالیں گے۔

جاء الحق و زهق الباطل

شاہ جی تو کسی وجہ سے نہ آسکے تاہم پہلی بار ان کی شخصیت کی شوکت و عظمت کا نقش میرے دل پر بیٹھ گیا۔ خصوصاً یہ بات کہ ان کی آمد کے محض اعلان کے ساتھ ہی کفرستان میں زلزلہ آجاتا ہے بقول اقبال:

کس کی ہیبت سے صنم سہمے ہوئے رہتے تھے
مُنہ کے بل گر کے ہوا للہ احد کہتے تھے

مجھے ماہ وسال یاد نہیں رہتے۔ اتنا ضرور ہے کہ میں وقتاً فوقتاً ان کی بارگاہ میں حاضر ہوتا رہتا تھا اور میری حیثیت ایک خاموش سامع کی سی ہوتی تھی۔ لب ساکت، نگاہیں فیض یاب جمال، گوش سماعت ان کے فیوض تکلم سے معمور، دل اور روح میں اترتی ہوئی ایک مسلسل روشنی۔ ہر لفظ ایک ستارہ، ہر جملہ ایک چاند، ہر گفتگو کہکشاں کی لڑی، میں ذہن و دل کے دریچے وا کر کے بیٹھتا اور ان کے انوار سے فروزاں ہو کر اٹھتا۔ ان کی خدمت میں ہمہ وقت بہ کثرت لوگ جمع رہتے۔ ان میں ہر مکتبِ فکر کے افراد ہوتے۔ زندگی کے ہر شعبے سے تعلق رکھنے والے مختلف حیثیات و مراتب کے حامل لوگ بلا تفریق و امتیاز روز و شب حاضر رہتے۔ مختلف موضوعات و مسائل پر شاہ جی سیر حاصل اور طمانیت بخش گفتگو کرتے اور حاضرین اس خضرِ وقت سے ایسا آبِ حیات پیتے کہ ان کے سینوں میں مرے ہوئے دل جی اٹھتے۔ اور ان کی خستہ جانیں زندگی کی توانائیوں سے بھر جاتیں۔ وہ ایک جذاب شخصیت تھے۔ ان کی مقناطیسی کشش دنیا بھر کو ان کے درِ فیض پر اور ان کی درگاہ علم و دانش میں کھینچ لیتی۔ لوگ حالتِ نادانی و بے علمی میں آتے اور عالم و فاضل بن کر اٹھتے۔ میری طبیعت کا ہمیشہ سے یہ رنگ ہے کہ میں علماء سے حتی الامکان بچتا ہوں۔ اور ان کی خدمت میں حاضر ہونے سے گریز کرتا ہوں۔ مبادا میرے نام نہاد علم اور میری جہالت کا پول کھل جائے۔ لیکن شاہ جی سے ملتے ہوئے مجھے اور میری جہالت کو کبھی خوف لاحق نہیں ہوا کیونکہ ان کی شفقت کا یہ حال تھا کہ ہم چھوٹے لوگ ان کی صحبت میں خود کو بڑا محسوس کرتے تھے۔ وہ نرم و ملائم لہجے میں ہمیں تعلیم کرتے اور ہماری جہالت اخروٹ کے چھلکے کی طرح ہم سے الگ ہو جاتی۔ اور ہم وہاں سے پرمغز ہو کر رخصت ہوتے ان کی طبیعت میں سب کے لئے اصلاح اور

خیر خواہی کا جذبہ تھا۔ چند جملوں میں دوسروں کے ذہن و دل میں انقلاب برپا کر دینا اور اسے کوچۂ ضلالت سے نکال کر جادۂ ہدایت و سلامتی پر لے آنا انہی کی مہربان شخصیت سے مخصوص تھا۔ وہ متانت اور شگفتہ مزاجی، جلال اور جمال، محبت اور حمیت کا مرقع تھے ان کی صحبت میں روحیں غسلِ نور کرتی تھیں اور دلوں کے میل کچیل صاف ہو جاتے تھے۔ وہ دلوں میں حرم تعمیر کرنے سے پہلے وہاں کے اصنام کو باہر نکالتے تھے۔ بت کدے کو منہدم کر کے حرم کی بنیاد اٹھاتے تھے۔

ایک جانب دل کے بت خانے پہ پڑتی جائے ضرب
ایک جانب کارِ تعمیر حرم ہوتا رہے

یہ حدیث محبوبی ہے۔ دراز سے دراز تر ہوتی جائے گی۔ اس لئے اس سے منعطف ہو کر یادوں کے چراغ روشن کرتا ہوں۔

سواطع الالہام چھپی۔ شاہ جی نے شہر کے شعراء اور دانشوروں کو یاد فرمایا۔ مٹھائی اور مشروبات سے خوب خوب تواضع ہوئی۔ ساتھ ساتھ روحانی اور ادبی غذا بھی عطا ہوتی رہی۔ چلتے وقت کتاب کا ایک ایک نسخہ ہمیں مرحمت فرمایا۔ میری سادہ دلی دیکھئے میں نے اگلے دن کتاب کی قیمت کی رقم منی آرڈر کے ذریعے ارسال کر دی۔ تین چار دن کے بعد منی آرڈر واپس آ گیا۔ ڈاکیے نے لکھا تھا "مرسل الیہ رقم لینے سے انکاری ہے"

چند روز بعد حاضر ہوا برس پڑے۔ جب بارش تھمی تو میں نے عرض کی "شاہ صاحب! چھوٹے اس لئے لغزشیں کرتے رہتے ہیں کہ بڑوں کی رحمت کو جوش میں آنے کے بار بار مواقع میسر ہوتے رہیں"۔ فرمایا۔ "پہلی خطا معاف۔ آئندہ ایسی حرکت نہ کرنا"۔

ایک موقع پر میرے ایک عزیز محمد یونس شاہد جو ایک میڈیکل کمپنی کی ڈائریکٹر تھے کراچی سے ملتان آئے۔ شاہ جی کی زیارت کے مشتاق تھے۔ ہم خدمت میں حاضر ہوئے۔ شاہ جی اپنے مرض "ذیابیطس" کا ذکر فرمانے لگے۔ "شاہی مرض تھا۔ فقیر کے گلے آ پڑا"۔ ڈائریکٹر صاحب نے عرض کی۔ "میں چند مجرب ادویات ارسال خدمت کروں گا۔ آپ استعمال سے پہلے اپنے اطمینان کے لئے متعلقہ لٹریچر بھی پڑھ لیجئے گا"۔ شاہ جی نے فرمایا۔ "میں لٹریچر پڑھ کر کیا کروں گا میں نے آپ کو پڑھ لیا ہے"۔

میں نے ملتان میں السنہ شرقیہ کا ایک تعلیمی ادارہ "دبستان" کے نام سے جاری کیا۔ کئی سال قائم رہا۔ اور بہت سے طالبان علم نے اس سے فیض اٹھایا۔ ایک سال عزیزی عطاء المحسن سلمہ اللہ تعالیٰ بھی داخل ہوئے۔ فاضلِ فارسی کی کلاس میں شریک ہوئے۔ باپ کی ذہانت، ذکاوت، فراست اور لیاقت سے بہرہ یاب تھے کلاس میں ان کے دم سے رونق آ گئی۔ علمی اور ادبی مسائل و مباحث پر بے تکان بولتے تھے رفقائے مکتب ان کے علم پر حیران و ششدر تھے۔ ان کی زبانیں گنگ، دم بخود چھوٹے شاہ جی کو تکتے رہتے اور "آمنا و صدقنا" کے دائرے سے باہر نہ آتے۔ انہی دنوں شاہ جی سے ملنے گیا۔ فرمانے لگے "عطاء المحسن تم سے فارسی سیکھ رہا ہے۔ یہ تمہارا مجھ پر احسان ہے"۔ میں نے غرق ندامت ہوتے ہوئے عرض کی۔ "شاہ جی! اس میں میرا کیا

خرچ ہو رہا ہے۔ آپ ایک دریا ہیں، میں ایک نہر۔ آپ سے پانی لیتا ہوں خود سیراب ہوتا ہوں اور وہی جرعے عطاء المحسن کو پلا دیتا ہوں۔ میرا کام تو سقایت کا ہے۔ ورنہ علم و فضل کی ساری موجیں تو آپ کے دریائے فیض سے بلند ہوتی ہیں"۔ شاہ جی خوش ہوئے دعا دی!

ایک اور واقعے کا ذکر کرتا ہوں جب کہ مجھے اس مرد مومن کو شانِ جلالی اور شانِ جمالی سے بہ یک دم فیض یاب ہونے کا شرف حاصل ہوا۔ میں نے فارسی میں ایک نظم شاہ جی کی تعریف میں کہی۔ "پاک است، افلاک است" کے قوافی و ردیف میں۔

میں حاضر ہوا نظم خوانی کی اجازت چاہی۔ اذن پا کر میں نے اشعار پڑھنے شروع کر دیئے۔ شاہ جی کے چہرے پر ایک رنگ آتا ایک جاتا۔ یہ کیفیت الفاظ میں ظاہر نہیں ہو سکتی۔ جب میں یہ توصیفی نظم پڑھ چکا تو صفتِ جلال کا غلبہ تھا۔ ارشاد فرمایا۔ "اگر مجھے معلوم ہوتا کہ تم میری اتنی مدح سرائی کرو گے تو میں تمہیں پڑھنے ہی نہ دیتا۔ ایسی باتوں سے نفس متکبر ہو جاتا ہے تم چاہتے ہو میں کہیں کا نہ رہوں"۔ میں نے حالتِ شرمندگی میں معافی طلب کی۔ جب اس صفتِ جلال کا غلبہ کم ہوا اور شانِ جمال نے ظہور کیا تو ارشاد فرمایا۔ "اچھی نظم ہے۔ عمدہ مضامین عمدہ اسلوب سے ادا ہوئے ہیں۔ اگر یہ نظم پہلے ہو جاتی تو میں صوفی تبسم کی نظم کے ساتھ ساتھ اس نظم کو بھی شامل کر لیتا۔ پھر اسی ردیف و قوافی پر اپنی نعتیہ نظم ارشاد فرمائی اور مجھے اور حاضرین کو ایک اور ہی عالم میں پہنچا دیا!۔

شاہ جی ہم میں موجود نہیں ہیں لیکن ہمارے وجود کا ذرہ ذرہ اور دل و دماغ کا گوشہ گوشہ ان کی بے مثال شخصیت کی تنویر سے فروزاں ہے۔ انہیں یاد کرتے ہیں اور خلوتِ ذہن و دل میں چراغاں ہو جاتا ہے۔!

ملک ممتاز

امیر شریعت جناح اور پاکستان
نواب افتخار حسین ممدوٹ امیر شریعت کے حضور میں
ایک یادگار ملاقات کی مختصر روداد

انڈیپنڈنٹس ایکٹ ۱۹۴۷ء کے تحت ۵۱-۱۹۵۰ء میں پنجاب میں صوبائی اسمبلی کے انتخابات کے سلسلہ میں ملتان ڈویژن کا دورہ کرنے کے لئے مرحوم حسین شہید سہروردی، مرحوم نواب افتخار حسین خان ممدوٹ، مرحوم میاں عبدالباری، مرحوم چوہدری محمد حسن لدھیانوی، مرحوم محمد عبداللہ خان (چوک گوالمنڈی والے) وغیرہ جب روانہ ہوئے تو مجھے بھی ان کے ہمراہ ملتان جانا پڑا۔ الیکشن پروپیگنڈہ کے لئے ملتان میں مرکزی مقام خاکوانی ہاؤس کچہری روڈ بنایا گیا۔ جہاں سابق چیئرمین میونسپل کارپوریشن نوابزادہ غلام قاسم خاکوانی، نواب صاحب مرحوم کے بہنوئی جناب دوست محمد خاکوانی، حمید اللہ خاکوانی اور نواب عبدالغفور خان خاکوانی نے ہمارے قیام وطعام کا مکمل انتظام کر رکھا تھا۔ جلسے جلوسوں سے پہلے فیصلہ ہوا کہ امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ صاحب بخاری کے حضور حاضری دے کر ان سے دعائیں لی جائیں۔

چنانچہ محلہ ٹبی شیر خان میں ایک کچے بوسیدہ مکان بلکہ درویش کی کٹیا میں مرحوم نواب صاحب، مرحوم عبداللہ خان کے ہمراہ میں بھی شاہ صاحب مرحوم کی کٹیا میں داخل ہوگئے۔ خدا کا شکر ہے کہ اتنے عظیم کردار و گفتار کے مالک، مجاہد امیر شریعت کا کوئی پرائیویٹ سیکرٹری اور اردلی نہیں تھا۔ رہبر شریعت میٹنگ میں مصروف اور نہ غسل خانہ میں تھے۔ کلب گئے ہوئے تھے اور نہ لنچ پر پہنچ چکے تھے یا جانے والے تھے۔ امیر شریعت اپنے "ائرکنڈیشنڈ روم" میں ٹاٹ پر تشریف فرما چند عقیدت مندوں سے مصروف گفتگو تھے۔ ہمیں داخل ہوتے دیکھ کر سب سے پہلے مرحوم خان عبداللہ خان سے بغلگیر ہوتے ہی کہا۔

"لاہور کا شاہی قلعہ تو ہم جیسے لوگوں کی وجہ سے مشہور تھا ہی مگر عبداللہ خان امرتسر کا قلعہ گوبند گڑھ تمہاری نظر بندی کے باعث مشہور ہوگیا"۔ آپ نے مرحوم نواب صاحب کا نام ضرور سنا تھا لیکن ملاقات کبھی نہ ہوئی تھی۔ مرحوم نواب صاحب سے بھی ہاتھ ملایا۔ مجھے دیکھتے ہی کہا۔ "اوئے مخبر کب پاکستان آئے، تم نے تو ہندوستان میں رہنے کو ترجیح دی تھی۔ دیکھ لیا نالالوں اور بنیوں کو۔"

عرض کی! قائد اعظم نے تو کبھی اسلام کو ایکسپلائیٹ نہیں کیا تھا۔ لیکن جب تاج برطانیہ کے خیر خواہوں یا ان کی اولاد کو اسلام کہتے سنا اور یہ سنا کہ پاکستان میں کالی کملی والے کا قانون اور طرز زندگی ہوگی تو دل نے کہا۔ یہ لوگ قطعاً جھوٹ بولتے ہیں۔ جن لوگوں کے گھروں میں فرنگیوں کا طرز زندگی پایا جاتا ہے اور اسلام کہیں دکھائی نہیں دیتا وہ ملک پاکستان میں اسلام اور کالی کملی والے کا قانون اور طرز زندگی کو کیسے رائج کریں گے۔ چنانچہ ہندوستان میں رہنا چاہا لیکن پاکستان آنے پر مجبور ہوگیا۔ اور پھر تو آپ جانتے ہی ہیں کہ ضلع سیالکوٹ تحصیل پسرور کے نوشہرہ گکے زئیاں میں میرے ددھیال ہیں اور امرتسر کوچہ؟ گکے زئیاں میں

میرے ننھیال۔ لہٰذا پاکستان پھر بھی آنا تھا۔ ہندوستان کی حکومت سیکولر، سیکولر کا پروپیگنڈہ تو کرتی ہے مگر ہے خالصتاً ہندو متعصب حکومت۔ الٹ اس کے پاکستان میں ایک اسلامی ملک کا نعرہ لگانے کا زور شور ہے مگر ۔۔۔۔۔ اسلام ؟"

امیر شریعت نے فرمایا" بولو۔ بولو۔ بولتے کیوں نہیں ؟

عرض کی۔ میری خاموشی نے ہی سب کچھ عرض کر دیا مگر آپ نے مخبر کیسے فرما دیا؟

مسکرا کر فرمایا۔۔" ارے ملک ممتاز اخباروں کو خبریں دینے والے کو تم لوگ بے شک انگریزی میں پریس رپورٹر کہو۔ مگر میرے نزدیک اخباروں کو خبریں دینے والا مخبر ہوتا ہے۔ یعنی خبر دینے والا۔

اس پر ہنس کر میں نے قہقہہ لگایا اور ہنس کر کچھ عرض کرنا چاہا عرض کی۔ "ہنستی یا چغلخور" پھر قہقہہ لگا۔

مرحوم نواب صاحب نے سوال کیا۔ پاکستان بن گیا ہے اب پاکستان میں کیا ہونا چاہیئے۔ کوئی ہدایت دیں شاہ صاحب"

امیر شریعت: جن لوگوں نے مسٹر جناح کو قائد اعظم کہا اور مانا۔ اور اپنے قائد اعظم کی ہدایت پر عمل نہیں کیا۔ وہ میری ہدایت پر عمل کیا کریں گے۔ ارے یار جنھوں نے اللہ تعالیٰ کی لاثانی سب سے بڑی کتاب قرآن پاک میں دی گئی ہدایات پر عمل نہیں کیا جنھوں نے رسول پاک ﷺ کے ارشادات گرامی کو تقریروں میں خوب اچھالا مگر خود عمل نہیں کیا۔ وہ اپنے قائد اعظم کی ہدایات اور میری ہدایات پر کیا عمل کریں گے۔ مسٹر جناح اگرچہ اسلامی تعلیمات کے لحاظ سے کوئی عالم فاضل نہیں تھے لیکن پھر بھی وہ جو کہتے یا ہدایت کرتے رہے اگر ان پر ہی عمل کر لیا ہوتا تو پاکستان میں رہنے والے مسلمانوں کا اور خود پاکستان کا یہ حال نہ ہوتا۔ اگر پاکستان کو صحیح معنوں میں اسلامی سلطنت بنا دیا گیا تو یاد رکھو اسلامی سلطنت میں کوئی انسان دکھی نہ ہو گا۔ یہ سلطنت غیور، بہادر، مجاہدوں اور درویشوں کی بستی ہو گی۔ کوئی دشمن اسلام پاکستان کی طرف مشکوک و معیوب آنکھ اٹھانے کی جرأت نہ کر سکے گا۔ اسلامی پاکستان کے اندر مسائل اگر ہوں گے تو خود بخود ختم ہو جائیں گے اور مستقبل میں بھی کوئی پریشان کن مسئلہ پیدا نہ ہو گا۔ مگر ہائے افسوس! جن لوگوں نے فرنگیوں کی غلامی کی زنجیروں کو مضبوط سے مضبوط تر کرنے میں کوئی کسر باقی نہیں رکھی۔ جن لوگوں نے اپنا دل و دماغ، آل اولاد، جسم و جان اور مزارعین تک کو تاج برطانیہ کے پاس فروخت کر دیا اور زیادہ سے زیادہ فوجی بھرتی دے کر تاج برطانیہ کی حفاظت اور خوشی کے لئے مقامات مقدسہ پر بھی گولی چلانے سے دریغ نہ کیا۔ وہ یا ان کی اولاد جن کی اکثریت پاکستان پر مسلط ہے وہ کیسے پاکستان کو ایک مقدس اسلامی سلطنت بننے دے گی ہائے افسوس! ان محسن کشوں کو کون سمجھے یا سمجھائے کہ پاکستان بنانے اور لے کر دینے والے کے جسم سے گوشت تو غائب تھا صرف پوست ہی پوست تھا ہڈیوں کے اس ڈھانچہ کو ہم بے شک مسٹر محمد علی جناح کہتے ہیں لیکن اختلاف رائے رکھنے کے باوجود ان کی دل سے عزت کرتے ہیں۔ ڈاکو لٹیرے نہیں بنے، کرسی اقتدار کے پیچھے نہیں بھاگے لیکن ہڈیوں کے ڈھانچے کو قائد اعظم کہنے والے کتنے بے وفا قاتل نکلے۔ قائد اعظم کہنے والوں نے اپنے

محسن بابا کی آنکھیں بند ہونے کے فوراً بعد ہر صوبہ میں ایک دوسرے کے گریبان پر کس بری طرح سے ہاتھ ڈالا۔ کیسے کیسے بہتان لگائے۔ ان لوگوں نے اپنے محسن کی زندگی ہی میں وہ اودھم مچایا کہ ہڈیوں کا یہ ڈھانچہ کبھی چٹاگانگ اور سہلٹ جاتا ہے کبھی پشاور، بنوں، کوہاٹ، سیالکوٹ، لاہور، کوئٹہ، حیدر آباد، کراچی میں جلسے پر جلسے کر رہا ہے۔ ہر پانچ منٹ کے بعد پانی کا گھونٹ پیتا اور پھر ان خود غرضوں کو سمجھانا شروع کر دیتا کہ پاکستان کو ایک مضبوط خوشحال سلطنت بناؤ مگر افسوس خودغرضوں نے اس کے منہ پر تو سب اچھا کہا مگر کیا وہ جس میں وہ خود غرض کامیاب ہونا چاہتے تھے نتیجہ سامنے ہے۔

عرض کی:۔ پنجاب میں میاں دولتانہ اچھے ہیں یا نواب ممدوٹ؟

امیر شریعت:۔ دونوں اچھے ہیں بشرطیکہ خودغرض نہ ہوں اور اپنے قائد اعظم کی ہدایات پر عمل کریں۔

سوال۔ پنجاب میں جو گڑبڑ جاری ہے یا پاکستان میں ہر مسلم لیگی جو دست و گریبان ہے اس کا ذمہ دار کون ہے؟

امیر شریعت:۔ یہ جھوٹ بولنے والے خوشامدی، جو سچے دکھائی دیں حالانکہ وہ جھوٹے اور خود غرض ہوتے ہیں انہوں نے مسلم لیگی لیڈر شپ کو تباہ کر دیا ہے اور غلط راستہ پر ڈال دیا ہے۔ خدا تاج برطانیہ کے خیر خواہ یا ان کی اولاد سے پاکستان کو محفوظ رکھے جنہوں نے مقدس مقامات پر بھی گولی چلانے سے دریغ نہ کیا اور انگریزوں کی حاکمیت کو سینے سے لگائے رکھا۔ معلوم نہیں یہ اپنی اغراض کی خاطر پاکستان اور پاکستانی عوام کا کیا حشر کریں گے"

میں نے اس وقت ایک ہلکی مسکراہٹ کے ساتھ شرارت کی اور عرض کی" جناب آپ سے ملیئے آپ ہیں نواب افتخار حسین خاں ممدوٹ"

امیر شریعت:۔ اوئے ظالم تم نے کیا کر دیا میرے ہی منہ سے میرے ہی مہمان کے خلاف الفاظ نکلوا دیئے۔

مرحوم نواب صاحب:۔ جناب ہمارے خاندان کے کسی بھی فرد نے ہر گز ہر گز مقامات مقدسہ پر گولی نہیں چلائی۔ ہم بہت زیادہ عرصہ حیدر آباد دکن رہے ہیں وہاں ہم نے مسلمانوں کی بہت خدمت کی۔

امیر شریعت:۔ نواب صاحب۔ آپ کی مسلمانی شرافت اور حب الوطنی کی خوب شہرت سنی ہے اور مجھے یقین بھی ہے۔ اگر نیت نیک ہے تو پاکستان کو ایک مضبوط تر خوشحال اسلامی سلطنت بنانے کے لئے قدم بلا خوف بڑھاتے جاؤ۔ اپنے قائد اعظم کے فرمان پر ہی کم از کم عمل کرنا۔ اگر ہو سکے تو قرآن پاک میں دی گئی ہدایات اور ارشادات رسول مقبول ﷺ پر عمل کرو اور اوروں سے بھی عمل کراؤ۔

خدا یقیناً نیک نیتوں کی مدد کرتا ہے۔ بہتان طرازی سے پرہیز کرنا ورنہ خدا کے آگے جواب دہ ہو گے۔ عزت، ذلت، موت و حیات سب اللہ کے پاس ہے۔ شیطان کو شکست دو اور اللہ کے فوجی بن جاؤ پھر دیکھو کیا ہوتا ہے۔ جھوٹے مزے یا جھوٹے وعدے کرسیٔ اقتدار کے لئے مت کرنا۔ کرسی اقتدار ایک بہت ہی بے وفا محبوبہ ہے۔

میری طرف متوجہ ہو کر "ممتاز" غلط خبریں دیکر ہر گز عوام کو گمراہ نہ کرنا۔ دوسروں کی عزت کی حفاظت کرنا اپنا فرض سمجھو۔ اللہ تمہاری عزت کی حفاظت کرے گا۔"

پروفیسر تاثیر وجدان

زندگی کی ایک موجِ تُند جولاں

زیر نظر مقالہ محترم پروفیسر تاثیر وجدان صاحب نے (ستمبر ۱۹۹۱ء) میں حضرت امیر شریعت کی یاد میں دارِ بنی ہاشم ملتان میں منعقدہ تقریب میں پڑھ کر سنایا۔ (مُدیر)

اہل خیر کی اس مجلس ذکر و فکر میں میری شرکت تو صرف حصول اجر و ثواب کی نیّت سے ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ کسی بڑے انسان کی عظمت کے اعتراف کے لئے خود معترف میں کسی نہ کسی درجے کی عظمت کا ہونا ضروری ہوتا ہے جو مجھ میں نہیں۔ مجھ ناچیز کا مقصد و مدعا شاہ جی مرحوم کی زندگی کے سوانح کی گہری تحقیق نہیں۔ نہ ہی ان کے شخصی اور نجی حالات و واقعات کی پوری پوری تدوین میرا مقصود ہے۔ اور نہ ہی ان کے مجاہدانہ، خطیبانہ اور مصلحانہ اور عارفانہ مقام و مرتبہ کے بارے میں کوئی باقاعدہ اور جامع مقالہ پیش کرنا اس وقت میرا ہدف، ان چند سطور کا منشا تو صرف ۱۸۹۲ء اور ۱۹۶۱ء کے درمیان کی عظیم ۶۷ سالہ زندگی کے سامنے جو پٹنہ سے چلی اور خاک ملتان میں ہمیشہ کے لئے روپوش ہو گئی۔ سر جھکا کر صرف اظہار عقیدت کرنا ہے۔

عقیدتوں کی زبان جذباتی اور تاثراتی ہو جایا کرتی ہے۔ میں بھی اس کمزوری کا شکار ہوں۔ اس لئے میں معذرت خواہ ہوں۔ کہ میری اس جذباتی ژولیدہ بیانی کا خطاب آپ کی تجزیاتی اور استدلالی عقل سے نہیں بلکہ براہ راست آپ کے دل سے ہے۔ کیونکہ یہ طے ہے کہ جس محفل سے میں مخاطب ہوں وہ بنیادی طور پر اہل دل ہی کی محفل ہے۔

خدائے بزرگ و برتر کے جوش رحمت نے اس بسیط و بیکراں کائنات کو پیدا کیا اور اس کے استمرار رحمت نے اس ارضی کائنات میں اولاد آدم کی دائمی و روحانی کفالت اور خبر گیری کے لئے مسلسل انبیائے کرام بھیجے۔ پہلی بات کو قرآن نے رحمانیت کہا اور دوسری کو رحیمیت۔ نبوت مرحلہ در مرحلہ اپنے ارتقاء کے فطری مقسوم کو پورا کرتی ہوئی جب اپنے آخری نقطہ کمال کو پہنچی تو وہ نبوت آخر الزمان کے نام سے موسوم ہو کر حیات و کائنات کے دائرے میں اتری اور اِن ہی رحمتوں کے گراں قدر آب حیات سے تمام معلوم اور نامعلوم دنیاؤں کو ان کی آخری سرحدوں تک سیراب کر گئی۔

اے ترا قدسی ظہور انعام ربِ کائنات
اے پیمبر خلد کا ابرِ کرم تیرا وجود

کون جانے تیری رحمت کی پناہ گاہی کی حد
کیا خبر کن کن جہانوں پر ہے کب سے سایہ گستر
تیری رحمت کی ہمہ گیری کا سچا سائبان
دھوپ میں جلتے سروں کا آخری ملجا و ماویٰ
دکھ سے پتھرائے ہوئے چہروں کا دمساز وانیس
غم شناس و مہرباں آغوش مادر کی طرح

اس انتہائی برتر اور انتہائی برگزیدہ نبوت نے ساری مخلوق میں نوع انسان کی عزت بڑھا دی۔ رب کریم نے ہمیں پھر اپنے کرم سے نوازا۔ اور نبوت آخر الزمان صلی اللہ علیہ وسلم کے چھوڑے ہوئے گراں قدر روحانی ورثے کے محافظ اور اس کے اسوہ حسنہ کی عظیم روایات کے وارث اور امین بھی پیدا کر دیئے۔ جنہوں نے انسانی رُوح کے لہلہاتے چمن زاروں کو تندئ بادِ صرصر سے بچایا۔ ان وارثان نبوت میں مفسرین، محدثین، مجتہدین، مجاہدین، علماء، فقہاء، صلحاء، اتقیاء، اولیاء، حفاظ قرآن اور قاریان کرام وغیرہ شامل رہے۔ غرضیکہ عظیم مقدس اور نہایت ہی قیمتی ہستیوں کا ایک ٹھاٹھیں مارتا دریا تھا۔ جو اسلامی تاریخ کا ایک بہ پور اور جیتا جاگتا تسلسل بن کر کرہ ارض کی زندگی کو اپنے فیض سے سیراب کرتا رہا۔ انسانی روحوں کی آبیاری کرنے والے اسی دجلہ خیر و برکت کی ایک موج تند جولاں کا نام تاریخ نے عطاء اللہ شاہ بخاری رکھا۔ جس نے بڑے بڑے نہنگوں کے نشیمنوں کو تہ و بالا کر کے رکھ دیا۔

اسی دریا سے اُٹھتی ہے موج تند جولاں بھی
نہنگوں کے نشیمن جس سے ہوتے ہیں تہ و بالا

یہ کیسی زندگی تھی جو واقعتہً سرزمین ہند پر ایک موج تند جولاں بن کر ابھری اور پھر اپنے ساتھ متوازی چلنے والے پورے سیاسی، سماجی، اور مذہبی عہد کو ایک نہایت فعال عنصر بن کر دور دور تک متاثر کر گئی۔

اس کی باغیانہ غیرت، اس کی سرفروشانہ جرأت، اس کی قلندرانہ اداء اور اسکے سکندرانہ جلال نے اپنے دور کے مستبد اور ظالم یورپی حکمرانوں اور ان کی کاسہ لیس نوکرشاہی کی راتوں کی نیند حرام کر دی۔ اس نے ناموس رسالت کے ڈاکوؤں کا عمر بھر پیچھا کیا۔ یہ کیسی زندگی تھی جو ٹوٹ جانا اور بکھر جانا جانتی ہی نہ تھی۔ وہ نہ نکبت و ہزیمت سے واقف تھی اور نہ ہی دشمن کے ساتھ کسی مفاہمت یا سمجھوتے کا اس کے ہاں کوئی تصور تھا۔ یہ کیسی زندگی تھی جس نے حق کی نمائندہ بن کر باطل کے ساتھ دائمی ٹکراؤ اور ایک ابدی کشمکش کو اپنا مقدر بنالیا تھا۔ شب و روز مزاحمت اور شب و روز پیش قدمی۔ شر کے ساتھ لحہ لحہ تصادم اور ہر بار چوٹ کھا کر زندہ تر ہو جانے کی ادا اور دشمن سے نپٹنے کی تازہ تر آرزو اور امنگ

آتش زندہ ہیں ہو جاتے ہیں بجھ کر زندہ تر
مر کے جی اٹھنے کا سِرّ ارتقاء رکھتے ہیں ہم

حضور کے منہ مانگے گرامی قدر اور گراں قدر رفیق حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے استقامت کی وضاحت یہ فرمائی تھی کہ آدمی شیر کی طرح جم کر سیدھا چلے، لومڑی کی طرح دائیں بائیں نکلنے کے راستے نہ ڈھونڈے۔ اسی انداز کی بے خوف استقامت اور اسی طرح عمر بھر کے لئے جادۂ حق پر مضبوط اور اٹل گام زنی اور پیش قدمی امیر شریعت کا وہ پرکشش بے باکانہ کردار ہے جسے بے ساختہ گلے لگا لینے کو جی چاہتا ہے۔

آئین جواں مرداں حق گوئی و بے باکی
اللہ کے شیروں کو آتی نہیں روباہی

کھری سچی زندگی کا مفہوم یہی رہا کہ وہ تعذیب کے تجربے سے گزر کر تہذیب حاصل کرے۔ تعذب یعنی عذاب جھیلے بغیر وہ تزکیہ و تہذیب یعنی نکھرنے اور سنور جانے کی انتہائی منزل تک پہنچ ہی نہیں سکتی۔ حضور ﷺ مزکی تھے، صحابہؓ کا تزکیہ نفس صرف اس وقت ممکن ہوا جب مصیبتوں اور دکھوں کی آگ نے ان کی زمانہ جاہلیت کی ہر آلائش کو جلا کر راکھ کر دیا۔ اور انہیں کندن بنا دیا۔

شاہ جی مرحوم بھی برطانوی حکمرانوں کے گوناگوں تشدد کا مسلسل نشانہ بنے۔ پے در پے گرفتاریوں، پے در پے مقدموں، مسلسل قید و بند، مسلسل طوق و سلاسل کی اذیتوں کے مرحلوں سے گزرنے کے علاوہ قاتلانہ حملے ان پر ہوئے، زہر انہیں دیا گیا، قتل میں ملوث کرنے کی پوری سازشیں کی گئیں۔ تقریر کے موقع اور مقام پر پہلے سے فائرنگ کر کے خوف و ہراس پھیلانے کی کوششیں عمل میں لائی گئیں۔ تقریر کے لئے جس راستے سے گزر کر جانا تھا وہاں فرنگی فرمانرواؤں اور ان کے گماشتوں کی طرف سے غنڈے گھات میں بٹھائے گئے۔ تاکہ شاہ جی اور انکے ساتھیوں کو خوف زدہ کیا جا سکے۔ اذیتوں کے ان تمام تجربوں کو شاہ جی نے اپنے لئے تزکیہ باطن اور تہذیب نفس کا ذریعہ بنایا۔ ۲۱-۱۹۲۰ء میں جب ایک پہلے مقدمہ میں مجسٹریٹ کی طرف سے حبس دوام کی سزا متوقع تھی اور سزا صرف تین سال قید بامشقت کی سنائی گئی تو شاہ جی نے مجسٹریٹ کی طرف دیکھتے ہوئے فی البدیہ یہ شعر کہا

دار کے حق دار کو یہ قید سہ سالہ ملے
ہائے مشکل تھی جو آساں ہوتے ہوتے رہ گئی

آگے جیل میں منتقل کرنے کی روداد جانباز مرزا کے اپنے الفاظ میں سنیئے۔

"گاڑی چلنے میں کچھ منٹ باقی تھے کہ پولیس کی بھاری جمعیت کے ساتھ شاہ جی کو اسٹیشن پر لایا گیا۔ پاؤں میں لوہے کی بیڑیاں، ہاتھوں میں ہتھکڑی اس حالت میں یہ مرد درویش جب اسٹیشن کی عمارت میں داخل ہوا تو پتھر بھی آبدیدہ ہو گئے۔ برطانوی سامراج کا مجرم، وطن کا سپاہی، قرآن کا مبلغ آزادیٔ وطن کے جرم میں آہنی زنجیروں میں جکڑا ہوا، قیدیوں کی ویگن میں بیٹھنے کے لئے یہ کہتے ہوئے آگے بڑھا

"عشق اپنے مجرموں کو پابجولاں لے چلا"

یہ عشق کیا تھا؟ شاہ جی کے ہاں عشق، عشق رسالت تھا۔ جس کی آتش سوزاں میں وہ عمر بھر جلے۔

دراصل یہی عشق تھا جس نے ان کی زندگی کو موج تند جولاں بنا دیا تھا۔ یہی سوزِ عشقِ رسالت تھا جس سے انکی تقریریں لبریز ہوتی تھیں۔ اسی عشقِ رسالت کی آگ تھی جس کی وجہ سے وہ کبھی تحریک ختم نبوت، کبھی تحریک احرار، کبھی تحریک خلافت وغیرہ کی سرگرمیوں میں شریک ہو کر ہمیشہ فیصلہ کن کردار ادا کرتے رہے۔ ان کے ہاں عشقِ رسالت اگر نہ ہوتا تو وہ مرزائیت کے خلاف دفاعِ رسالت اور تحفظ نبوت کا عظیم کام کیسے سرانجام دے سکتے تھے؟

شاہ جی مرحوم سنت ابراہیمی کی پیروی میں ساری عمر بتان آذری کو پاش پاش کرتے رہے۔ کیسے کیسے بت تھے جو انہوں نے توڑے۔ فرنگی استعمار اور معاشی استحصال کے بت، قادیانیت اور چکڑالویت کے بت، جاہلی رسوم و رواج کے بت، شرک و بدعات کے بت، ملمع ساز پیران پارسا کی پارسائی کے بت، سیاست کے جعلی سکہ سازوں کے بت، بت شکنی کا یہ سارا عمل انہوں نے لا الٰہ کی تیغ براں سے سرانجام دیا۔ لا الٰہ نے انہیں ہر طاغوتی طاقت سے انکار پر ابھارا، سارے بتوں سے یہ انکار دراصل ایک خدا کی ہستی کے اقرار کے لئے تھا۔ انہوں نے عمر بھر یہ نعرۂ توحید و تکبیر بلند کیا کہ

سروری زیبا فقط اس ذات بے ہمتا کو ہے
حکمراں ہے اک وہی باقی بتان آزری

شاہ جی اپنی شخصیت کے لحاظ سے غیر معمولی انسان تھے۔ سپر مین تھے۔ ان کی مردانہ وجاہت اور شوکت اور انکی آواز کے انتہائی سریلے زیر و بم نے نہ جانے کن کن لوگوں کے اندر چپکے چپکے ان کے لئے احساس پرستش ابھارا ہوا گا۔ ان کی خطیبانہ سحر انگیزی ناقابل مزاحمت اثر کی حامل تھی۔ اور یہ بات بلا خوف تردید کہی جا سکتی ہے کہ ان کی آواز نے معاشرے کے ہر طبقے کے افراد کو متاثر کیا۔ سماج کا نچلہ طبقہ بھی ویسے ہی متاثر ہوا جیسے متوسط اور اعلیٰ طبقہ۔ تینوں طبقوں کے وہ تمام مرد و زن خواہ مسلمان تھے، ہندو تھے، سکھ تھے، یا عیسائی جو بھی بحیثیت سامع ان کی آواز کے غیر معمولی ارتعاش کی زد میں آیا وہ کوشش کے باوجود متاثر اور مسحور ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ بعض اوقات محتسب قوت، ان آہنی سلاسل کو زمین پر پھینک کر شاہ جی کے قدموں پر گر گئی جنہیں وہ شاہ جی کی گرفتاری کے لئے اپنے ہمراہ لائی تھی۔

اس خطیبانہ اثر انگیزی اور فسوں سازی میں پورے ہندوستان میں بہ شمول ابوالکلام آزاد کوئی بھی ان کا ہم پلہ نہیں۔ ابو الکلام آزاد کی خطابت کا دائرہ اثر زیادہ تر پڑھے لکھے لوگوں تک محدود تھا۔ دیہات کے جاہل اور گنوار لوگوں تک تو نہ مولانا مودودی کی رسائی تھی نہ ابوالکلام آزاد کی۔ ان غریب انسانی آبادیوں پر تو صرف امیر شریعت کی تابناک آواز کا پرچم لہراتا تھا۔ شخصی اثرات کی اس گہرائی اور گیرائی کو ناپنے کا ہمارے پاس کوئی پیمانہ نہیں۔ شخصی اثرات کو مقداروں اصطلاحوں یعنی منوں اور سیروں میں تو ظاہر نہیں کیا جا سکتا۔ اثرات کیفیتی ہوتے ہیں نہ کہ کمیتی۔ تو پھر آیئے یہ بات مان لیں کہ جو کام آج تک بعض پوری مذہبی جماعتیں نہیں کر سکیں وہ تنہا شاہ جی مرحوم نے سرانجام دیا۔ کاش ان لامحدود داخلی اثرات کو پوری طرح

خارجی طور پر متحد اور منظم کرنے کا کام بھی سرانجام پاجاتا۔

امیر شریعت رحمتہ اللہ علیہ عظمتوں کا ایک جہان تھے۔ بصیرتوں کی ایک کائنات تھے۔ اس جہان اور کائنات اس کا احاطہ میرے بس میں نہیں۔

شاہ جی کے جذبہ انقلاب اور ان کے ذوق اصلاح دعوت کی کئی جہتیں ہیں۔ لیکن ایک جہت انتہائی بنیادی ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ سرزمین ہند پر فرنگی تسلط و فرمانروائی کو توڑنے کے لئے ان کی باغیانہ آواز نے فضاؤں میں جو تھرتھراٹیں پیدا کیں۔ ان کے اثرات بڑے فیصلہ کن ثابت ہوئے۔ مسلمانان ہند کو آزادی کی نعمت سے ہمکنار کرنے کے لئے انہوں نے نہایت مؤثر کردار ادا کیا۔ شاہ جی ہماری داستان حریت و آزادی کے اہم ہیرو تھے۔

مستقبل کا مؤرخ کوئی ابن بطوطہ، کوئی البیرونی، کوئی ابن خلدون، کوئی بلاذری، کوئی مسعودی، کوئی غلام رسول مہر، کوئی معین الدین ندوی اور کوئی شیخ اکرام الحق۔ گردش روزگار کی کسی سازگار کروٹ کے ساتھ جب بھی جنم لے گا تو وہ یہ طے کرسکے گا کہ شہاب الدین سہروردی، اور بہاء الدین زکریا ملتانی، وجیہہ الدین عراقی، شیخ الاسلام صدر الدین عارف، شاہ رکن عالم رحمہم اللہ تعالیٰ اور ان جیسے تمام عارفان حق سے بننے والی مسلسل اور تابناک زنجیر میں امیر شریعت کا کیا مقام ہے۔ وہ عارف باللہ تھے۔ ایک عارف کی حیثیت سے شاہ جی مرحوم ایسے قطبی ستارہ تھے جنہیں دیکھ کر ان کے عہد کی انسانی نسلیں اپنی سمت سفر کو درست کرتی رہیں۔

شاہ جی زندہ ہیں اور زندہ رہیں گے۔ لہٰذا مستقبل کی اولادِ آدم بھی ان سے اس روحانی استفادہ کو یقیناً جاری رکھے گی۔

رہ وفا میں ترے بعد آنے والوں کو
قدم قدم پہ ملیں گے نشان منزل کے

قطعہ تاریخ وفات

شمعے کہ مدتے بہ جہاں نور می فشاند
آں شمعِ نور پاش زدستِ قضا فسرد
دردِ آشنا مجاہد، و شیوا بیاں خطیب
فردِ عمل بہ ناز حضورِ خدا ببرد
تاریخِ انتقالِ بخاری بگو خلیق
گویند "آہ بلبلِ باغِ نبی بمرد

۱۳۸۱ھ خلیق قریشی

عطاء الحق قاسمی

آنکھیں ترستیاں ہیں!

امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاری کا نام جب بھی میری زبان پر آتا ہے یا کسی دوسری زبان سے میں یہ نام سنتا ہوں تو ان کے کارناموں کا خیال ذہن میں بعد میں آتا ہے پہلے میں اس لذت اور حلاوت سے ہم کنار ہوتا ہوں جو اپنے خاندان کے کسی عزیز ترین فرد کے محبت بھرے تذکرے کی صورت میں دل و دماغ کو محسوس ہوتی ہے انسان کا بچپن اس کی جوانی اور بڑھاپے کا ساتھی ہوتا ہے چنانچہ اس دور کی یادیں ساری عمر اس کے ہاتھ میں ہاتھ دے کر چلتی ہیں۔

میں نے امیر شریعت کو نہ قریب سے دیکھا ہے اور نہ کبھی ان کی تقریر کو سننے کا موقع ملا ہے لیکن میں نے شاہ صاحب کو بہت قریب سے بھی دیکھا ہے اور ان کی بیسیوں تقریریں بھی سنی ہیں میں نے انہیں ۱۹۴۳ء میں پہلی بار دیکھا۔ ۱۹۴۳ء ہی میرا سال پیدائش ہے۔ شاہ صاحب نے مجھے اپنی گود میں اٹھایا اور میری پیشانی کا بوسہ لیا تھا اور پھر ۱۹۴۷ء تک میں ان کے ہاتھوں میں پلا ہوں۔ ان سے ہمارے خاندانی روابط تہہ در تہہ تھے۔ قیام پاکستان سے قبل امرتسر میں ہمارا اور حضرت شاہ صاحب کا گھر ایک ہی محلے میں تھا بلکہ جس گھر میں شاہ صاحب رہتے تھے وہ والد ماجد مولانا بہاء الحق قاسمی نے اپنے لیئے بنایا تھا، شاہ صاحب کو وہ گھر پسند آگیا چنانچہ والد ماجد نے یہ گھر ان کے لئے خالی کر دیا[1] اور اس کے برابر میں دوسرا گھر تعمیر کرلیا، میں تو اس وقت بہت چھوٹا تھا بلکہ قیام پاکستان کے وقت میری عمر صرف چار سال تھی، والد ماجد بتاتے ہیں کہ دو گھروں کے باوجود ہم ایک ہی گھر کے مکین تھے، ہمارے اور شاہ صاحب کے خاندان کے افراد ایک دوسرے کے گھر میں اس طرح داخل ہوتے تھے جیسے اپنے گھر میں داخل ہوا جاتا ہے، شاہ صاحب ہمارے لئے تایا تھے اور والد ماجد شاہ صاحب کی اولاد کے لئے حقیقی چچا کی سی حیثیت رکھتے تھے، اس کے علاوہ ایک رشتہ دوسرا بھی تھا، امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاری میرے دادا حضرت پیر غلام مصطفی قاسمی کے عزیز ترین شاگردوں میں سے تھے جبکہ والد ماجد انگریز استعمار اور اس کے قادیانی ایجنٹوں کے خلاف جدوجہد میں حضرت شاہ جی کو اپنا رہنما تصور کرتے تھے چنانچہ انگریزوں اور قادیانوں کے خلاف جدوجہد کے دوران وہ جلسوں اور جیلوں میں بھی ایک دوسرے کے رفیق رہے بلکہ پاکستان بننے کے بعد جب ۱۹۵۳ء میں تحریک تحفظ ختم نبوت کے دوران والد ماجد کو تشدد کے لئے شاہی قلعے لے جایا گیا تو وہاں تفتیشی افسر نے تین دن کی شدید اذیت کے دورا ان سے کہا کہ اگر وہ یہ بیان دے دیں کہ تحریک میں حصہ انہوں نے شاہ صاحب کے اکسانے پر لیا ہے تو ان کی "جان بخشی" ہو سکتی ہے، اس پر والد ماجد نے حقارت سے اس کی طرف دیکھا اور کہا

تم اس شخص سے یہ بیان لینے کی کوشش کر رہے ہو جس کے نزدیک زندگی اور موت دونوں عطیہ خداوندی ہیں اور تم

---

[1] شاہ جی نے یہ مکان مولانا سے مبلغ 3400 روپے میں خرید کیا تھا۔

شاید یہ بھی نہیں جانتے کہ ختم نبوت کا درس شاہ صاحب نے مجھے نہیں دیا بلکہ خود انہوں نے یہ درس میرے خاندان سے لیا ہے۔ لہذا اگر تم چاہو تو ان کے حصے کی سزا بھی مجھے دے سکتے ہو" چنانچہ باقی ماندہ قید کے دوران تفتیشی افسر نے والد ماجد کی یہ خواہش پوری کرنے کی حتی الامکان کوشش کی۔

میں جانتا ہوں کہ حضرت شاہ صاحب کو ان کی ذات کے حوالے سے جاننے کا یہ بیان قدرے طویل ہو گیا ہے مگر اس بیان کی لذت میں میرا یہ افتخار شامل ہے کہ میں ان کی گود میں کھیلا ہوں، اس کے علاوہ جو کچھ ہے وہ میرے بیان کی اہلیت سے باہر ہے۔ گو میں نے انہیں چار برس کی عمر تک "دیکھا" تھا تاہم میں اپنا نام ان خوش نصیبوں کی فہرست میں درج کرانا چاہتا ہوں، جن کی آنکھوں نے شاہ صاحب کا دیدار کیا ہے۔

اور میں نے شاہ صاحب کی کوئی تقریر بھی نہیں سنی لیکن جید علماء ممتاز دانشوروں، چوٹی کے ادیبوں دانشوروں سیاست دانوں اور تھڑے پر بیٹھ کر گپ شپ کرنے والوں عوام الناس سے ان کی تقریروں کے بارے میں اس قدر سنا ہے کہ لگتا ہے کہ ان لاکھوں کے مجمع میں میں بھی شریک رہا ہوں جیسے امیر شریعت اپنی خطابت سے مسحور کرلیا کرتے تھے سو میں نے ان کی دلوں کو مسخر کرنے والی خطابت کے اتنے واقعات سنے ہیں کہ مجھے شاہ صاحب ایک ماورائی سی شخصیت لگنے لگے ہیں اور میرے ذہن میں ان کا جو ہیولا ابھرتا ہے، وہ حضرت مسیح علیہ السلام سے مماثل ہے، جو مردوں کو زندہ کردیتے تھے۔ امیر شریعت نے انگریز سامراج کے خلاف برصغیر کے پژمردہ عوام میں زندگی کی لہر دوڑادی تھی اور انہیں ایک ایسی طاقت سے لڑا دیا تھا، جس کی سلطنت پر سورج کبھی غروب نہیں ہوتا تھا۔ لیکن یہ سورج غروب ہو کر رہا اور برصغیر کے عوام نے بالآخر اپنی آنکھیں ان کومل کرنوں کے جھرمٹ میں کھولیں، جو آزادی کے سورج کی کرنیں تھیں سو میں نے اگرچہ شاہ صاحب کی کوئی تقریر نہیں سنی، لیکن ان کا جذبہ حریت ان کے لاکھوں مداحین میں سے "ٹریول" کرتا ہوا مجھ تک پہنچا ہے اور آج میرے دل میں سامراج کے لئے جو شدید نفرت ہے وہ شاہ صاحب کی ان ولولہ انگیز تقریروں کی بھی دین ہے جو جملہ جملہ ہو کر مجھ تک پہنچی ہیں۔

یوں میں نے شاہ صاحب کو بہت قریب سے دیکھا بھی ہے اور ان کی تقریریں بھی سنی ہیں لیکن میں انہیں ایک بار دیکھنا چاہتا ہوں اور ایک بار ان کی تقریر سننا چاہتا ہوں میں نے سنا ہے کہ سائنسدان فضا میں موجود ماضی کی آوازوں کو مجتمع اور چہروں کو مجسم کرنے کی کوشش میں مشغول ہیں وہ دن میرے لئے بہت مبارک ہو گا جس دن وہ اپنی اس کوشش میں کامیاب ہوں گے کہ میں اپنے شاہ صاحب کو چلتے پھرتے، ہنستے بولتے اور تقریر کا جادو جگاتے دیکھ سکوں گا کیا میں شاہ صاحب کو کبھی سچ مچ دیکھ سکوں گا؟

حضرت شاہ جی کے علمی اور دینی قد کاٹھ کے بارے میں کسی بونے کا کچھ کہنا اچھا نہیں لگتا، میرے منہ سے یہ باتیں کچھ جچتی نہیں کہ حضرت شاہ جی نے انگریز کے چنگل سے چھٹکارا حاصل کرنے کے لئے قید و بند کی کس قدر صعوبتیں جھیلیں اپنے آرام کو قربان کیا، سیم و زر کو اپنے پاؤں کی خاک سے بھی کم تر جانا یا یہ کہ آج تک ان سے بڑا خطیب پیدا نہیں ہوا، یہ وہ باتیں ہیں جو تاریخ کا حصہ ہیں اور تاریخ کو عطاء الحق قاسمی کی گواہی کی کوئی ضرورت نہیں۔

قیام پاکستان کے حوالے سے مجھے حضرت شاہ جی کے موقف کا علم ہے تاہم اس ضمن میں میرا معاملہ بھی حضرت شاہ جی کے ان لاکھوں عقیدت مندوں سا ہے جو ساری ساری رات شاہ جی کی تقریر پر سر دھنتے تھے مگر صبح ووٹ مسلم لیگ کو دیتے تھے، تاہم مجلس احرار سے وابستہ علماء کی نیت پر شک کرنا، خود پر شک کرنے کے مترادف ہے۔ قیام پاکستان کے بعد شاہ جی نے ایک تقریر میں فرمایا کہ مسجد بن جائے تو اسے ڈھایا نہیں کرتے، اس کی حفاظت کیا کرتے ہیں، اور اب پاکستان میرے لئے ایک مسجد کی طرح ہے جس کی حفاظت مجھ پر لازم ہے اور انہوں نے اپنا یہ عزم نبھایا بلکہ ان کی قابل فخر اولاد بھی پاکستان کو اسلام کا حقیقی قلعہ بنانے کے لئے سرگرم عمل ہے۔ دراصل ایک طویل عرصے کے مشاہدے اور تجربے کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ اسلام سے محبت رکھنے والا کوئی بھی شخص پاکستان کا بدخواہ نہیں ہوسکتا چنانچہ آپ دیکھ لیں کہ آج اندرون ملک اور بیرون ملک پاکستان کے خلاف جتنی بھی سازشیں ہو رہی ہیں ان کے پیچھے اسلام دشمن ذہن کارفرما ہے مجلس احرار اسلام کو قیام پاکستان کے ضمن میں جو اختلاف تھا، وہ بھی اسلام کی محبت ہی میں تھا۔ جیسا کہ میں نے شروع میں عرض کیا کہ امیر شریعت کو میں نے اپنی ہوش کی آنکھوں سے نہیں دیکھا کیونکہ میں اس وقت بہت چھوٹا تھا، انہیں صرف اپنے خاندان کے ایک فرد کے طور پر جانا اور یا پھر انگریز استعمار کو ناکوں چنے چبوانے والے ایک شعلہ نوا خطیب اور ایک عظیم المرتبت حریت پسند کے طور پر جس نے برصغیر کے مسلمانوں کی آزادی کے لئے راہ ہموار کی۔ البتہ حضرت شاہ جی کو میں ان کی آخری عمر میں سلطان فونڈری والے اپنے عزیز دوست عارف مرحوم کے گھر دیکھا مگر اس وقت نہ وہ مجھے پہچان سکتے تھے اور نہ میں انہیں پہچان سکتا تھا۔ گھر والے شاہ جی کا جو سراپا بیان کرتے تھے یا میں نے ان کی جو تصویریں دیکھی تھیں انہیں ذہن میں لانے کے بعد میں شاہ جی کو پہچاننے میں کامیاب ہوا، یوں انہیں پہچاننے میں مجھے کچھ دیر لگی۔ مجھے یقین ہے کہ خواہ مزید کچھ دیر لگے مگر پاکستانی قوم بھی ایک دن شاہ جی کو ضرور پہچانے گی کہ قیام پاکستان کے لئے بالواسطہ طور پر راہ ہموار کرنے والے تحریک آزادی کے یہ رہنما بھی ہمارے محسن ہیں اور اپنے محسنوں کو جو قوم جتنی جلدی پہچانے اس کے لئے یہ اتنا ہی اچھا ہوتا ہے! (مجلس احرار اسلام کے لاہور کے زیر اہتمام منعقدہ سید عطاء اللہ شاہ بخاری کی برسی میں پڑھا گیا) (بہ شکریہ نوائے وقت ملتان۔ ۲۷ اگست ۱۹۸۹ء)

جناب ارشد ملتانی

شاہ جی
ایک مشاہدہ ۔۔۔۔ ایک تاثر

سن اور تاریخ یاد نہیں یہ واقعہ میرے بچپن کا ہے۔ رات کا وقت ہے چوک حسین آگاہی کی سیڑھیوں پر ایک چھوٹا سا اسٹیج بنا ہوا ہے اور اس پر بجلی کے قمقمے روشن ہیں۔ مجلس احرار اسلام کے سرخ پوش رضا کار تیزی سے ادھر ادھر دوڑتے ہوئے انتظامات میں مصروف نظر آتے ہیں۔ دکانیں بند ہو چکی ہیں اور لوگ آہستہ آہستہ دور دور تک بچھی ہوئی دریوں پر آ کر بیٹھتے جاتے ہیں۔ یہاں تک کہ چاروں طرف لوگوں کا ایک ہجوم جمع ہو جاتا ہے اور اسٹیج سے نعرہ تکبیر کی آوازیں بلند ہونے لگتی ہیں۔ پتہ نہیں صدر جلسہ کون تھے۔ بہرحال دو تین مترنم نعتوں کے بعد لوگوں کا اشتیاق حد سے بڑھ گیا اور اسٹیج سیکرٹری نے نہایت ہی ادب و احترام سے حضرت شاہ جی کا نام پکارا۔ جلسہ یکدم نعرہ تکبیر اور امیر شریعت کے نعروں سے گونج اٹھا۔ شاہ جی بڑے وقار سے مائک پر نمودار ہوئے۔ خوبصورت وجیہہ چہرہ، پر جلال وضع انہوں نے ایک مفکرانہ گہری نظر جلسے کے چاروں طرف دوڑائی اور چند آیات قرآنی تلاوت کیں۔ شخصیت کا سحر، لحن داؤدی اور اعجاز قرآنی کے مجموعی اثر نے لاکھوں انسانوں کے ذہنوں پر ایک مکمل سکوت طاری کر دیا۔ شاہ جی نے حسب معمول تھوڑی معذرت کی اور پھر اپنے اصل موضوع کی طرف آئے۔ آج اُن کا موضوع واقعہ معراج تھا۔ چنانچہ معراج انسانیت کے اس عظیم واقعہ کی انہوں نے انتہائی خوبصورت اور دلکش انداز میں توضیح و توجیہہ کی۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے لوگ جھوم رہے تھے اور داد و تحسین کے نعرے بلند کر رہے تھے۔ شاہ جی کے بیان کی حلاوت اور اظہار کے رس نے وہ سماں باندھا کہ لوگوں کو پتہ بھی نہ چلا اور رات کے دو بج گئے لوگ ایسے جمے بیٹھے تھے جیسے جلسہ ابھی شروع ہوا ہے۔ یہ بات میں ذاتی مشاہدے کی کر رہا ہوں۔ ویسے برصغیر کے کروڑوں انسان میری اس بات کی تائید کرنے پر تیار ہو جائیں گے۔

شاہ جی کی ذات گرامی علم وادب اور زور خطابت میں یکتا تھی اور اس کے ساتھ ساتھ وہ اپنے سینے میں حُبِّ رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے لبریز دل رکھتے تھے۔ شاہ جی کے افکار و خیالات کا جائزہ اس امر کی گواہی دیتا ہے کہ عشق رسول ان کی زندگی کا محور و مرکز تھا۔ انہوں نے زندگی کے کسی موڑ پر بھی اس مرکز سے گریز نہیں کیا۔ وہ ایک زبردست انقلابی رہنما تھے۔ نعرہ باز انقلابی نہیں۔ وہ انقلابی جو امن و فلاح کے حقیقی انقلاب کے شیدائی ہوتے ہیں۔ ہماری سرزمین نے اور بھی بہت سے انقلابی پیدا کئے ہیں لیکن شاہ جی کی انفرادیت یہ تھی کہ انہوں نے انقلاب لانے کا ایک مختلف اور انوکھا راستہ اختیار کیا۔ وہ راستہ جو خوبصورت بھی تھا اور منزل تک لے جانے والا بھی۔ شاہ جی کی فطرت ہر مشکل میں آسانی کی راہ پیدا کرنے والی تھی۔ میں نے علم و ادب اور سیاست و معاشرت کے کئی اکابر سے اچھا خاصا استفادہ کیا ہے میں سمجھتا ہوں کہ منزل کے حصول کے لئے جو راہ شاہ جی نے اپنائی تھی اس میں بڑا حسن اور رومان ہے۔ شاہ جی عالم تھے۔ انتہائی خوش ذوق اور زندہ دل

انسان تھے۔ ان کے بلند اور اعلیٰ ذوق اور ان کے علم کی وسعت کا تقاضا ہی یہی تھا کہ ان کے قول اور عمل میں تضاد نہ ہو۔ ایک انفرادیّت ہو، ایک نیا اور اجلا پن ہو، میں ایک خاص اور باریک نقطے کی طرف توجہ دلاتا ہوں ہم اپنے سیاست دانوں اور مذہبی رہنماؤں کی پرجوش تقریریوں کے عمق میں جھانک کر دیکھیں تو محسوس ہوتا ہے کہ ہمیں خوف دلا کر ڈرا دھمکا کر اپنی طرف لانا چاہتے ہیں۔ یا اپنی بات منوانا چاہتے ہیں۔ کہیں عاقبت کا خوف ہے۔ کہیں سیاست کا ڈر، کہیں اقتصادیات کے اندیشے ہیں کہیں تہذیب و ثقافت کا ہراس۔ یعنی لفظ لفظ کا بنیادی مفہوم خوف ہے لیکن شاہ جی کی گفتگو میں، تقریروں میں، ان کی خطابت میں خوفزدہ کرنے کا نفسیاتی انداز ہرگز نہ تھا۔ بلکہ اس کے برعکس وہ راحت و مسرت کے لطیف جذبوں کے ساتھ ساتھ لے جانا چاہتے تھے۔ ان کی اپروچ شاعرانہ تھی۔ ان کی عظیم خطابت میں کہیں شعر کا حسن ہے کہیں لطیفے کی چاشنی کہیں زبان کا لطف ہے کہیں محاورے کا چٹخارہ اور اسکے ساتھ ساتھ علم کی حکمت آفرین نکتہ رسی بھی ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ خصوصیات، یہ انفرادی مقام و مرتبہ علم اور تجربے کے بغیر کسی کو حاصل نہیں ہوتا اور علم و تجربے کی عظمت ہر کسی کو نہیں ملتی۔

جس کے لبوں پہ رقص کناں تھے علوم و فکر
آتا ہے یاد فن خطابت کا شہر یار
لرزاں تھا جس سے کفرِ سیاست قدم قدم
وہ مردِ حق پرست وہ عالم وہ ذی وقار

چودھری محمد شفیق ایڈووکیٹ۔ ملتان

زندۂ جاوید شخصیت

ذیل کا مضمون دراصل چودھری صاحب کی وہ تقریر ہے جو انہوں نے ستمبر ۱۹۹۱ء میں شاہ جی کی یاد میں دارِ بنی ہاشم میں منعقدہ تقریب میں کی۔ بعد میں اس تقریر کو انہوں نے نظر ثانی کر کے مربوط کر دیا۔
(کفیل)

کائنات کے تخلیقی، تدریجی ارتقاء اور نشوونما کی گلکاریاں، مصور حقیقی کی تدبیر اور منشاء کے عین مطابق، کمال اہتمام انصرام کے ساتھ ہزارہا برس کی معلومہ تاریخ میں محفوظ ہیں۔ انسان اور انسان سے وابستہ مظاہر کائنات، لحہ بہ لحہ رونما ہونے والی تبدیلیوں کی حکایت دلفروز، کمال دیانت کے ساتھ اس طور پر منتقل کرتے چلے آرہے ہیں کہ انسانی زندگی کے انفرادی اور اجتماعی پہلو کے اعتبار سے انسانی صلاحیت اور استعداد کی بے شمار وسعتیں اور جہتیں آشکار ہوتی ہیں۔ چشم بصیرت تاریخ کے اوراق سے اسباق اور عبرتیں حاصل کرنے کے ساتھ اسباب و علل کے نظام سے بھی آشنا ہوتی ہے۔ تاریخی عمل افراد کے ہاتھوں ہی جاری و ساری رہتا ہے۔ کچھ افراد یا شخصیات تاریخی عمل کے منطقی نتیجہ کے طور پر سامنے آتے ہیں اور ان کی شخصیت کی تعمیر تاریخ کے ہاتھوں انجام پاتی ہے۔ اور کچھ شخصیات کے ہاتھوں خالق کائنات تاریخ سازی کی اہم ذمہ داریاں سرانجام دلاتے ہیں۔

نگہ کر غافل تجلی عین فطرت ہے
کہ بیگانہ اپنی موج سے رہ سکتا نہیں دریا

تجلیات کا نزول بلا انقطاع، اک گونہ تواتر، تسلسل اور تناسب و توازن کے ساتھ، مقتضائے زمانہ کے مطابق ہماری آنکھوں کے سامنے وا ہوتا رہتا ہے۔ تاریخ کے دھاروں کے رخ موڑنے والے ہاتھ، شخصیات خال خال ہی پیدا ہوتی ہیں۔

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

کسی ایک نشست میں ایسی شخصیت کے تمام کمالات کا احاطہ ممکن نہیں۔ ایک فرد کا ذکر دراصل ایک دور کے سیاسی، سماجی، اقتصادی، اخلاقی و دینی تذکرے پر محیط ہوتا ہے۔ نشستیں، تذکروں میں تبدیل ہو جاتی ہیں۔ تذکرے لائبریریوں کا تقاضا کرتے ہیں۔ لمحے صدیوں میں تبدیل ہوتے ہیں اور تعارف ہے کہ تکمیل ہی نہیں پاتا۔

بحر اوقیانوس کے ساحل سے بحر الکاہل کے جزائر تک تین براعظموں میں پھیلی ہوئی منفرد و یگانہ تہذیب کی علمبردار ملت غلامی کی اتھاہ گہرائیوں میں اتر چکی ہے۔ مرکز ملت (خواہ نام ہی کو سہی) اور نظم ملت سامراجی ریشہ دوانیوں کا شکار ہو چکا ہے۔ انحطاط تمام شعبوں میں اپنی آخری حدوں پر ہے۔ ماہرین عمرانیات کے نزدیک تہذیب موت کی دہلیز پر ہے۔ کسی لحہ بھی وقوع پذیر ہو سکتی ہے۔ ملت کے جغرافیہ کا شمال مغربی کونہ، ملت کے فرزانوں سے خالی ہو چکا ہے۔ غرناطہ و الحمرا کی ثقافت دم توڑ چکی ہے۔ ملت کا مشرقی کنارا پرتگیزیوں کے تصرف میں ہے۔ شمال کی جانب زار روس کی جیرہ دستیاں تاراج میں مصروف ہیں۔ برصغیر ہند کی حالت اس صورت حال سے مختلف نہیں ہے۔ مسلمانوں کی حکومت قصہ پارینہ ہو چکی ہے۔ راجواڑے بھی دم توڑ رہے ہیں۔ مدافعت اور مزاحمت کے تمام سلسلے سسکیاں لے رہے ہیں۔ برطانوی سامراج کے زیر تسلط علاقوں میں سورج اپنی تمازتوں کے نصف النہار پر ہے۔ پینتیس کروڑ کی آبادی کا حکمران اس قدر مستحکم ہو چکا ہے کہ چند ہزار فرنگی نفوس امور مملکت سرانجام دینے کے لئے انتہائی کافی باور کرتا ہے۔ کارہائے مملت کے تقاضے، ہندوستان کے باسی ہی اس قدر خوبی اور وفاداری سے ادا کر رہے ہیں کہ حکومت کو افرادی

قوت کی کمی کا احساس تک ہی نہیں ہو پاتا۔ ایک سو صرف ایک سو برس کی مدت میں نیا نظام تشکیل پا چکا ہے۔ جو نہ صرف نظم مملکت کے لئے کافی اور شافی ہے بلکہ اسلامیان ہند کی بنیادی اساس پر بھی ضرب کاری لگا رہا ہے۔ اسلاف کے افکار کے ساتھ عربی، فارسی سے بھی رشتہ منقطع ہو چکا ہے۔ نئی زبان پروان چڑھ چکی ہے۔ علم کے سرچشموں کے راستے نظروں سے اوجھل کر دیئے گئے ہیں۔ پیمانے اور قدریں تبدیل کر دی گئی ہیں۔ علم اب صرف ذریعۂ روزگار رہ گیا ہے۔

کیا کہوں احباب کیا کارہائے نمایاں کر گئے
بی۔ اے ہوئے، نوکر ہوئے پنشن ملی اور مر گئے

دین ایک متحرک قوت کی بجائے رسم ہو گیا۔ اجتماعی نظام کی بجائے انفرادی عمل قرار دے دیا گیا ہے۔ دین اب مذہب کہلانے لگا ہے۔ اکابرین کی تحریری، تقریری، عملی کاوشوں اور تدابیر کے فوری نتائج سامنے نہ آنے کی بناء پر ان کا جہد، جہد کے راستوں کی ابتلاء، اذیتیں، صعوبتیں، شاہوں اور تاجوروں سے برسرپیکار ہونے کا طرز عمل غرضیکہ وہ تمام اسلوب تبلیغ و جہد جو انبیاء علیہم السلام کا طریق ہے اپنی سہل پسندی اور گریز پائی کے سبب ناقابل عمل قرار پا چکے ہیں۔ بڑی خوش الحانی اور صوتی زیر و بم کے ساتھ فرنگی توپوں میں کیڑے ڈالے جانے کی دعائیں جاری ہیں۔ دین کے داعی صرف اس پر قانع ہو چکے ہیں۔ بقول اکبر الٰہ آبادی:

ملا کو جو ہے ہند میں سجدہ کی اجازت
نادان یہ سمجھتا ہے کہ اسلام ہے آزاد

وہ فکری انتشار ہے کہ الاماں! جنگ آزادی کو اغیار نے غدر قرار دیا۔ ہم نے بغاوت ہند تسلیم کیا۔

اسلامی افکار، شعار اور شخصیات کے بارے میں نقطہ نظر محض دفاعی ہی نہیں اس قدر مغلوبانہ ہوا کہ جہاد ہی موقوف کر دیا گیا۔ فلاح کے ان گنت راستے، افکار کی مختلف نوعیتیں اور مغربی تہذیبی یلغار نے سوچ کو ہی غلامانہ کر دیا ہوا ہے۔ دین پر تیقن مفقود، عمل ناپید۔

ایسے عالم میں ایک صاحب عمل شخصیت کی ضرورت، ایسا صاحب عمل جو عین الیقین کی منزل سے گزر کر تیقن کی دولت سے مالامال ہو۔ شدت وحدت کا ایسا حسین امتزاج کہ حق بات کے لئے کھڑا ہو جائے۔ اپنے تمام اثاثے، تمام توانائیاں نثار کر دے۔ افراد کو جماعتی نظم میں لائے۔ قریہ قریہ، کوچہ کوچہ، نگر نگر، صبح و شام اپنے کردار و گفتار سے جو اس کے بس میں ہے کر گزرے۔ ہر وہ بات، ہر وہ عمل اپنوں نے کہی ہو یا غیروں سے سرزد ہوا گر کسی طور پر اس کے دین سے متحارب یا متصادم ہو تو سینہ سپر ہو جائے۔ مصلحتیں اس کی راہ میں آڑے نہ آئیں اور ہمہ وقت لڑائی کے لئے تیار رہے۔ دین ہی اس کا اوڑھنا اور بچھونا ہو

حدیث بے خبراں ہے تو با زمانہ بساز
زمانہ با تو نہ سازد تو با زمانہ ستیز

تاریخ میں ایسی شخصیات بھی نظر آتی ہیں جو رسمی سطح پر زیست بسر کرتی ہیں۔ امور کی انجام دہی بھی رسمی طور پر ہوتی رہتی ہے۔ خوبیاں اور خامیاں رسمی سطح پر ساتھ ساتھ چلتی رہتی ہیں۔ نماز بھی ادا ہو رہی ہے اور سودی کاروبار بھی جاری ہے۔ ترک و اختیار کا عمل شعوری کارفرمائی کے بغیر وقوع پذیر ہو رہا ہے۔ تخلیقی صلاحیتوں کے حامل افراد کا دیا ہوا طرز عمل، ابتداء میں شعوری سطح پر قائم رہتا ہے۔ پھر تقلید کے دور میں داخل ہوتا ہے۔ کہ عمل کی علت، غرض و غایت اور مقاصد ہی مر جاتے ہیں۔ معاشرے حیوانی سطح پر اتر آتے ہیں یہی وہ مرحلہ ہے جہاں شخصیت اپنا کردار ادا کرتی ہے۔ سیاسی، سماجی، عصری تقاضوں کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے امراض کی نشاندہی اور ان کے لئے زندگی بخشنے والا علاج تجویز کرتے ہیں۔ تاریخ کے اس نازک موڑ پر جنم لینے والے افراد واقعی معاشروں کو زندگی دے جاتے ہیں؟ ایک سوال ہے جس کا جواب تاریخی تجزیہ میں پوشیدہ ہے۔ تجزیے پچاس برس میں مکمل نہیں ہوتے۔ اور برصغیر کے تاریخی مدارج کا تجزیہ مکتب اور یونیورسٹی کی مغائرت کے پس منظر میں اور بھی زیادہ مدت کا متقاضی ہے۔ جب تجزیے کھل کر سامنے آئیں گے اور معاشرہ کو زندگی بخشنے والی شخصیات نکھر آئیں گی۔

ذرا چشم تصور وا کیجئے۔ تاریخ کے اس نازک موڑ پر کچھ لوگوں کے نزدیک زندگی مغربی فکر کو اپنانے میں پوشیدہ تھی اور کچھ لوگوں کے نزدیک مغربی طرز زیست سے پرہیز میں زندگی مضمر تھی۔ خواہ رسمی طور پر ہی کیوں نہ ہو۔ اس پہ طرفہ تماشا جاگیرداری و سرمایہ داری کا تحفظ بھی مطلوب و مقصود تھا۔ شمال و مغرب کے دونوں طرز زیست کرۂ ارض پر کارفرما تھے۔ مغرب سے گریز شمال کی ترغیب کا باعث تھا اور شمال سے دوری مغرب کی قربت کا قرینہ رکھتی تھی۔ علی گڑھ، دیوبند، جامعہ ملیہ دہلی، مسلم لیگ، جمعیت العلماء ہند، مجلس احرار، خاکسار، رجعت پسند، ترقی پسند، قوم پرست افکار، دبستان، جماعتیں، تحریکیں اسی فکری انتشار کی آئینہ دار ہیں اور اس پر طرہ یہ ہے کہ قدم قدم پر سازشیں اور ریشہ دوانیاں، غداروں کے

جلو میں کار فرما نظر آتی ہیں۔

اس پس منظر میں ملت اسلامیہ کی مسیحائی کا بیڑا اٹھانے کے لئے فکر و عمل کے ہر موڑ پر کسی اور رعایت کو خاطر میں لائے بغیر رہبری کی ذمہ داریاں صرف اس شخص کے سپرد کی جاسکتی ہیں جو دینی فکر میں پیدا ہونے والی یا لے جانے والی ہر کجی کی نشاندہی کر سکے اور اسلاف کی اس عظیم میراث کو بہا لے جانے والے سیلاب کو دریا کی حدود میں مقید کر سکے۔

مدرسہ قاسم العلوم کی مشرقی دیوار سے ملحقہ گلی، کچہری روڈ اور محلہ ٹبی شیر خاں کو براستہ پرانا برف خانہ سے ملاتی ہے۔ محلہ ٹبی شیر خان اور کوٹلہ تولے خان کے سنگم پر واقع ایک کچا مکان جہاں دیدہ و جہاں گزیرہ بوریا نشین کا مسکن ہے۔ کچہری روڈ پر حکیم محمد اجمل خان رحمۃ اللہ علیہ کے تربیت یافتگان حکیم عطاء اللہ مرحوم اور ان کے خلف الرشید حکیم محمد حنیف اللہ صاحبان کا دوا خانہ ہے۔ کم از کم دن میں ایک بار یہ گلی، متین، وجیہہ اور پروقار شخصیت کے قدموں سے ہر روز برسوں تک لپٹتی رہی۔ کم سن آنکھیں، مرتبہ اور مقام شخصیت سے نا آشنا ہونے کے باوجود اس راستے پر مرکوز ہیں۔ وہ آرہے ہیں۔ آداب بجا لائے جاتے ہیں۔ دست شفقت سائبان بنتا ہے۔ تمازت لمس کے ساتھ ہی شفقتوں کے دھارے بہہ نکلتے ہیں۔ دعائیں پل بھر میں قبولیت کا شرف حاصل کرتی ہیں۔ کم سن خود کو بالغ نظر محسوس کرنے لگتا ہے۔ اپنا قد بڑھتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ حریص شفقت اگلے روز کے انتظار میں چلا جاتا ہے۔ شخصیت بزرگوں کی طرف بڑھ رہی ہے۔ بزرگوں کو اٹھنے سے روک دیا جاتا ہے۔ لحہ پہلے دعائیں دینے والی شخصیت دعاؤں کی طلبگار بن جاتی ہے۔ گفتگو کا یارا نہیں۔ قلب و نظر مسحور ہو چکے ہیں۔ یہ سحر آج بھی اس گلی میں طاری ہے اور کیوں نہ ہو یہ معمول بھی تو کم و بیش ایک دہائی پر محیط ہے۔ سفید ریش، پرنور چہرہ، سرخی مائل رنگت، دل موہ لینی والی آنکھیں، مضبوط و کشادہ سینہ، میانہ قد، عصا بدست سید عطاء اللہ شاہ بخاری رحمۃ اللہ علیہ کی گزر گاہ ہے۔

ہم قریہ قریہ ڈھونڈ چکے کہیں اس کی مثال نہیں ملتی
نہ پیکر اس کے پیکر سا نہ لہجہ اس کے لہجہ سا

اپنی تمام تر صلاحیتوں اور رعنائیوں کے ساتھ برصغیر ہند میں تاریخ کے اس نازک مرحلہ پر مردانہ وار جولا نگاہ میں اترتے ہیں۔ خیبر سے لے کر راس کماری تک، کون سا شہر، قصبہ، گاؤں، نگر اور قریہ ایسا ہے جہاں انہوں نے قدم رنجہ نہیں فرمایا۔ فرد کو مجلس احرار میں تبدیل کر دیا۔ دین کے حوالے سے ہر کجی کو سیدھا کیا۔ ہر محاذ پر مردانہ وار اترے اور کامران ہوئے۔ مغربی افکار ہوں کہ مشرقی، دین پر یورش شمال سے ہو یا جنوب سے ابھرے۔ ارتکاز دولت کی تمام شکلیں، جو کسی طور بھی مغربی سرمایہ دارانہ نظام کے تحت کسی فرد سے وابستہ ہوں یا اشتمالیت و اشتراکیت کے زیر اثر کسی جماعت کے ہاتھوں منظم ہوں ملت اسلامیہ کے لئے مضر ہیں۔ سرمایہ پرست کبھی بھی معاشروں کی زندگی نہیں ہو سکتے۔ زیادہ سے زیادہ ہر حکومت وقت کی تائید ہی کر سکتے ہیں۔ فرنگی سامراج کے ساتھ ساتھ ارتکاز دولت کے خواہش مندوں اور ہمنواؤں اور ان کی سرپرست پاپائیت

ان کی ضرب کا شکار ہوئی۔ اور یہ اسی ضرب کاری کا نتیجہ ہے کہ ہم شعوری طور پر محسوس کرتے ہیں اور جان چکے ہیں کہ دشمنان دین نے کہاں کہاں سرنگ لگائی ہے۔ وہ کون کون سے شعبے ہیں جو ہماری دینی فکر کو پامال کرتے رہے ہیں اور کرنے کے در پے ہیں۔ رافضیت نے ہمیں کہاں کہاں زک پہنچائی۔ مرزائیت نے کیوں کر نقصان پہنچایا۔ یہودیت نے کہاں آگ لگائی۔ نصرانیت کی سازشوں کا کیونکر شکار ہوئے۔ ہماری تہذیب کیسے ہندوائی گئی۔ رہبانیت کیسے در آئی۔ خوبصورت خانقاہی نظام کیونکر گھنا گیا۔ فکر جامد کیوں ہو گئی۔ اور یہی تخلیقی صلاحیتوں کے حامل افراد کا وہ گرانقدر عطیہ ہوتا ہے جو معاشروں کو زیست کرنے کا ہنر دے جاتا ہے۔

محبت اور نفرت کی بنیادیں محض جذباتی نہ تھیں بلکہ شعوری طور پر تھیں۔ انسانوں سے محبت وہ ہمیشہ بلاامتیاز رنگ و نسل و عقیدہ کرتے رہے۔ لیکن انسانوں میں ہی موجود ہر برائی سے انہوں نے نفرت کی۔ یہ امتیاز، یہ شعور شاہ جی رحمۃ اللہ علیہ کے ہاں کوئی نیا نہ تھا۔ موصوف اس فکر کے خود خالق نہ تھے۔ بلاشبہ یہ فکر، یہ نظریہ، یہ سوچ، چودہ سو برس قبل ہادیٔ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں مرحمت کی تھی۔ کہ مومن کی زندگی کا ہر لمحہ رضائے الہٰی کی جستجو میں محدود کر دیا گیا۔

یہ مصرعہ لکھ دیا کس شوخ نے محراب مسجد پر
کہ ناداں گر گئے سجدہ میں جب وقت قیام آیا

شاہ جی کی زندگی کے بے شمار دن اور راتیں تفہیم قرآن اور بیان اسوہ حسنہ میں صرف ہوئیں۔ ہندوستان کے ہر خطہ میں مانوس لب و لہجہ میں، ظرف مخاطب کے عین مطابق پیغام رسانی کے فریضہ کو بہ کمال احسن سر انجام دیا۔ یقین و عمل کا خوبصورت پیکر ایک لمحہ کے لئے بھی سکون پذیر نہیں ہوا۔ دین اسلام کے خلاف کھلنے والے ہر محاذ کے مقابل صف اول میں جماعت احرار کے ساتھ ستیزہ کار نظر آتے ہیں۔

ان کی بصیرت افروز گفتگو آج کے بین الاقوامی تناظر میں، از سر نو جائز کی متقاضی ہے۔ شمال میں کمیونزم کی پامالی، مغرب میں ارتکاز دولت کی وجہ سے زبوں حالی آئندہ آنے والی نصف صدی کے اندر اندر مغربی تہذیبی چکا چوند کے ماند ہونے کا منظر پیش کر رہی ہے۔ ہمیں جلد یا بدیر ارتکاز دولت کے خلاف دینی بصیرت کے حصار میں رہتے ہوئے نہ صرف اپنی زندگیوں کو سنوارنا ہے۔ بلکہ انسانیت کی رہبری کی ذمہ داریوں سے بھی عہدہ برآ ہونا ہے۔ مکتب نے بھی اب شخصیت سازی کا ہنر کھو دیا ہے۔ یونیورسٹی کی عنایات تو ہم پہلے ہی دیکھ چکے ہیں۔ شاہ جی کی طرح جوہر کی تلاش، ان کی تراش اور نکھارنے کی ضرورت پہلے سے بھی دوچند ہے۔ ایسی شخصیات جو زندگی کے مختلف دھاروں پر ہماری شعوری طور پر رہنمائی کریں شعور کے سہارے زندہ رہنے کا راستہ دکھائیں۔ ترک و اختیار میں شعور کی کارفرمائیاں ہمارا شعار ہوں۔ دوستی اور دشمنی، محبت اور نفرت کی بنیاد صرف رضائے الہٰی ہو۔ انسانوں سے محبت، انسانوں میں موجود برائیوں سے نفرت ان کے لئے دکھ و کرب ہمارے محور ہوں۔ سخن دلنواز ہو، جاں پر سوز اور نگہ بلند رہے۔ کہ ہمارے میر کارواں

اسی رخت سفر کو لئے میدان کارزار میں اترے تھے۔ وطن عزیز سازشوں کی آماجگاہ بن چکا ہے۔ ملت اسلامیہ ایک بار پھر اغیار کی چیرہ دستیوں کی شکار ہونے کو ہے۔ قیادت، نیابت، فضیلت اور تکریم کا معیار دولت کو قرار دیا جا چکا ہے۔ ارتکاز دولت کو جواز مہیا کر دیا گیا ہے۔ اب صاحب تکریم وہی ہے جو صاحب سرمایہ ہے۔ علم، کردار، تقویٰ، پرہیز گاری اور صلاحیت قابل ذکر سرمایہ نہیں۔ سرمایہ پرستی معاشروں کی موت ہے۔ اجتماعی مفادات کو مؤخر کرنے کا عمل تہذیبوں کے لئے کبھی بھی زندگی بخش نہیں ہوسکتا۔ انفرادی مفادات کو اجتماعی مفادات پر فوقیت یا ترجیح دینے کا عمل سراسر خودکشی ہے۔ رنگ، نسل، تہذیب، علاقائی اور گروہی بنیادوں پر ملت اسلامیہ کی تعمیر کا تصور سراسر کذب اور افتراء ہے۔ شاہ جی اور ان ایسے اکابر کی مانند اپنی ذات کی نفی کرتے ہوئے میدان عمل میں اترنا ہی شاہ جی کو خراج عقیدت پیش کرنے کا صحیح طریقہ ہے۔ تکریم، قیادت اور نیابت کی ذمہ داریاں صاحبان علم و دانش، صاحبان کردار، تقویٰ، اور بصیرت کے حامل افراد کو سونپنے کا وقت آگیا ہے۔ منصب اہل افراد ہی کے لئے زیبا ہے۔ شاہ جی کو اکابر نے اہلیت کی بنیاد پر ہی امیر شریعت کے گرانقدر منصب جلیلہ کے لئے منتخب فرمایا تھا۔ اور تاریخی حقیقت ہے کہ انہوں نے منصب کے تقاضوں کو کمال احسن طریق سے نبھایا۔ وہ سخن فہم بھی تھے۔ سخن شناس بھی۔ جوہری بھی اور جوہر تراش بھی۔ افراد کا انتخاب، ان کی تراش خراش اور انکی اہلیت کے مطابق ذمہ داریوں کی سپردگی کا قرینہ انکی امارت کی صلاحیت کی منہ بولتی تصویریں ہیں۔ راست فکر، راست عمل، حق گو اور بے باک، بے لوث و بے غرض، جان ہتھیلی پر سجائے امیر شریعت کے تربیت یافتہ احباب پچھلی نصف صدی میں آہستہ آہستہ رخصت ہو گئے۔

بجھی عشق کی آگ اندھیر ہے
مسلماں نہیں راکھ کا ڈھیر ہے

مرزا جی کی ٹیچی ٹیچی

میں ابھی بچہ ہی تھا کہ مولانا سید عطاء اللہ شاہ بخاری مرحوم وزیر آباد تشریف لائے۔ رات غلہ منڈی میں انہوں نے تقریر کی۔ میں بھی اپنے دوستوں کے ہمراہ تقریر سننے چلا گیا اور تو کچھ میری سمجھ میں نہ آیا البتہ ایک صاحب نے ایک پنجابی نظم پڑھی جس کا ایک شعر مجھے اب بھی یاد ہے۔

ٹیچی ٹیچی رب جانے کتھوں دی چڑیل اے
راتوں رات ہوندا جدھا مرزے نال میل اے

(خدا جانے ٹیچی ٹیچی کہاں کی چڑیل ہے جو رات کے وقت مرزا قادیانی سے ملاقات کرتی ہے)

میں اور میرے دوست اس پر ہنستے ہنستے لوٹ پوٹ ہو گئے اور میں یہ شعر گاتا ہوا گھر کو آگیا۔۔۔۔ ٹیچی ٹیچی رب جانے کتھوں دی چڑیل اے۔۔۔۔ مرزائیت کے متعلق یہ میرا پہلا تاثر تھا۔

قاضی محمد حفیظ اللہ۔ پی سی ایس (ریٹائرڈ)

زاہد منیر عامر

شاہ جی! اپنے اسلوب نگارش کے آئینے میں

سید عطاءاللہ بخاری کو جو قدرت اللہ تعالیٰ نے زبان و بیان پر عطا فرمائی تھی اس بناء پر وہ نہ صرف اپنے دور کے خطباء میں بلکہ بعد میں آنے والے دور میں بھی خاتم الخطباء تھے اور اس لحاظ سے انہیں خطابت کا "ابوالوقت" بھی کہا جا سکتا ہے ان کی شخصیت کے ہمہ جہتی مطالعہ سے اس کے جو پہلو ہمارے سامنے آتے ہیں ان کے مطابق وہ صرف ایک خطیب ہی نہ تھے بلکہ ایک عارف باللہ بھی تھے اور ایک اچھے نعت گو بھی تھے ان کی جو نعتیں ہمیں ملتی ہیں صرف انہی کے مطالعہ سے ان کے عشق رسول ﷺ کا اندازہ کیا جا سکتا ہے شاعری کے ساتھ ساتھ اللہ تعالیٰ نے انہیں نثر پر بھی قدرت عطا کی تھی ان کے منظوم و منثور کلام کا جو حصہ ہمارے سامنے ہے اس سے جہاں ان کی شخصیت کے مختلف پہلوؤں پر روشنی پڑتی ہے وہاں ان کے مطالعہ کی وسعت کا بھی اندازہ ہوتا ہے۔

شاہ جی نے اصلاً نثر نگاری نہیں کی ان کے نثری ذخیرہ میں صرف دو ایک مضامین چند خطوط اور ایک مقدمہ شامل ہیں اس مختصر نثری سرمایہ میں جو مضامین نظر آتے ہیں ان کی بنا پر ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ان کی شخصیت کے اس پہلو کا بھی تجزیہ کیا جائے۔ مضمون کا مطلب انگریزی لفظ (EASSAY) کے مترادف ہے یا اسے کسی خاص موضوع پر مجموعۂ خیالات بھی کہا جا سکتا ہے مفہوم اور موضوع بھی مضمون کے مطلب کے ضمن میں آتے ہیں 'ایک اچھے مضمون کے خصائص میں جو چیزیں شامل ہیں۔ان میں موضوع کے عنوان (موضوع کی وضاحت) اور مختلف واقعات کو مختلف حصوں "پیراگرافس" میں لکھنا اور واقعات کا ارتباط قائم رکھنا شامل ہیں۔ علاوہ ازیں عبادت کی سلاست' روانی 'ایجازو اختصار' (جسمیں اگر سادگی کا عنصر شامل ہو تو اور بھی اچھا ہے) فقرات کی چستی اور بندش اور قاری کو محو کر دینے کی خصوصیات بھی ایک اچھے نثرپارہ کی خوبیوں میں شامل ہیں۔

سید عطاء اللہ شاہ بخاری کی نثر جہاں ان کے مزاج اور ماحول کی عکاسی کرتی ہے وہاں ایک ٹھوس قوت بیان کی بھی حامل ہے شاہ جی تصورات سے زیادہ عمل کو اہمیت دیتے تھے تحریر سے زیادہ تقریر پر زور دیتے اور سکون سے زیادہ متحرک زندگی کو پسند کرتے تھے۔ بقول خود ان کی نصف زندگی جیل میں اور نصف ریل میں گزری ان کے مزاج کو ایک ایسے پہاڑ سے تشبیہ دی جا سکتی ہے جس کی بلندی پر کوئی شک نہ کر سکتا ہو' جس پختگی پر کسی کو نظر اٹھانے کی جرات نہ ہو سکے یا ایک ایسا طوفان کہا جا سکتا ہے جس میں بلا کی طاقت ہو اور وہ اپنی طاقت کو پورے طور پر بروئے کار بھی لائے۔

الغرض ان کے مزاج میں بجلی کی سی تیزی، پھول کی سی لطافت، آبشار کی سی روانی، سمندر ساجوش و خروش اور زندگی ایسی متاع بے بہا کی پوری رمق شامل تھی اور ان کی تحریر میں جن عوامل کی کارفرمائی نظر آتی ہے ان کا خمیر انہی اجزاء سے مل کر بنا ہے جن سے ان کی زندگانی عبارت ہے۔ لیکن اپنی زندگی میں انہیں حوادث سے سابقہ رہا اس کے اثرات بھی ان کی تحریر میں نمایاں ہیں علاوہ ازیں ان کی زندگی کا خاص وصف یعنی خطیبانہ لہجہ بھی ہے ان کی نثر میں واضح طور پر چھلکتا ہے۔ ایک اچھی تقریر کے اجزاء میں بیان کا ارتباط سب سے زیادہ اہمیت کا حامل ہے اور شاہ جی کی تحریر میں یہ خاصیت پوری طرح جلوہ گر ہے مثلاً جیل خانہ کی زندگی کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

"جیل خانہ زندگی کے سفر کا ایک ایسا موڑ ہے جہاں کبھی طلب کے خیال سے رکنا پڑتا ہے، کبھی فرض کی کشاکش لے آتی ہے اور کبھی جستجوئے منزل کا تقاضا پہنچا دیتا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ اب جیل خانہ کی آبرو پر بھی بوالہوش نے پیش دستی شروع کی ہوئی ہے اور
"جو بادہ کش تھے پرانے وہ اٹھتے جاتے ہیں"

("میرا عقیدہ" روزنامہ کوہستان لاہور مورخہ ۴ ستمبر ۱۹۶۱ء)

اب ذرا ان تراکیب پر غور کیجئے ! کیا ادبی لحاظ سے ان میں کوئی سقم پایا جاتا ہے؟ فرض کی کشاکش، جستجوئے منزل، طلب کا خیال، ایسی تراکیب ان کے خاص ادیبانہ مزاج کا پتہ دیتی ہیں ایک اسی اقتباس سے پتہ چلتا ہے کہ ان کا مطالعہ زندگی کس قدر وسیع تھا کہ انہوں نے زندگی کے ایک موڑ یعنی جیل خانہ کی حقیقت کو کس قدر حقیقت افروز اور جامع پیرائے میں بیان کیا ہے اسی مضمون کی ایک اور عبارت میں شاہ جی نے اپنی زندگی کے تجربات و مشاہدات کو اپنے دو جلیل القدر عزائم (جذبات) میں بلا کی شدت اور حرارت پیدا کرنے کے باعث قرار دیا ہے اور وہ عزائم ہیں "قرآن کی محبت اور انگریز سے نفرت"

شاہ جی جب اپنی زندگی کے یادگار واقعات کو بیان کرنے لگتے ہیں تو ان کی تحریر میں ایک خاص سوزوگداز پیدا ہو جاتا ہے لیکن جب وہ اس کے حال پر نظر ڈالتے ہیں تو یکایک ان کی تحریر میں ایک گونہ آزردگی و افسردگی کا احساس عود کر آتا ہے وہ اپنی زندگی کی یادگار قید کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

"میانوالی جیل میں احباب کی ایک یادگار بزم، سب اہل ذوق، اہل نظر، اہل دل اور اہل علم جمع تھے۔ مولانا احمد سعید دھلوی حدیث پڑھایا کرتے عبدالمجید سالک دربار اکبری کا سبق دیتے مولوی لقا اللہ کی نپی تلی باتیں گفتگو میں رس پیدا کرتیں۔ صوفی اقبال پانی پتی کے اشغلے! خدا کی پناہ! عبداللہ چوڑی والے کی ٹکسالی گالیاں تبرک کی طرح تقسیم ہوتیں اور آصف علی کھلتے تو پھولوں کے تختے بچھ جاتے جی خوش کرنے کے لئے کبھی مشاعروں کا بھی اہتمام ہوتا شاعر طرحی و غیر طرحی کلام سناتے کبھی سالک صدر ہوتا کبھی آصف اور کبھی۔

قرعہ فال بنام من دیوانہ زدند

اس پیرگراف پر غور کریں تو معلوم ہوتا ہے کہ لکھنے والا کس دلچسپی سے اپنے ساتھ بیتے ہوئے واقعات بیان کر رہا ہے کس خوبصورت انداز سے اپنے احباب کو یاد کرتا ہے اور کس طرح قاری کو ان ایام کی تصویر دکھا کر متاثر کرتا ہے۔

شاہ جی ایک وسیع مشاہدہ رکھنے والے انسان تھے یہ بات خاص طور سے قابل ذکر ہے کہ اس کے ساتھ ساتھ ان کا مطالعہ بھی بہت وسیع تھا ادب' اس کی مختلف شاخوں اور شاعری وغیرہ کے موضوعات پر ان کا علم خاصا وسیع تھا۔ ادبی تحاریک کے مختلف ادوار اور ان کے حالات سے کماحقہ آگاہ تھے۔ اس بات کا علم جہاں ان کے خطبات سے ہوتا ہے وہاں ان کی تحریر میں بھی اس کے متعلق اشارے ملتے ہیں نظم و نثر کے متعلق ان کے مطالعہ کی وسعت کا خفیف اندازہ اس تحریر سے ہوتا ہے جو نور احمد خان فریدی کی کتاب "صدر الدین عارف" پر بطور تقریب لکھی گئی۔ اس میں لکھتے ہیں۔

میرے نزدیک مولانا کا وہی مقام ہے جو انیس کی نظم کا۔ وہ سہل ممتنع لکھتے ہیں اور انہیں روزمرہ پر پوری قدرت حاصل ہے وہ پینتیس سال سے اپنا خون جگر دماغی قوتیں اور ادبی صلاحیتیں علم و عرفان اور تاریخ و تصوف کی خدمات میں صرف کر رہے ہیں ان کا قلم آب حیات کے قطرات سے تشنگان علم و مذہب کی پیاس بجھانے میں مصروف ہے" (صدر الدین عارف ص نمبر۴ ناشر قصر الادب ملتان جلد اول)

اسی تحریر میں ایک اور جگہ لکھتے ہیں۔

" یوں تو شیخ العارف اور ان کی اولاد امجاد کی سیرت کے ایک ایک حرف میں بصیرت و موعظت کے ہزار دو ہزار ساماں موجود ہیں لیکن پھر بھی ان میں کئی مقام ایسے آتے ہیں جہاں انسانی نگاہیں بے اختیار رک جاتی ہیں دل کی دنیا میں ایک تہلکہ سا مچ جاتا ہے اور خون جگر اشک ہائے ندامت کی صورت میں آنکھوں سے ٹپکنا شروع کر دیتا ہے۔" (حوالہ مذکور)

ان اقتباسات سے جہاں اولیاء اللہ سے ان کی عقیدت کا احساس اجاگر ہوتا ہے وہاں زبان پر ان کی قدرت کا بھی اندازہ ہوتا ہے۔ "دل کی دنیا" اگرچہ ایک پامال ترکیب ہے مگر شاہ جی نے جس خوبصورتی کے ساتھ اسے اپنی تحریر میں سمویا ہے اس نے اس کی پامالی کے احساس کو ختم کر دیا اور پھر دل کی دنیا میں تہلکہ مچ جانا کے بعد خون جگر کا اشک ہائے ندامت کی صورت میں برآمد ہونا ان کی تحریر کے محاسن کا پتہ دیتے ہیں اور یہ باتیں صرف وہی انسان لکھ سکتا ہے جو خود صاحب حال ہو اور صاحب دل ہو اور شاہ جی جیسا کہ گزشتہ سطور میں گزرا خود ایک عارف باللہ تھے۔

وسعت مطالعہ کے ساتھ شاہ جی نے کمال کا حافظہ بھی پایا تھا اور اپنی بے پناہ مصروفیات کے باوجود بھی وہ مختلف اساتذہ کے دواوین زیر مطالعہ رکھتے تھے ایک مرتبہ خود شاہ جی نے فرمایا تھا کہ "دو کتابیں سفر و حضر میں ہمراہ رہتی ہیں ایک قرآن اور دوسری دیوان غالب لیکن قرآن پاک اوپر رکھتا ہوں اور دیوان

کمال حافظہ کی ایک مثال ملاحظہ ہو کہ میانوالی جیل میں ایک مرتبہ اختر علی خان نے ایک معرکہ کی غزل سنائی وہاں عبدالمجید سالک ' آصف علی اور لقااللہ جیسے لوگ موجود تھے کوئی اس غزل کی حقیقت تک نہ پہنچ سکا مگر شاہ جی نے اس کی اصل کو جانچ لیا اس واقعہ کو بیان کے بعد لکھتے ہیں۔ "میں نے اختر سے کہا میاں مقطع سے کہو وہ کسی قدر جھینپا میں نے کہا تو لو پھر مجھ سے سنو مقطع۔

جو مے کشی سے ہو فرصت تو دو گھڑی کو چلو

امیر مسجد جامع میں آج امام نہیں"

سب ششدر رہ گئے۔ ارے امیر مینائی کی غزل اڑالی سولات کی ایک بوچھاڑ ہونے لگی اختر علی خان مقطع کے ساتھ ہی بزم سے غائب ہوگئے۔" (مضمون متذکرہ)

(بحوالہ "وے صورتیں الٰہی" ڈاکٹر عبدالسلام خورشید مطبوعہ لاہور)

انکسار شاہ جی کی طبیعت کا ایک خاص وصف تھا جو انہیں اپنے دور کے بڑے بڑے لیڈروں جن میں سے اکثر غرور و تکبر کا شکار تھے سے ممتاز کرتا ہے۔ اسی انکسار کی جھلک ان کی تحریر میں بھی ملتی ہے جس سے ان کی شخصیت کے اس پہلو پر بھی روشنی پڑتی ہے اور ایسے مواقع پر ان کا اسلوب عقیدت مندانہ یا نیاز مندانہ ہو جاتا ہے۔ مثلاً مولانا حسین احمد مدنی رحمتہ اللہ کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں۔

" صدر صاحب تو اس وقت کلکتے پہنچے ہوئے ہیں ان چند سطروں کے پیش کرنے کا شرف مجھے حاصل ہو رہا ہے حضرت کی خدمت اقدس میں جو عریضہ ارسال کیا گیا ہے وہ محض اظہار مقصد کے لئے ہے اب حضرت والا اپنی مرضی کے مطابق جہاں مناسب خیال فرمائیں اور جس مقام کو موزوں سمجھیں اور جن حضرات کو دعوت دینا حضرت کی نظر برکت اثر میں ضروری ہو ارشاد فرمائیں ان شاء اللہ ارشاد عالی کی تکمیل ہوگی۔"

(بحوالہ "مکتوبات شیخ الاسلام" مرتب نجم الدین اصلاحی جلد دوم مطبوعہ ہندوستان)

یہ خط اگرچہ کسی وقتی مسئلہ کے متعلق ہے مگر شاہ جی کا انداز ملاحظہ ہو کہ وہ چھوٹتے ہی لکھتے ہیں "ان سطروں کے پیش کرنے کے شرف مجھے حاصل ہو رہا ہے۔" اس میں شک نہیں کہ شاہ جی مولانا مدنی کا بہت احترام کرتے تھے مگر سیاسی رائے میں ان میں اختلافات بھی رہے اور بعض اوقات یہ اختلافات شدت بھی اختیار کر گئے مگر شاہ جی نے احترام برقرار رکھا اس کی وجہ ان کی طبیعت کا وہی نمایاں وصف تھا جس کا اوپر ذکر ہوا۔

اسی نوعیت کی ایک اور تحریر ملاحظہ ہو جس میں اپنے ایک شعر کی وضاحت کرتے ہوئے مولانا احمد علی لاہوری رحمتہ اللہ کو لکھتے ہیں۔

"میرے وہم میں بھی ذم کا یہ پہلو نہیں تھا' چونکہ آپ فرماتے ہیں شعر سے ذم کا پہلو نکلتا ہے۔ آپ کے ارشاد کے بعد میں اس شعر کی کوئی تاویل نہیں کرنا چاہتا اور استغفراللہ پڑھتا ہوں آپ ہی میرے حق میں دعا کریں اللہ تعالیٰ مجھے معاف کر دے۔"

(بحوالہ "حیات امیر شریعت" از جانباز مرزا مطبوعہ لاہور)

اب شاہ جی کی عظمت کا اندازہ کیجئے کہ اتنا بڑا آدمی جس کے عقیدت مند بے شمار ہوں اور جو اپنی للکار سے فرنگی ایسے سامراج کو للکار چکا ہو۔ جس کی ساری زندگی اسلام اور وطن کی خدمت و آزادی کے لئے صرف ہوئی ہو' کسی غرور و نخوت کا اظہار نہیں کرتا۔ تاویل کی ضرورت نہیں تھی اگر وہ محض اپنے شعر کا پس منظر بیان کر دیتے تو بھی حقیقت کی وضاحت ہو سکتی تھی مگر وہ کسی تعبیر و تشریح کے چکر میں پڑے بغیر صاف الفاظ میں استغفراللہ پڑھتے ہیں اور دعا کے لئے التجا کرتے ہیں۔

شاہ جی کی صلاحیتوں اور خدمات کا ایک زمانہ معترف ہے لیکن اپنے شاگرد قاضی احسان احمد شجاع آبادی کو ایک خط میں لکھتے ہیں۔

"قاضی جی! میں تو جیسا نکما ہوں آپ جانتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو بہت صلاحیتیں عطا کی ہیں اور بہت لوگوں کو آپ سے فائدے پہنچتے رہتے ہیں۔"

(بحوالہ "قاضی احسان احمد شجاع آبادی" از نور الحق قریشی مطبوعہ ملتان)

در حقیقت انکسار ایک ایسا جوہر ہے جو کسی بھی انسان کو بڑا بنا سکتا ہے اور جب ایک بڑا انسان اسے اپناتا ہے تو اس کا مرتبہ اوج ثریا تک جا پہنچتا ہے اور شاہ جی میں انکسار کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا۔

شاہ جی کی تحریر پر غور کرنے سے ان کی شخصیت کے نئے نئے پہلو سامنے آتے ہیں ان اجزا سے جہاں وہ مرکبات کی مترشح ہوتے ہیں جن سے مل کر شاہ جی کی شخصیت کی تعمیر ہوتی تھی وہاں ان کی تحریر کے حسن کا بھی بخوبی اندازہ ہوتا ہے احسن تحریر کی ایک مثال ملاحظہ ہو۔

"دوست زندانی مصائب سنانے میں لذت محسوس کرتے ہیں اور میں عیب۔ یہ اپنا اپنا زاویۂ نظر ہے۔ میں ان مصیبتوں کو رسوا کرنے کا عادی نہیں' میرے لئے جیل خانہ صرف نقل مکانی ہے۔ میں اپنے گرد و پیش باغ و بہار فراہم کر لیتا ہوں اور قیدیوں گزر جاتی ہے جیسے صحرا سے بادل" (میرا عقیدہ)

شاہ جی کی تحریر میں جو بانکپن ہے اس کا اظہار ان کے ایک خط میں بھی ہوا ہے اس خط کا اسلوب ان کے اشہب قلم کی جولانی کا پتہ دیتا ہے مشہور صحافی عبداللہ ملک کے نام اس خط میں لکھتے ہیں زندگی کے شب و روز اسی طرح بسر ہوتے ہیں' اب باقی کیا رہ گیا ہے کہ اس کے لئے اضطراب ہو۔ نہ بیتے ہوئے دنوں کا افسوس ہے اور نہ حال سے کوئی شکوہ۔ مستقبل کی فکر ہی کیا' جو لوگ مستقبل کی فکر کے

لئے جی رہے ہیں ان سے پوچھئے ؟ اپنا تو اب چل چلاؤ ہے گور کنارے بیٹھا ہوں ۔ دیکھئے کب بلاوا آجائے ۔ اس کے سوا کوئی مشغلہ نہیں رہا کہ اپنے اللہ سے صبح شام بھیک مانگتا ہوں ۔ وہی پالنہار ہے ' وہ آخری سہارا ہے ۔ اس کے ہاں عفو و درگذر کے سوا کچھ نہیں ۔ ہمارا خدا ' ہمارا خدا ہے ۔ سزا گناہوں کی دے چکا جزا پشیمانیوں کی دے گا ۔ تمہارے لئے دن رات دعا کرتا ہوں ۔ اب چمن اور اس کی شاخیں تم نوجوانوں کی باغبانی کے سپرد ہیں ۔ جب تک جیو وضع داری سے جیو کہ یہی ایمان کی نشانی اور حاصل زندگی ہے ۔

(بحوالہ " چٹان " لاہور ۱۵ جنوری ۱۹۶۲ء)

اس خط کے انداز بیان سے جہاں شاہ جی کی تحریر کے حسن کا پتہ چلتا ہے وہاں اس آزردگی کا بھی احساس ہوتا ہے جس سے انہیں آخر عمر میں پالا پڑا " مستقبل کی فکر ہی کیا " اور " گور کنارے بیٹھا ہوں دیکھئے کب بلاوا آجائے " ایسے فقرات ہیں جن کا طویل پس منظر ہے اور یہ اقوال ان کیفیات کی غمازی کرتے ہیں جن سے شاہ جی کو گزرنا پڑا اسی طرح جب وہ اپنے جیل کے واقعات کی حسین یادوں کو آواز دیتے ہیں تو ان کی تحریر میں ایک خاص سوز انباط چھلکتا ہے جس سے پڑھنے والے کو پتہ چلتا ہے کہ لکھنے والا ان واقعات کے سنانے میں مزہ بھی محسوس کر رہا ہے ۔ مگر جب ان کی نظر اس کے مال پر پڑتی ہے تو ان کی تحریر میں ایک گونہ آزردگی عود کر آتی ہے مثلاً جیل خانہ سے متعلق اپنے مضمون " میرا عقیدہ " میں اپنے ساتھ بیتے ہوئے واقعات لکھنے کے بعد کہتے ہیں ۔

اب کہاں ' وہ بزم آرائیاں سب نقش و نگار طاق نسیاں ہوگئیں ہم میں سے کوئی رہا ہوتا تو سب بچوں کی طرح بلکتے روتے اور بادل ناخواستہ الوداع کہتے ۔ مولانا احمد سعید رہا ہونے لگے تو ان کی گھگھی بندھ گئی آنسوؤں کے تاروں سے نغمہ جدائی پھوٹ رہا تھا ۔ "

یہ تاسف زدہ لہجہ اگرچہ اس وقت کی کیفیت بیان کرتے ہوئے آیا ہے مگر درحقیقت اس میں ان کے حال دل کا وہ حصہ بھی شامل ہے جس کا ذکر گذشتہ سطور میں ہوا ۔

شاہ جی کی مہیا شدہ جملہ تحریروں پر ایک نظر ڈالنے سے ان کی تحریر کی جو خوبیاں ہمارے سامنے آتی ہیں ان میں مندرجہ ذیل بطور خاص قابل ذکر ہیں ۔

۱۔ ان کی تحریر میں بے ساختگی ہے ۔
۲۔ فقرات نہایت چست اور شستہ ہیں ۔
۳۔ اس میں قاری کو محو کر دینے کی صلاحیت ہے ۔
۴۔ انداز بیاں ایک لحاظ سے شاعرانہ ہے ۔

۵۔ ان کی تحریر میں ایک وسیع المطالعہ شخص کی تحریر کی خصوصیات پائی جاتی ہیں۔

۶۔ انکسار آمیز لہجہ ہے۔

۷۔ شاعرانہ اسلوب کے ساتھ اس میں ایک جوش ہے جس سے ان کی طبیعت کا پتہ چلتا ہے ان کی تحریر کسی قومی لیڈر کی تحریر معلوم نہیں ہوتی بلکہ کسی پختہ کار مصنف اور ادیب کی تحریر معلوم ہوتی ہے کیونکہ ہمارے ہاں قومی رہنماؤں کی جو تحریریں پائی جاتی ہیں ان کا انداز بیان ایک الگ نوعیت کا ہے جس میں اپنی شخصیت کو اجاگر کرنے کا جذبہ اکثر میں پایا جاتا ہے جبکہ شاہ جی کی تحریر میں مطلقاً یہ بات نہیں پائی جاتی ان کا اسلوب جداگانہ ہے اپنے دور کے نثر نگاروں میں وہ مولانا ابوالکلام آزاد سے متاثر تھے مگر ان کی تحریر میں ایسی کوئی بات نظر نہیں آتی جس سے یہ کہا جاسکے کہ وہ نثر میں ابوالکلام آزاد کے مقلد تھے!

ماہنامہ نقیبِ ختمِ نبوت
۶۲۲
امیرِ شریعت نمبر
اسلام کے ناموسِ نبوت، تحریکِ آزادی کے عظیم مجاہد فدائے احرار
مولانا محمد گل شیر شہید
رحمۃ اللہ علیہ کے
سوانح و افکار
احوال و آثار
سیرت و کردار
بےمثال جدوجہد
ولادت تا شہادت
نوجوان محقق محمد عمر فاروق کے قلم سے ایک تاریخی دستاویز
مقدمہ نگار
خواجہ خان محمد مدظلہ
ڈاکٹر انور سدید
مولانا سید عطاء المحسن بخاری
مولانا محمد سعید الرحمٰن علوی
فلیپ نگار
احمد ندیم قاسمی
مولانا محمد اسحٰق بھٹی
نایاب اخباری و سرکاری ریکارڈ سے ماخوذ دستاویزات۔
مکاتیب و عکس تحریر
نادر و نایاب تصاویر
تاریخی منظومات
نامور شخصیات کا اعترافِ عظمت
انگریزوں کے پشتینی وفاداروں کی خدمات
اعزازات، خطابات اور زمینوں کی تفصیلات
مجاہدینِ آزادی کی خونچکاں سرگزشت، تاریخ کے سربستہ راز اور ان کہی کہانیاں
پہلی مرتبہ منظرِ عام پر
جب برطانوی سامراج کا آفتاب نصف النہار پر تھا
انقلاب زندہ باد کہنے سے انگریز اور اس کے جانشینوں کی ہڈیاں انکی قبروں میں چٹخنے لگتی تھیں،
راست بازوں کے لئے اندھا قانون اور بےخوف انسانوں کے لئے کوڑھی انصاف تھا،
کاسہ لیسان سرمدی اپنے سینوں پر تمغہ ہائے وفاداری لٹکائے پھرتے تھے،
فدایانِ حریت کے لئے حلقہ ہائے زنجیر یا درہ ہائے تعزیر،
طلبگارانِ آزادی کی بے سروسامانی پر فرزندانِ سلطنت کے وحشیانہ قہقہے گونجتے تھے،
احرار رضاکاروں کے بدن کا گوشت روئی کے گالوں کی طرح اڑتا تھا،
پیکرانِ عفت کے چہروں پر طمانچوں کی مہریں ثبت تھیں،
یہ انہی دنوں کی سرگزشت ہے
مؤلف کی دس سالہ محنت کا نچوڑ
منفرد اندازِ تحریر میں
سینکڑوں عنوانات کے گرد گھومتی کہانی
صفحات ۴۰۴
کمپیوٹر کتابت
خوبصورت سرورق
مجلد
اعلیٰ طباعت
قیمت ۱۵۰ روپے
پیشگی رقم ارسال کرنیوالوں کیلئے خصوصی رعایت سے ۸۵ روپے میں
قریبی بکسٹال یا ہم سے طلب فرمائیں
بخاری اکیڈمی
دار بنی ہاشم مہربان کالونی
ملتان
جمادی الاخریٰ ۱۴۱۳ھ
۱۹۹۲ء

امین الدین انصاری ؒ

تحریک تحفظ ختم نبوت میں شاہ جی کی ایک تقریر

انسانی دماغ قدرت کاملہ کا عظیم شاہکار ہے۔ ماضی کے واقعات اپنی تمام جزئیات کے ساتھ انسان کے حافظہ میں بالکل اسی طرح محفوظ ہوتے ہیں جس طرح دور جدید میں کمپیوٹر میں محفوظ کئے جاتے ہیں۔ حافظہ پر ذرا زور دیں تو ماضی کے واقعات کی مکمل فلم ابتداء سے آخر تک چلنی شروع ہو جاتی ہے۔ ہر واقعہ تسلسل کے ساتھ اور پورے سیاق و سباق کے ساتھ چشم تصور میں ابھر آتا ہے اور یوں محسوس ہوتا ہے جیسے انسان عام زندگی میں اس کا مشاہدہ کر رہا ہے۔ اللہ جل شانہ کی اس نعمت کی بدولت امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاری کی ایک یادگار تقریر میرے حافظہ کے کیسٹ پر محفوظ ہے اور ملت اسلامیہ خصوصاً اس ملت کی امیدوں کے چراغ ملک پاکستان کے حالات دیکھ کر کبھی کبھی چلنا شروع ہو جاتی ہے۔ سید عطاء اللہ شاہ بخاری نے یہ تقریر ("لانبی بعدی") کے موضوع پر کی تھی۔

یہ ۱۹۵۳ء کا ذکر ہے۔ تحریک ختم نبوت پورے زور و شور سے جاری تھی۔ ملک کا گوشہ گوشہ ختم نبوت زندہ باد کے نعروں سے گونج رہا تھا۔ قائدین تحریک عوام کو مسئلہ کی اہمیت سے آگاہ کرنے اور مسئلہ کے حل کے لئے حکومت پر رائے عامہ کا دباؤ بڑھانے کے لئے ملک بھر کے طوفانی دورے کر رہے تھے۔ ملک ابھی نیا نیا قائم ہوا تھا۔ اور قائد ملت خان لیاقت علی خان کی شہادت کے بعد خواجہ ناظم الدین ملک کے وزیر اعظم تھے۔ تحریک ختم نبوت کے سلسلے میں راولپنڈی کے ٹرنک بازار میں ایک جلسہ منعقد ہونا تھا۔ مولانا ظفر علی خان کے حضرت امیر شریعت کے بارے میں اس شعر سے لاؤڈ سپیکروں پر جلسہ کا اعلان ہو رہا تھا۔

کانوں میں گونجتے ہیں بخاری کے زمزمے
بلبل چہک رہا ہے ریاض رسول میں

حضرت شاہ جی واقعی ریاض رسول ﷺ کے بلبل تھے۔ آپ کی ساری زندگی انگریز کو ملک سے باہر نکالنے، انگریز کے پروردہ اور خود ساختہ نبوت کے دعوے دار مرزا غلام قادیانی کی سرکوبی اور عقیدہ ختم نبوت کے تحفظ میں بسر ہوئی۔ جلسہ کا آغاز تلاوت کلام پاک سے ہوا۔ شان رسالت میں ہدیہ ہائے نعمت پیش کئے گئے۔ مقررین نے مسئلہ ختم نبوت کی اہمیت کو اجاگر کیا۔ حضرت شاہ جی اپنی روایات کے مطابق جلسہ میں تشریف لائے اور فضا امیر شریعت زندہ باد، تخت و تاج ختم نبوت زندہ باد کے نعروں سے گونج گئی۔ حضرت امیر شریعت اپنی نشست پر جلوہ افروز ہوئے۔ سامعین کا شاہ جی کی ایک جھلک دیکھنے کا جذبہ دیدنی تھا۔ شاہ جی نے کرسی پر بیٹھتے ہی منتظمین جلسہ سے فرمایا "مجھے کیوں جولاہے کی کھڈی میں لا کر بٹھا دیا ہے۔ کیا مجھ سے کپڑا بنوانا ہے" یا تقریر سننی ہے"؟

دراصل ہوا یوں تھا کہ جس کرسی پر شاہ جی کو بٹھایا گیا تھا وہ اونچی تھی۔ شاہ صاحب کے پاؤں لٹک رہے تھے۔ منتظمین کو غلطی کا احساس ہوا۔ کرسی تبدیل کر دی گئی۔ شاہ جی نے تقریر سے قبل حسب معمول تلاوت کلام پاک فرمائی۔ حقیقت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت شاہ جی کو تلاوت کلام پاک کا وہ انداز اور سوز عطا فرمایا تھا کہ سامعین پر وجد کی کیفیت طاری ہو جاتی تھی۔ تلاوت کلام پاک کے بعد آپ نے تقریر کا آغاز کرتے ہوئے فرمایا۔ میں آج کی نشست میں آپ کو "لانبی بعدی" کے متعلق کچھ سمجھانے کی کوشش کروں گا۔

صاحبان علم و دانش تشریف فرما ہیں۔ میں تو ایک طالب علم ہوں پھر بھی میں "لانبی بعدی" کا جو مفہوم سمجھ سکا ہوں۔ آپ کو پیش کرنے کی جسارت کرتا ہوں۔ عربی زبان میں لا" نفی جنس " کے لئے استعمال کیا جاتا ہے۔ یعنی لا جس چیز پر وارد ہوتا ہے اس چیز کی مکمل نفی کر دیتا ہے۔ وہ چیز کسی شکل کسی حالت میں باقی نہیں رہتی ہے۔ لارجل فی البیت، مکان میں کوئی مرد نہیں۔ ہے تو اس سے مراد یہ ہے کہ مرد جنس کی جتنی حالتیں اقسام اور صورتیں ہو سکتی ہیں۔ ان میں سے کسی بھی صورت میں مرد کا وجود نہیں ہے۔ یعنی لڑکا، نوجوان، بوڑھا کوئی بھی موجود نہیں ہے۔ اس جنس کی مکمل نفی "لا" سے ہو گئی ہے۔

آپ نے مزید وضاحت فرماتے ہوئے اپنے مخصوص انداز میں فرمایا۔

آپ نے دیکھا ہو گا۔ "لا" تلوار کی طرح ہوتا ہے اور تلوار کا کام کاٹنا ہے جو سامنے آئے گا کٹ جائے گا۔ اس کا خاتمہ ہو جائے گا"۔

پھر آپ نے کلمہ طیبہ میں "لا" کا ذکر فرمایا اور کہا

جب اللہ نے دیکھا کہ دنیا میں بے شمار الٰہ پیدا ہو گئے ہیں تو اس نے "لا" کو حکم فرمایا کہ ان کا خاتمہ کر دیا جائے۔ "لا" کی تلوار چلی جو بھی خود ساختہ الٰہ سامنے آیا اسے ختم کر دیا۔ لا تو اللہ پر وارد ہو جاتا لیکن اللہ پاک نے فوراً اس کے ساتھ الا کا کلمہ لگا دیا۔ الا نے تحفظ کیا، لا کا کام ہی خاتمہ کرنا ہے اور ہر شکل میں کرنا ہے۔
پھر آپ نے

الم ذالک الکتب لاریب فیہ

کا ذکر فرمایا۔ کہ یہاں بھی لا نے شک و شبہ کی جتنی بھی شکلیں ہو سکتی ہیں۔ سب کی نفی فرمائی ہے۔ یعنی قرآن پاک وہ کتاب ہے جس کے بارے میں کسی قسم کے شک و شبہ کی گنجائش نہیں۔ جس نے قرآن پاک نازل فرمایا جس کے ذریعہ نازل فرمایا۔ جس پر نازل فرمایا۔ جس نے لوگوں تک پہنچایا کسی موقع پر کسی بھی صورت میں اس میں شک و شبہ کی گنجائش نہیں ہے۔ یہ مثالیں آپ پر لا کے صحیح مفہوم کو پہنچانے کے لئے دی جا رہی ہیں۔ اسی طرح جب نبی پاک نے فرمایا کہ انا خاتم النبین لا نبی بعدی۔ تو مسئلہ حل ہو گیا۔ نبی کے بعد نبی آنے کے تمام امکانات کسی بھی صورت میں ختم ہو گئے" یہ مسئلہ قیامت تک کے لئے حل ہو گیا ہے۔ حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے آخری نبی ہیں۔ آپ کے بعد کوئی نبی نہیں آسکتا۔ عقیدہ ختم نبوت مسلمانوں کے ایمان کا حصہ ہے۔ عقیدہ ختم نبوت کا تحفظ ہر مسلمان کا فرض ہے۔ نبی کریم کے بعد جو کوئی

بھی نبوت کا دعویٰ کرتا ہے وہ جھوٹا ہے۔

حضرت امیر شریعت نے لانبی بعدی کے موضوع پر اتنی مفصل تقریر فرمائی اور اس نکتہ کو اس انداز سے سمجھایا کہ عام و خاص سب کی سمجھ میں بات آگئی اور اتنی وضاحت اور بلاغت کے ساتھ حقیقت کی سمجھ آجانے کے بعد کسی مفروضے پر بحث کی کوئی گنجائش ہی نہیں رہ جاتی۔

آغا شورش کاشمیری نے حضرت امیر شریعت کو یوں خراج عقیدت پیش فرمایا

خطیب اعظم عرب کا نغمہ عجم کی لے میں سنا رہا ہے
ہوا ہے گو تند و تیز لیکن چراغ اپنا جلا رہا ہے

پروفیسر محمد عباس نجمی

شاہ جی اور اُن کی اولاد

میرا تعلق ایک جاٹ کسان قبیلے سے ہے ہمارے گاؤں چک نمبر ۱۲/۴۲۔ ایل تحصیل چیچا وطنی ضلع ساہیوال میں زیادہ تر جاٹ کاشتکار ہی آباد ہیں اور کھیتی باڑی ان کا پیشہ ہے۔ میرے والد کے ایک ماموں زاد بھائی حافظ عبدالرشید چیمہ کا دل کاشتکاری میں نہ لگا اور وہ سکون قلب کیلئے مرشد کی تلاش میں چل نکلے۔ سلوک و معرفت اور شریعت وطریقت کے عرفان و القان کیلئے عمر کے ابتدائی سالوں ہی میں وہ برصغیر کے عظیم روحانی مرکز خانقاہ سراجیہ کندیاں سے وابستہ ہوگئے۔ اس خانقاہ کے موجودہ سجادہ نشین حضرت خواجہ خان محمد دامت برکاتھم العالی گزشتہ کئی برسوں سے سال میں ایک آدھ مرتبہ ہمارے گاؤں تشریف لاتے ہیں اور اس موقع پر علاقے بھر سے ان کے مریدین یہاں جمع ہوتے ہیں۔ حافظ صاحب مد ظلہ العالی فطری طور پر ایک شریف النفس، نیک دل، پارسا، متقی اور پرہیز گار شخص ہیں۔ انہوں نے اپنے بزرگوں کی نسبت کو زندہ رکھنے کیلئے گاؤں میں ایک مسجد تعمیر کرائی اور ساتھ ہی قرآن پاک کی تعلیم کیلئے ایک مدرسہ بھی قائم کیا۔ موجودہ مجلس احرار اسلام کے جواں سال رہنما عبداللطیف خالد چیمہ، حافظ صاحب کے فرزند ہیں۔

گزرے وقتوں کے حالات و واقعات کو ان کی اصل شکل میں لوٹانا تو شاید انسانی اختیار میں نہیں۔ ہاں۔۔۔۔ البتہ۔۔۔۔ بیتے موسموں اور گزری رُتوں میں کھلنے والے یادوں کے گلابوں کی مہک سے حال گھڑی میں کچھ لمحوں کیلئے اپنے دل دماغ کو معطر ضرور کیا جاسکتا ہے۔

لگ بھگ اٹھائیس برس پہلے کی بات ہے ہمارے گاؤں کے اسی دینی مدرسے میں قرآن پاک کی تعلیم دینے کے لئے ایک جواں سال قاری صاحب مدرس اور معلم کی حیثیت سے تشریف لائے۔ سرخ و سفید چہرے پر نوخیز ریش مبارک، موٹی موٹی چمکدار آنکھیں، کھلا روشن ماتھا، صحت مند اور توانا جسم، جلال و جمال کی ملی جُلی کیفیات کے حسین امتزاج کا عکسِ جمیل، وجاہت اور وقار کے باوصف ایک بے پرواہ سی شخصیت کے مالک یہ جوانِ رعنا محض حافظِ قرآن ہی نہ تھے بلکہ قادرِ مطلق نے انہیں خوش شکلی کے ساتھ ساتھ خوش الحانی ایسی نعمت گراں مایہ سے بھی نواز رکھا تھا۔ خود نہ صرف حافظ وقاری بلکہ قرأت کے اسرار و رموز سے بھی بخوبی آگاہ۔ دوست دار، باذوق، خدمت گزار، بے تکلف اور حد درجہ محبت کرنے والے اس شخص کا نام سید عطاء المھیمن بخاری تھا اور ان کے احباب انہیں "پیرجی" کے نام سے پکارا کرتے تھے۔

میں اور برادر عزیز عبداللطیف خالد چیمہ بہت قلیل عرصے میں انکی شاگردی کے دائرے سے نکل کر دوستی کے حلقے میں داخل ہوگئے۔ اٹھائیس برس ہونے کو ہیں دوستی محبت خلوص اور چاہت کے اس رشتے نے ہر مشکل وقت میں ایک قابل قدر حوصلہ اور انمول اطمینان عطاء کیا ہے۔ اور ان شاء اللہ العزیز عظیم

المرتبت باپ کے اس فقیر اور درویش بیٹے سے مجھے تادم واپسیں مہر و مروت کی خیرات ملتی رہے گی۔

پیر جی کو ہمارے گاؤں آئے ہوئے ابھی چند ہفتے گزرے ہوں گے کہ بیٹھے بٹھائے ایک دن انہوں نے اپنی ڈائری سے ایک فوٹو گراف نکال کر دکھائی۔ پہلی نظر میں مجھے لگا جیسے یہ انکی اپنی تصویر ہے۔ میری آنکھوں میں حیرت بھرا سوال دیکھ کر خود ہی کہنے لگے ہاں! بہت سے لوگوں کو ایسا ہی شک گزرتا ہے تاہم یہ میری نہیں میرے ابا جی کی تصویر ہے ان کا نام سید عطاء اللہ شاہ بخاری تھا۔ تب میں چھٹی جماعت کا طالب علم تھا۔ اور اس وقت میرا مبلغ علم بس اتنا ہی تھا جتنا کہ اوسط درجے کے ایک دیہاتی طالب علم کا ہو سکتا ہے سو بات آئی گئی ہو گئی کچھ دنوں بعد دوران گفتگو جب میں نے اپنے گاؤں کے ایک شخص کو یہ بتایا کہ ہمارے نئے استاد، سید عطاء اللہ شاہ بخاری کے بیٹے ہیں تو جیسے اُسے میری بات کا یقین نہ آیا ہو۔ اور کہنے لگا۔ ہوں۔۔۔۔ سید عطاء اللہ شاہ بخاری کے بیٹے اور یہاں۔۔۔۔ اس گاؤں میں۔۔۔۔ بھلا اس بستی کے ایسے نصیب کہاں؟ وہ لمحہ وہ گھڑی مجھے اچھی طرح ابھی تک یاد ہے۔ یکایک ایسے جیسے مجھے ایک لمحے میں سب کچھ بتا دیا گیا ہو کہ سید عطاء اللہ شاہ بخاری کون تھے۔ وہ لمحہ۔ وہ مہربان لمحہ۔ جس کے وسیلے سے میری حیرت نے یقین کا روپ اختیار کیا۔ وہ محسن گھڑی جس کے توسط سے مجھے عصرِ حاضر کے بہت بڑے انسان سے ملنے کا موقع ملا اپنے عہد کی جلیل القدر ہستی سے یہ میرا پہلا تعارف تھا۔

وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ آہستہ آہستہ اس نام کا نور میری رگوں میں اترتا چلا گیا۔ اس کی عظمت کا جادو سر چڑھ کر بولنے لگا۔ اس کی محبت کے شبنمی موتی دل دھرتی کو قطرہ قطرہ سیراب کرنے لگے۔ سوچ سمندر میں اس کی فکر و دانش کے سفینے تیرنے لگے۔ ذہن کے آسمان پر اسکی محبت اور عظمت کے ستارے جھلملانے لگے۔ زندگی کو سلیقہ مل گیا۔ جرأت حمیت اور غیرت کا مفہوم سمجھ میں آ گیا۔

جنوبی ایشیا سے تعلق رکھنے والے رواں صدی کے مسلم مشاہیر میں سے ان گنت نام اپنی قومی ملی سیاسی ثقافتی اور دینی خدمات جلیلہ کی وجہ سے ہزاروں بلکہ لاکھوں دلوں میں بستے ہیں۔ میں نے گزری عمر کے تمام مرحلوں میں جذباتی اور شعوری ہر دو سطحوں پر نظریاتی فکری روحانی ہر لحاظ سے ہمیشہ سید عطاء اللہ شاہ بخاری رحمۃ اللہ علیہ کو اپنا رہبر مرشد اور رہنما تسلیم کیا ہے۔

اپنے مذکورہ محبوب اور ممدوح کو زندگی میں کبھی سننے کا اتفاق ہوا نہ دیکھنے کا۔ ہاں البتہ ان کے بہت سے دیکھنے والوں کو دیکھا بھی اور سنا بھی۔

ماضی قریب کے اس عظیم انسان کے وفادار ساتھیوں اور جانثار رضا کاروں کی زبانی بھی انکے کارنامے سنے ہیں اور ان کے مخالفوں سے بھی انکی تعریف۔ لیکن انکی ذات کا سچا عرفان اور شخصیت کی اصل پہچان بہر حال مجھے فرزندان امیر شریعت ہی کے ذریعے ہوئی ہے جو حقیقتاً اس مردِ مومن کی سیرت و کردار علم و دانش فکر و تدبر اور جلال و جمال کا دلربا عکس ہیں۔

ان کے چاروں فرزندان ۔۔۔ گرامی مرتبت حضرت مولانا سید ابو معاویہ ابوذر بخاری، مربی و محسن سید عطاء المحسن بخاری، محترم سید عطاء المومن بخاری اور ہمارے پیر جی سید عطاء المھیمن بخاری سب کے سب نہ صرف ظاہری شکل و صورت، شرافت و نجابت، حسن و خوبی کے حوالے سے اپنے بڑے باپ کی سچی تصویریں ہیں بلکہ جرأت و ہمت دلیری و بہادری بے غرضی و بے نفسی، حق گوئی و بے باکی ایثار و قربانی عزم و استقلال تسلیم و رضا زہد و عبادت تقویٰ و پرہیزگاری نیکی و جاں فشانی اور صبر و رضا میں بھی اپنے والد ماجد کے رنگ میں پوری طرح رنگے ہوئے ہیں۔ فرزندانِ امیر شریعت جہاں شخصی اور انفرادی طور پر نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے سچے امتی اور راسخ العقیدہ مسلمان کی حیثیت سے زندگی کے شب و روز گزار رہے ہیں وہیں ملی قومی اور اجتماعی کردار کی تعمیر و ترقی میں بھی مقدور بھر حصہ ڈالنے میں مصروف عمل ہیں۔ میرے جیسے ہزاروں گناہ گار مسلمانوں پر شاہ جی کے فرزندوں کا سب سے بڑا احسان یہ ہے کہ انکی صحبت میں بیٹھنے سے زندگی کی ترجیحات کے تعین میں سہولت پیدا ہو گئی۔

یہ چند روزہ زندگی نفسانی خواہشات کی تکمیل کیلئے ہے یا خلقِ خدا کی خدمت اور پروردگار کی رضا جوئی کیلئے، اس سلسلے میں شاہ جی کے بیٹوں کا ووٹ قولاً فعلاً اور عملاً ہر لحاظ سے خلقِ خدا کی خدمت اور رب العالمین کی اطاعت کے حق میں ہے انہی کے توسط سے کائنات کی بہت بڑی سچائی سے ہم آشکار ہوئے کہ مادہ پرستی اور اخلاقی اقدار کے زوال کے اس دورِ پرفتن میں اگر انسانوں کو امن و آشتی اور فلاح و سلامتی کی ضرورت ہے تو اس کا واحد چشمہ اسلام اور صرف اسلام ہے۔ اور ایک مسلمان کیلئے شعوری زندگی میں سب سے اہم بات اس کا عقیدہ ہوتا ہے۔ عقیدہ جس میں شرک و بدعت کی رتی بھر ملاوٹ نہ ہو۔ صحیح اور سچا عقیدہ رکھنے والا شخص ہی مضبوط اور بہادر ہوتا ہے جسے موت کے سوا دنیا کی کوئی طاقت زیر نہیں کر سکتی۔

یہ چاروں بھائی نہ تو فرشتے ہیں اور نہ ہی معصوم عن الخطاء تاہم وہ انسانی بشری خوبیوں اور خامیوں کے باوصف معقول تعداد میں ایسے مسلمانوں کی توجہ محبت اور عقیدت کا مرکز ہیں جن کا ظاہر اور باطن ایک ہوتا ہے۔ وہ جو کہتے ہیں وہ کر کے دکھاتے ہیں اور جو نہیں کرتے، مفاد پرست سیاسی دعوے داروں کی طرح اس کا نعرہ ہی نہیں لگاتے۔ وہ نعروں کے نہیں عمل کے قائل ہیں۔ انہوں نے اپنے والد کی روشن راہوں پر چلتے ہوئے جدوجہد کا راستہ اپنایا ہے۔ وہ راستی اور عزیمت کی راہ کے کبھی نہ تھکنے والے مسافر ہیں۔ انہوں نے جاہ و منصب کی خواہش کو گلے کا کانٹا بنانے کی بجائے درویشی اور خدامستی کی قبا پہننا پسند کی ہے۔

وہ تخت و تاج کے رسیا نہیں خدائی راج کے خواہاں ہیں۔ اسی لئے تو اپنے باپ کے اس نصب العین کا بارِ امانت اٹھائے ہوئے ہیں "کہ اللہ کی دھرتی پر اللہ کے قانون ہی میں ابنِ آدم کی بقاء کا راز مضمر ہے۔

انکی مجلسوں میں بیٹھنے والے انکے نقطۂ نظر انکے سیاسی فلسفے اور ان کے طرزِ عمل سے اختلاف کر سکتے

ہیں تاہم ان کے اخلاص نیک نیتی اور دیانت پر کبھی شک نہیں کیا جا سکتا۔ انکے والد کی دعاؤں کے صدقے اور اعلیٰ فکری و سماجی تربیت کے طفیل مہر و مروت اور خلوص و وفا کے جذبے سے سرشار ہو کر ان کی محفلوں میں حاضر ہونے والے بالاخر ان کی مومنانہ فراست، تدبر اور استدلال سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے۔

شاہ جی کے بیٹوں نے نسلی یا نسبی تفاخر میں مبتلا ہو کر محض ہاشمی ہونے کی وجہ سے دیگر مسلمانوں سے اپنے آپ کو کبھی افضل و اعلیٰ قرار نہیں دیا بلکہ اس اعزاز کو محض تعارف اور پہچان ہی کا ایک وسیلہ سمجھا۔

عصر حاضر کے دیگر بد دیانت، اقرباء پرور، خود غرض، مفاد پرست، سیاسی و مذہبی اجارہ داروں کی طرح انہوں نے محض اپنے خاندان کے کارناموں یا اپنے والد مرحوم ہی کی ذات و صفات کا پرچم بلند نہیں کیا بلکہ انہوں نے اپنے والد کی سب سے بڑی اور قیمتی نشانی مجلس احرار اسلام کے نام اور کام کو اپنے لہو سے زندہ رکھا۔ وہ جہاں اپنے قابلِ قدر باپ کے قابلِ فخر کارناموں پر ناز کرتے ہیں وہیں وہ چودہری افضل حق، ماسٹر تاج الدین، شیخ حسام الدین۔ مولانا گلشیر شہید، دیگر اکابر اور رضا کاران احرار کی اجتماعی جدوجہد کو بھی کمال دیانت، ذمہ داری اور جاہت کے ساتھ بیان کرتے ہیں۔

مجلس احرار اسلام کی جدوجہد تاریخ آزادی کا بالعموم اور تاریخ اسلام کا بالخصوص ایک روشن اور ناقابل فراموش باب ہے۔ اس انمول فکری اور ملی سوغات کا ہم تک پہنچنا محال ہوتا اگر اس کوشش کے پیچھے شاہ جی کے فرزندوں کا ایثار شامل نہ ہوتا۔ اپنے باپ کے نقوش پا پر چلتے ہوئے انہوں نے دنیاوی طور پر ہمیشہ خسارے کے سودے کئے اور اپنے عیش و آرام سکھ اور سکون حتیٰ کہ اپنے اپنے جیون کو اپنے والد کی راہ پر قربان کر کے تاریخ حریت کا لہو رنگ گلدستہ علم کے زندہ ایوانوں میں ہمیشہ ہمیشہ کیلئے سجا کے رکھ دیا تاکہ قیامت تک آنے والی نسلیں اس کی مہک سے ولولۂ تازہ حاصل کرتی رہیں۔

بے شمار لوگوں کا کہنا ہے اور اپنے اس فرمان کو عام کرنے میں انہوں نے کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی۔ کہ شاہ جی کے بیٹے، ضدی، ہٹ دھرم، بزرگوں کے گستاخ، سخت مزاج، تلخ گفتار اور وقت کے تقاضوں سے بالکل بے خبر ہیں۔ سیاسی اور مذہبی اشتراکِ عمل کے قائل نہیں۔ کسی سے انکی بنتی نہیں۔

میرا مشاہدہ، یقین اور وجدان اس بات کی گواہی دیتا ہے کہ متذکرہ خیال راست گفتار اور دیانت دار لوگوں کی سوچ کا آئینہ دار نہیں بلکہ ابنائے وقت سیاسی جیب کتروں حرام مال کھانے والے قلمکاروں، فکر و نظر سے عاری مذہبی بہروپیوں اور دنیا دار علماء سوء کی کج روی اور باطل سوچ کا نتیجہ ہے۔

یہ بات درست ہے کہ سیاسی سماجی تہذیبی معاشرتی اور دینی حوالوں سے کسی بھی مقام پر کسی بھی حالت میں وہ مصلحت اور ملاوٹ کو پسند نہیں کرتے۔ ان کے نزدیک کامیابی اور ناکامی کا معیار ہمارے دور کے دوسرے رہنماؤں سے بالکل مختلف ہے۔ صحیح اور سچے عقیدے کو ڈھال بنا کر خالص دینی سوچ اور

اسلامی فکر کی چھاؤں میں وہ قرآن حکیم اور ارشادات نبوی کی روشنی میں علماء حق اور اسلاف کی تعبیر و تفسیر کے مطابق کلمۂ حق بلند کرنے کو اپنا فرضِ منصبی سمجھتے ہیں اور ظاہری نتائج سے بے پرواہ ہو کر وہ رشدو ہدایت کے اس سفر پر رواں دواں ہیں۔

تاریک، غیر اسلامی، غیر شریفانہ، اور ناجائز ذریعوں سے حکومت الٰہیہ کا قیام عمل میں آئے یہ انہیں منظور نہیں۔ وہ ایک ایسے سچے اور لازوال انقلاب کے خواہاں ہیں جو پیغمبر اعظم و آخر اور انکے پیارے ساتھیوں کی مقرر کردہ حدود کے اندر رہ کر برپا ہو۔

میں آج بھی جزوی طور پر احرار کی سیاسی حکمت عملی سے اختلاف رکھنے کے باوجود فکری اعتقادی نظریاتی اور سیاسی حوالوں سے شاہ جی کے فرزندوں کی رائے کو مبنی بر حق خیال کرتا ہوں۔ علم و دانش کے جتنے موتی میں نے ان کی محفلوں سے چنے ہیں وہ میری حیات مستعار کا قیمتی سرمایہ ہیں۔

ہماری بد قسمتی یہ ہے کہ اسلام کے نام پر قائم ہونے والے اس ملک میں خالص دینی انقلاب کی کوئی مخلصانہ کوشش نہیں کی گئی۔ اس ملک میں کبھی جمہوریت کا راگ الاپا گیا تو کبھی سوشلزم کے گیت گائے گئے افسوس کا مقام تو یہ ہے کہ ہمارے علماء بھی وقفے وقفے سے اس دامِ فریب کے اسیر ہوتے رہے۔ اور آج تک اس تاریک غار سے باہر نہیں نکل پائے۔ شاہ جی کے فرزندوں اور ان کی جماعت نے اپنے محدود وسائل کے اندر رہتے ہوئے حزب اللہ کا کردار ادا کیا ہے۔ شاہی، صدارتی پارلیمانی یا جمہوری طرز سیاست کی بجائے وہ اسلام کے شورائی نظام کے احیاء میں ہی مسلم دنیا کی عافیت سمجھتے ہیں۔ توحید و ختم نبوت کا مفہوم جیسا انہوں نے بتایا اسے اچھی طرح سمجھا اور پلے باندھ کر رہنمائے زیست بنا لیا اور ان شاء اللہ یہی توشۂ آخرت بھی ہے۔

یہ اللہ لوگ وقت کی رفتار کے ساتھ ساتھ سفر کرنے کی بجائے اس منہ زور گھوڑے کی لگام اپنے ہاتھوں میں رکھ کر منزلِ مقصود کی طرف رواں دواں ہیں اور ایسے میں سید ابو معاویہ ابو ذر بخاری دامت برکاتہم کا یہ کہنا حرفِ آخر کی حیثیت رکھتا ہے کہ:

جو قصدِ منزلِ حق ہے تو پھر کتاب مُبیں کو
ہجوم تیرہ شبی میں چراغ راہ بناؤ

قرآن و سنت کے ساتھ ساتھ اسوۂ ازواج و اصحاب رسول علیہم الرضوان سے روشنی حاصل کرنے کا درس بھی انہی باشعور مبلغوں سے ملا ہے۔ جاں نثارانِ نبی کو معیارِ حق تسلیم کرنے کا فلسفہ بھی انہی سخیوں کی دین ہے۔

جھوٹی عقیدت اور گم کردہ راہ ارادت نے تاریخ کے نام پر جو زہر گھولا شاہ جی کے فرزندوں کے پاس اس کا تریاق موجود ہے کذب و افترا پر مبنی روایات کی ظلمت میں گم ہونے والی امت کو حقیقت حال سے آگاہ رکھنا ان درویشوں نے اپنا اصولِ زندگی بنا لیا ہے کہ کہیں صداقتیں آہستہ آہستہ نذرِ خرافات نہ ہوتی چلی

جائیں۔

فکری روحانی اور نظریاتی بیماریوں کے ان گنت مریض حضرت امیر شریعت کے فیاض اور حکیم بیٹوں سے شفایاب ہو چکے ہیں۔ مستعمل تاریخی روایات جو صدیوں سے حق پرست اسلاف کے کردار کو مسخ کر رہی تھیں سید ابوذر بخاری اور ان کے بھائیوں نے ان کے آگے اپنے سچے اور روشن تاریخی شعور کا آئینہ رکھ دیا ہے۔ جس میں وہ پاکیزہ شکلیں اپنے اصل حسن کے ساتھ نظر آنے لگی ہیں۔

خدا سے ایک زندگی لے کر آنے والے یہ فرزندانِ اسلام بیک وقت کئی محاذوں پر اپنے رب کی خوشنودی حاصل کرنے کیلئے سرگرم عمل ہیں۔ پاکستان بنا تو احرار کا نام لینا جرم سمجھا جانے لگا۔ لوگ آہستہ آہستہ اس نام سے براءۃ کا اظہار کرنے لگے۔ اپنے قول بھولنے لگے۔ اپنے ماضی پر شرمسار نظر آنے لگے۔ بھاگنے کے لئے بہت سی دلیلیں اور فرار کے لئے بے شمار حیلے انکی مٹھی میں بند تھے۔ سو انہوں نے سہولت اور عافیت کی زندگیاں گزارنے کیلئے غیروں کی پناہ گاہوں میں بسیرا کر لیا لیکن۔ یہ۔ یہ۔ جن کی رگوں میں عطاء اللہ شاہ بخاری کا خون تھا جو ہاشمی غیرت کے امین تھے۔ یہ اپنے قول کے پکے نکلے۔ یہ تو اپنے باپ سے غداری کا سوچ بھی نہ سکتے تھے سو انہوں نے وفا کی لاج رکھی۔ احرار کی آبرو کے محافظ بن گئے۔

باپ کی وفات کے بعد احرار کا سرخ پرچم بلند کیا اور آج تک اسے بلند رکھے ہوئے ہیں۔ وہ احرار کے قیام اور اس کی ترویج و ترقی کو اپنے اوپر لازم قرار دیئے ہوئے ہیں۔

وہ چاہتے تو حکمرانوں سے دوستی کر سکتے تھے۔ وہ چاہتے تو ارباب اختیار کی رنگینیوں سے اپنی مرضی کے رنگ چن سکتے تھے۔ وہ پیر بن کر اپنے باپ کے مریدوں کی دولت دونوں ہاتھوں سے لوٹ سکتے تھے۔ لیکن اس کیلئے ضمیر گروی رکھنا پڑتا تھا۔ سو ساری زندگی یہی کام ان سے نہ ہوسکا۔

وہ اللہ، اس کے رسول ﷺ، اور رسول کے ساتھیوںؓ کے چاہنے والوں کے چاہنے والے اور انکے دشمنوں کے دشمن ہیں۔ تبلیغی سفر کے دوران ان کے ایک ہاتھ میں عقیدت کی تسبیح ہوتی ہے تو دوسرے ہاتھ میں عقیدے کا چراغ۔ وہ اپنے عظیم باپ کی تابندہ اور روشن تعلیمات کے سچے اور کھرے امین ہیں۔ میں اکثر سوچتا رہتا ہوں۔

جس باپ کے بیٹے ایسی شاندار اور ایمان افروز خوبیوں کے مالک ہوں وہ خود۔۔۔ کیسا۔۔۔ ذی شان۔۔۔ اور والاصفات ہوگا۔

سفرِ زندگی

سفر ایک تھا۔ منزلیں کئی۔ بعض مقامات پر رکنا پڑا، بعض جگہ ٹھہرنا پڑا، کچھ دیر ستائے، تلووں کو سہلایا، آبلوں اور کانٹوں میں معانقہ ہو چکا تو چلنے لگے، پھر چلتے ہی رہے۔ حتیٰ کہ ایک رات بیت گئی۔

دن چڑھا، سورج نے شعاعوں کا چمن آراستہ کیا، غنچوں کا چہرہ مسکرا اٹھا، آنکھ اٹھا کر دیکھا تو گرد و پیش وہی سناٹا تھا۔

یہ داغ داغ اجالا یہ شب گزیدہ سحر
وہ انتظار تھا جس کا یہ وہ سحر تو نہیں

امیر شریعتؒ

(ملتان ۱۹۵۳ء)

تم مجھے نہ پا سکو گے!

میں نے بنجر زمینوں میں ہل جوتے، تاریک صحراؤں میں سفر کیا اور قبرستانوں میں اذانیں دی ہیں۔

اب میں وہاں چلا جاؤں گا جہاں سے لوٹ کر کوئی نہیں آیا۔ پھر تم مجھے پکارو گے، مگر تمہاری پکار تمہارے ہی کانوں سے ٹکرا ٹکرا کر تمہیں ہلکان کر دے گی۔

مگر۔۔۔

تم مجھے نہ پاسکو گے۔۔۔!

امیر شریعتؒ

(ملتان۔ ۱۹۶۰ء)

خواجہ صادق کاشمیری

امیر شریعت کا آخری سفر

دلخراش خبر

سوموار ۲۱ اگست کو شام کو چند دوستوں کے ساتھ باتوں میں مصروف تھا کہ ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔ میری بھانجی شائستہ شورش بول رہی تھی۔ اس نے بتایا ابھی ابھی ملتان سے ٹیلی فون پر اطلاع ملی ہے کہ سید عطاء اللہ شاہ بخاری کا انتقال ہو گیا ہے۔ خبر سن کر میری روح کانپ اٹھی۔ فضا میں ایک دھماکہ ہوا صبر و قرار کی کائنات برباد ہو گئی۔ کانپتے ہوئے ہاتھوں سے ٹیلی فون کا رسیور گر گیا۔ وفور غم سے دل بیٹھنے لگا۔ ''ہائے شاہ جی''! کے علاوہ اور کچھ نہ کہہ سکا۔ دنیا اندھیری ہوتی ہوئی نظر آنے لگی۔ مایوسی اور غم کے عالم میں سر پکڑ کر بیٹھ گیا اور ملال و کرب کی گہری سوچ میں ڈوب گیا۔ مغلپورہ ایجی ٹیشن۔ شہید گنج تحریک، دوسری جنگ عظیم فوجی میں بھرتی کے خلاف احرار کا محاذ، ناموس رسول ﷺ کے لئے قادیان میں مرزا بشیر الدین محمود کو چیلنج، تحفظ ختم نبوت تحریک، شاہ جی کی طویل ترین دلپذیر تقاریر اور پھر ان کی قرآن خوانی آنکھوں کے سامنے جھومنے لگی۔ اور وہ مبارک لمحے یاد آگئے جب مجھے اس عظیم شخصیت کے پاؤں دبانے کی سعادت حاصل ہوا کرتی تھی۔ عالم تصور میں بڑی دیر تک شاہ جی کے پاؤں دباتا رہا کہ چودھری عبدالرحیم صاحب کی آواز نے چونکا دیا۔

''خواجہ صاحب کیا ہوا۔ خیر تو ہے؟''

گلو گیر آواز میں انہیں بتایا کہ شاہ جی ہمیں چھوڑ کر اللہ کو پیارے ہو گئے ہیں۔ چودھری عبدالرحیم مجھے دلاسہ دینا چاہتے تھے مگر ان سے بھی صبر کا دامن چھوٹ گیا اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے۔ چند منٹوں میں خبر محلہ بھر میں پھیل گئی۔ بے شمار لوگ میرے مکان پر اکٹھے ہو گئے۔ ہر شخص حزن و ملال کی تصویر بنا ہوا تھا۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کیا کیا جائے۔

حاجی محمد اسحاق حنیف کا شمار صابر اور موحد قسم کے لوگوں میں ہوتا ہے۔ وہ کاروباری سلسلے میں روزانہ شیخ حسام الدین صاحب سے ٹیلی فون پر بات چیت کرتے ہیں اور یہ معمول گزشتہ چودہ سال سے جاری ہے۔ جس کی وجہ سے انہیں شیخ صاحب کا ٹیلی فون نمبر حفظ ہے لیکن شاہ جی کے انتقال کے خبر ان کے لئے بھی ناقابل برداشت تھی وہ شیخ صاحب کو فون کرنا چاہتے تھے لیکن ہر بار غلط نمبر مل جاتا ہے آخر انہوں نے مجھے فون کیا اور شیخ صاحب کا نمبر پوچھا۔ اس وقت حاجی صاحب کی آواز میں بڑا دردناک کرب تھا۔ معلوم ہوتا تھا کہ اس موحد اور مضبوط عقیدہ کے بزرگ کی آنکھیں بھی اشکبار تھیں۔

ملتان روانگی

شورش صاحب نے اطلاع دی کہ پونے نو بجے گاڑی سے ملتان جانے کا پروگرام ہے۔ تیار ہو جاؤ۔ لہٰذا اسی وقت حاجی محمد حنیف کے ہمراہ ریلوے اسٹیشن پہنچا۔ شیخ حسام الدین، ماسٹر تاج الدین انصاری، آغا

شورش کاشمیری، مولانا مظہر علی اظہر، سالار معراج دین، حاجی محمد جہانگیر، میاں سعید اقبال، حاجی حبیب اللہ اور دوسرے بیشمار عقیدت مند وہاں ملتان جانے کے لئے اسٹیشن پر موجود تھے۔ سیکنڈ کلاس کی نشستیں ختم ہو چکی تھیں۔ تھرڈ کلاس کے ڈبے کھچا کھچ پر ہو چکے تھے۔ جسے جہاں جگہ ملی وہیں بیٹھ گیا۔ شیخ صاحب، شورش صاحب اور ماسٹر جی فرسٹ کلاس میں تھے۔ مولانا مظہر علی اظہر اور لاہور کے رئیس حاجی حبیب اللہ تھرڈ کلاس کے ڈبے میں بیٹھے تھے۔ حاجی اسحاق حنیف نے سکینڈ کلاس کی ٹکٹیں لی تھیں مگر انہیں انٹر کلاس میں جگہ ملی۔ غرضیکہ جگہ اور آرام سے بے نیاز ہر شخص امیر شریعت کے آخری دیدار کی دھن میں ملتان پہنچنے کے لئے بے تاب تھا۔

خانیوال کے اسٹیشن پر لائل پور کے سو سوا سو ساتھی اس گاڑی میں سوار ہوئے۔ جن میں خواجہ جمال الدین بٹ، مولانا عبید اللہ احرار، مسٹر محمد عالم بھی شامل تھے۔ جھنگ سے صوفی شیر محمد، مولانا غلام قادر، مولانا صادق حسین، مولانا عبدالحکیم کے ہمراہ بھی ساٹھ ستر آدمی آن ملے۔ کوئٹہ میل صبح ساڑھے پانچ بجے ملتان چھاؤنی کے اسٹیشن پر پہنچی تو کے مرید خاص اور شاگرد قاضی احسان احمد شجاع آبادی نے آنسو بھری نگاہوں سے سوگوار ساتھیوں کا استقبال کیا۔ قاضی صاحب نصف گھنٹہ پہلے شاہ جی سے ملنے کراچی سے ملتان پہنچے تھے۔ اسٹیشن پر اخبار پڑھا تو کلیجہ پھٹ گیا۔ دل تڑپ اٹھا۔ پلیٹ فارم پر ہی بیٹھ گئے۔ اتنے میں لاہور سے گاڑی پہنچ گئی۔ قاضی صاحب نے احرار زعماء اور اپنے رفقائے کار کو دیکھا تو ایک ایک سے گلے مل کر روئے اور دوسروں کو رلایا۔

سوگواروں کا یہ قافلہ صبح سویرے محلہ ٹبی شیر خاں کی ایک تنگ و تاریک بستی میں امیر شریعت کے مکان پر پہنچا۔ اس علاقے کے تقریباً تمام مکان کچے اور شکستہ ہیں۔ جوہڑوں میں پانی کھڑا ہے۔ جگہ جگہ کوڑے کرکٹ کے انبار لگے ہیں۔ اس علاقے کے ایک کچے اور شکستہ مکان میں شاہ جی گزشتہ چودہ سال سے چالیس روپے ماہوار پر گزر کر رہے تھے۔

زیارت

عقیدت مندوں کا اصرار تھا کہ انہیں شاہ جی کی زیارت کرائی جائے۔ لیکن مرحوم کے فرزند اکبر مولانا حافظ سید عطاء المنعم اپنی مجبوری بیان کر رہے تھے کہ مکان میں جگہ تھوڑی ہے۔ پردے کا انتظام نہیں ہو سکتا صبر کریں۔ تھوڑی دیر بعد میت کو کسی کھلی جگہ پہنچانے کا انتظام کیا جائے گا۔ لیکن مرحوم کے مخلص عقیدت مند حاجی حبیب اللہ قاضی احسان احمد اور چند دوسرے ساتھیوں کو بھی اندر آنے کی اجازت مل گئی۔ خواتین ٹاٹ کے پیوند لگے پردوں میں چھپ گئیں۔

شاہ جی جنہوں نے دو سال تک فالج، اختلاج قلب، یرقان اور ٹائیفائڈ سے جنگ لڑی تھی لٹھے کے کفن میں لپٹے آخری سفر کے منتظر تھے۔ یرقان کی وجہ سے ان کا چہرہ زرد ہو گیا تھا۔ سرخ و سفید نورانی چہرے والے نواسۂ رسول پر کمزوری کے نشان عیاں تھے۔ لیکن اس کے باوجود ان کے چہرے پر عجیب استقلال و

اطمینان ٹپک رہا تھا۔ یوں معلوم ہوتا تھا کہ جیسے ابھی ابھی طویل تقریر کے بعد تھک کر سو گئے ہیں۔ لیکن جب یہ خیال آتا کہ شاہ جی اب بیدار نہ ہوں گے تو عقیدت مند بے ساختہ رو پڑتے۔ مجھ پر تو لرزہ خیز رقت طاری تھی۔ ایک طرف شاہ جی کی میت اور دوسری طرف اس عظیم انسان کے گھر کا نقشہ۔ پیوند لگے ٹاٹ کے پردے، مٹی کے برتن، پھٹے پرانے بستر، شکستہ چارپائیاں۔

شاہ جی کی بیماری اور اس کا علاج

جس بزرگ کے در پر بڑے بڑے رئیس آفیسر، وزیر، علماء اور صوفیاء حاضری دینا باعث سعادت و فخر سمجھتے تھے۔ جس کی ایک تقریر انقلاب کا پیش خیمہ بن جاتی تھی۔ جو اگر چاہتا تو دولت کے انبار اکٹھے کر لیتا۔ عالی شان کوٹھیاں بنا لیتا۔ اقتدار چاہتا تو بڑا عہدہ حاصل کر لیتا۔ مرتے دم تک سر چھپانے کے لئے ایک مکان بھی نہ بنا سکا۔ کرائے کے مکان میں مفلسوں کی زندگی گزاری۔ فاقہ ہوا تو شکوہ نہ کیا۔ تکلیف ہوئی تو اف تک نہیں کی۔ کبھی کسی کو احساس نہ ہوا کہ اس مہاجر کو سر چھپانے کے لئے جگہ ہی دے دی جائے۔

شاہ جی یوں تو گزشتہ ڈیڑھ سال سے بیمار تھے۔ لیکن گزشتہ رمضان میں ان پر فالج کا حملہ ہوا۔ جس کا اثر زبان اور جسم کی دائیں جانب ہوا۔ مرحوم پر فالج کا یہ چوتھا حملہ تھا۔ عید الفطر کے دوسرے روز انہیں نشتر ہسپتال داخل کرایا گیا۔ جہاں ان کا باقاعدہ علاج شروع ہوا؟

مرحوم کی بلند پایہ دینی و ملی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے صدر پاکستان فیلڈ مارشل محمد ایوب خان نے نشتر کالج اور ہسپتال کی ایڈمنسٹریٹر کو ہدایت کی کہ ان کے علاج میں پوری احتیاط کی جائے۔ اس سلسلے میں اگر کسی ایسی دوا کی ضرورت ہو جو ملک میں نہ مل سکتی ہو تو انہیں بتایا جائے تاکہ وہ دوائی درآمد کر لی جائے۔ شاہ جی ڈیڑھ ماہ تک ہسپتال میں رہے جہاں سے ان کے بیٹے (باہمی مشورے سے) انہیں گھر لے آئے۔ (اس لئے کہ انہیں افاقہ نہ ہوا اور طبیعت زیادہ بگڑ گئی) گزشتہ جون میں انہیں شیخ حسام الدین علاج کے لئے لاہور لے آئے۔ یہاں لاہور کے مشہور حکیموں کے بورڈ نے ان کا معائنہ کیا۔ لیکن علاج کرنل ضیاء الدین سے کرایا گیا۔ یہاں ان کی حالت کچھ بہتر ہو گئی تو ایک ماہ پہلے انہیں واپس ملتان لے جایا گیا جہاں کرنل ضیاء الدین کی ادویات استعمال کرائی جاتی رہیں لیکن ملتان میں حالت اور بھی خراب ہو گئی۔ فالج کے بھرپور حملہ کے باعث قوت گویائی بالکل ختم ہو گئی۔ کبھی کبھار بڑی مشکل سے بات کرتے تھے لیکن مفہوم سمجھ میں نہیں آتا تھا اور پھر اچانک بخار شروع ہو گیا۔ موت سے تین روز قبل یرقان کا حملہ ہوا جس سے جسم کی رنگت بدل گئی۔ رہی سہی توانائی بھی ختم ہو گئی ان حالات میں ان کے ذاتی معالج حکیم عطاء اللہ خان اور اُن کے صاحبزادے حکیم حنیف اللہ سے رجوع کیا گیا۔ انہوں نے بتایا کہ تکلیف جگر کے ساتھ ساتھ اندرون جگر سوزش اور ورم بھی ہو گئی ہے۔ ضعف قلب پہلے ہی تھا۔ لیکن اب زیادہ ہے۔ ان دنوں مرحوم کو ایک سو سے ایک سو چار درجے بخار رہنے لگا۔ آخر ان عوارض نے مل کر اس بلند ہمت انسان کو گرا لیا اور وہ ۲۱ اگست کی شام کو ۶ بج کر پچاس منٹ پر انتقال فرما گئے۔

شاہ جی جس حال میں بھی رہے کبھی شکوہ نہ تھا۔ لاہور اور دیگر اضلاع کے عقیدت مندوں نے کوشش کی کہ ان کے شہر میں چل کر بہتر مکان میں رہیں مگر آپ نے انکار کر دیا۔ ایک مرتبہ گجرات کے ایک عقیدت مند نے شدید اصرار کیا تو ملتان کے خان مظہر نواز خاں نے کہا کہ ہم کٹ مریں گے لیکن ملتان کو شاہ جی کے قیام کی سعادت سے محروم نہ ہونے دیں گے۔ شاہ جی نے مسکرا کر کہا۔ میاں مت گھبراؤ اس فقیر نے اپنا وجود تمہارے سپرد کر دیا ہے۔ اب تم ہی اس کے وارث ہو۔ ٹبی شیر خاں کے تنگ و تاریک کوچہ میں مرحوم کو شاہ و گدا ملا کرتے تھے۔ وہاں رئیس و وزیر بھی جاتے اور فقیر بھی۔ جو سب فرش خاک پر ہی شاہ جی کے رو برو بیٹھتے۔ عقیدت مند ان کی خدمت کر دیا کرتے تھے۔ اللہ کے بھروسے پر ساری زندگی گزار دی۔ کہا کرتے تھے کہ خالق حقیقی نے کبھی اس فقیر کی ضروریات کو نظر انداز نہیں کیا۔ آخر دم تک فقر و استغنا کا نمونہ تھے۔

ان کی محفلیں ایک مدت تک یاد رہیں گی۔ شاہ جی جہاں ہوتے صبح سے شام تک ایک میلہ سا لگا رہتا۔ شاہ جی لوگوں کے دلوں پر حکومت کیا کرتے تھے۔ لوگ اپنا غم لے کر آتے اور شاہ جی کے سامنے زانو طے کرتے اور غم بھول جاتے۔

جذبۂ غریب پروری

وہ ملتان میں اپنے غریب اہل محلہ کے لئے شفقت اور محبت کا خزانہ تھے۔ ان کے دولت مند عقیدت مند جو لے کر آتے بے آسرا لوگوں کے کام آتا۔ وہ بڑی خاموشی سے ان کے گھروں میں رقم پہنچا دیا کرتے۔ یہ سلسلہ آخر وقت تک جاری رہا۔ ان کے معالج حکیم حنیف اللہ نے بتایا کہ ایک روز کہنے لگے:

"حکیم صاحب کبھی آپ نے مجھ سا صابر اور فرمانبردار مریض بھی دیکھا ہے"

اور اکثر حکیم صاحب کی کوششوں پر مسکرا دیا کرتے اور کہتے بھئی میں نے تو بہت جی لیا ہے تم اپنی سعی کر دیکھو۔ مگر میں تو اپنے خالق حقیقی سے ملنے کی تیاریاں کر رہا ہوں۔ ایک مرتبہ ایک عقیدت مند نے کہا شاہ جی مجھے تعویز لکھ دو۔ شاہ جی نے جواب دیا۔ مجھ سے عرضی نویسی کراتے ہو۔ ایسی عرضی تو تم بھی لکھ سکتے ہو۔ وہ کبھی اپنے عقیدت مندوں کو موقع ہی نہیں دیا کرتے تھے کہ وہ انہیں کراماتی پیر کا درجہ دیں۔ وہ علمائے دیو بند کے مسلک سے تعلق رکھتے تھے۔ لیکن دین کی خدمات کے معاملہ میں کبھی تعصب سے کام نہ لیا۔ انہوں نے ہر مکتب ہائے فکر کے مدارس کی امداد فرمائی ان کے سالانہ جلسوں میں شریک ہوئے۔ انہوں نے بے شمار مدرسوں کی بنیاد اپنے ہاتھ سے رکھی جس کی وجہ سے آپ ہر حلقہ میں عزت و احترام کی نظر سے دیکھے جاتے تھے۔

عقیدت مندوں کی ملتان میں آمد

۲۱ اگست کی رات کو ریڈیو پر ان کے انتقال کی خبر نشر ہونے کے بعد ملک کے ہر گوشہ سے عقیدت مند ملتان پہنچنا شروع ہو گئے۔ کراچی سے لے کر پشاور تک کے تقریباً ہر ضلع سے لوگ ملتان پہنچے۔ جنازہ اٹھنے تک ریل کار، ہوائی جہاز، ٹرک، بس، سائیکل اور پیدل تقریباً دس ہزار لوگ باہر سے ان کے جنازے میں شرکت

کے لئے ملتان پہنچ چکے تھے۔ ان لوگوں کے لئے شاہ جی کے مکان سے ایک فرلانگ کے فاصلہ پر مدرسہ قاسم العلوم میں شامیانے لگوا دیئے گئے تھے جہاں بے شمار لوگ کلام پاک کی تلاوت کر رہے تھے۔

کمشنر اور ڈپٹی کمشنر شاہ جی کے مکان پر

دس بجے کے قریب کمشنر ملتان مسٹر بی اے قریشی تعزیت کے لئے شاہ جی کے مکان پر پہنچے۔ انہوں نے حکومت مغربی پاکستان کی طرف سے پیش کش کی کہ اس جلیل القدر رہنما کو ملتان کے تاریخی قلعہ میں دفن کیا جائے لیکن مرحوم کی اہلیہ (سیدہ ام الاحرار اور چاروں بیٹوں) فرزندوں نے اسے قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ (ان کے پیش نظر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا اسوہ تھا) اور کہا کہ مرحوم نے زندگی بھر اپنے لئے کبھی کوئی رعایت حاصل نہیں کی۔ مرنے کے بعد بھی سرکاری رعایت حاصل کرنا ان کے مسلک کے خلاف ہے۔ لیکن عقیدت مندوں کی خواہش تھی کہ شاہ جی کو ان کی شان کے مطابق قلعہ میں دفنایا جائے شاہ جی کے فرزند اکبر سید عطاء المنعم بخاری نے کہا کہ والد ماجد اپنی موت کا ذکر کر کے اکثر فرمایا کرتے تھے "اب تو چل چلاؤ کا وقت ہے۔ خدا سے دعا ہے کہ ایسے مقام پر قبر نصیب کرے جو سر راہ ہو اور آتے جاتے لوگ فاتحہ پڑھ جایا کریں"

شاہ جی کے جانشین کا تقرر اور دستار بندی

مولانا محمد علی نے لوگوں سے درخواست کی کہ وہ عقیدت اور جذبات سے مرعوب ہو کر مرحوم کے مسلک کو تبدیل نہ کریں بلکہ ان کے مشن کو پورا کرنے کے لئے اپنے آپ کو تیار کر لیں۔ انہوں نے شاہ جی کے بڑے بیٹے مولانا حافظ عطاء المنعم کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ عمر کے لحاظ سے وہ ہمارے عزیز ہیں لیکن سادات اور شاہ جی کے بیٹے کی حیثیت سے وہ ہمارے بزرگ اور باپ ہیں۔ شاہ جی کی موت کے بعد وہی ان کے جانشین ہو سکتے ہیں۔ لہٰذا اسی وقت حافظ عطاء المنعم بخاری صاحب کو مرحوم کا باقاعدہ جانشین بنانے کا اعلان کر دیا گیا۔ حضرت مولانا خیر محمد جالندھری نے ان کی دستار بندی کی۔

مولانا حافظ عطاء المنعم کا صبر اور استقلال

جوں جوں وقت گزرتا جا رہا تھا بیرون جات سے آنے والوں میں اضافہ ہوتا رہا اور ہر طرف سے ایک ہی خواہش اور مطالبہ تھا کہ انہیں شاہ جی کی زیارت کرائی جائے۔ لیکن حافظ عطاء المنعم تنگ مکانی کے باعث معذرت کر رہے تھے۔ انہوں نے بڑے صبر و استقلال کا مظاہرہ کیا۔ عظیم و شفیق باپ کی موت کے صدمہ کے باوجود ان کی آنکھ سے ایک آنسو نہ نکلا۔ وہ اپنے دوسرے بھائیوں سمیت ایک مرد مجاہد اور پیکر سُنت کی طرح جنازہ کے انتظامات اور لوگوں کو مطمئن کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔

جنازہ اٹھایا گیا

ساڑھے تین بجے نماز ظہر کے بعد جنازہ اٹھایا گیا۔ سب سے پہلے گھر سے میت کو حافظ عطاء المنعم،

قاضی احسان احمد، حاجی محمد اسحق، حنیف اور دیگر فرزندان امیر شریعت کندھا دے کر باہر لائے۔ اس وقت ٹبی شیر خاں کی تمام سڑکیں میدان اور گلیاں لوگوں سے کھچا کھچ بھر گئیں تھیں۔ ایک لاکھ سے زیادہ لوگ مرحوم کو کندھا دینے کی سعادت حاصل کرنا چاہتے تھے۔ جنازہ کے چاروں طرف بڑے بڑے آٹھ بانس لگا دیئے گئے۔ لیکن اس کے باوجود نصف سے زیادہ لوگ کندھا دینے سے محروم رہ گئے۔ جنازہ تک پہنچنا ایک بڑا مرحلہ تھا۔ ہجوم کے باعث کمزور اور ناتواں لوگ تو میت تک پہنچ ہی نہ سکتے تھے۔ جنازے کا جلوس کم از کم ایک میل تھا۔ حد نظر تک انسان ہی انسان نظر آتے تھے۔

نماز جنازہ

چار بجے جنازہ امیرسن کالج کی گراؤنڈ میں پہنچا دیا گیا۔ جہاں ایک گھنٹہ تک لوگوں کو مرحوم کی زیارت کا موقع دیا گیا لیکن اس عرصہ میں ایک چوتھائی لوگ بھی زیارت نہ کر سکے۔ کچھ عقیدت مند مرحوم کے پاؤں پکڑ کر رونے لگے۔ کوئی ان کا منہ چومنے لگا۔ حتیٰ کہ بے شمار عورتیں بھی پہنچ گئیں۔ جس کی وجہ سے جنازہ کو ڈھانپ دیا گیا۔ اور نماز جنازہ کے لئے صفیں بنائی گئیں۔ اس کام میں بھی پون گھنٹہ لگ گیا۔ مولانا حافظ عطاء المنعم نے نماز جنازہ پڑھائی جس میں بے پناہ عوام کے علاوہ متعدد آنریبل بیشمار علماء اور صوفیاء کرام شریک تھے۔

تدفین بخاری

شام کو ٹھیک چھے بجے مرحوم کو جلال باقری قبرستان میں بالکل سڑک کے کنارے آغوش لحد کے سپرد کر دیا گیا۔ (سنت کے مطابق تدفین کا سارا عمل مکمل کیا گیا۔ قبر کچی بنائی گی) شاہ جی ہمیشہ کے لئے منوں مٹی تلے دب گئے۔ لوگ چیخیں مار مار کر رونے لگے اور برصغیر ہند و پاک تحریک آزادی کا دل آویز باب ختم ہو گیا۔

تعزیتی جلسہ

مقامی حکام نے اس موقع پر تعزیتی جلسہ کرنے کی اجازت دے دی تھی۔ رات کو قاسم باغ میں ایک عظیم الشان جلسہ منعقد ہوا۔ جس میں صاحبزادہ سید محمد سلیمان ------، مولانا عبدالرحمن میانوی، ماسٹر تاج الدین انصاری، شیخ حسام الدین، مولانا مظہر علی اظہر، قاضی احسان احمد شجاع آبادی، اور آغا شورش کاشمیری نے تقریر کرتے ہوئے مرحوم کی موت کو ناقابل تلافی نقصان قرار دیا اور ان کی ملی اور دینی خدمات کو خراج تحسین پیش کیا۔

آغا شورش کاشمیری نے اپنی تقریر میں کالونی ٹیکسٹائل ملز کے مالکان کی اس روش پر افسوس کا اظہار کیا کہ انہوں نے اس عظیم المرتبت شخصیت کی موت کے باوجود بھی فٹ بال ٹورنامنٹ بند نہیں کیا جو کالونی ملز کے مالکوں کی طرف سے کرایا جا رہا تھا۔ (۱)

حاشیہ اگلے صفحے پر ملاحظہ فرمائیں۔

حاشیہ از صفحہ 636

ا۔ کالونی ملز ملتان کے مالکان مرزائی ہیں۔ اب تک اُن کے رشتے ناطے مرزائیوں میں ہی ہوتے ہیں۔ لیکن بعض فتویٰ فروش مولوی و مفتی ہر الیکشن کے موقع پر انہیں مسلمان قرار دے دیتے ہیں۔ اور مرزائی اُن کے پیٹ کا جہنم نوٹوں سے بھر دیتے ہیں۔ (مدیر)

1. انٹرنیشنل کالج آف کامرس ملتان۔
2. مسلم ماڈل ہائی سکول، ملتان۔
3. مسلم ڈگری کالج برائے خواتین ملتان۔
4. مسلم کالج آف ایجوکیشن ملتان۔
5. مسلم لاء کالج ملتان۔
6. مسلم کمپیوٹر کالج ملتان۔
7. مسلم یونیورسٹی ملتان۔

چیف ایڈمنسٹریٹر
پروفیسر محمد امجد خان

(1) اولڈ کیمپس : بالمقابل حلیم اسکوائر نزد چوک کچہری، ملتان
(2) نیو کیمپس : بالمقابل دفاتر محکمہ صحت کچہری روڈ، ملتان
فون : 33434-514200-42420-513779

☎ 72813

Monthly
NAQEEB-E-KHATM-E-NUBUWWAT
Regd. No. L8755
MULTAN

Ameer -e- Shareeat

NUMBER

JAMADI-UL-SANI
1413 A.H.

DECEMBER
1992 A.D.

Editor
Sayyed Muhammad Kafeel Bukhari

DAR-E-BANI HASHIM
MEHRBAN COLONY - MULTAN (PAKISTAN)

MAISOON PUBLICATIONS, MULTAN.